شبلی کا ذہنی ارتقاء

(تحقیقی مقالہ)

اِس مقالے پر سندھ یونی ورسٹی (حیدر آباد) نے
فاضل محقق کو پی ایچ-ڈی کی ڈگری عطاء فرمائی ہے

محقق
ڈاکٹر سیّد سخی احمد ہاشمی

ناشر
مجلس یادگار ہاشمی
کراچی

شبلی کا ذہنی ارتقاء

(تحقیقی مقالہ)

اس مقالے پر سندھ یونی ورسٹی (حیدر آباد) نے
فاضل محقق کو پی ایچ۔ڈی کی ڈگری عطا فرمائی ہے

محقق
ڈاکٹر سید سمیع اللہ احمد ہاشمی

ناشر
مجلس یادگار ہاشمی
کراچی

ضابطہ

نام کتاب	:	شبلی کا ذہنی ارتقاء
مصنف و محقق	:	ڈاکٹر سید یحیٰ احمد ہاشمی
ناشر	:	مجلس یادگار ہاشمی، کراچی
طابع	:	المخزن پرنٹرز، پاکستان چوک، کراچی
کتابت	:	بقا کمپوزنگ سروسز، اردو بازار، کراچی ۔ ۷۴۲۰۰
ضخامت	:	۷۵۲ صفحات
قیمت	:	۴۰۰ روپے

ملنے کے پتے

(۱)

مجلسِ یادگارِ ہاشمی

جی ۲۴/ ۵۔۶، اسٹیل ٹاؤن

بن قاسم، کراچی ۔ ۷۵۰۱۰

(۲)

مکتبہء شاہد

۱/۹، علی گڑھ کالونی

کراچی

فہرستِ مضامین و سنین

انتساب

سیرت نگارِ اعظم

علامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ

کی یاد میں

حرفِ سپاس

حامد و مصلیاً۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ والدِ گرامی مرحوم کا پی ایچ۔ڈی کا مقالہ، جو انھوں نے "شبلی کا ذہنی ارتقاء" کے عنوان سے اپنے استادِ محترم حضرت قبلہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب مدظلہ کی نگرانی میں لکھا تھا اور سندھ یونی ورسٹی نے اس پر انھیں پی ایچ۔ڈی کی ڈگری ایوارڈ کی تھی، شائع ہو رہا ہے۔ قبلہ والد صاحب اس کی اشاعت کے بہت آرزو مند تھے، لیکن چند در چند رکاوٹوں کی وجہ سے مرحوم کی زندگی میں اس کی اشاعت ممکن نہ ہو سکی تھی۔

یہ مقالہ دراصل حضرت قبلہ ڈاکٹر صاحب مدظلہ کے ایک خواب کی تعبیر ہے۔ حضرت مدظلہ نے اپنے تعارفی مقالے میں اس خواب کا ذکر فرمایا ہے۔ مقالے کے عنوان کے انتخاب اور تحقیق کے آغاز سے لے کر تکمیل مقالہ تک تمام مراحل مآخذ کی نشان دہی، مواد کی فراہمی، تالیف وتدوین کے تمام مراحل حضرت قبلہ ڈاکٹر صاحب ہی کی نگرانی و رہنمائی میں طے ہوئے تھے۔ ڈگری کے عطا ہونے پر بھی حضرت قبلہ ڈاکٹر صاحب مدظلہ کی خوشی والد مرحوم کی خوشی سے زیادہ تھی، کم نہیں۔

اب کہ یہ مقالہ شائع ہو کر شائقین علم وادب کے ہاتھوں میں پہنچ رہا ہے تو یہ بھی حضرت قبلہ ڈاکٹر صاحب مدظلہ کی توجہ سامی کی بدولت ممکن ہوا ہے۔ مختلف اسباب کی بنا پر، جب کہ وسائل مفقود تھے، کوئی صورت نظر نہ آتی تھی کہ اتنا ضخیم مقالہ تو کجا والد مرحوم کی یاد میں ایک کتابچہ بھی شائع کیا جا سکے گا۔ لیکن قبلہ ڈاکٹر صاحب

مدظلہ کی توجہ عالی نے تمام رکاوٹوں کو اس طرح دور کر دیا کہ اب اس پر حیرت ہوتی ہے کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا! حقیقت یہ ہے کہ والدِ گرامی کے انتقال کے بعد حضرت قبلہ ڈاکٹر صاحب مدظلہ کی شفقت نے مرحوم کے خاندان کو اپنی آغوش میں اس طرح لے لیا ہے کہ اس بات کو نہ صرف قلب سے صاف محسوس کر لیا، بلکہ اس کے فیوض و برکات کو آنکھوں سے دیکھ لیا جا سکتا ہے۔ اس سے پہلے شاید یہ بات ہو کہ والد مرحوم کی زندگی میں خاکسار نے صورتِ حال پر سنجیدگی سے غور نہ کیا تھا۔ اب چوں کہ تبدیلیِ حالات کی بنا پر سوچنا پڑا ہے تو محسوس بھی کرنے لگا ہوں۔ حضرت قبلہ ڈاکٹر صاحب کی نظر شفقت و توجہ عالی اس خاندان پر تقریباً نصف صدی (١٩٥٠ء سے، جب کہ والد مرحوم کو حضرت کی خدمت میں پہلی بار نیاز حاصل ہوا تھا، تا ایں دم) سے ہے۔ یہ ناچیز بھی آج اگر کسی قابل ہے تو وہ حضرت کی توجہ ہی کا ثمرہ ہے۔ الحمد للہ! یہ فیضان الٰہی ایک نسل سے تیسری نسل تک پہنچ چکا ہے اور امید ہے کہ نسلاً بعد نسل جاری رہے گا۔ اللہ تعالیٰ سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ کے فیض روحانی کو حضرت قبلہ و کعبہ ڈاکٹر صاحب مدظلہ، جو برصغیر پاک ہند میں کعبۂ مقصود اور قبلہ صوفیائے نقشبندیہ ہیں، کے ذریعے دوام عطا فرمائے۔

قبلہ والد صاحب مرحوم حضرت ڈاکٹر صاحب مدظلہ کے جس درجے عقیدت کیش و ارادت مند تھے اس کا بیان ممکن نہیں۔ حضرت بھی انھیں اپنی اولاد کی طرح چاہتے تھے۔ والد مرحوم حضرت ڈاکٹر صاحب مدظلہ کے شاگرد بھی تھے، اور شعبۂ اردو سندھ یونی ورسٹی کے ساتھی اور رفیق بھی۔ حضرت مدظلہ نے تعلق کے اول روز سے آج تک اپنے استاد اور بزرگ و مربی ہونے کا اور رفیق درس و تدریس ہونے کا حق جس طرح ادا کیا اور ہر لمحہ والد صاحب سے شفقت و محبت کا برتاؤ کیا اور ان کے بعد ان کے

پورے خاندان کی سرپرستی فرمائی اور جس طرح ہم سب منت پذیر ہوئے، اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت کے کمال شفقت اور غایت درجہ، محبت کا کچھ اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ اس مقالے کی اشاعت کے تمام اخراجات حضرت مدظلہ العالی کی توجہ سامی سے پورے ہوئے ہیں۔

حضرت ڈاکٹر صاحب مدظلہ العالی نے مقالے کی کمپیوٹر کتابت، پروف خوانی، طباعت اور اشاعت کے انتظام کی کل ذمہ داری اپنے لائق و فاضل شاگرد محترمی ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری کو سونپ دی تھی۔ محترمی ڈاکٹر ابو سلمان صاحب نے والد مرحوم کی نگرانی میں سندھ یونی ورسٹی سے پی ایچ۔ڈی کا مقالہ لکھا تھا۔ انھیں ہمیشہ سے والد صاحب سے خاص تعلق خاطر بھی ہے۔ انھوں نے نہایت شوق و خوش دلی اور خوش اسلوبی کے ساتھ اس ذمہ داری کو نباہا اور اپنے علم و تجربہ اور سلیقے سے مقالے کی صحت و حسن کے ساتھ اشاعت میں پوری سعی فرمائی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کام جتنا مشکل تھا اور جتنے مشکل حالات میں انھوں نے انجام دیا ہے، یہ انھیں کا حصہ تھا۔ ہم سب ان کی سعی و محنت کے معترف اور زحمت فرمائی کے دل سے شکر گزار ہیں۔ ڈاکٹر ابو سلمان صاحب حضرت قبلہ ڈاکٹر صاحب کے شاگردوں اور ارادت مندوں میں معروف، تصنیف و تالیف میں مشہور اور تحقیق میں نامور ہیں۔ سندھ ایجوکیشن سروس سے وابستہ اور کراچی کے ایک گورنمنٹ کالج میں استاد ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں مزید کامیابیاں اور ترقیاں عطا فرمائے۔

میں اپنے دوست محترم سلطان شاکر صاحب کا شکریہ ادا کرنا بھی اپنے اوپر فرض سمجھتا ہوں۔ وہ ایک علم دوست اور ادب نواز شخص ہیں۔ میرے حال پر ان کا ہمیشہ کرم خاص رہا ہے اور قدم قدم پر مجھے ان کا تعاون حاصل رہا ہے، جس کی وجہ سے اپنی

ذمہ داریوں کے بارے میں نے ہمیشہ اپنے تئیں سبک دوش محسوس کیا ہے۔ مجھے ان کی دوستی پر ناز ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں خوش رکھے اور اپنی بے پایاں نوازشوں سے نوازے۔

احقر
(پروفیسر) سید زبیر احمد ہاشمی
صدر شعبہ۔ اردو، پاکستان اسٹیل کیڈٹ کالج
بن قاسم۔ کراچی ۷۵۰۰۰

آہ میرے ہاشمی!

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب مدظلہ

سید یحییٰ احمد ہاشمی میرے عزیز ترین شاگردوں میں سے تھے۔ افسوس کہ آج وہ ہم میں نہیں ہیں، لیکن مکہ معظمہ کی جنت المعلیٰ میں بے شمار رحمتوں اور نعمتوں کی آغوش میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ ان کو میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے، اس لیے کیوں نہ کہوں کہ ان کی زندگی اور موت دونوں میرے لیے قابل رشک ہیں۔ کاش آخرت میں مجھے ان کی معیت حاصل ہو!

رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۝ (آمین)

وہ کئی سال سے حیدرآباد چھوڑ کر اسٹیل مل کراچی کی کالونی (اسٹیل ٹاؤن) میں اپنے بڑے بیٹے زبیر میاں کے ساتھ رہنے لگے تھے۔ یہاں آتے رہتے تھے۔ ابھی وہ اپنی بڑی بیٹی کے یہاں آئے ہوئے تھے کہ ۲۱۔ جنوری اور ۲۲۔ جنوری کو دیر تک میرے ساتھ خوش کلامی کرتے رہے۔ ۲۳۔ جنوری کو عصر کے وقت مراقبے میں بھی شریک رہے اور مجھ سے خوش خوش رخصت ہو کر گئے۔ جمعہ ۲۷۔ جنوری کی صبح کو ہوائی جہاز سے جدہ روانہ ہوئے۔ وہاں ایک دن عبدالغفار صاحب لکھنوی کے یہاں جو (A. G. Khan) کے نام سے زیادہ مشہور ہیں قیام پذیر ہوئے۔ دوسرے دن مکہ معظمہ گئے، وہاں پہلے کی طرح اب بھی مدرسہ صولتیہ میں ٹھہرے۔ پھر عمرہ کیا۔ دو دن کے بعد یعنی سہ شنبہ (۳۱۔ جنوری) کو پہلا روزہ رکھا۔ رات کو حرم شریف میں تراویح پڑھی۔ وہاں سے واپس مدرسہ صولتیہ آئے۔ احباب سے قریب ایک بجے رات تک (یعنی ہمارے یہاں کے تین بجے رات تک) باتیں کرتے رہے۔ پھر آرام کے لیے لیٹے تو

Angina کا درد اٹھا۔ سینہ ملتے رہے، لیکن قریب ایک گھنٹے کے بعد اللہ اللہ کرتے اللہ کو پیارے ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ٥

ہاشمی صاحب سندیلہ کے رہنے والے تھے (۱)۔ خاتون منزل لکھنو میں رہ کر ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ وہیں سے میٹرک وغیرہ پاس کیا اور کچھ دن کے بعد Accounts Department میں ملازم ہوگئے۔ پاکستان بننے کے بعد محکمے کی منتقلی سے کراچی آگئے تھے۔ ان سے میری ملاقات ۱۹۵۰ء میں ہوئی، جب کہ انھوں نے اردو کالج میں بی اے میں داخلہ لیا۔ ادب و احترام، شائستگی اور انکساری ان کی امتیازی شان تھی، جو ظاہر کرتی تھی کہ کسی اعلیٰ خاندان سے وابستہ ہیں۔ طلبہ میں بھی وہ اپنے اوصافِ حمیدہ کی وجہ سے معزز و مکرم تھے۔ ۱۹۵۲ء میں بی اے اور ۱۹۵۴ء میں اردو میں ایم اے کیا۔ دوسرے سال تاریخ اسلام میں بھی ایم اے کیا۔ پہلے وہ محلہ رنچھوڑ لائن میں رہتے تھے، پھر لالوکھیت میں مکان لے لیا۔ اس زمانے کا ایک واقعہ یاد آیا۔ میں نے لالوکھیت سے کچھ سامان خریدا اور اپنے مکان (۳۲۸۔ پیر الہیٰ بخش کالونی) آنے والا تھا کہ ہاشمی صاحب مل گئے۔ فرمانے لگے کہ میں بھی ایک ضروری کام سے آپ کے مکان کے قریب جانا چاہتا ہوں۔ یہ کہہ کر انھوں نے اصرار کے ساتھ میرا سامان لے لیا اور میرے مکان تک پہنچا دیا۔ بس یہی ضروری کام تھا۔

میں ۱۹۵۶ء تک اردو کالج میں رہا۔ وہاں اور اس سے پہلے اسلامیہ کالج میں ایم اے کی کلاسیں ہوتی تھیں۔ ۱۹۵۴ء کے بعد یونی ورسٹی نے ایم اے کلاسوں کو اپنی تحویل میں لے لیا اور اردو کالج کے اساتذہ کے تعاون سے پڑھائی شروع کرادی۔ ۱۹۵۶ء میں مجھے سندھ یونی ورسٹی والوں نے بلا لیا اور علامہ آئی۔ آئی۔ قاضی مرحوم نے اپنی خاص شفقت کی بناء پر میرے لیے مکان بھی تعمیر کرا دیا۔ جولائی میں مجھے حیدر آباد منتقل ہونا پڑا اور اسی زمانے میں ہاشمی صاحب کو ان کے محکمے نے لاہور بھیج دیا۔ وہاں وہ چند روز ہی رہے تھے کہ وہاں سے انھوں نے مجھے لکھا کہ آپ کے بغیر میرا دل یہاں نہیں لگتا۔ میں نے جواب میں لکھ دیا کہ آپ یہاں آجائیں۔ وہ فوراً وہاں سے آگئے۔ اب

میں فکر مند ہوا کہ میں نے بغیر سوچے سمجھے انھیں بلالیا ہے تو ان کے لیے کوئی انتظام تو ہونا چاہیے ۔ اللہ کی شان کریمی کہ اسی زمانے میں حیدر آباد میں سردار بہادر کالج قائم ہوا میں نے اس کے پرنسپل صاحب کو خط لکھا کہ ازراہ کرم آپ ہاشمی صاحب کو لیکچرر کی جگہ عنایت فرمادیں ۔ وہ اس قدر شریف النفس تھے کہ صرف میرے خط پر ہاشمی صاحب کا تقرر کر دیا ۔ وہ کچھ عرصے تک وہاں کام کرتے رہے ۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ایک بہتر صورت پیدا فرمادی ۔ وہ یہ کہ خود سندھ یونی ورسٹی میں لیکچرر کی جگہ کا اعلان ہوا ۔ میں علامہ قاضی صاحب مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا اور انھوں نے خوشی کے ساتھ ہاشمی صاحب کو لے لیا ۔ پھر ان کے قیام کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے اسباب پیدا فرمادیے ۔ ہوا یہ کہ اسی زمانے میں حکومت نے لطیف آباد میں مکانات تعمیر کرائے ۔ وہاں (لطیف آباد نمبر ۱۰ میں گو کہ دور ہے) مکان ملنے کا امکان تھا ۔ میں نے ہاشمی صاحب سے کہا کہ آپ فوراً وہاں منتقل ہو جائیں ۔ وہ کہنے لگے کہ وہ جگہ بہت دور ہے اور غیر آباد بھی ہے ۔ میں نے کہا کہ ایسا نہ سوچیں، وہ جلد آباد ہو جائے گی ۔ چناں چہ بادل ناخواستہ وہ وہاں چلے گئے ۔ پھر ان کے گھر والے بھی آگئے ۔ سندھ یونی ورسٹی اس زمانے میں حیدر آباد ہی میں تھی (گو کہ اس کے چند شعبے اب بھی حیدر آباد میں ہیں) ہاشمی صاحب لطیف آباد سے سائیکل پر، پھر اسکوٹر پر آنے لگے اور بہت محنت سے کام کرنے لگے ۔

علامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ (م ۱۹۵۳ء) نے اپنی وفات کے بعد خواب میں مجھ سے فرمایا تھا کہ حیاتِ شبلی کا دوسرا حصہ تم لکھ دو ۔ میں نے یہ موقع غنیمت جان کر ہاشمی صاحب کو پی ایچ ۔ ڈی کا مقالہ لکھنے پر آمادہ کیا اور "شبلی کا ذہنی ارتقاء" موضوع تجویز کیا ۔ انھوں نے اس موضوع پر بڑی محنت کی ۔ لکھنو تو وہ جاتے ہی رہتے تھے، وہاں ندوہ کی لائبریری کھنگال ڈالی اور اعظم گڑھ میں جس قدر معلومات حاصل ہو سکتی تھیں بڑے سلیقے سے جمع کیں اور ایک ضخیم مقالہ تیار کیا ۔ اس زمانے میں یہاں یونی ورسٹی میں ایک ایسے صاحب آگئے تھے جو کئی لحاظ سے "کان کے کچے" تھے ۔ اس لیے وہ مقالہ قریب ڈیڑھ سال تک یونی ورسٹی کے دفتر میں پڑا رہا، پھر بڑی مشکل سے وہ ممتحن

حضرات کے پاس بھیجا گیا۔ بہرحال ہاشمی صاحب کو ڈگری مل گئی۔ لیکن افسوس کہ اس مقالے کی طباعت کا مرحوم کی زندگی میں کوئی انتظام نہ ہو سکا۔ الحمدللہ! اب راستے کی تمام رکاوٹیں دور ہو گئی ہیں اور یہ مقالہ شائع ہو رہا ہے۔

ہاشمی صاحب علمی کاموں میں برابر حصہ لیتے رہتے تھے۔ خود بھی لکھتے تھے اور طلبہ کو بھی آمادہ کیا کرتے تھے۔ چناں چہ متعدد طلبہ نے ان کی نگرانی میں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔

ہاشمی صاحب نے تصنیف و تالیف کے کئی کام کیے۔ چودھری وزیر حسن نشتر سندیلوی (۱۸۹۷ء۔۱۹۶۸ء) کا دیوان "لمعاتِ نشتر" انھوں نے مرتب کر کے (مع مقدمہ) ۱۹۶۸ء میں شائع کیا تھا۔ ہاشمی صاحب کے بہنوئی شاہ راشد علی نے "روح العبادات" ۱۹۵۲ء میں لکھی تھی۔ ہاشمی صاحب نے ۱۹۶۹ء میں اسے شائع کیا۔ رتن ناتھ سرشار کے "فسانۂ آزاد" کا ایک انتخاب (حصہ اول، صفحات ۴۴) بھی (مع مقدمہ، صفحات ۶۴) طلبہ کے لیے ۱۹۷۰ء میں شائع کیا تھا۔ ایک مجموعۂ مضامین "ادبی آئینے" بھی جون ۱۹۷۴ء میں شائع کیا۔ اس پر انھیں ڈی لٹ کی ڈگری سندھ یونی ورسٹی نے دی تھی۔ اردو لغت بورڈ (کراچی) کے لغات پر نظرِ ثانی آخر وقت تک کرتے رہے۔ انھیں ذاتی طور پر فرنگی محل، دریاباد، کاکوری، بجنور، اعظم گڑھ، الٰہ آباد وغیرہ کے علماء اور صلحاء سے وابستگی رہی تھی اور خود ان کے آباء و اجداد کے متعلق بہت کچھ معلومات حاصل تھیں۔ اس لیے میں بار بار ان سب کو جمع کرنے کے لیے کہتا رہتا تھا، لیکن افسوس وہ اپنی ذاتی مصروفیات اور بیماری Angina کی وجہ سے نہیں لکھ سکے۔

عام مشاعروں کی غیر سنجیدگی کی وجہ سے شعبۂ اردو نے "نعتیہ مشاعرہ" کی ابتدا کی تھی۔ عموماً رمضان المبارک کے کسی دن ظہر سے مغرب تک یہ مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ پھر طلبہ میں علمی تحقیق کا ذوق پیدا کرنے کے لیے اور لکھنے کی عادت بنانے کے لیے شعبۂ اردو نے ایم اے (فائنل) کا ایک پرچہ "اصول تحقیق اور اصلاح املا" کے لیے مختص کیا تھا۔ دوسرے مقامات پر یہ دونوں چیزیں بعد میں اختیار کی گئی ہیں۔

ہاشمی صاحب کو ان دونوں کاموں سے بڑی دلچسپی تھی۔

دہلی کا سلیقہ اور لکھنو کی نفاست، وہاں کے ادب اور معاشرے میں نمایاں ہے۔ ہاشمی صاحب اس نفاست کا پیکر تھے۔ ان کی ہر بات اور ہر گفتگو اسی نفاست اور لطافت کی آئینہ دار تھی۔ ہنسی مذاق اور خوش کلامی ایسی تھی کہ محفل میں انھی کی شمع روشن رہتی تھی۔ پھر ہمارے محترم مولانا ڈاکٹر ابو الفتح صغیر الدین صاحب (سابق صدر شعبہ اسلامیات۔ سندھ یونی ورسٹی) کی وجہ سے اس شمع کی روشنی اور بڑھ جاتی تھی۔ اللہ اللہ، کیا دن تھے اور کیسی باتیں تھیں! اب کیوں کر ان کا اعادہ ہو سکتا ہے! ہاشمی صاحب کو غیبت سے سخت نفرت تھی، بلکہ اگر انھیں کسی شخص سے تکلیف پہنچتی تھی تو اس کا ذکر بھی مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ ہمیشہ "بر غیر بد بیں مباش" ان کا شیوہ تھا۔

خاندان میں ہاشمی صاحب کا نام صابر تھا اور وہ واقعی صابر تھے۔ ان کے تین بیٹے فوت ہوئے، لیکن میں نے ان کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھے۔ والد صاحب اور والدہ صاحبہ کا انتقال ہوا تو اس وقت بھی انھوں نے اظہار غم نہیں ہونے دیا۔ مظہر محمود شیرانی کے مقالے کے ممتحن تھے اور زبانی امتحان کے لیے انھیں لاہور جانا تھا، لیکن حیدر آباد سے وہاں کے لیے ہوائی جہاز نہ ہونے کی وجہ سے وہ بس سے کراچی جانے والے تھے۔ ٹھیک اسی وقت لکھنو سے میرے پاس اطلاع آئی کہ ہاشمی صاحب کے چھوٹے بھائی مطیع احمد کا انتقال ہو گیا ہے، میں دوڑتا ہوا ان کو اطلاع پہنچانے کے لیے پہنچا تو اس وقت بھی انھوں نے غم کا اظہار نہیں کیا۔

ہاشمی صاحب پرانی تہذیب کے دلدادہ تھے۔ کبھی اپنے بڑوں کے سامنے اپنی اولاد کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ اپنے بڑے بھائی سید علی احمد صاحب سے کبھی اپنی اولاد کے متعلق کچھ کہنا مقصود ہوتا تھا تو اپنی بھاوج صاحبہ کو لکھ دیتے تھے۔ خود میرے سامنے اپنی اولاد کے متعلق شاذ و نادر ہی کچھ کہتے تھے۔

انھیں مجھ حقیر سے بہت محبت تھی۔ ان کے سب بچے مجھے (۲) "ڈاکٹر دادا" کہتے ہیں۔ ایک مرتبہ محض عقیدت کی بنا پر ہاشمی صاحب نے میری پرانی شیروانی مجھ سے

لے لی اور درزی کو دو سو روپے دے کر اسے اپنے لیے صحیح کرالی۔ پار سال اسی عقیدت کی وجہ سے مجھ سے میری گرم صدری لے لی۔ وہ پار سال کی سردی میں اور ابھی اس سال کی سردی میں بھی بہت خوش ہو کر اسے پہنے رہتے تھے۔ کبھی کبھی وہ اور ان کے بیٹے میرے پاؤں دابنے لگتے تھے۔ میں منع کرتا لیکن وہ نہیں مانتے تھے۔ پھر میں کہتا کہ "کمزور کو سب دباتے ہیں"۔ اس جملے سے وہ لطف اندوز ہوتے تھے۔

ہاشمی صاحب نقشبندی سلسلے سے وابستہ تھے اور اس لحاظ سے وہ میرے پیر بھائی تھے، خاموشی سے ریاضت کرنے کے عادی تھے۔ تلاوت اور وظائف بھی تنہائی کے معمولات تھے۔ ابھی جب کہ وہ اپنے بڑے صاحبزادے زبیر میاں کی وجہ سے اسٹیل ٹاؤن کراچی میں رہنے لگے تھے، تو میرے بار بار کہنے پر چند حضرات کے ساتھ مراقبہ کرنے لگے تھے، ورنہ اس معاملے میں وہ تنہائی پسند تھے۔

میرا اندازہ ہے کہ ہاشمی صاحب نے کم از کم ۴۲ سال تک رمضان المبارک کے اعتکاف میں ناغہ نہیں کیا۔ پار سال وہ رمضان المبارک سے حج تک حرمین شریفین ہی میں رہے۔ اس سال بھی اس مقصد کے لیے مکہ معظمہ گئے تھے۔ انھوں نے تین حج کیے تھے۔ ۱۹۶۷ء میں، پھر ۱۹۸۶ء میں (اپنی اہلیہ کے ساتھ) اور پار سال ۱۹۹۴ء میں بھی مشرف ہوئے تھے۔ یہ تینوں حج بحری سفر سے کیے تھے کہ بحری سفر کو وہ ترجیح دیتے تھے اس سال ہوائی جہاز سے گئے تھے۔

میں نے ہاشمی صاحب کے والد صاحب (حاجی حسین احمد عرف حاجی میاں) کے انتقال (۱۳۸۱ھ / ۱۹۶۱ء) پر اور والدہ صاحبہ کی وفات (۱۳۸۹ھ / ۱۹۷۰ء) پر تاریخی قطعے لکھے تھے۔ آج ہاشمی صاحب کی یاد کو اس طرح تازہ کرتا ہوں:

سخی احمد اعلیٰ گہر ہاشمی

۱۴۱۵ھ (شب چہار شنبہ، ۲۔ رمضان المبارک)

بہشت آشیاں ، جنتی جنتی

۱۹۹۵ء (یکم فروری)

کسی کا شعر ہے:

رات دن زیرِ زمیں لوگ چلے جاتے ہیں
نہیں معلوم نہ خاک تماشا کیا ہے!

ہاشمی صاحب مرحوم سے پہلی ملاقات ۱۹۵۰ء میں ہوئی تھی۔ ۱۹۵۶ء تک میں اور وہ کراچی میں رہے، بہت تعلق رہا لیکن قربِ قیام اور کالج میں تقریباً روزانہ ہی ملاقات ہو جانے کی وجہ سے انھیں یا مجھے خط لکھنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ ۱۹۵۶ء میں جب میں حیدرآباد منتقل ہوا اور انھیں لاہور جانا پڑا تو اگرچہ یہ عرصہ بہت مختصر تھا، اس دوران میں کچھ مراسلت ہوئی، لیکن اللہ تعالیٰ نے جلد ہی دوبارہ یک جائی کی صورت پیدا کردی اور وہ حیدرآباد آگئے۔ پھر چونکہ سردار بہادر کالج اور سندھ یونی ورسٹی سے تعلق کی بنا پر روزانہ ملاقاتوں کی صورت پیدا ہو گئی تھی اور یہ سلسلہ میرے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی جاری رہا، اس لیے مراسلت کی ضرورت پیش نہ آئی۔ پھر بھی کبھی نہ کبھی کسی ضرورت سے مراسلت کا سلسلہ جاری تھا اور یہ سلسلہ اس وقت بھی قائم رہا جب وہ خود ریٹائر ہو کر کراچی چلے گئے۔ ان کے کچھ خطوط کاغذات میں ضرور محفوظ ہوں گے، جو ان کی لکھنوی تہذیب کی اور ادبی طرزِ نگارش کے آئینہ دار ہوں گے اور ان سے ان کی زندگی کے کئی واقعات بھی ظاہر ہوں گے۔ مرحوم کا آخری خط میرے نام یہ تھا:

۱۴۔ شعبان المعظم ۱۴۱۵ھ / ۱۶۔ جنوری ۱۹۹۵ء
یوم دوشنبہ، وقت ساڑھے گیارہ بجے دن

باسمہٖ حامداً و مصلیاً

محترمی و معظمی ڈاکٹر صاحب مد ظلہ!
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔
بہت دنوں سے خط نہیں لکھا۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔ میں نے

ٹکٹ لے لیا ہے۔ آج ویزا آگیا ہوگا۔ کل ان شاء اللہ لے آؤں گا۔ اب کی بھی عمرہ اور حج وزیارت کا ارادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ پورا فرمائے۔ لڑکے حیدر آباد جاتے ہیں۔ آپ کے یہاں نہیں جاتے جو خیریت معلوم ہو۔ رومی کے تو حیدر آباد کے کئی چکر لگتے ہیں۔ کل گیا ہے اور وہیں ہے۔ میں ان شاء اللہ جانے سے قبل ملنے حاضر ہوں گا۔ محفوظ صاحب کا بھی کچھ پروگرام بن رہا ہے۔ شاید اسی طرح آنا ہو۔ میں ایک دو روز ٹھہر جاؤں گا، ان شاء اللہ شاید اب کی سنیچر کو آنا ہو۔ پروگرام بننے پر ہے۔

عزیزی حافظ منیر سلمہ کو سلام و دعا۔ پیر بھائیوں کو سلام۔ امید کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ یہاں سب سلام کہتے ہیں۔ فقط والسلام۔

محتاجِ دعا
ہاشمی

حواشی:

(۱) ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے "تذکرہ مشاہیر سندیلہ" مولفہ چودھری نبی احمد، ۱۹۷۶ء میں مرتب کرکے لکھنؤ سے شائع کیا تھا۔ اس میں ہمارے ہاشمی صاحب کے حالات (صفحہ ۲۹۴، ۳۴۶ - ۳۴۷ وغیرہ (موجود ہیں)۔

(۲) ان کے نو بچے ہیں؛ زبیر احمد، عمیر احمد، سہیل احمد، جنید احمد، صہیب احمد اور چار بیٹیاں

میری انتہائے نگارش یہی ہے
ترے نام سے ابتدا کر رہا ہوں

گذارش احوال

منظور ہے گذارش احوال واقعی
اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے

اللہ کا شکر و احسان اور کرم ہے کہ سات سال کی کوشش کے بعد یہ مقالہ "شبلی کا ذہنی ارتقاء" مکمل ہوا، گو طبیعت کو اب بھی اطمینان نہیں، اس لیے کہ حضور انور نبی کریم سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے سیرت نگار پر قلم اٹھانا معمولی بات نہیں، لیکن حضرت احمد مجتبے محمد مصطفے (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام کی برکت اور غلام مصطفے (ڈاکٹر) کی شفقت سے یہ کام کسی نہ کسی طرح تکمیل کو پہنچ ہی گیا۔

موضوع خواہ کتنا ہی موزوں کیوں نہ ہو کام کرنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے لیے کس قدر تلاش و تحقیق، جدوجہد، خط و کتابت اور سفر کی صعوبتوں کی کھکھیڑ اٹھانی پڑتی ہے۔ لیکن چوں کہ دشواریاں تو تحقیق کرنے والوں کو پیش آتی رہتی ہیں، ان کا ذکر فضول سا ہے۔ تاہم اتنا عرض کرنے کی ضرورت ہے کہ اس مقالہ کی تیاری میں راقم الحروف نے مولانا شبلی کے موجود تلامذہ سے ملاقات اور "نصف ملاقات" کا رابطہ قائم کیا اور ان لوگوں کو دیکھا جنھوں نے مولانا شبلی کو دیکھا تھا۔ اس کے لیے اعظم گڑھ، بندول، لکھنو، کان پور اور علی گڑھ کے سفر ہمیشہ یاد رہیں گے۔ دار المصنفین والوں کی محبت اور شفقت انمٹ ہے اور بھلا دینے والی نہیں۔

دار المصنفین میں محترم و معظم شاہ معین الدین صاحب کی ذات والا صفات کی شفقت، مولانا مسعود علی ندوی مدظلہ العالی کی شخصیت اور انتظامی صلاحیت، برادرم محترم سید صباح الدین عبد الرحمٰن کی علمی اعانت اور برادرم عزیزم مولوی ابو البقا ندوی کی بندول وغیرہ تک رہنمائی اور ذاتی شرافت سے بہت متاثر ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو تادیر قائم و دائم رکھے اور جزائے خیر دے

یہ موضوع اس لیے ناموزوں بھی تھا کہ مولانا کی شخصیت میں اتار چڑھاؤ خاصا ملتا ہے اور ان کے مخالفین میں اکثر و بیشتر قابل عزت حضرات ہیں، اس لیے تمام اختلافی مسائل سے دامن بچا کر نکل جانا بڑا مشکل کام نظر آرہا تھا لیکن طبیعت کو مناسبت اسی موضوع سے تھی۔ لہذا سلامتی اسی میں نظر آئی کہ غیر جانبداری کے ساتھ قدم بڑھایا جائے اور طریقہ بین بین کا اختیار کیا جائے۔ اس میں کہاں تک کامیاب ہوا اس میں شبہ ہی ہے، لیکن اپنی سی کوشش ضرور کی گئی ہے۔

مولانا انسان تھے اور بشری کمزوریاں ان میں یقیناً تھی۔ لہذا ان کمزوریوں کو اچھالنا انسانیت کی توہین سمجھی گئی اور مولانا عبدالماجد دریابادی کی اس عبارت کو پیش نظر رکھنے کی کوشش کی گئی:

> "بشریت کی ان کمزوریوں کو طشت ازبام کرنا، خلائق کے سامنے مشتہر کرتے رہنا، ہرگز علم کی خدمت ہے نہ دین کی، نہ ادب و زبان کی اور نہ اس مرحوم اور گزری ہوئی شخصیت کی جو اپنے غالی پرستاروں کی ان حرکتوں سے شرم سے پانی پانی ہو رہا ہوگا اور معصیت کو جانے دیجیے، مباحات اور طبعیات کے دائرے کے اندر ہی کتنی چیزیں ایسی ہیں، جن کا پبلک کے سامنے آنا کوئی شریف ہرگز اپنے لیے گوارا نہیں کر سکتا۔ غسل خانہ یا بیت الخلاء میں بیٹھے ہوئے کون شخص اپنا فوٹو کھنچوانا پسند کرے گا (۱)۔

مقالہ تیار کرنے کے بعد سب سے بڑی دشواری اس کی چار نقلیں تھیں۔ اس لیے کہ حیدرآباد (سندھ) میں اردو ٹائپ کی مشین دستیاب نہ تھی اور کراچی میں چند دنوں مستقل قیام کی دشواری تھی۔ اس لیے اپنے کرم فرما حضرات اور طلبہ میں مسودات تقسیم کر دیے تاکہ نقل میں قدرے آسانی اور جلدی ہو جائے۔ اس لیے مختلف تحریروں کی وجہ سے بدنمائی اور مختلف صلاحیتوں کی وجہ سے غلطیاں ہو گئیں جن کو اپنے علم و یقین کی حد تک درست کر دیا گیا اور بدنمائی کی پروا نہیں کی گئی اور اس خیال کو پیش نظر رکھا گیا کہ بدنما کتنا ہی ہو جائے۔ مگر امکان بھر کوئی غلطی نہ ہو۔ اس معذرت کے بعد غالباً بدنمائی اور بدخطی بری معلوم نہ ہو گی، بلکہ اس کو بوقلمونی کہا جا سکے گا۔

جن حضرات سے ملاقات کی یا خط و کتابت کا تعلق رہا، ان کی فہرست بہت بڑی ہے اور اب سب کا نام یاد آنا ناممکن ہے۔ پھر بھی جو نام یاد آرہے ہیں ان کو نظرانداز کر دینا ان کی حق تلفی اور راقم الحروف کے فرض میں کوتاہی سمجھی جائے گی۔ جن حضرات کے نام رہ جائیں گے اس کے

لیے سوائے معذرت کے اور کچھ نہیں کیا جاسکتا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کی تعلیم و تربیت میں بالواسطہ یا بلاواسطہ تقسیم ہند سے قبل تک رہا۔ گو قدر یہاں آنے کے بعد ہوئی اور استفادے کا خیال تو بہت بعد کو آیا۔ پھر بھی جب ہندوستان گیا، استفادے کا موقع ملا، بلکہ موصوف نے اپنی شفقت کی وجہ سے خود پہل کی کیوں کہ موصوف کی عدیم الفرصتی کی وجہ سے راقم الحروف کو ان کے قیمتی وقت میں خلل انداز ہونے سے جھجک ہی ہوتی رہی۔ اس جھجک پر ان کی ناراضی (انھوں نے راقم الحروف کے بڑے بھائی حاجی سید علی احمد صاحب مدظلہ کے نام ایک مکتوب میں راقم الحروف سے ناراضی کا اظہار کیا تھا)، کو سند کے طور پر محفوظ کر لیا ہے۔ موصوف کے علاوہ مولانا مسعود علی ندوی، مولانا عبدالباری ندوی، مولانا جواد علی خاں ندوی، مولانا خواجہ عبدالواجد کان پوری، مولوی حفاظت علی صاحب سابق استاد گورنمنٹ جوبلی کالج لکھنو، سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب، مولوی عبدالسلام قدوائی ندوی استاد جامعہ ملیہ دہلی، پروفیسر نجیب اشرف صاحب (بمبئی)، مولوی نصیرالدین ہاشمی مرحوم، مولانا سعید انصاری مرحوم سابق رکن شبلی اکیڈمی لاہور، محترمی وقار خلیل، محمد اکبرالدین صدیقی (حیدرآباد۔ دکن)، مرزا احسان احمد بیگ وکیل اعظم گڑھ، مولوی عبدالحکیم صاحب بندولی، ضیاء الدین اصلاحی صاحب رفیق دارالمصنفین اعظم گڑھ، مولوی مشتاق حسین صاحب اسسٹنٹ لائبریرین آزاد لائبریری مسلم یونی ورسٹی۔ علی گڑھ، ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی شعبہ اردو۔ ڈھاکہ یونی ورسٹی (مشرقی پاکستان)، عبداللطیف اعظمی صاحب (جامعہ ملیہ دہلی)، پروفیسر ریاض الرحمن شروانی استاد عربی مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، ابن فرید صاحب ایڈیٹر ماہنامہ ادیب۔ علی گڑھ اور کبیر احمد جائسی صاحب قابل ذکر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو اجر عظیم عطا فرمائے۔ آمین اور مولانا سعید انصاری صاحب مرحوم اور مولوی نصیرالدین ہاشمی مرحوم کو اللہ تعالیٰ جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

مقالہ میں ابواب نہیں ہیں اور ہر سال ایک باب کی قائم مقامی کرتا ہے۔ ہر سال کے تحت مولانا سے متعلق خاص واقعات اور حالات، جن کا ان کے ذہن پر اثر پڑا ہے، تفصیل سے پیش کر دیے گیے ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض جگہ یہ تفصیل غیر ضروری معلوم ہو، مگر بشریت کی کمزوری کا تقاضا بھی تو کچھ ہے۔ بعض سالوں کے واقعات میں پھیلاؤ اس قدر ہو گیا تھا کہ بعض چیزیں عمداً رو کنا پڑیں۔ مثلاً ۱۹۱۱ء سے ملاقات کے اقتباسات حذف کر دینا پڑے۔

آخر ڈاکٹر صاحب مدظلہ (غلام مصطفے خاں) کے لیے یہ عرض کرنا ضروری ہے:

جمال ہمنشیں بر من اثر کرد
وگرنہ من ہمہ خاکم کہ ہستم

اس مقالے میں یقیناً خامیاں ہوں گی۔ لیکن بھروسا اس ستار العیوب پر ہے جو "مرکب من الخطاء والنسیان" کی کوتاہیوں کی پردہ پوشی کرنے والا ہے۔ راقم الحروف تو بہرحال یہی کہے گا:

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

سید یحیٰ احمد ہاشمی

۳۔ دسمبر ۱۹۶۵

حاشیہ:

۱۔۔۔ مکتوبات سلیمانی، صفحہ ۴، صدق جدید بک ایجنسی، کچہری روڈ، لکھنو۔

شبلی کا ذہنی ارتقاء

کہیں صدیوں میں ہوتا ہے یہ فیض خاص ربّانی
نہیں اٹھتے ہمیشہ دہر میں شبلی نعمانی (۱)

یحییٰ اعظمی نے مولانا شبلی کی ولادت باسعادت کو اللہ تعالیٰ کا خاص فیض بتایا ہے۔ مولانا کے علمی کارناموں اور دینی خدمات کو دیکھتے ہوئے یہ دعویٰ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس دعویٰ کی دلیل کے لیے مولانا کی پوری زندگی کی علمی اور ادبی مصروفیات کو پیش کرنا ہوگا اور ان کے ذہن کے تمام ارتقائی مدارج کا جائزہ بھی لینا ہوگا۔

مولانا کی ولادت "غدر ہندی ۱۲۷۳ھ (۲) کے زمانے میں ہوئی۔ سید سلیمان ندوی مولانا کی ولادت کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"مولانا شبلی مرحوم کی ولادت ذیقعدہ ۱۲۷۴ھ مطابق مئی ۱۸۵۷ء میں عین اس ہنگامہ خیز زمانہ میں ہوئی جو عام طور سے غدر کے نام سے مشہور ہے۔ اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ عین اس دن ولادت ہوئی جس دن ضلع اعظم گڑھ کے باغیوں کی ایک جماعت نے ڈسٹرکٹ جیل کے پھاٹک کو توڑ ڈالا اور بہت سے قیدیوں کو نکال لے گئے۔" (۳)

لیکن یہاں غالباً کچھ سہو ہو گیا ہے۔ ۱۲۷۴ھ کے بجائے ۱۲۷۳ھ ہوگا۔ کیوں کہ امپریل گزیٹیر ضلع اعظم گڑھ کے صفحہ ۱۵۶ پر لکھا ہے کہ ۳۔ جون ۱۸۵۷ء کو دیسی فوج کی سترھویں رجمنٹ کی اعظم گڑھ میں بغاوت ہوئی اور اسی دن جیل کا پھاٹک توڑا گیا۔ ڈسٹرکٹ گزیٹیر مطبوعہ نول کشور صفحہ ۱۷۴ میں بھی ۳۔ جون ۱۸۵۷ء ہے، اور یہی صحیح ہوگا۔ ۳۔ جون ۱۸۵۷ء مطابق ہوتا ہے ۱۰۔ شوال ۱۲۷۳ھ کے، اس لیے شوال ۱۲۷۳ھ صحیح ہوگا۔

مولانا نے ۱۸۷۶ء تک مختلف اساتذہ سے مختلف مدرسوں اور درسگاہوں میں تعلیم حاصل کی۔ گویا ۱۹ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو چکے تھے۔ اس کے بعد کتب بینی کا سلسلہ جاری رہا، لیکن درس لینے کا سلسلہ بند ہو گیا۔ مولانا اپنی طالب علمانہ زندگی کے بارے میں خود لکھتے ہیں

- علمی شوق والد اور گھر کی تربیت کا اثر تھا - خاندان میں علم کا چرچا تھا اور تمام بزرگ معروف علم تھے - اس زمانہ کی طالب علمی بہت مشکل تھی، یکہ پر سفر کرتے تھے، پیدل بھی چلنا پڑتا تھا - یہ سب میں نے خوشی سے گوارا کیا، دو دفعہ والد کی اجازت کے بغیر چپکے سے نکل گیا، یہ خاص التزام رہا (اور اس میں میں منفرد تھا) کہ ہر فن مثلاً ادب، منطق، حدیث اور اصول فقہ کے لیے ان ہی علماء کی پاس دور دراز کا سفر کر کے گیا، جو ان علوم میں تمام ہندوستان میں ممتاز تھے - مثلاً حدیث کے لیے مولانا احمد علی سہارن پوری، ادب کے لیے مولانا فیض الحسن -

والد اور تمام خاندان کی مرضی بلکہ حکم تھا کہ میں علمی مشاغل چھوڑ کر وکالت اور ملازمت کروں - چناں چہ مجبور ہو کر امتحان دیا اور کامیاب ہوا - چند روز وکالت کی، لیکن وکالت اور ملازمت سب چھوڑ دی، اور علمی اشغال میں معروف ہوا اور اس لیے معمولی معاوضہ پر اول علی گڑھ کی پروفیسری ۴۰ روپے ماہوار ----- ملازمت تو اکثر علمی ہی اختیار کی، لیکن وکالت اور سرکاری ملازمت کے زمانہ میں بھی درس و تدریس کا مشغلہ جاری رکھا اور یہ فطرت تھی -" (۴)

مولانا نے مولوی فاروق مرحوم سے پڑھنے کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"میں نے معقولات کی تمام کتابیں مثلاً میر زاہد، ملا جلال مع میر زاہد، حمد اللہ، شرح مطالع، صدرا، شمس بازغہ ان ہی سے پڑھیں اور میری تمام ترکاشتات ان ہی کے افادات ہیں - فارسی کا مذاق بھی ان ہی کا فیض ہے -" (۵)

مولانا کے ابتدائی مدرسہ کے متعلق سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"قرآن پاک اور فارسی کی ابتدائی تعلیم گاؤں ہی میں حاصل کی - ان کے گاؤں کے قریب جیراج پور کے ایک بزرگ حکیم عبداللہ صاحب المتوفی ۱۳۰۷ھ / ۱۸۹۰ء تھے ---- وہی پہلے معلم مقرر ہوئے -" (۶)

مولانا نے مدرسہ عربیہ اعظم گڑھ میں بھی کچھ دنوں پڑھا تھا - اس کے متعلق سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"شیخ صاحب مرحوم اور شہر کے دوسرے اہل استطاعت حضرات نے مل کر اعظم گڑھ میں علوم عربیہ کا ایک مدرسہ قائم کیا تھا، جس میں پہلے تھوڑے عرصے تک مولانا سخاوت علی جون پوری مرحوم کے شاگرد خاص مولوی فیض اللہ صاحب مرحوم مدرس اعلیٰ مقرر ہوئے، مولانا نے اسی مدرسہ میں مولوی صاحب سے عربی کی کچھ

کتابیں پڑھیں۔" (۷)

مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی کے بیان کے مطابق مولانا نے کچھ دنوں جون پور میں بھی پڑھا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

"چند روز بحیثیت طالب علم جون پور کے مدرسہ حنفیہ میں رہے۔" (۸)

اس کے بعد مولانا نے مدرسہ چشمہ، رحمت، غازی پور میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے متعلق سید سلیمان ندوی اس طرح رقم طراز ہیں:

"مولانا محمد فاروق صاحب چریا کوٹی ان دنوں چشمہ، رحمت، غازی پور میں مدرس تھے۔ ان کی تعلیم و تدریس کا شہرہ دور دور پھیلا تھا۔ ..... شیخ صاحب نے مولانا کو ان ہی کے پاس غازی پور بھیج دیا۔" (۹)

شیخ صاحب کے قائم کیے ہوئے مدرسے میں مولانا فاروق صاحب کا مدرس اول کی حیثیت سے تقرر ہوا تو مولانا نے بقیہ تعلیم اسی مدرسے میں مولانا فاروق سے حاصل کی۔ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"مولانا نے قریب قریب درجہ فراغ تک اسی مدرسہ میں مولانا فاروق صاحب سے تعلیم پائی۔" (۱۰)

اس مدرسے میں مولانا نے ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸۷۲ء تک تعلیم پائی۔ مولانا لاہور کے سفر سے پہلے دیو بند بھی تشریف لے گئے، مگر وہاں درس میں شامل نہیں ہوئے۔ چناں چہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"اس زمانہ میں دیو بند کے مدرسہ میں مولانا کے چند ہم وطن اور ہم عمر دوست، جیسے مرزا محمد سلیم جو بعد کو وکیل ہوئے، پڑھتے تھے۔ اس کشش سے وہ دیو بند گئے اور ایک مہینہ کے قریب رہے۔ تعلیم میں شرکت نہیں کی، مگر فرائض کا علم یہیں سیکھا، یا فرائض کا رسالہ یہیں پڑھا، مدرسہ دیو بند کے کتب خانہ سے بعض کتابیں اس زمانہ میں پڑھنے کو لی تھیں، جن پر مولانا نے اپنا نام لکھا تھا وہ کتابیں وہاں اب تک ہیں اور ان پر ان کا نام لکھا اب تک موجود ہے۔" (۱۱)

مولانا سہارن پور جاتے ہوئے لکھنو بھی ٹھہرے تھے۔ چناں چہ مؤلف "حیاتِ شبلی" میں لکھتے ہیں:

"سہارن پور جانے کے لیے جب مولانا گھر سے نکلے تو پہلی منزل لکھنو پڑی یہاں ان کے بعض احباب فرنگی محل میں مولانا عبدالحی صاحب سے پڑھتے بھی تھے۔ وہ

طالب علموں کے مجمع میں داروغہ حیدر بخش کی مسجد میں جاکر ٹھہرے اور مناظرے شروع ہوگئے۔" (۱۲)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں مولانا فن مناظرہ میں بڑے مشاق تھے اور یہ مولانا فاروق کی تعلیم کا اثر تھا۔ دیو بند کے بعد اسی سال (۱۲۸۹ھ) انھوں نے رام پور اور لاہور کے سفر کیے۔ رام پور میں مولانا ارشاد حسین رام پوری سے فقہ اور اصول کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد لاہور چلے گئے اور وہاں مولانا فیض الحسن صاحب سے عربی ادب کی تعلیم حاصل کی۔ سید سلیمان ندوی نے رام پور اور لاہور کے تعلیمی سفر (۱۳) کے سال ۱۲۹۱ھ، ۱۲۹۲ھ لکھے ہیں۔ جو صحیح نہیں معلوم ہوتے۔ اس لیے کہ مولانا نے اپنے والد کے نام فارسی خط میں لاہور پہنچنے کے دو ماہ بعد اپنے سفر کا حال لکھا ہے اور اسی خط میں اپنے والد سے خرچ بھی طلب کیا ہے۔ مکاتیب شبلی حصہ دوم صفحہ ۲۳۶ پر ان کا ایک خط ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"بگرامی خدمت جناب والد ماجد!

مرا دو ماہ می گذرد کہ ترک وطن کردہ ام، و بہ بیگانگی بسر بردہ ام۔ بست و پنج روپیہ عنایت شدہ بود، سہ روپیہ بکرایہ، یکہ از اعظم گڑھ تا جونپور رفت و ہفت روپیہ صرف ریل تا بہ سہارن پور شد، و پنج روپیہ از آنجا تا بہ لاہور، دہ روپیہ باقی می ماند، اول کہ درنجار سیدم دو یک روپیہ بحوائج ضروریہ کہ در وقت قیام جائے پیش می آید، صرف شد، وچوں دریں جا جائے قیام نہ بود، مکانے بہ کرایہ یک روپیہ گرفتم، دو ماہ را دو روپیہ کرایہ می شود، آنچہ باقی می ماند، بصرف طعام آمد، اگر انصاف، رود بچنداں کفلت بسر بردہ ام کہ بیش ازو متصور نیست، چوں مزاج عالی اند کے برہمی داشت از تکلیف ارسال صرف باز ماندم، اکنوں کار مشکل افتاد است۔ دیگر چہ گویم تاخیر آزار تمام باعث خواہد بود۔ حد ادب۔

شبلی نعمانی ۱۲۸۹ھ" (۱۴)

مولانا ۱۲۹۳ھ / ۱۸۷۶ء میں سہارن پور میں مولانا احمد علی محدث سہارن پوری سے علم حدیث پڑھ رہے تھے کہ اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر والد صاحب کے ساتھ حج کے لیے تشریف لے گئے۔ حج سے واپسی کے بعد پھر نہ کسی استاد سے پڑھا اور نہ کسی مدرسے کا رخ کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مولانا فیض الحسن صاحب کے ساتھ سہارن پور تشریف لائے اور یہیں عربی ادب کی تکمیل کر کے مولانا احمد علی محدث کے درس میں شامل ہوگئے۔

ویسے تو مولانا کو بچپن سے شاعری کا چسکا لگ گیا تھا اور کچھ نہ کچھ کہتے ہی رہتے تھے۔ مگر

مرحوم کی مثنوی کے ان چند اشعار کو اولیت کا شرف حاصل ہے جو انھوں نے روضہء اقدس حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ۱۲۹۳ھ (مطابق ۱۸۷۶ء) میں پیش کیے تھے۔ اس سے قبل کے اشعار دستیاب نہیں ہوئے۔ مولانا کی عمر اس وقت ۱۹ سال تھی۔ وہ اشعار یہ ہیں:

" اے بے کرم کار جہاں کرد ساز
مرہمہ را پیش تو روے نیاز
چوں بہ درت آمدہ ام باامید
از کرم خویش مکن ناامید
چوں بہ درت آمدم امیدوار
سایہء لطفے ز سرم بردار " (۱۵)

عجیب اتفاق ہے کہ مولانا حالی نے بھی انیس سال کی عمر میں نعت لکھی تھی اور وہ شاعری میں ان کی پہلی کوشش تھی۔ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں لکھتے ہیں:

"مولانا حالی نے ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۶ء) یعنی تقریباً انیس سال کی عمر میں حاجی جان محمد قدسی کی مشہور نعتیہ غزل "مرحبا سید مکی مدنی العربی" پر ایک تضمین لکھی تھی اور اس وقت خستہ تخلص اختیار کیا تھا۔" (۱۶) اس کا آخری بند یہ ہے:

" خستہ خاموش کہ مشکل ہے بہت وصفِ نبیؐ
ہاتھ اٹھا سوے مدینہ دم حاجت طلبی
پڑھ زباں سے زرہ صدق یہ شعر قدسی
سیدی انت حبیبی وطبیب قلبی
آمدہ سوے تو قدسی پئے درماں طلبی (۱۷)

چوں کہ مولانا شبلی علم حدیث کا درس چھوڑ کر حج کے لیے تشریف لے گئے تھے اس لیے علم حدیث کی طرف خاصا دھیان تھا اور فنون حدیث کی کتابوں کی تلاش تھی لہٰذا مدینہ منورہ کے کتب خانوں کی سیر کی اور اپنی تشنگی کو منبعِ حدیث کے دربار میں بجھایا۔ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"اس مذہبی سفر میں مولانا کی علمی تگ و دو بھی جاری رہی، چنانچہ مدینہ منورہ میں جو کتب خانے ہیں، ان کی سیر کی۔ فرماتے تھے کہ فنون حدیث کا جو ذخیرہ وہاں دیکھا کہیں دوسری جگہ نظر نہیں آیا۔" (۱۸)

حج سے واپسی کے بعد مولانا نے اعظم گڑھ میں قیام کیا۔ مولانا کی عمر بیس سال کی تھی کہ

۱۲۹۴ھ مطابق ۱۸۷۸ء میں روس اور ترکی میں جنگ چھڑ گئی۔ اس زمانے میں آزاد مسلمان ملکوں میں ترکی طاقتور ملک تھا۔ مسلمانوں کی ہمدردانہ نگاہیں اس کی طرف قدرتاً اٹھتی تھیں۔ ترکی میں خلافت تھی۔ اگرچہ اسلامی مملکت اور شرعی خلافت کا اس پر صحیح اطلاق نہ ہوتا ہو پھر بھی مسلمانوں کے لیے ترکی بڑا سہارا تھی۔ مولانا کو بھی ترکی سے محبت اسی بنا پر تھی۔ اتحاد اسلامی کے اثرات کی وجہ سے بھی ہندوستان کے مسلمان اس جنگ میں ترکی کے ہمدرد تھے۔ مولانا کی عین جوانی تھی۔ جوش اور ہمدردی اپنے شباب پر تھی۔ لہٰذا انھوں نے بڑی تندہی سے ترکی کے لیے چندہ جمع کیا اور ترکی سفیر حسین جیب آفندی مقیم بمبئی کے ذریعے قسطنطنیہ روانہ کیا۔ چندہ جمع کرنے کا ذکر مولانا نے حکیم محمد عمر کے نام ایک فارسی خط میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"یار گرامی مدظلہ السامی

تسلیم، نامہ رسید، دل را رہین دیدہ گردانید، دریں فرصت باادب کار دارم، خود چیزے از ادب می خوانم و دیوان حماسہ بدیگرے می آموزم، درنامہ پیشین از عزم سفر نوشتہ بودم، تعین مقام اکنوں نتواں کرد، لکھنو رفتن آں صاحب رائے صائب است از پیش رفتن می بایست، اکنوں ہم چیزے نہ رفتہ است، چندہ ایں شہر تا بدو ہزار و ششصد رسید۔ امید قوی است کہ از سہ ہزار بیشتر گرد آید۔

مولوی فقیر اللہ صاحب ندانم از چہ رو بامن خاطر گراں دارند از دو ماہ بنامہ ننواختہ اند، سپاس ایزد کہ روسیاں تبہ کار در روز پیکار کہ با عثمان پادشاہ کردہ بودند ہشت ہزار طعمہ، تیغ شدند و بست و چہار ہزار زخمہائے گراں برتن برداشتہ بر بستر خاک طپیدند، نسیم فتح و ظفر بر پرچم علم سلطانی وزید و برادر شاہ روس گرینڈ ڈیوک نکلس از بیم ضربت دلیران ترک از میان رمید۔" (۱۹)

اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

"چند روزیست کہ درانجا طرح مشاعرہ نہادہ بودند غزلے کہ گفتہ آمد اینست:

مطلع:

ناتواں عشق نے آخر کیا ایسا ہم کو
غم اٹھانے کا بھی باقی نہیں یارا ہم کو

مقطع:

قالب جسم میں جاں آگئی گویا شبلی
معجزہ فکر نے اپنی یہ دکھایا ہم کو

غزلے دیگر ہم گفتہ آمد، مگر ایں نامہ مختصر جائے آں ندارد یک شعر ازو اینست ایں غلط گفتہ آمد۔

مطلع:

یوں چشم تر میں قامت جاناں ہے جلوہ گر
جس طرح سے کہ سرو لب آب جو رہے

اس خط کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ۱۸۷۷ء میں ادب سے دلچسپی لے رہے تھے اور ادب کے متعلق ہی پڑھ رہے تھے اور دیوان حماسہ کا جو مولانا فیض الحسن کے فیض سے نشہ چڑھا تھا اس کا خمار اب بھی باقی تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس وقت دیوان حماسہ پڑھتے تھے اور اب پڑھاتے تھے اور اس پڑھائی کی یاد تازہ کرتے تھے۔ سب سے اہم کام جو اس زمانہ میں کیا وہ ترکی کے لیے چندہ جمع کرنا تھا۔ اعظم گڑھ میں اس زمانے میں ادبی ذوق بڑھا ہوا تھا۔ مشاعرے ہوتے تھے اور شرفاء ان مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ مولانا شروع سے ادبی ذوق رکھتے تھے اور مولانا فاروق نے اس ذوق کو جلا بخشی تھی۔ وہ بڑے شوق سے ان مشاعروں میں شرکت کیا کرتے تھے اور ایک خاص دھن میں اشعار پڑھتے تھے۔ یہ بھی مولانا فاروق کا فیض تھا۔ چناں چہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"مولانا فاروق صاحب خود بھی شاعر تھے اور نہ صرف شاعر تھے بلکہ موسیقی کا فن بہت اچھا جانتے تھے۔ مولانا فرماتے تھے کہ مولوی صاحب اکثر رات کے تیسرے پہر اٹھا دیتے اور پوچھتے، شبلی بھیرویں سنو گے؟ پھر گا کر سناتے۔ قومی جلسوں میں مولانا شبلی مرحوم جس پر اثر لے میں اپنے قصیدے پڑھتے تھے، فرماتے تھے کہ وہ بھی استادہی کا فیض تھا۔" (۲۰)

ان دنوں مولانا کا کام فارسی خطوط کا انشاء کرنا بھی تھا، جن کو بڑی محنت سے لکھتے تھے۔ اس زمانے میں مولانا پر نہ کوئی ذمہ داری تھی اور نہ ملازمت وغیرہ کی پابندی۔ فراغت سے بسر ہوتی تھی۔ زمانہ طالب علمی سے مناظرے سے دلچسپی تھے اور مولانا فاروق کی تربیت کی بنا پر متشدد حنفی تھے۔ نعمانی کی مناسبت بھی حنفیت کی بنا پر تھی۔ اتفاق کی بات کہ اعظم گڑھ اور اس کے قرب وجوار میں مقلد اور غیر مقلد کی ایسی بحث چھڑی کہ گاؤں گاؤں بلکہ گھر گھر اسی کا چرچا ہونے لگا مولانا کی ایک تو جوانی پھر اس پر مستزاد یہ کہ کٹر حنفی، اپنے دینی علم اور فن مناظرہ سے مسلح ہو کر میدان میں آگئے۔ یوں تو غیر مقلدوں کے رد میں کئی رسالے لکھے، جن میں سے معلومہ دو ہیں۔ ایک "ظل الغمام فی مسئلۃ القراۃ خلف الامام"، اردو میں ہے اور "اسکات المعتدی" عربی میں ہے۔

ظل الغمام کی طباعت کا سال سید سلیمان ندوی نے ۱۲۹۲ھ لکھا ہے جو مولانا کے سہارن پور اور لاہور کے قیام کا زمانہ ہے۔ مولانا اس سفر سے قبل مناظرہ سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ رسالہ تو سہارن پور اور لاہور کے سفر سے پہلے لکھا مگر طباعت کی نوبت ۱۲۹۲ھ (۲۱) میں آئی، یعنی سہارن پور یا لاہور کے قیام کے زمانے میں کیوں کہ یہ زمانہ مولانا کے وطن سے باہر کا زمانہ تھا۔ ۱۲۹۴ھ (۲۲) میں مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے اس بحث میں شرکت کی اور اپنی معتدل رائے، امام الکلام فی ما یتعلق بالقرأۃ خلف الامام، میں پیش کی۔ ۱۲۹۴ھ مطابق ۱۸۷۷ء مولانا کالج سے واپسی کے بعد کا زمانہ ہے۔ سید سلیمان ندوی و آثار علمیہ ادبیہ، مولانا شبلی مرحوم کی ابتدائی تحریر کا نمونہ کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں: "ان میں سے ایک رسالہ اردو میں ہے اور اس کا نام ظل الغمام فی مسئلۃ القرأۃ خلف الامام ہے۔ اس کا سال تصنیف ۱۲۹۹ھ ہے۔ مشہور قدیم مطبع نظامی کان پور میں چھپا تھا۔ اس وقت مصنف کی عمر ۲۴-۲۵ برس تھی۔" (۲۳) ۱۲۹۹ھ غلط معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ مولوی عبدالحی فرنگی محلی نے اپنے رسالہ ۱۲۹۴ھ میں لکھا تھا۔ ۵ سال کے بعد اس رسالے کا لکھا جانا سمجھ میں نہیں آتا۔ ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۲ء ہوتا ہے۔ مولانا ۱۸۸۲ء میں ملازمت، نیل کی تجارت اور بستی میں وکالت کی الجھنوں میں پھنسے ہوئے تھے، اس لیے ان جھگڑوں کے لیے وقت نکالنا ذرا مشکل ہی تھا۔ مولانا دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> "واضح ہو کہ اس فرقہ نو کا یہ دعویٰ ہے کہ ہم قرآن و حدیث کے پیرو ہیں اور بہ مقابلہ حدیث نبویؐ کسی امام و مجتہد کے قول کو سند نہیں لاتے۔ اس رسالہ میں بہ ضمن مسئلہ قرأتِ فاتحہ خلف الامام دو باتوں کا ثابت کرنا منظور ہے۔ ایک یہ کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب قرآن و حدیث سے صاف صاف ثابت ہے۔ پس غیر مقلدوں کا یہ بیان کہ چونکہ امام صاحب کا مذہب احادیث سے خلاف ہے، اس لیے ہم اس پر عمل نہیں کرتے، بالکل از راہ فریب و مکر ہے۔ دوسرے یہ کہ حضرات غیر مقلدین حدیثوں میں کس قدر کذب و افترا کو کام میں لاتے ہیں اور عوام کو دام فریب میں پھنساتے ہیں اے برادران اسلام اس رسالہ کو خوب غور و فکر سے دیکھو اور جب تمھیں ثابت ہو جائے کہ یہ لوگ حدیثوں کی سند میں فریب اور کذب اختیار کرتے ہیں تو ان سے بیزار ہو جاؤ اور پھر ان کے دام فریب میں نہ آؤ۔" (۲۴)

مولانا کا یہ رسالہ اردو میں ہے۔ زبان میں حرارت ہے اور انداز بیان مناظرانہ ہے۔ راج پوتی خون کا جوش اور جوانی کا ولولہ اور جوش دو آتشہ بن گیا ہے۔

اس زمانے میں مولانا کا مناظرانہ جوش اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ میلوں کا سفر کر کے جاتے تھے اور مناظرہ کرتے تھے اور غیر مقلدین کے رد میں اپنے اور اپنے شاگردوں کے نام سے رسالے لکھتے تھے۔ گویا تقریر اور تحریر دونوں سے غیر مقلدین کے پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ گئے تھے۔ اس وقت کی کیفیت کا نقشہ سید سلیمان ندوی نے بڑا اچھا پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"سنا ہے کہ جب یہ سن پاتے کہ فلاں گاؤں میں کوئی غیر مقلد ہوا ہے یا آیا ہے تو گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں پہنچ جاتے اور مناظرہ کا چیلنج دیتے، مناظرانہ تقریروں کے علاوہ اس راہ میں تحریری خدمت بھی انجام دی۔ اپنے اور اپنے عزیزوں اور شاگردوں کے ناموں سے تحریریں اور رسالے لکھے، جن میں بعض چھپے اور بعض قلمی رہے۔" (۲۵)

رسالہ بازی کا سلسلہ جاری تھا کہ والد صاحب کے کہنے سننے سے مولانا نے وکالت کا امتحان دینے کا ارادہ کیا۔ مولانا کے یہاں وکالت نے خاندانی پیشے کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ مولانا کے والد بڑے کامیاب وکیل تھے اور ننھیال میں مولانا کے ماموں اعظم گڑھ کے مشہور وکیلوں میں تھے۔ اگرچہ مولانا کی طبیعت وکالت کے پیشہ سے مناسبت نہ رکھتی تھی، مگر بے شغلی اور والد صاحب کے دباؤ سے مجبور ہو کر وکالت کی تیاری شروع کی۔ چناں چہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"از تطاول دہر بہ حفظ قانون مشغول ہستم۔" (۲۶)

مولانا نے یہ خط لکھنو سے لکھا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وکالت کا امتحان لکھنو میں ہوتا تھا تو مولانا نے لکھنو ہی میں قیام کر کے وکالت کے امتحان کی تیاری کی۔ آخر کار ۱۸۷۹ء میں وکالت کے امتحان میں شریک ہوئے مگر چوں کہ وکالت مولانا کے جی پر نہ کھُبتی تھی، اس لیے تیاری اچھی نہ کی تھی۔ نتیجہ یہ کہ پرچے اچھے نہ ہوئے۔ فیل ہونے میں بدنامی تھی اس لیے گھبرائے اور اس زمانے کے ایک ممتحن کالون صاحب سے ملے مگر بے سود۔ چناں چہ اپنے منجھلے بھائی مہدی حسن کو لکھتے ہیں:

"وی با کالون صاحب برخوردم از نام و نسب پرسید ہمہ باز گفتم، بہ تعظیم تمام پیش آمد و معذرت خواست کو امسال صحف اردو نگریستن نہ خواہم، دل زدہ بخانہ رسیدم، و از دیوان غیب تطاول خواستم ایں شعر بر آمد،

آنچہ سعیت من اندر طلبت بنمودم
ایں قدر ہست کہ تغییر قضا نتواں کرد

ناامیدی را خیر مقدم گفتم و در پس زانوے حرماں نشستم" (۲۷)

آگے چل کر اسی خط میں لکھتے ہیں:

"عزیزان گویند کہ بغیر از تعلیم انگریزی نخواہی بسر برد، ایں خود چہ حرفست جمعے را بین کہ ہیچ از انگریزی نخواندہ اند و باز بمناصب جلیلہ میرسند آخر در تحصیلداری وغیرہ او خود مشروط نیست۔(۲۸)

اس خط سے متعدد باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ مولانا شبلی پرچوں کی کمزوری کو محسوس کرتے تھے اور فیل ہونے کا امکان تھا جب ہی کالون سے ملے تھے۔ دوسرے یہ کہ اس زمانے میں وکالت کے امتحان میں جوابات اردو اور انگریزی دونوں میں لکھے جاتے تھے، جب ہی کالون نے کہا کہ اردو جواب کی کاپیاں اس سال دیکھنا نہیں چاہیے۔ تیسرے یہ کہ ان دنوں مولانا دیوان حافظ سے فال نکالتے تھے اور اس فال پر بھروسا کرتے تھے، جب ہی اور دل شکستہ ہوئے۔ چوتھے یہ کہ بعض عزیز مولانا سے انگریزی کی اہمیت جتایا کرتے تھے اور مولانا کو احساس کمتری دلاتے تھے اور مولانا اپنی انگریزی سے ناواقفیت کی بنا پر نہ شرماتے تھے اور نہ دل شکستہ ہوتے تھے بلکہ ترقی کے لیے انگریزی سے ناواقفیت کو رکاوٹ نہ سمجھتے تھے۔

آخر کار مولانا ۱۸۷۹ء کے وکالت کے امتحان میں ناکام رہے اور منجھلے بھائی مہدی حسن (۲۹) جو حافظ تھے اور انگریزی پڑھتے تھے وہ بھی امتحان میں بیٹھے تھے، کامیاب ہوگئے۔ اس نتیجہ امتحان سے مولانا کی غیرت کو ٹھیس لگی اور مولانا نے تہیہ کر لیا کہ وکالت کا امتحان پاس کر کے رہیں گے۔ ممکن ہے ذہن میں یہ بھی ہو کہ دیکھیں انگریزی کی ناواقفیت کیسے مانع ہوتی ہے اور کامیابی کیسے نہیں ہوتی۔۔ بہر حال مولانا نے اب جی لگا کر تیاری کی اور بڑی محنت سے نصاب کو پڑھا اور نوٹس وغیرہ تیار کیے اور ۱۸۸۰ء کے وکالت کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔

حواشی:

۱.... نوائے حیات از یحییٰ اعظمی، صفحہ ۲۲، مطبع معارف، اعظم گڑھ ۱۹۵۰ء (طبع دوم)

۲.... "غدر ہندی" سے غالب نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی تاریخ نکالی تھی اور "رستخیز بے جا" سے بھی

۳.... حیات شبلی، صفحہ ۶۸

۴.... معارف، اعظم گڑھ۔ نومبر ۱۹۲۳ء

۵.... الندوہ، لکھنؤ۔ اکتوبر ۱۹۰۹ء، صفحہ ۲، حیات شبلی، صفحہ ۷۰

۶.... مولانا کے والد شیخ حبیب اللہ مرحوم

۷.... حیات شبلی، صفحہ ۱۷ تا ۳۷

۸۔۔۔ مجموعہ، نظم شبلی اردو مع سوانح عمری مرتبہ سید ظہور الحسن۔ جی لینڈ سنس پریس، دہلی۔ ۱۹۱۶ء

۹۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۷۲ و ۷۳

۱۰۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۷۷

۱۱۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۸۰

۱۲۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۸۹

۱۳۔۔۔ ایضاً، صفحہ ۸۷

۱۴۔۔۔ لیکن فصیح اللہ صاحب نے یہی خط نقل کیا ہے اور وہ اس مجموعے میں ہے جو اعظم گڑھ میں محفوظ ہے۔ اس میں ۱۳-اکتوبر ۱۸۸۲ء ہے۔ اس سے پہلے ۱۲۹۹ھ ہے جو صحیح نہیں ہوگا۔ بات یہ ہے کہ اس فارسی خط میں عیسوی سال کے ساتھ ۱۳-اکتوبر بھی ہے لیکن ہجری سال کے ساتھ دن اور مہینہ نہیں ہے اور یہ بات مولانا شبلی کی طبیعت کے خلاف واقع ہوئی ہے۔ یعنی یہ چیز بظاہر ممکن نہیں کہ وہ عیسوی سال کے ساتھ دن اور مہینہ دے دیں اور ہجری سال کے ساتھ دن اور مہینے کو ترک کر دیں۔ چناں چہ میرا خیال ہے کہ نقل کرنے والے بزرگ (محمد فصیح اللہ صاحب) نے تقویم دیکھ کر ہجری سال اپنی طرف سے (مٹی ہوئی جگہ پر) بنا دیا ہے۔ اب رہا عیسوی سال کا معاملہ تو مذکورہ بالا حالات کے تسلسل سے یہ عقدہ کھل جاتا ہے کہ یہ عیسوی سال نقل کرنے میں ۱۸۷۲ء کے بجائے ۱۸۸۲ء ہو گیا ہے۔ اب پوری بات اس طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ۱۳-اکتوبر ۱۸۷۲ء مطابق ہے ۹-شعبان ۱۲۸۹ھ کے۔ چناں چہ تمام حالات اب تسلسل کے ساتھ سامنے آجاتے ہیں کہ غازی پور اور اعظم گڑھ سے ۱۲۸۹ھ / ۱۸۷۲ء میں فارغ ہو کر اسی سال مولانا فیض الحسن صاحب کی خدمت میں وابستہ ہوئے اور لاہور میں قیام کیا۔ وہ مولوی فیض الحسن سہارن پوری سے درس لے رہے تھے کہ اورینٹل کالج، لاہور میں تعطیل ہوئی اور استاد نے اپنے وطن سہارن پور جانے کا ارادہ کیا۔ مولانا نے درس کو جاری رکھنے کے خیال سے خود بھی سہارن پور جانے کا ارادہ کیا۔ چناں چہ اپنے والد کو خط میں لکھتے ہیں، جو مکاتیبِ شبلی، حصہ دوم میں صفحہ ۲۳۶ و ۲۳۷ پر موجود ہے۔

"اعلیٰ حضرت!

آداب۔ بخیریت ہستم و خیریت خواہ مزاج اقدس ؟ نامہ والا رسیدہ کام روائے جان و دل گردید، در قریب روزگارے عریضہ مع گلستان مطبوعہ لندن ارسال خدمت کردہ ام، اگر نہ رسیدہ است از نارسائی بخت است، مراد رایں جرمے نیست۔ در چند روزے مدرسہ اینجا تعطیل خواہد یافت، تعطیل تا دو ماہ خواہد ماند، حضرت استاد بوطن خویش یعنی سہارن پور تشریف خواہند برد، ایں قدر نافہ نتواں کرد، مرا ہم عزم سہارن پور است۔ دیگر ہرانچہ مرضی باشد، طرفہ تماشائے است "عزیزی مہدی می نویسد کہ "جناب مولانا مولوی محمد فاروق صاحب در تعلیم بندہ تساہلی بکار برند" و جناب ممدوح مرا نوشتہ اند کہ "عزیز مذکور را در تحصیل علم التفاتے نیست" خدائے داند ازیں میان حق بجانب کیست ؟ بجناب والدہ عرض آداب، و برادر صاحب و حضرت منشی صاحب تسلیم و بعزیزی محمد اسحق سلام و دعا۔ — محمد شبلی عفی عنہ (لاہور)

۱۵..... حیاتِ شبلی، صفحہ ۹۶

۱۶..... حالی کا ذہنی ارتقاء از ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، صفحہ ۱۰

۱۷..... حاشیہ بر صفحہ ۱۰، حالی کا ذہنی ارتقاء

۱۸..... حیاتِ شبلی، صفحہ ۹۲

۱۹..... مکاتیبِ شبلی، حصہ دوم (فارسی)، صفحہ ۲۴۱ و ۲۴۲

۲۰..... حیاتِ شبلی، صفحہ ۹۸

۲۱..... حیاتِ شبلی، صفحہ ۱۰۱

۲۲..... حیاتِ شبلی، صفحہ ۱۰۳

۲۳..... معارف، اعظم گڑھ، رجب ۳۶ھ نمبر ۱۱، جلد نمبر ۲، مطابق مئی ۱۹۱۸ء

۲۴..... حیاتِ شبلی، صفحہ ۱۰۴

۲۵..... حیاتِ شبلی، صفحہ ۱۰۱

۲۶..... مکاتیبِ شبلی، حصہ دوم (فارسی)، صفحہ .....

۲۷..... مکاتیبِ شبلی، حصہ دوم (فارسی) صفحہ ۲۳۹ و ۲۴۰

۲۸..... مکاتیبِ شبلی حصہ دوم (فارسی)، صفحہ ۲۳۹ و ۲۴۰

۲۹..... "انھوں نے اپنے منجھلے بیٹے کو حافظ بنانے کے بعد اپریل ۱۸۷۶ء میں انگریزی پڑھانا شروع کیا اور ان کو علی گڑھ کالج کے اسکول میں تعلیم کے لیے بھیجا، جہاں وہ ۱۸۸۱ء تک رہے اور اسی سال وہیں سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔" (حیاتِ شبلی، صفحہ ۱۱۸)

۱۸۸۱ء

مولانا نے وکالت کا امتحان پاس کرنے کے بعد اعظم گڑھ میں وکالت شروع کی۔ یہاں وکالت چلنے اور مولانا کی ترقی کے اچھے خاصے مواقع تھے۔ اس لیے کہ والد اور ماموں اعظم گڑھ کے کامیاب وکیلوں میں تھے۔ ان کی نگرانی اور مقدمے کے لیے قانونی تیاری میں مدد مفت حاصل تھی، مگر اس کو کیا کیا جائے کہ مولانا مقدمہ لڑ سکتے تھے مگر مقدمہ بنا نہیں سکتے تھے۔ اس لیے مولانا کو کچھ دنوں کی پریکٹس کے بعد دقتیں پیش آنے لگیں اور طبیعت اچاٹ ہونے لگی۔ آخر وکالت چھوڑنا پڑی۔ وکالت کے زمانہ کا ایک مشہور واقعہ ہے جس سے مولانا کی وکالت میں اپنی دیانت کی وجہ سے ناکامی کا پتا چلتا ہے۔ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

> "مولانا ایک مقدمہ کا عجیب و غریب واقعہ بیان فرماتے تھے۔ کسی ٹھاکر نے اپنی کمسن لڑکی بیاہ دی تھی، داماد جوان ہو کر سسر کو پسند نہ آیا۔ ادھر سے رخصتی کا تقاضا تھا اور ادھر سے شدید انکار تھا۔ ناچار شوہر نے عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ لڑکی کا باپ مولانا کے والد کے پاس آیا۔ وکیل صاحب نے مولانا کو فرمایا کہ تم لکھ دو مولانا نے قصہ پوچھا تو ساری کہانی اس نے کہہ سنائی۔ سن کر فرمایا کہ تم جب خود اقرار کرتے ہو کہ لڑکی اس سے بیاہی جا چکی ہے تو اب کیا ہو سکتا ہے؟ جاؤ لڑکی کو رخصت کرو وہ ہنستا ہوا وکیل صاحب کے پاس آیا۔ وکیل صاحب نے مولانا سے فرمایا کہ بس آپ وکیل بن چکے۔ آخر خود وکالت نامہ لکھا اور مقدمہ کی روداد بنائی۔ مقدمہ لڑا گیا اور جیتا گیا۔"(۱)

جب یہ حالات تھے تو پھر وکالت کتنے دن چل سکتی تھی نہ طبیعت کو مناسبت تھی نہ دیانت اجازت دیتی تھی۔

مولانا انتہا پسند تھے۔ مزاج میں شدت تھی۔ اس لیے مولانا عبدالحی فرنگی محلی کا "**امام الکلام فی مایتعلق بالقرأۃ خلف الامام**" میں اعتدال پسند نہ آیا اور اس کا جواب ۲۴ صفحات کے ایک عربی رسالہ میں لکھا اور اس کا نام "**اسکات المعتدی علی انصاف المقتدی**" رکھا۔ یہ ۱۲۹۸ھ مطابق ۱۸۸۱ء میں شائع ہوا۔ اس کے چھپوانے کا خرچ مولانا کے چچا نے برداشت کیا، جیسا کہ مولانا کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"از عم مکرم شیخ مجیب اللہ عجب دارم، ایشاں صرف طبع اسکات المعتدی بذمہ خود گرفتہ بودند، اکنوں زرباقی از حافظ حسرت صاحب ہم ادا نمی شود، و نسخ اسکات از عقب ہمی رود۔" (۲)

اسکات المعتدی کی ابتدائی عبارت یہ ہے:

" الحمد لله المفيض الوسمى المذلل الآبى المسيل الآذى بسطوته وسلطانه رافع العنان باسط الدجان ساق الظمان فى مواجر الطلب وهمعانه والصلواة على رسوله الهادى صاحب اللهى والاياوى احمس من خضب بنا مور الاعادى ومهج المعادى شفاء القراضب وسنان الهوادى وافضل من امتطاء مسنام اليعال وافتعه غوارب الخوادى وعلى آله واصحابه ولاة الدول كماة الملل هداة السبل ما انهم السوارى وانسكب الفوادى على بقاع العمران وعراص البوادى وبعد فهذا نبذ من الكلام بل بلل لله وام لمن حسام حول تحقيق المقام فى امر القراة خلف الامام حررت يحتمى به تفر خفاء الاسلام فجاء بلطف الله مراحاً لمن حاول المرام وكفاحا لمن بارز الكرم "ابيات" للمولف:

" ويل ذاك الا موعظات و رحمته
و نور هدىٰ للعالمين مسائله
و قدجاء يهدى للتى هى اقوم
و يغنيك عما كنت دهراً تداوله
لعمرک طل منه يشفى عليكم
فكيف اذا ماجاء للناس واجله

چوں کہ مولانا نے یہ رسالہ مولوی عبدالحی فرنگی محلی کے رسالہ کے رد میں لکھا تھا اس لیے مولوی فرنگی محلی کے بعض شاگردوں نے اس کا جواب دیا۔ جواب دینے والوں میں مولانا نور محمد صاحب ملتانی پیش پیش تھے۔ بعض مشہور رسالے یہ ہیں: تذکرۃ المنتہی فی رد اسکات المعتدی، الافادات فی رد الاسکات، التنبیہات علیٰ ہفوات الاسکات، یہ تینوں رسالے مولانا نور محمد ملتانی کے

ہیں اور الایضاحات الی اغلاط مصنف الاسکات از حافظ ملا شعیب حنفی کابلی باجوری۔

لیکن قابل تعریف تھے مولانا عبدالحی فرنگی محلی کہ انھوں نے جب اپنا رسالہ "امام الکلام" دوبارہ شائع کیا تو غیث الغمام کے نام سے اس میں حاشیہ لگایا اور مولانا سے تعرض کیے بغیر تمام اعتراضات کا جواب دیا۔ اگرچہ مولانا نے اپنے رسالہ میں مولوی عبدالحی فرنگی محلی کے نام کی بین السطور میں صراحت کی تھی۔ اس سے دونوں کی طبیعت اور مزاجی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مولانا فرنگی محلی میں متانت و سنجیدگی تھی اور مولانا شبلی میں جوش و وارفتگی۔

مولانا کے اس رسالہ کی قدر پاک و ہند میں تو ہوئی ہو گی مگر یہ منزلیں مارتا ہوا عرب ممالک میں پہنچا اور وہاں اہل زبان نے قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ مولانا "سفرنامہ، روم و مصر و شام" میں لکھتے ہیں:

> "ایک دن شیخ علی طبیان جن کے والد ایک مشہور صوفی ہیں، شیخ عبدالفتاح سے ملنے آئے۔ میں بھی اس وقت موجود تھا اور اتفاق سے رسالہ اسکات المعتدی جو میری قدیم تصنیف ہے اور عربی زبان میں ہے، سامنے رکھا ہوا تھا۔ انھوں نے اٹھا کر دیکھا اور کہا کہ یہ رسالہ مدت ہوئی میں نے دمشق میں اپنے شیخ کے پاس دیکھا تھا تو انھوں نے اس کے مصنف کی نسبت کہا تھا۔ شکر اللہ مساعیہ۔ شیخ علی طبیان کو جب معلوم ہوا کہ وہ رسالہ میری ہی تصنیف ہے تو اٹھ کر بڑی گرم جوشی سے ملے اور نہایت لطف اور مہربانی سے پیش آئے۔" (۴)

اس واقعہ سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں، ایک یہ کہ مولانا کو اس زمانہ میں عربی پر خاصا عبور ہو چکا تھا اور طریقہ۔ استدلال اور انداز بیان پر کشش تھا۔ دوسرے یہ کہ پاک و ہند ہی میں مناظرہ کی وبا نہیں پھیلی ہوئی تھی، بلکہ یہ وبا مسلمان ملکوں میں بھی تھی اور جب ہی اس قسم کے رسالے قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

مولانا نے اسی زمانہ میں علی گڑھ کا سفر کیا۔ یہ مبارک سفر مولانا کے لیے بام عروج تک پہنچنے کا زینہ ثابت ہوا۔ سفر کی تحریک اس طرح ہوئی کہ مولانا کے منجھلے بھائی مسٹر مہدی حسن علی گڑھ کالج میں پڑھتے تھے۔ مولانا کے والد ان سے ملنے گئے تو مولانا شبلی کو بھی ساتھ لیتے گئے۔ مولانا کے والد سے اور سرسید سے سرسید کے غازی پور کے قیام کے دوران تعلقات ہو گئے تھے، اس لیے مولانا سرسید اور ان کی قومی خدمات سے واقف تھے۔ لہٰذا اسی تعلق کی بنا پر مولانا نے سرسید کی تعریف میں ایک عربی قصیدہ کہا اور علی گڑھ میں سرسید کی خدمت میں پیش کیا۔ چوں کہ مولانا کا

اس زمانہ میں ایک مشغلہ شعر و شاعری بھی تھا اس لیے اردو، فارسی اور عربی میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ مولانا نے عربی میں قصیدہ کہنا پسند کیا اور مولانا کی شاعری میں صرف یہی ایک عربی قصیدہ دستیاب ہوتا ہے۔ مطلع یہ ہے:

"المجد يصحب علما حيثما يصل
والعلم عن قومنا لازال يرتحل" (۴)

چوں کہ قوم کے بعض افراد نے سرسید کی مخالفت کی تھی اس لیے مولانا نے ایک شعر میں سرسید کی مصلحانہ کوششوں کے بدلہ میں قیامت میں خدا سے صلہ ملنے کی بشارت دی۔ فرماتے ہیں:

فمن سعى اليوم فى اصلاح حالهم
فالله جازيه يوما يقطع الامل

پھر سرسید کی اس طرح تعریف کرتے ہیں:

ان كنت تسئلنى من هذا صفته
قلت الامام الهمام السيد البطل
هوالذى فاق فى الآفاق منزلة
ونال مالم تنله الاعصر الاول

اس کے بعد سرسید کی ہمت افزائی ان اشعار میں کی ہے۔ لکھتے ہیں:

ياخير من سيط حب القوم من دمه
احسن ولاتبتئس من سوء ماعملوا
احسن اليهم ولوجازوک سيئة
ولاتبال بماقالوا وما فعلوا (۵)

اس قصیدہ میں حیاتِ شبلی میں ایک شعر کم چھپا ہے جو یہ ہے:

بنى له المجد بنياً لاتغيره
غوائل الدهر حتى ياته الاجل (۶)

اس قصیدے کو سرسید نے مولوی شبلی کی قابلیت کے اعتراف کے ساتھ شائع کیا اور لکھا:

"جناب مولوی شبلی صاحب نعمانی رئیس ضلع اعظم گڑھ"

چند روز ہوئے کہ ہمارے مدرسۃ العلوم میں جناب مولوی حبیب اللہ صاحب مع اپنے فرزند ارجمند ادیب ذوالمجد والفضل جناب مولوی شبلی صاحب کے تشریف لائے تھے اور چند روز احاطہ مدرسۃ العلوم میں مقیم رہے - ان کے دوسرے فرزند سعید مہدی حسن صاحب مدرسۃ العلوم میں پڑھتے ہیں اور بالفعل انٹرنس کلاس میں شامل ہیں ہم کو نہایت خوشی ہے کہ دونوں باپ بیٹوں نے ہمارے مدرسۃ العلوم کو اور طریق معاشرت طلباء کو حد سے زیادہ پسند فرمایا اور جناب مولوی شبلی صاحب نے کہ علم و ادب میں نہایت ید طولیٰ رکھتے ہیں اور ہمارے مخدوم و مکرم وحید العصر جناب مولانا مولوی فیض الحسن صاحب سہارن پوری کے شاگرد رشید ہیں اور فرط عنایت سے چند اشعار عربی بروقت ملاقات سیکرٹری کمیٹی مدرسۃ العلوم کو عنایت کیے جن کو ہم بجنسہ اس مقام پر چھاپتے ہیں اور جن سے ہمارے مدرسۃ العلوم کی قدر و منزلت اور مصنف کے اعلیٰ درجہ کا تبحر علم و ادب میں ثابت ہوتا ہے۔" (۷)

مولوی محمد عمر صاحب دیناپارہ ضلع اعظم گڑھ کے باشندے اور مولانا کے شاگرد تھے۔ انھوں نے کسی ضرورت سے غازی پور جانے کا ارادہ کیا اور مولانا سے مشورہ کیا تو مولانا نے لکھا کہ غازی پور اچھی جگہ ہے اور وہاں فائدے کی امید ہے۔ مولانا کے ایک اور پرانے شاگرد اور عزیز مولوی سمیع تھے۔ مولانا ان سے بہت محبت کرتے تھے (یہ بعد کو جونپور کی ججی میں محافظ دفتر ہوئے) پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا، لہذا مولوی محمد عمر نے مولانا سے دریافت کیا کہ کیا مولوی سمیع، الٰہی شاہ (۸) کی دامادی قبول کریں گے۔ مولانا نے اس رشتہ پر اپنی خوشی کا اظہار کیا اور مولوی سمیع کی خوش بختی بتلائی اور وجہ یہ بتلائی کہ اس سے بہتر کیا بات ہو سکتی ہے کہ پہلی بیوی مرجائے اور دوسری اس سے بہتر ملے۔ مولانا نے یہ بھی لکھا کہ چوں کہ یہ نیک کام ہے لہذا دیر کرنے کی ضرورت نہیں۔" (۹)

مولانا اسی زمانے میں بستی گئے مگر وہاں بھی درس و تدریس کا مشغلہ رہا اور نایاب کتابوں کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ ظہیر فاریابی کے دیوان کو طلب کیا تھا، لہذا اس کا تقاضہ کیا۔ اگرچہ بستی، اعظم گڑھ سے دور نہیں تھا، مگر مولانا کو شاگردوں، دوستوں اور عزیزوں سے دوری شاق

گزر رہی تھی۔(۱۰)

اس زمانے میں مولانا کے خطوط فارسی انشاء کے نمونے ہوتے تھے لیکن اس مشغلہ کے علاوہ عربی خطوط لکھنے کا بھی مشغلہ تھا۔ مولانا کے یہ خط علمائے عرب کے نام ہوتے تھے، اس لیے اتنی مدت گزر جانے کے بعد غیر ممالک سے ان کا حاصل کرنا ناممکن ہے۔ معلومہ خطوط میں سے ایک قدیم خط یہ ہے۔ خط سے مکتوب الیہ کا پتہ نہ چل سکا۔

"سلام علیکم

هذا ديوان الصبابة يصل اليكم, واما انى فلايمكننى حضور نديكم, لالانى اشتغلت بامور غير طائلة او قعدت ممتى, وصرفت عنان العناية الى الدنيا الدنيد وبرئت من تحصيل كمال العلم والادب ذمتى, فانى بحمد الله خلقت وكسب الفضل سيط من دمى فهولا يفارقنى انشاء الله فى حالتى وجودى وعدمى, بل لانى لملازمتى هذه العهدة الرذيلة ادوم اتفكر فى حالتى, فيزيدمعى وتزداد ملالتى, وبيدكم الانصاف, ماهذا الالجور والاعتسان, فصبر جميل وهو حسبى ونعم الوكيل۔" (۱۱)

حواشی:

۱۔۔۔ المعارف نمبر ۲، جلد ۱، صفحہ ۲۰
۲۔۔۔ مکاتیبِ شبلی حصہ دوم (فارسی)، مولوی سمیع کے نام، صفحہ ۲۵۳
۳۔۔۔ سفرنامہ روم و مصر و شام۔ مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۴۰ء، صفحہ ۳۳-۳۴
۴، ۵۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۱۱۸ تا ۱۲۰
۶۔۔۔ یہ قصیدے کا پندرھواں شعر ہے۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، علی گڑھ۔ مورخہ ۱۵-اکتوبر، ۱۸۸۱ء، جلد ۱۶، نمبر ۸۲، صفحہ ۱۱۷۶
۷۔۔۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، علی گڑھ۔ مورخہ ۱۵-اکتوبر ۱۸۸۱ء، جلد ۱۶، نمبر ۸۲، صفحہ ۱۱۷۵
۸۔۔۔ الہٰی شاہ ساکن سرہد ضلع جون پور مولانا کے والد شیخ حبیب اللہ کے پیر تھے۔ (حیاتِ شبلی، صفحہ ۶۴)
۹۔۔۔ مکاتیبِ شبلی، حصہ دوم، صفحہ ۲۳۶
۱۰۔۔۔ مکاتیب شبلی، دوم، صفحہ ۲۳۶-۲۳۷
۱۱۔۔۔ مکاتیبِ شبلی، حصہ دوم، صفحہ ۲۶۱

۱۸۸۲ء

وکالت سے مولانا بیزار تھے ہی مگر مولانا کی بیزاری سے ان کے والد بھی تنگ تھے۔ آخر مولانا کو عدالت کلکٹری میں قائم مقام نقل نویس کی ملازمت دلا دی گئی۔ دس روپے کی اس ملازمت میں زمینداری کی شان باقی تھی یعنی نو روپے ماہوار سواری کے کرایہ کی نذر ہو جاتے تھے۔ اسی زمانے میں قرق امینی کی عارضی جگہ خالی ہوئی تو اس کی قرق امینی کی بھی قائم مقامی کی۔ قرق امینی میں اگرچہ بڑی محنت کرنا پڑی مگر مولانا نے امانت کے کام کو بڑی ہمت سے کیا۔ خود مولانا اس زمانے کی پریشانی اور محنت کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

"غریب تر حالیست منکہ از آشفتہ سری و شوریدہ مزاجی تن بآمیزش کس نمی دادم اکنوں از فرخی طالع وہمایونی بخت کارم بخار و خس افتادہ است، مگر من وخدائے من کہ ایں ہمہ محنت پژوہی ونفس گدازی از آں دوست تر دارم کہ تہاتی چند درہم بافند و دروغ راست مانا را پیش کسان جلوہ ظہور و فروغ قبول دہند (۱)، نفسے چند کہ از پیش گاہ ایزد دانا ودیعت آوردہ ایم، سزائے آنست کہ سررشتہ اش بایں چنیں کارہا بند باشد۔ دیگراں ندانم تا در سرچہ دارند من خود دریں خیال از کشمکش وآویزش فکر فارغ نشستہ ام کہ با ایں ہمہ خواہیماں شیلی ام کہ بودہ ام واگر گاہے بختم یاوری کرد، ہماں خواہم بود کہ ہستم ماہے دو دو کار امانت، روز از شب نشناختم و در راہ طلب از غلت جد و جہد تاب وتواں درباختم وہر چند کہ دریں راہ پر خطر دو اسپہ تاختم و در آنجا ایں کار ہر کس وناکس ساختم، مگر با ایں ہمہ بجائے نہ رسیدم و خواست وناخواست پائے ارادت در دامن قناعت کشیدم، فرمان تقررہم بمن ندادند تا بہ سند کارگذاری چہ رسید، استغفر اللہ سخن از کجا تا کجا کشید، خیرہ سری از جادہ شکیبائیم برکران برد" (۲)۔

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا اس وقت امانت کی ملازمت چھوڑ چکے تھے اور کل دو ماہ یہ ملازمت کی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ۱۸۸۲ء کی پہلی شش ماہی میں یہ ملازمت اختیار کی تھی اور دو ماہ متواتر کام کرنے کے باوجود تقرری کا پروانہ نہ ملا تھا۔ یہ خط ۲۵۔ اگست کو لکھا گیا ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ مولانا حالی بھی کلکٹر کے دفتر میں معمولی ملازمت پر رہے تھے۔ چناں چہ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان لکھتے ہیں:

"یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ۱۸۵۷ء والے عالم آشوب "رستخیز بے جا" (۳) کو

ابھی ایک سال باقی تھا اور مولانا کوئی برس ڈیڑھ (دہلی سے واپسی پر) پانی پت میں رہ چکے تھے اور ضلع حصار میں کلکٹر کے دفتر میں ایک اسامی (۴) پر مقرر تھے۔" (۵)

مولانا اس ملازمت سے بھی جلد اکتا گئے اور ملازمت ترک کر دی آخر مولانا کے والد نے نیل سازی کے کام کی نگرانی میں مولانا کو لگایا۔ چوں کہ یو۔پی کے مشرقی اضلاع میں نیل بکثرت پیدا ہوتا تھا اور اس کو جمع کر کے بستی سے باہر کھیتوں کے قریب گودام میں جمع کر لیا جاتا تھا جس کو کوٹھی کہتے تھے۔ اس کوٹھی میں بڑے بڑے حوض ہوتے تھے۔ اس میں نیل کے ڈنٹھل بھگوئے جاتے تھے، پھر ان کو جوش دیا جاتا تھا اور اس کے بعد ڈنٹھلوں کو نچوڑ کر الگ کر دیا جاتا تھا اور نچوڑے ہوئے پانی کو اڑا کر مادہ کو خشک کیا جاتا تھا۔ وہی مادہ نیل ہوتا تھا۔ یہ نیل رنگنے کے کام میں آتا تھا۔ جرمنی کے مصنوعی اور سستے رنگ نے اس صنعت کو تباہ کر دیا۔ مولانا کے والد صاحب نیل کا کاروبار کرتے تھے اور اس کی تجارت سے بڑا فائدہ تھا۔ بندول کی بستی کے باہر، کھیتوں سے متصل (۶) اب بھی نیل کی کوٹھی موجود ہے اور عبرت کا مرقع پیش کر رہی ہے۔

بہرحال مولانا نے یہ درد سری بھی مول لی۔ مگر شاعر، نثر نگار اور درس و تدریس کے شائق سے یہ کب نبھ سکتی تھی۔ اس زمانے میں اپنی حالت کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

"پارہ از رد تذکرہ بر زبان قلم آمدہ بود کہ ہمدریں میان مارا بکار امانت گماشتند و از ہجوم کار و تراکم افکار کرے سخ کردن نتوانستم۔

وچو از ایں کشمکش فارغ نشستم دیگر روئے داد یعنی کارم بہ گودام و متعلقات او افتاد و ہرچند آں چناں کارے سزائے ایں ہیچکارہ نہ بود مگر مرا از امتثال امر حضرت قبلہ گاہی چارہ نبود، اکنونکہ ازیں ہرزہ گردیہا ستوہ آمدہ خودرا ایں جار سانیدہ ام، انشاء اللہ دراندک زمانہ از عہدہ رد تذکرہ بدرمی آیم، مردمان گویند کہ ایاحات دو رسالہ دیگر ہم از حافظ صاحب است، تاحال بر علم و استعداد حافظ صاحب اعتمادے داشتم اکنوں آں ہم برخاست، انشاء اللہ در قریب وقتے بہ غازی پوری رسم و دریں اغلاط و پالغزہائے مصنف تذکرہ و ایاحات ہمہ باز خواہم گفت، دریں سفر جناب حافظ حبیب اللہ خاں صاحب و عزیزی مولوی محمد سمیع ہمراہ من خواہند بود، معلوم نیست کہ قصیدہ بمولوی عبدالاحد شمشاد سپردی یا چوں نام من اورا ہم از یاد بردی۔" (۷)

اس خط سے کئی باتیں معلوم ہوتی ہیں وہ یہ کہ مولانا اس زمانے میں بھی مولانا سلامت صاحب جیراج پوری (اسلم جیراج پوری کے والد) کے رسالوں کے رد میں اور حنفیت کی تائید میں

رسالہ بازی کر رہے تھے۔ البتہ مصروفیت کبھی کبھی مانع ہوتی تھی جیسا کہ اس خط میں اظہار کیا گیا ہے۔ اس وقت بھی تذکرہ اور ایماضات کے رد کے لیے پر تول رہے تھے۔ دوسرے یہ کہ وکالت کے جھنجھٹ سے نجات ملی تھی تو گودام وغیرہ کے کام کی مصیبت آپڑی تھی۔ بہرحال والد کے حکم کا پاس تو کرنا ہی تھا۔ تیسرے یہ کہ اس سب کے باوجود شعر و شاعری سے دلچسپی اپنی جگہ پر قائم تھی اور شمشاد لکھنوی (۸) جیسے فرنگی محلی عالم اور مشہور شاعر سے تعلقات تھے اور ان کو اپنا کلام بھیجتے اور ان کا کلام منگواتے تھے۔ شمشاد لکھنوی مولانا کے استاد بھائی بھی تھے۔ یعنی مولانا فاروق چریاکوٹی کے شاگرد تھے۔ مولانا کا اکتوبر ہی میں غازی پور جانے کا خیال تھا۔

ستمبر کے آخر اور اکتوبر کے شروع میں قاضی محمد سلیم صاحب بیمار ہوئے تو مولانا عیادت کو گئے۔ قاضی صاحب نے اپنا خواب بیان کیا کہ مولانا نے ان کی شان میں چند اشعار کہے ہیں۔ مولانا کے ذہن میں دوسرے دن ایک دم سے تاریخ وفات آگئی۔ اس وقت ان کا خواب یاد نہ تھا۔ دوسرے دن یاد آیا۔ چوں کہ یہ فال بد تھا اس لیے مولانا نے اس کا کسی سے اظہار نہ کیا، لیکن قاضی صاحب کے انتقال کے بعد خواب کی سچائی پر مولانا کو حیرت ہوئی اور اس کو مابعد الطبیعات سے متعلق کہا۔ وہ شعر یہ تھا:

چوں خواستم زپیر خرد سال مرگ او
از روئے درد گفت کہ " قاضی سلیم مرد " (۹)

مولانا، مولوی محمد سمیع کے ساتھ پھریہا (۱۰) تشریف لے گئے تھے۔ اس زمانے میں کسی زمین کا تنازعہ تھا جس کو مولانا طے کرنا چاہتے تھے۔ دعویدار کا کہنا تھا کہ اگر زمین اس کی ملکیت نہ ہو تو وہ دستبردار ہو جائے گا۔ مولانا جائے وقوعہ پر جاکر اور معلومات حاصل کر کے فیصلہ کرنا چاہتے تھے (۱۱)۔

اسی زمانے میں مولانا غازی پور تشریف لے گئے۔ مولوی محمد عمر کو وہیں بلایا۔ زیادہ قیام کا چوں کہ ارادہ نہ تھا اس لیے ان کو جلد بلایا (۱۲)۔

مولوی محمد عمر کو خیال ہوا کہ غازی پور سے واپسی میں مولانا جون پور ٹھہرے اور ملے نہیں۔ انھوں نے شکایت لکھی۔ مولانا نے جواب دیا کہ وہ جون پور نہیں ٹھہرے۔ اگر ٹھہرتے تو ضرور ملتے اور کیوں نہیں ٹھہرے، اس کے لیے معافی خواہ۔ مدرسہ عربی جون پور میں مولوی لطف الرحمن کے مدرس کی حیثیت سے تقرر پر چیں بجبیں ہوئے۔ کیوں کہ درس کے معاملے میں

مفتی محمد یوسف صاحب کو ان سے بہتر جانتے تھے۔ مولانا نے عبدالعزیز اور محمد (۱۳) کی الہ آباد سے واپسی دریافت کی (۱۴)۔

مولوی سمیع کو عبدالغفار کے انتقال کی خبر لکھی اور چاہا کہ وہ تعزیت کی غرض سے آجائیں اصل میں ملاقات مقصود تھی اور ان کے آنے سے تسلی ہوتی۔ مولانا کے چچا شیخ عجیب اللہ صاحب کو بخار آگیا اور اعضاء میں درد ہو گیا (۱۵)۔ اسی زمانے میں اعظم گڑھ میں ایک انگریز تھا، جس نے مولانا کے والد سے خواہش کی کہ اس کی انگریزی نظم کا ترجمہ اردو نظم میں کر دیا جائے۔ وہ نظم افغانستان کی جنگ سے متعلق تھی۔ مولانا اس کا اردو ترجمہ سن لیتے اور نظم کرتے جاتے۔ نظم کے چند اشعار یہ ہیں:

لو سنو تیغ و سناں کی داستاں　　رایت وطبل ونشاں کی داستاں
پہلو انان جہاں کی داستاں　　شاہ کے اعزاز و شاں کی داستاں
حکمران بحر و کاں کی فتح ہے
قیصر ہندوستاں کی فتح ہے
والی کابل نے کی جب سرکشی　　ملک میں اپنے سفارت منع کی
غیر سے ڈالا تھا طرح آشتی　　ہو چلا تھا کچھ خیال خود سری
روس پر تھا جو گمان اختیار　　ہاتھ سے چھوٹی عنان اختیار (۱۶)

یہ پوری نظم گویا محاربہ کابل و قندھار کی داستان ہے جو اس انگریز افسر نے اپنے ذاتی مشاہدے کی بنا پر انگریزی میں نظم کی تھی۔ مولانا نے غزلوں (اردو اور فارسی) میں خاصی مشق بہم پہنچائی تھی۔ مگر نظم جس بے ساختگی اور استادی سے لکھی ہے وہ ان کے اس فن میں پوری مہارت رکھنے کی دلیل ہے۔ شروع ایسی بے ساختگی سے کی ہے کہ سنتے ہی کان کھڑے ہوتے ہیں اور پوری توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتی ہے، لو سنو تیغ و سناں کی داستاں، گویا جان ہے پوری نظم کی اور روح ہے مولانا کی فنی مہارت کی۔

اب ۱۸۸۲ء کے آخری ماہ تھے اور مولانا الجھنوں کا شکار تھے کہ مولوی محمد کامل صاحب ولید پوری منصف بستی، اعظم گڑھ تشریف لائے۔ مولانا ملازمت، نیل کے کام اور وکالت سے بیزار ہو چکے تھے۔ لہٰذا انھوں نے مولانا کے والد صاحب سے تعلقات کی بناء پر ان کو سمجھایا، دلاسا دیا اور پھر وکالت کے لیے آمادہ کیا اور اپنے ساتھ بستی لے جانا چاہا۔ مولانا نے غنیمت جانا اور مولانا

کے والد نے بھی اپنی دیرینہ آرزو (۱۷) کو پورا ہوتا دیکھ کر جانے کی اجازت دے دی (۱۸) ۔ مولانا بستی گئے اور چند ماہ وکالت کی ۔ پھر وکالت کو ایسا خیرباد کہا کہ مرتے دم تک اس کا نام نہ لیا۔

اسی زمانے میں مولانا کا سرسید کی شان میں کہا ہوا عربی قصیدہ رنگ لایا۔ علی گڑھ کالج میں عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر کی جگہ خالی ہوئی ۔ مولانا کی سفارش خود ان کا قصیدہ تھا، جو درخواست سے پہلے ہی مولانا کے لیے جگہ بنا چکا تھا ۔ اس پر مولانا فیض الحسن سہارن پوری کی تصدیق و توثیق مستزاد، درخواست بھیجی اور خود بھی وکالت سے جان چھڑا لکھنو ہوتے ہوئے علی گڑھ پہنچ گئے ۔ علی گڑھ میں ڈپٹی محمد کریم صاحب (۱۹) کے یہاں قیام کیا اور انھیں کی وساطت سے مولوی سمیع اللہ خاں (۲۰) سے ملے جو سرسید کے دست راست تھے ۔ مولوی صاحب نے عربی و فارسی کے لیے مولانا کا انتخاب کیا اور سرسید سے بھی ملایا۔ ملاقات کی تجدید ہوئی اور قصیدہ کی یاد تازہ ہو گئی ۔ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"بہرحال دونوں (۲۱) کی پسند سے مولانا کا تقرر اسسٹنٹ عربک پروفیسر کے عہدہ پر ۱۸۸۲ء کی کسی آخری تاریخ میں چالیس روپے ماہوار پر ہو گیا" (۲۲)۔

چو غالب رہا شد زبند ملال   خدیو سخن شد عزیز از کمال
سخن یافت چوں از عزیز احترام   ملک گشت شبلی بملک کلام (۲۳)

مولانا کے علمی کمالات میں چوں کہ فارسی اور اردو شاعری بھی داخل ہے ۔ اس لیے اس کا بیان ناگریز ہے ۔ مولانا کا ذوق شاعری فطری تھا، مگر اس میں فنی اور ادبی محاسن پیدا کرنے کے لیے تعلیم و تربیت کی ضرورت تھی جو خوش قسمتی سے ان کو مولانا فاروق اور مولانا فیض الحسن جیسے سخن فہم، نکتہ سنج اور صاحب ذوق شعراء سے حاصل ہوئی ۔ ان کے فطری ذوق کے متعلق محبوب الرحمن کلیم لکھتے ہیں:

"علامہ شبلی مرحوم کے حصے میں یہ دولت ازل ہی سے آئی تھی ۔ مذاق شاعری ان کے ضمیر میں تھا اور لذت چاشنی، سخن ان کے رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی ۔ اسی وجہ سے جب تک زندگی کے انفاس باقی تھے وہ لیلائے سخن کے دلدادہ و جاں نثار رہے اور جب تک دم میں دم رہا سخن کا خمار ان کے سر سے نہ اترا۔" (۲۴)

کثرت مطالعہ اور اعلیٰ درجہ کے شعراء کے دواوین کی ورق گردانی نے اس ذوق کو اور جلا بخشی ۔ اعظم گڑھ کے مشاعروں نے سمند شوق کو مہمیز کیا اور مولانا کچھ نہ کچھ موزوں کرنے لگے ۔ مولانا کی ابتدائی اردو شاعری کے متعلق قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی لکھتے ہیں:

"ابتدا میں مولانا فارسی میں مشق سخن کیا کرتے تھے لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں اردو شاعری نے انھیں اپنی طرف متوجہ کر لیا...... ان کے ابتدائی زمانہ کا اردو کلام چند غزلیات کے سوا ہمارے پاس موجود نہیں - یا وہ چند اشعار جو ان کے مکاتیب میں خود انھوں نے نقل کیے ہیں - مولانا کی غزلیات میں کوئی خاص بات ہم کو نظر نہیں آتی - خصوصاً ان کے معاصر شعراء کے کلام کے مقابلہ میں ان کی یہ غزلیں کچھ زیادہ قابل وقعت نہیں سمجھی جاسکتیں، اگرچہ خود ان کا یہ دعویٰ ہے کہ:

یہ نظم آئیں یہ طرز بندش سخنوری ہے فسوں گری ہے
کہ ریختہ میں بھی تیرے شبلی مزہ ہے طرز علی حزیں کا

یہ دعویٰ فارسی میں تو ہر ایک کو مسلم ہے، لیکن اردو میں قابل تسلیم نہیں ہو سکتا- ہاں بقول ان کے صرف اسی قدر کہا جاسکتا ہے کہ:

یاد رکھنا دوستو اس بزم میں آ کے شبلی بھی غزل خواں رہ گیا (۲۵)

مولانا کی شاعری کا پہلا دور ابتدا سے ۱۸۸۲ء تک ہے، یعنی علی گڑھ میں پروفیسر مقرر ہونے سے پہلے کی مدت - یہ مولانا کے بچپن اور نوجوانی کا دور تھا - ان کی شاعری کے متعلق بچپن کے دو واقعے بہت مشہور ہیں - ایک واقعے کے متعلق سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"مولانا شبلی مرحوم بچپن سے شاعر تھے، ان کے بچپن کے ایک استاد کہتے تھے کہ جب مولانا شبلی بچے تھے اور چھوٹی چھوٹی کتابیں پڑھتے تھے اور ان کو اوڑھنے کی ایک چادر کی ضرورت ہوئی ان کے باپ اعظم گڑھ کے نامور وکیل تھے - تو بیٹے نے باپ سے زبانی کہنے کے بجائے یہ شعر کاغذ پر لکھ کر دیا-

پدر جس کا یوں صاحب تاج ہو پسر اس کا چادر کو محتاج ہو (۲۶)

دوسرا واقعہ سید سلیمان ندوی اس طرح لکھتے ہیں:

"ان کے عربی اور فارسی کے استاد مولانا فاروق صاحب چریاکوٹی تھے، شاگرد ایک دفعہ ننگے سر بیٹھا تھا استاد نے آکر پیچھے سے سر پر ایک ہلکی سی چپت لگائی اور خوش طبعی سے فرمایا:

سر یہ خلائق گو چپت کا ہے

شاگرد نے فوراً جواب دیا:

جتنے ہیں سر ان پہ ہے فائق یہ سر (۲۷)

مولانا کی نوجوانی کا زمانہ شاعرانہ ماحول میں گزرا - اعظم گڑھ میں شعر و سخن کا چرچا تھا - پڑھے لکھے آدمیوں کو شاعری سے دلچسپی تھی، مشاعروں کی دھوم تھی - لہذا اس ماحول سے متاثر ہونا

لازمی تھا۔ چناں چہ سید سلیمان ندوی مولانا کی مشاعروں سے دلچسپی کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

"مولانا بھی اپنے وطن اعظم گڑھ میں اسی قسم کی مجلسیں کرتے تھے۔ غزلیں پڑھی جاتی تھیں، واہ واہ ہوتی تھی، سبحان اللہ اور جزاک اللہ کے نعرے بلند ہوتے تھے۔" (۲۸)

مولانا نے شروع میں اپنا تخلص تسنیم رکھا تھا مگر بعد کو شبلی کر لیا۔ مولانا کی فارسی نعت جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارک کے سامنے پڑھی تھی وہ قدیم ترین ہے۔ اس کا ذکر آچکا ہے۔ ابتدائی اشعار جن میں تسنیم تخلص اختیار کیا ہے، چند ہی ملتے ہیں:

یوں تو .... سارے جہاں میں زور ہے
بار فرقت جو اٹھائے اس جواں میں زور ہے (۲۹)
ضعف میں بھی یہ مرے تیر فغاں میں زور ہے
روک لے اس کو کہاں یہ آسماں میں زور ہے
نیست تھی اس کی کمر پر تو نے ثابت کر دیا
واہ وا تسنیم کیا ترے بیاں میں زور ہے۔ (۳۰)

ایک فارسی غزل اس طرح ہے:

"نگاہے برمن مسکیں خدارا — کہ گاہے شاہ بنوازد گدارا
فغاں کز ہجر تاب و صبر و آرام — نمت نگذاشت در دل ہیچ جارا
نہ یاد آری گہے از خستہ خویش — فرامش ساختی حرف و فارا
سخن را رہ نباشد در دہانت — زتنگی ہچو در غنچہ صبارا
کجا در بارگاہ بش بار بخشند — چو تسنیم غریب بے نوارا (۳۱)

اسی دور کی ایک فارسی نعت بھی ہے جس کے چند اشعار یہ ہیں:

یا سائلی عن ذی الخبر، رحمے کہ امروزم دگر
از دیدہ شد خون جگر دز و دو آہ بی اثر
آید جہانم در نظر از بخت خود ہم تیرہ تر
تاکی تواں کردن بسر، آتش زدہ در جان وتن
آہ از جفای چرخ دوں، فریاد از بخت زبوں
کز جور ایشانم کنوں، از دیدہ ریزو سیل خوں

شبہا دریں جوش جنوں درباختہ صبر و سکوں
چوں شمع باسوز دروں ، گریم بحال خویشتن

آخری اشعار یہ ہیں:

شاہا مرا بنگر کہ چوں ، از دست ایں چرخ حروں
شد دیدہ و دل جملہ خوں ، ہر لحظہ در جوش جنوں
چوں غم بود از حد فزوں از خویش می آیم بروں
رحمے بحالم تاکنوں ، آسایم از رنج و محن
مسکیں نوازا آدادگر جز تو ندانم کس دگر
بیچارہ گاں را چارہ گر ہے شبلی شوریدہ سر
بینالد از درد جگر ، برحال زارش کن نظر
انقذہ یاخیر البشر من کل غم والحزن (۳۲)

بیان واقعی کے عنوان کے تحت چند اشعار اردو میں اس طرح ہیں:

بگڑا ہے زمانہ کہ بنا کام بروں کا
آغاز سے بدتر ہوا انجام بروں کا
ہے سارے زمانہ میں بس اب نام بروں کا
پھیلا ہے جدھر دیکھیے بس دام بروں ہے
جگنو تھے جو شبلی ہر انور ہوئے اب تو
کہلاتے .... مظفر ہوئے اب تو (۳۳)

چند اشعار اردو میں اور ہیں:

اس بھوندو کا کہوں یارو میں تم سے اب کیا ذکر
لاحول پڑھا جس نے سنا اس کا ذرا ذکر
شیطان کی طرح چاروں طرف ہے اس کا ذکر
کہ میں بھی کہوں گا جو .... کا ذکر
اب اس کے سنو مکر کا .... کا قصہ
افسانہ انھیں کا ہے وہ ابلیس کا قصہ (۳۴)

۱۸۷۹ء میں مولانا نے انشاء اللہ خاں انشاء کے قصیدہ کی زمین (۳۵) میں سلطان عبدالحمید خاں کی شان میں اردو میں قصیدہ کہنا شروع کیا تھا۔ مگر اس دور میں چوں کہ ان پر فارسی کا غلبہ تھا اس لیے چودہ اشعار (۳۶) سے زیادہ گاڑی نہ چل سکی اور اٹھارہ اشعار فارسی (۳۷) میں کہے۔

اردو قصیدہ کا پہلا شعر اس طرح ہے:

پھر بہار آئی ہے شاداب ہے پھر دشتِ چمن
بن گیا رشک گلستان ارم پھر گلشن

آخری شعر:

چونکتے ہیں جو کبھی خواب سے اطفال بہار
تھپکیاں دیتی ہے سونے کے لیے باد چمن

فارسی قصیدے کا پہلا شعر:

ہاں دگر فصل بہار آمد و آراستہ شد
بزم عیشے کہ درد نیست جز از بادہ سخن

فارسی قصیدے کا آخری شعر:

تازمان است ترایار بود دولت و جاہ
تاجہان است موافق بودت چرخ کہن

اردو اشعار جو رزمیہ کابل و قندھار کے عنوان کے تحت کہے گئے تھے، ان کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ قلمی بیاض میں چند اردو اشعار اور ملتے ہیں جن پر لکھا ہوا ہے "ریختہ قلم جادو رقم مولوی محمد سمیع صاحب ساکن اعظم گڑھ" اور یہ بھی لکھا ہے "در حقیقت شبلی نعمانی"۔

اشعار یہ ہیں:

احباب کو یہ صدا مبارک — یہ مژدہء جانفزا مبارک
اوس مردم چشم مردی نے — یعنی حافظ حسن علی نے (۳۸)
وہ نامہء لاجواب لکھا — عالم میں نہیں نظیر جس کا
جو مسئلہ ہے وہ مستند ہے — ہر نقطہ سپند چشم بد ہے
تصویر یقیں جو ہے تو یہ ہے — شمع رہ دیں جو ہے تو یہ ہے
ہر چند کہ نزد صاحب فن — ہر حرف ہے اک دلیل روشن

پرحق میں عدو کے اے دل افروز | ہر سطر ہے ناوک جگر دوز
اس نامہ نو کا طرز اسلوب | از بسکہ ہے دل پسند و مرغوب
کچھ ایک عدو نہیں خجل ہے | حاسد بھی حسد سے منفعل ہے
کس طرح سے دیکھ اے معاند | باطل ہوئی تری رائے فاسد
اب سے بھی اگر بجوش مستی | ہو تجھ کو خیال خود پرستی
میدان سخن وسیع تر ہے | دکھلا ترے پاس جو ہنر ہے
اوروں سے بھی یاوری طلب کر | کر جمع اساتذہ کو یکسر
پھر دیکھ کہ کس طرح بلا کہ | کرتا ہوں ترے خیال کو رد
کیا یاد کرے عدو یہ تو بھی | ہاں کی تھی کسی سے گفتگو بھی
انصار بھی ترے وقت پے کار | کھولیں نہ کبھی زبان گفتار
اکنوں باسید دستگیری | ادعو من حضرۃ القدیری
ان یعصمنی من الدواہی | والامر الیک یا الہی

تمام شد

اس دور کی اردو شاعری کی معلومہ کائنات یہی ہے۔ چوں کہ فارسی سے اس زمانے میں بڑی رغبت تھی۔ اس لیے فارسی اشعار اور بھی ہیں جو پیش کیے جاتے ہیں:

دو لشکر بنا ورد برخاستند | دو صف چوں صف محشر آراستند
چناں تنگ شد عرصہ برپر ولاں | کہ شد تیغ در قبضہ، خود نہاں
قیامت از شمشیر بالا گرفت | زگرز گراں کوہ صحرا گرفت
چناں لرزہ در دشت کس اوفتاد | کہ قاروں بروں از زمیں اوفتاد
در آمیختہ لشکر ہر دو صف | چو در حالت پنجہ گری دو کف
رسم ستو راں دراں رزمگاہ | عیاں گشت ماہی نہاں گشت ماہ

نوید شادی محمد عمراز شبلی نعمانی۔ کل بارہ اشعار ہیں (۳۹)۔

پہلا شعر:

در عیش و طرب باز ست امروز | جہاں راکار باساز است افروز

آخری شعر:

زراه لطف کار من بسازند　　غریبی را باحسانی نوازند

تین شعراس طرح ہیں:

ساقیا باز خیز و ساغر دہ　　جام مئے دہ و مکرر دہ

فصل گل آمد و بہار رسید　　ے بدہ کا نکیم خمار رسید

چوں سرمدح دوستانم ہست　　بادہ دردہ کہ بادہ جانم ہست

ایک فارسی غزل اس طرح ہے:

از بس بیاد آں قد رعنا گریستیم　　بے خود بزیر سایۂ طوبیٰ گریستیم

باسوز سینہ زاول شب تادم سحر　　چوں شمع در فراق تو شبہا گریستیم

مارا زچرخ چشم وفائے نبودہ است　　من بروفائے سست احبا گریستیم

از سادگی بوعدہ دو نان فریفتم　　اکنوں چہ سود گرہمہ دریا گریستیم

عیبی بزرگ تر زہنر در زمانہ نیست　　شبلی بحال مردم دانا گریستیم

ایک اور غزل اس طرح ہے:

از جہاں خاطر پریشاں می روم　　ہمچو بلبل از گلستاں می روم

در سفر داریم آتش زیرپا　　ہمچو دود شمع پیچاں می روم

دوستاں راہست شادی و طرب　　مازبخت خود پریشاں می روم

آتشے داریم درسینہ نہاں　　از شرارش سینہ سوزاں می روم

طالعہ واژوں مرا یاری نکرد　　چوں سکندر آب حیواں می روم

ایک غزل اور ہے جس کا مطلع اور مقطع پیش کیے جاتے ہیں:

مطلع:

اے زندگانی بخش من لعل شکر گفتار تو　　در آرزوی مردنم در حسرت دیدار تو

مقطع:

خواہی کہ بہر خندہ، پیش افگنی افگندہ،　　اینک چوخسرو بندہ، نوبردہ، بازار تو

چند اشعار اس طرح ہیں:

شد ہوائے عرصہ گیتی برنگ آتشیں　　کز نسیم صبح گردد شعلہ چوں مرغ کباب

بس کہ از تفتیدگی دریچ چیزی نم نماند　　شد حباب بحر ہمچوں کوزہ، نادیدہ آب

دیگر:

گل غنچہ گشت تادہن اور شود نہ شود — بشگفت بازکان رخ نیکو شود نشود

دیگر:

برد سحاب گر آبی ز چشم خوں بارم — گہردروں صدف خوں شد چودانہ انار

دیگر:

والہء عارض تو دیدہ دری نیست کہ نیست — بستہء حلقہء زلف تو سرنیست کہ نیست

غزل:

گرچہ تاراج دل و دیں کردہء — عاشقاں را دین وایمانی ہنوز
تیر نواز سینہ دل خستگان — برنمی آید بآسانی ہنوز
دین و دل خود آشکارا بردہء — ہمچناں از دیدہ پنہانی ہنوز
کشت صدرہ درد بجرم دین عجب — زندہ ام دارد گراں جانی ہنوز
نیمہء از وصف تو کم کردہ ام — خوب تراز ماہ کنعانی ہنوز
شبلیا چوں زلف او،ہم در وصال — جمع گشتی و پریشانی ہنوز

دیگر:

سر نام نام جہاندار پاک — برا رندہ رستباز جاک
بلندی و آسمان بلند — کشائندہء دیدہء ہوشمند

نعت:

فرستادہء خاص پروردگار — رسانندہء حجت استوار
گرانمایہ تر تاج آزاد گاں — گرامی تر از آدمی زاد گاں

ایک ساقی نامہ بھی ہے جس میں تقریباً سو شعر ہیں۔ صرف تین پیش کیے جاتے ہیں۔

بیا ساقی ساں دہ مرا — ازاں داروئی بی شہاں دہ مرا
ازاں داروے تلخ بے ہش کنم — مگر خویشتن را فراموش کنم
بیا ساقی آن ارغوانی شراب — بے دہ کہ نامست گردم خراب (۴۰)

حواشی:

۱۔۔۔ یعنی وکالت

۲۔۔۔ مکاتیب شبلی، دوم صفحہ ۲۵۱، ۲۵- اگست ۱۸۸۲ء

۳۔۔۔ غالب نے "رستخیز بے جا" اور "غدر ہندی" سے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کی تاریخ نکالی تھی۔

۴۔۔۔ اگرچہ اسامی کی تشریح نہیں ہے، مگر یہی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چھوٹی ملازمت تھی۔

۵۔۔۔ حالی کا ذہنی ارتقاء صفحہ ۱۰

۶۔۔۔ میں نے ۱۹۶۲ء میں بندول دیکھا تھا۔ ہاشمی۔

۷۔۔۔ مکاتیب شبلی، حصہ دوم صفحہ ۲۴۷-۲۴۸، ۷- اکتوبر ۱۸۸۲ء

۸۔۔۔ مولانا عبد الاحد کی ولادت ۲۳- صفر ۱۲۶۶ھ روز سہ شنبہ کو ہوئی۔۔۔۔۔۔۔ ادب مولانا فاروق چریا کوٹی سے پڑھا۔ فن شاعری کو آفتاب الدولہ قلق اور مولانا عبد العلیم آسی غازی پوری اور جعفر حسین کاشف سے حاصل کیا۔ شمشاد تخلص اختیار کیا۔ مولانا رحمت اللہ کے انتقال کے بعد مدرسہ، چشمہ، رحمت غازی پور کے مینجر اور مولانا مرحوم کے جانشین مقرر ہوئے۔ تین دیوان مطبوعہ یادگار ہیں۔ ۲۵- ذی قعدہ یوم پنجشنبہ ۳۵ھ کو انتقال ہوا اور مولوی انوار صاحب کے باغ میں لکھنؤ میں دفن ہوئے۔ (ماخوذ از تذکرہ علمائے فرنگی محل ۱۹۳۰ء)

۹۔۔۔ مکاتیب شبلی، حصہ دوم صفحہ ۲۴۸، ۱۰- اکتوبر ۱۸۸۲ء

۱۰۔۔۔ مولوی حمید الدین فراہی کا وطن۔ پھرہا کی مناسبت سے مولوی صاحب مرحوم فراہی لکھتے تھے۔

۱۱۔۔۔ مکاتیب، دوم صفحہ ۲۴۸-۲۴۹، ۲۹- اکتوبر ۱۸۸۲ء

۱۲۔۔۔ مکاتیب شبلی، حصہ دوم صفحہ ۲۴۹، ۲۹- اکتوبر ۱۸۸۲ء

۱۳۔۔۔ مولانا کے سوتیلے بھائی

۱۴۔۔۔ مکاتیب، دوم صفحہ ۲۴۹-۲۵۰، ۵- نومبر ۱۸۸۲ء

۱۵۔۔۔ مکاتیب شبلی، حصہ دوم صفحہ ۲۵۲

۱۶۔۔۔ حیات شبلی، صفحہ ۳۹

۱۷۔۔۔ مولانا کے والد مولانا کے لیے خاندانی پیشہ وکالت پسند کرتے تھے، جب ہی زور دے کر وکالت کا امتحان دلوایا تھا۔

۱۸۔۔۔ حیات شبلی صفحہ ۱۱۶۔

۱۹۔۔۔ محمد آباد ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے، مولانا کے والد شیخ حبیب اللہ خاں کے دوستوں میں تھے۔

۲۰۔۔۔ دلی کے عمائد میں سے تھے پہلے ہائی کورٹ کے وکیل تھے پھر سب جج ہو گئے تھے۔ علی گڑھ کالج کے ہمدرد اور سرسید کے ہمنوا تھے۔ بعد کو سرسید سے اختلاف ہو گیا تھا۔

۲۱۔۔۔ مولوی سمیع اللہ خاں اور سرسید

۲۲.... حیاتِ شبلی، صفحہ ۱۲۲
۲۳.... اقبالیات کا تنقیدی جائزہ، صفحہ ۹۴، قاضی احمد میاں اختر - جوناگڑھی - اقبال اکیڈمی - کراچی ۱۹۵۵ء
۲۴.... علامہ شبلی اور ان کی شاعری از محبوب الرحمن کلیم بی-اے وکیل - اعظم گڑھ - معارف مجلد سوم - ماہ ربیع الاول ۱۳۳۷ھ مطابق دسمبر ۱۹۱۸ء عدد ششم
۲۵.... یہ مقالہ ہندستانی اکیڈمی (الہ آباد) کی کانفرنس منعقدہ، ۱۳-جنوری ۱۹۳۶ء میں پیش کیا گیا - بمبئی میں ۱۰-جنوری ۱۹۳۶ء کو مکمل ہوا تھا - صفحہ ۲۳۷ (اصل میں مولانا کا ابتدائی کلام بہت کم دستیاب ہوتا ہے - ورنہ ممکن ہے کہ یہ دعویٰ درست ثابت ہوتا - ابتدائی کلام نہ ملنے کی دو خاص وجہیں ہیں - پہلی تو یہ کہ کسی کے ذہن میں (اور ممکن ہے خود مولانا کے ذہن میں بھی) اس وقت یہ نہ ہو گا کہ آگے چل کر وہ بڑے شاعر ہوں گے - اس لیے ابتدائی شاعری محفوظ نہ رہ سکی - دوسرے یہ کہ مولانا کی آدھی بیاض علی گڑھ میں ۱۸۸۷ء میں چوری ہو گئی تھی - لہذا ابتدائی کلام بھی اس نصف بیاض میں شامل ہو گا)
۲۶.... کلیاتِ شبلی (اردو) معارف پریس، اعظم گڑھ - طبع سوم صفحہ ۲
۲۷.... ایضاً، صفحہ ۲
۲۸.... ایضاً، صفحہ ۳
۲۹.... بیاض قلمی، مملوکہ دارالمصنفین
۳۰.... کلیاتِ شبلی (اردو) صفحہ ۴
۳۱.... کلیاتِ فارسی، صفحہ ۱۱۷
۳۲.... کلیاتِ فارسی، صفحہ ۱۱۵-۱۱۶
۳۳.... قلمی بیاض، مملوکہ دارالمصنفین اعظم گڑھ
۳۴.... ایضاً
۳۵.... انشاء کے قصیدے کا مطلع یہ ہے:

نگھیاں پھولوں کی تیار کر اے بوے سمن
کہ ہوا کھانے کو نکلیں گے جوانانِ چمن

۳۶.... قلمی بیاض و کلیاتِ شبلی (اردو) صفحہ ۳۰
۳۷.... کلیاتِ فارسی و قلمی بیاض، صفحہ ۱۱۶-۱۱۷
۳۸.... مولانا کے خطوط میں حافظ حسن علی کا اکثر ذکر ہے
۳۹.... کلیاتِ شبلی، (فارسی) صفحہ ۱۲۰-۱۲۱
۴۰.... کلیاتِ شبلی، (فارسی) صفحہ ۱۱۸-۱۱۹

۱۸۸۳ء

مولانا نے پہلی فروری ۱۸۸۳ء سے کالج میں پڑھانا شروع کیا۔ ملازمت سے قبل تک تو ڈپٹی محمد کریم صاحب کے دولت کدے پر قیام رہا، لیکن ملازم ہونے کے بعد ڈپٹی صاحب کو تکلیف دینا مناسب نہ سمجھا اور یکم فروری سے الگ مکان کرایہ پر لے لیا۔ منجھلے بھائی مولوی اسحٰق کو بھی علی گڑھ بلا لیا تھا اور اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔ چناں چہ خود مولانا کے قلم سے علی گڑھ کے ابتدائی قیام کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں:

"تاحال بر دولت کدہ ڈپٹی محمد کریم اقامت داشتم وی مکانے بہ کرایہ گرفتہ ام مگر چنانکہ می بایست نیست۔ ازیں رو از فکر اوستاد میدہ ام و دست طلب در آستین کشیدہ۔

از یکم فروری بہ کالج ہی روم۔ ایف۔اے و بی۔اے۔فارسی و انٹرنس وسکنڈ عربی بمن تعلق دارد سید صاحب (۱) ہرچند از کلکتہ دہ بخار سیدہ اند مگر چوں از زحمت سفر گونہ ناسازی مزاج دارند ہنوز بایشاں برنخوردہ ام، عزیزی محمد اسحٰق را درصف اولیں جائے دادہ اند، محیط الدائرہ فرستادن دارد۔" (۲)

ابھی (۳) مولانا کو کالج میں پڑھاتے ہوئے ایک ہفتہ گزرا تھا اور دوسرا ہفتہ شروع ہوا تھا کہ حیدرآباد (دکن) کے سرسالار جنگ کا ۹۔فروری کو انتقال ہو گیا۔ مرحوم کے غم میں کالج ۱۰۔فروری ۱۸۸۳ء کو بند رہا۔ مولانا نے جو مکان کرایہ پر لیا تھا اس کا کرایہ پانچ روپے ماہوار تھا۔ یہ کالج سے خاصا دور تھا اور باوجود کوشش کے قریب نہ مل سکا تھا اس زمانے میں درہ نادرہ اور عرفی نصاب میں شامل تھیں۔ وہاں مرزا صائب کا رزمیہ دستیاب ہوتا تھا مگر اس کے صرف دو ورق تھے۔

سرسالار جنگ کے انتقال پر اظہار غم میں ایک خاص جلسہ ہوا۔ مولانا نے اس موقع پر فارسی مرثیہ لکھ کر سنایا۔ یہ مرثیہ کلیات میں نہیں ہیں۔

پہلا بند:

آہ ایں چہ غم بود کہ جہانے است نوحہ گر
آہ ایں چہ ماتم است کہ خون شد دل وجگر
تنہا ہمیں نہ دولت و ملک است در خطر
ہم شرع را بنا ندکنوں معنی دگر
سالار جنگ مرد جہاں گشت دیدہ تر
شادی زدل رمیدہ و دل زاں رمیدہ تر (۴)

آخری بند:

از رفتنش اگرچہ جہاں نے بجاں بود
اما ہرآنچہ خواستہ آسماں بود

اکنوں دعائے شبلی دل خستہ آں بود   باشد ہماں چہ سود بود چہ زیاں بود
خود زیر سایہ حرم کردگار جائے (۵)   گورابود بہ رحمت پروردگار جائے

مولانا کی شاعری کا یہ پہلا سکہ تھا جو علی گڑھ کالج میں مرثیہ کے رنگ میں ڈھلا اور دہلی کی ٹکسال (۶) میں مقبولیت ہوئی اور اسی سے علی گڑھ کالج میں ان کا بحیثیت شاعر سکہ جما۔ اس کو سرسید نے انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ (۷) میں شائع کیا اور بڑی قدر کی۔ خود مولانا لکھتے ہیں:

"مرثیہ (جو تم بھی دیکھ چکے ہوگے) جن لوگوں نے اس کی فارسی دیکھی ہے ازبس پسند فرمائی ہے میر اکبر حسین صاحب بھی ان میں داخل ہیں۔" (۸)

مولانا حالی نے بھی سرسالار جنگ کی وفات پر مرثیہ لکھا تھا جو اس سے قبل ۲۰۔ فروری ۱۸۸۳ء کو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہو چکا تھا۔ عبارت یہ ہے:

مدرستہ العلوم مسلمانان علی گڑھ کے نامور لائق ممبر مولوی الطاف حسین حالی نے نواب سرسالار جنگ بہادر کی وفات کے متعلق چند اشعار بطور مرثیہ تحریر فرمائے ہیں جن کو ہم ذیل میں چھاپتے ہیں۔" (۹)

کل ۲۷ اشعار ہیں۔ چوں کہ اس مرثیہ کا کم لوگوں کو علم ہے اور اس کا امکان ہے کہ کہیں یہ ضائع نہ ہو جائے اس وجہ سے حاشیہ میں پورا نقل کیا جاتا ہے تاکہ محفوظ ہو جائے۔ یہ مرثیہ غالباً ڈاکٹر غلام مصطفے خاں کی نظر سے نہیں گزرا کیوں کہ حالی کا ذہنی ارتقاء میں اس کا ذکر نہیں۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی نے بھی حالی بحیثیت شاعر صفحہ ۲۲۷ پر مولانا حالی کے لکھے ہوئے مرثیوں میں اس مرثیہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ غالباً ان کی نظر سے بھی یہ نہیں گزرا۔ ان شمسین (حالی و شبلی) کے علاوہ بھی بعض دیگر شعراء نے مرثیے لکھے تھے۔ جو ۶۔ مارچ ۱۸۸۳ء کے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ معہ پروگریس میں شائع ہوئے۔

مولانا کالج میں دوسرے اساتذہ کے مقابلہ میں تنخواہ کی کمی کی وجہ سے شروع شروع میں خوش نہ تھے۔ یہ ان کی زود حسی کا نتیجہ تھا، چناں چہ پریشانی کا اظہار خطوط میں کرتے رہتے تھے۔ غیر مقلدوں کا زور ابھی اعظم گڑھ اور اس کے اطراف میں باقی تھا۔ مولانا کے علی گڑھ چلے آنے سے انھوں نے میدان خالی پاکر مزید زور پکڑا۔ ابھی مولانا پر علی گڑھ کا رنگ نہیں چڑھا تھا، لہذا مولوی سمیع سے خواہش کی کہ وہ مولوی فقیر اللہ صاحب کو اس کے تدارک پر آمادہ کریں۔ مولانا نے رزمیہ صائب، قضاوقدر طالب آملی و قلی سلیم مولوی سمیع کو بھیجنے کا ارادہ کیا اور گرمیوں کی چھٹیوں میں آخر مئی ۱۸۸۳ء تک وطن جانے کے ارادے کا اظہار کیا۔ مولوی اسحق کے علاوہ دو

اور عزیز عبدالغفور اور عثمان بھی مولانا کے ساتھ رہتے تھے اور انگریزی، فارسی اور عربی کی تعلیم میں مشغول تھے۔ مولانا نے اپنی فارسی کی بیاض فوری طور پر مولوی سمیع سے طلب کی۔

مولانا کو اب انگریزی کی اہمیت کا شدید احساس ہو گیا تھا۔ اعزا اور احباب کو انگریزی پڑھنے، لکھنے اور بولنے کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ اسی پر بس نہیں کیا بلکہ مجلس موازنہ، ترقی قومی قائم کی جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ اعزہ، باشندگان اعظم گڑھ کی سالانہ تعلیمی ترقی کا موازنہ پیش کرے مولوی سمیع کو اس مجلس کا سیکرٹری مقرر کیا۔ اسی مجلس کی نگرانی میں اعظم گڑھ میں نیشنل اسکول قائم کیا اور اس کی نگرانی علی گڑھ میں بیٹھے بیٹھے کرتے رہے (۱۰)۔

اسی زمانے میں مولانا کے منجھلے بھائی مہدی حسن کے ایک عزیز دوست مسٹر راجندر پرشاد آنجہانی ہوئے تو انھوں نے خواہش کی کہ آنجہانی کی تاریخ وفات لکھ دیں۔ مولانا نے یہ تاریخ وفات لکھی، جو مہدی حسن کی زبان سے ہے۔ لکھتے ہیں:

چو راجندر پرشاد در خاک خفت   که غافل زپیچ و خم مرگ بود
مرا بود سرمایہ، زندگی   وفا باخش تادم مرگ بود
جہانے زمرگش غمیں شد بہ بیں   کہ ہم سال مرگش "اا مرگ" بود

۱۳۰۰ھ

دیگر

آں گرامی پایہ یار من راجندر   از جہاں رفت و زیر خاک نہفت
خویشتن از میان رمید و مرا   خان ومان شکیب پاک برفت
چارہ چوں نیست جز شکیبائی   خود چہ آید کنوں زگفت وسنفت
از سر وصل او تواں بگذشت   گرچہ ایں حرف خود نیارم گفت
وانگہے سال مرگ او گفتم   کانتابی بزیر خاک نہفت

۱۸۸۳ء-۱۸۸۹ء

سر وصل یعنی واؤ کا تخرجہ ہے۔ مصرعہ تاریخ کا عدد ۱۸۸۹ء ہے۔ اس میں سے ۶ کے تخرجہ کے بعد ۱۸۸۳ء حاصل ہوتا ہے۔

اب مولانا فارسی خطوط لکھنا رفتہ رفتہ کم کر رہے تھے اور اردو میں خط و کتابت کی طرف توجہ تھی۔ اسی سال سے مولانا کے اردو خطوط دستیاب ہوتے ہیں بعد کو تو پھر کسی خاص ضرورت

یا سبب سے عربی یا فارسی خطوط لکھتے تھے (۱۱)۔

اکبر الہ آبادی سے تعلقات اور علی گڑھ کالج میں مولانا کی شاعری کی قدر نے اردو غزلوں کی طرف بھی متوجہ کر دیا تھا۔ چناں چہ اس زمانے میں مولانا کی کئی اردو غزلیں ملتی ہیں۔ غزلیں وہ اپنے احباب اور اعزا کو بھیجا کرتے تھے۔ مولانا کی اس زمانے کی ایک غزل کا مطلع یہ ہے:

دوستو نذر ہیں یہ لعل و گہر تھوڑے سے
اشک و خوں تھوڑے سے اور لختِ جگر تھوڑے سے (۱۲)

مولانا نے علی گڑھ میں چوں کہ قیام کر لیا تھا اور وطن سے پہلی مرتبہ بسلسلہ ملازمت لمبے وقفہ کے لیے دور ہوئے تھے۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ المکتوب نصف الملاقات کے ذریعے وطن اور وطن والوں کی پوری کیفیت اور حالت معلوم ہوتی رہی اور اس کے لیے وہ اعزا اور احباب کو متوجہ کرتے رہتے تھے بلکہ تنبیہ کرتے اور بعض مرتبہ خفا ہوتے اور بگڑتے۔ خود بھی یہ تصور کر کے کہ اعزہ اور احباب کو مولانا کے متعلق بھی فکر ہوگی کہ کہاں رہتے ہیں، کیسے رہتے ہیں، کیا کرتے ہیں، مکان کیسا ہے، پڑوسی کیسے ہیں، احباب کیسے ہیں۔ انھوں نے اپنے خطوں میں پوری تفصیل سے آگاہ کیا۔ یہ خطوط خاصے بڑے ہیں اور مولانا کے حالات اور کیفیات کو پیش کرتے ہیں لکھتے ہیں:

"عام قاعدے کی بات ہے کہ جب کوئی اپنا عزیز کہیں باہر ہوتا ہے تو احباب کو اس عزیز کے یاد آنے کے ساتھ ضرور یہ خیال ہوتا ہے کہ کس مکان میں ہوگا، کیسے بسر ہوتی ہوگی، کیا شغل ہوگا، دوست احباب کیسے ہوں گے۔ بھائی یہ خیال تمھیں ہو یا نہ ہو مگر میں تمہاری طرف سے فرض کرکے اپنی طریق معاشرت کا خاکہ کھینچتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ عبارت کی رنگینی اور شان و شوکت کی تلاش تھوڑی دیر کے لیے چھوڑ دو گے اور سادے فقروں پر قناعت کرو گے (۱۳)۔"

جب قلم کی روانی اور عبارت کی سادگی میں یہ حسن ہو تو پھر رنگینی اور رنگ آمیزی اس کے آگے ماند ہے۔ جو بات بے تکلف انداز بیان میں ہے وہ عبارت آرائی میں کہاں ممکن ہے۔ مکان کی تفصیل اس طرح ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے والا مولانا کے ساتھ ہے اور وہ اس کو مکان کا کونہ کونہ دکھلا رہے ہیں۔ اس خط کی تازگی اس طرح برقرار ہے گویا ۱۸۸۳ء نہیں بلکہ ۱۹۶۵ء کی بات ہے۔ لکھتے ہیں:

"جس مکان میں رہتا ہوں شہر کے کنارے پر ہے۔ یہ ایک مختصر سا مگر خوش

قطع مکان ہے - دکھن کی طرف ایک خوش نما محراب دار چھوٹا سا دالان ہے - اس میں خاص میں رہتا ہوں، ایک جانب پلنگ ہے اور زمین پر صاف اور پاکیزہ چاندنی کا فرش کھنچا ہوا ہے - صدر مقام کے دائیں جانب ترکی جانماز اور سامنے ایک رنگین اور ہلکا ساڈسک رکھا ہوا ہے - دیوار میں لیمپ جڑا گیا ہے جو شب کو دیر تک روشن رہتا ہے - اسی دالان کے متصل ایک جانب ایک حجرہ ہے، جس میں مولوی عبدالغفور صاحب تشریف رکھتے ہیں - اسی دالان کے مقابل دوسری جانب ایک گول کمرہ ہے جو عزیزی اسحٰق کی سکونت کی جگہ ہے اور جو کرسیوں اور میز سے آراستہ ہے، کمرے کے متصل جو حجرہ ہے، وہ عزیزی محمد عثمان کے رہنے کی جگہ ہے -" (۱۴)

مکان کے پڑوس میں خواجہ محمد یوسف کا مکان تھا جو مولانا سے تعلق رکھتے تھے اور مولانا کو بھی ان سے مل کر خوشی ہوتی تھی - اسی مکان میں ایک شاعر قیس رہتے تھے جن کے شاگرد پورے شہر میں تھے - مولانا بھی ان کی اردو سخن سنجی کے معترف تھے -

مولانا، مولوی سمیع اللہ خاں سے ملتے رہتے تھے اور اکبر الہ آبادی (۱۵) سے تو گاڑھی چھنتی تھی اور وہ مولانا کی فارسی شاعری کی خوب داد دیتے تھے - مولانا کے طلبہ مہذب اور باذوق تھے - مولانا نے قصیدہ عیدیہ اسی زمانے میں لکھا تھا - اس کی اس قدر، قدر ہوئی کہ ہفتوں طلبہ کے پاس گھومتا پھرا - بعض نے اس کی نقلیں بھی کرلیں مگر اصل مل دل کر پرزے پرزے ہو گیا - مولانا کی خواہش تھی کہ وہ چھپ جائے - مرثیہ (سرسالار جنگ مرحوم) کی نقل بھی مولانا اپنے وطن بھیج چکے تھے - اس کی تعریف اکبر الہ آبادی نے بھی کی - اسی زمانے میں وہاں عبدالحمید نامی کلکٹر کے دفتر میں اہلمد تھے وہ صاحب دیوان شاعر تھے اور کتابوں کے بڑے شائق تھے - ان کے پاس فارسی کے چھپے ہوئے دواوین کا ذخیرہ تھا - مولانا نے ان کے ذوق اور کتابوں کے شوق کو دیکھ کر بہت سی کتابیں لکھوادی تھیں جن کو وہ منگوانا چاہتے تھے - مولانا کو بھی ان سے کتابیں پڑھنے کو مل جاتی تھیں - مولوی اسحٰق کی فارسی قابلیت کی تعریف کی، اس زمانے میں مولانا سلمان ساؤجی اور طالب آملی پڑھنے کے لیے بے چین تھے - مولانا نے مولوی سمیع کے فرزند کی ولادت کی تاریخ کہی تھی جس کو مولوی سمیع نے بہت پسند کیا -

مولانا اسکول (نیشنل اسکول) کی ذرا ذرا سی بات سے باخبر رہنا چاہتے تھے - اسکول کی باقاعدہ رپورٹ منگواتے تھے اور علی گڑھ میں بیٹھ کر نگرانی کرتے تھے - رپورٹ کے نقائص پر نظر رکھتے تھے اور احباب اور اعزا سے اس کی فرمائش کرتے اور گرفت کرتے - سب سے زیادہ مولوی

سمیع کو جواب دہ سمجھتے تھے ۔ طلبہ کی علمی استعداد معلوم کرنے کے لیے بے چین رہتے تھے ۔ محمد شریف طالب علم پر کسی وجہ سے جرمانہ کیا گیا تھا ۔ مولانا چاہتے تھے کہ وہ ضرور وصول کیا جائے ورنہ اسکول نہ آنے دیا جائے اور شفیع بلند دلی اور فخرالدین سے فیس وصول کرنے پر زور دیا ۔ بغیر فیس وصول کیے اسکول آنے کی اجازت دینے کے حق میں نہ تھے ۔ اس لیے کہ اسکول کو اسکول بنانا چاہتے تھے کھیل یا مذاق نہیں ۔

اسی زمانے میں مولانا کو تاریخ بنی العباس لکھنے کی دھن تھی ۔ اگرچہ پھیلاؤ دیکھ کر انھوں نے اس خیال کو المامون لکھنے تک پابند کر لیا تھا ۔ یہ خیال مولانا کو کلامی مسائل سے دلچسپی کی بناء پر پیدا ہوا ہو گا اور وہ تاریخ تک کلام کے ذریعے ہی پہنچے ۔ چوں کہ اسی دور میں علم کلام کی بنیاد پڑی تھی اس لیے کلام اور متکلمین کی تلاش میں تاریخ بنی العباس تک پہنچے اور پھر المامون پر ٹھہر گئے ۔ حالاں کہ ہارون الرشید میں زیادہ کشش اور دلچسپی ہو سکتی تھی، لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ مامون الرشید کے زمانہ میں خلق قرآن کی بحثیں ملتی تھیں اور کلامی مواد کی فراوانی تھی ۔ یہ دوسری بات ہے کہ جب قلم اٹھایا تو مورخ اور سوانح نگار کی حیثیت ہو گئی ۔

یہیں مولانا کو انگریزی خواں طبقہ کے ساتھ رہنا پڑا اور انھیں کو پڑھانا پڑا ۔ مولانا کو اس طبقہ کی علمی حالت کچھ بہتر نظر نہ آئی ۔ مذہبی واقفیت تو کم تھی ہی دنیوی اعتبار سے بھی خاصی خالی نظر آئی ۔ مثلاً نہ خیالات میں وسعت، نہ سچی آزادی کی لگن، نہ بلند ہمتی اور نہ ترقی کا جوش بس لباس کی ایک خاص وضع قطع اور ایک خاص تہذیب کا مظاہرہ تھا ۔ مولانا کے جدید تعلیم کے دلدادہ، ہم وطن یہ دعویٰ کرتے تھے کہ جدید اعلیٰ تعلیم یافتہ مذہبی باتوں کو تمام تر کمزور اور ضعیف ثابت کر دیں گے ۔ مولانا نے اس طبقہ میں رہ کر اور گھل مل کر ان کی گہرائی کا اندازہ لگایا اور ان کی سطحی باتوں کو دیکھتے ہوئے خیال کیا کہ وہ زمین کی حرکت بھی نہیں سمجھ سکتے، مذہبی باتوں کی ضعیف کیا ثابت کریں گے ۔ سرسید سے بھی اس طبقہ کے متعلق گفتگو ہوتی رہتی تھی ۔ سرسید کا کہنا تھا کہ سوائے تین اشخاص کے پورے ہندوستان میں تمام انگریزی تعلیم یافتہ مسلمان اس قابل نہیں کہ کسی مجمع کو مخاطب کر سکیں یا کچھ لکھ سکیں ۔ گویا علم سے دوستی تو پیدا نہ ہوئی، فیشن پرستی آ گئی ۔

مولانا نے ایک اور غزل کہی جس کا مطلع اور مقطع یہ ہے:

تیر قاتل کا یہ احساں رہ گیا　　جائے دل سینہ میں پیکاں رہ گیا
یاد رکھنا دوستو اس بزم میں　　آ کے شبلی بھی غزل خواں رہ گیا

یہ غزل خاصی طویل تھی جو مولوی سمیع کو ارسال کی (۱۶)۔

گرمیوں کی چھٹیاں ہو گئی تھیں۔ مولانا وطن جانے کا ارادہ کر چکے تھے اور ۲۴۔ مئی ۱۸۸۳ء کو روانہ ہونا چاہتے تھے۔ درمیان میں لکھنو ٹھہرنے کا ارادہ تھا۔ اس طرح ۲۷۔ مئی کو وطن پہنچنے والے تھے۔ اسی زمانے میں مولانا نے نیرنگ خیال از محمد حسین آزاد پڑھی اور ارادہ کیا کہ یہ کتاب مولوی سمیع کے لیے ہدیہ لے جائیں مگر ہدیہ کے پیش نظر یہ کتاب اہم نہ تھی اس لیے کہ آزاد نے آب حیات کے ایک خاص حصہ کو اضافہ کر کے طبع کرا دیا تھا البتہ اس نئے نسخے میں مرزا دبیر، میر انیس، میر حسن اور مومن خاں کے کچھ حالات مل سکتے تھے۔ ۲۰۔ اور ۲۴۔ مئی کے درمیان علی گڑھ میں ایک مشاعرہ ہو رہا تھا اس کے لیے مولانا نے ایک غزل کہی تھی جو ہمراہ لے جانے کا ارادہ تھا۔ ان دنوں مولانا غالباً طلبہ کے امتحانات کی وجہ سے بڑے مصروف رہے (۱۷)۔

مولانا گرمیوں کی چھٹی گزار کر علی گڑھ واپس آگئے اور درس و تدریس میں مصروف ہو گئے۔ مولانا کے ایک ہم وطن مسمی اکبر نے لکھا کہ ایک نوید لکھ دیں تو دریافت کیا کہ نثر میں ہو یا نظم میں اور نظم بھی اردو میں ہو یا فارسی میں۔ مولانا نے یہ بھی لکھا کہ اگر علی گڑھ آنے کا خیال ہے تو نحو میر اچھی طرح سے پڑھ لی جائے اور جو کچھ پڑھ رکھا ہے، اسے ازبر کر لیا جائے اور اسی انداز پر فصول اکبری بھی پڑھ لی جائے اور اگر جون پور یا غازی پور کا ارادہ ہے تو وہ مناسب نہیں۔ صرف و نحو سے فراغت کے بعد کسی کامل استاد سے پڑھنا مناسب ہوگا۔ یوسف اور شبلی ہر جگہ نہیں مل سکتے جو ابتدا سے اور شفقت سے پڑھائیں۔ ویسے مولانا اکبر کے منتظر تھے کہ وہ مولانا کی ہدایت کی تکمیل کر کے آجاتے اگرچہ نہ ٹھہرنے کی جگہ اچھی تھی اور نہ کھانا اچھا تھا۔ بہر حال مولانا کی جیسی بھی گزر رہی تھی اسی میں اکبر کو بھی شریک کر لیتے بلکہ خوشی سے شریک کرتے۔

مولانا نے ستمبر میں مولوی سمیع کو ایک اور غزل بھیجی۔ اب مولانا زیادہ تر اردو غزلیں لکھتے تھے۔ مولانا کو مولوی سمیع نے پریسیڈنٹ اور چیئرمین کے ملاحظہ کے لیے چند قواعد بھیجے تھے جو مولانا کو مل گئے اس کے جواب میں مولانا نے چند مشورے دیے، فیس داخلہ کی بابت البتہ بعض مصلحتوں کی بنا پر نہ لکھا اس لیے کہ بنگالی ماسٹر گریس بابو ناراض ہو جاتے اور ان کو ناراض کرنا مقصود نہ تھا کیوں کہ اس کا اندیشہ تھا کہ جب اسکول (نیشنل) کے لڑکے بڑے درجوں میں آتے تو مشن اسکول میں داخل ہو جاتے، اس سے اسکول کی حالت پر برا اثر پڑتا اور اسکولوں میں رقابت شروع ہو جاتی جس سے نیشنل اسکول کے بیٹھ جانے کا اندیشہ تھا اور اسکول کے بند ہو جانے کی

صورت میں جگ ہنسائی ہوتی ۔ اسکول کے ترقی کر جانے کے بعد پھر ڈرنے کی بات نہ ہوتی اور لڑکوں کی کمی بھی نہ ہونے پاتی ۔ اسی زمانے میں کسی شخص نے اسکول کا معائنہ کیا تو مولانا نے دریافت کیا کہ معائنہ کرنے والے سے مراد میاں ممتاز الدین تو نہیں ۔ تصریح کی ضرورت تھی (۱۸) ۔ اب سرسید کی جوہر شناس نگاہیں مولانا کو خوب پرکھ چکی تھیں اور مولانا کے کتب بینی کے شوق کا اندازہ لگا چکی تھیں، لہٰذا انھوں نے قدر شناسی کی مثال پیش کی کہ اپنے کتب خانے سے استفادہ کرنے کی مولانا کو عام اجازت دے دی اس طرح مولانا کو کتب بینی کا بڑا اچھا موقع مل گیا ۔ سرسید کے پاس تاریخ و جغرافیہ عربی کی چند نایاب کتابیں تھیں جن کا پتا اکثر لوگوں کو نہ تھا ۔ وہ سب کتابیں جرمنی میں تھیں اور ان کا پتا مصر والوں کو بھی نہ تھا اسی زمانے میں مولانا گبن کی تاریخ کا مطالعہ کر رہے تھے اور تاریخ کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ تاریخ لکھنے کے لیے بھی پر تول رہے تھے سرسید نے گبن کی تاریخ کا زر کثیر صرف کر کے ترجمہ کرایا تھا ۔ مولانا شبلی کا رخ تاریخ کی طرف موڑنے میں ان کتابوں کا بھی ہاتھ تھا ۔

جس قصیدہ کا اوپر ذکر آچکا ہے وہ مولانا نے ۱۸۸۳ء کی عید کے موقعہ پر سپرد قلم کیا تھا ۔ قصیدہ شروع کرنے سے پہلے یہ شعر ہے:

که درد پس از شرح دادن گرمی ہنگامہ عید — تحتی ازہر ہے کار اسلامیاں نمودہ آمد

مطلع:

روز عید ست و دگر کار جہاں گشت بساز — باز شد بر رخ گیتی در امید فراز

مقطع:

شرح ایں حادثہ از شبلی دل خستہ مخواہ — شب بود کوتہ و افسانہ دراز ست و دراز (۱۹)

اسی سال مسٹر سڈیس پرنسپل محمڈن کالج نے استعفیٰ دیا ۔ یہ ۲۸ ۔ جون ۱۸۷۵ء سے کالج کے پرنسپل تھے ۔ چناں چہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں اس طرح ہے:

Mr. Siddius, Principal since 28.6.1875 i.e., the (۲۰) biggining of the college. He resigned in his letter dated 5.5.1883. Mr. Theodor Back was appointed as a principal on 3.8.1883.

مولانا شبلی نے محمڈن سول سروس فنڈ میں ایک خاصی بڑی رقم چندہ دیا (۲۱) ۔

حواشی:

۱۔۔۔ سرسید
۲۔۔۔ مکاتیبِ شبلی، حصہ دوم (فارسی) صفحہ ۲۴۰
۳۔۔۔ مکاتیبِ شبلی، حصہ دوم (فارسی) صفحہ ۲۵۵
۴۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۱۵۳
۵۔۔۔ حیاتِ شبلی، برحاشیہ صفحہ ۱۵۴
۶۔۔۔ سرسید دہلی کے مستند اہل زبان میں سے تھے۔
۷۔۔۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ معہ پروگریس، ۲۷-۲-فروری ۱۸۸۳ء، صفحہ ۲۲۹
۸۔۔۔ مکاتیبِ شبلی، حصہ اول صفحہ ۵۴
۹۔۔۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ معہ پروگریس، ۱۰-فروری ۱۸۸۳ء، صفحہ ۱۹۸-۱۹۹

داشت ہر کس بہ زبان مدحت مختار الملک   کامد از در خبر رحلت مختار الملک
تاچہ افتاد پس از نہضت مختار الملک   بر سر موکب وجمعیت مختار الملک
ای اجل گرتن بیجاں نہ خاکش سپری   نتوانی کہ نکونامیش از یادبری
لشکر از ماتم او چاک گریباں شدہ است   کشور از مردن او یکسرہ پژماہ شدہ است
ای بسا چشم کزیں حادثہ گریاں شدہ است   حیدر آباد تو گفتی ہمہ ویراں شدہ است
ای اجل گرتن بیجاں نہ خاکش سپری   نتوانی کہ نکونامیش از یادبری
منتی ہست از و برسر سرکار نظام   کہ بفکرش نتواں کردمہ و سال قیام
ہمہ از و یافتہ عدلیہ و مالیہ قوام   ہم بدو لشکر و ضبطیہ پزیرفت نظام
ای اجل گرتن بیجاں نہ خاکش سپری   نتوانی کہ نکونامیش ازیادبری
آہ کیں درد نہ دردیست کہ درماں دارد   ملک ازیں واقعہ صد لرزہ درارکاں دارد
قوم ازیں واقعہ انگشت بہ نداں دارد   تافلک درپس ایں پردہ چہ پنہاں دارد
ای اجل گرتن بیجاں نہ خاکش سپری   نتوانی کہ نکونامیش ازیادبری
چشم اسلام ازیں غصہ بخوں تر گردید   ملت از حالت پیشینہ زبوں تر گردید
علم دیں کہ نگوں بودنگوں تر گردید   قیمت خواجہ پس از مرگ فزوں تر گردید
ای اجل گرتن بیجاں نہ خاکش سپری   نتوانی کہ نکونامیش ازیادبری
دوست نادشمن اور زوطبع یاری داشت   کشور از نیروی تدبیرش ستواری برداشت
دولت عہد از و چشم وفاداری داشت   گردن قوم زاحسانش گراں باری داشت
ای اجل گرتن بیجاں نہ خاکش سپری   نتوانی کہ نکونامیش ازیادبری
آہ ازاں عقل وکفایت کہ نہ بینش مثال   آہ ازاں بذل وسماحت کہ نہ یابیش ہمال

سپس از ہند چنیں مرد نہ خیزد مہ و سال ۔ خاصہ از قوم کہ افتاد درآں قحط رجال
ای اجل گر تن بیجاں نہ خاکش سپری ۔ نتوانی کہ نکونامیش ازیادبری
در علی گڑھ کہ نہادند عزیزاں بنیاد ۔ درسگاہی کہ ز طوبیٰ ثمرش باد زیاد
تا بہ گیتی جود ایں بقعہ دلکش آباد ۔ خلق را یاد جوانمردی او خواہد داد
ای اجل گرتن بیجاں نہ خاکش سپری ۔ نتوانی کہ نکونامیش ازیادبری
کیست در ہند کزیں غم لب حسرت نگزید ۔ کیست از قوم کزیں غصہ گریباں ندرید
تا بجای کہ چوں ایں نالہ جاں کا شنید ۔ حالی گوشہ نشیں ہم زجگر آہ کشید
ای اجل گر تن بیجاں نہ خاکش سپری ۔ نتوانی کو نکونامیش ازیادبری

۱۰..... مکاتیب شبلی، دوم (فارسی)، صفحہ ۲۵۵-۲۵۶
۱۱..... مکاتیب شبلی، حصہ اول، صفحہ ۵۷-۵۸
۱۲..... مکاتیب شبلی حصہ اول، صفحہ ۵۲-۵۳-۵۴-۵۵ (اس خط کا سال سید سلیمان ندوی نے اندازے سے ۱۸۸۱ء لکھا ہے - یہ غلط ہے کیوں کہ مولانا نے علی گڑھ میں ۱۸۸۳ء میں قیام کیا تھا اور کالج سے تعلق اور مکان کرایہ پر لے کر رہنا اسی زمانے میں تھا۔)
۱۳..... مکاتیب شبلی، حصہ اول، صفحہ ۵۲ تا ۵۵
۱۴..... مکاتیب شبلی، حصہ اول، صفحہ، ۵۲ تا ۵۵
۱۵..... اکبرالہ آبادی سے مولانا کی واقفیت اودھ پنچ لکھنو کے ذریعہ تھی۔
۱۶..... مکاتیب شبلی، حصہ اول، صفحہ ۵۰-۵۲
۱۷..... مکاتیب شبلی فارسی، صفحہ ۲۵۶
۱۸..... مکاتیب شبلی، حصہ اول، صفحہ ۵۵ تا ۵۷
۱۹..... دیوان شبلی باہتمام محمد رحمت اللہ رعد، مطبع نامی، کان پور، صفحہ ۲
۲۰..... علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، صفحہ ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، مورخہ یکم ستمبر ۱۸۸۳ء
۲۱..... علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، صفحہ ۱۰۸۹، ۲۲- ستمبر ۱۸۸۳ء

۱۸۸۴ء

بڑے دن کی چھٹی گزارنے کے بعد مولانا ۱۴۔ جنوری روز دو شنبہ علی گڑھ پہنچے۔ کچھ آرام کیا۔ چوں کہ عزیزوں سے مل کر واپس آئے تھے، اس لیے ان کی باتیں یاد آتی رہیں اور اس وجہ سے کچھ ملول رہے۔ بعض حاسدوں نے عجیب عجیب باتیں مولانا کے متعلق مشہور کر دیں۔ اس سے مولانا اور تنگ دل ہوئے۔ مولانا کو یہ احساس تھا کہ ان کی قابلیت کو دیکھتے ہوئے تنخواہ اور عہدہ کم ہے۔ مگر راضی برضا تھے، کیوں کہ ان کے والد کو وکالت کروانے کی دھن تھی۔ مولانا عجیب کشمکش میں تھے اور سوچتے تھے کہ چلاییں یا نہ چلاییں پھر وکالت کرنا پڑے گی اور لوگوں کو دھوکے سے فریب دینا ہوگا اور یہ ذلت شاید گوارا کرنا ہی پڑے۔ اسی سوچ میں الجھے ہوئے تھے۔ اس حالت میں بھی عزیزوں کے حالات اور بندول کے مدرسے کی اور اعظم گڑھ کے مفصل حالات معلوم کرنے کی فکر رہی۔ مولانا کو اپنے فارسی خطوط کو محفوظ رکھنے کا خیال تھا اس لیے مولوی سمیع یا عبدالحمید کو محفوظ رکھنے کے لیے مشورہ دیا(۱)۔ مولانا علی گڑھ کالج میں تھے مگر کم تنخواہ کی وجہ سے آزردہ تھے۔ مولانا سے زیادہ مولانا کے والد ان کے وکالت کا پیشہ اختیار نہ کرنے کی وجہ سے آزردہ تھے اور مولانا اس پیشے سے وحشت زدہ تھے۔ اس لیے قناعت و صبر کر لیا۔ اسی زمانے میں مولانا نے چند اشعار بحر طویل کی شکل میں کہے جو مولوی سمیع کو بھیج دیے۔ مولوی سمیع مولانا کے پاس جانے والے تھے تو مولانا نے دریافت کیا کہ جب ان دنوں چھٹی نہیں تو پھر یہ ارادہ کیا؟(۲)۔

دسمبر ۱۸۸۳ء کی چھٹیوں میں مولانا وطن گئے اور نیشنل اسکول کا جلسہ انعام انہی دنوں ہوا جس میں حکام کو بھی مدعو کیا۔ کچھ ایسے مواقع پیش آئے کہ مولوی سمیع نے اس جلسہ میں شرکت نہ کی، جس کا مولانا کو افسوس رہا۔ ان کے شرکت نہ کرنے کی وجہ کوئی امتحان تھا، جو وہ دے رہے تھے۔ مولانا نے امتحان کی کیفیت دریافت کی۔ طلبہ سے کچھ ایسی باتیں سرزد ہوئیں کہ ماسٹر کی خوبیاں اجاگر نہ ہو سکیں، اس لیے حکام نے یہی کمی محسوس کی، جس کا مولانا کو افسوس ہوا۔ ان کو ایک اچھے ماسٹر کی تلاش ہوئی۔ مولوی سمیع کو بھی تاکید کی مدرسے (نیشنل اسکول) کی دن رات فکر رکھی جائے۔ ان دنوں مولانا تنہائی کی وجہ سے گھبرا رہے تھے اور شعر و شاعری کے مشغلے کا سہارا لے رہے تھے۔ چناں چہ ۱۷۔ جنوری ۱۸۸۴ء کی شب میں ایک غزل لکھ ڈالی اور مولوی سمیع کو بھیج

دی۔ نظام کا قصیدہ تہنیت لکھنے کا ارادہ کر رہے تھے، مگر طبیعت نہیں لگ رہی تھی۔ اسکول کے ارکان سے چندے کا تقاضا کیا۔ جنید (۳) کی تعلیم کی فکر اور ان کی تعلیم کے لیے مولوی سمیع کو ذمہ دار بنایا۔ غزل کے چند اشعار یہ ہیں:

مجھ کو لے جا کے مری آنکھ وہاں   اک تماشا سا دکھا لائی ہے
آہ کو سوے اثر بھیجا تھا   واں سے کیا جانیے کیا لائی ہے
شبلی زار سے کہہ دے کوئی   مژدہء وصل صبا لائی ہے (۴)

بندول ضلع اعظم گڑھ (مولانا کا وطن) میں بھی ایک مدرسہ قائم تھا۔ مولانا کو اس کی بھی فکر رہتی تھی۔ اسی زمانے میں وہاں ایک نئے ماسٹر رکھے گئے۔ ان کی اہلیت اور قابلیت کے متعلق مولانا نے دریافت کیا۔ مولانا نے اسکول وغیرہ کے متعلق مولوی حمید الدین کے ذمے جو کام کیے تھے، اس میں کچھ کوتاہی ہوئی تو مولانا بے حد ناراض ہوئے اور مولوی سمیع کے ذریعے کہلوایا کہ وہ اپنے کام سے اور مولانا کے تعلق سے استعفا دیں۔ مولانا کے لیے ان کی کاہلی اور سستی پسندیدہ نہ تھی اور اس کو قوم کے ادبار کی دلیل بتایا۔ ناراضگی کے اظہار کے لیے مولوی سمیع کو تاکید کی۔ مولانا چاہتے تھے کہ بہا بیر اگرچہ ماہوار پر مدرسے میں تین گھنٹہ بطور ٹیوشن پڑھانے پر راضی ہوتے تو ان کو مقرر کر لیا جاتا اور آخری جماعتیں ان کے سپرد کر دی جاتیں۔ ماسٹر مذکور سے گفتگو کر کے اطلاع دینے کی ضرورت تھی۔ مولانا نے انھیں دنوں ایک فارسی غزل لکھی تھی جو مولوی حمید الدین کو بھیجی تھی اس ناراضی میں مولانا نے ان کی فہم پر بھی طنز کیا اور لکھا کہ "اگرچہ فہم کی توقع نہیں ہے۔" مدرسہ کے حالات اور اس کے متعلق لوگوں کے خیالات معلوم کرنے کی فکر رہی۔ اس زمانے میں دو غزلیں لکھیں ایک غزل کا مطلع یہ ہے:

پوچھتے کیا ہو جو حال شب تنہائی تھا   رخصتِ صبر تھی یا ترک شکیبائی تھا

یہ اشعار بھی خوب ہیں:

رحم تو ایک طرف پایہ شناسی دیکھو   قیس کو کہتے ہیں مجنون تھا، صحرائی تھا
آنکھیں قاتل بھی پر زندہ جو کرنا ہوتا   لب میں اے جان تو اعجاز مسیحائی تھا
دشمن جاں تھے ادھر ہجر میں درد و غم و رنج   اور ادھر ایک اکیلا ترا شیدائی تھا
خوب وقت آئے نکیرین جزا دے گا خدا   لحدِ تیرہ میں کیا عالم تنہائی تھا

مقطع:

ہم نے بھی حضرت شبلی کی زیارت کی تھی یوں تو ظاہر مقدس تھا پہ شیدائی تھا (۵)

دوسری غزل کا مطلع یہ ہے:

مطلع:

تیس دن کے لیے ترک مے و ساقی کر لوں واعظ سادہ کو روزوں میں تو راضی کر لوں

شبلی تو واعظ سادہ کو راضی کرنے کے لیے ترک مے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، مگر داغ تو اس پر بھی تیار نہیں ہوتے اور کہتے ہیں:

یہ بجا کہ منع ہو گا رمضان میں آب و دانہ
یہ غضب کہ تیس دن تک نہ پئیں شراب ہرگز (۶)

مولانا اعزہ اور احباب کے خطوط کے منتظر رہتے تھے اور جواب میں دیر ہونے پر طنز بھی کرتے تھے اور افسردہ اور ناراض بھی ہوتے تھی۔ چناں چہ مولوی محمد عمر کی کوتاہ قلمی کی شکایت استفہام انکاری میں کی ہے۔ مولوی صاحب نے کتابوں کی رسید بھی نہ دی تھی۔ مولانا میں ایک خاص بات تھی کہ اگر کوئی اچھی کتاب چھپتی تھی تو اس کا مطالعہ کرتے اور پسند آتی تو چاہتے تھے کہ احباب اور اعزہ بھی پڑھیں۔ کبھی تحفہ میں بھجواتے اور کبھی ترغیب دیتے کہ پڑھنے والا خود منگائے اور پڑھے۔ چناں چہ مولانا محمد حسین آزاد کی سنین اسلام جب شائع ہوئی تو اس کو پڑھا اور پسند آنے پر اس کو اپنے پیسوں سے خرید کر شاہ اسد علی وکیل الہ آباد کو دونوں جلدیں بھجوائیں۔ مولوی سمیع کو یہ بھی لکھا کہ کتاب کی طلب کے لیے جو خط لکھا جائے وہ عمدہ طور سے لکھا جائے۔ مراد یہ تھی کہ زبان کا خیال رکھا جائے اور خط کے آخر میں مولانا کے دستخط کے ساتھ پروفیسر محمڈن کالج بھی کہ جس سے وہ پہچان سکیں (۷)۔

مولانا کے احباب اور شاگرد خطوط کے جواب دینے میں سستی کرتے تھے۔ مولانا کو جواب میں دیر کی برداشت نہ تھی اس لیے کہ کام کا جذبہ اور طبیعت کا جوش، ہم وطنوں کی تعلیمی ترقی کے لیے بے چین اور بے قرار تھا اور وہ ذرا ذرا سی بات سے باخبر رہنا چاہتے تھے۔ چناں چہ ایک مجلس ترتیب دی۔ اس مجلس کے ارکان مولوی محمد عمر، محمد سمیع، عبدالغفور، حمید الدین فراہی، حافظ حسن علی اور مولوی احمد اللہ تھے اور پھر اس مجلس کے شرکا کی تصور اور خیال میں ایک گفتگو پیش کی ہے اور اس کو قلم بند کر کے ان حضرات کے پاس بھیج دیا۔ اس طنزیہ خط کے بارے میں خود

ہی لکھتے ہیں۔ لوگ کہیں گے کہ کیا حماقت کی ہے، مگر خدا کی قسم دل کی چوٹ اور حضرات کی عنایت کا پورا چربہ ہے۔ تمہیں انصاف کرو خط لکھنا کمبخت کون سا کام ہے، مگر یہ بھی نہیں ہو سکتا (۸)۔"

چوں کہ یہ طنزیہ خط بہت دلچسپ ہے اس لیے پیش کیا جاتا ہے:

"بھئی کچھ سنا ہے؟ (محمد سمیع) خیر تو ہے، ہاں ایک تازہ واقعہ ہے۔ میاں شبلی کا انتقال ہو گیا (محمد سمیع) ارے سچ نہیں جھوٹ ہو گا، ابھی ہفتہ بھی نہیں ہوا ان کا ایک خط میرے نام آیا تھا (مولوی محمد عمر صاحب) تو تم نے آج سنا ہے۔ اجی اس کو تو کئی دن ہوئے انھوں نے جو کتابیں بھیجی تھیں اس کی رسید بھی تو میں نے اسی وجہ سے نہیں دی (محمد سمیع) انا للہ! افسوس ابھی مرنے کے کوئی دن تھے (حمید) ہاں واقعی سخت رنج ہے مگر تقدیر سے کس کا زور چلتا ہے (اور دبی زبان سے) ارے میاں چلو قصہ پاک ہوا، آئے دن کی حکومتوں سے دم ناک میں آگیا، بھلا روئداد تو خیر ایک بار کا کام تھا لکھ ہی لیا اب روز روز مدرسوں میں لڑکوں کو مسودہ لکھاتے پھرو، اس پر طرہ یہ کہ ہفتہ وار مدرسہ کی رپورٹ لکھ کر ان کے پاس بھیجتے رہو۔ اچھی خاصی بیگاری بھگتا کرو (عبدالغفور) ارے میاں خیر مرنا تو سب کے لیے ہے ہاں ان کے خط کا جواب رہ گیا مگر یہ بھی کوئی زبردستی ہے۔ جی نہ چاہے تو مفت کی محنت کون گوارا کرے۔ (حافظ علی حسن صاحب) لو اب کی ان کو خط لکھتے لکھتے رہ گیا، امتحان کا حال لکھنا تھا، اور جو کچھ ہو آدمی تو مزے کا تھا، دو گھڑی کیفیت رہتی تھی (مولوی محمد عمر صاحب) بھئی کیا کہیے دل لگی ہی جاتی رہی اور تو کس کام کا آدمی تھا مگر ہاں ذرا جی بہل جایا کرتا تھا (مولوی احمد اللہ) اجی جی کیا بہلتا تھا، دنیا بھر کی شکایتیں ہوا کرتی تھیں کبھی ان کی نقل کی کبھی ان کا خاکہ اڑایا اور اس کے سوا ان کا کام ہی کیا تھا۔ چلو اچھا ہوا۔ یار خوش قسمتی سے ایسے ایسے عزیز احباب ہاتھ آتے ہیں (۹)۔"

اس خط کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کو اس زمانے میں نیشنل اسکول، اس کے اساتذہ، طلبہ، منتظمین کے متعلق کتنی فکر تھی۔ اسکول کی ہفتہ وار رپورٹ کے لیے وہ بے چین اور امتحان کی کیفیت کے معلوم کرنے کے لیے بے قرار رہتے تھے اور مندرجہ حضرات کے ذمے کام مقرر کر دیے تھے۔ دیر ہوئی اور مولانا نے خبر لی۔ ۸۔ فروری ۱۸۸۲ء کو مولوی سمیع کا خط پہنچا۔ اس کے جواب میں مولانا نے لکھا:

"یہ بھی چشم فلک کو برا نہ لگے کہ عزیزوں میں سے ایک شخص تو میرے حال

سے محبت رکھتا ہے۔زندہ باشی و جاوداں باشی (۱۰)۔"

اسی زمانے میں مولانا نے حمید صاحب کو ایڈریس لکھنے کے لیے لکھا تھا۔ جواب میں دیر ہوئی تو یاد دہانی کی۔ اس کا جواب جو آیا تو مولانا تلملا گئے اور ان کے متعلق لکھا کہ خدا معلوم ان پر کیا ستم ہوا ہے کہ انھوں نے بڑا ماتم لکھا ہے۔ مولانا کو شبہ ہوا یا طنزیہ لکھا کہ وہ عشق کے اکھاڑے میں اترے ہیں خدا خیر کرے جب ہی تو انھوں نے (حمید) لکھا کہ میرا دل تو خود ہی ستم رسیدہ ہے۔ میں کسی کی بات کی تاب کہاں لا سکتا ہوں۔ مولانا نے اس کا جواب یہ دیا کہ سچ ہے کہ آخر قیس کا کوئی تو وراثت دار ہوتا۔

ان کو شاید یہ گمان ہوا کہ میں ایڈریس نہیں لکھ سکتا۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو لیکن بہرحال ان کا یہ جواب ہے "آپ نے یہ کیوں یقین کر لیا کہ مجھے یہ کام بن آتا ہے۔ اگر آپ کر سکتے ہوں تو مجھ پر رحم کیجیے۔" ذرا اس کر سکنے کے جملے کو تو دیکھو۔ مولانا کو فکر رہی کہ آخر ان کو کیا پریشانی تھی جس سے وہ متفکر تھے اور اسی بنا پر اتنا سخت جواب لکھا تھا۔ مولانا ناراض تو تھے ہی، لکھ دیا کہ اگر واقعی کوئی پریشانی ہو تو ان کی (مولانا) طرف سے مبارک باد دے دی جائے، ایسے منحوسوں کی پیدا ہونے کی ضرورت کیا تھی۔

مولوی محمد عمر صاحب کی توجہ دلائی کہ تعلیم کے متعلق مدرس فارسی کی شکایت کو دور کریں۔ یہ بھی اطلاع آنے کی ضرورت تھی کہ جو نئے طلبہ اسکول میں داخل ہوئے ان میں سے کس کس نے اور کتنی کتنی فیس داخل کر دی تھی۔ اسی زمانے میں مولوی اسحاق کو ایک خط فارسی نظم میں لکھا تھا۔ اس نظم کے مزید دو اشعار لکھے۔ اس نظم کا ایک شعر یہ تھا:

نبود بزمانہ یاورِ من   نے خواہر و نے برادرِ من

مزید دو اشعار یہ ہیں:

از جورِ سپہر خستہ باشم   در کنجِ غمے نشستہ باشم

کس را نبود بمن نیازے   من باشم و دورِ جانگدازے

مولانا کو فکر تھی کہ یہ معلوم ہو کہ ممبروں کے ذمہ کتنا چندہ باقی ہے اور یہ بھی فکر تھی کہ میاں عثمان (مولانا کے بھائی) کے درس میں سفرنامہ ناصر خسرو شامل ہونے کے باوجود جب دستیاب نہیں ہوتا تو طلبہ کیا پڑھتے ہیں اور اس کو مولانا ہی سے لکھ کر منگوا لینا چاہیے تھا۔ کیوں کہ مولوی محمد عمر کے ذمہ روئدادوں کا مرتب کرنا تھا اور وہ مرتب نہ کر سکے تھے تو پھر کیوں کر مرتب

کی جا سکی ہوں گی۔ مولانا کو اس کی بڑی فکر رہی۔

ان ہی دنوں مولانا کا ارادہ تھا کہ اپنا فارسی دیوان مرتب کریں، مگر اس زمانے میں بعض وجوہات سے نہ کر سکے۔ طلبہ کے لیے چاہتے تھے کہ محنت سے فارسی سیکھنے کی کوشش کریں ورنہ بیکار ہے اور مولوی سمیع کو بھی مقرر کیا کہ وہ فارسی کی طرف طلبہ کو توجہ دلائیں۔ مولوی سمیع کو غلط فہمی ہوئی تھی کہ مولانا نے دو قصیدے لکھے تھے، اس لیے انھوں نے طلب کیے۔ حالاں کہ مولانا نے عید کا صرف ایک قصیدہ لکھا تھا۔ اس کو اپنے ہاتھ سے صاف لکھا ہوا بھیجنے کا وعدہ کیا۔ اسی زمانے میں سرسید پنجاب کا دورہ کر کے واپس ہوئے اور کالج کے لیے دس ہزار روپیہ لائے۔ پنجاب کے حضرات نے بڑی آؤ بھگت کی اور ان پر پھول برسائے۔ مہدی (۱۱) کے فیل ہونے پر مولانا کو بڑا رنج ہوا لیکن اس اطلاع کے لیے مولانا پہلے سے تیار تھے کیوں کہ انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ وہ محنت سے جی چرار رہے تھے اور بغیر سخت محنت کے ایف۔ اے کیا کوئی امتحان پاس کرنا ممکن نہ تھا۔ چوں کہ سال اول کا امتحان تھا۔ اس لیے امید تھی کہ شاید تین ماہ بعد پھر امتحان ہو ان کو محنت کی ضرورت تھی اگرچہ امید کم تھی کہ وہ محنت کریں۔ یہ قوم کے ادبار کی دلیل بتلائی کہ محنت سے جی چرایا جائے۔ اسی مرض (محنت نہ کرنا) میں مبتلا ہو کر عبدالرؤف اور فضل اللہ بھی فیل ہوئے مولانا نے ایک اور اردو غزل لکھی۔ اس کا مطلع یہ ہے:

یار کو رغبت اغیار نہ ہونے پائے   گل تر کو ہوس خار نہ ہونے پائے

چند اشعار یہ ہیں:

اس میں در پردہ سمجھتے ہیں وہ اپنا ہی گلہ   شکوہء چرخ بھی زنہار نہ ہونے پائے
چپکے وہ آتے ہیں گلگشت کو اے بادِ صبا   سبزہ بھی باغ میں بیدار نہ ہونے پائے
جمع کر لیجیے غمزوں کو مگر خوبیِ بزم   بس وہیں تک ہے کہ بازار نہ ہونے پائے
آپ جاتے تو ہیں اس بزم میں لیکن شبلی   حالِ دل دیکھیے اظہار نہ ہونے پائے (۱۲)

اسی زمانہ میں مسٹر بک نے بحیثیت پرنسپل اپنا عہدہ سنبھالا۔ اس کے متعلق انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں اس طرح شائع ہوا تھا:

'"Mr. Buck was given charge of the post on his arrival in Aligarh when Mr. Siddous retires i.e. 16.2.1884. Pay of Mr. Buck was fixed Rs. 650/= The amount of Rs. 50/= will be deducted as the rent of the house." ' (۱۳)

سرسید کو فروری ۱۸۸۳ء میں مصطلحات الشعراء کی ضرورت ہوئی، مولانا شبلی نے وطن سے ان کے لیے ڈاک سے منگوائی۔ اسی زمانے میں مولوی محمد عمر صاحب مڈل کا امتحان دینا چاہ رہے تھے تو مولانا نے دریافت کیا کہ تیاری شروع کردی یا آج کل ہر معاملہ ٹل رہا ہے۔ اسکول کے بارے میں مندرجہ معلومات حاصل کرنا چاہیں۔ ۱۔ تمام لڑکے خصوصاً پانچویں جماعت کے لڑکان بھر انگریزی بولتے تھے یا نہیں اور اساتذہ نے اس طرف توجہ مبذول کی تھی یا نہیں۔ ۲۔ نچلے درجہ کے طلباء خط کی مشق کرتے تھے اور مسودہ لکھایا جاتا تھا یا نہیں۔ ۳۔ جن ممبروں کے ذمہ چندہ تھا انھوں نے سہ ماہی دو ششماہی ادا کیا یا ویسا ہی ان کے ذمے باقی رہا۔ ۴۔ جمعرات کے دن انگریزی ہوتی تھی یا امتحان رکھا گیا تھا۔ ۵۔ ہر لڑکے کے پاس کاپی ہونا تھی جس پر فارسی کے مدرس روزمرہ نوٹ لکھاتے۔ ایسا ہوا یا نہیں۔ دیوان آملی یا آصفی کے دستیاب ہونے کی صورت میں کیا مولوی سمیع خریدنے کو تیار تھے (۱۴)۔

مولانا کا ارادہ تھا کہ اپنا فارسی کلام چھپوائیں لیکن مولوی فاروق صاحب کو پہلے دکھلا لینا چاہتے تھے۔ مولانا فاروق نے اس کو دیکھنا منظور کر لیا تھا۔ اپنے پاس جو کلام تھا وہ بھیجنے والے تھے مگر فارسی کے نامے اور غزلیں "مولوی سمیع کے پاس تھیں۔ لہٰذا ان کو ہدایت کی کہ بلیا کے پتے پر جہاں مولانا فاروق اس زمانے میں وکالت کرتے تھے غزلیں وغیرہ بھیج دیں۔ اسی زمانے میں مولانا نے ایک نہایت پرزور واسوخت لکھی (بعد کو یہ واسوخت محفوظ نہ رہ سکی۔ مولانا کو اس پر حیرت تھی کہ کیوں کر لکھ سکے۔ مولانا اس زمانے میں تاریخ کا مطالعہ کر رہے تھے، اس لیے ان کو سنین الاسلام از محمد حسین آزاد کی یاد آئی جو مولانا کے ماموں عبدالکریم صاحب کے پاس تھی۔ لہٰذا اس کو اپنے پاس منگوانے کے لیے ہدایت کی۔ واسوخت کے ساتھ ساتھ ایک اردو نامہ بھی لکھا تھا یہ دونوں خود مولانا کو بہت پسند تھے لہٰذا اس کی نقل نہیں بھیجی اور یہ وعدہ کیا کہ اپنی آمد پر خود ہی سنائیں گے (۱۵)۔

اسکول میں نئے داخل ہونے والے لڑکوں کے نام و نشان سے واقف ہونے کے لیے بے چین رہے۔ سنین الاسلام حمید نے واپس نہ کی، اس پر مولانا نے لکھا کہ اتنا تو آزردہ نہ ہوں کہ مولانا ہی کی کتاب واپس نہ کریں۔ آخر مئی سے چھٹی شروع ہونے کا امکان تھا جو آخر جولائی تک تھیں، لہٰذا مولانا نے وطن جانے کا ارادہ کیا۔ اپنی کوٹھی کے لیے دری بنوائی جس کا عرض و طول پندرہ گز تھا۔ مولانا نے اپنے والد سے خواہش کی کہ کوٹھی پر چھت کے لیے حکم دے دیں۔ مولانا

نے چوں کہ تاریخ بنی العباس لکھنا شروع کر دی تھی اور معتصم باللہ کے حالات تک لکھ چکے تھے اور یہ بھی ارادہ تھا کہ پہلی جلد یہیں پر ختم کر دی جائے، مولوی سمیع کو ترغیب دلائی کہ آئینہ اسکندری خسرو دہلوی اور دیوان آصفی خرید لیں۔ دیوان آصفی کی قیمت دو روپے تھی اور آئینہ اسکندری کی قیمت مولانا کو معلوم نہ تھی (۱۶)۔

ان دنوں مولانا نے چہ کنم کی ردیف اور حیران اور فراواں کے قافیے میں ایک فارسی غزل کہی، اس پر طلبہ نے کہا کہ علی حزیں جیسے استاد کی زمین میں طبع آزمائی سے حاصل۔ طے یہ پایا کہ اس زمانے کے فارسی شاعری کے سخن فہم و سخن سنج خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی مصنف قیصر نامہ اور غالب کے مشہور شاگرد نیر دہلوی کے پاس مولانا کی غزل اور علی حزیں کی غزل بغیر مقطع بھیجی جائیں اور دونوں سے ان پر رائیں لی جائیں۔ چناں چہ یہی کیا گیا۔ دونوں نے تسلیم کیا کہ مولانا کی غزل اہل زبان کا کلام تھا۔ نیر نے بہت تعریف کی اور لکھا کہ سلف کے کلام کے ہم پلہ تھا۔ دونوں کی رائیں مولانا کے پاس محفوظ تھیں۔ خط میں بھی یہ ظاہر نہیں کیا گیا تھا کہ کس نے طبع آزمائی کی تھی۔ غزل کا مطلع یہ ہے:

گر کم عقل نہ گیرم من حیراں چہ کنم　　　　می دہد مغبچہ ام بادہ فراواں چہ کنم

دو اور اشعار یہ ہیں:

چاکے از دست جنوں بہرہ من باشد دگر　　　　ارمغانش نفرستم بہ گریباں چہ کنم
خود گرفتم کہ بہ زلفش نفروشم دل و دیں　　　　در بغاوت بروآں نرگس فتاں چہ کنم (۱۷)

مولانا ان دونوں وقتی طور پر تنگ دست تھے۔ کیوں کہ اس سستے زمانے میں گراں قیمت تاریخ کی کتاب کے لیے ۲۵ روپے کی رقم بھیجی تھی۔

اس زمانے میں اس غزل کے علاوہ اور بھی علی حزیں کے تتبع میں غزلیں کہیں۔ علی گڑھ میں ماحول ہی کچھ ایسا میسر آگیا تھا۔ چوں کہ وطن میں ایسے مواقع حاصل نہ ہوتے اس لیے طبیعت کی جولانی اپنے شباب پر تھی۔ واسوخت فارسی کے پندرہ بند یعنی ۴۵ اشعار اور تقریباً اتنے ہی نامہ، اردو کے اشعار تھے، جن کو مولانا کے استاد مولوی فاروق صاحب نے نہایت پسند کیا تھا۔ مولانا کا ارادہ تھا کہ واسوخت اور نامہ، اردو بھی وقتی طور پر شائع کر دیا جائے، مگر روپے کی کمی کی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا۔ بعض شاگردوں، احباب اور اعزا کو شائع کرنے کی طرف لطیف اشارے بھی کیے، مگر پھر بھی شائع نہ ہو سکے۔ اسکول کی مفصل کیفیت معلوم نہ ہو سکی تھی۔ مولانا قربان علی صاحب

انگریزی ماسٹر کی تلاش میں تھے اور اسکول کے قواعد نہ ملنے کے شاکی تھے۔ مولانا کا کوٹھا گرمی میں رہنے کے قابل نہ تھا (۱۸)۔ اس کے باوجود مولانا عبداللہ خان کے مکان پر رہنا پسند نہ کرتے تھے، کیوں کہ اپنے اعزا اور احباب سے دور ہو جاتے۔ گرمیوں کی چھٹی میں وطن میں موجود تھے کہ مہدی کی ایف۔ اے میں کامیابی معلوم ہوئی۔ اس خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے۔ اسی عالم میں فرحت احمد (چچازاد بھائی) کو مبارک باد کا خط لکھا اور ان کو ترغیب دی کہ وہ اور مولانا جب علی گڑھ میں اکٹھے ہوں تو مٹھائی کا مطالبہ کریں اور مولانا سے کہیں کہ مٹھائی تو ان کے ہونٹوں میں تھی۔ اب مولانا کو انتظار تھا کہ جلد چھٹیاں ختم ہوں اور وہ علی گڑھ پہنچیں اور وہاں کے احباب اکٹھے ہوں اور محفل جمے اور خوش گپیاں ہوں۔ مولانا کو اپنے فارسی خطوط کو محفوظ رکھنے کا خیال تھا اس لیے اس کو محفوظ رکھنے کی تاکید کی (۱۹)۔

آخر جولائی میں مولانا علی گڑھ واپس آگئے، مگر بیمار ہوگئے۔ خیال یہ ہے کہ بارش کے بعد وہاں ملیریا کا زور ہو جاتا ہے۔ لہذا ملیریا میں مبتلا ہوئے، کمزوری خاصی بڑھ گئی، حتیٰ کہ قلم پکڑنا دشوار ہو گیا۔ اس کے باوجود خطوط لکھنے کا سلسلہ جاری رہا اور عبدالغفور کو اطلاع دی کہ مڈل میں اختیاری مضمون کی حیثیت سے عربی نہ تھی۔ اس لیے فارسی میں جی لگانے کی ضرورت تھی۔ مولانا ...... اسکول کا شش ماہی چندہ جلد بھیجنے والے تھے۔ عبدالغفور سے مولانا کو اطلاع ملی کہ اسکول میں تین چار نئے طلبہ داخل ہوئے تھے۔ مولانا ان کے نام، پتے معلوم کرنے کے لیے بے چین ہو گئے اور باوجود علالت اور کمزوری کے خط لکھ کر ان کے نام دریافت کیے (۲۰)۔

مولوی سمیع کے خط نہ آنے سے فکر مند تھے، آخر خط نہ لکھنے کی شکایت لکھی اور یہ بھی لکھا کہ عیدیہ قصیدہ موجود نہیں لہذا وہیں لکھوا لیا جائے یا پھر مولانا اپنے آنے پر لکھ دیتے۔ یہ بھی دریافت کیا کہ تحقیق کر لی جائے کہ نیل کب تک باہر روانہ کر دیا جائے گا اور اس کی فروخت کب اختتام کو پہنچے گی۔ اصل بات یہ تھی کہ اعظم گڑھ والوں کے پاس نیل کی فروخت کے زمانے میں خاصے پیسے ہوتے تھے اور اسی زمانے میں چندے کی وصولی ہو سکتی تھی۔ اس لیے مولانا نے چاہا کہ اگرچہ مشکل سے اور بڑی کوشش کے بعد چھٹی ملے گی اور دو ہفتے سے زیادہ نہ ملے گی مگر اس موقع سے فائدہ اٹھایا جائے اور بڑے دن کی اور نئے سال کی چھٹی کے ساتھ ساتھ دو ہفتہ کی چھٹی لے کر وطن میں قیام کر کے اسکول کے لیے چندے کی مہم شروع کی جائے اور چونکہ لوگوں کے پاس نیل کی فروخت کے بعد رقم ہوگی لہذا خوب دل کھول کر چندہ دے سکیں گے۔ مگر اس ارادے کو عملی

جامہ پہنانے سے قبل مولوی سمیع اور مولوی محمد عمر سے بھی مشورہ لیا کہ کیا یہ ارادہ مناسب تھا۔ اس زمانے میں مولانا نے شاعری نہیں کی ورنہ مولوی محمد عمر کو طلب پر بھیج دیتے۔ بیماری مانع رہی ہوگی۔ اس بیماری کے باوجود تاریخ لکھ رہے تھے اور دو چار سطریں ہر روز لکھ لیتے تھے۔ فرحت احمد نے اپنے بھتیجے کی پیدائش پر تاریخ کہنے کی فرمائش کی تھی۔ مولانا نے ٹالنا مناسب نہ سمجھا اور یہ تاریخ لکھ کر بھیج دی:

مرحبا مرحبا لمولود — کہ بود بادہء ایاغ کمال
باز در پیش گاہ بزم وجود — گشت روشن ازو چراغ کمال
مردم دیدہء ہنر، فرحت — کہ تواں یافت زو سراغ کمال
سال تاریخ را چو امر نمود — گفت شبلی "بہار باغ کمال" (۲۱)

۱۳۰۲ھ (نومبر ۱۸۸۴ء) (۲۲)

حواشی

۱۔۔۔ مکاتیب شبلی، حصہ دوم (فارسی)، صفحہ ۲۳۷-۲۳۸، ۱۷-جنوری ۱۸۸۴ء

۲۔۔۔ مکاتیب شبلی، حصہ دوم (فارسی)، صفحہ ۲۴۲-۲۴۵

۳۔۔۔ مولانا کے چھوٹے بھائی

۴۔۔۔ مکاتیب شبلی، حصہ اول، صفحہ ۵۸-۵۹، ۱۸-جنوری ۱۸۸۴ء

۵۔۔۔ مکاتیب شبلی، حصہ اول، صفحہ ۶۱

۶۔۔۔ مکاتیب شبلی، حصہ اول، صفحہ ۲۶

۷۔۔۔ مکاتیب شبلی، حصہ اول، صفحہ ۶۰-۶۲، ۲۶-جنوری ۱۸۸۴ء

۸۔۔۔ مکاتیب شبلی، حصہ اول، صفحہ ۶۳

۹۔۔۔ مکاتیب شبلی، حصہ اول، صفحہ ۶۲ تا ۶۴، ۷-فروری ۱۸۸۴ء

۱۰۔۔۔ مکاتیب شبلی، حصہ اول، صفحہ ۶۴، ۸-فروری ۱۸۸۴ء

۱۱۔۔۔ مولانا کے چھوٹے اور بھائیوں میں منجھلے بھائی

۱۲۔۔۔ مکاتیب شبلی، حصہ اول، صفحہ ۶۴ تا ۶۷، ۸-فروری ۱۸۸۴ء

۱۳۔۔۔ علی گڑھ گزٹ، صفحہ ۲۰۸۹، ۲۲- ستمبر ۱۸۸۴ء

۱۴۔۔۔ مکاتیب شبلی، حصہ اول، صفحہ ۶۷-۶۸، ۲۲-فروری ۱۸۸۴ء

۱۵۔۔۔ مکاتیب شبلی، حصہ اول، صفحہ ۶۹، ۲۷-مارچ ۱۸۸۴ء

۱۶۔۔۔ مکاتیبِ شبلی، حصہ اول، صفحہ ۶۹-۷۰ (۱۹- اپریل ۱۸۸۴ء)

۱۷۔۔۔ مکاتیبِ شبلی، حصہ اول، ص ۷۱ (حاشیہ) و حیاتِ شبلی، صفحہ ۱۳۰

۱۸۔۔۔ مکاتیبِ شبلی، حصہ اول، صفحہ ۷۰ تا ۷۳، ۲۴- اپریل ۱۸۸۴ء

۱۹۔۔۔ مکاتیبِ شبلی، حصہ دوم (فارسی)، صفحہ ۲۵۹، ۲۳- جون ۱۸۸۴ء

۲۰۔۔۔ مکاتیبِ شبلی، حصہ دوم (فارسی)، صفحہ ۲۵۷، ۱۶- ستمبر ۱۸۸۴ء

۲۱۔۔۔ مکاتیبِ شبلی، حصہ اول، صفحہ ۷۳-۷۴، ۲۷- نومبر ۱۸۸۴ء

۲۲۔۔۔ مکاتیب میں ۱۳۲۰ھ چھپ گیا ہے جو کتابت کی غلطی ہے ۱۳۰۲ھ ہونا چاہیے۔

۱۸۸۵ء

مولانا عربی و فارسی کے منتہی تھے۔ مشرقی طرز پر تعلیم ہوئی تھی۔ مشرقی تمدن میں اب تک زندگی بسر کی تھی۔ علی گڑھ میں مولانا کو مغربی و مشرقی تہذیب سموئی ہوئی ملی۔ انگریز اساتذہ سے میل جول اور ایک خاص ماحول نے مولانا کو متاثر کیا۔ سرسید سے روزمرہ گفتگو ہوتی تھی اس میں علمی اور کلامی مسائل پر بحث ہوتی تھی۔ اس طرح مولانا فرقہ وارانہ کشمکش اور گروہ بندیوں سے الگ ہوتے چلے گئے۔ یہیں پروفیسر آرنلڈ جیسے علم دوست سے ملاقات ہوئی اور یہ ملاقات یگانگت اور دوستی کو استوار کرتی چلی گئی۔ اگر پروفیسر آرنلڈ نے مولانا کو جدید علمی اصول سے آگاہ کیا تو مولانا نے بھی قدیم علوم کی اہمیت ان کے گوش گذار کی اور ان کی اہمیت کا سکہ ان کے دل پر بٹھایا۔ خود ان سے فرنچ پڑھی اور ان کو عربی پڑھائی۔ اس ماحول کو مولانا حبیب الرحمن شروانی نے بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"سرسید مرحوم کو خدا تعالیٰ نے ایسا دماغ عطا فرمایا تھا جو صحیح اصول کا اخذ کرنے والا تھا۔ ذوق علم ان کے رگ و پے میں ساری تھا۔ ان کی مجلس میں علمی چرچے رہتے تھے۔ مختلف مسائل پر جرح و قدح ہوتی تھی۔ جدید و قدیم اصول باہم ٹکراتے تھے بڑی خوش قسمتی علامہ شبلی کی یہ تھی کہ اس عہد میں پروفیسر آرنلڈ سا علم دوست استاد کالج میں تھا۔ یہ دونوں دلدادگان علم باہم ملے اور اس طرح ملے کہ جس طرح مختلف اللون نور کی شعاعیں باہم مل کر عالم کی روشنی کا باعث بنتی ہیں۔ پروفیسر آرنلڈ نے علامہ شبلی کو جدید اصول سے آگاہ کیا۔ یہ بتایا کہ جدید علمی مجلس کے کیا ساز و سامان ہیں۔ قدیم علوم پر کیا کیا اعتراض اور حملے ہیں۔ علامہ شبلی کی حذاقت اور قوت دماغی یہ تھی کہ وہ جدید اصول کے طمطراق سے مرعوب نہیں ہوئے، بلکہ ان پر اطمینان سے غور کیا۔ جو اصول عمدہ تھے، ان کو اخذ کیا (نہ صرف اخذ کیا بلکہ ان کو اپنی زندگی کا رہبر بنایا)۔ نمائشی چیزوں کو رد کر دیا۔ پروفیسر آرنلڈ نے عربی میں استفادہ علامہ شبلی سے کیا اور یہ سیکھا کہ پرانی زمینوں میں بھی جوہر آبدار موجود ہیں۔ اگرچہ گرد آلودہ ہو کر نگاہوں سے پوشیدہ ہو گئے ہیں۔ اس واقفیت کا نتیجہ آرنلڈ کی بے نظیر تصنیف "پریچنگ آف اسلام" کی صورت میں عیاں ہوا۔ علامہ شبلی نے پروفیسر آرنلڈ سے کسی قدر فرنچ بھی سیکھی تھی۔ علامہ ممدوح کی زندگی کا یہ دور بہت کچھ سبق آموز اور ایک

بڑے تعلیمی مسئلہ کا حل کرنے والا ہے(۱)۔"

مولانا کی سر سید کے کتب خانہ میں کتب بینی اور سر سید سے مختلف مسائل میں گفتگو اور پروفیسر آرنلڈ کے میل جول نے قومی درد (۲) میں مزید ٹیس پیدا کر دی۔ چناں چہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"بہر حال علی گڑھ تحریک کے بعض مفید اثرات کو انھوں نے بہت جلد قبول کر لیا۔ ان میں سے سب سے پہلی چیز ملت کی بربادی کا درد اور احساس ہے۔ ان کے وہ رنگین ترانے جو اب تک حسن و عشق کی جھوٹی کہانیوں سے لبریز ہوتے تھے، اب قوم و ملت کے عشق سے خوں افشاں ہونے لگے۔ مسلمان کیا تھے اور کیا ہو گئے۔ یہ احساس اب ان کی قومی نظموں کا موضوع بن گیا۔"

اسی احساس کو وہ عیدیہ قصیدہ ۱۸۸۳ء میں پیش کر چکے تھے اور اب ایک پوری نظم مثنوی، صبح امید کے نام سے کہہ دی۔ اسی رنگ میں رنگی ہوئی مولانا حالی نے "مد و جزر اسلام" کے عنوان کے تحت ۱۸۷۹ء میں ایک مثنوی لکھی تھی، جو مسدس حالی کے نام سے مشہور ہو گئی تھی۔ اس لیے اولیت (۳) کا شرف تو مولانا حالی ہی کو حاصل ہوا، مگر مولانا شبلی نے اس رنگ کو مثنوی میں پیش کر کے اور جلا دے دی اور مثنوی کو قومی نظم کے لیے استعمال کر کے مثنوی کی آبرو رکھ لی مولانا نے یہ مثنوی شروع ۱۸۸۵ء میں لکھی جو فروری میں شائع ہوئی۔ آغاز اس طرح ہوا:

ادراک حال ماز نگہ می تواں نمود — حرفے زحال خویش بہ سیما نوشتہ ایم
کیا یاد نہیں ہمیں وہ ایام — جب قوم تھی مبتلائے آلام

اس کے بعد قوم کی بد حالی کے ذکر ہے اور پھر یاد دلا رہے ہیں اسلام کی ترقی اور فتوحات اسلامی کو۔ فرماتے ہیں:

وہ قوم کہ جان تھی جہاں کی — جو تاج تھی فرق آسماں کی
تھے جس پہ نثار فتح و اقبال — کسریٰ کو جو کر چکی تھی پامال
گل کر دیے تھے چراغ جس نے — قیصر کو دیے تھے داغ جس نے
وہ نیزہ، خوں فشاں کہ چل کر — ٹھہرا تھا فرانس کے جگر پر
روما کے دھوئیں اڑا دیے تھے — اٹلی کو کنویں جھکا دیے تھے

اس کے بعد مختلف علوم و فنون کی ترقی کا ذکر ہے۔ زبان و ادب کا ذکر اس طرح ہے:

میدان سخن جو روبرو تھا — فارس کی زباں پہ طرقوا تھا

پھر قوم کے ادبار کا ذکر اس طرح ہے:

وہ ابر کہ چھا رہا تھا یکسر
دو دن ہوئے کھل گیا برس کر
پستی نے دبا لیا فلک کو
خورشید ترس گیا چمک کو
اب خضرؑ کو گمرہی کا ڈر ہے
عیسیٰؑ کو تلاش چارہ گر ہے
جو ابر ابھی برس گیا ہے
اک بوند کو اب ترس گیا ہے
اسلام کی جان پر بنی ہے
دم توڑ رہا ہے جاں کنی ہے

اس کے بعد اردو شاعری کا مذاق اڑاتے ہوئے لکھتے ہیں:

بیہودہ فسانہائے پاریں
زلف و خط و خال کے مضامیں
وہ نوک مژہ کی نیزہ بازی
وہ ترکِ نگہ کی فتنہ سازی
یہ طرز خیال تھا ہمارا
یہ فن ، یہ کمال تھا ہمارا
جغرافیہء وجود سارا
ہر چند کہ ہم نے چھان مارا
کی سیر بھی گرچہ بحر و بر کی
لیکن نہ خبر ملی کمر کی

اس کے بعد گروہ بندی اور کفر کے فتووں کی فراوانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

لڑ پڑتے تھے بات بات میں ہم
ڈوبے تھے تعصبات میں ہم
دکھلائی کمال دین داری
مومن کو بنا دیا جو ناری
تکفیر ہمارا ہی چلن تھا
زندیق تو تکیہء سخن تھا
دشمن کو نہ کر سکے موافق
مومن کو بنا دیا منافق
گمراہ تو سیکڑوں بنائے
رستے پہ نہ ایک کو بھی لائے

اور اس شعر میں تو بڑا زبردست طنز ہے۔ لکھتے ہیں:

خلق نبویؐ کی تھی یہ تصویر
آپس میں تبر ایک گرم تکفیر
تصنیف میں گالیوں کی بھرمار
تحریر کہ لعنتوں کا انبار

علی گڑھ تحریک کو کس خوبی سے روشناس کراتے ہیں اور اس کی خوبیاں گناتے ہیں:

جھونکے جو چلے نئی ہوا کے
آغوش میں آ گیا فنا کے
وہ بزم رہی ، نہ جام و ساغر
یک بار الٹ گیا وہ دفتر

اس کے بعد قوم کے ادبار اور پستی کی طرف متوجہ کرنے والے (سرسید) کی طرف بڑی

خوبی سے متوجہ کیا ہے:

ماتم تھا یہی کہ آئی ناگاہ — اک سمت سے اک صدائے جانکاہ
اس شان سے تھی وہ آہ دلگیر — پہلو میں اثر، بغل میں تاثیر
دل ہاتھ سے لینے میں بلا تھی — جادو تھی؟ فسوں تھی؟ جانے کیا تھی؟

اس کے بعد سرسید کا سراپا کس خوبی سے پیش کیا ہے:

دیکھا تو وہاں بجاہ و تمکیں — آیا نظر ایک پیر دریں
صورت سے عیاں جلال شاہی — چہرے پہ فروغ صبح گاہی
وہ ریش دراز کی سپیدی — چھٹکی ہوئی چاندنی سحر کی
پیری سے کمر میں اک ذرا خم — توقیر کی صورت مجسم
وہ ملک پہ جان دینے والا — وہ قوم کی ناؤ کھینے والا
اٹھتے ہوئے جوش سے بہ رقت — ہے مرثیہ خوان قوم و ملت

قوم کا مصلح قوم سے کہتا ہے:

نالاں ہیں کہ "اب سے بھی تو جاگو" — اے خواب گراں کے سونے والو
آخر کب تک یہ خوابِ غفلت — اٹھو تو ذرا نقابِ غفلت
تا چند رہو گے مست و سرشار — اٹھو! کہ سحر ہوئی نمودار
سوچو تو ذرا! کہ حال کیا ہے؟ — کس خواب میں ہو؟ خیال کیا ہے؟
غفلت میں جو شب بسر ہوئی ہے — لو اب تو اٹھو! سحر ہوئی ہے

آگے چل کر کہتے ہیں:

جادو کی بھری ہوئی وہ تقریر — ہونٹوں سے ٹپک رہی تھی تاثیر
ترغیب کے ساتھ ساتھ تہدید — کچھ یاس تو کچھ نوید امید
کچھ لطف بھی تھا عتاب کے ساتھ — تھا زہر، پہ قندناب کے ساتھ
باتوں میں اثر تھا کس بلا کا — اک بار جو رخ پھرا ہوا کا
امید کی بڑھ گئی تگ و تاز — اونچی ہوئی حوصلوں کی پرواز

سرسید کے علی گڑھ کالج کے لیے چندہ نے کی مہم کا ذکر کس خوبی سے کرتے ہیں:

وہ کشتہء قوم وہ فدائی — اٹھا لیے کاسہء گدائی

اک ایک سے عرض حال کرتا　　در در وہ پھرا سوال کرتا
ہر بزم و ہر انجمن میں پہنچا　　ہر باغ میں ، ہر چمن میں پہنچا

علی گڑھ کالج کے قائم ہونے کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں:

روشن ہوئی بزم گاہ امید　　نکلا افق شرف سے خورشید
قائم ہوا یادگار ایام　　وہ مدرسۃ العلوم اسلام

اس کی ترقی کو بیان کرتے ہیں:

یہ اوج وہ خیال امید　　یہ قوم کا نونہال امید
صد شکر کہ آج بارور ہے　　جو شاخ ہے اس کی پر ثمر ہے
لایا ہے وہ برگ و بار کیسا　　اعدا کو ہے خار خار کیسا

آخر میں حجرہ نشین حضرات کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں: اور مولانا کا یہی جرم کبھی معاف نہ ہوا کہ مرنے کے بعد بھی کفر کے فتنوں سے نوازے گئے۔

اے مدعیان حبّ اسلام　　حجروں میں تو اب کرو نہ آرام
دعوے ہیں تو کچھ ہنر دکھاؤ　　ہمت کے قدم ذرا بڑھاؤ
دیکھو رہ جستجو نہیں ہے　　میدان یہی ہے ! گو یہی ہے
انداز عرب اگر ہے خوں میں　　باقی ہے وہ جوش اگر لہو میں
موقع ہے یہی ہنر دکھاؤ　　جو کہتے تھے ، آج کر دکھاؤ

کیا چیز دکھلانے کو کہتے ہیں:

اس جام میں ہے شراب باقی　　مرجھا گئے پھول ، بو وہی ہے (۵)

۵ - فروری ۱۸۸۵ء کو اس مثنوی کے چھپ کر جلد آنے کی اطلاع مولوی سمیع کو دی۔ اس کی عام قیمت چار آنے مقرر ہوئی۔ مگر خاص لوگوں (قدردانوں) کے لیے ایک روپیہ مقرر کی تھی۔ خاص قیمت مقرر کر کے اسکول کی امداد کا ذریعہ بنایا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سب سے پہلا نام اپنے والد کا لکھا ہے، اس کے بعد اپنے احباب اور اعزا کے ناموں کو گنایا ہے۔ الہ آباد سے مولانا کے ایک عزیز کا آٹھ نسخوں کے لیے بحساب ایک روپیہ آرڈر آیا تھا۔ ناموں کی فہرست دینے کے بعد لکھتے ہیں

"دیکھیے خاص و عام کی تفریق کیوں کر ہوتی ہے۔" (۶)

اپریل ۱۸۸۵ء میں مولانا کے منجھلے بھائی مسٹر مہدی حسن جب انگلینڈ جانے لگے تو مولانا کے والد شیخ حبیب اللہ مرحوم نے اس تقریب میں ایک جلسہ منعقد کیا۔ مولانا نے اس موقع پر ایک فارسی نظم کہی جس کو مشہور دعائیہ مصرعے پر ختم کیا تھا۔ "بہ سلامت روی باز آئی۔" اس نظم کے دو شعر یہ ہیں:

خار در دیدہء عدو شکنی حاسداں را جگر گداز آئی
ما بہ نادیدہ در رہت باشیم کہ تو ناگہ ز در فراز آئی (۷)

۵۔ اگست ۱۸۸۵ء کو مولوی سمیع کا خط ملا کہ مولانا کی اہلیہ کی طبیعت خاصی خراب ہے۔ مولانا نے دو ہفتہ کی رخصت لی، گاڑی منگوائی اور سفر کا پورا ارادہ کر لیا تھا کہ دوسرا خط ملا جس میں طبیعت کچھ بہتر لکھی تھی۔ مولانا نے سرسید سے مشورہ کیا تو سرسید نے روک دیا۔ اس لیے مولانا رک گئے اور اعظم گڑھ نہ گئے۔

اسی زمانے میں خبر اڑ گئی تھی کہ نظام حیدر آباد (دکن) سالار جنگ سے ناراض تھے اور سالار جنگ نے استعفیٰ دے دیا اور سرسید کو وزارت پیش کی گئی تھی۔ مولانا نے اس خبر کی تردید کی اور لکھا کہ سرسید اس زمانے میں حیدر آباد (دکن) بے شک گئے تھے، مگر اس میں کوئی اصلیت نہ تھی کہ سالار جنگ سے نظام ناراض تھے اور انھوں نے استعفیٰ دے دیا تھا۔ البتہ نظام نے سرسید کی چند بار دعوت ضرور کی۔

سید محمود اس زمانے میں علی گڑھ میں تھے اور کالج میں ایف۔ اے اور بی۔ اے کے طلبہ کو دو گھنٹے پڑھاتے تھے۔ ان کی کثرت معلومات، طرز ادائے مطلب و وسعت تحقیقات پر طلبہ حیرت کرتے تھے۔

چندے کے روپے جلد بھیجنے کا ارادہ تھا۔ مولانا نے کچھ رومال بھیجے تھے جو احباب کے لیے تھے، مگر میاں حمید نے سب گم کر دیے جس کا مولانا کو بڑا افسوس ہوا۔ مولانا نے مولوی سمیع کو تاکید کی کہ اہلیہ کے حالات مرض سے مولانا کو باخبر رکھیں، اس لیے کہ مولانا بڑے متفکر تھے (۸)۔

مولانا نے اسی سال ایک فارسی مثنوی لکھی، لیکن اس مثنوی کو وہ پورا نہ کر سکے۔ اس میں کل چھبیس (۲۶) اشعار ہیں۔ چند اشعار یہ ہیں:

فرحت آں برگزیدہء احباب گفت روزی بمن زروی عتاب

کای بہ بے حاصلے بسر بردیم   ہرزہ خون دل و جگر خوردہ

آخر کے دو شعر یہ ہیں:

شاعرے نہ ہمیں سخن سازیست   کہ ومہ بلطف پردہ گونہ گوں باز یست
طرز اندیشہ نو کنم اکنوں   نشنیدی کہ الحدیث شجون (۹)

اکتوبر ۱۸۸۵ء میں نواب ضیاء الدین خاں نیر کا انتقال ہوا تو مولانا نے سات بند کا ایک مرثیہ لکھا۔ یہ وہی نیر دہلوی ہیں جنھوں نے مولانا شبلی کے اکثر اشعار علی حزیں سے بہتر بتلائے تھے پہلا بند یہ ہے:

گرم ہنگامہ شوای نالہ، دل ہاں برخیز   از پئے برہمی عالم امکاں برخیز
تو ہم اے آہ جہاں سوز بسا ماں برخیز   ای جنوں باز بتاراج گریباں برخیز
چشم خوں نا بہ فشاں خواست چو طوفاں کردن   خوں شوای دل، کہ توانم سروساماں کردن (۱۰)

تیسرے بند میں مرحوم کی سخن گوئی کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

تاچہ ہست ایں کہ دل از نالہ نیا سود ہنوز   ہمچناں زخم جگر ہست نمکسود ہنوز
اشک ازدیدہ برآید جگر آلودہ ہنوز   آتشی ہست ہمانا کہ رود رود ہنوز
فاش گویم کہ سخن گوی زماں روی نہفت
تیرہ شد دہر کہ نیر زجہاں روے نہفت

آخری بند یہ ہے:

شبلیا دست نہ در دامن ادراک بزن   شیشہ، صبر دریں حادثہ بر خاک بزن
ای جنوں جیب و گریباں خرد چاک بزن   تو ہم ای نالہ سرا پردہ، افلاک بزن
گر نہ خوں گشتہ بمژگاں ترم سے آئی
آخر اے دل بچہ کاردگرم سے آئی (۱۱)

حواشی:

۱۔۔۔ بحوالہ مقالات شروانی، صفحہ ۱۶۹، مطبوعہ شروانی پرنٹنگ پریس، علی گڑھ۔
۲۔۔۔ ترکوں کے لیے چندہ جمع کر کے مولانا نے قومی درد کا پہلا ثبوت دیا تھا۔
۳۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۱۳۲

۴ ـــ مولانا حالی مولانا شبلی سے بیس سال بڑے تھے۔ یہ دونوں علی الترتیب ۱۸۳۷ء اور ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے تھے
۵ ـــ کلیاتِ شبلی اردو، طبع سوم ۱۹۴۰ء، صفحہ ا، معارف پریس، اعظم گڑھ
۶ ـــ مکاتیبِ شبلی، حصہ اول، صفحہ ۴۳، ۵۔ فروری ۱۸۸۵ء
۷ ـــ حیاتِ شبلی، صفحہ ۶۶
۸ ـــ مکاتیبِ شبلی، حصہ اول، صفحہ ۷۶ ـ ۷۷، ۶۔ اگست ۱۸۸۵ء
۹ ـــ مثنوی ناتمام، صفحہ ۴۴، دیوان شبلی یعنی مجموعہ نظمہائے فارسی۔ مطبع نامی کان پور
۱۰ ـــ مرثیہ نواب ضیاالدین خاں مرحوم دہلوی متخلص بہ نیر۔
۱۱ ـــ کلیاتِ شبلی، صفحہ ۳۲ ـ ۳۳، مطبوعہ معارف پریس، اعظم گڑھ

۱۸۸۶

مولوی سمیع کی والدہ محترمہ کا جنوری ۱۸۸۶ء میں انتقال ہوا تو مولانا نے تعزیت کا خط لکھا۔ مولانا پر بھی اس سانحے کا خاصا اثر ہوا(۱)۔ انگلستان سے مہدی جو خطوط لکھتے تھے ان میں وہاں کی عورتوں کی آزادی (۲) اور بے باکی کا ذکر ہوتا تھا اور چوں کہ باپ کے پاس خط آتے تھے، وہ خط پا کر اور خیریت معلوم کر کے خوش ہوتے تھے اور ان کے خطوط خوش ہو کر دوسروں کو سناتے تھے۔ سننے والوں میں ہر قسم کے لوگ ہوتے تھے۔ لہٰذا وہ بر بنائے حسد آپس میں چہ می گوئیاں کرتے تھے اور حاشیہ آرائی کرتے تے، جس سے خاندان کی عزت کو دھبہ لگ رہا تھا۔ چناں چہ مولانا نے حاشیہ آرائی کرنے والوں سے ناراضگی اور بیزاری کا اظہار کیا۔ اس لیے حمید الدین کو لکھتے ہیں:

> "نامہ از من کہ بہ مہدی حسن بودو درنامہ، میاں عبدالحمید ذکرش بمیان آمدہ است ہمیں کہ بر جانب دیگرش بازمی نویسم،
> ہرچند دانم کہ فرومایگان سخنہائے ------ رابر خود گرفتہ باشند، وبزمہا آراستہ تاہم بمن بازتواں گفت کہ ایشاں چہ ہرزہ اندیشیدہ اند و چہ لاف ہا بافتہ حیف"۔(۳)

مہدی نے اپنے خطوط میں انگلستان کی دلچسپیوں کا ذکر جاری رکھا اور ان خطوط کے متن کی اطلاع مولانا کو دی جاتی رہی۔ اس پر مولانا نے ناراضگی کا اظہار کیا اور مولوی سمیع کو لکھا کہ سوائے ان کی تعلیم اور خیریت کے اور کچھ نہ لکھا جائے اور آئندہ اس بات کی پابندی کی جائے۔

مولانا نے مولوی سمیع کو ہدایت کی کہ مضمون نگاری کیا کریں اس طرح مضمون لکھنے کی مشق ہو جائے گی اور اس کو آفتاب اخبار میں شائع کرایا کریں۔ مولانا اصلاح دینے پر تیار تھے۔

۱۶۔ فروری ۱۸۸۶ء کو کالج میں ان طالب علموں کے اعزاز میں جلسہ ہونے والا تھا۔ جنھوں نے ولایت میں کامیابی حاصل کی تھی۔ دعوت بھی تھی۔ مولانا کو اس زمانے میں ضعف دماغ کی شکایت تھی اس کے باوجود ایک نظم خاص اس موقع کے لیے کہہ کر پڑھنے والے تھے۔ سید محمود انگریزی میں تقریر کرنے والے تھے اور صرف مولانا کا انتخاب اردو میں تقریر کرنے کے لیے ہوا تھا(۴)۔

کالج کے قواعد میں داخل تھا کہ طلبہ مغرب کی نماز باجماعت ادا کریں مگر عملی طور پر اس کی کوئی خاص پابندی نہ تھی۔ مولانا نے طلبہ میں ایسا مذہبی جوش پیدا کر دیا کہ لڑکوں نے خود ایک مجلس بنائی اور اس کا نام لجنتہ الصلوۃ رکھا۔ اس کا سیکریٹری بی۔اے کا طالب علم تھا اور بہت سے تعلیم یافتہ حضرات اس کے ممبر تھے۔ فجر کی اذان انگریزی تعلیم یافتہ دیتا تھا۔ پانچوں وقت کی نمازوں میں جماعت کا اہتمام کیا جاتا تھا اور مغرب کی نماز کا تو لطف دوبالا ہو جاتا تھا کیوں کہ سرسید بھی اس میں شرکت کرتے تھے اور عامل بالحدیث ہونے کی وجہ سے "آمین" زور سے کہتے تھے۔ ان کی بھاری بھرکم آواز سے مسجد گونج جاتی تھی اور مذہبی جوش میں اضافہ کرتی تھی۔ مولانا کبھی کبھی اسلام پر لکچر دیتے تھے جس سے ان کی مذہبی دلچسپی میں اضافہ ہوتا تھا اور ولولہ و جوش پیدا ہوتا تھا۔ یہ سب محض ترغیب دلانے کا نتیجہ تھا۔ کسی دباؤ یا سختی کی بنا پر نہ تھا۔ اسی زمانے میں کالج میں مسجد تعمیر کرانے کی تجویز ہوئی۔ اس میں بھی دینی جوش کار فرما تھا۔ وہ بھی پورے عقل و ہوش کے ساتھ۔ چناں چہ سید محمود تعمیر کے معاملے میں ذاتی دلچسپی اور پوری سرگرمی سے مہتمم خاص بنے اور تین ہزار چندہ دینے کا وعدہ کیا۔ مولانا نے بھی بقدر حبثہ (تنخواہ اور مالی حیثیت کے لحاظ سے) حصہ لیا۔ یعنی ۵۰ روپے چندہ دیا جو اس زمانے کے لحاظ سے گراں قدر رقم تھی۔ سید محمود کا خود ہاتھ میں پھاوڑا لے کر مسجد کی نیو کھودنے کا ارادہ تھا۔ مسجد کی تعمیر کی لاگت کا تخمینہ ساٹھ ستر ہزار روپیہ تھا۔ مولانا ان چیزوں کو دیکھتے تھے اور خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے اور خوش ہو کر وطن والوں کو اطلاع دیتے تھے اور ان کو بھی خوشی میں شریک کرتے تھے۔ مگر اس وقت افسردہ اور ملول ہو جاتے تھے جب یہ دیکھتے تھے کہ اسحٰق اور عثمان میں مذہبی پابندی، دینی حمیت اور اسلامی جذبہ نہیں۔ ان لوگوں نے ترقی و لیاقت کا طرہ، فخر صرف لامذہبیت کو سمجھ رکھا تھا۔ حالاں کہ لیاقت دنیا سے کوئی نرالی نہ تھی۔۔ بہرحال مولانا اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان حضرات کے لیے پر امید اور دعاگو تھے (۵)۔ مولانا غیر مقلدوں کے لیے اب خاصے نرم پڑ گئے تھے۔ ان کے عمل پر معترض ہونا تو درکنار، آمین بالجہر کہنے پر کھل اٹھتے تھے اور اس کو مذہبی جوش کو بڑھانے کا سبب جاننے لگے تھے۔ مولانا جیسے کٹر حنفی کی یہ تبدیلی سرسید کے اثر اور کالج کی روشن خیالی اور فرقہ وارانہ اتحاد کا نتیجہ تھی۔

مولانا کو مولوی سمیع سے بڑی محبت تھی اور مولوی سمیع کو بھی مولانا سے بڑی عقیدت تھی (۶)۔ لہٰذا مولانا ان کے خط نہ لکھنے پر کبھی ناراض ہوتے، کبھی طنز کرتے تھے اور کبھی

چکارتے ۔ چناں چہ ادھر عرصے سے ان کا خط نہیں آیا تھا، اس لیے پریشان تھے ۔ اس پریشانی میں ان کو لکھا کہ ان کی کوتاہ قلمی ان کے جوش کو برباد کر دیتی ہے ۔ لہذا ٹکٹ کے دام خواہ مولانا کے حساب میں رکھے جائیں لیکن خدا کے واسطے جواب دسویں پندرھویں آنا چاہیے ۔

مولانا دو ایک مہینہ سے دماغی تھکن محسوس کر رہے تھے ۔ اس لیے کوئی علمی کام نہ کر سکے تھے ۔ دوسرے یہ کہ دوسری شادی کا مسئلہ چھڑا ہوا ہوگا ۔ مولانا اس پر آمادہ نہیں ہو رہے تھے ۔ لہذا ان الجھنوں میں مبتلا ہوں گے ۔ ان کا ارادہ تھا کہ گرمیوں کی چھٹیوں میں باقاعدہ علاج کرائیں ۔ اس لیے بندول (وطن) میں صرف دو تین روز رہنے کا اور باقی وقت اعظم گڑھ میں گزارنے کا ارادہ تھا ۔

مولانا اپنے خاندانی معاملات میں بھی مولوی سمیع کو دخیل کیے ہوتے تھے اور اپنے والد صاحب کے اور اپنے درمیان میں بعض معاملات میں واسطہ بناتے تھے ۔ چناں چہ ان کو لکھا کہ دو چوکیاں چھوٹے پایوں کی تیار کرائیں جیسی اس سے قبل حافظ حسن علی صاحب نے ایک چوکی خریدی تھی اور وہ اس وقت (۷) چھاؤنی میں تھی ۔ طول عرض میں کچھ زیادہ ہونا چاہیے ۔ لکڑی کے لیے والد صاحب سے پوچھنے کو لکھا کہ شاید گودام میں ہو تو مل جائے، ورنہ پھر خریدنے کا بندوبست کر کے قیمت سے مطلع کرنے کی خواہش کی، مگر مارچ کے آخر تک تیار ہونا ضروری تھا ۔ یہ گویا گرمیوں کی چھٹی میں اعظم گڑھ میں قیام کی تیاری تھی ۔ تعطیل میں جنیہ (۸) کو اپنے ساتھ اعظم گڑھ میں رکھنے کا ارادہ تھا ۔

آفتاب ہند میں نظیر محمد کا مضمون دیکھ کر خوش ہوئے اور فکر ہوئی کہ کس نے لکھا ہے اس لیے کہ وہ خود لکھ نہ سکتے تھے ۔ بہر حال مضمون اچھا تھا ۔ اس ذکر کو چھوڑ کر مولوی سمیع کو بھی لکھنے کی طرف توجہ دلائی ۔

اسی زمانے میں علی گڑھ میں بر ہیڑوں کے خیر مقدم کے سلسلے میں خوب جلسے ہوئے ۔ مولانا کو بھی لطف آیا ۔ آنریبل نواب عبد المجید جون پوری مقیم الہ آباد مولانا سے بڑی محبت سے ملے اور اصرار کے ساتھ الہ آباد بلایا اور اپنے یہاں ٹھہرنے کی تاکید کی اور قبل سے اطلاع کرنے کو کہا ۔

۔ مولوی عبد الغفور بھی بڑے تپاک سے ملے، مگر شاہ امجد اللہ سے مل کر مولانا خوش نہیں ہوئے ۔ ان کو اپنے عہدے کی کچھ تمکنت تھی ۔ لہذا مولانا نے لکھا کہ ان لوگوں کو مستغنی اس سے

زیادہ مغرور کرتی ہے، جتنا فرعون کو مصر۔ لیکن مولانا کو ان لوگوں سے کوئی خاص تعلق نہ تھا۔ اس لیے ان کے طرز عمل سے کوئی خاص شکایت نہ رہی۔ مولوی عبدالغفور نے مہدی (۹) کے بے تمیزی کے خطوط کا ذکر کیا، جن میں لیڈیوں کے ناچ کا ذکر تھا۔ مولانا کو اس پر تعجب ہوا کہ یہ خبریں دوسروں کو کیسے پہنچی تھیں۔ ایسا اندازہ تھا کہ مولانا کے والد لوگوں کو وہ خط پڑھ کر سناتے تھے اور لوگ بعد کو نکتہ چینی کرتے تھے اور وہ پھیل جاتی تھی۔ مولوی محمد عمر صاحب کے نام خط میں علی گڑھ کے مذہبی جوش کا ذکر تھا۔ اس میں اسحٰق اور عثمان کا بھی ذکر کیا تھا۔ بعد کو خیال کیا کہ ناحق لکھا، اس لیے پھر لکھا کہ وہ خط کسی اور کو نہ دکھایا جائے۔ مولانا نے ان دنوں اردو کی ایک غزل لکھ کر حمید کو بھیجی تھی۔ لہٰذا مولوی سمیع کو لکھا کہ اس کو منگوا کر محفوظ کر لیں۔ نیز اس زمانے میں داغ اور حالی کی دلی میں دھوم تھی۔ ان کی دو تین غزلیں اخبار میں بھی چھپی تھیں۔ داغ کے دوسرے دیوان چھپ جانے اور تیسرے کے چھپنے کی اطلاع دی اور اپنی مثنوی کے متعلق لکھا کہ اس کو اہل سخن نے پسند کیا (۱۰)۔

مولانا کو جو کتاب پسند آتی تھی وہ چاہتے تھے کہ دوسرے بھی پڑھیں اور خریدیں۔ اپنے احباب کو خصوصاً توجہ دلاتے تھے۔ چناں چہ اسی زمانے میں مولانا حالی کی لکھی ہوئی حیاتِ سعدی چھپی اور مولانا حالی نے مولانا کو تحفۃً بھیجی۔ انھوں نے پڑھی اور بہت پسند کی اور مولوی سمیع کو ترغیب دلائی کہ نہایت دلچسپ اور محققانہ سوانح عمری ہے۔ مولانا نے مولوی سمیع کے لیے اس کو بے حد پسند کیا اور مولانا حالی کو لکھ دیا کہ مولوی سمیع کے نام بھیج دیں۔ ادھر مولانا حالی کو لکھا اور ادھر مولوی سمیع کو کہ واپس نہ کر دیں اور قیمت بھی لکھ دی کہ ایک روپیہ چار آنے ہے۔ مزید اس کی تعریف کی کہ واقعی بے مثل ہے اور پاس رکھنا ضروری ہے اور اس کتاب کے اور بھی خریدار پیدا کرنے کی ضرورت پر زور دیا (۱۱)۔

مولانا کے خط کے جواب میں جہاں کسی سے سستی ہوئی اور مولانا ناراض ہوئے یا طنزیہ خط لکھا۔ چناں چہ مولوی سمیع کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"تمھاری بے پروائیوں نے اگرچہ دل سرد کر دیا، تاہم بے حیائی کر کے پھر تم کو لکھتا ہوں (۱۲)۔"

مولانا کی اس زمانے میں طبیعت خراب تھی اور گرمیوں کی چھٹی کے ساتھ ہی مولانا نے رخصت لے لی تھی تاکہ جم کر اپنا علاج کراتے۔ گرمیوں کی چھٹی ڈھائی ماہ کی تھی مگر مولانا کی چھٹی

تین ماہ پندرہ دن تھی - مولانا کا ۲۶ - مارچ کو علی گڑھ سے روانہ ہونے کا خیال تھا اور کچھ دنوں الہ آباد ٹھہر کر اعظم گڑھ پہنچنے والے تھے - مولوی سمیع کو لکھا تھا کہ چوکیوں کا بندوبست کر دیں، اس کے لیے متفکر رہے کہ کیا گیا کہ نہیں - اسی زمانہ میں وزیر الدولہ خلیفہ سید محمد حسن (۱۳) وزیر ریاست پٹیالہ، علی گڑھ کالج تشریف لائے تھے - ان کے اعزاز میں کالج میں خوب جلسے ہوئے - وہ مولانا کو پہلے سے جانتے تھے - لہذا بڑی محبت سے ملے - دعوت کے جلسے میں سید محمود کی فرمائش سے مولانا نے چند بند فارسی میں لکھے اور کھانے کے بعد پڑھے - ایک تو مولانا کے فارسی اشعار، پھر خاص ترنم سے پڑھنا، عجیب سماں بندھ گیا - لوگ بیتاب ہو گئے - سید محمود کی تو یہ حالت ہو گئی کہ قرار نہ تھا اور اٹھ اٹھ کر ہر بند کو بار بار پڑھواتے تھے اور جی نہ بھرتا تھا - وزیر صاحب نے کہا کہ چوں کہ اس میں ان کی تعریف تھی لہذا داد نہیں دے سکتے کیوں کہ اپنی تعریف کی داد دینا گویا خود اپنی تعریف اپنے منہ سے ہوتی - پہلا بند یہ ہے:

اے دل این مایہ انتظار کہ بود ؟   آخر ایں سستی از خمار کہ بود ؟
چشم شوقت بہ رہ گزار کہ بود ؟   ہوس سرمہ، غبار کہ بود ؟

ایں بہ بیں خانہ جلوہ گاہ کہ ہست
پردہ، دیدہ فرش راہ کہ ہست (۱۴)

مثنوی پریس سے چھپ کر اب تک نہ آسکی تھی - خیال تھا کہ علی گڑھ سے روانگی (۱۶- مارچ ۱۸۸۶ء) سے قبل آجاتی تو اپنے ساتھ وطن لے جاتے - مولانا طبیعت کی خرابی کی وجہ سے کوئی اور کام نہ کر سکے - نیشنل اسکول کی حالت بھی بہت کم معلوم ہو سکی - اسی زمانے میں مولانا حالی نے مسدس پر جو اضافہ (ضمیمہ) کیا تھا وہ مولانا کو بھیجا - لہذا مولانا نے مولوی سمیع کے لیے لے جانے کا ارادہ کیا (۱۵) -

گرمیوں کی تعطیل ختم کر کے واپس علی گڑھ آگئے مگر طبیعت کی خرابی کا سلسلہ جاری رہا اور تبخیر کی شکایت موجود رہی - نیشنل اسکول کے طلبہ نے جو امتحان میں نمبر پائے تھے، مولانا کو اس کی اطلاع ملی - لہذا مولانا اس نتیجے سے مطمئن ہو گئے اور دریافت کیا کہ اب تو کوئی شکایت نہیں - کہیں ایسا تو نہیں کہ اساتذہ ٹھیک نہ پڑھاتے ہوں یا پڑھا نہ سکتے ہوں - ۱۸۸۶ء میں جرمنی میں ایک اجتماع ہونے والا تھا جس میں عربی اور فارسی وغیرہ پر جدید تحقیقات کو پیش کیا جانا تھا - حکومت ہندوستان کی طرف سے حمید اللہ خاں پسر مولوی سمیع اللہ خان کا انتخاب ہوا کہ

وہ اس میں شرکت کریں اور مقالہ پڑھیں۔ انھوں نے سرسید کو لکھا کہ وہ اس قابل نہیں۔ لہٰذا کسی عالم سے خصوصاً مولانا شبلی سے مقالہ لکھوا کر بھجوا دیں۔ ان کا ارادہ تھا کہ جو شخص لکھے گا اسی کے نام سے اس اجتماع میں مقالہ پڑھا جائے گا۔ چوں کہ وقت کم تھا اور طبیعت ٹھیک نہ تھی، تھوڑا سا لکھنے سے سر چکرانے لگتا تھا اس لیے اس کا امکان تھا کہ نہ لکھ سکیں۔ مولانا اس دور میں بھی عربی کو باعث شہرت و عزت سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ حمید اللہ خاں اگر عربی سے واقف ہوتے تو تمام دنیا میں ان کے نام کی دھوم ہو جاتی۔ تعطیل میں مولانا کے والد، چھوٹے بھائی جنید، صاحبزادے حامد کا علی گڑھ جانے کا ارادہ تھا۔ مولانا کی خواہش تھی کہ ان کے چچا شیخ مجیب اللہ اور مولوی سمیع بھی ان کے ہمراہ ہوتے تو لطف رہتا۔ اس زمانے میں یہ خبر اڑی تھی کہ سید محمود کو لکھنؤ کی ججی پر مقرر کیا جانے والا ہے۔ لیکن مولانا نے تردید کی۔ کیوں کہ اس وقت تک کوئی بات طے نہیں ہوئی تھی۔ ایک خبر یہ بھی اڑی تھی کہ مولانا کو علی گڑھ کالج کا منیجر مقرر کیا جانے والا ہے۔ اس خبر کی بھی مولانا نے تردید کی (۱۶)۔

مولانا کے چچا کی اس زمانے میں طبیعت خراب ہوئی اور انھوں نے ڈاکٹری علاج کیا تو مولانا نے ڈاکٹری علاج سے منع کیا اور رائے دی کہ حکیم حفیظ اللہ صاحب کا علاج کریں۔ اگرچہ خوشامد کرائیں گے، مگر توجہ سے علاج کیا تو فائدہ ہونے کی امید ہے۔

نیشنل اسکول کے لیے حکومت کی اعانت کا مسئلہ درپیش تھا۔ کلکٹر کی سفارش کی ضرورت تھی۔ مولانا نے چاہا کہ ان کے والد کلکٹر سے اسکول کا معائنہ کرا کے جلد رپورٹ لکھوا لیں۔ اس کام میں دیر کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ مولانا کی علالت کا سلسلہ جاری رہا۔ مولوی سید محمد صاحب سے علاج کراتے رہے مگر کوئی فائدہ نہ ہوا تو ۲۷۔ اگست ۱۸۸۶ء کو بغرض علاج دہلی جانے کا فیصلہ کیا۔ دہلی کے احباب نے بھی مولانا کو بغرض علاج بلایا، اس لیے خیال تھا کہ وہاں کے اطباء توجہ سے علاج کریں گے۔ گرمیوں میں سرسید کا ارادہ نینی تال جانے کا تھا۔ مولانا کا بھی ارادہ تھا ان کے ساتھ نینی تال جاتے۔ اسی زمانے میں یہ مسئلہ درپیش تھا کہ نیشنل اسکول میں پست اقوام کے لڑکوں کو داخلہ دیا جائے یا نہیں۔ مولانا کی رائے یہ تھی کہ ایک گشتی مراسلہ کے ذریعہ تمام ممبروں سے اس معاملہ میں استفسار کیا جائے۔ جیسی سب کی رائے ہو اس پر عمل کیا جائے۔

اسی زمانے میں الہ آباد ہائی کورٹ کی ایک شاخ لکھنؤ میں قائم ہو رہی تھی۔ سید محمود لکھنؤ

گئے تھے اور خیال تھا کہ وہ وہاں جج مقرر ہوں۔ تنخواہ اور اختیارات الہ آبادہائی کورٹ کے ججوں جیسے تھے۔ ایک انگریزی اخبار میں مولانا کے منجھلے بھائی مہدی کی کامیابی کی خبر چھپی تھی جو انھیں انگلستان میں ہوئی، اگرچہ کامیابی چوتھے نمبر پر تھی۔ محمد رؤف (۱۷) بیرسٹری کے امتحان داخلہ میں کامیاب ہوئے۔ مولانا کو محمد سمیع سے ان کی مختصر نویسی کی شکایت رہی۔

ان دنوں ملکہ وکٹوریہ نے مدرسۃ العلوم علی گڑھ کو اپنی تصنیف کردہ دو کتابیں تحفۃً بھیجیں۔ اس کے شکریہ میں کالج میں ۲۳۔اگست کو جلسہ ہوا، مولانا نے بھی شرکت کی۔ طلبہ اور ان کی تعلیم کی فکر مولانا کو پریشان کیے رہی۔ مولانا کو امید نہ رہی کہ ان کے چچا علی گڑھ آسکیں گے، کیوں کہ علیل تھے۔ اپنے چچا کو لکھا کہ ان کی (مولانا کی) علالت کی خبر ان کے والد کو نہ ہو ورنہ وہ پریشان ہوں گے۔ اس لیے کہ اس زمانے میں علی گڑھ میں بخار عام تھا۔ اکثر لوگ مبتلا تھے اور اکثر لوگ بیمار ہو جایا کرتے تھے (۱۸)۔

مولانا کو اس زمانے میں اسکول کے حالات کم معلوم ہوئے۔ انسپکٹر کے معائنہ کی بھی فکر رہی۔ جاڑوں کی تعطیل میں اعظم گڑھ میں رہ کر مڈل کلاس کی تعلیم کے انتظام کا ارادہ کیا۔ منجھلے بھائی مہدی کی خیریت اور حالات دریافت کیے۔ چھاؤنی (سوتیلی والدہ) کے حالات معلوم ہونے سے گھبراہٹ ہوئی۔ مولانا کے اعزہ جو ان کے ساتھ رہ کر تعلیم حاصل کر رہے تھے ان کے متعلق بھی اطلاع دی کہ یہ گھبراتے نہیں ہیں مگر چھٹی کے دن گنتے ہیں کہ کب چھٹی ہو اور وطن جائیں۔

اسی زمانے میں مولانا نے عیدیہ قصیدہ میں ایک تقریب سے کچھ تفسیر کیا۔ ۲۶ شعر کا اضافہ کیا اور تقریباً اسی قدر اصل سے کم کر دیے۔ بڑھائے ہوئے شعر ان کی نظر میں بلند پایہ تھے (۱۹)۔

مولانا کا دسمبر کی چھٹیوں میں وطن جانے کا ارادہ نہ تھا، کیوں کہ علی گڑھ میں ۲۸۔دسمبر سے پہلے نیشنل کانگریس (۲۰) کا جلسہ ہونے والا تھا اور مولانا کو اس میں شرکت کرنا تھی۔ مولوی سمیع نے کچھ اشعار مولانا کو بھیجے جو مولانا کو بہت پسند آئے اور لکھا کہ ان کو تو دل لگی سوجھی یا آرائش نامہ مقصود تھا۔ مگر مولانا ان اشعار کو پڑھ کر تڑپ گئے۔ نیشنل اسکول کے مڈل کلاس کی تعلیم کے لیے پرائیوٹ انتظام کرنا چاہتے تھے۔ اسکول کے طلبہ کی قابلیت کا امتحان لینے کا یہ طریقہ سوچا کہ مولوی اسحق سے امتحان کے پرچے بنوائیں اور انھیں سے کاپیاں جنچوائیں۔ امتحان کی نگرانی کی ذمہ داری مولوی محمد عمر کے سپرد کرنا چاہتے تھے۔ چوں کہ مولانا کا چھٹیوں میں وطن جانے کا ارادہ نہ تھا۔ اس لیے ان عزیزوں کی جو مولانا کی نگرانی میں کالج میں تعلیم پا رہے تھے ان کو

کسی خاص شخص کی نگرانی میں ۲۵۔دسمبر تک بھیجنے کا ارادہ تھا۔اور اکبر کے متعلق دریافت کیا کہ ان کا امتحان میں شریک ہونے کا ارادہ ہے یا نہیں (۲۱)۔

حواشی

۱۔۔۔ مکاتیب شبلی، حصہ اول، صفحہ ۷۷-۷۸، ۲۸-جنوری ۱۸۸۶ء
۲۔۔۔ ماہنامہ ادب، علی گڑھ، جولائی-اگست و نومبر ۱۹۶۳ء، مکاتیب محمد مہدی
۳۔۔۔ مکاتیب شبلی، حصہ دوم (فارسی)، صفحہ ۲۳۵-۲۳۶
۴۔۔۔ مکاتیب شبلی، حصہ اول، صفحہ ۷۸-۷۹، ۱۳-فروری ۱۸۸۶ء
۵۔۔۔ مکاتیب شبلی، حصہ اول، صفحہ ۳۶، ۷۳-۲-مارچ ۱۸۸۶ء
۶۔۔۔ مختار احمد صاحب وکیل الہ آباد خلف مولوی سمیع کا خط راقم کے نام
۷۔۔۔ دوسری والدہ کے قیام کی جگہ (شبلی منزل سے تھوڑی دور پر ہے)
۸۔۔۔ مولانا کے چھوٹے بھائی
۹۔۔۔ مولانا کے منجھلے بھائی
۱۰۔۔۔ مکاتیب شبلی، حصہ اول، سمیع کے نام، صفحہ ۹۴ تا ۹۶، ۶-مارچ ۱۸۸۶ء
۱۱۔۔۔ مکاتیب شبلی، حصہ اول، صفحہ ۷۵، ۱۰-مارچ ۱۸۸۶ء
۱۲۔۔۔ مکاتیب شبلی، حصہ اول، صفحہ ۷۹-۸۰، ۱۶-مارچ ۱۸۸۶ء
۱۳۔۔۔ ان کے چھوٹے بھائی خلیفہ محمد حسین نے ڈاکٹر برنیر کے سیاحت نامے کا اردو ترجمہ کیا ہے۔
۱۴۔۔۔ مکاتیب شبلی، حصہ اول، صفحہ ۷۹ (حاشیہ)
۱۵۔۔۔ مکاتیب شبلی، حصہ اول، صفحہ ۷۹-۸۰، ۱۶-مارچ ۱۸۸۶ء
۱۶۔۔۔ مکاتیب شبلی، حصہ اول، صفحہ ۱۷-۱۸، ۱۲-اگست ۱۸۸۶ء
۱۷۔۔۔ بعد کو الہ آباد میں بیرسٹری کی۔
۱۸۔۔۔ مکاتیب شبلی، حصہ اول، صفحہ ۱۸-۱۹، ۱۵-اگست ۱۸۸۶ء
۱۹۔۔۔ مکاتیب شبلی، حصہ اول، صفحہ ۹۶-۹۷، ۲-نومبر ۱۸۸۶ء
۲۰۔۔۔ پہلے اس کا نام محمڈن ایجوکیشنل کانگریس تھا، بعد کو سرسید نے ۱۸۹۰ء سے مسٹر ماریسن کے مشورے سے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کر دیا۔
۲۱۔۔۔ مکاتیب شبلی، حصہ اول، صفحہ ۸۰-۸۱، ۲-ستمبر ۱۸۸۶ء

۱۸۸۷ء

مولانا نے اگست ۱۸۸۶ء (۱) ہی میں ارادہ کر لیا تھا کہ آئندہ گرمیوں کی تعطیل میں سر سید کے ہمراہ نینی تال جائیں گے۔ چناں چہ گرمیوں کی تعطیل میں، بجائے وطن جانے کے نینی تال گئے۔ موسم گرما کی چھٹیاں تھیں، مولانا بآسانی وطن جا سکتے تھے، مگر نینی تال کا ارادہ کر چکے تھے۔ اسی زمانے میں رمضان شریف بھی تھے، اس لیے پہاڑ کا ہی رخ کیا۔ علی گڑھ میں تو احباب کے خطوط کے منتظر رہتے ہی تھے، یہاں خطوط کے جواب کی طلب اور بڑھ گئی۔ چناں چہ مولوی سمیع کا خط آیا تو جواب میں طنزیہ لکھا:

"تمہارا بیش بہا و بیش قیمت کارڈ آیا۔ اس اسراف کا نہایت ممنون ہوں، سچ یہ ہے کہ اگر یہ بھی نہ مرحمت ہوتا تو میرا کیا زور تھا۔ آخر مولوی محمد عمر صاحب کا میں نے کیا کر لیا، جو ضروری عریضے کا جواب بھی بے پروائی کے حوالے کرتے ہیں۔ .... ایک ٹکٹ رکھ دیا ہے، اب جواب آئے تو خط کے پیرایہ میں آئے۔ ٹکٹ کے بھیجنے سے تمہارا احسان کم قیمت نہیں ہو جائے گا، آخر سادہ لفافہ تو تمہارے ہی داموں کا ہو گا۔ مدرسے کے حالات، تعمیر کی تجویز، منشی محمد اکرام کا رقعہ، یہ امور افسوس ہے کہ میں ان کو بھی ضروری خیال کرتا ہوں، افسوس اس لیے کہ تمہاری رائے بھی اس خصوص میں شاید مخالف ہو گی۔ بھائی سامنے کے بہ نسبت آدمی غائبانہ زیادہ پہچانا جاتا ہے۔ کارڈ میں جو کم سخنی صرف ہوتی ہے اس وقت موزوں ہوتی ہے جب سامنے بھی خاموشی میں مولوی فیاض احمد کے ہم زبان ہوتے۔ خیر ایں ہم غنیمت است (۲)۔"

مولانا (۳) کو نینی تال میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ سوائے اس کے کہ روزے آرام سے گزر رہے تھے۔ مولانا کو سید محمود کی بحیثیت جج تقرری سے بڑی دلچسپی تھی، اس لیے جب ان کی تقرری معلوم ہوئی تو بہت خوش ہوئے۔ ان کی تقرری کی بااثر اور معزز انگریزوں نے مخالفت کی تھی، اس پر مولانا نے فرمایا کہ سید محمود کی خوش بختی نے اس مخالفت کی ایک نہ چلنے دی، آخر تقرر ہو کر رہا۔

نینی تال میں ایک بڑا اچھا فوٹو گرافر تھا۔ سر سید کی خواہش تھی کہ مولانا اپنا فوٹو کھنچوائیں، مگر اٹھارہ روپیوں کا خرچ تھا۔ اس سستے زمانے کو دیکھتے ہوئے بڑی گراں قیمت تھی۔ مولانا

تذبذب میں تھے کہ سرسید نے دو تصویروں کے خریدنے کے ارادے کا اظہار کیا۔ بقیہ دس کی خریداری کے لیے مولانا نے مولوی سمیع کو لکھا اور ناموں کی فہرست بھی لکھی کہ اگر وہ لوگ خرید لیتے تو مولانا فوٹو کھنچوانے پر تیار ہو جاتے۔ مولانا نے یہ بھی لکھا کہ اس تحریر کا مقصد یہ نہ تھا کہ مولوی سمیع تصویر کے بیچنے میں دلالی کرتے، ہاں صرف توجہ دلانے کی ضرورت تھی، اگر خود سے تیار ہوتے تو ٹھیک تھا۔ اس فہرست میں کوئی غیر نہ تھا۔ حقیقی بھائی، سوتیلے بھائی، مولانا کے والد اور خاص احباب تھے۔ سرسید سے مولانا قیمت لینے پر تیار نہ تھے مگر قیمت دینے پر ان کو اصرار تھا۔ اسی زمانے میں سرسید اپنا سفرنامہ لکھنا چاہتے تھے۔ اس میں ان کی تصویر بھی ہوتی۔ مولانا کی تصویر بھی اسی غرض سے لینی چاہتے تھے تاکہ اس میں وہ بھی شامل کر دی جائے۔ یہ ارادہ ابھی ارادہ ہی تھا اس لیے مولانا نے مولوی سمیع کو اس کے اظہار نہ کرنے کی تاکید کی۔

اسی زمانے میں پٹنہ محمڈن اسکول کے انٹرنس کے امتحان کا نتیجہ نکلا، آٹھ طلبہ پاس ہوئے، جن میں پانچ مسلمان تھے۔ مولانا کو اس اطلاع پر بڑی خوشی ہوئی، کیوں کہ اس زمانے میں انٹرنس کے امتحان میں بیٹھتے ہی کتنے تھے اور پھر ان میں سے پاس ہونا اور وہ بھی مسلمانوں کا برائے نام ہوتا تھا۔

محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کا اجلاس اس سال لکھنؤ میں ہونے والا تھا۔ پہلا اجلاس ۱۸۸۶ء میں علی گڑھ میں ہوا تھا، جس میں خاص خاص لوگوں نے شرکت کی تھی۔ اس دوسرے اجلاس کے لیے قبل سے تیاریاں تھیں اور اعلیٰ پیمانے پر کرنے کا ارادہ تھا۔ پچھلے سال مولانا نے چند تجاویز پیش کی تھیں اور بعض تجاویز کی تائید کی تھی۔ اب کی سال مولانا کا "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" پر مضمون پڑھنے کا ارادہ تھا۔ اشتہار میں بھی مولانا کا نام اس صراحت کے ساتھ تھا کہ مولانا مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم پر مضمون پڑھیں گے۔ مولانا کا ارادہ خوب جی لگا کر لکھنے کا تھا۔

نینی تال میں مولانا نے کوٹھی نمبر ۱۶۰ ایڈونیسٹیو ایارپاتا میں سرسید کے ساتھ قیام کیا تھا۔ سرسید کے بھتیجے مع اہل وعیال کے اسی کوٹھی میں مقیم تھے۔

مولانا نے نینی تال کی تصویر اپنے مخصوص انداز میں کھینچی اور تسلیم کیا کہ نینی تال ایک عجیب اور حیرت انگیز مقام ہے، لیکن مولانا کا کہنا تھا کہ اگر تعجب انگیز اور دلچسپ و فرحت زا ہونا دو جداگانہ چیزیں ہیں تو مولانا سے یہ امید رکھنا عبث تھا کہ وہ اس کو فرحت زا بھی مان لیتے۔ ہاں جو لوگ انگریزوں کی ہر ادا پر جان دیتے تھے ان کا کیا پوچھنا۔ "ہرچہ آید در دلم غیر تو نیست (۴)۔"

اس کے بعد مولانا نے نینی تال کی پوری تفصیل اس طرح لکھی ہے:

"کاٹ گودام تک ریل ختم ہوتی ہے اور پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، کاٹ گودام سے نینی تال ۱۲ میل ہے، مگر تمام راستہ قدرت الہٰی کی نیرنگی اور عظمت کا مرقع ہے۔ عرض میں پانچ چھ ہاتھ زمین چھوٹی ہوئی ہے، جس پر رستہ چلتا ہے۔ باقی ایک طرف پہاڑ کی وہ ہیبت ناک دیوار ہے جس کی طرف دیکھنے سے نگاہ کانپ جاتی ہے۔ دوسری جانب نہایت عمیق ہولناک غاروں کا سلسلہ ہے اور اگر اس پہاڑ میں سخت سردی نہ ہوتی تو یہ غار بڑے بڑے اژدر اور موذی جانوروں کے دارالسلطنت ہوتے۔ نینی تال جب تین میل رہ جاتا ہے تو پہاڑ کی چڑھائی شروع ہوتی ہے۔ سطح زمین سے اس مقام کا ارتفاع تین میل سے کم نہیں، مگر اس پیچ و پیچ سے راہ نکالی ہے کہ بے اختیار انگریزوں کی ہمت پر آفرین کی صدا بلند ہوتی ہے۔ آپ خود خیال کر سکتے ہیں کہ جو کوٹھا تین میل کا اونچا ہو گا۔ اس کے زینے کیسے پرپیچ اور دشوار گذار ہوں گے۔ کوئی شخص کیسا ہی بے حس یا مستقل دل رکھتا ہو یہاں پہنچ کر ممکن نہیں کہ حیرت کے صدمہ سے بچ سکے۔ تال جو ایک میل سے زیادہ لمبا ہے، یہ ایک نہایت گہرا غار تھا جس کی تھاہ اب بھی غیر معلوم ہے۔ اس میں مدت سے قدرتی چشموں کا پانی گرتا ہے اور اب وہ بھر گیا ہے اور تال کے لقب سے ممتاز ہے۔ شام کو اس کے کنارے میموں اور مسوں کا مجمع ہوتا ہے اور مختلف طرح کے کھیل کھیلتی ہیں، سامنے ایک میدان ہے جس میں انگریز کرکٹ کھیلتے ہیں، یہ سب کچھ ہے مگر چوں کہ اس کے دونوں طرف پہاڑ کی نہایت اونچی دیواریں کھڑی ہیں، مجھ کو یہ جگہ ہر طرف سے نہایت بند اور گھٹی ہوئی معلوم ہوئی۔ مجھ کو یقین ہے کہ جو شخص صحرائیت اور فضائیت (۵) کا دلدادہ ہے، میرے دعوے کی شہادت پر فوراً آمادہ ہو گا۔ جس کوٹھی میں میں ہوں بہت بلندی پر نہیں ہے، تاہم دو دن کی مشق میں نیچے تک پہنچنے اور واپس آنے میں میرا دم ٹوٹ جاتا ہے اور کئی جگہ ٹھہرنا پڑتا ہے۔ ہر ایک کوٹھی سے انگریزوں کی بے روک ہمت، پرجوش محنت کی شہادت ملتی ہے یہاں جو کچھ آرام ہے، صرف یہ ہے کہ کسی وقت یہاں آفتاب کی عمل داری نہیں ہونے پاتی یہی بات ہے جس کے لیے انگریزوں نے لاکھوں، کروڑوں روپے صرف کر دیے ہیں۔ در حقیقت ہم کو انگریزوں سے سبق سیکھنا چاہیے کہ صحت سب چیزوں پر مقدم ہے اور کوئی کام دنیا میں ناممکن نہیں۔ رمضان تو خوب گزرے گا، مجھ کو اگر کچھ دلچسپی ہے تو اسی سے (۶)۔"

مولانا کو کوٹھی میں ذرا مشکل سے جگہ ملی تھی کیوں کہ لوگوں کی زیادتی کی وجہ سے اس میں گنجائش کم رہ گئی تھی۔ مولانا کے سوتیلے بھائی میاں محمد کا بھی نینی تال کا ارادہ تھا۔ مولانا نے

گنجائش کی کمی اور سرسید پر بار کی وجہ سے ان کا آنا پسند نہ کیا۔یہاں بھی مولانا کو مدرسے کی فکر رہی اور اس کے لیے برابر دریافت فرماتے رہے ۔ نینی تال کی کیفیات چوں کہ مولانا نے محنت سے لکھی تھیں، لہٰذا اس خط کو مولوی سمیع کے حوالے کرنے کو لکھا تاکہ دوسرے لوگ پڑھ کر لطف اٹھائیں۔

مولوی سمیع کی غیر معتدل طرز تحریر اور عذر نامعقول سے ناراض ہوئے ۔ اگرچہ کسی قسم کی رنج دلانے والی بات سے کم رنج ہوتا تھا بلکہ اکثر نہیں ہوتا تھا ۔ اعزہ میں سے جو فارسی کی کتاب پڑھتے تھے مولانا نے ان کے لیے ایک وقت پڑھنے کی تجویز کی اور بوستاں کے چار شعر روزانہ ان کے لیے کافی سمجھے اور اس بات کی حمید کو تاکید کی کہ خیال رکھا جائے ۔ مولوی محمد عمر کے عہدے میں ترقی ہوئی تھی لہٰذا مولانا نے مبارک باد دی اور خوشی کا اظہار کیا ۔ مولانا منشی جی سے کوئی رقعہ اسکول کی بابت لکھوانا چاہتے تھے، اس کو اپنے والد کے خط میں دریافت کیا اور مولوی سمیع سے بھی اس کے متعلق دریافت کیا ۔مدرسے کی عمارت کی بھی مولانا کو فکر تھی، لہٰذا معلوم کیا کہ اس کے متعلق کیا کارروائی کی گئی ۔نئے ماسٹر کے بارے میں دریافت کیا کہ ملا یا نہیں مولانا کا ارادہ تھا کہ نینی تال سے وطن جائیں مگر اسکول کے متعلق زیادہ فائدے کی امید نہ تھی ۔ مولانا جو مضمون (مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم) تعلیمی کانگریس کے لیے لکھ رہے تھے اس کی نقل کی ضرورت نہ سمجھی، اس لیے کہ وہ کانگریس کے سپرد کردیا جاتا اور کانگریس اس کو روئداد کے ساتھ شائع کرتی ۔ اسی زمانے میں مولانا نے بہاریہ قصیدہ فارسی میں لکھنا شروع کیا تھا۔اس کے ستائیس شعر کہہ چکے تھے اور بہت بہتر ہو جانے کی امید کر رہے تھے ۔ غالب کے قصائد سے توارد کا اندیشہ تھا، اس لیے مولوی سمیع سے قصائدِ غالب منگوائے تھے تاکہ توارد نہ ہو سکے ۔ مولانا کو امید تھی کہ یہ قصیدہ اپنی شاعرانہ خوبیوں کے لحاظ سے غالب کے قصائد سے بڑھ جائے گا(۷) ۔یہ قصیدہ مکمل نہ ہو سکا اور اس کے ستائیس اشعار بھی پورے نہ مل سکے ۔ یا ممکن ہے کہ مکمل کرلیا ہو مگر نصف (۸) بیاض کی چوری کی نذر ہو گیا ہو ۔جتنے اشعار مل سکے وہ سید سلیمان ندوی نے "بہاریہ قصیدہ، ناتمام" کی سرخی کے تحت کلیات فارسی میں دے دیا ہے۔

ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا ۱۶۔ جون ۱۸۸۷ء کے بعد وطن گئے اور کچھ دنوں وہاں قیام کرکے جولائی ۱۸۸۷ء (۹) میں علی گڑھ آگئے ۔ اپنا مسطر اس قیام کے دوران وہیں بھول گئے تھے، لہٰذا طلب کیا ۔ اپنی یادداشت کے مطابق یہ بھی لکھا کہ بڑے کمرے کے صدر جانب الماری کے پہلے

تختے پر رکھا تھا۔ نہ ملنے کی صورت میں اطلاع دینا ضروری تھا۔ اپنے دادا کی تصویر اپنے والد بزرگوار سے منگوائی۔ اپنے سوتیلے بھائی محمد کو علی گڑھ بلوانا چاہتے تھے۔ پانچویں کلاس میں داخلے کا امکاں تھا اپنے حقیقی چھوٹے بھائی جنید کو بھی علی گڑھ بلا لیا تھا اور انگریزی شروع کرادی تھی۔

اسی زمانے میں مولانا کی بیاض کا تقریباً آدھا حصہ چوری ہو گیا، جس کا بہت افسوس ہوا۔

اسکول کے ماسٹر کے لیے برابر کوشش جاری رہی اور اس سلسلے میں مختلف جگہ خطوط لکھے گئے۔ حمید الدین فراہی کے لیے بھی چاہا کہ وہ بھی علی گڑھ آجائیں ورنہ یہ سال بھی ضائع ہونے کا اندیشہ تھا۔ مولانا کے ماموں جو مولانا حمید الدین کے والد تھے، وہ مولانا حمید الدین فراہی کو علی گڑھ بھیجنے کے معاملے میں متذبذب تھے۔ مولانا کا مشورہ یہ تھا کہ بس ہمت کر کے چلے آئیں (۱۰)۔

مولانا نے قصیدہ بہاریہ اسی سال لکھا ہے۔ انھوں نے مولوی سمیع کے نام جس خط میں اس قصیدے کا ذکر کیا ہے۔ اس خط پر ۱۶۔ جون ۱۸۸۶ء (۱۱) تاریخ پڑی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۶۔ جون ۱۸۸۷ء کا لکھا ہوا یہ خط ہے، مگر کاتب کی غلطی سے ۱۸۸۶ء ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ خط ۸۔ مئی ۱۸۸۷ء (۱۲) اور ۱۷۔ جولائی ۱۸۸۷ء (۱۳) کے درمیان شامل کیا گیا ہے۔ یہ تینوں خط مولوی سمیع کے نام ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مولانا مئی ۱۸۸۷ء میں نینی تال میں تھے اور جون کے اس خط میں لکھتے ہیں "میں مکان پر واپس آنا چاہتا تھا مگر شاید کوئی خاص فائدہ نہ ہو"۔ چوں کہ علی گڑھ سے گرمیوں کی چھٹی میں وطن چلے جاتے تھے اور اس بار بجائے وطن کے نینی تال تشریف لے گئے تھے اور وہاں سے کچھ دنوں کے لیے وطن جانے کا ارادہ بھی تھا۔ اس لیے یہ جملہ لکھا ہے اور جون ۱۸۸۶ء میں وطن ہی میں قیام تھا۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ ۸۔ مئی ۱۸۸۷ء کے خط میں مولوی سمیع کو محمڈن تعلیمی مجلس کے اشتہار کے متعلق پوچھا ہے۔ "شبلی مسلمانوں کے گذشتہ تعلیم پر "ایک وسیع مضمون پڑھے گا۔" شاید یہ "مضمون میں جی لگا کر لکھوں اور گرانمایہ لکھوں۔ ظاہر ہے کہ جب مولوی سمیع کو مولانا کے اس گرانمایہ مضمون کا علم ہوا تو انھوں نے اس کی نقل لینے اور رکھنے کی خواہش کی اور یہ خواہش آخر مئی یا شروع جون میں کی ہوگی۔ اس کے جواب میں مولانا نے ۱۶۔ جون ۱۸۸۷ء کو جواب دیا۔ "جو مضمون میں کانگریس میں دوں گا وہ کانگریس کی طرف سے چھاپا جائے گا۔ نقل لینے کی ضرورت نہیں۔" اور یہ ۱۶۔ جون ۱۸۸۷ء ہو سکتی ہے کیوں کہ ۱۸۸۶ء کے اجلاس میں مولانا نے کوئی مضمون نہیں پڑھا تھا۔ چنانچہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں "اس کا پہلا ابتدائی اجلاس ۲۷۔ دسمبر ۱۸۸۶ء کو علی گڑھ میں ہوا جس میں کل ساٹھ ستر آدمی

شریک تھے، اور مولوی سمیع اللہ خاں صدر نشین، اس اجلاس میں مولانا کی شرکت بعض ریزولیوشنوں کی تحریک اور تائید تک رہی (۱۴) ۔" اور یہ ۱۶۔ جون ۱۸۸۸ء بھی نہیں ہے کیوں کہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"کانفرنس کا تیسرا اجلاس دسمبر ۱۸۸۸ء میں لاہور میں ہوا ۔ اس میں غالباً مولانا نے شرکت نہیں کی (۱۵) ۔ "غالباً کے لفظ سے اگرچہ شبہ ہوتا ہے مگر یہ شبہ اس طرح زائل ہو جاتا ہے کہ ۱۸۸۸ء میں مولانا کا کوئی مضمون روئداد میں نہیں ملتا۔ حالاں کہ ۱۶۔ جون "۱۸۸۷ء" کے خط میں ذکر ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ۱۶۔ جون ۱۸۸۷ء ہی ہے ۔ پھر دوسرے اجلاس کے بارے میں سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں "دوسرے اجلاس میں جو ۲۷۔ دسمبر ۱۸۸۷ء کو لکھنو میں ہوا، مولانا نے اپنا مشہور مقالہ "مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم "لکھ کر پڑھا (۱۶) ۔ "گویا ۱۶۔ جون کے خط میں اسی مضمون کا ذکر ہے ۔ لہذا ۱۶۔ جون ۱۸۸۷ء ٹھہرتا ہے ۔

۸۔ مئی ۱۸۸۷ء کے خط میں مولانا نے تعمیر (۱۷) کی تجویز اور منشی محمد اکرام کے رقعہ کے متعلق دریافت کیا ہے ۔ اس کی یاد دہانی اپنے والد صاحب کو ۲۵۔ مئی کو ان الفاظ میں کی:

"تحریر فرمائیے کہ مدرسے کے لیے کیا ہوا، منشی جی نے رقعہ لکھا یا نہیں (۱۸) ؟"

چوں کہ مدرسے کی تعمیر اور منشی جی کے رقعے کی فکر تھی لہذا مولوی سمیع کے نام ۱۶۔ جون کے خط میں بھی اس کی یاد دہانی کراتے ہیں:

"منشی جی نے رقعہ لکھا یا نہیں اور کیوں توقف ہے ؟ مکان مدرسے کی نسبت کیا کارروائی ہو رہی ہے ؟ (۱۹)"

چوں کہ مولانا کو اس زمانے میں ان دو باتوں کی بہت فکر تھی ، لہذا ۸۔ مئی کے بعد ۱۶۔ جون کو یاد دہانی ہے ۔ ۸۔ مئی کا سال ۱۸۸۷ء ہے ۔ لہذا ۱۶۔ جون کا سال بھی ۱۸۸۷ء ہوا اور چوں کہ ۱۶۔ جون کے خط میں قصیدۂ بہاریہ اور اس کے ستائیس اشعار لکھے جانے کا ذکر ہے، لہذا قصیدۂ بہاریہ ۱۸۸۸ء (۲۰) میں نہیں بلکہ ۱۸۸۷ء میں لکھا گیا ۔ مولانا چوں کہ نینی تال میں تھے، لہذا وہاں کی کیفیات مولانا کے قصیدۂ بہاریہ کی محرک ہوئی ہوں گی ۔ لکھتے ہیں:

مطلع:

" دوش ایں مژدہ بگوش گل و ریحاں آمد — کہ بہار آمد و بسیار بساماں آمد "

چند اشعار یہ ہیں:

ابر گوہر ہمہ افشاند چوگریاں بگذشت — گل ہمہ زر براگند چو خنداں آمد
آب را سلسلہ برپای بہ بستند زموج — بسکہ دیوانہ وش از طرف بیاباں آمد
ہر حبابے کہ سر از آب برارد ، گوید — باید از سر بتماشای گلستاں آمد

آخری شعر ہے:

جام ے داد بدست من وانگہ بسرود — غزلے تازہ کہ آرایش دیوان آمد (۲۱)

اس قصیدے کے کل ۱۹ اشعار دستیاب ہو سکے جو کلیاتِ شبلی میں شامل کیے گئے۔ ایسا اندازہ ہے کہ باقی ۸ اشعار بیاض کے آدھے حصہ (۲۲) کی چوری کی نذر ہو گئے۔ ممکن ہے پورا قصیدہ چوری ہو گیا ہو۔ بعد کو ۱۹ اشعار ہی یاد آئے ہوں جو محفوظ کر لیے گئے۔

اسی سال مولانا فیض الحسن کا انتقال ہوا۔ مولانا کی حماسہ سے دلچسپی اور شعرائے جاہلیت کی پر تاثیر سادہ شاعری سے لگاؤ اور قرآن پاک کی معجزانہ فصاحت کی نکتہ شناسی مولانا فیض الحسن سہارن پوری کا فیض تھا جو انھوں نے درس کی قلیل مدت میں حاصل کیا تھا۔ لہذا مولانا مرحوم (فیض الحسن) سے مولانا شبلی کو بڑی شیفتگی تھی، دوسرے یہ کہ مولانا کے علی گڑھ کالج میں تقرر میں مولانا فیض الحسن مرحوم کا بھی ہاتھ تھا، اس لیے مولانا کو اپنے استاد کے انتقال کا بڑا صدمہ ہوا۔ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

> "مولانا فیض الحسن صاحب نے ۱۳۰۴ھ / ۱۸۸۷ء میں وفات پائی - سید سجاد حیدر صاحب (علیگ) بیان کرتے تھے کہ مولانا کو اس سانحہ کا حال کالج میں عین درس میں معلوم ہوا، سننے کے ساتھ آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور ہم طالب علموں سے کہا کہ چلے جاؤ اور اسی اثر میں وہ مرثیہ لکھا جو ان کے کلیات میں ہے (۲۳)۔"

اس مرثیہ کا مطلع یہ ہے:

دریں آشوب غم عذرم بنہ گرنالہ زن گریم — جہانے را جگر خوں شد ہمی تنہا نہ من گریم

چند اشعار یہ ہیں:

بہ تحسین صبوری چند لبفریبی مرا ناصح — دمے بگذار تا در ماتم فیض الحسن گریم
بہ مرگش علم و فن در نالہ بامن ہم نوا باشد — ہنر بر خویشتن گرید چو من بر خویشتن گریم
گہے بے خود بہ بزم گشتن کار ہنر نالم — گہے بخویش بر روز سیاہ علم و فن گریم (۲۴)

حیاتِ شبلی (۲۵) میں کار ہنر نالم کے بجائے بزم ہنر نالم چھپا ہے۔

مولانا نے تاریخ بنی العباس کا پھیلاؤ دیکھ کر المامون پر اکتفا کر لیا تھا۔ لہٰذا اسی سال (۲۶) المامون کو مکمل کر لیا اور اس کا حق تصنیف مدرستہ العلوم، علی گڑھ کو دیا۔ چناں چہ کمیٹی دار العلوم نے اس کا پہلا ایڈیشن شائع کیا جو اسی سال فروخت ہو گیا۔ سرسید، المامون کے دوسرے ایڈیشن کے دیباچہ میں ۱۲۔ اکتوبر ۱۸۸۹ء کو لکھتے ہیں:

"اس کتاب کا حق تصنیف مصنف نے اپنی فیاضی اور قومی ہمدردی سے مدرستہ العلوم علی گڑھ کو عطا کیا ہے پہلا ایڈیشن اس کتاب کا اسی سال میں کمیٹی مدرستہ العلوم نے کمیٹی کے فائدے کے لیے چھاپا اور سب فروخت ہو گیا اور لوگوں کی طلب باقی رہی۔ میں نے کمیٹی کی طرف سے اس کے فائدے کے لیے دوسرا ایڈیشن چھاپنے کا ارادہ کیا اور اس کے لیے یہ دیباچہ لکھا (۲۷)۔"

سرسید نے مولانا کی اس فیاضی کا اقرار سید حسن بلگرامی کے نام خط میں بھی کیا۔ لکھتے ہیں:

"پچاس نسخے، المامون کے میں نے خدمت عالی میں روانہ کیے ہیں۔ گذشتہ تعلیم مسلمانان کے نسخے صرف معدودے چند رہ گئے ہیں، اسی لیے وہ نہیں بھیج سکا۔ آپ نے جو کتابوں کو خرید فرمایا، غالباً آپ کو خیال ہو گا کہ گویا ایک اعانت مولوی شبلی کی ہے۔ مگر مولوی شبلی نے یہ کتابیں مع حق تصنیف وغیرہ کالج کی نذر کر دی ہیں ان کی قیمت یا منافع سے ایک حبہ کا فائدہ انھوں نے حاصل نہیں کیا اور آئندہ جو کچھ وہ لکھ رہے ہیں صرف کالج کے فائدہ کے لیے لکھتے ہیں۔ اپنا ذاتی فائدہ ان کو مقصود نہیں۔ ایسے جاہل آدمی ہیں کہ انھوں نے چند نسخے المامون کے بلا قیمت اپنے دوستوں کو بھیجنا چاہے۔ میں نے ہر چند اصرار کیا کہ جس قدر تمہارا دل چاہے لے لو۔ ہرگز نہ مانا مجھ سے خرید کیں اور اپنے دوستوں کو بلا قیمت بھیج دیں (۲۸)۔"

مولانا شبلی نے المامون، مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم سے پہلے لکھنا شروع کی تھی جو بعد کو ختم ہوئی، مگر اس سے پہلے شائع ہوئی۔ مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم بعد کو لکھنا شروع کی لیکن المامون سے پہلے ختم کی لیکن یہ مقالہ ۲۷۔ دسمبر ۱۸۸۷ء کو پڑھا گیا۔ چناں چہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"یہ گرانمایہ مضمون لکھا گیا اور ۲۷۔ دسمبر ۱۸۸۷ء (۲۹) کو قیصر باغ کی شاہی بارہ دری میں جو مقام اجلاس تھا، پڑھ کر سنایا گیا (۳۰)۔"

چوں کہ لوگوں کے سامنے پہلے المامون آئی، اس لیے یہاں بھی ترتیب رکھی گئی ہے، ورنہ خود مولانا شبلی اس کو اپنی پہلی تالیف قرار دیتے تھے۔ جیسا کہ سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں:

"یہ ملک میں اپنی نوعیت کی پہلی چیز تھی اس لیے خطبہ ہی خطبہ نہ رہا بلکہ

الگ رسالے کی صورت میں چھپا، اسی لیے مولانا نے اس کو اپنی سب سے پہلی تالیف قرار دیا ہے(۳۱)۔"

خود مؤلف کے بیان کے بعد کسی مزید دلیل کی ضرورت باقی نہیں رہتی ورنہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالحلیم شرر اور مولانا حبیب الرحمن شروانی کی تائید میں (۳۲) رائیں پیش کی جاتیں

المامون کا نمونہ ، تحریر یہ ہے:

"طاہر طلب ہوا اور سند حکومت کے ساتھ ایک کروڑ درہم بھی جو عموماً خراسان کے گورنروں کو ملتے تھے، عطا ہوئے۔طاہر نے ایک مہینہ میں سازو سامان سفر درست کیا اور ۲۹۔ذی قعدہ ۲۰۹ھ کو خراسان روانہ ہوا۔طاہر کا بیٹا اس کے بعد صاحب الشرطہ مقرر ہوا لیکن تھوڑے ہی دنوں میں اس کی ذاتی لیاقت نے مصر کی گورنری تک پہنچا دیا۔تقرر کے بعد مامون نے اس کو اپنے سامنے بلایا اور کہا کہ یوں تو ہر شخص اپنی اولاد کی نسبت حسن ظن رکھتا ہے لیکن طاہر نے جو کچھ تمہاری تعریف میں کہا اس سے کم کہا جس کے تم دراصل مستحق تھے۔"طاہر نے یہ مژدہ سنا تو بیٹے کو ایک نہایت مفصل خط لکھا جو آئین حکومت، انتظام ملکی رفاہ رعایا کے متعلق ایک نہایت مدبرانہ دستور عمل تھا۔یہ خط اس قدر مقبول عام ہوا کہ تمام لوگوں نے اس کی نقلیں لیں۔خود مامون نے اس کی باضابطہ نقلیں عموماً حکام سلطنت کے پاس بھجوائیں اور کہا کہ طاہر نے دنیا و دین و تدبیر و رائے و سیاست و اصلاح ملک و حفاظت سلطنت و قیام خلافت کے متعلق کوئی بات اٹھا نہیں رکھی(۳۳)۔"

المامون کا سال تصنیف سید عبداللہ (۳۴) اور حامد حسن قادری (۳۵) نے ۱۸۸۹ء لکھا ہے جو صحیح نہیں معلوم ہوتا، کیوں کہ مولانا کی کتابوں اور مقالات کی فہرست مرتبہ مولوی ابوالبقا ندوی میں سال تصنیف ۱۸۸۷ء ہے۔دوسرے مولانا عبدالماجد دریابادی (۳۶) کا کہنا بھی یہی ہے کہ ۱۸۸۷ء میں لکھی گئی۔ تیسرے سرسید کے دیباچہ کے آخری جملوں سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں:

"مگر مجھ کو مصنف کا دوبارہ شکریہ ادا کرنا پڑا کہ انھوں نے مہربانی سے پہلے ایڈیشن پر نظر ثانی کی اور بعض نہایت مفید اور ضروری مضامین اس میں اضافے کیے اور حکمائے عہد مامون میں بالتخصیص نہایت مفید اضافہ کیا(۳۷)۔"

۱۸۸۷ء میں مولانا اس کو مکمل کر چکے تھے۔آخر ۱۸۸۷ء میں یا شروع ۱۸۸۸ء میں پہلا ایڈیشن شائع ہوا جو تین مہینہ میں نکل گیا۔جب دوسرے ایڈیشن کا خیال آیا تو مندرجہ بالا اضافے

کیے گئے جس میں ۱۸۸۸ء اور ۱۸۸۹ء کے کچھ مہینے لگے ہوں گے۔ ان اضافوں کے بعد دوسرے ایڈیشن کے چھپنے کے وقت یعنی اکتوبر ۱۸۸۹ء میں سرسید نے دیباچہ لکھا۔ ایک ہی سال میں (پہلے ایڈیشن کے نکلنے کے بعد) اضافے کرنا اور دوبارہ چھپوانا ممکن نہیں معلوم ہوتا۔ اور "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" کا نمونہ، تحریر یہ ہے:

"مسلمانوں نے جن علوم کی اشاعت کی ان میں سے کچھ ان کے ذاتی علوم ہیں جو خود انھوں ایجاد کیے یا خاص طرح پر ان کو ترتیب دیا، کچھ ایسے ہیں جو دوسری قوموں سے حاصل کیے اور پھر ایسی ترقی دی کہ گویا انھی کے ایجادات سے ہیں۔ میرا مضمون گو ان دونوں قسم کے علوم سے تعلق رکھتا ہے، لیکن علوم کی ذاتی حیثیت سے نہیں، بلکہ ان کی طرز تعلیم کے اعتبار سے۔

میں افسوس کے ساتھ اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ ان دو بحثوں کی تفصیل کے لیے جس قسم کے ضروری حالات درکار ہیں، یعنی فلسفہ، یونانی وغیرہ کے ترجمے، ترجموں اور تصنیفات کے نام، اسلامی دارالعلوم اور مدرسوں کی تفصیل، طریقہ درس، نصاب تعلیم، غرض اس قسم کے حالات مجھ کو کسی مستقل تصنیف میں نہیں ملے اور شاید یہ لکھے بھی نہیں گئے۔

کشف الظنون جیسی بڑی فہرست میں صرف ایک کتاب کا نام ملتا ہے۔ لیکن غالباً خود کشف الظنون کے مصنف کو بھی اس کا دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ چند اجمالی حالات جو گبن کی رومن ایمپائر و ہسٹری آف فلاسفی مصنفہ ہنری لوئس و اقوام المسالک چیمبرس انسائیکلوپیڈیا، برٹانیکا انسائیکلوپیڈیا وغیرہ میں ملتے ہیں (۳۸)۔ وہ اس غرض کے لیے بے شبہ مفید ہیں کہ جب مسلمانوں کی پچھلی ترقی کے عام ذکر میں کسی پرجوش خطیب کی زبان سے ادا ہوں تو متاثر دلوں کو ہلا دیں، لیکن ان سے ایک مفصل تاریخی آرٹیکل کیوں کر مرتب ہو سکتا ہے۔ میں نے مختلف تاریخوں اور دوسری قسم کی تصنیفوں کے جستہ جستہ مقامات سے کچھ حالات بہم پہنچائے ہیں اور غالباً یہ پہلی تحریر ہے جس میں اس قدر واقعات جمع کیے گئے ہیں۔ اصل مضمون شروع کرنے سے پہلے میں ایک اجمالی طریقہ پر مسلمانوں کے خاص علوم، ان کی ابتدائی تاریخ اور سبب ایجاد کا تذکرہ کرنا مناسب خیال کرتا ہوں (۳۹)۔"

آخر میں لکھتے ہیں:

"نمونے کے طور پر میں چند ترجموں کی ایک فہرست ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ میں نے ان ترجموں کو مطلقاً چھوڑ دیا ہے، جن کے مترجموں کے نام یا ان کے

زائد حالات میں نہیں معلوم کر سکا ہوں - جن حکماء کی کتابوں کے ترجمے ہوئے ان
میں سے بعض کے نام یہ ہیں (۳۹)-"

فہرست لکھنے کے بعد اس طرح لکھتے ہیں:

"یہ فہرست نہایت مختصر ہے - ہم نے خود اختصار کی غرض سے بہت سے ترجموں کے نام نہیں لکھے، گو عام طور پر ان مفصل واقعات سے لوگ بہت کم واقف ہیں - اہم ترجموں کی اجمالی پر فخر تاریخ آج قوم کے ایک ایک ممبر کو معلوم ہے - انہی واقعات پر خیال کرنے سے بانیان سائینٹفک سوسائٹی علی گڑھ کو دھوکا ہوا اور وہ سمجھے کہ جس طرح ہمارے مورثوں نے بذریعہ ترجموں کے علوم کو ترقی دی، ہم بھی یورپ کے علوم و فنون کو اپنی زبان میں ترجمہ کر کے اپنے علوم اور اپنی قوم کو ترقی کے رتبے پر پہنچائیں گے - مگر ان کا یہ قیاس غلط اور قیاس مع الفارق تھا - اول تو ترجموں کا اہتمام اور لاکھوں روپے کا خرچ جو خلفائے عباسیہ کے زمانہ میں ہوا، اب غیر ممکن ہے - دوسرے اس زمانے میں علوم محدود تھے اور ترقی رک چکی تھی - جس قدر کتابیں ترجمہ کر لیں گئیں، یونانیوں کے علوم پر گویا احاطہ کر لیا گیا - اس زمانے میں علوم کی ترقی کی انتہا ہے، نہ ان کتابوں کے شمار کی کوئی حد ہے جن کی تصنیف کا سلسلہ برابر جاری ہے - تیسری بڑی غلطی اس قیاس میں یہ تھی کہ اس زمانے میں عربی زبان جس میں ترجمے ہوئے، تمام ممالک اسلامی میں حکومت کرنے والی زبان تھی - دنیا میں اس کی کوئی مثال موجود نہیں ہے کہ قوم نے اس زبان میں علوم و فنون کو ترقی دی ہو، جو ان پر حکومت کرنے والی نہیں ہے - مگر ہم کو اس بات کے معلوم کرنے سے خوشی ہے کہ خود سید احمد خان صاحب نے جو سائینٹفک سوسائٹی کے بانی ہیں، متعدد تحریروں میں اپنی غلطی کا اعتراف کیا ہے - (۴۰)

حواشی:

۱..... مکاتیب شبلی، حصہ اول، صفحہ ۱۹، ۲۵- اگست ۱۸۸۶ء
۲..... ایضاً، صفحہ ۸۱-۸۳، ۸- مئی ۱۸۸۷ء
۳..... مکاتیب شبلی، حصہ اول، صفحہ ۸۱-۸۳، ۸- مئی ۱۸۸۷ء
۴..... مکاتیب شبلی، حصہ اول، صفحہ ۱۰-۱۱، ۲۵- مئی ۱۸۸۷ء
۵..... مولانا کو فضائیت بہت پسند تھی - چناں چہ جہاں بھی قیام کرتے سب سے بلند مقام پر یا باغ اور کھیتوں کے قریب، قدیم دارالعلوم ندوۃ العلما کی عمارت (موجودہ خاتون منزل، لکھنو) میں سب سے اوپر

کے کمرے میں قیام رہتا تھا۔ امین آباد پارک کے سامنے بلند کمرے پر بھی قیام کیا تھا۔ بندول میں سب سے اونچی عمارت حمیدہ منزل کے بالائی کمرہ میں، پھپھامیں اور سرائے میر میں کھیتوں کے قریب بلندی پر اور اعظم گڑھ میں پرفضا بنگلے میں قیام ہوتا تھا۔

۶۔۔۔ مکاتیب شبلی، (حصہ اول)، ۲۵-مئی ۱۸۸۷ء، صفحہ ۱۰-۱۱۔

۷۔۔۔ مکاتیب شبلی، (حصہ اول)، صفحہ ۸۳-۸۴، اس خط پر ۱۹-جون ۱۸۸۶ء ہے حالاں کہ ۱۸۸۷ء ہونا چاہیے۔

۸۔۔۔ ایضاً صفحہ ۸۴، ۱۷-جولائی ۱۸۸۷ء

۹۔۔۔ ایضاً، صفحہ ۸۴، ۱۷-جولائی ۱۸۸۷ء

۱۰۔۔۔ ایضاً، صفحہ ۸۴، ۱۷-جولائی ۱۸۸۷ء

۱۱۔۔۔ مکاتیب شبلی، (حصہ اول)، صفحہ ۸۳-۸۴، ۱۹-جون ۱۸۸۷ء

۱۲۔۔۔ ایضاً، صفحہ ۸۳، ۸-مئی ۱۸۸۷ء

۱۳۔۔۔ ایضاً، صفحہ ۸۴، ۱۷-جولائی ۱۸۸۷ء

۱۴۔۔۔ حیات شبلی، صفحہ ۱۹۳

۱۵۔۔۔ حیات شبلی، صفحہ ۱۹۳

۱۶۔۔۔ ایضاً

۱۷۔۔۔ مکاتیب شبلی، (حصہ اول)، صفحہ ۸۱، ۸-مئی ۱۸۸۷ء

۱۸۔۔۔ ایضاً، صفحہ ۱۱، ۲۵-مئی ۱۸۸۷ء

۱۹۔۔۔ ایضاً، صفحہ ۸۴، ۱۷-جولائی ۱۸۸۷ء

۲۰۔۔۔ کلیاتِ شبلی، (فارسی)، مطبوعہ معارف اعظم گڑھ، صفحہ ۲۳ تا ۲۵ و دیوان شبلی، مطبع نامی، کان پور، صفحہ ۲۸ تا ۲۹

۲۱۔۔۔ کلیاتِ شبلی، مطبوعہ معارف، اعظم گڑھ، صفحہ ۲۳ تا ۲۵-دیوان شبلی، مطبع نامی کان پور، صفحہ ۲۸ تا ۲۹

۲۲۔۔۔ مکاتیبِ شبلی، (حصہ اول)، صفحہ ۸۴، ۱۷-جولائی ۱۸۸۷ء

۲۳۔۔۔ حیات شبلی، صفحہ ۸۴

۲۴۔۔۔ کلیاتِ شبلی، (فارسی)، مطبوعہ معارف، اعظم گڑھ، صفحہ ۲۴-۲۵ و دیوان شبلی، مطبع نامی، کان پور، صفحہ ۲۸-۳۰

۲۵۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۸۴

۲۶۔۔۔ مولانا کی کتابوں اور مقالات کی سن وار فہرست مملوکہ دارالمصنفین مرتبہ مولوی ابوالبقا ندوی میں المامون کا سنہ طباعت ۱۸۸۷ء درج ہے

۲۷ــــ البصیر (شبلی نمبر ۱۹۵۷ء) اسلامیہ کالج چنیوٹ، صفحہ ۱۲۹
۲۸ــــ مکتوبات سرسید مرتبہ: شیخ اسماعیل پانی پتی۔ مجلس ترقی ادب، لاہور-۱۹۵۹ء، صفحہ ۲۳۲
۲۹ــــ کتابت کی غلطی سے سنہ ۱۸۷۸ء شائع ہو گیا ہے۔
۳۰ــــ حیاتِ شبلی، صفحہ ۱۷۱
۳۱ــــ ایضاً، صفحہ ۱۷۲
۳۲ــــ ایضاً، صفحہ ۱۷۱، مقالات شیروانی، صفحہ ۱۷۷، مجموعہ، نظم شبلی مع سوانح عمری، جی لنڈ سنز پریس، دہلی ۱۹۱۶ء، صفحہ ۶۴
۳۳ــــ المامون، صفحہ ۹۸۔ شیخ مبارک علی تاجر کتب، اندرون لوہاری گیٹ-لاہور
۳۴ــــ سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ۔ مکتبہ کاروان-لاہور، صفحہ ۱۴۷-۱۹۶۰ء
۳۵ــــ داستان تاریخ اردو (طبع دوم) ۱۹۵۷ء، صفحہ ۶۴۶
۳۶ــــ مولانا کا خط راقم کے نام
۳۷ــــ المامون کا دیباچہ
۳۸ــــ مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم از مقالاتِ شبلی جلد سوم (تعلیمی)، مطبع معارف اعظم گڑھ، طبع دوم ۱۹۵۵ء
۳۹ــــ ایضاً
۴۰ــــ مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم از مقالات شبلی جلد سوم (تعلیمی)، مطبع معارف، اعظم گڑھ، طبع دوم ۱۹۵۵ء، صفحہ ۳۵-۳۶

۱۸۸۸

مولانا نے (۱) ۲- دسمبر ۱۸۸۷ء کو ایجوکیشنل کانگریس (۲) منعقدہ لکھنؤ میں شرکت کی اور اپنا مقالہ "مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم" پڑھا اس اجلاس کی اخیر تاریخ میں انھوں نے اپنا قصیدہ عیدیہ جو ۱۸۸۳ء میں لکھا تھا وہ بھی پڑھا۔ اس پورے اجلاس میں مولانا اپنی نثر اور شاعری کی وجہ سے چھائے رہے۔ خود مولانا نے کانگریس کے بے مثل ہونے اور توقع سے زیادہ کامیاب ہونے کی اطلاع اپنے بھائی اسحق کو دی اور ان کے شرکت نہ کرنے پر افسوس کا اظہار کیا۔ کانگریس کے حالات خود نہ لکھ سکے تھے۔ مگر اکبر حسین سے تاکید کی تھی کہ پوری کیفیت اور حالات سے مولوی اسحق کو اطلاع دیں۔ مولانا کا مقالہ "مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم" علاحدہ چھپ رہا تھا، جس کے چھ جز تھے اور قصیدہ عیدیہ بھی اسی مضمون کے ساتھ چھپ رہا تھا اور کانگریس کی روئداد میں بھی قصیدہ شامل کیا گیا تھا۔ اسی زمانے میں مولوی محمد عمر کا خط مولانا کے پاس آیا جو اسکول کے متعلق تھا۔ مولانا نے اپنے خط کے ساتھ اس خط کو مولوی اسحق کو بھیج دیا اور یہ بھی لکھا کہ وہ مولوی اسحق سے بھی اتنا ہی متعلق تھا جتنا مولانا سے۔ اس کو بھیج کر مولانا نے مولوی اسحق کا آئندہ لائحہ عمل معلوم کیا اور لکھا کہ خوب غور و فکر کے بعد کوئی رائے قائم کر کے مولانا کو اطلاع دیں۔ رائے قائم کرنے سے پہلے تین چیزوں کا خیال خاص طور سے رکھنا ضروری تھا۔ پہلا یہ کہ نیشنل اسکول کا قائم رکھنا کیوں ضروری تھا۔ دوسرے یہ کہ اس زمانے کے حالات اور آئندہ کی توقعات پر کیا اسکول قائم رہ سکتا تھا۔ تیسرے یہ کہ وطن اور قوم کے تعلیم یافتہ نوجوان جن میں مولوی اسحق کا شمار بھی تھا اسکول کی خدمت پر آمادہ ہو سکتے تھے یا نہیں۔ اس کے بعد پھر ترغیب دلائی کہ اگر وہ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد ایم۔ اے یا قانون کے امتحان کی تیاری اعظم گڑھ میں قیام کر کے کرتے تو بہتر ہوتا، اس لیے کہ اسکول کو تقویت ہوتی۔ مولانا اس کا ذمہ لینے کو تیار تھے کہ اگر وہ اعظم گڑھ میں قیام کرتے تو مولانا اپنے والد سے ان کا ماہانہ خرچ دلاتے رہتے اور یہ الہ آباد کے قیام سے بہتر ہوتا، کیونکہ وہ ان روپیوں سے کتابیں خرید کر اپنے علمی مذاق کو باقی رکھ سکتے تھے۔ مولانا کو اس سے بڑی مسرت تھی کہ مولوی اسحق اگرچہ اپنا پورا وقت تو نہیں مگر کچھ نہ کچھ علمی کاموں میں لگاتے رہتے تھے۔ جب ان کو علم سے دلچسپی تھی تو پھر کیوں نہ اسکول کو اپنے حوصلوں اور خیالات کے لیے ایک عمدہ مشغلہ

بناتے اور اپنی ترقی کے ساتھ ساتھ اسکول کو بھی ترقی دیتے اور یہی قومی کام کہا جاسکتا تھا اور جن لوگوں میں قومی مذاق پیدا ہوتا جاتا وہ اپنی قومی فیاضی اسکول کے لیے صرف کرتے جاتے۔ اگرچہ اسکول اس وقت معمولی حیثیت میں تھا مگر مولانا کو اس سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں اور ان کو امید تھی کہ یہ کبھی ضرور معراج و ترقی پر پہنچے گا۔ لیکن اس کی معمولی حیثیت، بہرحال لوہار کی اس میلی چمڑی سے پھر بھی بہتر تھی جو مدت تک پاؤں کو محفوظ رکھنے کے لیے استعمال کی گئی تھی اور بعد کو ایک معمولی علم پر چڑھ کر تین ہزار سال تک درفش کاویانی کے فخر آمیز لقب سے پکاری گئی. بہرحال مولانا اسکول کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے تھے اور دل سے چاہتے تھے کہ مولوی اسحٰق اس کی دیکھ بھال کریں تو وہ کسی قابل ہو جائے مگر خود ان کی راے معلوم کرنا بھی ضروری تھا (۳)۔ مولانا کا درفش کاویانی کو یہاں مثال کے طور پر پیش کرنا ان کے بلند تاریخی ذوق کا کتنا بین ثبوت ہے اور یہ وہ وقت ہے جب مامون الرشید کی سوانح لکھ چکے ہیں اور اس کے زمانے کی تاریخ کو اجاگر کر چکے ہیں، جبھی تاریخی ذوق ابھرا ہوا ہے۔ مولانا ایجوکیشنل کانگریس کے تیسرے اجلاس منعقدہ لاہور (۴) دسمبر ۱۸۸۸ء میں شرکت نہ کر سکے۔

اس زمانے میں رام پور میں نواب کلب علی خاں مرحوم کے انتقال کے بعد نواب مشتاق علی خاں نواب ہو چکے تھے، لیکن ریاست کا سارا انتظام جنرل عظیم الدین خاں کے ہاتھ میں تھا۔ جنرل عظیم الدین خاں مولانا کے بڑے قدر دان تھے، لہٰذا انھوں نے مولانا سے خواہش کی کہ وہ سرکاری کتب خانہ کی ترتیب و اصلاح و ترقی پر ایک مفصل رپورٹ لکھ دیں۔ چناں چہ مولانا نے پورا کتب خانہ کھنگال ڈالا اور تین روز کی محنت کے بعد رپورٹ تیار کی، جس میں الماریوں کی ترتیب، فہرست لکھنے کا طریقہ، کتابوں پر نمبر ڈالنے کی کیفیت، نوادر کا انتخاب اور حفاظت کے طریقے اور دوسری ضروری ہدایتیں درج تھیں۔ مولانا سے قبل امیر مینائی نے فہرست کا نمونہ تیار کیا تھا۔ مولانا نے اس کو پسند کیا اور تھوڑی سی اصلاح کے بعد انھیں خطوط پر کتابوں کو نئے سرے سے ترتیب دینے کا مشورہ دیا۔ کتب خانے میں حروف تہجی کے لحاظ سے ترتیب تھی، مولانا نے یہ ترتیب بدل دی اور فن و مطالب سے اور معنوی خوبیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے نوادر کے دوبارہ انتخاب کی راے دی۔ مولانا نے اپنی رپورٹ ۱۴۔ اکتوبر ۱۸۸۸ء کو پیش کی۔ مولانا کی رپورٹ پر فوری طور پر تو عمل درآمد نہ ہوا مگر جب نواب مشتاق علی خاں کا انتقال ہو گیا اور نواب حامد علی خاں تخت نشین ہوئے جو نابالغ تھے تو جنرل عظیم الدین خاں انتظامی کونسل کے صدر ہوئے اور

انھوں نے اس وقت مولانا کی رپورٹ پر عمل درآمد کرایا (۵)۔

اسی سال یعنی ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۸ء میں نواب سر آسمان جاہ بہادر وزیر اعظم حیدر آباد (دکن) علی گڑھ تشریف لائے تو سرسید کی فرمائش سے مولانا نے رودکی (۶) کے مشہور قصیدے پر ایک قصیدہ لکھ کر پڑھا۔ اس واقعہ کو خود مولانا بیان کرتے ہیں:

"جس زمانے میں میں علی گڑھ کالج میں پروفیسر تھا، آسمان جاہ (وزیر ریاست حیدر آباد دکن) علی گڑھ میں آئے۔ سرسید مرحوم نے مجھ سے فرمایا کہ سپاسنامہ کی بجائے کالج کی طرف سے قصیدہ پیش کیا جائے گا، وہ تم لکھ دو۔ میں نے ایک خاص مناسبت سے اسی (۷) قصیدہ کو پیش نظر رکھا۔ ابتدا میں یہ تمہید تھی کہ لوگوں میں آسمان جاہ کی آمد کا چرچا ہے، پھر یہ اشعار تھے:

ہمچناں باشیم گرم گفتگو قاصد از در ناگہاں آید ہمے
افگند شور مبارک باد و پس ایں حدیثش بر زباں (۸) آید ہمے
آسماں جاہ از سوے ملک دکن جانب ہندوستاں آید ہمے" (۹)

اس قصیدے کے صرف یہی تین (۱۰) شعر ملتے ہیں۔

حواشی:

۱۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ نمبر ۱۶۳
۲۔۔۔ بعد کو اس کا نام محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ہو گیا تھا۔
۳۔۔۔ مکاتیبِ شبلی، حصہ اول، صفحہ ۲۳ تا ۲۵، ۱۴۔ جنوری ۱۸۸۸ء
۴۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۱۶۴
۵۔۔۔ ایضاً، صفحہ ۱۷۶
۶۔۔۔ رودکی کے مشہور قصیدہ کا مطلع یہ ہے:

بوے جوے مولیاں آید ہمے یاد یار مہرباں آید ہمے

(شعر العجم، حصہ اول۔ مطبع معارف، اعظم گڑھ۔ طبع چہارم ۱۹۲۰ء صفحہ ۲۹)

۷۔۔۔ رودکی کا قصیدہ
۸۔۔۔ تمکین کاظمی نے بجائے "برزباں" کے "درمیاں" لکھا ہے۔
(ماہنامہ ادیب علی گڑھ۔ اکتوبر ۱۹۶۰ء)
۹۔۔۔ شعر العجم، حصہ اول، صفحہ ۳۰، (حاشیہ)
۱۰۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۱۵۷۔۱۵۸، شعر العجم، حصہ اول بر حاشیہ، صفحہ ۳۰ و شبلی حیدر آباد میں، از تمکین کاظمی، ماہنامہ ادیب، اکتوبر ۱۹۶۰ء، صفحہ ۴

۱۸۸۹ء

المامون ۱۸۸۷ء (۱) میں شائع ہوئی تھی اور ہاتھوں ہاتھ لی گئی تھی۔ چوں کہ اس کی طلب باقی رہی (۲) اس لیے اس کو اکتوبر ۱۸۸۹ء میں سرسید نے اپنے دیباچے کے ساتھ دوبارہ شائع کیا۔ دیباچے سے پتا چلتا ہے کہ مولانا نے دوسرے ایڈیشن میں خاصہ اضافہ کیا۔ چناں چہ سرسید لکھتے ہیں:

"مگر مجھ کو مصنف کا دوبارہ شکریہ ادا کرنا پڑا کہ انھوں نے مہربانی سے پہلے ایڈیشن پر نظر ثانی کی اور بعض نہایت مفید اور ضروری مضامین اس میں اضافہ کیے اور حکمائے عہد مامون میں بالتخصیص نہایت مفید اضافہ کیا (۳)۔"

مولانا کے ذہن کو مولوی فاروق نے ایسے قالب میں ڈھالا تھا کہ ان کو فن مناظرہ سے اور کلامی مسائل سے طبعاً دلچسپی ہو گئی تھی۔ کلامی مسائل میں بھی مختلف فیہ مسائل اور آپس کے تنازعوں سے کٹر حنفیت کی بنا پر زیادہ دلچسپی تھی اور کٹر حنفیت مولوی فاروق کا فیض تھا۔ علی گڑھ میں مناظرہ وغیرہ کا تو بالکل امکان نہ تھا لیکن کلامی مسائل سے سرسید کو بڑی دلچسپی تھی، لہذا حکمائے عہد مامون میں بالتخصیص اضافہ دونوں کی مشترکہ دلچسپی کی وجہ سے تھا۔

اسی زمانے میں مولانا نے الفاروق کی طرح ڈالی، مگر بعد کو اس کام کو ملتوی کر کے سیرۃ النعمان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ یہ کام مولانا کی خاص دلچسپی کا تھا۔ ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے محبت اور عقیدت کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ عملی طور پر اس محبت کو پیش کیا جائے (۴)۔

مولوی سمیع اس زمانے میں محمد آباد (ضلع اعظم گڑھ) میں تھے۔ مولانا نے ان کو ان کے بھائی ضامن کے لیے بے پروائی برتنے پر بڑا سخت خط لکھا۔ اس کے بعد دوسرے خط کے لہجہ میں بھی خاصی تلخی ہے۔ اس زمانے میں ضامن کو نہایت تکلیف تھی، سردی کھاتے تھے۔ مولانا کو معلوم ہوا تو کچھ روپے بھیج دیے، جس سے ان کی سرمائی بنی۔ پھر کتابوں کے لیے رقم کی ضرورت ہوئی اور پڑھائی میں بغیر کتابوں کے حرج ہونے لگا۔ انھوں نے مولانا سے ذکر کیا۔ مولانا نے بھائی کی خبر گیری نہ کرنے پر مولوی سمیع کی خوب خبر لی۔ ساتھ ساتھ مولانا نے یہ بھی لکھا کہ فضول بحث سے کوئی فائدہ نہیں۔ موٹی سی بات تھی کہ ان کے وسائل آمدنی تنخواہ تک محدود نہ تھے۔ علی

ضامن کے لیے گھر سے خرچ آتا تھا، وہ انھوں نے بند کرا دیا تھا۔ گودام میں بھی سیکڑوں روپے لگائے جا رہے تھے اور اتنا نہیں ہو سکتا تھا کہ چند روپے ماہانہ بھائی کو دے سکتے۔

اسی زمانے میں علی گڑھ میں ایجوکیشنل کانگریس کا اجلاس ہونے والا تھا۔ مولانا نے اس کے احاطے میں اعظم گڑھ والوں کے لیے ایک کمرہ مخصوص کرا دیا تھا، تاکہ سب اکٹھا قیام کریں۔ اس جلسے میں مولوی سمیع کی آمد معلوم کر کے مولانا کو بڑی خوشی ہوئی۔

چوں کہ اسی سال مولانا نے الفاروق لکھنا شروع کی تھی اور اس کام کو روک دیا تھا، جس کا ایک سبب مواد کی فراہمی میں کمی تھی۔ لہٰذا انھوں نے ارادہ کیا کہ مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک کا دورہ کریں اور وہاں کے کتب خانوں سے مواد فراہم کریں۔ یہ خیال اسی سال آیا کہ مئی ۱۸۹۱ء میں قسطنطنیہ کے لیے روانہ ہوں اور وہاں چھ ماہ قیام کریں۔ مولانا کو ترکی سے دلچسپی ترکوں سے محبت کی بنا پر تھی اور ترکوں سے محبت اسلامی برادری کی بنا پر۔ مولانا چاہتے تھے کہ اس سفر میں مولوی سمیع بھی ساتھ ہوں، اس کے لیے وہ ان کے سفر خرچ کا بار بھی اٹھانے کو تیار تھے۔ علی ضامن کے لیے بھی بندوبست کرنے کو تیار تھے۔ اس تجویز کے تمام پہلوؤں پر ان کو غور کر کے جواب لکھنے کو لکھا۔ بہرحال مولانا اپنا سفر بالکل طے کر چکے تھے، خواہ مولوی سمیع ہمراہ جاتے یا نہ جاتے۔

۱۱۔ دسمبر تک مولانا سیرۃ النعمان کا پہلا حصہ ختم کر چکے تھے۔ اور دوسرا حصہ جلد شروع کرنے والے تھے (۵)۔

مسلم ایجوکیشنل کانگریس کا چوتھا اجلاس علی گڑھ میں ہوا۔ مولانا نے اس میں شرکت کی اور اپنا فارسی ترکیب بند پڑھا۔ پہلے بند کے چند (۶) ابتدائی اشعار اس طرح ہیں:

حیرتم می برد اینک کہ بدیں زینت و ساز — چیست کیں بزم بآئین دگر است طراز
جلوہ گاہیست ہمانا، ہمہ رنگ و ہمہ بوے — بزم گاہیست ہمانا، ہمہ برگ و ہمہ ساز
مژدہ باد اہل نظر را کہ تماشا مفت ست — شاہد بزم دگر چہرہ برافروختہ باز
بسکہ شور طرب از خاک بگردوں برشد — بلزاید گنبد فیروزہ پرست از آواز
ہاں بآئین ادب آئی کہ سرتا سر بزم — پردۂ دیدہ بود فرش بہ پہناے دراز
بزم را تا چہ قدر پایہ بلند است امروز — بسکہ چوں ماہ گہراں اند درو جلوہ طراز

اسی بند کے آخر میں فرماتے ہیں:

انتظار تو و شوق تو چو از حد گذرد — لاجرم پردہ کشایم ز رخ شاہد راز
تہنیت گویم و از جا روم از جوش طرب — مژدہ بر مژدہ رسانم کہ بصد زینت و ساز
باہمہ فرہ و فر باہمہ تمکین و شکوہ — چار مین مجلس تعلیم نہادند آغاز
ہی چہ آغاز کہ پیرایہء ایام است ایں
ہی چہ آغاز ۔ کہ طغرائے صد انجام است ایں

دوسرے بند میں مولانا حالی، ڈپٹی نذیر احمد کا اور اپنا ذکر کسی خوبی سے کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

نگہ از مہر، سوے حالی آزادہ فگن — واں نذیر احمد طوطی شکر خا بنگر
آں یکے را بطرب، آں نغمہء جانسوز ببیں — واں دگر را بکف، آں دفتر انشا بنگر
پس ازاں پایہ فرود آئی و بہ پائین بساط — شبلی دل زدہ را، زمزمہ پیرا بنگر

تیسرے بند میں کانگریس کا ذکر بڑی خوبی سے کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

روز گاریست کہ سرگشتہ سعئیم مگر — نخل اندیشہء ما ہیچ نیاورد ثمر
ہرچہ گفتیم و شنیدیم، بجائے نرسید — گرچہ صد بار بگفتیم و بگوئیم دگر
ہیچ از ناوک تدبیر نیامد بہ نشاں — ہمہ بگذار، ہمیں کانگرس را بنگر
چار سال است کہ ایں جادہ نوردیم و ہنوز — حاصل ما نبود زاں ہمہ جز بوک و مگر
تا چہ سود است کہ در بزم بہنجار سخن — نغمہء چند سرایند بآہنگ اثر
تا چہ سود است کہ در عرصہء سالی دو سہ روز — مصرعی چند بہ بافند و بخوانند از بر
ہم ز ہر ناحیہ، دیدہ وران جمع آیند — وانگہ آں دفتر پارینہ کشایند از سر

چوتھے اور آخری بند کے آخری اشعار اس طرح ہیں:

ہم ز بے راہ روی بود کہ با ایں تگ و پوے — خود بسر منزل مقصود نیفتاد گذار
از تبہ کاری و بربادی ما ہیچ نکاست — ما ہما نیم و ہماں بر ہمہ شہر و دیار
پستی بخت ہم امروز چناں ست کہ دی — حالت جملہ ہم امسال ہماں است کہ پار
داورا ایکہ جہاندار جہاں بخش توئی — بندگان تو دریغ است کہ باشند نزار
پسند ایں کہ نشینند بایں روز سیاہ — خاک بوسان سر کوی رسول مختارؐ
داورا ہاں پسند اینکہ دریں کد باشیم
ما کہ از حلقہ بگوشان محمدؐ باشیم (۷)

مولانا نے اس سال جزیہ پر الجزیہ کے عنوان کے تحت ایک مضمون لکھا جو کتابچے کی شکل میں شائع ہوا۔ اس کے متعلق سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"۱۸۹۲ء میں جب مولانا نے کتب خانہ اسکندریہ کا مضمون لکھا ہے اور اس سے چار برس پہلے ۱۸۸۹ء میں الجزیہ پر جو مضمون لکھا تھا، جس نے تحقیق کی دنیا میں ہلچل ڈال دی تھی، تو سرسید کو خیال آیا کہ یورپ نے اسلام اور مسلمانوں کی نسبت جو تاریخی غلط فہمیاں پھیلائی ہیں، ان کے جواب اور تصحیح کے لیے ایک مجلس بنائی جائے (۸)۔"

مولانا اس مضمون کو اس طرح شروع کرتے ہیں:

"غیر مذہب والوں نے ہمیشہ اس لفظ کو نہایت ناگواری سے سنا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اسلام اس لفظ کا موجد ہے۔ اسلام ہی نے یہ اصول پیدا کیا جس سے اس کا مقصد مسلمانوں اور غیر مذہب والوں میں نہایت متعصبانہ اور نامناسب تفرقہ قائم کرنا تھا، ان کا خیال ہے کہ جزیہ ایک ایسا جبر تھا جس سے بچنے کے لیے اسلام کا قبول کرنا بھی گوارا کیا جاتا تھا اور اس وجہ سے وہ جبراً مسلمان کرنے کا ایک قوی ذریعہ تھا، لیکن یہ تمام غلط خیالات ان ہی غلط فہمیوں سے پیدا ہوئے ہیں جو غیر قوموں کو اسلام کی نسبت ہیں ہم اس موقع پر تین حیثیتوں سے جزیہ پر بحث کرنا چاہتے ہیں۔ (۱) جزیہ اصل میں کس زبان کا لفظ ہے اور کن معنوں میں مستعمل ہوتا ہے۔ (۲) ایران اور عرب میں جزیہ کی بنیاد کب سے قائم ہوئی۔ (۳) اسلام نے اس کو کس مقصد سے اختیار کیا" (۹)۔

آگے چل کر لکھتے ہیں:

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم و خلفائے راشدین کے جو معاہدے تاریخوں میں منقول ہیں، ان سے عموماً پایا جاتا ہے کہ جزیہ ان لوگوں کی محافظت کا معاوضہ تھا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے والی ایلہ کو جو فرمان جزیہ کا تحریر فرمایا اس میں یہ الفاظ مندرج فرمائے، **یحفظوا ویمنعوا** یعنی ان لوگوں کی حفاظت کی جائے اور دشمنوں سے بچائے جائیں۔ حضرت عمرؓ نے وفات کے قریب جو نہایت ضروری وصیتیں کیں، ان میں ایک یہ بھی تھی کہ غیر مذہب والے جو ہماری رعایا ہیں وہ خدا اور رسول کی ذمہ داری میں ہیں اور مسلمانوں کو ان کی طرف سے ان کے دشمنوں سے مقابلہ کرنا چاہیے۔ اس موقع پر ہم بعض معاہدات اصلی الفاظ میں نقل کرتے ہیں۔ جن سے نہایت صاف اور صریح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ جزیہ صرف حفاظت کا معاوضہ

تھا اور غیر مذہب والے جو مسلمانوں کی رعایا تھے، یہی سمجھ کر یہ معاوضے ادا کرتے تھے (۱۰)۔"

بالکل آخر میں اس طرح لکھتے ہیں:

"جزیہ کی تعداد زیادہ سے زیادہ بیس روپیہ سالانہ تھی۔ کسی کے پاس لاکھوں روپیہ ہوں تو اس سے زیادہ دینا نہیں پڑتا تھا، عام شرح چھ روپیہ اور تین روپیہ سالانہ تھی۔ بیس برس سے کم اور پچاس برس سے زیادہ عمر والے اور عورتیں، مفلوج معطل العقل، نابینا، مجنون، مفلس، یعنی جس کے پاس دو سو درہم سے کم ہو، یہ لوگ عموماً جزیہ سے معاف تھے۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ ایسا ہلکا ٹیکس جس کی تعداد اس قدر قلیل تھی، جس کے ادا کرنے سے فوجی پر خطر خدمت سے نجات مل جاتی تھی، جس کی بنیاد نوشیروان عادل نے ڈالی تھی، کیا ایسی ناگوار چیز ہو سکتی ہے جیسی کہ اہل یورپ نے خیال کی ہے۔ کیا دنیا میں ایک شخص نے بھی اس سے بچنے کے لیے اپنا مذہب چھوڑا ہو گا؟ کیا کسی نے اپنے مذہب کو ایسے ہلکے ٹیکس سے بھی کم قیمت سمجھا ہو گا؟ اگر کسی نے ایسا سمجھا تو ہم کو اس کے مذہب کے ضائع ہونے کا رنج بھی نہ کرنا چاہیے۔ جو لوگ جزیہ ادا کرتے تھے ان کو اسلام نے جس قدر حقوق دیے، کون حکومت اس سے زیادہ دے سکتی ہے۔ لیکن چوں کہ ہمارے مضمون کے عنوان سے یہ بحث کسی قدر دور پڑ جاتی ہے، اس لیے اس موقع پر ہم یہ بحث چھیڑنی نہیں چاہتے (۱۱)۔"

حواشی:

۱۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۱۷۲ ۔۔۔ ۲۔۔۔ دیباچہ المامون۔ مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ لاہور، صفحہ ۵

۳۔۔۔ ایضاً ۔۔۔ ۴۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۱۸۰ ۔۔۔ ۵۔۔۔ مکاتیبِ شبلی، حصہ اول، صفحہ ۸۵-۸۶

۶۔۔۔ دیوان شبلی۔ مطبع نامی، کان پور، صفحہ ۶ و کلیاتِ شبلی (فارسی) مطبع معارف، اعظم گڑھ صفحہ ۴ پر اس ترکیب بند کا سال ۱۸۹۰ء شائع ہوا ہے۔ یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ ۱۸۸۹ء ہونا چاہیے۔ اس لیے یہ علی گڑھ کے اجلاس ۱۸۸۹ء میں پڑھا گیا تھا۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۱۹۳ پر ۱۸۸۹ء صحیح ہے۔ اس لیے کہ روداد مسلم ایجوکیشنل کانگریس ۱۸۹۰ء میں اس ترکیب بند کا ذکر نہیں ہے۔

۷۔۔۔ دیوان شبلی، صفحہ ۶ تا ۱۰ و کلیات شبلی، صفحہ ۴ تا ۸ ۔۔۔ ۸۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۱۹۱

۹۔۔۔ مقالاتِ شبلی، جلد اول (مذہبی)، مطبع معارف، اعظم گڑھ۔ ۱۹۵۴ء، صفحہ ۲۲۱

۱۰۔۔۔ ایضاً، صفحہ ۲۲۶

۱۱۔۔۔ مقالاتِ شبلی، جلد اول (مذہبی)، مطبع معارف، اعظم گڑھ۔ ۱۹۵۴ء، صفحہ ۲۳۱

۱۸۹۰ء

مولانا نے مولوی سمیع کے چھوٹے بھائی علی ضامن کی کامیابی اخبار میں پڑھی تو ان کو بڑی مسرت ہوئی اور انھوں نے مشورہ دیا کہ اگر مزید پڑھنے کے لیے الہ آباد بھیجیں تو بہتر ہے اور اگر علی گڑھ بھیجنے کا ارادہ ہو تو دو چیزیں ہیں، ایک یہ کہ آٹھ روپے کا وظیفہ دلایا جاسکتا ہے اور بورڈنگ میں قیام ہو، مگر بورڈنگ کے اخراجات زیادہ ہیں۔ دوسرے یہ کہ مولانا کے ساتھ قیام ہو اس میں خوراک کے علاوہ تین روپے فیس ہے اور خوراک مولانا کے ذمے۔ وہ عزیزوں کی خدمت کے تحت یہ چاہتے تھے اور اس کو قبول کرنے میں تکلف نہیں کرنا چاہیے (۱)۔

مسٹر مہدی حسن اردو کے مشہور انشا پرداز تھے۔ ان کی "افادات مہدی" مشہور ہے، بعد میں (۱۹۶۴ء میں) ان کے خطوط ان کی اہلیہ کے نام "صحیفہ محبت" کے نام سے شائع ہوئے ہیں انھوں نے محمڈن کلب گورکھ پور میں قائم کیا تو مولانا کو لکھا کہ وہ اپنی تصانیف محمڈن کلب کو عنایت کریں، اور ساتھ ہی انہیں یہ بھی لکھ دیا کہ وہ ان کی کتابوں پر ریویو کریں گے۔ ابھی چوں کہ ان کی کوئی ادبی شہرت نہ تھی، سوائے اس کے کہ سرکاری ملازمت میں نائب تحصیلدار تھے، اس لیے مولانا کو یہ بات ناگوار گزری اور انھوں نے لکھا کہ ریویو کا تذکرہ جو ان کے خط میں تھا وہ شاید مناسب نہ تھا۔ خواہ ان کا وہ منشا نہ ہو جو مولانا کچھ لیکن اس سے بہر حال یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ریویو گویا کتاب کا ایک قسم کا معاوضہ ہے اور یہ مصنف کی پست فطرتی ہے کہ وہ لوگوں سے ریویو لکھانے کا شائق ہو۔ یہ ضرور ہے کہ اگر کوئی شخص کسی معقول کتاب پر ریویو لکھنے کی قابلیت رکھتا ہے تو اس کو ضرور لکھنا چاہیے۔ ریویو کے متعلق بھی لکھا ہے کہ یہ کوئی آسان چیز نہیں، اور ریویو نگاروں کے لیے یہی بہت ہے کہ ان کی یہ قابلیت تسلیم کی جائے، نہ یہ کہ مصنف پر احسان رکھا جائے۔ مولانا کے نزدیک اس زمانے میں پورے ملک میں دو تین سے زیادہ مضمون نگار نہ تھے جن کے ریویو سے کسی مصنف کو خوشی ہو سکتی۔

اپنی کتابوں کے متعلق لکھا کہ وہ اپنی کوئی تصنیف نذر نہیں کر سکتے، اس لیے کہ "گذشتہ تعلیم" کی کوئی جلد باقی نہیں ہے اور المامون اور الجزیہ فروخت کے لیے ہیں، مگر یہ دونوں کتابیں سرسید نے کالج کے لیے چھاپی ہیں اور المامون پر دیباچہ بھی لکھا ہے۔ حق تصنیف میں مولانا کو ایک

نسخہ عنایت ہوا تھا، مولانا اس کو دینے پر راضی نہ تھے۔ "گذشتہ تعلیم" کو پیام یار کے اڈیٹر نثار احمد دوبارہ چھاپ رہے تھے۔ مولانا نے یہ بھی لکھا کہ انھوں نے اب تک اپنی کسی تصنیف کو خود نہیں چھپوایا اور نہ اس سے فائدہ اٹھایا۔

آخر میں مولانا نے محمڈن کلب کی کامیابی کے لیے نیک تمنا کا اظہار کیا اور یہ بھی لکھا کہ بے ہودہ قسم کی کتابیں اس کی الماریوں کی زینت نہ بنیں (۲)۔

اگرچہ مہدی حسن کے خط کے جواب میں ترشی تھی، مگر آگے چل کر خط و کتابت کا سلسلہ محبت و خلوص کی شیرینی سے بدل گیا اور مولانا کے مرتے دم تک تعلقات اور محبت قائم رہی۔

مولانا ۸۔ مئی اور ۲۔ جون کے درمیان علی گڑھ سے اعظم گڑھ پہنچ گئے تھے اور مہدی حسن کے ۲۷۔ مئی کے خط کا جواب لکھ رہے تھے۔ انھوں نے اپنی تلخ تحریر سے درگزر کرنے پر اپنی ممنونیت کا اظہار کیا اور لکھا کہ علی گڑھ سے دور ہیں، ۲۳۔ جون تک علی گڑھ نہیں پہنچ سکتے۔

مولانا کے پاس خطبات احمدیہ کا ایک عمدہ نسخہ تھا، وہ کلب کو پیش کرنے کا ارادہ تھا۔ جون میں گورکھ پور جانے کا بھی ارادہ تھا (۳)۔

اب مولانا سے اور مہدی حسن سے خصوصیت ہوتی جا رہی تھی۔ گورکھ پور کے قیام میں ان سے بالمشافہ گفتگو بھی ہو چکی تھی، اس لیے مولانا نے ان سے خط و کتابت جاری رکھنے کی خواہش کی (۴)۔

چوں کہ شروع تعلیمی سال میں کالج میں کام بڑھ جاتا تھا اس لیے آج کل مولانا بہت مصروف تھے اور کوئی تصنیفی کام نہیں کر رہے تھے۔ لیکن اس مصروفیت کو عارضی سمجھ رہے تھے اس لیے نصف اگست سے پھر تصنیفی کام شروع کرنے کا ارادہ تھا۔ اسی زمانے میں مسٹر مہدی حسن نے محمڈن کلب کے لیے اردو کتابوں کی فہرست طلب کی تو مولانا نے لکھا کہ افسوس ابھی اردو میں ہے ہی کیا اور ان کے خیال میں ساری اچھی کتابیں کلب میں موجود ہی ہیں۔ اس زمانے میں اردو زبان کا گنجینہ، آبِ حیات، نیرنگِ خیال، حیاتِ سعدی وغیرہ اور تہذیب الاخلاق ہی کو سمجھتے تھے۔ محمد حسین آزاد نے جس ترتیب سے دیوان ذوق شائع کیا تھا وہ دیکھنے کے قابل تھا اور دربار اکبری وغیرہ شائع ہونے والی تھیں جو یقیناً مسٹر مہدی حسن کی نظر سے گزرنے والی تھیں۔ مولانا اردو زبان میں اچھی کتابوں کی کمیابی اور فضول کتابوں کی زیادتی سے فکر مند تھے۔ (۵)

مولانا یکم ستمبر سے بخار میں مبتلا تھے، ۸۔ ستمبر تک افاقہ نہیں ہوا تھا۔ بیماری اور تنہائی

سے پریشان تھے۔ اسی کیفیت میں مولوی سمیع سے دریافت کیا کہ مولوی حمید الدین سے انھوں نے مولانا کی غزلیں لیں یا نہیں، ممکن ہے مولوی حمید الدین نے وہ دی ہی نہ ہوں۔

مولانا اس زمانے میں ہندول کے فارسی مدرسے کے متعلق بہت فکرمند تھے۔ اس لیے چاہتے تھے کہ مولوی سمیع صاحب اس کی مفصل رپورٹ ان کو لکھ بھیجیں۔ نیل کی تجارت کے بارے میں بھی دریافت کیا کہ کیا حال ہے اور تنخواہ وصول ہونے پر مدارس کے چندے کے ارادے کا اظہار کیا (۶)۔

اب مولانا نے امام ابو حنیفہؒ کی سوانح عمری کا پہلا حصہ ایک سو چالیس صفحات پر ختم کر دیا تھا۔ اس حصے میں خاص خاص مضامین یہ تھے، ۱۔ تمہید، ۲۔ ان کتابوں کا ذکر جو قدما نے امام کے حالات میں لکھیں، ۳۔ امام کی ولادت اور نسب، ۴۔ تابعیت تحقیق، ۵۔ امام کا سنہ ترشد اور تعلیم ۶۔ ان کے احادیث کے، اساتذہ کی تفصیل اور مختصر تراجم، ۷۔ تعلیم اور افتا، ۸۔ بقیہ زندگی اور شاہی تعلقات، ۹۔ وفات اور ان کی اولاد کی تفصیل، ۱۰۔ ان کے اخلاق و عادات، طرز معاشرت اور عام حالات، ۱۱۔ ان کے مناظرات جیسے فتاویٰ اور علمی مجلسیں، ۱۲۔ ان کی شہرت اور معصروں کی ان کی نسبت رائیں۔

مولانا کا ارادہ تھا کہ دوسرے حصے میں امام ابو حنیفہؒ کے علوم اور تدوین فقہ و طریقہء اجتہاد کی تفصیل اور ان کے مشہور شاگردوں کا مختصر تذکرہ لکھیں۔ ان کو امید تھی کہ دوسرا حصہ پہلے حصے کے مقابلے میں زیادہ ہوگا اور اسی میں زیادہ محنت کرنے کا ارادہ تھا۔ اگرچہ اس تصنیف کے سلسلے میں مولانا کو کاٹ چھانٹ کرنا پڑی تھی اور بہت سے کتب خانے دیکھنے پڑے تھے، تاہم انھیں امید تھی کہ اگر ان کی مرضی کے مطابق کتاب تیار ہوئی تو ایک نادر چیز ہوگی اور تمام محنت کا معاوضہ ہوگی۔

ان کا خیال تھا کہ مئی ۱۸۹۱ء تک اس سے فراغت حاصل کر لیں گے۔ دوسرے حصے کے لیے چند کتابوں کی ضرورت تھی۔ بغیر ان کے کتاب کا مکمل ہونا ممکن نہ تھا اور وہ کتابیں خود مولانا کے پاس وطن میں تھیں۔ مثلاً تفسیر کبیر مکمل، نووی، کی شرح مسلم، نصب الرایہ، تخریج ہدایہ فتح القدیر، ہدایہ، شرح مسلم، موطا امام محمد۔ ان کے ماموں کے پاس بھی بعض کتابیں تھیں، ان کی بھی مولانا کو ضرورت تھی۔ مثلاً میزان الاعتدال، معانی الآثار زیلعی، مقدمہ ابن الصلاح۔ لہذا مولانا نے حکیم محمد عمر کو ہدایت کی مندرجہ کتابیں مولانا کو بھیج دیں۔ ان کتابوں کی غیر موجودگی میں

ماموں صاحب کے ہرج ہونے کا اندیشہ تھا، مگر مولانا نے گذارش کی کہ وہ اس ہرج کو گوارا فرمائیں اور کتابیں ضرور بھیج دیں۔

مولانا کے ذہن میں عرصے سے الفاروق لکھنے کا خیال تھا اور اس کے مواد کی تلاش میں وہ قسطنطنیہ جانا چاہتے تھے، اب انھوں نے طے کیا کہ مئی ۱۸۹۱ء میں امام ابو حنیفہؒ کے سوانح مکمل کر کے وہ قسطنطنیہ روانہ ہو جائیں۔ اس کے لیے انھوں نے تیاریاں کر لی تھیں اور جو انتظام باقی تھا اس کو مئی تک کر لینے کا ارادہ تھا۔ وہاں سے واپسی (۷) پر الفاروق لکھنے کا ارادہ تھا (۸)۔

مولانا نے ۱۸۹۰ء میں الہ آباد میں کانفرنس کے پانچویں اجلاس دسمبر میں شرکت کی اور اس میں تقریر کی۔ ان کی تقریر آگے چل کر درج کی جاتی ہے۔ لیکن اس سے پہلے ایک غلط فہمی کا ازالہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ حیاتِ شبلی میں الہ آباد کے اجلاس کا جو سال لکھا گیا ہے وہ صحیح نہیں، معلوم ہوتا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ۱۸۸۶ء میں قائم (۹) ہوئی تو اس میں مولانا نے شرکت کی (۱۰) دوسرے اجلاس کے متعلق سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"دوسرے اجلاس میں جو ۲۷-دسمبر ۱۸۸۷ء کو لکھنو میں ہوا، مولانا نے اپنا مشہور مقالہ "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" لکھ کر پڑھا (۱۱)۔

تیسرے اجلاس کے متعلق لکھتے ہیں:

کانفرنس کا تیسرا اجلاس دسمبر ۱۸۸۸ء میں لاہور میں ہوا، اس میں غالباً مولانا نے شرکت نہیں کی۔"

اور چوتھے اجلاس کے متعلق لکھتے ہیں:

چوتھا اجلاس ۱۸۸۹ء میں پھر علی گڑھ میں ہوا۔ مولانا نے اس میں اپنا وہ ترکیب بند پڑھا، جس کا مطلع یہ ہے:

حیر تم می بردلنگ کہ بدیں زینت و ساز　　　چیست کیں بزم بآئین دگرست طراز (۱۲)

پانچویں اجلاس کے متعلق سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"پانچواں اجلاس ۱۸۹۱ء میں الہ آباد میں ہوا (۱۳)۔

پانچواں اجلاس ۱۸۹۱ء میں نہیں بلکہ ۱۸۹۰ء میں الہ آباد میں ہوا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ الہ آباد کے جلسہ کی روداد میں سرسید کی رپورٹ پر مولانا شبلی اپنے ریمارک میں لکھتے ہیں:

"بے شبہ یہ افسوس کی بات ہے کہ پارسال جو رزولیشن پاس ہوئے ان

کے متعلق عملی کارروائیاں بہت کم ہوئیں (۱۴)۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر الہ آباد کا اجلاس ۱۸۹۱ء میں ہوا تو پار سال یعنی ۱۸۹۰ء میں بھی اجلاس ہوا تھا۔ جس کا ذکر ہے، حالاں کہ ۱۸۸۲ء سے ترتیب وار اجلاس کے لحاظ سے پانچواں اجلاس ۱۸۹۰ء میں ہونا چاہیے۔ پھر یہ کہ ۱۸۹۰ء کے اجلاس کا سید سلیمان ندوی نے ذکر نہیں کیا ہے۔ سید سلیمان ندوی نے اس اجلاس کی تائید میں مولوی سمیع کے نام ۱۲۔ دسمبر ۱۸۹۱ء کے خط میں مولانا کا یہ جملہ لکھا ہے: "اب کی کانفرنس میں مجمع بہت نہ ہوگا (۱۵)۔" حالاں کہ یہ جملہ چھٹے اجلاس (۱۸۹۱ء) سے متعلق ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اسی خط میں مولانا نے اس طرح لکھا ہے:

> "سیرۃ النعمان یعنی لائف آف ابو حنیفہؒ بالکل تیار ہے۔ اخیر دسمبر میں انشاء اللہ مطبع سے شائع ہوگی۔ تین سو صفحوں کی کتاب ہے۔" (۱۶)

جب کہ ۲۷۔ نومبر ۱۸۹۰ء تک صرف پہلا حصہ ایک سو چالیس صفحات کا لکھا جا چکا تھا اور دوسرا حصہ جس کے لیے کچھ کتابیں طلب کی تھیں، وہ مئی ۱۸۹۱ء تک لکھنے کا ارادہ تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ۱۲۔ دسمبر ۱۸۹۱ء میں مولانا نے چھٹے اجلاس ۱۸۹۱ء کا اشارہ کیا ہے اور یہ اجلاس (پانچواں) ۱۸۹۰ء نہیں ہے۔

سید سلیمان ندوی نے اس اجلاس کا ۱۸۹۱(۱۷) میں ہونا لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ روداد محمڈن ایجوکیشن کانفرنس کے دو سرورق ہیں، پہلے پر تو ۱۸۹۰ء اور دوسرے پر غلطی سے ۱۸۹۱ء چھپ گیا ہے۔ اس وجہ سے غلط فہمی ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ روداد میں کئی اور جگہوں پر بھی ۱۸۹۱ء شائع ہو گیا ہے۔ اس غلطی کا سبب یہ ہے کہ روداد ۱۸۹۱ء میں شائع ہوئی اور لکھتے وقت موجودہ سال ذہن میں رہا ہوگا۔ پہلے سرورق پر عبارت اس طرح ہے:

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس

کا

پانچواں سالانہ جلسہ

بمقام الہ آباد

منعقدہ ۲۸۔۲۹۔۳۰۔ دسمبر ۱۸۹۰ء

مطبع مفید عام آگرہ میں طبع ہوا

۱۸۹۱ء

اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ جلسہ ۱۸۹۰ء میں ہوا اس لیے کہ جو جلسہ ۳۰۔ دسمبر کو ختم ہو اس کی روداد اسی سال یعنی ۳۱۔ دسمبر کو کیسے شائع ہو سکتی ہے۔ پھر جب کہ روداد کے ۲۶۸ صفحات ہوں اور محسن الملک کے دو لکچر ۶۶ اور ۳۸ صفحات کے اور ایک مضمون ۵۰ صفحات کا پروفیسر آرنلڈ کا اس میں شامل ہو۔

یہ سالانہ جلسہ جناب سردار محمد حیات خاں بہادر، سی۔ ایس۔ آئی کی صدارت میں ہوا جس میں سرسید نے سیکریٹری محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی حیثیت سے سالانہ رپورٹ پیش کی (۱۸)۔ رپورٹ پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

"مگر اے جناب صدر انجمن جس کامیابی کی توقع پر ہم نے یہ سالانہ تعلیمی جلسہ قائم کیا ہے وہ کامیابی ابھی کوسوں دور ہے۔ کسی کو ہمارے اس قومی جلسہ کی عیب جوئی ضروری نہیں ہے، ہم خود اس کے نقصوں کو بیان کرتے ہیں، ہم خود کہتے ہیں کہ ہم کو اس کی پوری کامیابی کی توقع نہیں ہے۔ ہاں لعل اللہ یحدث بعد ذالک امراً ہم خود اس کو اب تک فعل لغو اور بحث عبث اور قول بے عمل قرار دیتے ہیں۔ ہم خود کہتے ہیں کہ اب تک اس پر بے سود روپیہ خرچ ہوتا رہا ہے پس اس سے زیادہ اور کسی کے کہنے کو کیا گنجائش ہے۔ مگر کریں سو کیا کریں، قوم کو مرتے دیکھا نہیں جاتا۔ بیمار جاں بلب کو سب جانتے ہیں کہ دوا دینی بے سود ہے پھر بھی اس کے حلق میں دوا ڈالتے ہیں یہی ہم سے ہو سکتا ہے۔ نجات دینی یا نہ دینی خدا کے ہاتھ ہے" (۱۹)

مولانا شبلی نے مندرجہ بالا جملوں پر اس طرح ریمارک پیش کیے:

جناب صدر انجمن صاحب! میں آپ سے اس بات کی اجازت چاہتا ہوں کہ گزشتہ سال کی ایجوکیشن کانفرنس کی کارروائیوں کے متعلق آنریبل سیکریٹری نے جو رپورٹ پڑھ کر سنائی ہے اس پر کچھ ریمارک کروں۔

بے شک یہ افسوس کی بات ہے کہ پار سال جو رزولیشن پاس ہوئے ان کے متعلق عملی کارروائیاں بہت کم ہوئیں۔ نہ اسکالرشپ فنڈ میں کوئی معقول اضافہ ہوا، نہ اعلیٰ تعلیم اور نہ ادنیٰ تعلیم کے موازنے پر مضامین لکھے گئے۔ تاہم میں سیکریٹری صاحب کے ان الفاظ سے کہ ہماری کانفرنس بے فائدہ چیز ہے اور مفت میں ہزاروں روپے برباد کرتی ہے، ہرگز اتفاق نہیں کر سکتا بلکہ اگر سیکریٹری صاحب معاف فرمائیں تو میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کی رائے غلط اور بالکل غلط ہے۔

بے شبہ ایک ایسا انسان جو ایک عمر سے ان کوششوں میں معروف ہے،

جس نے انھیں افکار میں اپنے بال سفید کر دیے، جس کو معمولی طور پر دنیا میں زیادہ رہنے کی توقع نہیں رہی ہے، ضرور ہے کہ اس کا دل تھوڑی بات پر رنجیدہ ہو اور اس حالت میں مجبورانہ ناامیدی کے الفاظ کہہ اٹھے - بے شبہ وہ یہی چاہے گا کہ ہتھیلی پر سرسوں جمائے اور اپنی کوششوں کے تمام نتیجے اپنی آنکھوں سے دیکھ لے - لیکن حقیقت یہ ہے کہ برسوں کے کام دو دن میں نہیں ہو سکتے - قوم میں ایک مدت سے خاموشی چھائی ہوئی تھی - تعصب، غفلت، جہالت کی کچھ حد نہیں رہی - تمام روحانی قوتیں افسردہ ہو گئی تھیں، دل و دماغ عموماً بے کار ہو گئے تھے، کیا ایسی مردہ قوم دو چار لکچروں، اسپیچوں سے سنبھل سکتی ہے -

ایسی مردہ قوم کے لیے کم از کم پچاس برس کا زمانہ درکار ہے کہ اسے ترقی کا خیال بھی آئے - ہماری کانفرنس کی یہ کچھ کم کامیابی ہے کہ اتنے ہی دنوں میں اس نے تمام قوم میں ایک سرگرمی پیدا کر دی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت کانفرنس کا ہال قریباً ایک ہزار کرسیوں سے بھرا ہوا ہے - کیا پانچ برس پہلے بھی آپ ایسے مجمع اور سرگرمی کی توقع کر سکتے تھے؟

ہندوستان میں آج تک مسلمانوں کا ایک بھی ایسا عظیم الشان مجمع ہوا ہے؟ اس سے پہلے کسی موقع کا نشان دیا جا سکتا ہے، جس میں لوگ تعلیمی مقاصد پر غور کرنے کے لیے ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار میل کی مسافت طے کر کے آئے ہوں؟ یہ جوش اور سرگرمی کس نے پیدا کی ہے؟ کانفرنس کے انہی گزشتہ اجلاسوں نے، جن کو آنریبل سیکریٹری بے سود اور بے فائدہ بتاتے ہیں -

یورپ جس کی ترقیوں پر آج زمانہ رشک کر رہا ہے، ایک دن میں اس حالت پر نہیں پہنچا تھا، یہ کچھ مبالغہ نہیں ہے - یورپ نے جس تدریج سے ترقی کی ہے ہمارے ملک کی رفتار اس نسبت سے زیادہ تیز ہے -

انسان کی یہ ظاہر بینی ہے کہ اس کی نگاہ صرف ان باتوں پر پڑتی ہے جو علانیہ ظاہر اور محسوس ہوں - وہ ان پوشیدہ اثروں سے بے خبر ہوتا ہے جو اندر ہی اندر اپنا کام کر رہے ہیں اور آنکھوں کو دکھائی نہیں دیتے - دنیا میں اس قسم کے جتنے کام ہوئے ہیں ایک مدت تک ان کا مادہ بنتا رہا ہے پھر ان کی صورت ظہور میں آئی -

عباسیوں کی حکومت بظاہر ایک دن میں قائم ہو گئی لیکن ان کی بنیاد کی ریشہ دوانیاں ایک مدت سے ہو رہی تھیں، جس پر کسی کی نگاہ بھی نہیں پڑی تھی - ہماری کانفرنس کا اثر بظاہر کچھ زیادہ محسوس نہیں ہوا لیکن اس کی وجہ سے رفتہ رفتہ دلوں میں تعلیم کی طرف جو میلان پیدا ہوتا جاتا ہے ذرا سے غور سے صاف معلوم ہو سکتا ہے

بہت سے لوگ جو کانفرنس سے اٹھ کر جاتے ہیں ان کو خود نہیں محسوس ہوتا کہ کانفرنس سے کیا چیز لے کر گئے۔ لیکن ان جلسوں کا اثر چھپ کر ان کے ساتھ جاتا ہے۔

قوم کو آج جس چیز کی سخت ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ اس کی قوتیں متحد ہو کر کام کریں۔ ترقی کا خیال لوگوں کو موٹے پیدا ہو گیا ہے لیکن تدبیریں مختلف اختیار کی جاتی ہیں اور اس وجہ سے کوئی معقول نتیجہ نہیں پیدا ہوتا۔ کسی کی رائے ہے کہ ترقی کے لیے صنعت و حرفت کی ضرورت ہے، کسی کا خیال ہے کہ ادنیٰ تعلیم کے بغیر ترقی نہیں ہو سکتی۔ ہر شخص کی الگ الگ رائے ہے اور وہ اپنی رائے کے موافق اس کام میں مصروف ہے۔ لیکن جب تک سب کی رائے متفق ہو کر ایک طرف نہ مصروف ہو گی ہرگز ترقی نہیں ہو سکتی۔

اس کانگریس کا بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے تبادلہ خیالات کا موقع ملتا ہے اور اسی سے اس نتیجے کی امید کی جا سکتی ہے کہ ایک دن رایوں کے اختلافات رفع ہو کر سب ایک رستے پر آجائیں۔

ترقی کے لیے بڑی چیز یہ ہے کہ لوگوں میں قومی مذاق پیدا کیا جائے۔ یہ صرف اس طریقہ سے حاصل ہو سکتا ہے کہ قوم کا ایک معتدبہ گروہ ایک جگہ جمع ہو اور سب کے خیال میں ہو کہ ہم صرف قومی کام کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ یہ غرض جس قدر اس کانفرنس سے حاصل ہو سکتی ہے ہرگز کسی دوسری چیز سے نہیں ہو سکتی۔ اس مجمع میں ہم جو کچھ دیکھتے ہیں، جو باتیں سنتے ہیں، جس طرف آنکھ اٹھاتے ہیں، جس سے ملتے ہیں، جہاں بیٹھتے ہیں، ہر لحظہ اور ہر وقت قومی ہی خیال ہمارے سامنے ہوتا ہے۔ کیا اس سے زیادہ کوئی عمدہ اثر ہو سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ہم کو ایک قومی میلے کی ضرورت ہے، جہاں کہ جو کچھ ہو قومی لباس میں ہو۔ ہماری یہ کانفرنس فرض کرو کہ کچھ کام نہیں کرتی، بلا سے نہیں کرتی، لیکن وہ ایک قومی میلہ تو ہے۔

ہندوستان کے بڑے بڑے میلے، جہاں ہزاروں کوس کا سفر کر کے لوگ پہنچتے ہیں، کیا اس سے زیادہ دلچسپی کے قابل ہیں؟ اس ہال میں جس رتبے کے لوگ جمع ہیں کیا ان کی صورتوں سے بڑھ کر کوئی چیز دیکھنے کے لائق ہے؟ کون دل ہے، جس کو یہ آرزو نہیں کہ اس مشہور مصنف اور مدبر ملک کے خیالات سے واقف ہو، جس کے زور قلم نے ہماری زبان کو یورپ کی زبانوں کا ہمسر بنا دیا ہے؟ کس کو یہ تمنا نہیں ہے کہ اس نامور ماہر لغات کی صورت دیکھے جس نے یورپ کی متعدد زبانوں میں وہ ہی کمال حاصل کیا ہے جو مشرقی زبانوں میں اس کو حاصل ہے؟ کون ہے جس کی یہ خواہش نہیں ہے کہ اس بلند رتبہ شاعر کا کلام سنے جس نے اردو میں نیچرل نظم کی بنیاد ڈالی

ہے؟ کس کو یہ ہوس نہیں ہے کہ اس مشہور مصنف سے ملے جس کے قلم نے ایک لاکھ صفحے لکھ کر ڈال دیے ہیں؟ کیا ہندوستان میں اور کوئی مجمع ہے جو نواب محسن الدولہ مولانا سید علی بلگرامی جو امید ہے کہ آج ہی آنے والے ہیں، مولوی الطاف حسین حالی، شمس العلما مولوی ذکاء اللہ کو ایک جگہ مجتمع دکھا سکتا ہے۔ ہزاروں میل کا سفر، تکلیفات، مسافرت، صرف میرا خیال نہیں ہے بلکہ ان نو سو (۹۰۰) بزرگوں سے جو اس ہال میں جمع ہیں اگر پوچھا جائے تو سب یک زبان ہو کر میرا ساتھ دیں گے اور ایک شخص بھی آنریبل سیکریٹری کے قول سے متفق نہیں ہو گا کہ ہماری کانفرنس بے فائدہ اور بے حاصل ہے (۲۰)۔"

رزولیشن نمبر ۶ کی تائید مولانا شبلی کرنے والے تھے، لہٰذا روداد میں اس طرح ہے:

"اس جلسہ کی یہ رائے ہے کہ کم عمر بچوں کی تعلیم کا کوئی دستور العمل تجویز ہو کر مشتہر کیا جاوے تاکہ بچوں کے مربی اس پر غور کریں اور بچوں کی تعلیم کا یکساں اور عمدہ طریقہ کریں جو ان کی آئندہ عمر میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم تک پہنچنے میں آسانی ہو۔

اس رزولیشن کی تحریک کریں گے منشی رحمت اللہ صاحب رعد اور تائید کریں گے مولوی شبلی صاحب نعمانی (۲۱)۔

رزولیشن نمبر ۱۰ کو مولانا شبلی پیش کرنے والے تھے جس کے متعلق روداد میں اس طرح ہے:

"اس جلسہ کی یہ رائے ہے کہ اس مضمون پر ایک رسالہ لکھوایا جاوے کہ مسلمانوں نے اپنے عہد عروج میں جو علوم یونان و مصر و ہندوستان و فارس سے حاصل کیے تھے ان پر کون سے مسائل اور علوم اضافہ کیے۔ اس رسالہ میں ہر ایک امر اور مسائل اور مباحث کو بالتفصیل بحوالہ۔ اسناد ثبت کیا جاوے۔"

اس رزولیشن کی تحریک کریں گے مولوی محمد شبلی صاحب اور تائید کریں گے (۲۲) سید احمد خاں اسی سال کے جلسہ میں محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کا نام بدل کر محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس رکھا گیا ہے۔ چناں چہ پہلا رزولیشن اسی کے متعلق ہے جو اس طرح ہے:

"اس جلسہ کی یہ رائے ہے کہ ہماری اس قومی تعلیمی جلسہ کا نام جو محمڈن ایجوکیشنل کانگریس رکھا گیا ہے۔ لفظ کانگریس لوگوں کو شبہ میں ڈالتا ہے، بعض سمجھتے ہیں کہ یہ مثل نیشنل کانگریس کے ہے جو اس نام سے مشہور ہے اور بعض سمجھتے ہیں کہ یہ جلسہ اس کے برخلاف اینٹی کانگریس ہے، حالاں کہ اس جلسہ کو ان

دونوں باتوں سے کچھ تعلق نہیں۔ اس لیے نام میں تفرقہ کیا جاوے اور آئندہ سے اس جلسہ کا نام محمڈن ایجوکیشن کانفرنس قرار دیا جائے (۲۳)۔"

اس رزولیشن کو مولوی رضا حسین نے پیش کیا اور اس کی تائید سید احمد خان (سرسید) نے اپنی تقریر کے ساتھ کی۔ اپنی تقریر میں انھوں نے مولانا شبلی کے ریمارک (جو اوپر گزر چکا ہے) کے متعلق اس طرح فرمایا:

"ہماری اس مجلس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اب تک اس سے کچھ فائدہ نہ ہوا میں بھی اس کو قبول کرتا ہوں۔ گو کہ مولانا شبلی اس رائے کو غلط بتاتے ہیں مگر بلاشبہ اس قدر افسوس مجھ کو ہے کہ آج تک کسی شخص نے یہ نہیں بتایا کہ ان بدلتوں یا رایوں پر جو ہماری مجلس تعلیمی نے قرار دیں اور پورا کیا گیا اور اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ ہماری قوم کی مثال اس شخص کی ہے جو طبیب سے نسخہ لکھوالے اور دوا کا استعمال نہ کرے اور چاہے کہ صرف نسخہ ہی لکھوالینے سے بیمار کو شفا ہو جاوے (۲۴)۔"

رزولیشن نمبر ۱۰ کو پیش کرتے ہوئے مولانا شبلی نے مندرجہ ذیل تقریر کی:

"جناب صدر انجمن ہماری کانفرنس کا اصل مقصد اگرچہ صرف مسلمانوں کی موجودہ تعلیم سے بحث کرنا ہے۔ لیکن ضمنی اور استطرادی طور پر مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم بھی اس کی وقعت کے دائرے میں داخل ہے اور اسی بناء پر کانفرنس کے پچھلے اجلاسوں میں اس مضمون پر متعدد مضامین لکھے جا چکے ہیں۔

یورپ میں چند برس سے ایک کانفرنس قائم ہے جس کا مقصد مشرقی عوام کے علوم کی تحقیق ہے۔ اس کانفرنس کے متعدد اجلاس یورپ کے مشہور شہروں میں بڑی شان و شوکت سے منعقد ہوئے اور السنہ مشرقیہ کے بڑے بڑے ماہروں نے جمع ہو کر نہایت نادر اور عجیب تحقیقاتیں پیش کیں۔ ویانا کے اجلاس میں ایک فاضل نے ہارون الرشید کے دفتر خراج کا ایک کاغذ پیش کیا جو خود ہارون الرشید کے زمانہ کا لکھا ہوا تھا۔ کانفرنس نے اس عجیب یادگار کا فوٹو لیا جو روئداد کانفرنس کے ساتھ شامل ہو کر شائع کیا گیا ہے۔"

یورپ نے یہ مہتم بالشان کام جو اپنے ذمہ لیا در حقیقت ہمارا فرض تھا۔ اگرچہ ہم اپنی کوششوں سے یورپ کو بالکل سبکدوش نہیں کر سکتے، تاہم کم از کم اس قدر ضرور ہے کہ ہم ان تحقیقات کے متعلق جو خود ہماری نسبت ہوں، یورپ کا ہاتھ بٹائیں یہی خیال ہے جس نے مجھ کو اس رزولیشن کے پیش کرنے کی جرأت دلائی ہے۔

رزولیشن کا مضمون بظاہر ایک پامال مضمون ہے - اخبارات اور رسالوں میں متعدد تحریریں اس پر لکھی جا چکی ہیں - لفٹنٹ گورنر بنگال نے انعام کا اشتہار دے کر اس قسم کے مضمون پر ایسے مضامین لکھوائے تھے اور مولوی عبید اللہ اور مولوی کرامت علی نے اس پر نہایت مفید رسالے لکھے - اگرچہ اشتہار کا عنوان اسی قدر تھا کہ مسلمانوں نے یونان سے کیا کیا لیا اور یورپ میں مسلمانوں کے ذریعے سے وہ علوم و فنون کیوں کر پہنچے، لیکن ان رسالوں میں جستہ جستہ مسلمانوں کی خاص علمی ایجادات سے بھی بحث تھی اور کچھ شبہ نہیں کہ جس زمانہ میں یہ رسالے لکھے گئے، اس وقت کے لحاظ سے نہایت قابل قدر اور جدید معلومات پر مشتمل تھے - ان رسالوں کے بعد اس قسم کے سیکڑوں مضامین لکھے گئے، جن میں اگرچہ علمی تحقیقات کا عنصر کم تھا لیکن چوں کہ مدح و فخر کی چاشنی تھی اس لیے ان کو قبول عام حاصل ہوا اور رفتہ رفتہ یہ دعویٰ کہ ہم نے یونانیوں پر یہ علوم اضافہ کیے ہمارے قومی لٹریچر کے علوم متعارفہ بن گئے - اس سے ایک سخت نقصان یہ ہوا کہ تحقیقات کی رغبت کم ہو گئی اور جو مسئلہ نہایت بحث، نہایت غور، نہایت کاوش کے قابل تھا، مقلدانہ تصدیق پر طے کر دیا گیا-

حقیقت یہ ہے کہ یہ سوال نہایت غور طلب ہے کہ مسلمانوں نے علوم حکمیہ میں کوئی معقول اضافہ کیا یا نہیں - ہمارے ہاں تو اسی کی تحقیق کے وسائل مفقود ہیں لیکن یورپ جو ان تحقیقاتوں کا مرکز ہے وہ بھی اس بحث کا قطعی فیصلہ نہ کر سکا ہے-

یہ سچ ہے کہ یورپ کے بعض مصنفین مثلاً ڈریپر، گبن، جامعین انسائیکلوپیڈیا نے نہایت آب و تاب سے مسلمانوں کے کارنامے دکھائے ہیں، لیکن ایجاد و اختراع کا ذکر ان کی تحریروں میں بھی کم آتا ہے - اس کے علاوہ اکثر یہ مصنفین عربی زبان اور عربی تصنیفات سے واقفیت نہیں رکھتے، اس لیے ان کی رائیں اجتہاد کا رتبہ نہیں رکھتیں، اور یہی وجہ ہے کہ بعض موقعوں پر ان کی مدح و تحسین ناشناس ہو جاتی ہے - ایک صاحب لکھتے ہیں کہ علم الحیوانات پر دمیری نے جس رتبہ کی کتاب لکھی کئی سو برس کے بعد بھی بعض کو اس رتبہ کی کتاب لکھنی نصیب نہ ہوئی - دمیری کی کتاب الحیوانات ہمارے سامنے ہے اور جس رتبہ کی ہے ہم خود اس سے شرمندہ ہیں-

دوسری طرف یورپ میں ایک گروہ کثیر کی رائے ہے کہ مسلمانوں نے علوم حکمیہ میں کچھ اضافہ نہ کیا - یہ معمولی لوگوں کا خیال نہیں ہے بلکہ بڑے بڑے مصنفین

جو عربی زبان کے پورے ماہر ہیں، ان کی رائے ہے - زبان فرانس کا ایک مشہور پروفیسر ہے جس نے حکیم ابن رشد کی لائف اس جامعیت اور تحقیق سے لکھی ہے کہ تعجب ہوتا ہے - اس نے ایک بڑے مجمع میں لکچر دیا تھا جس کا عنوان تھا "اسلام اور سائنس" - اس کے بعض فقرے یہ ہیں -

"مسلمان ان تمام چیزوں سے جن کو علوم عقلیہ کہا جاسکتا ہے کئی سو میل دور ہیں - مسلمان اپنے زمانہ کے مشہور فاتح تھے لیکن یقیناً وہ فلاسفر نہ تھے - فلسفہ کو مسلمانوں سے صرف یہ تعلق ہے کہ وہ عربی زبان میں نقل ہو کر آگیا ہے نہ کہ وہ مسلمانوں کا ہے -"

ابو الفرج جو یورپ کا مشہور عربی داں مورخ ہے، لکھتا ہے کہ عرب کا علم جس پر ان کو ناز ہے علم الانسان واقفیت اصطلاحات سخن سنجی نثاری ہے - لیکن اگر فلسفہ کی نسبت پوچھتے ہو تو خدا نے ان کو یہ دماغ ہی نہیں دیا تھا - رینان اس قول کو نقل کر کے کہتا ہے کہ کیا اس سے زیادہ سچ ہو سکتا ہے - پروفیسر منک فرانس کا ایک مشہور عالم ہے جس نے فلسفہ عرب پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے اور چوں کہ وہ عربی، عمرانی، لاطینی زبانوں کا بڑا ماہر تھا اور مسلمانوں کی تصنیفات اصلی اور ترجمہ شدہ دونوں پر اس کو کافی اطلاع حاصل تھی، اس لیے اس نے جو کچھ لکھا ہے مجتہدانہ لکھا ہے - وہ فارابی، بو علی سینا، ابن رشد کی تصنیفات پر ریویو کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ لوگ ارسطو کے نہایت عمدہ شارح ہیں، لیکن خود کسی فلسفہ کے موجد نہیں - ہمارے علما کے اقوال سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے - عبد الکریم شہرستانی نے ملل و نحل میں لکھا ہے کہ فارابی و ابن سینا نے جو کچھ کہا ہے وہ نہایت خفیف اختلاف کے ساتھ صرف ارسطو کا فلسفہ ہے -

رینان اور منک کے سوا اور بھی یورپ کے نامور مصنفوں کی یہی رائے ہے لیکن چوں کہ ہم صدائے مدح کے زیادہ خوگر ہو گئے ہیں اس لیے ان کی آوازیں ہمارے کان میں نہ پہنچ سکیں - میں خود ان لوگوں کے خیالات سے متفق نہیں ہوں لیکن اس قدر ضرور تسلیم کرتا ہوں کہ یہ مسئلہ جیسا کہ آج تک بدیہی سمجھا گیا ایسا بدیہی نہیں ہے اور دو چار یورپین مصنفوں کی تقلید کی بنا پر طے نہیں کیا جاسکتا -

اصل یہ ہے کہ اب تک اس بحث پر پوری توجہ نہیں کی گئی - مخالف اور موافق دونوں فریق نے زیادہ استقراء اور تفتیش سے کام نہیں لیا اور در حقیقت ایک غیر قوم کو ہماری علمی ترقیوں پر اس سے زیادہ توجہ ہو بھی نہیں سکتی تھی - بے شبہ یورپ میں مسلمانوں کی علمی ترقیوں پر بہت سی کتابیں لکھی گئی، لیکن افسوس یہ ہے

کہ ان بے شمار تصنیفات میں صرف دو ہی چار کتابیں ہیں جو مجتہدانہ اور اصل مآخذ کی واقفیت سے لکھی گئیں۔ اس خاص امر میں یورپ نہایت الزام کے قابل ہے کہ اگلے زمانہ میں جب یورپ مسلمانوں کی ہر بات کو رقابت اور مخالفت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اس وقت مسلمانوں کے اخلاق، علوم، تمدن کی نسبت جو رائیں قائم ہو گئیں، آج تک مختلف طریقوں میں انہیں خیالات کا تتبع کیا جاتا ہے۔ زمانہ حال کے مصنفین میں بہت کم ہیں جنھوں نے عربی کے اصل مآخذ کی تلاش اور جستجو کی ہو اور اس بحث پر مجتہدانہ رائے قائم کرنے کا حق حاصل کیا ہو۔ یہ میری ذاتی رائے نہیں بلکہ انصاف پسند یورپین مصنفوں نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ مسلمانوں کی عمدہ سے عمدہ تاریخ جو زمانہ حال میں لکھی ہے، موسیو سیدیو فرانسیسی کی تاریخ ہے، وہ اس بحث میں لکھتا ہے:

"موجودہ زمانہ تک ایشیائی ہیئت اور ریاضی کی تاریخ بالکل تاریکی میں پڑی ہوئی ہے۔ علوم اور السنہ کے دوستوں نے اکثر یہ خواہش ظاہر کی کہ یہ رخنہ بھر دیا جائے، لیکن ان علماء نے جو قلمی کتابوں کی تحقیق اور جستجو میں شب بیداریاں کرتے ہیں، اس طرف بہت کم توجہ کی۔ ہم لوگ جب ان تصنیفات کو پڑھتے ہیں جو اس صدی کے آغاز میں عرب کی تحقیقات کے متعلق لکھی گئیں اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے اسلاف نے جو دستاویزیں ہمارے ہاتھ میں دیں وہ بالکل ناکافی ہیں تو ہم کو کسی قدر رنج ہوتا ہے۔ دو چار مختصر رسالہ جو بعض بعض مقامات پر چھاپے گئے اور چنداں ضروری نہیں ہیں۔ چند کتابیں جو لیٹن زبان سے نہایت غلط ترجمہ کی گئیں جن کے مترجم اصطلاحی الفاظ کا بڑا حصہ نہیں سمجھتے تھے اور صرف آواز اور صورت کا ترجمہ کرنا چاہتے تھے۔ چند فرض اور قیاسات جو شکوک سے لبریز ہیں چند عام نتیجے جن کی دلیلیں موجود نہیں۔ صرف یہ سرمایہ ہے جس کی بنا پر ہم ان ترقیوں کا اندازہ کرنا چاہتے ہیں، جو عہد اوسط (یعنی مسلمانوں کا زمانہ) میں علم ہیئت کے متعلق ظہور میں آئیں۔ ایسے ادھورے اور ناتمام سامان پر یہ عجیب خفیف العقلی ہے کہ یورپ نے قطعاً ان مسائل کا فیصلہ کر دینا چاہا ہے جو علوم کی تاریخ میں نہایت امپارٹنٹ مسائل ہیں۔ نہ تو عربی کے کم یاب نسخوں کی طرف رجوع کیا گیا، نہ اطمینان اور یقین کے ضروری سامان بہم پہنچائے گئے، تاہم یورپ چلا کر کہتا ہے کہ عرب کے ہیئت داں صرف یونانیوں کے قیاسات کے پیرو ہیں۔ عرب نے یہ البتہ کیا ہے کہ حساب میں کارو کے بجائے سائن رکھ دیا ہے، لیکن وہ اس سے آگے نہیں بڑھے۔"

موسیو سیدیو نے ان کے اپنے والد پروفیسر سیدیو کی اس اتفاقی اطلاع کا ذکر

کیا ہے جو ان کو ایک عربی کتاب سے ہوئی اور جس سے معلوم ہوا کہ بہت سی علمی ایجادات جن کو یورپ والے رینگوائن اور تیکوراہی وغیرہ کی ایجاد سمجھتے تھے۔ عرب کی ایجاد تھیں۔ موسیو سیدیو نے ایک تفصیلی بحث کے بعد یہ جملے لکھے ہیں:

"بہت سی وہ کتابیں جو ہم تک نہیں پہنچیں، ممکن ہے کہ ان اطلاعوں پر شامل ہوں جو نئے نظام کی تکمیل میں کام آسکیں۔ ممکن ہے کہ عرب وحشیوں کی یہ تصنیفات ہم کو سکھادیں کہ وہ ایجادات جن کی ایجاد کا فخر ہم دور جدید کے علماء یورپ کی طرف منسوب کرتے ہیں اہل عرب ان سے بے خبر نہ تھے۔"

موسیو سیدیو کی یہ امید بے جا نہیں۔ یورپین مصنفین جنھوں نے مسلمانوں کی نسبت یہ قطعی فیصلہ کرلیا ہے کہ انھوں نے علوم وفنون قدیم میں کوئی اضافہ نہیں کیا، یہ دعویٰ نہیں کرسکتے کہ انھوں نے اسلامی تصنیفات کا کافی استقصا کیا ہے۔ ابن سینا نے جس کی نسبت پروفیسر منک کہتے ہیں کہ وہ صرف ارسطو کے فلسفہ کا شارح ہے تصریح کی ہے کہ کتاب الشفا میں میں نے ارسطو کے مسائل بیان کیے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک جو فلسفہ صحیح ہے اس کو میں دوسری کتاب کلمہ مشرقیہ میں لکھ چکا ہوں۔ ابن سینا کی یہ تصنیف پروفیسر منک کو نہیں ملی، جیسا کہ انھوں نے خود اپنی کتاب میں اعتراف کیا ہے۔ اسی طرح فارابی، امام غزالی، فخر رازی وغیرہ کی بہت سی تصنیفات ہیں جن سے یورپ آج تک بے خبر ہے۔

میری اس تمام تقریر کا حاصل یہ ہے کہ مسئلہ نہایت غور طلب اور قابل بحث مسئلہ ہے اور اس قابل نہیں کہ مقلدانہ طور پر خوش اعتقادی کے ساتھ اس کا کوئی پہلو تسلیم کرلیا جائے۔ ہماری کانفرنس میں ایسے نامور علماء شامل ہیں جو ایشیا اور یورپ کی مختلف زبانوں کے پورے ماہر ہیں ان کا فرض ہے کہ عرب کے اصل مآخذ اور یورپ کی تحقیقات، ان دونوں کے موازنہ سے اس بحث کا تصفیہ کریں اور جو پہلو اختیار کریں اس کو ایسے قوی اور مصرح دلائل سے ثابت کریں کہ شک وشبہ کا موقع باقی نہ رہے۔ اسی بنا پر میں کانفرنس کے سامنے یہ رزولیشن پیش کرتا ہوں اور چاہتا ہوں اس مضمون پر ایسے (مضمون) لکھوائے جانے کے لیے وہ اپنی منظوری ظاہر کریں"۔(۲۵)

حواشی:

۱۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۸۶، اپریل ۱۸۹۰ء (مکتوب میں سنہ نہیں چھپا ہے۔ مگر قرائن سے ۱۸۹۰ء معلوم ہوتا ہے)

۲۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۱۹۴-۱۹۵، ۸-مئی ۱۸۹۰ء
۳۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۱۹۵، ۲-جون ۱۸۹۰ء
۴۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۱۹۵، ۱۳-جون ۱۸۹۰ء
۵۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۱۹۶، ۸-جولائی ۱۸۹۰ء
۶۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۸۶-۸۷، ۸-ستمبر ۱۸۹۰ء
۷۔۔۔ اپنے ارادے کے مطابق قسطنطنیہ کا سفر ۱۸۹۱ء میں نہ کر سکے اور ۱۸۹۲ء میں کیا۔
۸۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۴۸، ۲۷-نومبر ۱۸۹۰ء
۹۔۔۔ سید سلیمان ندوی، حیاتِ شبلی، صفحہ ۱۶۳ پر اس طرح لکھتے ہیں۔ "اس کا پہلا ابتدائی اجلاس ۲۷-دسمبر ۱۸۸۶ء کو علی گڑھ میں ہوا۔"
۱۰۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۱۶۳
۱۱۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۱۶۳
۱۲۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۱۶۳-۱۶۴
۱۳۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۶۴
۱۴۔۔۔ روداد، صفحہ ۱۰۲
۱۵۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۸۸
۱۶۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۸۷
۱۷۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۱۶۴
۱۸۔۔۔ روداد، صفحہ نمبر ۹۰ تا ۱۰۲
۱۹۔۔۔ روداد، صفحہ ۹۹
۲۰۔۔۔ روداد، صفحہ ۱۰۲-۱۰۵
۲۱۔۔۔ روداد، صفحہ ۱۱۰-۱۱۱
۲۲۔۔۔ روداد، صفحہ ۱۱۳
۲۳۔۔۔ روداد، صفحہ ۱۱۴
۲۴۔۔۔ روداد، صفحہ ۱۲۰
۲۵۔۔۔ روداد، صفحہ نمبر ۱۸۶ تا ۱۹۱

۱۸۹۱ء

مولانا کو نیشنل اسکول کی بڑی فکر رہتی تھی۔ اس لیے اعزا اور احباب کو برابر توجہ دلاتے رہتے تھے۔ مولوی اسحٰق چوں کہ چھوٹے تھے، اس لیے ان پر ذمہ داری بھی زیادہ عائد تھی اور ان ہی پر خفگی بھی زیادہ کرتے تھے۔ مولوی اسحٰق بھی اسکول کے معاملے میں خاص دلچسپی لیتے تھے اور اسکول کے متعلق اطلاع بھی برابر دیتے رہتے تھے۔ ویسے کبھی دیر بھی ہو جاتی تھی۔ مولانا اس سال بھی جولائی (۱) میں عرصے تک اسکول کے حالات نہ معلوم ہونے کی وجہ سے فکر مند تھے اور مولوی اسحٰق کو خط لکھنے والے تھے کہ ان کا خط آگیا تو اطمینان ہوا۔ مولانا لوگوں کو چندہ دینے کی ترغیب تو دلاتے ہی رہتے تھے، لیکن خود بھی چندے میں کسی سے پیچھے نہ رہتے تھے۔ چناں چہ مولوی اسحٰق سے دریافت کیا کہ ان کے لیے جو چندہ تجویز کیا جائے اس سے اطلاع دی جائے، تاکہ وہ بھیج دیں، لیکن لوگوں سے دلانا مشکل تھا پھر بھی حافظ حبیب اللہ اور حافظ حسن علی کو چندے کے لیے خط لکھا۔

اسکول کی تعمیر کے معاملے میں یہ مشکل آپڑی تھی کہ وہ مکان جس میں اسکول قائم تھا وہ مولانا وغیرہ کا مکان تھا اس لیے اس میں چندہ کی رقم لگانا کچھ مناسب نہ تھا، کیوں کہ بعد کو اگر اسکول کہیں اور منتقل کر دیا جاتا تو لوگ اعتراض کرتے کہ عام چندہ سے مکان تعمیر کیا گیا۔ چوں کہ بدگمانی کا امکان تھا، لہٰذا ایسا اقدام سوچ سمجھ کر کرنے کی ضرورت تھی۔ مولانا کی نگاہِ دور اندیش نے اس کو پہلے ہی تاڑ لیا اور مولوی اسحٰق کو اس طرف توجہ دلائی۔ مولانا اسکول کی عمارت کی تعمیر سے پہلے بورڈنگ کو تعمیر کرانے کے حق میں تھے۔ کیوں کہ ان کے پیش نظر تربیت نہایت ضروری تھی۔ اسکول تو اور بھی تھے مگر بورڈنگ والے اسکول کی ضرورت تھی، جہاں لڑکوں کی صحیح تربیت کی جاتی۔ مولوی محمد حسین بی۔ اے، مولوی مرزا سلیم، مولوی سلیم سندادی، مولوی محمد نعیم وغیرہ سے چندہ وصول کرنے کی تاکید کی۔ اسکول کی انتظامیہ کمیٹی کی روئداد کا مولانا کو انتظار رہا۔

مولانا چاہتے تھے کہ ان کے اعزا علی گڑھ آتے رہتے تو ان کی طبیعت بہلتی۔ کالج کی علمی ترقی دیکھتے تو اسکول کو ترقی دینے کا مزید خیال پیدا ہوتا۔ لہٰذا جب کالج میں کوئی جلسہ وغیرہ ہوتا تھا تو مولانا کسی نہ کسی کو مدعو کرتے تھے۔ اسی بہانے اعزا سے ملاقات بھی ہو جاتی تھی۔ چناں چہ اس

سے قبل اپنے منجھلے چچا کو بلا چکے تھے۔ اب کی اپنے چچا شیخ مجیب اللہ کو بلایا اور لکھا کہ منجھلے چچا تو آچکے ہیں اس لیے شاید ارادہ نہ کریں، پھر بھی اگر آئیں تو بہتر ہے، بڑی خوشی ہو، لیکن شیخ مجیب اللہ صاحب کو آنا ہی چاہیے۔ کیوں کہ ۱۱۔ دسمبر سے جلسے شروع ہو رہے تھے جو ۱۹۔ دسمبر تک جاری رہے۔ ان جلسوں میں سالانہ کھیل تماشے سب ہی کچھ ہوتے تھے، لہٰذا تفریح کا خاصہ سامان تھا۔ اس کے بعد ۲۷۔ دسمبر ۱۸۹۱ء (۲) سے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ہونے والی تھی، لہٰذا ۲۰۔ دسمبر سے ۲۶ دسمبر کے وقفہ میں دلی اور آگرہ کی سیر ہو سکتی تھی۔ مولانا چاہتے تھے کہ ان جلسوں سے فائدہ اٹھایا جاتا اور تفریح کی تفریح ہوتی۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ چچا کے ساتھ ان کے چچا زاد بھائی علی احمد اور مولوی سمیع (عزیز اور شاگرد) بھی آجاتے تو بہتر ہوتا (۳)۔

اسی زمانے میں حاجی اسمٰعیل خاں کو اپنے چھوٹے بھائی کی تعلیم کے لیے ایک استاد کی ضرورت ہوئی، انھوں نے مولانا سے ذکر کیا۔ مولانا نے اپنے استاد مولوی فاروق چریاکوٹی کا نام تجویز کیا۔ چناں چہ طے ہوا کہ پچاس روپیہ ماہانہ ان کی خدمت میں پیش کیے جائیں اور کھانا وغیرہ تنخواہ کے علاوہ۔ جب انھوں نے سارے معاملات طے کرلیے تو پھر مولوی فاروق کا پتا لگایا کہ وہ اپنے وطن چریاکوٹ میں تھے یا کہاں؟ مولوی سمیع کو ہدایت کی کہ وہ خود جاکر مولانا کی طرف سے مولوی صاحب سے اس ذمہ داری کو قبول کرنے کی استدعا کریں اور یہ کہیں کہ وہ فوراً علی گڑھ تشریف لے آئیں۔ مولوی فاروق کے قیام کی جگہ علی گڑھ سے صرف دس بارہ میل تھی، پھر آمد و رفت کی سہولت بھی تھی۔ چوں کہ بڑے دن کی تعطیل ہونے والی تھی، اس لیے مولانا چاہتے تھے کہ جلسوں میں شرکت کے لیے وطن سے لوگ آتے، خصوصاً مولانا کے چھوٹے چچا شیخ مجیب اللہ صاحب۔

مولانا نے اب سیرۃ النعمان کا دوسرا حصہ بھی مکمل کرلیا تھا۔ آخر دسمبر میں مطبع سے شائع ہو کر آنے والی تھی۔ تین سو (۳۰۰) صفحات کی کتاب تھی اور قیمت ایک روپیہ چار آنے طے کی گئی تھی۔ پچاس نسخے خریدنے والے کو پانچ روپیہ کا فائدہ تھا کیوں کہ سو روپے پر بیس روپیہ کمیشن دیا جاتا تھا۔ گویا ڈاک خرچ منہا کرنے کے بعد پانچ روپیہ کا فائدہ ہوتا تھا۔ اگرچہ مولانا کو اس کتاب کے سلسلے میں بڑی محنت کرنا پڑی تھی، مگر کتاب اچھی تیار ہو جانے پر مولانا مطمئن تھے۔ اور چوں کہ اعظم گڑھ اور اس کے قرب و جوار کے قصبات مقلد اور غیر مقلد کے جھگڑوں کے گڑھ رہ چکے تھے، جس کے اثرات اب بھی باقی تھے، لہٰذا مولانا چاہتے تھے کہ یہ کتاب وہاں خوب پھیلے اور پڑھی

جائے، تاکہ امام ابو حنیفہؒ کی قدر ہو اور تقلید کا رجحان اور فقہ سے دلچسپی پیدا ہو۔ کانفرنس کے اجلاس میں اب کی زیادہ مجمع ہونے کا امکان نہ تھا، مگر بڑے لائق لوگ اپنا کمال دکھانے والے تھے (۴)۔

مولانا نے اسی سال پہلی مرتبہ حیدرآباد (دکن) کا سفر کیا۔ عماد الملک بلگرامی سے ۱۸۸۹ء میں سرسید اپنے ساتھ مولانا شبلی کو حیدرآباد لے جانے کا وعدہ کر چکے تھے۔ اس خط میں انھوں نے لکھا تھا:

"انشاء سفر میں ارادہ حیدرآباد آنے کا بھی ہے۔ اگر ممکن ہوا تو مولوی شبلی صاحب کو بھی حیدرآباد لاؤں گا، تاکہ آپ کو وہ اپنی آنکھ سے دیکھ لیں اور جان لیں کہ آپ کون ہیں اور کیسے ہیں (۵)۔"

چناں چہ اس وعدے کو پورا کرنے کا وقت اب آیا۔ سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں:

"اس سفر میں سرسید تنہا نہ تھے بلکہ انھوں نے ایک وفد ترتیب دیا، جس میں ان کی تحریک کے بہت سے عمائد و ارکان شریک تھے۔ ان میں سے ایک مولانا شبلی بھی تھے (۶)۔"

مولانا نے لکھنو سے حیدرآباد تک سفر کے حالات اپنے ایک منظوم خط میں خواجہ امین الدین صاحب لکھنوی کو لکھے تھے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ علی گڑھ سے سرسید کے ساتھ روانہ نہیں ہوئے تھے۔ اس قصیدے کو اس طرح شروع کیا ہے:

" مرحبا قاصد فرخندہ سنہ گلم براہ　　　　که ترا فضل خدا باد بہر حال پناہ (۷) "

سید سلیمان ندوی اس سفر کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مولانا شبلی مرحوم نے اپنے سفر کے حالات ایک فارسی قصیدہ میں ذکر کیے ہیں، جو ان کے کلیات فارسی میں چھپا ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ علی گڑھ سے سرسید کے ساتھ نہیں چلے تھے بلکہ وہ شاید اپنے وطن میں تھے، وہاں سے لکھنو اور کان پور ہو کر اس سفر کے لیے روانہ ہوئے۔ سرسید کا قافلہ اس سے پہلے چل چکا تھا، اس لیے راہ میں ملاقات نہیں ہوئی (۸)۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں:

"مولانا جب بھوپال پہنچے تو معلوم ہوا کہ کل وہ قافلہ یہاں سے روانہ ہو گیا، وہ آگے بڑھے اور آخر تین رات دن کے سفر کے بعد حیدرآباد پہنچے (۹)۔"

مولانا لکھتے ہیں:

اول آہستہ ہمی راندو چوپا سے بگذشت   کانپور آمد و افزود بسرعت ناگاہ
چوں بہ بھوپال رسیدم زکساں پرسیدم   ہیچ دانید کزیں راہ گزشتست آں شاہ
سید آں قافلہ سالار کہ درکشور فضل   اوبود شاہ و حریفانِ دگر خیل و سپاہ
ہم ازاں جمع یکے گفت کہ آرے دیروز   او گزشت ست ازیں راہ بہنگام پگاہ
چوں زبھوپال گذشتم بہ نگاہم آمد   منظرے تازہ کہ افزود مرا نور نگاہ
ہر طرف می نگری سروچماں بود و چمن   ہر کجاے گذری آب رواں بود و گیاہ
آخر آں مرحلہ ہا نیز بسر آمد و پس   برسیدیم در اقلیم دکن ہفتم ماہ
للہ الحمد کہ با ایں سفر دور و دراز   کہ شباروز سہ تاریخ گذشت ست بہ راہ
طبع من ہست .بہر وجہ کہ جوئی خرم   حال من ہست .بہر گو نہ کہ خواہی دلخواہ

الغرض چوں زشب ہفتم پاسی بگذشت
حیدر آباد رسیدیم و سخن شد کوتاہ (۱۰)

سید سلیمان ندویؒ حیدر آباد میں ان مہمانوں کی قدر و منزلت کے بارے میں اس طرح لکھتے ہیں:

"حیدر آباد میں سرسید اوران کے رفقاء کی بڑی قدر و منزلت ہوئی، سرکاری مہمان خانے میں اتارے گئے، احباب نے دعوتیں کیں، جلسے ہوئے۔ اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں نے جنھوں نے ابھی ابھی اختیار پایا تھا وفد کو حضوری کا شرف بخشا، اور ایک ہزار ماہوار کی پہلی شاہانہ امداد کو دوچند یعنی دو ہزار ماہانہ کرنے کا حکم فرمایا۔ نواب اقبال الدولہ، وقار الامراء کی صدارت میں بشیر باغ میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں سرسید اور ان کے رفقاء نے تقریریں کیں۔ مولانا حالی نے اپنا اردو (۱۱) اور مولانا شبلی نے اپنا مشہور فارسی قصیدہ پڑھا، جس میں یہ تمام واقعات یعنی بادشاہ کے حضور میں پیش ہونا، وقار الامراء کا آگے بڑھ کر فرمان پڑھنا اور دو ہزار ماہوار کا حکم ہونا سب مذکور ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قصیدے کی تکمیل حضور میں پیشی کے بعد حیدر آباد میں کی گئی ہے (۱۲)۔"

مطلع یہ ہے:

اے بزرگان گرانمایہ و اصحاب کبار   اے عزیزان وفا پرور و اخلاص شعار (۱۳)

سرسید کاذکراس طرح کرتے ہیں:

"می نہ بینید کہ سرسید ما آنکہ بہ فضل | رہبر قافلہ ماست بہ ہر راہ گذار
چیست آخر کہ بایں پیری وایں ضعف بدن | از علی گڑھ بہ دکن آمد و جوید تیمار
تاچہ خواہد کہ بدریوزہ گری خاستہ است | تاچہ دارد کہ ازیں ننگ ندارد انکار
تاچہ حال ست کہ آتش ز نفس می بارد | تاچہ حال ست کہ خوں میچکدش از گفتار
ایں ہمہ غلغلہ آخر نہ بود بے چیزے | ایں ہمہ ولولہ بے صرفہ نبا شد زنہار
حضرت حالی و شمس العلماء را بنگر | واں دگر دیدہ ورانی کہ بوندش انصار
تاچہ پیش آمدہ کیں ناموراں را بجہاں | دربدر گشتن ودریوزہ گری گشت شعار

شرح ایں قصہ، جاں سوز نہ گفتن تاکے
سوختم سوختم ایں سوز نہفتن تاکے (۱۴)

آخر میں دربار میں پہنچنے اور باریاب ہونے کا بڑا اعلیٰ مرقع کھینچنے کے بعد آخری شعر اس طرح ہے۔ اس میں نظام اور نظامی کی رعایت نے لطف کو دوبالا کردیا ہے۔ لکھتے ہیں:

یعنی از نسبت آں شاہ گرامی باشم | شدہ نظام ست و بزیبد کہ نظامی باشم (۱۵)

تمکین کاظمی لکھتے ہیں:

"پہلے تو قصیدہ بھی رواں دواں تھا، اس پر شبلی کے ترنم نے بڑی دل آویزی پیدا کردی اور محض شبلی کی خاطر وقار الامراء نے اپنے دیوان میں ایک تقریب منعقد کی اور شبلی کو مدعو کر کے دوبارہ نظم سنی۔ شبلی کی یہ پہلی ہی آمد بڑی دلچسپ، خوش آئند اور حوصلہ افزا رہی۔ اور انہیں حیدرآباد نے مسحور کرلیا۔(۱۶)"

واپسی میں سرسید کا قافلہ بھوپال ٹھہرا۔ یہاں مولانا کی "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" اور المامون، پہلے ہی پہنچ چکی تھیں اور نواب علی حسن خاں صاحب ان کے پہلے ہی قدردان تھے۔ لہذا قدرشناسی کا ثبوت یہ دیا کہ مولانا کو اپنے پاس ٹھہرایا۔ چناں چہ سید سلیمان ندوی اس قیام کے متعلق اس طرح لکھتے ہیں:

"شہر کے اکثر علماء اور شعراء نے ان سے ملاقاتیں کیں۔ دن دن بھر یہ صحبت اتنا طول کھینچتی کہ مولانا گھبرا جاتے تھے۔ مولانا کی نواب صاحب سے یہی پہلی ملاقات ہے جو بڑھتے بڑھتے محبت اور قدرشناسی کی آخیر حد تک پہنچ گئی تھی(۱۷)۔"

یہ قافلہ اگست کے آخر میں حیدرآباد کے لیے روانہ ہوا تھا۔ ۷۔ ستمبر ۱۸۹۱ء کو فلک نما

(۱۸) میں فارسی قصیدہ پڑھا اور اکتوبر کے آخر (۱۹) میں حیدر آباد سے واپس ہوئے۔ اس طرح نومبر میں بھوپال میں قیام رہا اور آخر نومبر یا شروع دسمبر میں علی گڑھ واپس آئے۔ اس قافلے میں سرسید کے علاوہ مولانا حالی، مولوی ذکاء اللہ، حاجی اسمٰعیل خان، مولوی زین العابدین خاں اور ان کے صاحبزادے زین الدین خاں، مولوی شبلی، قاضی رضا حسین خاں عظیم آبادی، احمد علی (برادر سید محمد علی) تھے (۲۰)۔

حواشی:

۱ ـــ مکاتیبِ شبلی، حصہ اول، صفحہ ۲۵، ۲۶، جولائی ۱۸۹۱ء

۲ ـــ اب کانگریس سے یہ کانفرنس بن چکی تھی۔ نام تبدیل کرنے کا سبب یہ تھا کہ انڈین نیشنل کانگریس جو سیاسی جماعت تھی وہ روز بروز ترقی کر رہی تھی، اس لیے لوگوں کے شبہے کا اندیشہ تھا۔ لہٰذا پروفیسر ماریسن کے مشورے سے اس کا نام ایک ریزولیشن کے ذریعے الہ آباد کے سالانہ اجلاس ۱۸۹۰ء میں بدل دیا گیا۔

۳ ـــ مکاتیبِ شبلی، حصہ اول، صفحہ ۲۰، ۷- دسمبر ۱۸۹۱ء ۴ ـــ ایضاً، صفحہ ۸۷-۸۸

۵ ـــ مکتوباتِ سرسید مجلس ترقی اردو- لاہور، صفحہ ۳۳۲، ۲۰- مارچ ۱۸۸۹ء (حیاتِ شبلی، صفحہ ۱۸۱ پر ۲۰- نومبر ۱۸۸۹ء ہے جو صحیح نہیں معلوم ہوتا)

۶ ـــ حیاتِ شبلی، صفحہ ۱۸۲

۷ ـــ دیوان شبلی، مطبع نامی کانپور، صفحہ ۱۱

۸ ـــ حیاتِ شبلی، صفحہ ۱۸۳-۱۸۴

۹ ـــ حیاتِ شبلی، صفحہ ۱۸۴

۱۰ ـــ دیوان شبلی فارسی، مطبع نامی کانپور، صفحہ ۱۲-۱۳

۱۱ ـــ مولانا حالی کے قصیدے کا پہلا شعر یہ ہے:

اے صفر کی دوسری روز دو شنبہ مرحبا   ہم نہ بھولیں گے کبھی وہ تیری صبح جاں فزا

(حالی کا ذہنی ارتقاء، صفحہ ۱۲۱)

۱۲ ـــ حیاتِ شبلی، صفحہ ۱۸۴

۱۳ ـــ دیوان شبلی فارسی، صفحہ ۱۴

۱۴ ـــ ایضاً، صفحہ ۱۴-۱۵

۱۵ ـــ دیوان شبلی فارسی، صفحہ ۱۹

۱۶ ـــ شبلی حیدر آباد میں- ماہنامہ ادب، علی گڑھ، اکتوبر- ۱۹۶۰ء، صفحہ ۴

۱۷ ـــ حیاتِ شبلی، صفحہ ۱۸۸

۱۸ ـــ وقار الامراء کا محل

۱۹ ـــ حالی کا ذہنی ارتقاء، صفحہ ۱۲۶

۲۰ ـــ حالی کا ذہنی ارتقاء، صفحہ ۱۲۳

۱۸۹۲ء

سیرۃ النعمان مکمل ہو کر پہلی مرتبہ جنوری ۱۸۹۳ء میں شائع ہوئی (۱)۔ اس کے دیباچہ میں مولانا نے "الفاروق" کے متعلق بھی چند الفاظ لکھے تھے، جو ان ہی کے قلم سے یہاں مناسب ہیں۔ لکھتے ہیں: المامون کے بعد میں نے الفاروق لکھنی شروع کی تھی اور ایک معتد بہ حصہ لکھ بھی لیا تھا، لیکن بعض مجبوریوں سے چند روز کے لیے اس کی تالیف سے ہاتھ اٹھانا پڑا۔ اس پر کوتاہ بینوں نے عجیب عجیب بدگمانیاں کیں۔ حالاں کہ بات اتنی تھی کہ بعض نادر کتابیں جو اس تصنیف کے لیے ضروری ہیں اور یورپ میں چھپ رہی ہیں، ابھی تک پوری چھپ کر نہیں آچکیں۔ اس کے علاوہ ایک سبب اور بھی تھا جس کا مولانا نے اظہار نہیں کیا۔ وہ سرسید کی اس بنا پر مخالفت تھی کہ سنی اور شیعہ میں اختلاف کا اندیشہ تھا اور چوں کہ اس کا سبب علی گڑھ کالج کا ایک پروفیسر تھا، اس لیے کالج کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا اور کالج کے لوگوں میں بھی اختلاف ہونے کا اندیشہ تھا۔

مولانا کو مولوی فاروق صاحب کے متعلق نہ معلوم ہو سکا کہ وہ اس زمانہ میں کہاں قیام پذیر تھے۔ وہ دل سے چاہتے تھے کہ مولوی صاحب علی گڑھ کے قریب حاجی اسمٰعیل خان کے قصبہ میں ان کے بھائی کے اتالیق ہو جاتے۔ مولوی سمیع کو تاکید کی کہ وہ ان کا پتہ لگانے کی پھر کوشش کریں۔ مولوی سمیع کی فرمائش پر مولانا نے سیرۃ النعمان کی دس جلدیں وی پی ارسال کیں۔ چوں کہ اسکول کا چندہ مولانا کے ذمے باقی تھا، اس لیے مزید چار نسخے بھیجے کہ ان کو فروخت کر کے چندہ ادا کر دیا جائے۔ محصول ڈاک چوں کہ خریدار کے ذمہ ہوتا ہے اس لیے اس کو بھی کتابوں کی قیمت میں شامل کرنے کو لکھا۔

مولانا کی خواہش تھی کہ اس کتاب کو اعظم گڑھ کے اطراف میں پھیلائیں، تاکہ حنفیوں کی معلومات میں اضافہ ہو۔ کچہری کے عمال اور سوداگروں کو بھی اس سے واقف ہونے کی ضرورت تھی، کیوں کہ اس میں ان کے متعلق فقہی مسائل اور نکات موجود تھے، جو ان کی رہنمائی کر سکتے تھے اس غرض سے مولانا نے کتاب کے چند اشتہارات بھیجے، تاکہ کتاب کی تشہیر میں آسانی ہو (۲)۔

مولانا کی تین چار ماہ سے طبیعت خراب تھی۔ ۲۸۔ مارچ کو بہت سخت بخار آیا، درجہ حرارت ۱۰۶ تک پہنچ گیا۔ چار دن تک یہی کیفیت رہی اور خاصی تکلیف رہی۔ ۳۱۔ مارچ سے بخار

میں کچھ کمی ہوئی، مگر دوسری تکلیفیں مثلاً کھانسی باقی رہی۔ ڈاکٹر نے کونین استعمال کرائی جس کے اثر سے اونچا سننے لگے۔

مولوی محمد کامل کو علی گڑھ بلایا تھا، مگر وہ نہ جاسکے تو مولانا نے چاہا کہ محمد منیر چریا کوٹی ہی علی گڑھ آجاتے۔ مولانا نے اسکول کے لیے پچیس روپے بھیجے اور پانچ روپے باقاعدہ بھیجنے کا وعدہ کیا۔ مولوی سمیع نے سیرۃ النعمان کے مزید نسخے طلب کیے، تو ان کو لکھا کہ پہلا ایڈیشن عرصہ ہوا ختم ہو گیا۔ (پہلا ایڈیشن تین مہینے میں ختم ہو گیا تھا) دوسرے ایڈیشن کے چھپنے کی اطلاع دی۔ اسکول کے امتحان کا نتیجہ بہت اچھا رہا تھا، اس لیے مولانا بہت خوش تھے۔ مولانا کا خیال تھا کہ مولوی اسحٰق سے مشورہ کرکے اسکول کے لیے مزید امداد کی درخواست انسپکٹر کی رپورٹ کی بنیاد پر اگر دے دی جاتی تو مناسب تھا (۳)۔

۵۔ اپریل کو مولانا نے مولوی سمیع کو منیر صاحب کے لیے پھر یاد دہانی کی کہ اگر ان کا علی گڑھ آنے کا خیال ہو تو جلد آئیں، ان کے رہنے کا بندوبست بھی کر دیا جاتا۔

صحت ہونے کے بعد مولانا کا کشمیر جانے اور ڈیڑھ دو مہینے قیام کا ارادہ تھا۔ مولانا چاہتے تھے کہ مولوی سمیع بھی ساتھ چلتے، جس سے مولانا کا ساتھ ہوتا اور ہمدردی کا ثبوت ملتا۔ پھر کشمیر کا دیکھنا بہت بڑی نعمت تھی۔ اس زمانہ میں آمد و رفت کا خرچ چالیس پچاس روپیوں سے زیادہ نہ تھا۔ وہ مولوی سمیع کے ذمے اور قیام وغیرہ کا خرچ مولانا اٹھانے کو تیار تھے۔ مزید شوق دلانے کے لیے لکھا کہ اگر جنت کا نمونہ دیکھنا ہو تو کشمیر چلنا چاہیے اور اگر آنا ہو تو جلد آنا چاہیے اور جواب لکھنا چاہیے تاکہ انتظار نہ کرنا پڑے۔

ملیریا بخار باری سے برابر آتا رہا۔ ڈاکٹر بھی دوائیں بدل بدل کر اپنا روز لگاتے رہے۔

۵۔ اپریل کو خاص طور پر ایک دوا دی تاکہ بخار نہ آئے (۴)۔

کشمیر کے سفر کی مولانا کو بڑی دھن تھی۔ چناں چہ دس اپریل کو مولوی سمیع کو پھر یاد دہانی کی کہ وہ اپنے ارادے سے مطلع کریں۔ اب مولانا نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ آخر اپریل میں کشمیر کے لیے روانہ ہو جائیں۔ لہٰذا مولوی سمیع کو ترغیب دلائی کہ اگر وہ کشمیر گئے تو ان کے سیاہ رنگ میں بھی کمی ہو جائے گی، اس لیے کہ وہاں کی آب و ہوا بڑی فرحت بخش تھی اور وہ چہرہ پر سرخی لے آتی اور سیاہی کو مدھم کر دیتی۔ مولانا علی گڑھ میں بیٹھے کشمیر کا خیالی لطف اٹھا رہے تھے اور وہاں کی شگفتگی کو مزاحیہ انداز میں پیش کر رہے تھے (۵)۔

مولانا کے والد نے پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کر لی تھی، لیکن مولانا کی والدہ کے نام کچھ جائیداد ہبہ کر دی تھی، جس کا کوئی ثبوت نہ تھا۔ اس کے بعد شیخ حبیب اللہ اور ان کے بھائیوں کے درمیان ایک اقرار نامہ ہوا تھا۔ جو ہبہ کو باطل کر چکا تھا۔ اس کے بعد ایک اور عہد نامہ لکھا گیا تھا، جس میں مولانا اور ان کے بھائیوں کی طرف سے کچھ جائیداد سے دست برداری تھی اور اس کے صلہ میں معاوضہ بھی تھا۔ مولانا کی سوتیلی والدہ جس مکان میں قیام پذیر تھیں، وہ چھاؤنی کے نام سے مشہور تھا، اس لیے مولانا اسے چھاؤنی کہتے اور لکھتے تھے۔ اس اقرار نامہ میں چھاؤنی والی کی طرف سے بھی دست برداری تھی اور اس کا معاوضہ مولانا اور ان کے بھائیوں کی طرف سے کچھ نہ تھا، اس لیے مولانا اس اقرار نامہ کو فضول سمجھتے تھے۔ پہلے تو مولانا نے وہ اقرار نامہ سرسری طور پر دیکھا اور کچھ امور اپنے ماموں (اعظم گڑھ میں وکیل تھے) کو لکھ کر بھیجے۔ اس کے بعد اس اقررا نامہ کو باقاعدہ پڑھا تو بہت سی خامیاں نظر آئیں۔ اسی زمانے میں مولوی عبداللطیف سید پوری جو اس زمانہ میں کاسگنج میں قائم مقام منصف تھے۔ وہ مولانا کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ انھوں نے بھی مولانا کی رائے سے اتفاق کیا۔ مولوی اسحٰق اس اقرار نامہ کے حق میں تھے، اس لیے مولانا کو زیادہ تعجب ہوا کہ خامیوں پر ان کی نظر کیوں نہ گئی۔ مولانا کا کہنا یہ تھا کہ ان کے والد نے ان کی والدہ کو جو ہبہ کیا تھا وہ محض بے سروپا چیز تھی، اس کا تذکرہ بیکار تھا۔ اس لیے کہ ایک تو اس کا کوئی ثبوت نہ تھا، دوسرے تمام کارروائی اس اقرار نامے سے باطل ہو گئی تھی۔ جو ان کے والد اور چھاؤں کے درمیان ہوا تھا۔ اس پر کسی بات کو مبنی کرنا فساد کی جڑ تھی، بلکہ بدگمانیاں پیدا کرنے والی تھی۔ مولانا کا موقف یہ تھا کہ جب مولانا اور ان کے بھائی کسی جائیداد کے مالک نہ تھے، کیوں کہ والدہ کے نام ہبہ فضول تھا اور بعد کے اقرار نامہ میں مولانا وغیرہ کو کچھ نہیں دیا گیا تھا بلکہ والدہ کے نام ہبہ مفروضہ کا حوالہ دیا گیا تھا، لہٰذا مولانا وغیرہ جائیداد کے مالک نہیں ٹھہرتے تھے۔ جب مالک نہ تھے تو پھر دست برداری اور معاوضہ بے کار تھا۔ مولانا کا یہ خیال تھا کہ اگر یہ صورت ہوتی کہ جس قدر زیادہ حصہ فریق سوم (چھاؤنی والی) کو دیا گیا تھا، وہ بذریعہ بیع کے فریق دوم (مولانا وغیرہ) کی طرف رجوع کیا جاتا اور فریق دوم (مولانا وغیرہ) کا اصلی حصہ بذریعہ ہبہ نامہ منتقل کیا جاتا۔ اس کے علاوہ کوئی تدبیر مناسب نہ تھی۔ لیکن یہ تدبیر مولانا کے والد اور چھاؤنی والی کو پسند نہ ہوتی۔ چوں کہ مولانا کے بھائی مہدی حسن بھی چھاؤنی والی کے ہمنوا تھے، لہٰذا ان کو بھی پسند نہ ہوتی۔ مولانا کو اپنی حق تلفی پر چوں کہ کوئی شکایت نہ تھی، اس لیے

کسی کو فکر کی ضرورت نہ تھی۔ بہر حال دستاویز مہمل تھیں اور اس کو کسی طرح جائز نہ ٹھہرایا جاسکتا تھا۔ مولانا نے مولوی اسحاق کو آزادی دی تھی کہ وہ جو لائحہ عمل چاہیں اس معاملے میں اختیار کریں۔ مگر مولانا کے موقف کو مولانا کے ماموں مولوی محمد سلیم کے سامنے پیش کر دیں تاکہ وہ بھی واقف ہو سکیں (۶)۔

مولانا کو ترکی جانے کا خیال ۱۸۸۹ء میں آیا تھا (۷) اور مئی ۱۸۹۱ء میں جانے کا ارادہ بھی کر لیا تھا، مگر کچھ ایسے حالات ہوئے کہ نہ جاسکے۔ مارچ، اپریل ۱۸۹۲ء میں ملیریا میں مبتلا ہوئے اور اسی زمانہ میں ارادہ کیا کہ کشمیر جائیں، تاکہ صحت پورے طور پر بحال ہو جائے۔

مولانا کشمیر کا ارادہ کر رہے تھے۔ مگر اس سال کوہ قاف کی سرزمین مولانا کے قدموں کو چومنے کو بے چین تھی۔ چناں چہ ان کے قسطنطنیہ کے سفر کے خیال کو تقویت اس طرح ہوئی کہ انہیں معلوم ہوا کہ مسٹر آرنلڈ جلد ہی ولایت واپس جانے والے ہیں۔ لہذا ارادہ کر لیا کہ وہ ترکی کا سفر کریں، اس طرح سفر میں مسٹر آرنلڈ کا ساتھ ہو جائے گا۔ آرنلڈ سے مولانا کو بڑی انسیت بھی تھی۔ لہذا سفر میں ان کی رفاقت نعمت غیر مترقبہ معلوم ہوئی۔ مسٹر آرنلڈ سے ذکر کیا تو انھوں نے ہمت افزائی کی۔ مولانا جھٹ پٹ تیار ہو گئے۔ کہاں تو دو سال پہلے سے مولوی سمیع سے ساتھ چلنے کا وعدہ لے رہے تھے اور کہاں اب روانگی کی اطلاع دیتے ہی بن پڑی، کیوں کہ جہاز کی روانگی میں بہت کم وقت تھا۔ کالج میں تین مہینے کی چھٹی ہوتی تھی اور مولانا نے مزید تین ماہ کی چھٹی لی اور ۲۶۔ اپریل ۱۸۹۲ء (۸) کو علی گڑھ سے روانہ ہوئے۔ جھانسی سے مسٹر آرنلڈ کا ساتھ ہوا اور ۳۰۔ اپریل ۱۸۹۲ء (۹) کو بمبئی پہنچے۔ یہاں حاجی رحمت اللہ بن داؤد کے باغ میں قیام کیا۔ یکم مئی ۱۸۹۲ء کو جہاز پر صبح ۹ بجے سوار ہوئے۔ اس سفر میں مسٹر آرنلڈ مولانا سے عربی پڑھتے رہے اور مولانا سمندر کا لطف اٹھاتے رہے اور اس لطف کو شاعری کا جامہ پہنچاتے رہے۔ اور شاعری کے حالات پر ایک قصیدہ کہنا جہاز پر شروع کیا اور قسطنطنیہ پہنچ کر ختم کیا۔ اس قصیدے میں بہتر (۷۲) اشعار ہیں۔ شروع کے اشعار یہ ہیں:

بہر تکمیل فن و بہم پئے تحصیل عبر	روزگا ریست کہ میدا شتم آہنگ سفر
فارغ از حج و زیارت چو مرا کرد خدائے	خواستم تابسوئے روم شدم راہ سپر
گرچہ من گرم طلب بودم و بس متعجل	لیک تاخیر ہمی رفت بہ فرمان قدر

اس قصیدے میں سومالی قوم کے لڑکوں کی متبذل حرکتوں کی بنا پر ہجو ہے۔ آخر کے دو شعر

یہ ہیں:

مختصر گفتہ ام ایں حرف تو ہم میدانی — کہ دریں بادیہ بس تنگ بود راہ گزر
ہر کہ جویا بود از حال من و رحلہ من — بایدش گفت کہ ایں نظم بخواند یکسر (۱۰)

۷۔ مئی کو جہاز عدن پہنچا۔ یہاں مولانا نے سومالی قوم کے لڑکوں کو چند پیسوں کی خاطر مبتذل حرکتیں کرتے دیکھا اور ان کو عرب سمجھ کر بہت رنجیدہ ہوئے، بعد کو جب حقیقت معلوم ہوئی تو تسکین ہوئی۔

۱۳۔ مئی کو جہاز سویز پہنچا۔ یہاں ایک خوانچے والے نے مولانا سے اردو میں بات کی تو مولانا کو تعجب ہوا۔ دریافت کرنے سے جب معلوم ہوا کہ اس نے ہندوستان کبھی نہیں دیکھا تو اور حیرت ہوئی اور اردو زبان کی مقبولیت پر مزید استعجاب ہوئے۔

۱۵۔ مئی کو جہاز یافہ پہنچا اور ۱۶۔ مئی کو بیروت پہنچا۔ مولانا ایک آدمی کو ساتھ لے کر شہر کی سیر کر آئے۔ ۱۷۔ مئی کو جہاز قبرص (سائپرس) پہنچا۔ مولانا اس کے شہر لماسون میں اترے اور وہاں کی جامع مسجد دیکھی۔ مسجد سے متصل اسلامی مکتب کے مدرس سے ملاقات کی اور ایک طالب علم سے قرآن پاک کی چند آیتیں سن کر بہت متاثر ہوئے۔

۱۸۔ مئی کو جہاز روڈس پہنچا اور یہاں کئی گھنٹے ٹھہرا، مگر ایک رات کی وجہ سے مولانا اس کو نہ دیکھ سکے۔

۲۰۔ مئی کو جہاز صبح کے وقت ازمیر پہنچا۔ یہاں جہاز دو روز ٹھہرا۔ مولانا نے خوب سیر کی اور جمعہ کی نماز جامع حصار میں پڑھی۔ مسجد سے متصل کتب خانہ میں چند علما اور محکمہ تعلیم ترکی کے افسروں سے ملاقات کی۔ متعہ کے مسئلہ پر مولانا نے بحث میں حصہ لیا اور فارسی میں بڑی اچھی تقریر کی۔ (وہ لوگ فارسی جانتے تھے) جو لوگوں نے پسند کی۔ یہاں سے ۲۱۔ مئی کو شام میں روانہ ہو کر ۲۳۔ مئی (۱۱) کو قسطنطنیہ پہنچے۔ کشتی میں جب ساحل کے لیے روانہ ہوئے تو اسی کشتی میں شیخ عبدالفتاح سے ملاقات ہوئی۔ یہ شام کے ایک بزرگ خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور حضرت خالد رومی نقشبندی (۱۲) کے سلسلہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ہندوستان کے نقشبندیہ سلسلہ کے بزرگوں سے واقف تھے۔ ممکن ہے یہی تعلق دونوں میں یگانگت کا سبب بنا ہو۔ بہر حال دونوں نے ایک سرائے میں چھ سات دن قیام کیا اور اسی سرائے سے سرسید کو ۲۵۔ مئی کو پہلا خط لکھا (۱۳)۔

مولانا نے قسطنطنیہ پہنچتے ہی کتب خانوں کے چکر لگانے شروع کر دیے (۱۴)۔ اس درمیان میں امام غزالی کی تصنیفات اور بو علی سینا کی تقریباً کل تصنیفات کا پتہ چلا لیا تھا۔ وہاں امام غزالی کے خطوط بھی موجود تھے۔ انھوں نے وقتی طور پر ایک حجرہ گیارہ روپے ماہانہ کرایہ پر لے لیا تھا، مگر کھانے کے اخراجات زیادہ معلوم ہو رہے تھے۔ سرسید سے علی الحساب دو تین سو روپیہ کنگ کمپنی (تھامس کنگ) کے ذریعے طلب کیے، تاکہ جس وقت کوئی کتاب ہاتھ لگے خرید لی جائے یا اس کو نقل کرانے کا فوری انتظام کر دیا جائے، اس لیے کہ وہاں کتابیں بہت اور نادر تھیں۔ لہٰذا انھوں نے ترکی پڑھنا شروع کر دی۔ خیال تھا کہ واپسی تک خاصی ترکی سیکھ جائیں۔ وہاں کے بڑے کالج دیکھے، مگر حالات معلوم کرنے میں زبان کی وجہ سے بڑی دقت ہوئی۔ مولانا کا تعلق چوں کہ کالج سے تھا، لہٰذا وہاں ایک دلچسپی کالجوں کے حالات معلوم کرنے سے بھی تھی اور چاہتے تھے کہ تمام کالجوں کی رپورٹ تیار کریں۔ وہیں سفرنامہ کا خیال بھی آیا تھا، مگر عدیم الفرصتی کی وجہ سے نہ لکھ سکتے تھے۔ شہر بڑا تھا اور کتب خانے دور دور اور کتابوں کا شوق تیز، لہٰذا روزانہ تین چار میل کا چکر لگانا اور کتابوں میں منہمک ہونا یہ روز کا مشغلہ تھا۔ ان دنوں وہاں عینی کی شرح بخاری چھپ رہی تھی اور نو جلدیں چھپ چکی تھیں۔ حنفیوں کو اس کی عرصہ سے تلاش تھی۔ سرسید سے دریافت کیا کہ اگر کسی کو ضرورت ہو تو بھیج دی جائے۔ بیروت کے علما نے عرب عیسائیوں کے اشعار کا مجموعہ تیار کیا تھا، جس کی ایک جلد چھپ چکی تھی۔ اسی میں اخطل کا دیوان بھی تھا، جو نایاب تھا اور اس کی مشرقی اور مغربی ملکوں میں تلاش تھی۔ اس مجموعے میں جاہلیت اور اسلام دونوں کے عیسائی شعراء کا کلام تھا۔ سرسید کو معتزلہ کی کتابوں کی تلاش رہا کرتی تھی۔ مولانا کو ان کی دلچسپی کا وہاں بھی خیال رہا اور معتزلہ کی کتابوں کی تلاش رہی۔ آخر سرسید کو اطلاع دی کہ وہاں بھی معتزلہ کی کتابیں نہ تھیں۔ مولانا کے اعزا اور ہم وطن علی گڑھ کالج میں پڑھتے تھے۔ ان کی فکر ان کو وہاں بھی رہی اور سرسید کو ان لوگوں کی طرف توجہ دلائی اور حمید الدین فراہی کی سرسید کے ذریعہ نگرانی کی تاکید کی۔ چوں کہ مولانا بہت مصروف تھے اور ہر ایک کو الگ الگ خط لکھنے کے لیے وقت نکالنا مشکل تھا۔ لہٰذا سرسید کو لکھا کہ خط کی نقل ان کے والد کو بھیج دی جائے۔ اس سفر میں قصیدہ بھی تیار ہو گیا تھا۔ لہٰذا وہ بھی سرسید کو بھیجا اور لکھا کہ مفید عام پریس میں چھپوا کر علی گڑھ گزٹ کے ساتھ اگر مناسب ہو تو شائع کر دیا جائے اور ان کے چند نسخے ان کے والد کو بھیج دیے جائیں۔ وہاں ایک فارسی اخبار اختر شائع ہوتا تھا۔ اس کی اشاعت دو ہزار تھی اور شش ماہی قیمت

چھ روپے تھی۔ لہٰذا مولانا نے اس کو سرسید کے لیے جاری کرا دیا اور اس کی قیمت بھی کتابوں کے روپوں کے ساتھ بھیجنے کو لکھا کیوں کہ وہ چاہتے تھے کہ اخبار کو اپنے خریدار کی وجہ سے کالج سے واقفیت ہو جائے گی اور کالج کے حالات چھپنے لگے گا۔ اس طرح وہاں کے اکثر لوگ ہندوستان سے واقف ہو جائیں گے تو وہاں کے اوقاف سے کالج کو مدد ملنے کا امکان ہو سکتا تھا، کیوں کہ وہاں کے اوقاف سے دوسرے ملکوں کو بھی فائدہ پہنچ رہا تھا۔

اب مولانا نے دوسرا مکان کرایہ پر لے لیا اور جادہ، باب عالی معرفت ادارہ اختر قسطنطنیہ پر قیام تھا۔ مکان خوش منظر اور تمام ضروریات کے لیے موزوں تھا۔ کرایہ البتہ زیادہ تھا مگر ضروریات کے لحاظ سے مناسب تھا۔ اب ان کی صحت بہتر تھی، وہاں کی زبان کی ناواقفیت کی وجہ سے لوگوں سے میل جول اور ملاقات میں دشواری ہو رہی تھی، اس لیے کہ یہ ان کی بولی سمجھتے تھے نہ وہ ان کی۔ یار من ترکی و من ترکی نمی دانم کے مصداق معاملہ تھا۔

وہاں کتابیں عجیب و غریب تھیں۔ مگر بعض دشواریوں کی وجہ سے نقل نہیں ہو سکتی تھی اور کسی کا حافظہ اتنا نہیں ہوتا کہ سب محفوظ کر لے۔ روزانہ دو تین میل پیدل چلنے کی وجہ سے صحت برابر ترقی کر رہی تھی۔ وہاں ہندوستانی سرکاری عہدوں پر فائز تھے، مگر ان کی تنخواہیں کم تھیں اور وہاں کم ہی ہوا کرتی تھیں۔ مولانا کا دو تین ماہ سے زیادہ قیام کا ارادہ نہ تھا، اس لیے چاہتے تھے کہ گھر سے خطوط جلد جلد آئیں۔ اس زمانے میں ہندوستان سے بیس بائیس روز میں خطوط پہنچتے تھے۔ وہاں ایک مشترک کمپنی نے ڈیڑھ دو لاکھ کے سرمایے سے قدیم کتابوں کے شائع کرنے کا کام شروع کیا تھا۔ اس کا اپنا مطبع تھا اور اس میں انجن اور کلوں کے ذریعے کام ہوتا تھا۔ وہی کمپنی عینی (بخاری کی شرح) شائع کر رہی تھی۔ مولانا کا خیال تھا کہ اس میں بعض تحقیقات ایسی تھیں جو فتح الباری میں نہیں مل سکتی تھی۔ قیمت کا تعین اس وقت نہیں ہوا تھا۔ وہاں پر کالج کا ایک خاص لباس تھا اور کوٹ پر گریبان کے قریب اس کالج کا نام لکھا ہوتا تھا۔ یہ چیز مولانا کو بہت پسند آئی۔ انھوں نے علی گڑھ کالج کے لیے بھی اس چیز کو پسند کیا۔ لہٰذا انھوں نے خواہش کی کہ سرسید بھی اس امتیازی نشان کو کالج کے لیے اپنا لیں۔

ہر جمعہ کو خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالحمید خان مسجد حمیدیہ میں نماز ادا کرتے تھے اور قابل دید سماں ہوتا تھا اور عید میں تو عجیب سماں ہوتا تھا۔ مولانا کی خواہش تھی کہ وہ عید کی نماز کا منظر بھی دیکھتے۔ قسطنطنیہ سے ان کا ارادہ طرابلس اور دمشق کی سیر کر کے قاہرہ جانے اور چند

روز وہاں قیام کا ارادہ تھا۔

مولانا کو وہاں کے مسلمانوں کی ترقی اور قوت کے متعلق بڑی مایوسی ہوئی، اس لیے کہ حالت اچھی نہ تھی۔ جب آزاد مسلمان ملک کا یہ حال تھا تو غلام ہندوستان اپنے جذبہ، اسلام کی وجہ سے پھر غنیمت تھا۔ پھر بھی اس سفر سے ان کو اتنا فائدہ پہنچا اور ایسا تجربہ ہوا جس کو وہ ہزاروں کتابوں کے مطالعہ سے بہتر سمجھتے تھے کیوں کہ جب تک انسان دوسرے ملک کے حالات نہ دیکھے اور ان کے خیالات معلوم نہ کرے، اس کے خیالات محدود رہتے ہیں۔ مولانا وہاں بھی کالج کے حالات سے بے خبر نہ رہنا چاہتے تھے۔ لہٰذا علی گڑھ گزٹ اپنے نام جاری کرنے کو لکھا۔ کالج کے طلبا کے نتیجہ و امتحان کی بھی فکر رہی۔ خط کے جواب کے ساتھ اس کی تفصیل معلوم کی۔ اسی زمانے میں مولانا کے بھائی مولوی اسحٰق بی۔ اے، ال۔ ال۔ بی کا نام منصفی کے امیدواروں میں درج ہونے والا تھا۔ اس کے متعلق بھی فکر مند رہے اور ان کے متعلق دریافت کیا (۱۵)۔

مولانا کو باوجود تلاش بسیار کے قلمی کتابیں نہ ملیں۔ مصر کے متعلق ان کو معلوم ہوا کہ وہاں کبھی کوئی قلمی کتاب مل جاتی تھی، البتہ مطبوعہ کتابیں خاصی ملتی تھیں۔ امام غزالی کی تمام کتابیں رسالے اور مکاتبات موجود تھے۔ بوعلی سینا کی جتنی بھی تصنیفات قسطنطنیہ میں تھی اتنی مولانا نے اکٹھی کہیں نہ دیکھی تھیں۔ ارسطو وغیرہ کی کتابوں کے اصل ترجمے قدیم خط میں موجود تھے۔ عبدالقاہر جرجانی کی تفسیر موجود تھی، مگر اس میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ کتابت کی شرح چار روپے فی جز ہونے کی وجہ سے نقل کرانے میں بڑی دشواری تھی۔ اس سستے زمانے میں یہ گراں رقم تھی۔

مولانا ہندوستان ہی سے شیر پلونا غازی عثمان پاشا مجاہد کے کارناموں سے بخوبی واقف تھے ان کی بڑی خواہش تھی کہ وہ اس مجاہد کا دیدار کریں۔ اس کا موقع بھی مل گیا۔ چناں ۱۳۔ جون کو مولانا کی آرزو پوری ہوئی۔ مولانا نے اس مجاہد کے ان ہاتھوں کو بوسہ دینا چاہا، جنھوں نے روس کی گراں فوج کو شکست فاش دی تھیں (۱۶)، مگر پاشا اس پر راضی نہ ہوئے اور الٹا مولانا کے ہاتھوں کا بوسہ لینا چاہا، کیوں کہ مولانا ان ہاتھوں سے علمی جہاد کر رہے تھے۔ دونوں میں عربی میں گفتگو ہوئی۔ پاشا تھوڑی بہت عربی بول لیتے تھے۔ چلتے وقت مولانا کو اجازت دی کہ وہ جب چاہیں ان کے وہاں ملاقات کو جا سکتے ہیں۔ اسی طرح وہاں کے بڑے بڑے لوگوں سے ملاقات ہو سکتی تھی۔ مگر اور کسی سے ملنے کی تمنا نہ تھی۔ دوسرے زبان کی اجنبیت مانع ہوتی تھی۔

مولانا کو ترکی کا ٹائپ بہت پسند آیا۔ جو نوک پلک انھوں نے اس ٹائپ میں دیکھی وہ بیروت اور ہالینڈ کے ٹائپ میں نہ تھی۔ مولانا چاہتے تھے کہ علی گڑھ گزٹ کے لیے خرید لیا جاتا تو بہتر تھا۔ عربی تعلیم وہاں محدود تھی اور جدید تعلیم بڑی وسعت کے ساتھ تھی، مگر دونوں طرح کی تعلیم الگ الگ دی جاتی تھی۔ مولانا کا خیال تھا کہ دونوں طرح کی تعلیم کو ملانے کی ضرورت تھی، جب ہی اصلی ترقی ممکن تھی۔ قدیم تعلیم کی معرفت دین سے واقفیت اپنے علوم کی قدر سے ایمان میں استحکام حاصل ہوتا تھا اور جدید تعلیم کے ذریعے نئے علوم وفنون سے واقفیت حاصل ہوتی تھی اور بے دینی کے جدید رجحانات کا پتہ چلتا تھا۔ قدیم تعلیم کی مدد سے جدید رجحانات کا رد سوچنے میں مدد ملتی تھی اور ایک نئے علم کلام کی بنیاد پڑتی تھی۔ اس لیے دونوں کو الگ کرنا گویا ادھوری تعلیم اور محدود واقفیت کا ہونا تھا۔ یہی خرابی مولانا ہندوستان کے متعلق بھی محسوس کرتے تھے۔ تعلیم کے بارے میں مولانا نے اپنے خیالات کا اظہار پہلے پہل ترکی ہی سے کیا اس کے بعد یہ خیال پختہ ہو گیا۔ اور بعد میں ۱۸۹۴ء میں کانپور میں ندوۃ العلماء کے پہلے جلسے میں بڑی قوت کے ساتھ اس خیال کو پیش کیا۔

مولانا کا ارادہ ترکی میں ۱۵۔ اگست تک رہنے کا تھا، لہٰذا وہ چاہتے تھے کہ اگر ان کی تصنیفات تیار ہو جائیں تو چند نسخے قسطنطنیہ بھیج دیے جائیں۔ لیکن دیر کی صورت میں بھیجنے کی ضرورت نہ تھی۔ مولانا نے کالج کا نتیجہ اکمل الاخبار میں پڑھ لیا تھا، اس لیے اطمینان ہو گیا تھا، بلکہ اچھا نتیجہ دیکھ کر بہت خوش تھے۔ مولانا نے یہ بھی چاہا کہ اگر سرسید کو وہاں کی کوئی چیز مطلوب ہو تو لکھیں تاکہ مولانا اپنے ہمراہ لیتے آئیں۔ ویسے مولانا کالج کے لیے ترکی زبان کی عمدہ کتابیں خریدنا چاہتے تھے اور ان کے لیے روپے بہت جلد طلب کیے تھے کیوں کہ وہاں زیادہ قیام کا ارادہ نہ تھا (۱۷)۔

جنگ روس و روم کے زمانے میں مولانا نے ترکی سفیر مقیم بمبئی کے ذریعے چندہ جمع کر کے بھیجا تھا، اس لیے مولانا ان سے بھی پندرہ جون کو ملے۔ وہ وہاں پولیس کے بڑے افسر تھے۔ بڑی مہربانی سے ملے اور اردو میں بات چیت کی۔ مولانا نے سرسید سے خواہش کی کہ وہ سیرۃ النعمان کا ایک نسخہ جس پر کالج کی مہر نہ ہو بھیج دیں کیوں کہ وہ علمی مذاق رکھنے والے تھے۔

مولانا چوں کہ سابق سفیر ترکی حسین حبیب آفندی کے اخلاق سے بہت متاثر تھے اس لیے چاہتے تھے کہ کوئی اور تحفہ بھی ان کی خدمت میں پیش کریں، لہٰذا اپنے والد سے نظام آباد ضلع اعظم

گڑھ کے مٹی کے برتن جو نہایت اعلیٰ بنتے تھے اور تحفہ میں پیش کیے جاسکتے تھے، ان کو کسی رئیس کے ذریعہ فرمائشی بنوا کر بھیجنے کے لیے لکھا۔ کسی دشواری کی صورت میں لکھنوی چکن کا ایک تھان نہایت عمدہ فردی بوٹیوں والا خواجہ عزیز الدین عزیز (۱۸) کے ذریعے خرید کر بھیجنے کو لکھا اور اگر اس میں بھی دشواری ہو تو مراد آباد کا کوئی نہایت عمدہ برتن منگوایا تاکہ کوئی نادر اور یادگار چیز پیش کر سکیں (۱۹)۔

۱۹۔ جون (۲۰) کو ترکی میں جمعہ کا دن تھا۔ مولانا جمعہ کو موکب سلطانی کا نظارہ کرنے کے لیے بے چین تھے کیوں کہ آزاد مسلمان ملک میں خلافت کے دور میں نماز کا لطف خلیفہ کی شرکت سے دو بالا ہو جاتا تھا۔ ہندوستان میں یہ چیزیں مولانا کے خواب و خیال میں بھی نہ آسکتی تھیں۔ چناں چہ مولانا اس نظارے کے لیے ہمہ تن گوش بن کر گئے اور جامعہ حمیدیہ میں داخل ہوئے۔ خلیفہ بڑی شان و شوکت سے آئے، مگر مولانا دیکھ نہ سکے کیوں کہ یہ سیر صرف ان لوگوں کو نصیب ہو سکتی تھی جو گزرگاہِ سلطانی پر پہلے سے موجود ہوتے تھے اور پھر نماز کے ختم ہونے تک وہاں موجود رہتے تھے۔ یہ جامع مسجد محل سلطانی سے تھوڑے فاصلے پر تھی۔ اسی راہ میں ایک مکان تھا جس کی چھت پر دور دور ملکوں کے معزز سیاح اور عہدیدار کسی معزز شخص کے ذریعے اجازت حاصل کر کے موکب ہمایونی کی سیر کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہ تھی کیوں کہ خلیفہ کی تشریف آوری کے وقت فوج کا حلقہ ہو جاتا تھا اور کوئی شخص اس حلقے میں داخل نہ ہو سکتا تھا۔ حسین حبیب آفندی (سابق سفیر بمبئی) نے مولانا سے اجازت دلانے کا وعدہ کیا تھا، مگر ان سے وقت پر ملاقات نہ ہو سکی، لہٰذا مولانا مسجد میں داخل ہو کر پہلی صف میں بیٹھ گئے۔ سلطان کی گاڑی زینے تک آئی اور وہ اتر کر مسجد کے بالائی حصہ میں تشریف لے گئے اور اس مقصورہ میں بیٹھے جس کا دروازہ منبر کے بائیں طرف تھا۔ خلیفہ اسی میں نماز ادا کرتے تھے۔ جب خطیب نے اپنے خطبہ میں **اللھم انصر هذا السلطان السلطان ابن السلطان الحاقان ابن الحاقان السلطان عبدالحمید خان** کہا تو مولانا کی عجیب حالت ہو گئی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ گویا مولانا کی آنکھوں کے سامنے ماضی کا نقشہ گھوم گیا۔ جب خطیب نے سلطان کا نام لیا تو منبر پر ایک زینہ نیچے اتر آیا۔ مولانا نے اس کی توجیہ یہ کی کہ اگرچہ سلطان ظل اللہ تھے، مگر ان کا رتبہ حضرت صدیق اکبرؓ اور عمر فاروق اعظمؓ سے کم تھا۔ ایک زینہ نیچے اترنا اسی کا اظہار تھا نماز کے بعد حسین حبیب آفندی نے مولانا کو دیکھ لیا اور مساجد کے صحن میں جہاں پاشا اور

سرداران فوج حلقہ باندھے کھڑے تھے ان کو لے جا کر کھڑا کر دیا۔ سلطان مقصورہ سے اتر کر زینے کے قریب بیٹھے اور فوجیں سامنے سے گزرنا شروع ہوئیں۔ دو گھنٹے تک برابر فوج گزرتی رہی۔ مختلف رسالے اور ہر رسالے کے ساز و اسلحہ جدا جدا تھے۔ ترکی جوانوں کی باقاعدہ رفتار، چمکتے ہوئے اسلحہ، گھوڑوں کی شان و شوکت، پاشاؤں کا زر کا لباس اور جگمگاتے ہوئے تمغوں نے مولانا کو بہت متاثر کیا۔ آخر میں دونوں شہزادے گزرے۔ ان کی سواری کا ڈھنگ کسی بڑے جری اور شجاع سے کم نہ تھا۔ شہزادوں کے بعد سلطان سوار ہو کر سامنے سے گزرے۔ لوگوں نے سلام کیا۔ سلطان نے دونوں ہاتھوں سے جواب دیا۔ اگرچہ یہ سیر ہر ہفتہ ہوتی تھی مگر یورپ کے اکثر معزز حضرات بھی اس سیر کو دیکھنے کے لیے آتے تھے۔ مولانا پر اس سیر کی عجیب کیفیت رہی۔ گویا ایک نشہ چڑھا تھا جس کا سرور دیر تک رہا۔ مولانا کو پتہ چلا کہ عید کے دن تو یہ سیر عجیب تر ہوتی ہے۔ لہٰذا ان کو آرزو ہوئی کہ عید میں بھی یہ تماشا دیکھتے اور اس آرزو کی تکمیل کا امکان بھی تھا، کیوں کہ جولائی میں عید الاضحیٰ تھی۔

یہ پر لطف سیر دیکھ کر مولانا کے شاعرانہ جذبات کو تحریک ہوئی۔ انھوں نے ایک مثنوی لکھنا شروع کی۔ ستائیس اشعار لکھ چکے تھے تو خیال آیا کہ عید کے اجتماع سے بھی لطف اندوز ہو لیں، تو اس مثنوی کو مکمل کریں۔ مثنوی لکھنے کا سبب خود مولانا کے الفاظ میں بڑا دلچسپ ہے، اس لیے یہاں نقل کرنا لطف سے خالی نہ ہو گا۔ لکھتے ہیں:

> "یہ تماشا دیکھ کر قیام گاہ پر واپس آیا تو دل جوش اور اثر سے معمور تھا۔ شاعرانہ جذبات کی تحریک سے خود بخود جستہ جستہ مصرعے زبان پر آتے جاتے تھے۔ قلم اور کاغذ لے کر بیٹھا اور کچھ اشعار قلم بند کیے۔ پھر خیال آیا کہ عید کے دن اس سے بھی بڑھ کر سامان ہو گا، اس کو دیکھ لوں تو لکھوں۔ چناں چہ تمہید کے جس قدر اشعار اس وقت موزوں ہو گئے تھے لکھ کر چھوڑ دیے (۲۱)۔"

مثنوی کا پہلا شعر یہ ہے:

قاصد فرخندہ من باں تعال — متعک اللہ بحسن المال (۲۲)

پر اثر اور پر جوش نظارے کا لطف اٹھانا ہو تو یہ اشعار اس کی عکاسی کا حق ادا کرتے ہیں:

وینکہ ہر سید کہ زاں جلوہ گاہ — تا چہ بود حاصل چشم و نگاہ

ہی چہ تواں گفت کہ ذوق سخن — ہر نفسم مے برد از خویشتن

گرچہ نخواہم کہ نشینم خموش — فرصت آں کو کہ بیایم بہوش

گرچہ بعرض سخن آمادہ ام — مست ز کیفیت ایں بادہ ام
بگزر ازیں حرف و مکرر مپرس — خواب خوشی دیدم و دیگر مپرس
خوان سخن گر نہ خود آراستم — عذر بہ محو تماشا ستم
تندیے بود فرابم ہنوز — دیدہء من بازو بخوابم ہنوز
با توچہ گویم کو چہا دیدہ ام — شعبدہ ہا پیش نظر چیدہ ام

بزم چواز جلوہ زیبا پر است
دامن چشم زتماشا پر است (۲۳)

یہاں تک لکھ کر مولانا نے چھوڑ دیا تھا اور عید کا انتظار کر رہے تھے۔ مندرجہ بالا اشعار انھوں نے جون ۱۸۹۲ء میں کہے کیوں کہ ۱۹۔ جون کو جمعہ کی نماز کے بعد سیر کا لطف اٹھایا تھا۔

جولائی کے پہلے ہفتے میں عید الاضحیٰ پڑی۔ اس سیر کا لطف مولانا ہی کے قلم سے مناسب ہو گا۔ لکھتے ہیں:

"عید کے دن سلاملق (۲۴) نہ تھی اور اس وجہ سے فوج کی تعداد کم تھی، لیکن شان و شوکت، جاہ و جلال، جوش و اثر سلاملق سے کچھ بھی بڑھ کر تھا۔ قریباً ۸ بجے فوجوں کی آمد شروع ہوئی اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک تانتا بندھا رہا۔ اس کے بعد بہت سی خالی گاڑیاں آئیں۔ لوگوں کو تعجب تھا کہ اس سے کیا مقصود ہے۔ یکایک دور سے پیادہ صفیں نمودار ہوئیں۔ معلوم ہوا کہ تمام وزراء، پاشا، افسران فوج اور بڑے بڑے عہدیداران ملکی سلطان کے جلوس میں پیادہ پا آرہے ہیں۔ یہ صفیں سڑک کے دونوں جانب متصل آدھ میل تک تھیں اور ان کی وضع اور لباس سے عجیب شان و شوکت کا اظہار ہوتا تھا۔ شانوں پر زریں پھول، دامن اور آستینوں پر کلابتون کی تحریر، سینے مرصع اور طلائی تمغوں سے ڈھکے ہوئے، ان سب پر آفتاب کا عکس۔ تمام میدان جگمگا اٹھا۔ یہ صف جا چکی تو سلطان کا حال جہاں آرا نظر آیا۔ جناب ممدوح گھوڑے پر سوار تھے۔ لباس بالکل سادہ تھا۔ چند بڑے بڑے نامور فوجی افسر رکاب میں تھے۔ گھوڑا آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا تھا اور ہر قدم پر اس زور سے "بادشاہم چوق یشا" کا نعرہ بلند ہوتا تھا کہ تمام میدان گونج اٹھتا تھا (۲۵)۔

"اس کیفیت کا مولانا کے ذہن پر ایسا اثر ہوا کہ واپس آکر چھوڑی ہوئی مثنوی کو پورا کیا۔ مگر جو نقشہ مولانا کھینچنا چاہتے تھے اور جو رنگ بھرنا چاہتے تھے اس میں ان کے نزدیک انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ چناں چہ لکھتے ہیں:

"میں یہ سماں دیکھ کر واپس آیا۔ تو قلم دوات لے کر بیٹھا کہ جو کچھ خود دیکھا ہے دوسروں کو بھی دکھا سکوں، لیکن افسوس اور سخت افسوس ہے کہ قلم نے بالکل کوتاہی کی۔ جو تصویر میں نے کھینچی ہے وہ بالکل نامکمل تصویر ہے (۲۶)۔"

تصویر اس طرح شروع ہوتی ہے:

مہر چو از جیب افق سر کشید　　خاست ز ہر ناحیر گلبانگ عید (۲۷)

اور اس شعر پر نقاشی کو ختم کیا ہے:

سکہ اقبال بنام تو باد　　ہرچہ بگیتی ست بکام تو باد

اس طرح چھبیس اشعار کا مثنوی میں مزید اضافہ ہوا۔ مولانا کو ۱۴۔ محرم ۱۳۱۰ھ مطابق ۸۔ اگست ۱۸۹۲ء کو عثمان پاشا کے ذریعے ایک فرمان کے ساتھ تمغہ مجیدی درجہ چہارم عطا ہوا۔ اور وہ ۲۶۔ محرم ۱۳۱۰ھ (۲۸) یعنی ۲۰۔ اگست ۱۸۹۲ء کو قسطنطنیہ سے روانہ ہوئے۔ ۸۔ صفر کو جشن تخت نشینی ہوتا تھا اور دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا، مگر ان کی طبیعت اچاٹ ہو گئی تھی، لہٰذا زیادہ نہ ٹھہر سکے۔ لیکن یہ افسوس رہا کہ پرلطف اور پرجوش تماشا نہ دیکھ سکے، کیوں کہ جہاز پر تھے اور آبادی سے کافی دور آچکے تھے۔ ۲۶۔ اگست کو جہاز بیروت پہنچا۔ اگرچہ یہاں ٹھہرنے کا ارادہ نہ تھا، مگر معلوم ہوا کہ شیخ طاہر مغربی یہاں آئے ہوئے تھے۔ چوں کہ ان کے فضل و کمال کی ان اطراف میں دھوم تھی اور ان کی تعریف قسطنطنیہ میں سن چکے تھے۔ اس لیے ان سے ملاقات کے شوق کی وجہ سے یہاں ٹھہر گئے اور ایک ہفتہ قیام کیا۔ یہاں کے علمی اور تمدنی حالت پر سفرنامہ (۲۹) میں تفصیل سے روشنی ڈالی۔ یہاں کی یونیورسٹی (الکلیہ السوریۃ العلمیہ) کے پروفیسر انطون نے اپنے ہفتہ وار اخبار البشیر میں مولانا کے متعلق اڈیٹوریل نوٹ میں یہ عبارت شائع کی تھی:

"اجتمعنا فی ہذہ الایام علیٰ حضرۃ العالم الشیخ شبلی النعمانی المعلم الاول للعلوم العربیۃ فی بلدۃ علی کرہ من بلاد الھند فراینا فیہ رجلا کثیر المعارف وھو جایز النشان المجیدی من الرتبہ الرابعہ امام فی الاستاذنہ العلیۃ مدۃ ۱۳ شھرو حضر الی بیروت و توجہ ہذہ النہار الی زیارۃ بیت المقدس ثم منھا الی مصر ثم الیٰ بلاد الھند۔ (۳۰)

مولانا نے عبد الباسط الانسی کے ذریعہ شیخ طاہر مغربی سے پہلی بار ملاقات کی۔ بعد کو تو پھر کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک مرتبہ وہ خود ملنے تشریف لائے۔ ان کے نئے خیالات سے واقفیت، قومی ہمدردی اور مسلمانوں کے تنزل سے باخبری کی بنا پر مولانا ان سے بہت متاثر ہوئے۔ یہاں کی مرطوب آب و ہوا کی وجہ سے مولانا کی طبیعت بدمزہ رہی، بلکہ ایک روز بخار بھی آگیا۔ مولانا نے عبد الباسط الانسی کے چچیرہ بھائی عبد الرحمان الانسی کا علاج کیا۔ انھوں نے نہ فیس لی اور نہ دوا کی قیمت۔ دوا سے ان کی طبیعت ٹھیک ہو گئی۔ بخار آجانے کی وجہ سے طرابلس کی سیر رہ گئی۔ ان کو بہت افسوس ہوا۔ ۸۔ صفر ۱۳۱۰ھ مطابق یکم ستمبر ۱۸۹۲ء کو بیروت سے روانہ ہوئے اور ۲۔ ستمبر کو یافہ پہنچے اور یہاں سے بیت المقدس گئے۔ بیت المقدس سے پھر یافہ آئے، جہاں سے جہاز پر سوار ہو کر تیسرے دن اسکندریہ پہنچے اور یہاں سے ریل گاڑی کے ذریعے قاہرہ گئے۔ جامع ازہر میں رواق الشامیین کے حجرے میں قیام کیا۔ یہاں زیادہ قیام کا ارادہ تھا، مگر یہاں کی گرمی سے پریشان ہو گئے، پھر بھی ایک ماہ سے زیادہ قیام کیا۔ مصر میں مولانا کو دار العلوم سب سے زیادہ پسند آیا۔ یہ مولانا کے عین خیال اور مرضی کے مطابق تھا۔ مولانا کے ذہن میں جو خاکہ تھا۔ اس کی مثالی صورت یہی دار العلوم تھا۔ مولانا اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

> مصر اور نہ صرف مصر بلکہ تمام ممالک اسلامیہ میں جو کالج مجھ کو سب سے زیادہ پسند آیا اور جس کو میں نے مسلمانوں کے درد کے لیے کافی سمجھا۔ وہ یہی کالج ہے اور میرا ہمیشہ سے یہ خیال ہے اور میں نہایت مضبوطی سے اس پر قائم ہوں کہ مسلمان مغربی علوم میں گو ترقی کے کسی رتبہ تک پہنچ جائیں لیکن جب تک ان میں مشرقی تعلیم کا اثر نہ ہو ان کی ترقی مسلمانوں کی ترقی نہیں کہی جا سکتی۔ بے شبہ مشرقی تعلیم کی جو موجودہ اسکیم ہے، وہ نہایت ابتر اور غیر ضروری ہے، لیکن اسی تعلیم میں ایسی چیزیں بھی ہیں جو مسلمانوں کی قومیت کی روح ہیں اور جس تعلیم میں اس روحانیت کا مطلق اثر نہ ہو، وہ مسلمانوں کے مذہب، قومیت، تاریخ کسی چیز کو بھی زندہ نہیں رکھ سکتی۔
>
> جس مصیبت کا ہندوستان میں رونا ہے، وہی قسطنطنیہ، بیروت اور مصر میں بھی موجود ہے۔ یعنی نئی تعلیم میں قومیت اور مذہبی پابندی کا اثر کم ہے اور پرانی تعلیم اس قابل نہیں کہ دنیا کی موجودہ ضرورتوں کا ساتھ دے سکے۔ صرف ایک یہ دار العلوم ہے جو دونوں ڈانڈوں کو ملانا چاہتا ہے۔" (۳۱)

تعلیم کا سلسلہ میں اپنے اسی نظریے (۳۲) کو مولانا نے دار العلوم ندوۃ العلما کے سالانہ جلسوں میں اکثر دہرایا ہے اور اپنی نظامت (دار العلوم) کے زمانے میں تو اس پر سختی سے عمل کرنا

چاہا، مگر مخالفین کی وجہ سے اس میں کامیابی نہیں ہوئی اور آخر مولانا کو استعفیٰ دینا پڑا۔ اس دار العلوم کے ایک طالب علم احمد قوصی نے مولانا کی شان میں عربی کے تین اشعار فی البدیہ کہے، جو یہ ہیں:

محمدٌ انت شبلی المعالی لقد فقت الوریٰ وعلوت قدرا
وقد اولیتنا اشرفا و فضلا بتشریف زیارۃ ارض مصرا
فلا زلنا نراک بکل انس تزید تفضلا ونزید شکرا

شان و شوکت، ترتیب و خوش اسلوبی، زیب و زینت، حسن انتظام اور عمارت کی خوبی کے لحاظ سے مولانا کو کتب خانہ خدیویہ بہت پسند آیا اور انھوں نے اس کو قسطنطنیہ کے کتب خانوں پر ترجیح دی۔ مولانا نے مصر میں جن لوگوں سے ملاقات کی ان میں شیخ محمد عبدہ تھے۔ یہ سعید جمال الدین افغانی کے صحبت یافتہ تھے۔ ان سے مولانا متاثر ہوئے اور ان کو اپنا ہم خیال پایا، کیوں کہ وہ جامع ازہر کی ابتری تعلیم سے افسردہ اور نئی تعلیم کے شاکی تھے۔ گویا وہ بھی تعلیم کی ترقی کے خواہاں اور قدیم و جدید تعلیم کو مربوط دیکھنا چاہتے تھے۔

اب چھ ماہ کی چھٹی ختم ہو رہی تھی، لہذا مولانا تجربات اور معلومات لیے ہوئے ہندوستان واپس ہوئے۔ مولانا کے سفر کے مقاصد میں ایک مقصد صحت کی بحال بھی تھا۔ واپسی پر دیکھا گیا ہے کہ مراجعت کے بعد وہ خوب تندرست تھے۔ ایسی تندرستی پھر کبھی ان کو نصیب نہیں ہوئی (۳۳)۔

مولانا آخر اکتوبر ۱۸۹۲ء (۳۴) میں علی گڑھ واپس آگئے تھے۔ علی گڑھ پہنچتے ہی ان کو منجھلے بھائی کی علالت کی اطلاع ہوئی، جس سے بڑے متفکر ہوئے۔ وہ منتظر تھے کہ مولوی اسحٰق ان سے ملنے آئیں گے، مگر بعض مجبوریوں کی بنا پر وہ نہ پہنچ سکے اور ارادہ کیا کہ دسمبر میں آئیں، تاکہ کانفرنس جو دہلی میں ہونے والی تھی اس میں شرکت بھی کر سکیں اور مولانا کا سفر سے واپسی کے بعد وطن کا ارادہ ہو گا۔ دوسرے اب کی کانفرنس بھی پھیکی ہونے کا امکان تھا، کیوں کہ مولانا حالی شرکت نہیں کر رہے اور ڈپٹی نذیر احمد کے تقریر نہ کرنے کا امکان تھا۔ مولانا کے ہم وطن طلبا نے مولانا کی غیر موجودگی میں نہ کوئی عرضی بھیجی اور نہ فیس جس کی وجہ سے ان کے نام خارج کر دیے گئے۔ ان کے دوبارہ داخلہ اور فیس کی ادائیگی کی فکر رہی اور واپسی پر نئی چیزیں خرید کر سامان کی درستی میں لگے رہے۔ لوگوں نے سفرنامہ لکھنے کا تقاضا شروع کر دیا۔ مولانا طے نہیں کر پا رہے

تھے کہ لکھیں یا نہ لکھیں، اس کے مختلف وجوہ تھے۔ سب سے بڑھ کر تو یہی ہوگا کہ ترکی کے خلاف حکومت کے پروپیگنڈے کی تردید ہوتی اور مسلمانوں کی ترکوں سے محبت دوبالا ہونے کا امکان تھا، جو انگریزوں کی سیاسی مصلحت (۳۵) کے سراسر خلاف تھا اور یہ چیز ان کی حکومت کے لیے خطرہ بن سکتی تھی اور علی گڑھ کالج کے لیے اچھا شگون نہ ہوتا۔ مولانا جائیداد وغیرہ کی تقسیم سے ایسے دل برداشتہ تھے کہ وطن سے اب پہلا سا لگاؤ محسوس نہیں کر رہے تھے۔ مگر ایسے موقعہ پر یہ خواہش ضرور تھی کہ اگر اعظم گڑھ میں ہوتے اور احباب و اعزا اکٹھے ہوتے تو حالاتِ سفر اپنی زبان سے سناتے (۳۶)۔

چوں کہ ہندوستانی کالج کے ہندوستانی پروفیسر کا یہ پہلا سفر تھا اور وہ بھی علمی تحقیقات کی خاطر اسی لیے واپسی پر مولانا کی بڑی پذیرائی ہوئی اور اظہار مسرت کے لیے متعدد جلسے ہوئے۔ پہلا جلسہ ۱۲۔ نومبر ۱۸۹۲ء (۳۷) کی شام کو اسکول اسٹاف کی طرف سے ہوا، جس میں سرسید اور کالج کے پروفیسر شریک ہوئے۔ اس میں تمغہ مجیدی ملنے پر مبارک باد پیش کی گئی اور ان کی تحقیقات علمی سے جو کالج کو فائدہ پہنچنے والا تھا اس پر اظہار خوشی کیا گیا۔ چودھری خوشی محمد خاں ناظر جو اس زمانے میں کالج میں طالب علم تھے، انھوں نے اشعار میں مولانا کو خراج تحسین پیش کیا۔ لکھتے ہیں:

باز وقت گرمیٔ بزم سخن آید ہمی | بلبل گم گشتہ در صحن چمن آید ہمی
زینت ہر بزم و زیب انجمن آید ہمی | آں ادیب و شاعر و ہستورین آید ہمی (۳۸)
واپس آئے سیر روم و شام و مصر و زنگ سے | آشیاں بلبل کو لایا سیکڑوں فرسنگ سے
ہند سے جب روم کو بستر اٹھا کر چل دیے | تپ (۳۹) کی شدت تھی مگر کونین کھا کر چل دیے
پنجہ احباب سے دامن چھڑا کر چل دیے | ایک فقرے سے ہمیں ڈھارس بندھا کر چل دیے

ہرچہ بادا باد من کشتی در آب انداختم
خانہ بر موج سمندر چوں حباب انداختم

اس کے بعد ۲۔ دسمبر کو کالج اسٹاف کی طرف سے ایک جلسہ ہوا، جس میں مولانا نے ایک ترکیب بند پڑھا۔ پہلے بند کے شروع کے اشعار یہ ہیں:

قاصد خوش خبر امروز نواساز آمد | کز سفر باز سفر کردہ ما باز آمد
از سفر شبلی آزادہ کالج ہر سید | یا مگر بلبل شیراز بہ شیراز آمد

دوستاں مژدہ کہ آں بلبل خوش لہجہ دگر — اندریں تازہ چمن زمزمہ پرداز آمد
رفت ہرچند بسی بے سرو ساماں! اما — شکر ایزد کہ بایں برگ و بایں ساز آمد
نقد کار آگہی و تجرب آورد بکف — رفت بی مایہ و گنجینہ صد راز آمد
ہر کجا بود زہر گوشہ تمتع برداشت — ہر کجا رفت بہر طائفہ دم ساز آمد

اسی بند کے آخر میں فرماتے ہیں:

دلش از ذوق سفر گرچہ نیا سوز دلے — یاد یاران وطن حوصلہ پرواز آمد
جذبہ شوق وی رخصت آرام بداد — لاجرم رو بوطن کردو عناں تاز آمد
روز لیش گشت کہ امشب زندیماں شماست — وین شرف مایہء صد نازش و اعزاز آمد

بزم کایں جلوہ دریں فرہ و آئین دارد
شکر ایزد کہ ہماں رونق پیشیں دارد

دوسرے بند کے شروع کے اشعار یہ ہیں:

کالج امروز بآں فرہ و شان ست کہ بود — بزم را گرمی ہنگامہ ہمان ست کہ بود
ہمچناں تشنہ لباں ازنم او سیراب اند — جوی ایں فیض بدانگونہ روان ست کہ بود
ہمچناں ایں چمن تارہ علی الرغم عدو — ایمن از غار ایام خزان ست کہ بود

دوسرے بند کے آخر میں فرماتے ہیں:

ہر یکے ازبک و ماریسن و ارنالڈ و ہورسٹ (۴۰) — ہمچناں مدرسہ را روح و روان ست کہ بود
واں دیگر دیدہ وراں راکہ باسکول در اند — ہمچناں سعی و طلب از نہ جان ست کہ بود
شبلی غمزدہ آں جرعہ کش طرف بساط — ہم بآں طرز نوی زمزمہ خوان ست کہ بود
جملہ زیں پیش کہ گفتم بہ تنزل گفتم — ورنہ ہر شیوہ بسی بہتر ازاں ست کہ بود
بزم و ایں گرمی ہنگامہ نیز زد بشگفت — ساقی بزم ہماں پیر مغاں ست کہ بود
تاجہاں ماند وریں گنبد مینا ماند — یارب ایں ساقی وایں بزم دل آرا ماند (۴۱)

اسی زمانے میں منشی شرف الدین رام پوری نے سرگزشت بو علی (بو علی سینا) بھیجی - یہ مولانا کے پسند کی چیز تھی، لہٰذا انھوں نے خوشی کا اظہار کیا۔ مولانا کی عرصے کی خواہش پوری ہوئی، اگرچہ اس خواہش کی اطلاع شرف الدین کو نہ تھی - ان کا عرصے سے یہ خیال تھا کہ مشاہیر کی بڑی بڑی سوانح عمریاں نہ سہی مختصر حالات میں چھوٹے چھوٹے رسالے ہی اگر شائع کیے جائیں تو ان سے

بڑا فائدہ پہنچے۔ چناں چہ اس قسم کا ایک سلسلہ، تصنیف مولانا ترکی کے سفر میں دیکھ بھی آئے تھے، جس کا نام مشاہیر رجال تھا۔ اس چیز نے مولانا کے خیال کو اور پختہ کر دیا کہ ہندوستان میں بھی اس قسم کا ایک سلسلہ قائم ہونا چاہیے۔ لہذا مولانا نے اس خیال کو عملی جامہ پہنچانے کے لیے بعض احباب سے خط و کتابت بھی کی اور شرف الدین کی تصنیف کو اس سلسلے کی ایک کڑی قرار دیا جس کے شائع ہونے کی ان کو امید تھی۔ اس رسالے کے طرز ادا میں دلچسپی اور زبان کی عمدگی کی بھی تعریف کی۔

مولانا نے اس سلسلے میں اپنے ذہن میں چند قواعد مرتب کر لیے تھے، جن کی اطلاع دینا ضروری خیال کیا۔ وہ قواعد یہ تھے کہ مؤلف کو چاہیے کہ وہ شروع کتاب میں بتائے کہ اس کی تالیف کے ماخذ کیا ہیں۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو کسی ایک کتاب سے حالات لے کر سوانح تیار کی جا سکتی ہے اور تصنیف کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے اور قارئین کو یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ کون سا واقعہ صحیح ہے اور کون سا غلط اور وہ لوگ جو روایتوں کو اصل ماخذ سے تصدیق کر کے صحیح یا غلط کا فیصلہ کر سکتے ہیں ان کو بھی تطبیق میں دشواری ہوتی ہے اور اگر وہ اس کام کو انجام دیں تو پھر اس سے بہتر یہ ہے کہ اصل ماخذ ہی پڑھ لیں۔

مولانا نے اس طرف بھی توجہ دلائی کہ نامہ دانشوراں اور روضۃ الصفا میں سلطان محمود کا بو علی کے قتل کے درپے ہونا تعصب کی وجہ سے لکھا گیا تھا اور اس کو شرف الدین نے اور "حسن" (رسالہ) کے نامہ نگار نے (انھوں نے بھی اسی زمانے میں بو علی کی مفصل سوانح عمری لکھی تھی) بغیر کسی تحقیق کے واقعے کو سچ تسلیم کر لیا۔ یہ تحقیق کی غلطی تھی جس کا ازالہ ہونا چاہیے تھا۔ لہذا ضروری تھا کہ اس قسم کی تالیف میں دیباچہ میں تمام ماخذ کا اظہار کر دیا جاتا اور درمیان میں کسی تحقیق طلب واقعے کے بارے میں خاص کتاب کا حوالہ ہونا ضروری تھا۔ مولانا مزید مشورہ دینے کو بھی تیار تھے بشرطیکہ ان سے رجوع کیا جاتا۔ ہمت افزائی کے خیال سے شرف الدین کی اس کوشش کی بڑی تعریف کی (۴۲)۔

اسی سال حیدر آباد دکن کے مشہور علمی رسالے حسن میں مولانا نے اسلامی کتب خانوں کی تاریخ پر ایک مقالہ لکھا جس میں مسلمانوں کے کتب خانوں کی پوری تفصیل تھی۔ رسالے کے دستور کے مطابق مولانا کو اس مقالے پر ایک اشرفی دی گئی (۴۳)۔

سیرت النعمان کے دو حصے ہیں، دونوں حصوں کے اقتباسات نمونے کے طور پر پیش کیے

جاتے ہیں۔ پہلے حصہ کو مندرجہ ذیل اشعار سے شروع کرتے ہیں:

حمد و ستائش کہ بعنواں خوشست — نعت ہما گونہ ہمانساں خوشست
شیفتگا نیم و پیمبر پرست — سجدہ اگر نیست زمیں بوس ہست
تا نجودی پایہ نگہدار باش — دم ز شریعت زن و ہشیار باش
ہرچہ زبیش است و زکم بازداں — سجدہ و تعظیم زہم بازداں
در رہ الفت کہ بود پیچ پیچ — پا چونہی برتو نگیریم ہیچ (۴۴)
من کہ دریں دایرہ از دیریاز — پاے ز خلوت نہ نہادم فراز
باز برانم کہ دریں داوری — دل برم از خلق با فسونگری
فن سیر گرچہ بود دلپذیر — نیست در و خود ز روایت گزیر (۴۵)
مایہ تاگر از دگر آوردہ ام — قطرہ ربودئم گہر آوردہ ام
گرچہ مراشیوۂ فن ایں نبود — حرف بہ اردو زدن آئیں نبود
پیشتر از گرم طلب بودہ ام — بادیہ پیماے عرب بودہ ام
بزم چوآں فرہ وآں ساز داشت — ساغر من بادۂ شیراز داشت
لیک چوں آں مطرب و ساقی نماند — بوئے ازاں میکدہ باقی نماند
بزم بطرز دگر آراستم — خوشتر ازاں نیز کہ میخواستم
گرچہ سرو برگ سخن دیگر است — شمع ہمانست لگن دیگر است
باد گوارا بہ عزیزان تمام — بادۂ گلگوں بہ سفالینہ جام (۴۶)

اس کے بعد یہ عبارت ہے:

"ناموران اسلام جس کا ایک حصہ المامون چھپ کر شائع ہو چکا ہے، اول اول جب مجھ کو اس کا خیال پیدا ہوا، نہایت وسیع بنیاد پر ہوا۔ جس طرح میں نے خلافت و سلطنت کے مختلف خاندانوں سے نامور انتخاب کیے، ارادہ تھا کہ اسی طرح علوم و فنون کے جدا جدا خاندان قائم کیے جائیں اور جو لوگ ان خاص خاص فنون میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے ان کو اس سلسلے کا ہیرو قرار دیا جائے۔ مگر اتنا بڑا کام تنہا میرے بس کا نہ تھا۔ مجبوراً حیثیتِ حکومت کی قید لگا کر میں نے اس وسیع خیال کو بہت کچھ محدود کر دیا بلکہ سلسلۂ حکومت سے بھی بہت سے خاندان چھوڑ دیے، تاہم وہ خیال دل سے نہ گیا کہ فرصت ہو تو اہل کمال کا دربار بھی سجایا جائے کہ السیف والقلم توامان۔

المامون کے بعد میں نے الفاروق لکھنی شروع کی تھی اور ایک معتدبہ حصہ لکھ بھی لیا تھا لیکن بعض مجبوریوں سے چند روز کے لیے اس کی تالیف سے ہاتھ اٹھانا پڑا۔ اس پر کوتاہ بینوں نے عجیب عجیب بدگمانیاں کیں حالاں کہ بات اتنی تھی کہ بعض نادر کتابیں جو اس تصنیف کے لیے نہایت ضروری ہیں اور یورپ میں چھپ رہی ہیں ابھی تک پوری چھپ کر آ نہیں چکیں۔ اس زمانہ انتظار میں بیکار بیٹھنا تو مشکل تھا خیال ہوا کہ کسی اور نامور کی لائف شروع کروں، لیکن یہ دیکھ کر کہ الفاروق ناتمام ہے طبیعت رک جاتی تھی اور اس میدان میں قدم آگے نہ بڑھ سکتا تھا۔ ادھر یہ خلش چین نہ لینے دیتی تھی کہ علمی نام آوروں کے کارنامے دکھانے بھی ضرور ہیں، کیوں کہ اسلام میں تیغ و قلم کا ہمیشہ ساتھ رہا ہے۔

آخر یہ خیال غالب آیا اور چند روز کے لیے خاندان حکومت کو چھوڑ کر علمی سلسلے کی طرف توجہ کرنی پڑی۔ فقہ، حدیث، ادب، منطق، فلسفہ، ریاضی مختلف خاندان سامنے تھے۔ بعض وجہ سے فقہ کو ترجیح دی اور امام ابو حنیفہ کو، جو فقہ کے بانی ہیں، اس کا ہیرو قرار دیا۔ امام ابو حنیفہ کے اجتہادی مسائل تقریباً بارہ سو برس سے تمام ممالک اسلامی میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بڑی بڑی عظیم الشان اسلامی سلطنتوں میں انہی کے مسائل قانون سلطنت تھے اور آج بھی ہیں۔ اسلامی دنیا کا غالب حصہ انہی کے مسائل کا پیرو ہے۔ عربی، فارسی، ترکی بلکہ یورپ کی زبانوں میں ان کی متعدد سوانح عمریاں لکھی گئیں۔ ظلم تھا اگر ان کی لائف خود اردو میں نہ لکھی جاتی، جو بلحاظ غالب انھیں کے پیروؤں کی زبان ہے (۴۷)۔"

کتاب کے پہلے حصہ کے نمونے یہ ہیں:

"منصور نے ایک دوسرے دارالخلافہ کی تجویز کی اور بغداد کو انتخاب کیا۔ ۱۴۶ھ میں بغداد پہنچ کر امام ابو حنیفہ کے نام فرمان بھیجا کہ فوراً پائے تخت میں حاضر ہوں۔ وہ بنو امیہ کی تباہی کے بعد مکہ معظمہ سے چلے آئے تھے اور کوفہ میں مقیم تھے۔ منصور نے گو پہلے ہی ان کے قتل کا ارادہ کر لیا تھا تاہم بہانہ ڈھونڈتا تھا۔ دربار میں حاضر ہوئے تو ربیع نے، کہ صحابہ کا عہدہ رکھتا تھا، ان لفظوں سے ان کو دربار میں پیش کیا: "یہ دنیا میں آج سب سے بڑا عالم ہے۔" منصور نے پوچھا تم نے کس سے علم کی تحصیل کی؟ امام نے استادوں کے نام بتائے، جن کا سلسلہ، شاگردی بڑے بڑے صحابہ تک پہنچتا تھا۔ منصور نے ان کے لیے قضا کا عہدہ تجویز کیا۔ امام صاحب نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ "میں اس کی قابلیت نہیں رکھتا۔" منصور نے غصہ میں آکر کہا "تم جھوٹے ہو۔

امام صاحب نے کہا "اگر میں جھوٹا ہوں تو یہ دعویٰ ضرور سچا ہے کہ میں عہدہ قضا کے قابل نہیں، کیوں کہ جھوٹا شخص قاضی نہیں مقرر ہو سکتا۔"

"یہ تو ایک منطقی لطیفہ تھا لیکن در اصل وہ قضا کی ذمہ داریاں نہیں اٹھا سکتے تھے۔ انھوں نے منصور کے سامنے اپنی قابلیت کی جو وجہیں بیان کیں وہ بالکل بجا تھیں۔ یعنی یہ کہ "مجھ کو اپنی طبیعت پر اطمینان نہیں، میں عربی النسل نہیں ہوں اس لیے اہل عرب کو میری حکومت ناگوار ہو گی" درباریوں کی تعظیم کرنی پڑے گی اور یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی منصور نے نہ مانا اور قسم کھا کر کہا، تم کو قبول کرنا ہو گا۔ امام صاحب نے بھی قسم کھائی کہ ہرگز قبول نہ کروں گا۔ اس جرأت اور بے باکی پر تمام دربار حیرت زدہ تھا۔ ربیع نے غصہ میں آکر کہا: ابو حنیفہ، تم امیر المومنین کے مقابلہ میں قسم کھاتے ہو۔ امام صاحب نے فرمایا "ہاں، کیوں کہ امیر المومنین کو قسم کا کفارہ ادا کرنا میری نسبت زیادہ آسان ہے (۴۸)۔"

خطیب کی ایک اور روایت ہے کہ منصور نے زیادہ جبر کیا تو مجبوراً دار القضا میں جا کر بیٹھے۔ ایک مقدمہ پیش ہوا، جس میں قرضے کا دعویٰ تھا، لیکن ثبوت کے گواہ نہ تھے۔ مدعا علیہ کو سرے سے انکار تھا۔ امام صاحب نے حسب قاعدہ مدعا علیہ سے کہا تم قسم کھاؤ کہ مدعی کا تم پر کچھ دینا نہیں آتا وہ تیار ہو گیا۔ "واللہ" کا لفظ کہا تھا کہ امام صاحب نے گھبرا کر روک دیا اور آستین سے کچھ روپے نکال کر مدعی کے حوالے کیے کہ تم اپنا قرض لو، ایک مسلمان کو قسم کیوں کھلواتے ہو۔ عدالت سے آکر منصور سے کہہ دیا کہ مجھ سے کسی طرح یہ کام نہیں چل سکتا۔ اس پر حکم ہوا کہ قید خانے بھیجے جائیں، جس سے اس وقت چھوٹے کہ قید حیات سے چھوٹے۔ اس مدت میں منصور اکثر ان کو قید خانہ سے بلا لیتا اور علمی بحثیں کیا کرتا (۴۹)۔"

سیرۃ النعمان کے دوسرے حصہ میں اس طرح ہے:

"یہ امر تاریخوں سے ثابت ہے کہ امام صاحب کو تدوین فقہ کا خیال تقریباً ۱۲۰ھ میں پیدا ہوا، یعنی جب ان کے استاد حماد نے وفات پائی۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ اسلام کا تمدن نہایت وسعت پکڑ گیا تھا۔ عبادات اور معاملات کے متعلق اس کثرت سے واقعات پیدا ہو گئے تھے اور ہوتے جاتے تھے کہ ایک مرتبہ مجموعہ قانون کے بغیر کسی طرح کام نہیں چل سکتا تھا۔ نیز سلطنت کی وسعت اور دوسری قوموں کے میل جول سے تعلیم و تعلم نے اس قدر وسعت حاصل کر لی تھی کہ زبانی سند و روایت اس کا تحمل نہیں کر سکتی تھی۔ ایسے وقت میں قدرتی طور پر لوگوں کے دل میں خیال

آیا ہو گا ان جزئیات کو اصول کے ساتھ ترتیب دے کر ایک فن بنا دیا جائے۔

امام ابو حنیفہ کی طبیعت مجتہدانہ اور غیر معمولی طور پر مقننانہ واقع ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ تجارت کی وسعت اور ملکی تعلقات نے ان کو معاملات کی ضرورتوں سے خبردار کر دیا تھا۔ اطراف و بلاد سے ہر روز سیکڑوں ضروری افتا آتے تھے، ان سے ان کو اندازہ ہوتا تھا کہ ملک کو اس فن کی کس قدر حاجت ہے۔ قضاۃ اور حکام فصل قضایا میں جو غلطیاں کرتے تھے وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے۔ غرض یہ اسباب اور وجوہ تھے جنھوں نے ان کو اس فن کی تدوین و ترتیب پر آمادہ کیا۔ ممکن ہے کسی خاص واقعہ سے، جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، اس آمادگی کو اور تحریک ہوئی ہو جس کے ساتھ عملی کوشش کا ظہور ہوا (۱۰)۔"

حواشی:

۱۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ نمبر ۲۳۰

۲۔۔۔ مکاتیبِ شبلی، حصہ اول، صفحہ ۸۸، ۱۳۔جنوری ۱۸۹۲ء

۳۔۔۔ مکاتیبِ شبلی، حصہ اول، صفحہ ۹۰، یکم اپریل ۱۸۹۲ء

۴۔۔۔ مکاتیبِ شبلی، حصہ اول، صفحہ ۹۱، ۵۔اپریل ۱۸۹۲ء

۵۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۱۸۹

۶۔۔۔ مکاتیبِ شبلی، حصہ اول، صفحہ ۲۶-۲۷، ۱۱۔اپریل ۱۸۹۲ء

۷۔۔۔ مکاتیبِ شبلی، حصہ اول، صفحہ ۸۵۔ اس خط میں پہلے پہل خیال کا اظہار کیا ہے ورنہ یہ خیال بہت پہلے آچکا تھا۔ چناں چہ سفرنامہ کے صفحہ ۹ پر لکھتے ہیں: "جس زمانہ میں مجھ کو ہیروز آف اسلام کا خیال پیدا ہوا اسی وقت یہ خیال بھی آیا کہ ہمارے ملک میں جس قدر تاریخی سرمایہ موجود ہے وہ اس مقصد کے لیے کسی طرح کافی نہیں ہو سکتا۔ یہی خیال تھا جس نے اول اول اس سفر کی تحریک دل میں پیدا کی۔

۸۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۱۹۲ (سید سلیمان ندویؒ نے ۲۶۔اپریل ۱۸۹۲ء، مطابق ۲۶۔رمضان المبارک ۱۳۰۹ھ) لکھا ہے۔ تقویم کے حساب سے ۲۸۔رمضان المبارک ۱۳۰۹ھ ہوتا ہے۔ تقویم الایام از مولوی میر احمد علی مطبوعہ شمس المطابع مشین پریس نظام شاہی روڈ حیدرآباد دکن، بار اول ۱۳۵۲ف، صفحہ ۱۰۳

۹۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۱۹۲

۱۰۔۔۔ سفرنامہ، صفحہ ۲۵

۱۱۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۱۹۵ پر ۲۳۔مئی ہے۔ مکاتیبِ شبلی، حصہ اول، صفحہ ا پر ۲۲۔مئی ہے۔ سفرنامہ میں بھی ۲۳ مئی ہے۔

۱۲۔۔۔ حضرت خالد رومی حضرت شاہ غلام علی دہلوی سے بیعت تھے۔

۱۳.... سرائے میں قیام دو تین دن ہی رہا ہو گا، کیوں کہ ۲۵- مئی کو حجرہ کرایہ پر لینا خط میں لکھا ہے اور پتہ تختہ خان قریب خان محمود پاشا، قسطنطنیہ لکھا ہے۔

۱۴.... مکاتیب شبلی، حصہ اول، صفحہ ۱ تا ۳، ۲۵- مئی ۱۸۹۲ء

۱۵.... مکاتیب شبلی، حصہ اول، صفحہ ۱۱ تا ۱۳، ۵-جون ۱۸۹۲ء

۱۶.... اسی جنگ ۱۸۷۷ء کے لیے مولانا نے اعظم گڑھ سے چندہ جمع کر کے سفیر ترکی کو بمبئی بھیجا تھا۔

۱۷.... مکاتیب شبلی، حصہ اول، صفحہ ۳ تا ۵، ۱۵-جون ۱۸۹۲ء

۱۸.... مشہور فارسی شاعر اور کننگ کالج لکھنو کے پروفیسر اور مولانا کے دوست

۱۹.... مکاتیب شبلی، حصہ اول، صفحہ ۱۳- ۱۴، ۱۵-جون ۱۸۹۲ء

۲۰.... مکاتیب شبلی، حصہ اول، صفحہ ۱۴ تا ۱۶

۲۱.... سفرنامہ، روم، مصر و شام، مطبع معارف، اعظم گڑھ ۱۳۵۹ھ، صفحہ ۱۱۷

۲۲.... سفرنامہ، صفحہ ۱۱۹

۲۳.... سفرنامہ، صفحہ ۱۲۰

۲۴.... لفظی ترجمہ سلام کرنا ہے۔چوں کہ اس موقعہ پر فوج اور سرداران فوج سلطان کے سلام کو آتے ہیں، اس لیے اس کو سلاملق کی رسم کہتے ہیں۔

۲۵.... سفرنامہ، صفحہ ۱۱۸

۲۶.... سفرنامہ، صفحہ ۱۲۰

۲۷.... سفرنامہ، صفحہ ۱۲۲

۲۸.... سفرنامہ، صفحہ ۱۳۲ پر ۱۳۰۹ھ غلط چھپ گیا ہے۔

۲۹.... سفرنامہ، صفحہ ۱۷۴ تا ۱۹۷

۳۰.... سفرنامہ، صفحہ ۱۹۷

۳۱.... سفرنامہ، صفحہ ۱۸۶-۱۸۷

۳۲.... مولانا شبلی کا مجوزہ دارالعلوم، ماہنامہ ادب- علی گڑھ، اکتوبر و نومبر ۱۹۶۰ء

۳۳.... کشوف الشمسین، صفحہ نمبر ۱۵، نظامی پریس بدایوں

۳۴.... حیات شبلی، صفحہ ۲۱۶ پر شروع نومبر لکھا ہے جو غلط معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ مولانا نے مولوی اسحق کو ۲۲-اکتوبر کو خط لکھا ہے جس میں ہم وطن لڑکوں کی فیس نہ بھیجنے اور نام خارج ہونے کی اطلاع ہے اور اکثر چیزیں خریدنی یا درست کرنی پڑیں، جو علی گڑھ کو واپسی ہی پر ممکن تھا۔

۳۵.... مولانا کا ایک مخالف انگریز از راقم غیر مطبوعہ نمبر ۵

۳۶.... مکاتیب شبلی، حصہ اول، صفحہ ۲۷، ۲۸، ۲۲-اکتوبر ۱۸۹۲ء

۳۷.... حیات شبلی، صفحہ ۲۱۸

۳۸۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۲۱۸
۳۹۔۔۔ مولانا ملیریا میں مبتلا تھے معالج نے کونین کھلائی تھی جس کی وجہ سے کچھ اونچا سننے لگے تھے۔ اچھے ہوتے ہی سفر پر روانہ ہو گئے، اس کی طرف اشارہ ہے۔
۴۰۔۔۔ انگریز اساتذہ۔
۴۱۔۔۔ دیوان شبلی، صفحہ ۵۵
۴۲۔۔۔ مکاتیبِ شبلی، حصہ اول، صفحہ ۳۳۳ تا ۳۳۵، ۲۹۔ دسمبر ۱۸۹۲ء
۴۳۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۲۲۶
۴۴۔۔۔ سیرت النعمان مؤلفہ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی، بار دوم، مطبع مجتبائی، دہلی ۱۳۳۰ھ، صفحہ ۲
۴۵۔۔۔ سیرت النعمان، صفحہ ۲-۳
۴۶۔۔۔ دیباچہ سیرت النعمان، صفحہ ۳
۴۷۔۔۔
۴۸۔۔۔ سیرت النعمان صفحہ ۴-۵
۴۹۔۔۔ سیرت النعمان، صفحہ ۶۱-۶۲، حصہ اول
۵۰۔۔۔ سیرت النعمان، حصہ دوم، صفحہ ۱۹۵

۱۸۹۳ء

مولانا کے سفر کے سلسلے میں ان کے چھوٹے چچانے دو سو روپے بھیجے تھے جو ان کو زر مبادلہ کی وجہ سے ایک سو نوے سے کچھ زیادہ ملے تھے۔ مولانا نے واپس آکر یہ خیال کیا کہ وہ روپے واپس لینا گوارا نہ کریں گے، اس لیے دو سو روپے پورے کر کے مولوی محمد عمر کو بھیج دیے کہ دادا مرحوم کی یادگار میں چھوٹے چچا کے نام سے جمع کر لیں اور اپنے چچا کو شکریہ کا خط لکھا تاکہ ان کو اطلاع ہو جائے کہ وہ روپے کس مد میں دیے گئے، مگر اس چیز کو چچا نے پسند نہ کیا اور واپسی کا مطالبہ کیا اور مولوی اسحق نے اپنے چچا کی تائید کی۔ مولانا کو اس پر تعجب تھا کہ جو روپے کسی کو دے دیے گئے اس کا واپس لینا کیسا۔ یہ دوسری بات تھی کہ خود مولانا کو پسند نہ تھا، اس لیے اس کی سبیل یہ نکالی تھی کہ مولوی عمر کے پاس بھیج دیے۔ مولوی اسحق نے لکھا کہ بندول میں بھی ہوتا ہے، علی گڑھ کی دوسری بات ہے۔ مولانا کو اس پر افسوس تھا کہ چچی زندہ نہیں ورنہ بندول ہی میں حوصلے والوں کی کمی نہ تھی، یعنی وہ روپے ہرگز واپس نہ لینے دیتیں۔ چچا نے نیشنل اسکول میں پانچ سو روپے دینے کو کہے تھے اور سو (۱۰۰) دے بھی دیے تھے اور تقاضے پر باقی بھی دے دیتے۔ مولانا کا خیال تھا کہ چھوٹی چچی کو یہ بھی پست ہمتی پسند نہ ہوگی۔ مگر مولوی اسحق اور چچا نہیں مانتے تھے۔ بہرحال مولانا روپیوں کی ادائیگی کر کے سبکدوش ہو گئے۔ مولانا نے اس مسئلے میں مولوی سمیع کی رائے دریافت کی کہ وہ کیا کہتے ہیں (۱)۔

مولانا کا مجموعہ نظم فارسی مطبع میں چھپنے کے لیے بھیج دیا گیا اور اس کے جلد چھپنے کی امید تھی۔ اس کے چھپوانے کے محرک نواب سید علی حسن خاں تھے۔ مجموعے کی تیاری کے لیے اخبار کے پرانے فائلوں سے مدد لی گئی اور بعض حضرات سے دریافت کر کے اشعار جمع کیے گئے۔

منجھلے بھائی مہدی کی انگلستان سے واپسی پر مشن اسکول کے جلسے کے لیے ایک نظم کہی تھی اس کی ردیف آمدہ تھی مولانا کو اس کی تلاش تھی اور وہ اس کو مجموعے میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے مولوی سمیع سے بھی خواہش کی کہ ان کا کلام ان کے پاس جتنا محفوظ ہو اس کو جلد بھیج دیں تاکہ مجموعے میں شامل کر دیا جائے اور مجموعہ چھپ کر عید سے قبل مل جائے۔ اس زمانے میں سفرنامہ روم و مصر و شام لکھنے میں مصروف تھے (۲)۔

مولوی سمیع نے مولانا سے نارنگیوں کے متعلق دریافت کیا تھا کہ پسند ہیں یا نہیں۔ لہٰذا مولانا نے جواب دیا کہ ان کو نارنگیاں بہت پسند تھیں مگر تکلیف کے خیال سے کبھی ان کو تکلیف نہیں دی گئی۔ انناس کو پسند نہیں کرتے تھے، لہٰذا انناس کی بجے مزاحاً انا الناس لکھی جس کے معنی (میں انسان ہوں) اور یہ بھی لکھا کہ میں آدمی تو ہوں مگر انا الناس پسند نہیں کرتا۔

مولانا نے حامد (مولانا کے صاحبزادہ) اور جنید (چھوٹے بھائی) کے سیکنڈ کلاس پاس ہونے کی اطلاع دی اور یہ بھی کہ ضامن (مولوی سمیع کے بھائی) اور حمید (مولانا کے ماموں زاد بھائی) کی کامیابی کی بھی امید تھی۔ مجموعہ نظم فارسی چھپ کر (۳) ۱۱۔ اپریل ۱۸۹۳ء سے پہلے آگیا تھا، لہٰذا ۱۱۔ اپریل کو مولوی سمیع کو تحفے میں بھیجنے کی اطلاع دی۔ اس کا کاپی رائٹ نیشنل اسکول اعظم گڑھ کو دیا تھا، اس لیے اس کی معمولی قیمت تو چار آنے رکھی مگر اعظم گڑھ والوں کے لیے خصوصی قیمت عہ (ایک روپیہ) رکھی تھی تاکہ اسکول کی خدمت ہو سکے۔ اسی زمانے میں الفاروق لکھنے کا مصمم ارادہ کیا تھا، مگر ابھی وقت کا تعین نہیں کر پائے تھے۔ ابھی سفرنامہ مکمل نہیں ہوا تھا، مگر یہ سوچ رہے تھے کہ اس سے اگر ملک کو فائدہ پہنچے اور جیسی مانگ ہے اسی حساب سے اس کی جلدیں چھپوائی جائیں تو مناسب ہے ورنہ بلا ضروری روپیہ پھنس جانے کا امکان تھا۔ جون کی تعطیل میں وطن جانے کا ارادہ کر رہے تھے (۴)۔

الفاروق لکھنے کے سرسید اس لیے مخالف تھے کہ ان کو اندیشہ تھا کہ کالج کے ہمدردوں میں سنی اور شیعہ اختلاف کہیں نہ پیدا ہو جائے، جو قوم کے لیے نقصان دہ اور کالج کی اجتماعی قوت کو کمزور کرنے والا اور سرسید کی کوششوں کو ملیامیٹ کرنے والا ثابت ہو۔ مولانا نے کچھ حصہ لکھ لیا تھا اور اس کو مکمل کرنے کا ارادہ تھا۔ ادھر طبری کے مکمل شائع ہونے کا بھی انتظار تھا۔ اس وقفہ میں نیک نیتی پر مبنی مخالفت بھی چل رہی تھی۔ آخر طے یہ پایا کہ کالج کے روشن خیال شیعہ ہمدرد عماد الملک سید حسین بلگرامی کو حکم بنایا جائے اور ان کے فیصلے پر عمل کیا جائے۔ چناں چہ سرسید نے ان کو خط لکھا (۵) تو جواب میں انھوں نے لکھا "اسلام نے ایک فاروق پیدا کیا ہے اور حیف ہے کہ اس کی سوانح عمری بھی نہ لکھی جائے" (۶)۔

غیر منقسم ہندوستان میں یہ شہرہ تھا کہ مولانا الفاروق لکھیں گے اور ادھر بات طے ہونے میں دیر لگی اور طبری بھی مکمل نہ چھپی۔ اس دیر سے فائدہ اٹھا کر ایک صاحب نے ۱۸۹۳ء میں سیرۃ الفاروق شائع کر دی (۷)۔ سرسید کی مخالفت اتحاد اسلامی قائم رکھنے اور کالج کو فرقہ بندی

سے بچانے کے لیے تھی، اسی لیے وہ مولانا شبلی کو روک رہے تھے۔ مگر وہ یہ نہ برداشت کر سکتے تھے کہ اگر الفاروق لکھی جائے تو کوئی دوسرا لکھے۔ لہٰذا انھوں نے (۸) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۱۰۔ مارچ ۱۸۹۳ء میں لکھا: "اور جب ایسے شخص (۹) نے جو کیا، بحیثیت علم اور کیا بہ لحاظ عمدگی تالیف اور کیا بہ نظر طریقہ، ترتیب مضامین میں یادگار سلف ہے۔ الفاروق لکھنے کا ارادہ کیا تھا اور بہت کچھ امکان سامان بھی جمع کیا تھا۔ جس کا جمع کرنا نہ آسان کام ہے نہ ہر ایک شخص کا کام ہے اور ہنوز بہت کچھ جمع کرنا باقی ہے تو ہمارے دوست .... کو کچھ بلاشبہ مناسب نہ تھا کہ اسی مضمون پر کتاب لکھ ڈالتے، بلکہ اس رحمت کے منتظر رہتے جو خدا کو مولوی شبلی کے ہاتھ سے ملک کو پہنچانی تھی" اسی مضمون میں آگے لکھتے ہیں: .... یہ سمجھنا کہ .... کہ سیرۃ الفاروق تحریر کرنے سے مولوی شبلی بیدل ہو گئے ہیں، اب نہ وہ ہیروز آف اسلام لکھیں گے اور نہ الفاروق، محض غلط خیال ہے۔ اگر اہل ملک مولوی شبلی کی تصانیف کو سمجھتے ہوں تو وہ یقین کریں گے کہ اگر ایک ہی مضمون پر دس شخص بھی لکھیں تو مولوی شبلی کی تحریر نرالی ہوگی۔ بس ان کو کیا پروا ہے کہ اور کسی نے بھی کچھ لکھا ہے۔" آگے چل کر پھر لکھتے ہیں: "اور ہم دعا کرتے ہیں کہ خدا کرے مولوی شبلی الفاروق نہ لکھیں، ہم مولوی شبلی سے اصرار کر رہے ہیں کہ اپنا سفرنامہ ختم کرنے کے بعد الغزالی یعنی لائف امام غزالی کی لکھ دیں، جو نہایت دلچسپ اور بے حد مفید ہوگی۔ خدا ان کو توفیق دے کہ ہماری بات کو مانیں (۱۰)۔" یہاں پر دیکھنے والی چیز یہ ہے کہ سرسید نے اگر الفاروق لکھنے کی مخالفت کی تو اس کو ڈھکا چھپا نہ رکھا بلکہ علی الاعلان شائع کیا۔ یہ بڑی جرأت کی بات ہے، دوسرے یہ کہ وہ مولانا کی تحریروں کی بڑی قدر کرتے تھے اور بڑی فیاضی سے ان کی ہمت افزائی کرتے تھے۔

حواشی:

۱۔۔۔ مکاتیب شبلی، حصہ اول، صفحہ ۸۹-۹۰، ۴-فروری ۱۸۹۳ء ۲۔۔۔ مکاتیب شبلی، حصہ اول، صفحہ ۹۲، ۲۶-مارچ ۱۸۹۳ء ۳۔۔۔ مکاتیب، حصہ اول، صفحہ ۹۳ پر، ۱۱-اپریل ۱۸۹۲ء چھپ گیا ہے جو غلط ہے۔ ۱۱-اپریل ۱۸۹۳ء ہونا چاہیے کیوں کہ مکتوب ۲۶-مارچ ۱۸۹۳ء میں مجموعہ نظم فارسی کے چھپنے جانے کی اطلاع ہے۔ ۴۔۔۔ مکاتیب، حصہ اول، صفحہ ۹۲-۹۳، ۱۱-اپریل ۱۸۹۳ء ۵۔۔۔ مکتوبات سرسید، مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب، لاہور-۱۹۵۹ء، صفحہ ۳۲۱-۳۲۲ ۶۔۔۔ حیات شبلی، صفحہ ۲۳۱، بر حاشیہ ۷۔۔۔ حیات شبلی، صفحہ ۳۳۳ ۸۔۔۔ حیات شبلی، صفحہ ۲۲۳ ۹۔۔۔ مولانا شبلی مراد ہیں ۱۰۔۔۔ حیات شبلی، صفحہ ۲۳۲

۱۸۹۴ء

مولانا کو آزاد مسلم ملک ترکی سے ۱۸۷۷ء سے محبت تھی اور وہ بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچی کہ ۱۸۹۲ء میں اس کی زیارت بھی کر آئے۔ واپسی پر محبت عشق میں تبدیل ہو گئی۔ ہر وقت اسی کا چرچا، ہر موقعے پر اسی کا تذکرہ، اس پر مستزاد یہ کہ بعض حلقوں سے سفرنامہ لکھنے کی صرف خواہش ہی نہیں کی گئی بلکہ زور ڈالا جانے لگا۔ سرسید جو مولانا کی طبیعت سے پوری طرح واقف تھے، مانع ہوئے۔ وہ سفرنامہ لکھنے کے خلاف نہ تھے، بلکہ مولانا کے جوش کو ہوش میں رکھنے کے خواہاں تھے اور یہ مشکل نظر آرہا تھا۔ بہرحال مولانا کو اعتدال کی پابندیوں کے ساتھ لکھنے کی اجازت دی گئی اور انھوں نے ۱۸۹۳ء میں سفرنامہ لکھنا شروع کر دیا۔

واپسی پر مولانا نے حکومت سے تمغہ مجیدی کے استعمال کی اجازت مانگی، مگر انکار ہوا۔ اس سلسلے میں سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

> "مولانا نے ہندوستان پہنچ کر اس تمغے کو استعمال کرنا چاہا، لیکن گورنمنٹ انگریزی نے اپنے ۲- مئی ۱۸۸۶ء کے قانون کے مطابق اس کی اجازت نہیں دی" (۱)۔

دوسری چیز یہ ہوئی کہ مولانا نے واپس آکر ترکی کی ترقی کے حالات اور خوبیاں بیان کرنا شروع کیں۔ اس نے حکومت کے ترکوں کے خلاف پروپیگنڈے پر کاری ضرب لگائی اور ترکوں کے خلاف بے سروپا باتوں کے ابطال سے ہندوستانی مسلمانوں کے دلوں میں جذبہ محبت نہ سہی رغبت ضرور شروع ہو گئی تھی۔ اس کو انگریزوں نے عموماً اور کالج کے انگریز (۲) اساتذہ نے خصوصاً اچھی نظر سے نہ دیکھا۔ اس سلسلے میں سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

> "اس سلسلے میں ایک اور بات بھی ذکر کے قابل ہے کہ سفر سے واپسی کے بعد انگریز حکام میں یہ بدگمانی پھیلی تھی کہ مولوی شبلی صاحب اتحاد اسلامی کے مبلغ اور سلطان روم کے سفیر بن کر ہندوستان آئے ہیں"۔ (۳)

سرسید کی دور بین نگاہیں ان حالات کا مشاہدہ کر رہی تھیں اور گرد و پیش سے پوری طرح باخبر تھیں۔ راج پوتی خون کے جوش کو مصلحت بینی کے آزمائے ہوئے نسخے سے اعتدال پر رکھنے والا پھر آڑے آیا اور ایسی چال چلا کہ مولانا کو نعم البدل مل گیا۔ انگریزی سیاست کو وقتی اطمینان ہوا۔ کالج کی نیک نامی ہوئی اور سرسید کو بے حد مسرت کیوں کہ وہ مسلمانوں کو عموماً اور مولانا کو

خصوصاً سیاست سے الگ رکھنا چاہتے تھے اور مولانا کے لیے علمی مشاغل کے علاوہ اور کچھ پسند نہیں کرتے تھے، جب ہی علمی و عملی ہمت افزائی کیا کرتے تھے۔ چناں چہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"ڈپٹی سید زین الدین صاحب (علی گڑھ) کا (جو اس وقت کالج کے اونچے درجے کے طالب علم ہوں گے) یہ بیان ہے کہ سرسید نے ان ہی سے انگریزی میں ایک چٹھی لکھوا کر گورنمنٹ میں بھیجی کہ مولانا شبلی جیسے فاضل کی قدردانی ترکی گورنمنٹ تو اتنی کرے کہ تمغہ مجیدی عطا فرمائے اور انگریزی گورنمنٹ، بڑے افسوس کی بات ہے کہ اس فرض سے غافل رہے" (۴)۔

حکومت تو تھپکی دینے کا بہانہ ڈھونڈھ رہی تھی اس کو موقع ملا اور اس نے مولانا کو جنوری ۱۸۹۴ء میں شمس العلماء کا خطاب دے کر اس خطاب کی عزت بڑھائی۔ سرسید کے رفقا میں شمس العلماء (۵) کا خطاب پانے میں ان کا تیسرا نمبر (۶) تھا اور کالج کے پروفیسر کے لیے پہلا خطاب تھا۔ یہ سب سے کم عمر شمس العلماء تھے۔ کالج میں دو علمی مجلسیں اخوان الصفا اور لجنۃ الادب نام کی تھیں اور مولانا اس کے رکن تھے۔ لہٰذا ان دونوں کی طرف سے ۱۹۔ جنوری ۱۸۹۴ء کو ایک جلسہ ہوا جس میں کالج کے اساتذہ اور طلبہ کے علاوہ سرسید، سید محمود، نواب محسن الملک، مولانا حالی، نواب مزمل اللہ خان، مسٹر بک پرنسپل، پروفیسر آرنلڈ (سکریٹری اخوان الصفا) اور جسٹس کرامت حسین رکن اخوان الصفا و صدر لجنۃ الادب نے شرکت کی۔ متفقہ فیصلے کے مطابق محسن الملک نے جلسے کی صدارت کی۔ اپنی صدارتی تقریر میں انھوں نے کہا:

"جناب سرسید و سید محمود صاحب و حاضرین! جو خوشی اس وقت اس جلسے میں شریک ہونے اور اس صحبت کو دیکھنے سے ہوئی اس کا اظہار مشکل ہے، صاحبو! آپ جانتے ہیں کہ دوستوں کا جمع ہونا، احباب کا ملنا خود ایک ایسی دل خوش کن چیز ہے کہ اس سے بڑھ کر دوسری چیز اس دنیا میں خیال نہیں کی جاتی۔ پھر جب کہ وہ ایسے مقصود کے لیے ہو، جس کے واسطے ہم اس وقت جمع ہوئے ہیں یعنی اپنے ایک معزز دوست کے خطاب پانے اور جو اعزاز گورنمنٹ نے اسے بخشا ہے اس پر مبارک باد دینے کے لیے، تو اس خوشی کا اندازہ کرنا مشکل ہے" (۷)۔

آگے چل کر طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

عزیزو! مولانا شبلی صاحب صرف تمھارے ہی استاد نہیں ہیں، بلکہ درحقیقت مجھ پر بھی ان کو استادی کا حق ہے۔ اگر تم نے چند قاعدے صرف و نحو کے ان سے سیکھے، یا چند ابتدائی کتابیں ان سے پڑھی ہیں تو میں نے ان کی تصنیف و تالیف اور

تقریر و تحریر سے بڑے فائدے حاصل کیے ہیں - کوئی روز ایسا نہیں ہوتا کہ ان کی صحبت سے کسی نہ کسی قسم کا علمی فائدہ مجھے نہ ہوتا ہو یا ان کی باتوں سے کچھ نہ کچھ میری معلومات میں ترقی نہ ہوتی ہو - اس لیے اے میرے عزیز طالب علمو! نہ صرف بحیثیت ایک دوست ہونے کے بلکہ بحیثیت ایک طالب علم ہونے کے میں اس جلسے میں شریک ہوا ہوں اور میں مولانا شبلی صاحب کو اس معزز خطاب کے پانے پر جو گورنمنٹ نے ان کو دیا، مبارک باد دیتا ہوں" (۸)-

آگے چل کر فرماتے ہیں:

"وہ فی ذاتہ ہمیشہ سے علم کے آفتاب تھے اور گورنمنٹ ان کو خطاب دیتی یا نہ دیتی وہ سب کے نزدیک شمس العلماء تھے" (۹)-

محسن الملک کے یہ جملے تو مولانا کے لیے ہمیشہ سند رہیں گے، فرماتے ہیں:

"میرے نزدیک صرف وہ چند صفحے جو میرے معزز دوست نے جزیہ اور اسکندریہ کے کتب خانے پر لکھے ہیں، ایسے ہیں کہ اگر کوئی کام مسلمانوں کے فائدے کا انھوں نے نہ کیا ہوتا اور سوائے ان کے کوئی دوسری تحریر ان کی نہ ہوتی تو وہی چند صفحے ان کی فضیلت، لیاقت اور علم پر شاہد، اور مسلمانوں کے فخر اور عزت کے لیے کافی اور ان کے شمس العلماء ہونے کے شاہد تھے، حاجو ہماری قوم میں ہزاروں عالم گزرے اور اب بھی خدا کی مہربانی سے سیکڑوں موجود ہیں مگر ہم تو اس کے قائل ہیں، جو کچھ کر دکھائے اور اپنے علم و فضل سے مسلمانوں یا اسلام کو فائدہ پہنچادے-"

شاہد آں نیست کے موے و میانے دارد　　　بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد (۱۰)

محسن الملک کی تقریر کے بعد مولوی بہادر علی نے مولوی داؤد بھائی ممبر لجنۃ الادب و اخوان الصفا کا عربی قصیدہ عربی لہجے میں پڑھا- تیرہ اشعار کے قصیدے کا پہلا شعر یہ ہے:

حمد لمن جعل النجوم دراریا　　　والشمس نوراً للحنادس ماحیتا

اس کا شکر جس نے تاروں کو روشن اور سورج کو وہ روشنی بنایا جو تاریکیوں کو مٹا دیتی ہے-

مولانا کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

علامة مستنبط من آية القرآن　　　سراً خافياً و معانياً

علامہ ہے جو قرآن پاک کی آیت سے، چھپا ہوا بھید اور معنوں کا پتا لگاتا ہے-

حینا یحبّر فی العلوم رسائلا　　　حینا یشیّد للفنون مبانیا

کبھی وہ علوم کے رسالے نقش کرتا ہے، اور وہ کبھی فنون کی عمارتیں بلند کرتا ہے-

لله درّ مدرّس تدریسه سیلٌ اتیٰ و قد یغشی وادیا

ایسا اچھا مدرس ہے کہ اس کا درس ایک سیلاب ہے جو وادی میں چھا جاتا ہے۔

سحبانُ وقتٍ لایشّق غبارہٗ من کان للفرد الوحید مجاریا

اپنے وقت کا سحبان جس کی گرد تک کوئی نہیں پہنچ سکتا، کون فرد فرید کا مقابل ہو سکتا ہے۔

قسّ الفصاحۃ لاینُال مقامہ من کان للشمس المنیرۃ ثانیا

فصاحت میں قس (بن ساعدہ) ہے جس کے رتبے کو کوئی نہیں پہنچ سکتا، اس روشنی بخشنے والے آفتاب کا ثانی کون ہے۔

ان قال فی العربی شعرا فاق حسّاناً ونی العجمی فاق قانیا

اگر وہ عربی میں شعر کہے تو حسانؓ سے بڑھ جائے اور اگر فارسی میں کہے تو ------ سے آگے نکل جائے۔

قدیخلب الالباب سحر بیانہ اذما تصدّیٰ خاطبا اوشادیا

اس کے حسن و بیان کا جادو عقل کو لے لیتا ہے، جب وہ خطیب ہو کر یا شاعر ہو کر نغمہ سرا ہو۔

ھو خصرم الاخبار غیر مساجل یعطی الوری مرجانۃ لآلیا

وہ تاریخ کا اتھاہ سمندر ہے، جو لوگوں کے مرجان اور موتی دیتا ہے (۱۱)۔"

اس کے بعد نذیر احمد بی۔اے نے عربی میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

"تفخر اللجنتہ الادبیتہ بان اعظم ارکانھا بل بانیھا لقب بشمس العلماء وتھنئہ الان بھذا الاعزاز والاکرم۔

لجنتہ اللادب فخر کرتی ہے کہ اس کے سب سے بڑے رکن بلکہ بانی کو شمس العلماء کا لقب دیا گیا ہے، وہ ان کو ان کے اس اعزاز پر مبارک باد دیتی ہے۔

(۱۲)۔"

،نذیر احمد کے بعد ولایت اللہ متعلم بی۔اے نے ایک اردو نظم پڑھی جس کا پہلا شعر یہ ہے:

آج یہ کیوں نظر آتے ہیں خوشی کے ساماں در و دیوار سے آثار مسرت ہیں عیاں

- تمہید کے بعد شمس العلماء کے خطاب پانے کا ذکر بڑی خوبی سے کیا ہے، کہتے ہیں:

بہر تعظیم کھڑے ہو گئے حضار تمام ہو گیا پھر ہمہ تن گوش ہر اک پیر و جواں

سن کے کچھ پھول گئے مارے خوشی کے احباب — دل سے مت پوچھیے کچھ فرط مسرت کا بیاں
ہوئے شمس العلماء آج جناب شبلی — ہو گیا چار سو اس مژدہ کا فوراً اعلاں
فخر کرتا ہے بہت جن پہ علی گڑھ کالج — بلکہ یوں کہیے کہ ہے ہند بھی جن پر نازاں
مصر اور شام خجل ہیں عربی سن کے اگر — فلسفہ دیکھ کے شرمندہ ہو ملک یوناں
فارسی کی جو بھنک کان میں پڑ جائے کبھی — پھر کبھی نام نہ لے شرم سے اپنا ایراں
تم کو شمس العلماء کا یہ مبارک ہو خطاب — جب تلک شمس رہے اوج سما پر رخشاں
پس دعا ہے یہ ولایت کی ہمیشہ یا رب — یہ لقب پھولے پھلے آپ کے زیر داماں
سبز و شاداب یہ جب تک کہ رہے باغ علوم — شمس کی طرح رہیں آپ بھی سر پر تاباں (۱۳)"

اس کے بعد ممتاز حسین متعلم سیکنڈ ایئر (بانی ممتاز دار الیتامی، لکھنو) نے عربی میں تقریر کی۔ اس کے بعد مولانا حمید الدین فراہی (مولانا کے ماموں زاد بھائی اور شاگرد (جو اس زمانے میں کالج میں پڑھتے تھے) نے عربی قصیدہ پڑھا۔ مطلع یہ ہے:

یا خیر من یسموالی العلیاء — کالشمس بازغة بوسط سماء

اے ان سب میں بہتر جو بلندی کی طرف اونچے ہوتے ہیں آسمان کے وسط میں آفتاب کی طرح درخشاں ہو کر۔

دعا اور مبارک باد کے بعد کہتے ہیں:

ان کان تلک الشمس شمس سمائها — فلصرت شمس العلم و العلماء

اگر یہ آفتاب اپنے آسمان کا سورج ہے تو تو علم اور علماء کا آفتاب ہے۔

اذا انت شمس والعلوم سماء کم — فالشمس شمسی و السماء سمائی

جب آپ آفتاب ہیں اور علم و فن آپ کا آسماں ہے تو آفتاب ہمارا آفتاب ہے اور آسمان ہمارا آسمان ہے (۱۴)۔"

خواجہ غلام الثقلین اور سید محمود کی اردو تقاریر کے بعد ظفر علی خاں نے فارسی قصیدہ پڑھا، جس کا مطلع یہ ہے:

سحر گاہاں دلم پامال غم بود و پریشانی — مکدّر مطلع خاطر بداز اندوہ پنہانی

مولانا شبلی کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

کہ فخر قوم مولانائے شبلی رلپئے علمش   خطا بے شد عطا واللہ ز فیض جود سلطانی

زمین ہم آسماں ہم چہرہ افروزند بہراو   معطر باغ دہر است از پئے شبلی نعمانی (۱۵)"

بہاری لال مشتاق دہلوی شاگرد مرزا غالب نے اپنی تقریر میں مولانا شبلی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اپنے کو ہندو ہونے کی وجہ سے آفتاب پرست اور مولانا شبلی کو شمس العلماء ہونے کی وجہ سے اپنا معبود بتایا۔ سب سے آخر میں مولانا حالی نے اپنا عربی قصیدہ "من الحبیب الی الحبیب" پڑھا۔ شروع کے چند اشعار یہ ہیں:

یا وحید امن الکرام فریدا   و عزیزا کمثل علق نفیس

بڑے بڑے آدمیوں میں یکتا اور یگانہ اور نادر الوجود مثل نفیس و نادر چیز کے۔

انت اولی بان تلقب شمسا   بل بان یجعلوک شمس الشموس

تو اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ تجھ کو آفتاب کا لقب دیا جائے بلکہ اس بات کا کہ تجھے آفتابوں کا آفتاب قرار دیا جائے۔

انت شمس الھدیٰ و لستُ بشمس   یعتریھا الخنوس بعد خنوس

تو ہدایت کا آفتاب ہے اور وہ آفتاب نہیں جس کو غروب پر غروب لاحق ہوتا ہے (۱۶)۔"

سب سے آخر میں مولانا نے شکریہ آمیز تقریر میں کہا:

"آپ نے جس مہربانی اور محبت سے عطیہ، خطاب کی تقریب میں مجھ کو ایوننگ پارٹی میں مدعو کیا ہے اور جس جوش و خلوص سے آپ نے اس موقع پر مجھ کو اس خطاب پر مبارک باد دی ہے۔ میں نہایت سچے دل سے اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں، حقیقت میں میرے لیے اس سے زیادہ فخر و عزت کا کیا موقع ہو سکتا ہے کہ انجمن الادب کا جو اپنی قسم کی تمام ہندوستان میں ایک مجلس ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ اس مقدس زبان میں ہم کو اسپیچ اور لیکچر دینا سکھائے جو ہماری مذہبی اور قومی زبان ہے، جس کے ممبروں میں مولوی بہادر علی صاحب ایم۔اے اور کیپے ایم۔اے، ڈیل ایم۔اے داؤد بھائی صاحب جیسے ادیب، مرزا اللہ خان صاحب رئیس، جناب حاجی اسمعیل خاں صاحب ممبر کونسل، جناب سید کرامت حسین صاحب بیرسٹر ایٹ لا، مولوی خلیل احمد صاحب ایم۔اے گر اور اس کے آنریری ممبروں میں ہمارے مخدوم مولانا الطاف حسین حالی داخل ہیں۔ میرے خطاب کی نسبت مبارک باد دینا ایک ایسا فخر اور ایک ایسی عزت ہے، جس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے۔

اسی طرح اخوان الصفا کی مجلس جو مسلمانوں کی اس قدیم مجلس کے نمونے

پر قائم کی گئی ہے، جو چوتھی صدی میں قائم ہوئی تھی، جس کے سیکرٹری میرے استاد اور ہمارے کالج کے فرشتہ خصال پروفیسر آرنلڈ ہیں اور جس کے ممبر نہایت پاکیزہ اخلاق اور لائق و فائق اشخاص ہیں، ایسی مجلس کا مجھ کو مبارک باد دینا بڑی سے بڑی عزت اور بڑے سے بڑا شرف ہے۔"

اے حضرات! اگرچہ میں انگریزی گورنمنٹ کی نہایت قدر اور عزت کرتا ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ اس کے تمام احکام اور قاعدے ریاست اور انتظام کے اعلیٰ اصولوں پر مبنی ہیں اور اس بنا پر اس خطاب کی بھی جو گورنمنٹ نے مہربانی سے مجھ کو عطا کیا ہے نہایت قدر اور منزلت کرتا ہوں۔ لیکن میں آپ کو کافی یقین دلاتا ہوں کہ میں اس خطاب کو جو قوم کی طرف سے دیا جائے گورنمنٹ کے خطاب سے کچھ کم عزت نہیں کرتا اور یہ میرے لیے کچھ بے جا بات نہیں بلکہ اس زمانے میں بھی جبکہ خود مسلمانوں کی حکومت تھی مسلمانوں نے ہمیشہ سلطنت کے خطابات کی بہ نسبت قومی خطابات کی زیادہ عزت کی۔ اسی کا اثر ہے کہ سلطنت عباسیہ اور دوسری سلطنتوں کے عطا کیے ہوئے خطاب بالکل معدوم ہو گئے اور قوم کے عطا کیے ہوئے خطابات یعنی "حجۃ الاسلام" امام غزالی کے لیے، "امام" فخر الدین رازی کے لیے "علم الہدیٰ" اشریف مرتضے کے لیے آج بھی باقی اور قائم ہیں۔ پس جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ گورنمنٹ نے جو خطاب کے عطا کرنے کی عزت مجھ کو دی ہے اس کو آپ لوگ جو قوم کے صحیح قائم مقام ہیں، پسند کرتے ہیں اور بجا سمجھتے ہیں تو اس سے بڑھ کر میرے لیے فخر اور خوشی کا کیا موقع ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ۶۔جنوری کو اگر گورنمنٹ کے حضور سے مجھ کو خطاب ملا تھا تو آج ۱۹۔جنوری کو مجھ کو قوم کے دربار سے یہ خطاب ملا ہے۔

لنگہ می بینم بہ بیداری است یا رب یا بہ خواب

اے حضرات! جس طرح میں نہایت سچے دل سے آپ صاحبوں کی مہربانی کا شکریہ ادا کرتا ہوں، میرا فرض ہے کہ نہایت سچے دل سے گورنمنٹ کی اس پالیسی کی نسبت احسان مندی کا اظہار کروں جو اس نے اس خطاب کے دیے جانے کی نسبت اختیار کی ہے۔

حضرات! آپ کو معلوم ہے کہ جب کسی ملک میں انقلاب حکومت ہوتا ہے تو نئی حکومت پرانی حکومت کے تمام آثار کو، علوم کو، فنون کو، تمدن کو مٹا دینا چاہتی ہے قال اللہ تعالیٰ ان الملوک اذا دخلوا قریۃ افسدوھا وجعلوا اعزۃ اھلھا اذلہ وکذالک یفعلون ٥

بے شبہ جب بادشاہ کسی ملک میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو ویران اور

اس کے معزز باشندوں کو ذلیل کر دیتے ہیں اور ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔

لیکن انگریزی حکومت نے بخلاف اس کے پرانی حکومت یعنی اسلامی حکومت اور نہ صرف اسلامی حکومت بلکہ ہندوؤں کی حکومت کے آثار کو بھی محفوظ رکھنا چاہا ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی نے جو کام کیا ہے وہ آپ کو معلوم ہے۔ قدیم عمارتوں کی نسبت جو اہتمام گورنمنٹ کو ہے وہ مخفی نہیں، اسی طرح گورنمنٹ نے اس خطاب کے سسٹم کو قائم کرنے سے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ قدیم تعلیم اور قدیم علوم کی ویسی ہی عزت کرتی ہے جس طرح کہ انگریزی تعلیم کی۔

حضرات! اگرچہ کسی ایسے شخص کو جو علم کی خدمت کرنا چاہتا ہے کسی قسم کے خطاب کی خواہش کرنی یا خطابات کو اپنی خدمت کا صلہ سمجھنا ایک قسم کی تنگ حوصلگی ہے اور اسی بنا پر ہمارے قدیم بزرگوں میں سے بہتوں نے اس قسم کے خطابات کے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ تاہم کچھ شبہ نہیں کہ اس قسم کے اعزازوں سے لوگوں کے حوصلے بڑھتے ہیں اور ان کی ہمت بلند ہوتی ہے۔ ہم کو گورنمنٹ کے سایہ عاطفت میں اس بات کا موقع حاصل ہے کہ ہم اپنے قدیم علوم، قدیم زبان، قدیم تہذیب کو محفوظ رکھ سکیں اور اگر ہم کو ایسا کرنے کے لیے قدردانی اور ظاہری اعزاز کی تمنا اور آرزو ہے تو گورنمنٹ ہماری قدردانی اور عزت افزائی کے لیے اسی طرح موجود ہے جس طرح اسلامی عہد میں اسلامی حکومت۔ مولوی عبدالحق صاحب خیر آبادی، مفتی میر عباس مرحوم، مولوی حامد حسین صاحب مرحوم اگر اسلامی حکومت کے زمانہ میں موجود ہوتے تو ان کو اسی قسم کے اعزاز کی توقع ہو سکتی تھی جو انگریز گورنمنٹ نے ان کو عطا کیا۔

حضرات! جب کہ میں اس موقع پر آپ کے اور گورنمنٹ کے احسانات کا شکریہ ادا کر رہا ہوں نہایت ناسپاسی ہوگی اگر میں اس چیز کا ذکر نہ کروں جو ان تمام احسانات کا اصلی سرچشمہ ہے، یعنی یہ ہمارا قومی کالج (۱۷)۔"

اس تقریر میں چند باتیں توجہ کے لائق ہیں، ایک تو یہ کہ اس جلسے میں بھی مولانا مقدس زبان (عربی) کی تعریف سے نہیں چوکتے اور اس خیال کو رد کرنے میں اب بھی پس و پیش نہیں کرتے کہ انگریزی جاننا قابلیت کے لیے ضروری تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ انگریزی کو اس لیے ضروری سمجھتے تھے کہ اس کی وجہ سے جدید علوم و فنون سیکھنے میں آسانی ہوتی تھی، اس لیے وقت کے تقاضے کو پوری کرتی تھی۔ دوسری چیز یہ تھی کہ وہ المامون لکھنے کے بعد بھی تاریخ اسلام میں غرق تھے۔ باوجود گورنمنٹ کی قدردانی کے وہ قوم کے عطا کردہ خطاب کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے

تھے اور اس کے لیے دور عباسیہ کی مثال بھی پیش کی، گویا تاریخ اسلام ان میں رچی بسی ہوئی تھی۔ کوئی بات تاریخ اسلام کے تذکرے سے خالی نہ تھی۔ گورنمنٹ کی پالیسی کو وہ بھی سمجھتے تھے۔ لہٰذا اس کی پالیسی کی تحسین کرنا اپنے جذبات کے لیے رکاوٹ سمجھنا بھی ہو سکتا تھا۔ اس تقریر میں قدیم علوم اور قدیم تہذیب کو محفوظ رکھنے پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ مولانا نے اس تقریر میں انگریزوں کے متعلق سیاست کا لفظ بے وجہ نہیں استعمال کیا ہے۔ بہرحال اس پوری تقریر کو پڑھ کر ایسا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ انگریزوں کی سیاست، پالیسی اور چال کو سمجھتے تھے۔ جو ان کو خطاب دینے میں کارفرما تھی۔

آخر میں مولانا نے کالج کو خراج عقیدت پیش کیا ہے جس نے مولانا کی شہرت میں چار چاند لگا دیے تھے اور کالج کے پروفیسر کی حیثیت سے ہندوستان اور ہندوستان سے باہر روشناس ہوئے تھے۔

مولانا اس زمانے میں بھی نیشنل اسکول سے غافل نہیں رہے۔ چناں چہ مولوی سمیع سے دریافت کیا کہ حافظ حسن علی سے روپے وصول ہوئے یا نہیں؟ اگر نہیں تو مولوی سمیع کو دینا پڑیں گے۔ مولانا نے اپنے والد کو چند اردو اخبارات بھیجے اور یہ لکھا کہ ان کے دیکھنے کے بعد مولوی سمیع ان کو لے کر اپنے پاس رکھ لیں اور خصوصاً مولانا حالی کی نظم کا پرچہ محفوظ رکھنے کی تاکید کی ان اردو اخبارات میں ۱۹۔ جنوری ۱۸۹۴ء کے جلسہ کی روداد چھپی تھی جس کی صدارت محسن الملک نے کی تھی (۱۸)۔"

علی گڑھ میں سالانہ نمائش ہوا کرتی تھی جس میں ضلع کے اکثر رؤسا شرکت کرتے تھے۔ رؤسا کو کالج کی طرف متوجہ کرنے کے لیے سرسید نے ایک قومی تماشا گاہ کی طرح ڈالی۔ چناں چہ اس بوڑھے بازی گر نے ۶۔ فروری ۱۸۹۴ء کو چند بوڑھوں اور جوانوں کے ساتھ ایک کھیل کھیلا جس کا نام تماشائے عبرت رکھا۔ اس میں سب سے پہلے اسٹیج پر آنے والے نواب حاجی اسمٰعیل خان تھے جو کپتان کی وردی میں چند سپاہیوں کے ساتھ آئے اور ان سے عربی، فارسی، ترکی اور انگریزی میں گفتگو کی۔ اس کے بعد سرسید آئے جنھوں نے کپتان سے گفتگو کے بعد ایک لیکچر دیا اور آخر میں حافظ کی غزل پڑھی جس کا ایک شعر یہ ہے:

ساقیا برخیز و دردہ جام را   خاک برسر کن غم ایام را

اس کے بعد چار انگریز پروفیسر آئے اور انھوں نے مل کر ایک انگریزی گیت گایا، پھر آغا

کمال الدین سنجر طہرانی نے اپنا فارسی قصیدہ سنایا جس کا ایک شعر یہ تھا:

اے پیروان دین حنیف پیمبری فریاد از ستیزہ ایں چرخ چنبری

اس کے بعد مشہور سیاح آغا محمد حسین نے بدوی شیخ کی صورت میں آکر عربی گیت گایا۔ اس کے بعد خواجہ محمد یوسف وکیل نے تقریر کی اور اپنی اردو مثنوی سنائی۔ پھر پروفیسر آرنلڈ نے ایک انگریزی نظم سنائی۔ اس کے بعد مولانا شبلی سبز عبا پہنے اور رنگین عمامہ باندھے اسٹیج پر آئے اور اپنا قومی مسدس ایک خاص لحن سے پڑھ کر سنایا، جس سے لوگوں پر بڑا اثر ہوا۔ یہ مسدس اسی موقع کے لیے لکھا گیا تھا (۱۹)۔ پہلا بند یہ ہے:

آج کی رات یہ کیوں جمع ہیں احباب بہم بھیڑ کیا ہے نظر آتا ہے یہ کیسا عالم
نوجوانان ہنر پرور و ارباب ہمم جوق کے جوق چلے آتے ہیں کیسے باہم
کچھ سمجھ میں نہیں آتا جو یہ سب کچھ ہیں شاید اس بزم کو یہ بزم طرب سمجھے ہیں

آخری بند یہ ہے:

ان سے سن لے کوئی افسانہ، یاران وطن یہ دکھا دیتی ہیں آنکھوں کو وہی خواب کہن
ترے ہی نام کا اے قوم یہ گاتے ہیں بھجن ترے ہی نغمہ، پر درد کے ہیں یہ ارگن
پوچھتا ہے جو کوئی ان سے نشانی تیری یہ سنا دیتے ہیں سب رام کہانی تیری (۲۰)

اس مسدس میں کل سولہ بند ہیں اور اس میں بھی مسلمانوں کی شاندار تاریخ اور کارناموں کا ذکر ہے اور قوم کی ابتر حالت کے مرثیہ کے ساتھ ساتھ سرسید اور ان کے رفقا کی کوششوں کو سراہا ہے۔ اس نے حاضرین پر ایک عجیب کیفیت طاری کر دی اس کے بعد یاقوت خان طالب علم نے مولانا شبلی کا کچھ دن قبل کہا ہوا قصیدہ پڑھا، جس کا مطلع یہ ہے:

بزم احباب ہے پر جوش ہے جلسہ کیسا جم گیا پھر طرب و عیش کا نقشہ کیسا

اور مقطع یہ ہے:

اے حریفو! تمھیں خالق کی قسم سچ کہنا شبلی خستہ نے لکھا یہ قصیدہ کیسا (۲۱)

۱۷۔ فروری ۱۸۹۴ء کو علی گڑھ کالج کے اسٹریچی ہال میں ایک جلسہ ہوا جس میں مسٹر ہو گنٹن کمشنر میرٹھ نے مولانا کو عمامہ، عبا اور تمغہ دیا۔ اس کے بعد اپنی تقریر میں شمس العلماء کے خطاب کی تاریخ بیان کی، پھر ان خیالات کا اظہار کیا جس کی حکمراں قوم محکوم قوم کے افراد سے امید کرتی تھی۔ خطاب پانے والے کی اتنی تعریف نہیں ہے جتنی کہ خطاب دینے والے اور اپنی قوم

کی ہے کہتے ہیں:

"شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی! اس رسم خلعت کے انجام دینے پر اور اس سند کے نذر کرنے کے ساتھ جس پر ایسے قابل اور عالی دماغ اور راست رو وائسرائے اور گورنر جنرل کا طغرا ہے، جس سے بہتر ہندوستان کی خوش قسمتی کے حصے میں نہیں آیا، میں (آپ کے لیے) یہ چاہتا ہوں کہ آپ کی عمر دراز ہو۔ نہ صرف اس لیے کہ اس سزاوار عظمت سے لطف حاصل کیجیے بلکہ اس واسطے کہ جس طرح ترقی علوم مشرقی میں آپ نے ایسے کارہائے نمایاں کیے ہیں جس سے یہ امتیاز حاصل کیا اسی طرح اس سے بھی زیادہ نمایاں خدمت اپنی قوم اور انگلش قوم کے واسطے کرتے رہیے، جس کے ساتھ ساتھ عروج کرنا آپ کی قوم کے لیے مقدر ہے اور اپنے پرزور اثر کو جو آپ کی ممتاز لیاقت سے پیدا ہوتا ہے، اس معزز امر کے استحکام اور وسعت کی طرف مائل رکھیے جس کو آپ کے پرنسپل کے دل پسند الفاظ (برٹش کی وفاداری، انگلش کے ساتھ دوستی اور جوش، سیلف ہلپ کے بلند اور روز افزوں خیالات) کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں اور جو اپنی مثال اور اثر سے ہندوستان بلکہ دنیا پر اس سچے اصول کا اظہار کر رہی ہیں جس سے ایک قوی مگر زوال یافتہ قوم اپنی تلف کردہ عظمت کی بنیاد ایسے انداز پر ڈال سکتی ہے جو اس کے لیے باعث عزت اور اس کے فرماں رواؤں کے لیے باعث ہمدردی و اعانت ہو سکے (۲۲)۔"

اس وقت حکمران قوم کے تمام افراد کے تقریباً یہی خیالات تھے جس کی مثال مندرجہ بالا تقریر ہے اور محکوم کے اگر سب افراد میں نہیں تو چند افراد میں ضرور آزادی کی تڑپ تھی، پھر مولانا تو آزاد مسلم ملک میں آزادی کی سانسیں لے کر واپس ہوئے تھے، ان کے خیالات کچھ اور تھے اور وہ اس خطاب کو شکنجہ سمجھتے تھے۔ چناں چہ انھوں نے احباب کے مبارک باد کے خطوط کے جواب میں لکھا:

"عطائے خطاب کی تقریب میں اکثر بزرگان قوم نے مبارک بادی کے جو خطوط لکھے اور میرے رتبہ اور حالت سے بدرجہا بڑھ کر جن الفاظ میں قدر دانی کا اظہار کیا، ان کا اثر اگرچہ یہ نہیں ہو سکتا کہ میں ایاز قدر خود بشناس کا مقولہ بھول جاتا، تاہم کچھ شبہ نہیں کہ وہ تحریریں میرے دائمی شرف اور عزت کی باعث ہیں اور میں ان بزرگوں کا جس قدر شکریہ ادا کروں کم ہے۔ مسلمانوں کے عہد حکومت میں اور آج بھی جہاں اسلامی حکومت ہے وہاں کے حکومت کے عطا کردہ خطابات سے قومی خطابات کی عزت زیادہ کی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے میری اس عزت افزائی کی نسبت ان بزرگان قوم

کی طرف سے پسندیدگی اور خوشی کا اظہار جو ہماری قوم کے جائز قائم مقام ہیں اور جن میں افتخار الدولہ فخر الملک صاحبزادہ محمد عبید اللہ خان بہادر، فیروز جنگ - سی - ایس - آئی، نائب ریاست ٹونک سردار محمد حیات خان بہادر، سی - ایس - آئی، نواب محسن الملک، مولوی مہدی علی خاں صاحب، نواب وقار الملک، مولوی مشتاق حسین، مولوی سید اکبر حسین صاحب جج، حاجی محمد اسمٰعیل خان کے مبارک نام شامل ہیں، سب سے بڑی عزت ہے جو مجھ کو عطا کی جا سکتی ہے - علی الخصوص لسان الملک فخر قوم اور مخدوم قوم مولانا الطاف حسین صاحب حالی دام مجدہ کی نظم جو جناب موصوف نے اس موقع پر لکھی ہے، میرے لیے تمغائے فخر اور سند عزت ہے - بے شبہ یہ وہ بڑی سے بڑی عزت ہے جو مجھ کو حاصل ہو سکتی تھی اور جس کے حاصل ہونے پر مجھ کو اور کسی عزت کی خواہش نہیں ہو سکتی (۲۳) -"

مولانا اس زمانے میں چوں کہ تاریخ اسلام کی ورق گردانی کر رہے تھے اس لیے ہر تقریر میں تاریخ کی طرف ضرور اشارہ ہوتا تھا - ۱۸۹۳ء سے ۱۸۹۸ء کے درمیان مولانا نے تاریخ سے متعلق مختلف مقالے لکھے تھے جو رسائل شبلی کے نام سے شائع ہوئے -

خطاب کے سلسلہ میں مولانا حکومت پر قوم کی قدر افزائی کو ترجیح دیتے تھے، جس کا اس تقریر میں اور ۱۹ - جنوری ۱۸۹۴ء کی تقریر میں کھلا اعتراف کیا ہے - مولانا مقلد اور غیر مقلد کی بحث میں پڑ چکے تھے، تحریری اور تقریری مناظروں میں حصہ لے چکے تھے، کالج میں رہ کر وہ یہ بھی دیکھ چکے تھے کہ جدید تعلیم کے ساتھ روشن خیالی کے پردے میں چھپی ہوئی مذہب بیزاری بھی آرہی تھی، جس کی روک تھام کے لیے ضروری تھا کہ خاص طریقہ کار اختیار کیا جائے - اگرچہ سرسید نے اپنے طور پر پوری کوشش کی تھی - یعنی اس بے دینی کے سیلاب کے خلاف پہلے ہی سے بند باندھ دیا تھا، یعنی دینی تعلیم لازمی قرار دی تھی اور جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ قدیم تعلیم کا بھی اہتمام کیا تھا اور قدیم تعلیم کے لیے دیندار لوگوں کا تقرر کیا تھا - ان دونوں (قدیم و جدید) ڈانڈوں کو ملانے کی کوشش اس غرض سے کی گئی تھی کہ قدیم سرمایہ، تعلیم مذہب اور دین کی مدافعت میں معین و مددگار ہوتا اور جدید علوم میں واقفیت بلکہ مہارت دنیوی معاملات میں بڑھنے اور ترقی کرنے میں مدد دیتے اس طرح دینداری کے ساتھ ساتھ دنیوی معاملات میں اقوام کے مقابلے میں کھڑا ہوا جا سکتا تھا - لیکن علی گڑھ کالج میں اولیت جدید علوم و فنون کو حاصل تھی اور قدیم علوم و فنون کی ثانوی حیثیت تھی اور اس کے نتیجے سے سرسید بھی مطمئن نہ تھے، چناں چہ مولانا سے طلبہ

میں نماز کی پابندی نہ ہونے کے متعلق استفسار کیا تھا (۲۴) اور جدید علوم میں ان کی کمزوری کا اعتراف بھی کیا تھا (۲۵) ۔ مولانا نے اس تجربے سے بھی فائدہ اٹھایا تھا اور روم و مصر و شام کی تعلیمی حالت کا مشاہدہ بھی کر آئے تھے، اس لیے ایک خاص نظریے پر پہنچ چکے تھے ۔ خاکہ پہلے سے تیار تھا، تعلیمی سفر نے اس میں رنگ بھر دیا اور ذہن میں نقشہ تیار ہو گیا ۔ ان تجربات، مشاہدات اور نظریات کا نچوڑ وہ سفرنامے کے پیمانے میں ۱۸۹۳ء سے پیش کر رہے تھے اور اب سفرنامہ تیار تھا کہ ندوۃ العلماء کا پہلا اجلاس کان پور میں ۱۸۹۴ء میں ہوا اور مولانا نے اس میں شرکت کی ۔ مولانا کے لیے اپنے خیالات پیش کرنے کا اچھا موقع تھا، چناں چہ انھوں نے اس کو پیش کرنے میں بخل سے کام نہ لیا (۲۶) ۔

ندوۃ العلماء کی بنیاد اس طرح پڑی تھی کہ مدرسہ فیض عام کان پور میں ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء میں دستار بندی کا جلسہ ہوا ۔ اس جلسے میں جو علما تشریف لائے تھے انھوں نے اتفاق رائے سے یہ بات طے کی کہ علما کی ایک مستقل انجمن قائم کی جائے اور ہندوستان کے تمام ممتاز علماء کو اس میں شرکت کی دعوت دی جائے ۔ اس مجلس میں شریک ہونے والے چند علما کے نام حسب ذیل ہیں:

۱۔ (شیخ الہند) مولانا محمود حسنؒ (مدرس اول مدرسہ دار العلوم، دیو بند)
۲۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ (مدرس مدرسہ جامع العلوم، کانپور)
۳۔ مولانا خلیل احمد سہارن پوری (مدرس دوم دار العلوم، کانپور)
۴۔ مولانا شاہ محمد حسین الہ آبادی
۵۔ مولانا سید محمد علی مونگیریؒ
۶۔ مولانا لطف اللہ علی گڑھی
۷۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری
۸۔ مولانا نور محمد پنجابیؒ (صدر مدرس اسلامیہ فتح پور)
۹۔ مولانا شاہ سلیمان پھلواریؒ
۱۰۔ مولانا سید ظہور الاسلام فتح پوریؒ
۱۱۔ مولانا شاہ تجمل حسین دیسنویؒ (۲۷)

ندوہ کی بنیاد پڑنے کا سبب سید محمد حسنی لکھتے ہیں:-

"علما کی باہمی کشمکش، فقہی اختلافات کی شدت، حقیقی مسائل سے پہلوتہی اور وقتی یا مصنوعی مسائل پر زور آزمائی، مناظروں کی گرم بازاری اور تکفیر کا رواج، نئے فتنوں کی طرف سے غفلت اور غیر ضروری چیزوں پر اصرار، یہ حوصلہ شکن حالات تھے جس میں مولانا محمد علی نے ندوۃ العلما کا تخیل اسلامی ہند کے سامنے پیش کیا"۔(۲۸)

مولانا محمد علی مونگیری اس طرح لکھتے ہیں:

"۱۳۱۰ھ میں جب بہت سے نامور علما مدرسہ فیض عام کان پور کے جلسہ دستار بندی میں رونق افروز ہوئے۔ اس وقت بعض دور اندیش علما نے تحریک کی کہ ایک انجمن علما کی قائم کی جائے تاکہ جو خرابیاں مسلمانوں، خصوصاً ان کی تعلیم میں واقع ہو گئی ہیں ان پر غور کرے اور علما میں اتحاد پیدا ہو(۲۹)۔"

مولانا علی گڑھ میں رہ کر مقلد اور غیر مقلد کے جھگڑوں کو بھلا چکے تھے اور اتحاد اسلامی کے دل سے حامی ہو گئے تھے اور تعلیم کی خرابیوں کے معاملے میں نصاب کو تبدیل کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ قدیم و جدید کے ڈانڈوں کو بھی ملانا چاہتے تھے لیکن سرسید کے برخلاف قدیم کو اولیت اور جدید کو ثانوی حیثیت دینے کے حق میں تھے اور ان کو اپنے خیالات کا پرتو مصر کے دار العلوم میں ۱۸۹۲ء میں نظر آچکا تھا۔ گویا خیالات کی عملی شکل دار العلوم تھی۔ چناں چہ اس کے متعلق سفرنامے میں لکھتے ہیں:

"مصر اور نہ صرف مصر بلکہ تمام ممالک اسلامیہ میں جو کالج مجھ کو سب سے زیادہ پسند آیا اور جس کو میں نے مسلمانوں کے درد کے لیے کافی سمجھا وہ یہی کالج ہے۔ میرا ہمیشہ سے یہ خیال ہے اور میں نہایت مضبوطی سے اس پر قائم ہوں کہ مسلمان مغربی علوم میں گو ترقی کے کسی رتبے تک پہنچ جائیں لیکن جب تک ان میں مشرقی تعلیم کا اثر نہ ہو ان کی ترقی نہیں کہی جا سکتی۔ بے شبہ مشرقی تعلیم کی جو موجودہ اسکیم ہے وہ نہایت ابتر اور غیر ضروری ہے۔ لیکن اسی تعلیم میں ایسی چیزیں بھی ہیں جو مسلمانوں کی قومیت کی روح ہیں اور جس تعلیم میں اس روحانیت کا مطلق اثر نہ ہو، وہ مسلمانوں کے مذہب، قومیت، تاریخ کسی چیز کو بھی زندہ نہیں رکھ سکتی۔

جس مصیبت کا ہندوستان میں رونا ہے، وہی قسطنطنیہ، بیروت اور مصر میں بھی موجود ہے۔ یعنی نئی تعلیم میں قومیت اور مذہبی پابندی کا اثر کم ہے اور پرانی تعلیم اس قابل نہیں کہ دنیا کی موجودہ ضرورتوں کا ساتھ دے سکے۔ صرف یہ دار العلوم ہے جو دونوں ڈانڈوں کو ملانا چاہتا ہے(۳۰)۔"

آگے چل کر مولانا نے دار العلوم کا نصاب بھی دیا ہے جس میں قدیم و جدید علوم شامل ہیں (۳۱)۔

ان خیالات کے تحت مولانا نے بحیثیت پروفیسر محمڈن کالج علی گڑھ ندوۃ کے پہلے اجلاس میں شرکت کی اور مولوی شاہ محمد حسین الہ آبادی کی تجویز اول "موجودہ طریقہ تعلیم قابل اصلاح ہے یعنی قدیم طریقہ درس موجودہ زمانے کے لیے کافی نہیں اس میں ترمیم و اصلاح کی حاجت ہے (۳۲)" کی تائید میں تقریر کی۔ تقریر یہ ہے:

جناب صدر انجمن و دیگر حضرات!

قبل اس کے کہ میں اصل مضمون کے متعلق کچھ گفتگو کروں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہم مسلمانوں کا علم کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ مسلمانوں کی قوم کی حقیقت اور ماہیت جو کچھ کہو مذہب ہے۔ مسلمان کے لفظ کے اطلاق کے لیے کیا خصوصیت درکار ہے؟ سید ہونا؟ شیخ ہونا؟ مغل ہونا؟ عربی ہونا؟ عجمی ہونا کچھ نہیں صرف کلمہ توحید کا دل سے ماننا اور زبان سے اقرار کرنا۔ اس سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد، سیادت، مشیخت، عربیت، عجمیت نہیں ہے بلکہ اسلام ہے اور اسلام کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس امر کے ثابت ہونے کے بعد کہ ہماری قومیت اور اسلام گویا مرادف الفاظ ہیں ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ اسلام سے علم کو کیا تعلق ہے، کیوں کہ جو تعلق علم کو اسلام کے ساتھ ہو گا وہی ہمارے ساتھ بھی ہو گا۔

اسلام کی بنیاد، اسلام کی ترکیب، اسلام کے نظام پر جب غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اور علم آپس میں متلازم ہیں۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں اسلامی عقائد کا ذکر ہے اور ان کے تسلیم اور اذعان کا حکم ہے، اجتہادی حیثیت سے ہے نہ تقلیدی یعنی خود سوچو، دیکھو، غور کرو۔ **اولم تیفکر وافی خلق السموات والارض** بلکہ خود دعوتِ اسلام اور تبلیغ اسلام میں استدلالی اور علمی حیثیت ملحوظ ہے۔ **ادع الیٰ سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنہ وجادلھم بالتی ھی احسن ٥** کی تفسیر میں امام غزالی وغیرہ نے لکھا ہے کہ حکمت، موعظت، جدال سے استدلال برہانی، خطابی، جدلی مراد ہے اور یہ ظاہر ہے کہ تینوں طریقے علمی طریقے ہیں۔ عیانی ثبوت اس امر کا علم اسلام کے خمیر میں داخل ہے یہ ہے کہ علم اور اسلام کا ہمیشہ ساتھ رہا ہے۔ عرب کو دیکھو، وہ ملک جس پر ابتدائے آفرینش سے علم کا سایہ تک نہیں پڑا تھا، اسلام کے ساتھ اس کا ذرہ ذرہ علم کی روشنی سے چمک اٹھا۔ سلجوق، دیلم، افغان، تاتار، ترک جو دنیا کے آغاز سے بے علم رہے، اسلام قبول کرنے کے ساتھ شاعر، نثار، ادیب، فلاسفر، حکیم بن گئے:

دنیا کی وہ قومیں جو ابتدائے آفرینش سے صحرانوردی اور غارت گری کے سوا اور کچھ نہ جانتی تھیں، ان میں امام شافعیؒ، امام مالکؒ، یعقوب کندی، فارابی، ابن رشد کا پیدا ہو جانا کس کا اثر تھا؟ اسلام کا۔ اس سے زیادہ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ علم اسلام کا مایہ، خمیر ہے اور یہ کہ علم اسلام سے جدا نہیں ہو سکتا یا کم از کم یہ کہ وہ کبھی اس سے جدا نہیں ہوا۔

حضرات! جب ہم مسلمانوں کو علم سے اس درجہ تعلق ہے تو نہایت افسوس ہے کہ اگر ہم ہمیشہ اس بات کا خیال نہ رکھیں کہ اب علم میں ہمارا کیا پایہ ہے؟ ہمارے علوم کس حالت میں ہیں؟ مختلف زبانوں کے لحاظ سے اس کے نصاب میں کیا کیا اضافے اور اصلاحیں ہوتی رہنی چاہییں؟ بزرگان سلف عموماً ہر زمانے میں اس اصول کے پابند رہے اور یہی وجہ ہے کہ تعلیم کا طریقہ، کتابوں کا انتخاب، علوم درسیہ کا تعین، یہ چیزیں ہمیشہ بدلتی رہیں۔ بنو امیہ کے دور تک کتابی درس کا مطلق رواج نہ تھا بلکہ استاد زبانی تقریر کرتا تھا اور طلبہ اس کو قلم بند کرتے جاتے تھے۔ یہ طریقہ دولت عباسیہ میں مدت تک جاری رہا۔ اس کے بعد کتابوں کا درس جاری ہوا۔ لیکن پہلا طریقہ بھی مفقود نہیں ہوا۔ سب سے اخیر شخص جس نے اس طریقہ پر درس دیا۔ علامہ جلال الدین سیوطی تھے۔ ایک زمانے میں علوم عقلیہ نصاب تعلیم سے بالکل خارج تھے، بلکہ مقدس علما اس سے نفرت رکھتے تھے۔ زمانہ مابعد میں یہی علوم درس و تعلیم کے ضروری اجزا بن گئے یہاں تک کہ آج جس نے یہ علوم نہ پڑھے ہوں وہ پورا عالم نہیں شمار کیا جاتا۔ فارابی کے زمانے تک یعقوب کندی کے تصنیفات درس معقولات میں تھے۔ فارابی کے زمانے سے فارابی کی تصنیفات کا رواج ہوا، پھر بوعلی سینا کی کتابیں مقبول ہوئیں اور قدیم کتابیں گمنامی کے گوشے میں چھپ گئیں۔ اسی طرح ہر زمانے کے سلسلہ، تدریس میں تبدیلیاں ہوتی رہیں یہاں تک کہ ملا نظام الدین کا عہد آیا اور نظام تعلیم کی بالکل کایا پلٹ ہو گئی۔ موجودہ نصاب ملا صاحب ہی کی طرف منسوب ہے اور اسی وجہ سے نظامیہ کہلاتا ہے۔ بعض کتابیں مثلاً ملا حسن، غلام یحییٰ، حمد اللہ، قاضی، آہستہ آہستہ بعد میں داخل ہوتی گئیں اور غلطی سے تغلیباً وہ بھی سلسلہ، نظامیہ کے شمار میں آگئیں۔

یہ امر واقعی حیرت کے قابل تھا کہ جب مختلف ضرورتوں کے لحاظ سے یعقوب کندی، حکیم فارابی اور ابن سینا اور قطب الدین رازی کے نصابات بدلتے رہے تو سلسلہ، نظامیہ کا آج تک من غیر تغیر، بحال رہنا کس لحاظ سے ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے علما نے اس اہم بالشان مسئلے کی طرف توجہ کی اور آج یہ مسئلہ ایسی

پُروقعت مجلس میں پیش ہے جس میں چار دانگ ہند کے علما تشریف فرما ہیں۔

اس مسئلے کے متعلق دو حیثیت سے بحث کی جا سکتی ہے: (۱) طرز تعلیم کے لحاظ سے، (۲) کتب درسیہ کے تعیین کے لحاظ سے۔ میرے نزدیک طریقہ مروجہ کی نسبت جوں کہ جو نکتہ چینیاں کی جاتی رہیں وہ دوسری حیثیت پر محدود نہیں ہیں بلکہ پہلی حیثیت کو بھی اس میں بہت کچھ دخل ہے۔ ممکن ہے کہ یہی کتابیں جو درس میں داخل ہیں داخل رہیں لیکن طرز تعلیم بدل دیا جائے، جس سے بہت سی خرابیوں کی خود اصلاح ہو جائے۔ طرز تعلیم میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ اصل فن کی بجائے کتاب کے ساتھ زیادہ اعتنا کی جاتی ہے۔ اصل مسئلے کی تحقیق کی بجائے زیادہ وقت اس میں صرف کیا جاتا ہے کہ وہ مسئلہ کس عبارت میں بیان کیا گیا ہے؟ اور اس عبارت سے کیا کیا احتمالات پیدا ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ان مباحث میں اعتراضات اور جوابات کا ایک سلسلہ قائم ہو جاتا ہے جن کی بنیاد کسی خاص کتاب کی عبارت و الفاظ پر ہوتی ہے لیکن وہی مسئلہ اگر دوسرے لفظوں میں بیان کر دیا جائے تو وہ سلسلہ خود بخود منقطع ہو جائے۔ ان مباحث میں پڑ کر طالب علم کو اصل فن سے بعد ہو جاتا ہے اور تحقیق مسائل کے بجائے لفظی اعتراضات، احتمال آفرینی، توجیہات کی عادت ہو جاتی ہے۔ آج کل جو یہ شکایت عام ہے کہ موجودہ طریقہ تعلیم سے فن میں کمال نہیں حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کی وجہ تو زیادہ تر یہی ہے کہ فن کی تعلیم ہی نہیں ہوتی تو اس میں کمال کیوں کر پیدا ہو۔ البتہ کتابوں کی تعلیم ہوتی ہے، اس لیے کتاب میں کمال پیدا بھی ہوتا ہے۔ عموماً سننے میں آتا ہے کہ فلاں عالم میر زاہد ایسا اچھا پڑھاتے ہیں کہ کوئی اور نہیں پڑھا سکتا۔ قاضی مبارک کے نکات کا حل کرنا فلاں صاحب کا حصہ ہے۔ فلاں طالب علم نے حمد اللہ بڑی تحقیق سے پڑھی ہے۔ کسی مستعد طالب علم کا اگر مطول یا حمد اللہ میں امتحان لیا جائے تو ممکن ہے کہ وہ ان کتابوں کا مطلب نہایت شرح و بسط و ایراد و جواب کے ساتھ بیان کرے۔ لیکن اسی طالب علم سے اگر یہ کہا جائے کہ قرآن مجید کے کسی رکوع یا آیت کو فصاحت و بلاغت کے قواعد اور اصول پر منطبق کر کے دکھائے یا کسی مسئلے پر جب گفتگو کرے تو دلائل منطقی کو قیاسات کے پیرائے میں بیان کرتا جائے تو شاید نہ کر سکے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کتاب کی تعلیم ہوتی ہے فن کی نہیں ہوتی۔ ملا نظام الدین کا طریقہ درس یہ تھا کہ وہ کتابی خصوصیتوں کا چنداں لحاظ نہیں کرتے تھے بلکہ کتاب کو ایک ذریعہ قرار دے کر اصل فن کی تعلیم دیتے تھے۔ اسی طرز تعلیم نے ملا کمال، بحر العلوم، حمد اللہ، جیسے اہل کمال پیدا کیے۔ جب یہ طرز تعلیم نہ رہا تو اہل کمال بھی مفقود ہو گئے۔ یہ گفتگو جو میں نے کی طرز تعلیم پر تھی۔

نصاب تعلیم کے متعلق جو میرے خیالات ہیں ان کو بدفعات ذیل عرض کرتا ہوں۔(۱) تعلیم میں دو چیزوں کا لحاظ ضروری ہے: (۱) تحصیل فن (۲) امعان نظر اور قوتِ مطالعہ۔ نصابِ موجودہ میں دوسرے امر کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے اور پہلے مقصد کی طرف کم توجہ دی گئی ہے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ طلبہ میں (بشرطیکہ تحقیق کے ساتھ پڑھا ہو) قوتِ مطالعہ، دقتِ نظر، احتمال آفرینی یہ تمام صفتیں ضرور پیدا ہو جاتی ہیں۔ لیکن کسی فن میں کمال حاصل نہیں ہوتا۔ جس قدر کتابیں درس میں ہیں، اسی قسم کی ہیں۔ جن سے دقتِ نظر اور تشحیذ ذہن پیدا ہوتی، لیکن ایسی کتابیں بہت کم ہیں جن میں مسائل فن کا کافی استیعاب ہو۔ نحو میں بڑی سے بڑی کتاب شرح ملا ہے۔ لیکن اس میں نحو کا ایک مسئلہ بھی کافی سے زیادہ نہیں۔ منطق میں دس پندرہ کتابیں ہیں لیکن سب کی سب دوسرے مقصد کے لیے مفید ہیں۔ مسائل منطق کا استیعاب ایک میں بھی نہیں۔ شرح مطالع، ملخص امام رازی جو منطق کے فتاوے ہیں بالکل متروک اور درس سے خارج ہیں۔

(۲) ایک بڑا نقص یہ ہے کہ منطق کی جو کتابیں درس میں داخل ہیں۔ ان میں خلط بحث بہت ہے۔ ملا حسن، حمد اللہ، قاضی ہیں تو منطق میں، لیکن ان میں منطق کے جس قدر مسائل ہیں اس سے کہیں زیادہ امور عامہ اور فلسفے کے مسائل ہیں۔ جہل بسیط اور جہل مرکب، علم باری، کلی طبعی کا وجود فی الخارج وغیرہ وغیرہ۔ ایسے اہم اور معرکۃ الآرا مسائل ہیں کہ ان میں مصروف ہو کر طالب العلم کو منطق کے خاص مسائل کی طرف بہت کم توجہ ہو سکتی ہے۔ بے شبہ مسائل بالا بڑے معرکے کے مسائل ہیں اور ضرور ان کی تعلیم ہونی چاہیے لیکن وہ فلسفہ سے متعلق ہیں اور فلسفے میں خود سیکڑوں کتابیں موجود ہیں۔ ان مسائل کو مستقل و بالذات سیکھنا چاہیے اور انھیں کتابوں کے ذریعے سے سیکھنا چاہیے، جن میں وہ بالاستقلال مذکور ہیں۔ قدما کے زمانے میں کبھی کوئی ایسی کتاب درس میں نہیں رکھی گئی جس میں مختلف فنون کے مسائل مخلوط ہیں۔

(۳) ایک بڑا نقص یہ ہے کہ موجودہ نصاب میں ادب و عربیت کا حصہ بہت کم ہے۔ منطق کی بیسیوں کتابیں درس میں ہیں اور ان میں ایک بھی اگر پڑھنے سے رہ جائے تو سمجھا جاتا ہے کہ تحصیل کی تکمیل میں کمی ہے۔ لیکن اگر ایک طالبِ علم ادب سرے سے نہ پڑھا ہو، عربی زبان میں دو سطریں نہ لکھ سکتا ہو، قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت بھی نہ ثابت کر سکتا ہو تو عام لوگوں کے نزدیک، طلبہ کے نزدیک، اساتذہ کے نزدیک اس کے چہرہ، کمال پر کوئی داغ نہیں۔ حالاں کہ یہ امر یقینی ہے کہ ادب و

عربیت کے بغیر تفسیر یا حدیث کسی میں کمال نہیں پیدا ہو سکتا۔ اس بنا پر ادب سے بے اعتنائی در حقیقت علوم دینیہ سے بے اعتنائی ہے۔

(۴) ایک بہت بڑا اور سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ موجودہ نصاب میں قرآن مجید کے ساتھ بہت کم اعتنائی کی گئی ہے اور تفسیر اور طبقات تفسیر کی بہت کم کتابیں رکھی گئی ہیں۔ کل دو کتابیں درس میں داخل ہیں: بیضاوی اور جلالین۔ بیضاوی کے صرف ڈھائی پارے پڑھائے جاتے ہیں، جلالین پوری پڑھائی جاتی ہے۔ لیکن اس کے اختصار کا یہ حال ہے کہ اس کے الفاظ اور حروف قرآن مجید کے الفاظ اور حروف کے برابر ہیں۔ قرآن مجید کے ساتھ اس سے بہت زیادہ اعتنا درکار ہے اور اس کا یہ طریقہ ہے۔ اولاً تو کوئی کتاب ایسی درس میں رکھنی چاہیے جس سے قرآن مجید کے انداز بیان اور اس کے اقسام مضامین سے ایک اجمالی اطلاع حاصل ہو۔ مثلاً یہ کہ قرآن مجید کا اسلوب بیان جس کی وجہ سے شعرائے عرب کے کلام سے بالکل الگ معلوم ہوتا ہے کیا ہے؟ اس کے اساسی مضامین کیا کیا ہیں؟ کن مضامین کو بار بار فرمایا ہے اور وجہ تکرار کیا ہے؟ اخلاق، فقہ، عقائد، سیر انبیاء، جو قرآن مجید کے مضامین کے ارکان اربعہ ہیں، ان کے متعلق جو کچھ قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے اس کا احاطہ اور اس کی واقفیت، صحت اور خوبی کے دلائل، ثانیاً قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت پر نہایت توجہ ہونی چاہیے۔ یہ امر عموماً مسلم ہے کہ اسلام کا وہ معجزہ جو دائمی اور ابدی ہے قرآن مجید ہے۔ یہ بھی مسلم ہے کہ قرآن مجید کا اعجاز فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے ہے۔ لیکن کیا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ موجودہ نصاب کے تعلیم یافتہ اس اعجاز کو بدلائل ثابت کر سکتے ہیں؟ ان طلبہ کے سامنے اگر عرب کا کوئی عمدہ شعر اور قرآن مجید کی کوئی آیت پیش کی جائے تو کیا وہ دونوں کا موازنہ کر کے آیت قرآن کی فصاحت و بلاغت کے وجوہ ترجیح بتا سکتے ہیں۔

قرآن مجید کے اعجاز کے ثابت کرنے کا یہ طریقہ ہے کہ پہلے فصاحت و بلاغت کا کوئی ایسا اعلیٰ معیار قرار دیا جائے، جس کی نسبت یہ دعویٰ کیا جا سکے کہ وہ طاقت بشری کی حد سے باہر ہے۔ پھر امثلہ اور استدلال کے ساتھ ثابت کیا جائے کہ قرآن مجید بالکل اس معیار کے مطابق ہے۔ مثلاً فصاحت کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ لفظ شیریں ہو، لطیف ہو، صاف و سادہ ہو، مبتذل اور عامیانہ نہ ہو، سبک اور کم وزن نہ ہو۔ بعض الفاظ ایسے بھی ہیں جو ایک موقع پر خوشنما اور فصیح معلوم ہوتے ہیں۔ دوسرے موقع پر نہیں مثلاً فواد اور قلب کے موقع پر فواد کا لفظ اپنے سابق و لاحق الفاظ کے لحاظ سے (مناسب) معلوم ہوتا ہے۔ یعنی سابق و لاحق الفاظ کی نشست و ترتیب

ایسی ہے کہ وہاں فواد ہی کا لفظ استعمال کیا جائے تو وہ تناسب اور حسن صورت جو فصاحت کا سبب ہے، قائم رہتا ہے ورنہ نہیں رہتا۔ کہیں ایسا موقع ہوتا ہے کہ ترتیب اور تناسب صوت کے لحاظ سے یہی فواد کا لفظ مخل فصاحت ہو جاتا ہے اور وہاں قلب کا لفظ خوشنما اور فصیح معلوم ہوتا ہے۔ علامہ ابن الاثیر نے اس نازک اور دقیق فرق کے لیے قرآن مجید کی یہ آیتیں پیش کیں: **ماکذب الفواد ماریٰ ۝ لمن کان له قلب اوالقیٰ السمع و هو شهید ۝** پہلی آیات میں فواد کے بجائے قلب کا لفظ ہوتا تو فصاحت میں فرق آجاتا۔ بخلاف اس کے دوسری آیت میں فواد کا لفظ ہو تو تناسب صوت میں فرق آجائے۔

اب اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ کسی کلام میں جو معتد بہ مقدار رکھتا ہو فصاحت کا ایسا التزام کہ ہر لفظ فصیح ہو اور نہ صرف فصیح بلکہ فصیح تر ہو، انسان کی قدرت سے باہر ہے۔ امراء القیس، فردوسی، سعدی جن کو تمام شعرا میں افصح اور ابلغ مانا جاتا ہے، ان کے کلام میں ہزاروں الفاظ موجود ہیں جو فصاحت کے اعلیٰ رتبے بلکہ معمولی رتبے سے گرے ہوئے ہیں۔ اس معیار کے قرار دینے کے بعد ثابت کرنا چاہیے کہ قرآن مجید بالکل اس معیار کے مطابق ہے۔ یعنی اس میں جس قدر الفاظ ہیں عموماً اپنے تمام مرادف الفاظ سے فصیح تر اور خوشنما تر ہیں یہاں تک کہ اگر ایک چیز کے لیے زبان عرب میں جس قدر الفاظ تھے سب غیر فصیح تھے تو قرآن مجید میں سرے سے وہ الفاظ استعمال نہیں کیے گئے بلکہ اس چیز کو دوسرے طور پر سے تعبیر کیا گیا۔ مثلاً اینٹ کے لیے عربی میں تین لفظ ہیں: **قرمد۔ آجر۔ طوب** اور یہ تینوں غیر فصیح ہیں۔ اس لیے قرآن مجید میں اس کو بیان کرنا پڑا تو یوں تعبیر کیا **او قدلی علیٰ الطین** بے شبہ اس معیار کے مطابق قرآن مجید کی فصاحت کا اعجاز ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن موجودہ نصاب تعلیم میں کوئی کتاب ایسی داخل نہیں جس میں قرآن مجید کی فصاحت سے اس طرح بحث کی گئی ہو اور اس کے الفاظ کا ایک معتد بہ ذخیرہ نمونے کے طور پر پیش کیا گیا ہو۔ یہ نہیں خیال کرنا چاہیے کہ اس قسم کی کتابیں تصنیف ہی نہیں ہوئیں۔ ایسی کتابیں خود ہماری نگاہ سے گزری ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ان کو درس و تدریس کے دربار میں بار نہیں ملا۔

فصاحت کے بعد بلاغت کا مرحلہ ہے اور میں افسوس کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہمارے مدارس کے اکثر تعلیم یافتہ (**والاکثر حکم الکل**) بالکل اس قابل نہیں کہ اس مرحلہ میں قدم رکھ سکیں۔ بے شبہ قرآن مجید بلاغت کے اعتبار سے معجزہ ہے۔ لیکن اگر ہمارے طلبہ اس امر کو صرف تقلیدی طور پر جانتے اور تسلیم کرتے ہیں تو

ان میں اور ایک عام مسلمان میں کیا فرق ہے؟

میں اس موقع پر نہایت اختصار کے ساتھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن مجید کا من حیثیت البلاغت معجزہ ہونا کس طرح سے ثابت کیا جاسکتا ہے۔ عرب میں جن شعرا کو ہمعصروں میں اشعر الشعرا ثابت کرنا چاہتے ہیں، اس طرح ثابت کرتے ہیں کہ شعر کے چار عمود یا چار ارکان ہیں: فخر، مدح، نسیب، ہجو اور ان چاروں مضامین کو جس کمال کے ساتھ اس شاعر نے ادا کیا ہے، اس کے ہمعصروں میں سے کسی نے نہیں کیا چناں چہ جریر کے اشعر العصرین ہونے کے ثبوت میں یہ اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

اذا غضبت علیک نبی تمیم — حسبت الناس کلھم غضابا

الستم خیر من مرکب المطایا — واندی العالمین بطون راح

ان العیون التی فی طرفھا حور — قتلننا ثم لم یحیین قتلانا

یصرعن ذااللب حتی لاحراک له — وھم اضعف خلق الله ارکانا

فغض الطرف انک من نمیر — فلا کعبا بلغت ولا کلابا

شعرا کی افضلیت ثابت کرنے کے لیے تو اسی قدر کافی ہے، لیکن قرآن مجید کی شان بہت ارفع اور اعلیٰ ہے اور قرآن مجید کی نسبت ہمارا دعویٰ بہت وسیع ہے۔ ہم اس بات کے مدعی نہیں ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جس قدر شاعر اور خطیب تھے وہ قرآن مجید کے معارضے سے عاجز رہے۔ بلکہ ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ جاہلیت میں، اسلام میں، عربی میں، فارسی میں، یورپ میں، ایشیا میں کبھی کوئی کلام قرآن مجید کے مثل نہیں لکھا گیا اور نہ آئندہ لکھا جاسکتا ہے۔ یہ دعویٰ حقیقت میں وجدانی ہے۔ جس شخص کو ادب اور عربیت میں پوری مہارت ہو اور مذاق بھی صحیح ہو خود اس کا وجدان اس دعوے کی شہادت دے گا لیکن وجدان ایک ایسی چیز ہے جو مخالفت پر حجت نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اس دعوے کے اثبات کا یہ طریقہ ہے کہ اخلاق و موعظت، ترغیب و تہدید، لطف و قہر وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے بہت سے عنوان متعین کیے جائیں اور ان کے متعلق انسانی کلام میں اعلیٰ سے اعلیٰ اور بلند سے بلند اشعار یا تحریریں جو موجود ہیں، انتخاب کیے جائیں، پھر انھیں مضامین کے متعلق قرآن مجید میں جو آیتیں ہیں، ان سے موازنہ کر کے دکھایا جائے کہ وہ تمام اشعار اور تحریریں قرآن مجید کی بلاغت سے کچھ نسبت نہیں رکھتیں۔ اسی طرح بلاغت کے جو بڑے بڑے ارکان ہیں یعنی اسالیب جو اعلیٰ درجے کی بلاغت کے محل ہیں مثلاً ایجاز و اطناب، فصل و وصل، تشبیہ و استعارہ وغیرہ وغیرہ ان کے متعلق عرب و عجم کے کلام سے وہ مثالیں انتخاب کی جائیں جو نمونۂ مثل خیال کی جاتی ہیں اور انھیں اسالیب پر قرآن میں جو آیتیں ہیں ان سے موازنہ کیا جائے۔

قرآن مجید کی بلاغت کے ثبوت کے یہ طریقے ہیں اور جب تک قرآن مجید کے وجوہ اعجاز پر توجہ نہ کی جائے تو قرآن مجید کے ساتھ اعتنا کرنے کا دعویٰ صحیح نہیں ہو سکتا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا موجودہ نصاب میں ایسی کوئی کتاب داخل ہے جس سے قرآن مجید کے وجوہ اعجاز معلوم ہو سکیں؟ کیا بیضاوی و جلالین اس

مطلب کے لیے کافی ہیں ؟ افسوس اور سخت افسوس ہے کہ منطق اور فلسفہ جس سے اسلام کو بہت کم تعلق ہے اس کے لیے تو صغریٰ، کبریٰ، ایسا غوجی، قال اقول، میزان منطق، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی، میر قطبی، میبذی، ملا حسن، ملا جلال، میر زاہد، غلام یحییٰ، حمد اللہ، قاضی مبارک، صدرا، شمس بازغہ، شرح تجرید - یہ تمام دفتر لازمی اور ضروری قرار دیا جائے اور قرآن مجید کے لیے جو مدار اسلام ہے جلالین اور بیضاوی کے اڑھائی پارے کافی سمجھے جائیں -

(۵) ایک اور نقص طریقہ تعلیم میں ہے کہ قدیم علم کلام جو فلسفہ یونانی کے مقابلے میں ایجاد اور مدون ہوا تھا آج تک بغیر کسی اضافے اور ترمیم کے درس میں داخل ہے - حالاں کہ یہ ظاہر ہے کہ جو اعتراضات حال کی تحقیقات سے پیدا ہوتے ہیں ان کے لیے وہ علم کلام کیوں کر کافی ہو سکتا ہے جو اس وقت ایجاد ہوا تھا جب کہ یہ اعتراضات پیدا ہی نہیں ہوئے تھے - مثلاً یونانی آسمان کے معترف تھے صرف خرق التیام سے انکار تھا - مسلمانوں کو نزول ملائکہ اور امکان معراج کے لیے خرق اور التیام کے امکان کے ثبوت کی ضرورت تھی، چناں چہ علم کلام میں یہ امکان ثابت کر دیا گیا - لیکن آج یورپ والوں کو سرے سے آسمان کے وجود سے انکار ہے - اس لیے اب ہم کو آسمان کا وجود ثابت کرنا ضرور ہے - کیوں کہ قرآن مجید میں سیکڑوں جگہ آسمان کا ذکر ہے - آسمان کے ثبوت کے لیے قدیم علم کلام کس کام آسکتا ہے ؟ میں اس وقت اس بحث کو طول نہ دوں گا - مجھ کو معلوم ہے کہ نئے علم کلام کی ضرورت ہمارے علما بھی تسلیم کرتے جاتے ہیں - کان پور کے ایک مدرسے کا نصاب تعلیم جو حال میں شائع ہوا ہے، اس میں فلسفہ جدید اور اس کا رد بھی تعلیم میں داخل ہے - فلسفہ جدید کا رد یہی نیا علم کلام ہے -

(۶) ایک نقص نصاب تعلیم میں یہ ہے کہ وہ ایک خاص سلسلے پر محدود ہے - قدیم زمانے میں بہت سے لوگ صرف ایک یا دو فن کی تحصیل کرتے تھے اور تحصیل کا تمام زمانہ اس فن میں صرف کر دیتے تھے - فراء، کسائی، سیبویہ، خلیل امام بخاری، مسلم، طحاوی، نبردوی اور بہت سے اہل کمال اسی طرز کے تعلیم یافتہ ہیں اور در حقیقت یہ طرز ایک خاص فن میں کمال پیدا کرنے کے لیے نہایت مفید تھا - آج یہ طریقہ بالکل متروک ہے اور اہل کمال کے نہ پیدا ہونے کا یہ بھی ایک بڑا سبب ہے - ان وجوہ مذکورہ بالا کی بنا پر اس تجویز کی جس کو جناب مولانا شاہ محمد حسین صاحب نے پیش کیا تائید کرتا ہوں اور باصرار کہتا ہوں کہ موجودہ نصاب تعلیم ناقص ہے اور اس میں ضرور اصلاح اور اضافہ ہونا چاہیے (۳۳) -"

ممکن ہے مولانا کی یہ طویل تقریر گراں گزرے مگر پوری اس وجہ سے نقل کر دی گئی کہ یہ ان کے تجربات اور مشاہدات کے تحت علمی نظریات پر پہلی تقریر ہے اور بعد کی تقریریں اسی بنیادی تقریر کی تائید کرتی ہیں -

پہلے تو مولانا نے اسلام اور علم کے تعلق کو ثابت کیا اس کے بعد نصاب کی تبدیلی پر بحث کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے - ایک طرز تعلیم کے لحاظ سے دوسرے کتب درسیہ کے تعین کے

لحاظ سے۔ طرز تعلیم کو بدلنے پر زیادہ زور دیا ہے اور اس کی سب سے بڑی خرابی یہ بتلائی کہ اصل فن کے بجائے کسی خاص کتاب کے حسن وقبح پر بحث کی جاتی ہے حالاں کہ کتاب تو ذریعہ ہے اس فن کے حصول کا اور مقصد ہے فن سے واقفیت بلکہ اس کا کمال۔ چناں چہ ملا نظام الدین کے طریقۂ درس میں بھی کتابوں کی خصوصیت کا لحاظ نہیں رکھا جاتا تھا بلکہ کتاب کو ذریعہ قرار دے کر فن کی تعلیم دی جاتی تھی۔ بعد کو یہ طریقۂ درس باقی نہ رہا۔ لہذا مولانا نے نصاب میں دو چیزوں کو ضروری قرار دیا: پہلا تحصیل فن، دوسرا استحسان نظر اور قوتِ مطالعہ۔ چوں کہ دوسری چیز کا نصاب میں زیادہ خیال رکھا گیا تھا اور پہلے کی طرف توجہ نہیں کی گئی تھی، اس لیے فن میں کمال حاصل نہیں ہوتا۔ منطق کی کتابیں جو درس میں شامل تھیں، ان میں خلط مبحث تھا۔ ادب و عربیت کا حصہ بہت کم تھا۔ قرآن مجید اور اس کی تفسیر کی نصاب میں معمولی شمولیت تھی۔ قدیم علم کلام فلسفۂ یونان کے لیے ایجاد ہوا تھا اور اس دور میں سائنس کی روشنی میں مذہب پر اعتراضات ہو رہے تھے۔ لہذا جدید علم کلام کی تعلیم کی ضرورت تھی، جس کے تحت ان اعتراضات کا جواب دیا جاتا اور اس کے لیے جدید سائنس سے واقفیت اور دین سے پوری واقفیت کی ضرورت تھی اور اسی قسم کی کتابیں نصاب میں شامل کرنے کی ضرورت تھی، خواہ ایک یا دو فن کا حصول کیا جاتا مگر اس میں کمال پیدا کرنے کی ضرورت تھی اور ایک خاص سلسلے میں محدود کرنے کی ضرورت نہ تھی "مولانا شبلی کا مجوزہ دار العلوم" میں اس طرح لکھا ہے:

> "جس شرح و بسط کے ساتھ مولانا شبلی نے یہ مدلل تقریر کی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا شبلی نے نصاب کے جزئیات تک کو نہیں چھوڑا اور ایک ماہر تعلیم کی طرح اس کی خرابیوں کا جائزہ لینا مولانا شبلی کے علاوہ ممکن نہ تھا۔ اب وہ مولانا فاروق چریا کوٹی کے شاگرد نہ تھے، بلکہ ماہر تعلیم اور صاحبِ فن تھے۔ ان کی نگاہ اب محدود نہ تھی، بلکہ وسعتِ نظر میں ہندوستان کی درسگاہوں کے نصاب کے علاوہ روم و مصر و شام کے قدیم و جدید نصاب بھی تھے۔ اب وہ قدیم درسگاہ کے پڑھے ہوئے منطقی عالم ہی نہ تھے بلکہ کالج کے پروفیسر بھی تھے۔ اب وہ مقلدوں اور غیر مقلدوں کی بحثوں میں حصہ لینے والے مولوی نہ تھے بلکہ آہین بالجہر پر خوش ہونے والے مسلمان تھے۔ اگر جدید تعلیم یافتہ حضرات کا علما کو دیا ہوا اختراعی نام "تنگ نظر مولوی" صحیح تسلیم کر لیا جائے تو وہ اب "تنگ نظر مولوی" بھی نہ تھے (۳۲)۔"

آگے چل کر اسی مضمون میں ہے:

"ندوۃ کی روئداد سال اول ہی میں ایک دلچسپ چیز دیکھنے میں آتی ہے کہ مولانا کی نصاب پر تقریر کے بعد ایک خاص اجلاس میں اصول تقرر نصاب پر بحث ہوئی اور چند اصول پیش ہوئے - اول آیا علوم زیر درس پر کسی اور علم کا اضافہ ہونا ضروری ہے یا نہیں، ثانی اگر ہونا چاہیے تو وہ کیا علوم ہیں، ثالث مدت تحصیل کیا ہونا چاہیے - پہلے امر کی نسبت اتفاق عام ہوا کہ اضافہ ضرور ہونا چاہیے، دوسرے امر کے متعلق مختلف علوم کے نام لیے گئے ان میں سے بعض علوم یعنی رجال، اصول تفسیر و فن، تاریخ و جغرافیہ (بشرطیکہ عربی زبان میں ہوں) کی نسبت اتفاق عام ہوا کہ درس میں اضافے کیے جائیں - لیکن جب علوم جدیدہ کی تجویز مولوی منصور علی صاحب مراد آبادی نے پیش کی تو اختلاف رائے ہوا ان پر جو رائے لی گئی تو اتفاق کرنے والوں میں مولانا شبلی اور اختلاف کرنے والوں میں مولوی فاروق صاحب چریا کوٹی نظر آتے ہیں (۳۵) -"

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

"اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا شبلی میں یہ بات پیدا ہو گئی تھی کہ وہ حق بات کہنے میں استاد سے بھی اتفاق نہ کرتے تھے - استاد کی عزت و احترام اپنی جگہ پر لیکن حق بات کی حمایت میں بڑوں سے ٹکرا جانا یہ مولانا ہی کے دل گردے کا کام تھا (۳۶) -"

آگے چل کر پھر ہے:

"مولانا جو انقلاب چاہتے تھے اس میں تین اہم چیزیں تھیں: (۱) تمام عربی مدارس میں نصاب کی تبدیلی، (۲) دارالعلوم قائم کرنا، (۳) دارالعلوم کے شایاں شان کتب خانہ قائم کرنا - یہ تینوں چیزیں ان کے نزدیک لازم و ملزوم تھیں (۳۷) -"

مولانا اس تقریر سے پورے جلسے پر چھا گئے مولانا کی تقریر ہی کا اثر تھا کہ مولوی عبدالغنی صاحب مرشد آبادی نزیل بھیم پور نے مولانا کی بڑی تعریف کی اور علماء کی بڑی خبر لی (۳۸) - اس جلسے میں شرکت کے لیے مولانا حالی کو بھی دعوت دی گئی تھی مگر وہ بعض خانگی ضرورتوں کی وجہ سے شرکت نہ کر سکے اور ایک تحریر لکھ کر بھیجی جو روئداد میں شامل ہے (۳۹) -

چوں کہ ہر مکتبہ خیال کے لوگوں کو ندوۃ العلماء کے معاملے میں متفق کرنا، ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانا اور ان سے مشورہ کرنا مقصود تھا، اس لیے ناظم ندوۃ العلماء مولوی محمد علی مونگیری نے سرسید کو ندوۃ العلماء کے متعلق خط لکھا اور جلسہ سال اول کی روئداد بھی بھیجی -

اس کا جواب سرسید نے ۲۱۔ دسمبر کو دیا جس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔ لکھتے ہیں:

مجناب مولانا مخدوم و مکرم من مولوی محمد علی صاحب، ناظم ندوۃ العلماء

بعد سلام مسنون عرض یہ ہے کہ آپ کا نوازش نامہ اور حصہ اول روئداد ندوۃ العلماء پہنچا۔ ممنون عنایت ہوا۔ اس پر ریویو لکھنا اور فرائض ریویو نویسی کو پورا پورا ادا کرنا کسی قدر مشکل اور نامناسب ہے۔ ایک عمدہ کام شروع ہوا ہے اس کو چلنے دینا چاہیے۔ خدا اس کا نیک نتیجہ پیدا کرے۔ میں اس کی رسید اخبار میں چھاپوں گا۔ اور نواب محسن الملک، مولوی سید مہدی علی کانفرنس (۴۰) کے اجلاس میں ایک ریزولیشن پیش کریں گے کہ تمام مسلمانوں کو ندوۃ العلماء کی تائید کرنی چاہیے۔ غالباً سب لوگ اس سے اتفاق کریں گے اور جو آپ کا ارشاد ہے اس پیرایہ میں اس کی تکمیل ہو جائے گی۔ اگرچہ مجھ کو کچھ توقع نہیں ہے کہ باہم علما کا اتفاق ہو۔ الا کوشش ضرور ہو (۴۱)۔"

اپریل ۱۸۹۴ء میں ندوۃ العلماء کا پہلا اجلاس کان پور میں ہوا اور جولائی ۱۸۹۴ء (۴۲) میں مولانا کا سفرنامہ روم و مصر و شام پہلی مرتبہ شائع ہوا۔ اس کے دیباچے میں مولانا سفرنامہ لکھنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"رمضان المبارک ۱۳۸۲ھ / ۱۸۹۳ء میں میں نے قسطنطنیہ وغیرہ کا جو سفر کیا وہ محض طالب علمانہ سفر تھا اور چوں کہ نہ یہ کوئی غیر معمولی امر تھا، نہ واقعات سفر میں چنداں ندرت تھی۔ سفرنامہ لکھنے کا میرا ارادہ نہ تھا لیکن وہاں سے واپس آ کے جن بزرگوں اور دوستوں سے ملنے کا اتفاق ہوا، سب سفرنامے کے متقاضی تھے۔ میں نے خیال کیا کہ چوں کہ ایک مدت سے ہماری جماعت میں سیر و سیاحت کا طریقہ بند ہے اور اس وجہ سے اسلامی ممالک کے صحیح حالات سے بالکل اطلاع نہیں حاصل ہوتی، لوگوں کا یہ تقاضا کچھ بے جا نہیں۔ مجھ کو خود اپنی حالت یاد آئی کہ سفر سے پہلے قسطنطنیہ وغیرہ کا کوئی سیاح مل جاتا تو میں گھنٹوں وہاں کے حالات پوچھا کرتا۔

یہ اسباب تھے جنھوں نے مجھ کو ان اوراق پریشان کی ترتیب پر آمادہ کیا ورنہ ایسے عاجلانہ اور معمولی سفر کے حالات قلم بند کرنے اور ان کو سفرنامہ یا کتاب الرحلہ کا لقب دینا تنگ ظرفی سے خالی نہ تھا۔ سفرنامے میں جس قسم کی اطلاعیں لازمی اور ضروری ہیں، یعنی ملک کی دماغی حالت، انتظام کا طریقہ، عدالت کے اصول، تجارت کی کیفیت، عمارتوں کے نقشے ان میں سے ایک چیز بھی اس سفرنامے میں نہیں، البتہ معاشرت اور علمی حالت کے متعلق معتدبہ واقعات ہیں، اگرچہ وہ بھی اس تفصیل

کے ساتھ نہیں ہیں جس قدر ہونے چاہئیں - غرض جو شخص سفرنامے کی حیثیت سے دیکھنا چاہتا ہے وہ اس کتاب سے پورا لطف نہیں اٹھا سکتا - البتہ جن لوگوں کو اسلامی ممالک کے معمولی واقعات میں بھی مزہ آتا ہے ان کی دعوت میں یہ ماحضر پیش کیا جاسکتا ہے - کہ مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ (۴۳)"۔

مولانا کی ترکوں سے محبت اور یورپ کا ان کا خلاف پروپیگنڈا ان سے کیسے برداشت ہوتا جبکہ وہ قدیم طرز تحقیق کے پرستار اور جدید اصول تحقیق کے واقف کار تھے (۴۴) - ان کی نگاہ سے یورپ کی اس معاملے میں بددیانتی کیسے چھپی رہتی جب کہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر آئے تھے۔ لہٰذا جوش آہی گیا - فرماتے ہیں:

"یورپ نے کسی زمانے میں مسلمانوں کے خلاف جو خیالات قائم کر لیے تھے ایک مدت تک وہ اعلانیہ اس طریقے سے ظاہر کیے جاتے تھے کہ مذہبی تعصب کا رنگ صاف نظر آتا تھا اور اس وقت قبول عام کا یہی سب سے بڑا عمدہ ذریعہ تھا - لیکن جب یورپ میں مذہب کا زور گھٹ گیا اور مذہبی ترانے بالکل بے اثر ہو گئے تو اس پالیسی نے دوسرا پہلو بدلا - اب یہ طریقہ چنداں مفید نہیں سمجھا جاتا کہ مسلمانوں کی نسبت صاف صاف متعصبانہ الفاظ لکھے جائیں، بلکہ بجائے اس کے یہ دانش مندانہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ اسلامی حکومتوں، اسلامی قوموں اور اسلامی معاشرت کے عیوب تاریخی پیرائے میں ظاہر کیے جاتے ہیں اور عام تصنیفات، قصوں، ناولوں، ضرب المثلوں کے ذریعے سے وہ لٹریچر میں اس طرح جذب ہو جاتے ہیں کہ تحلیل کیمیاوی سے بھی جدا نہیں ہو سکتے - اگرچہ یہ طریقہ کل اسلامی قوموں سے برتا جاتا ہے، لیکن اس وقت ہم کو خاص ترکوں سے بحث ہے - یورپین لٹریچر پڑھ کر ترکوں کی نسبت تحقیر کے خیالات نہ پیدا ہونے بعینہٖ ایسا ہے جیسا خواب آور دوا کھا کر نیند کا نہ آنا (۴۵)۔

مختلف الخیال مصنفین کے متعلق بھی فرماتے ہیں:

"یورپ کے مصنفین کا دائرہ بہت وسیع ہے اور اس وجہ سے ان میں متعصب، نیک دل، ظاہر بین، دقیق النظر ہر درجہ اور ہر طبقہ کے لوگ ہیں - مثلاً آج کل کے بچے سے بچے یورپین مصنف کی راست بیانی یہ ہے کہ وہ ترکی حکومت کے ذکر میں قرضہ کی گرانباری صنائع و فنون کا بقدر کافی موجود نہ ہونا، اضلاع میں تعلیم کی عدم وسعت، آلات و اسلحہ میں یورپ کی احتیاج ان تمام امور کو بالکل راست راست لکھتا ہے، لیکن جو اصلاحیں حال میں ہوئی ہیں ان کے ذکر سے اس طرح دامن بچا جاتا

ہے کہ گویا اصلاح کا سرے سے وجود ہی نہیں۔ خزانے کا انتظام، نظام اصلاح میں زراعتی بنکوں کا قائم ہونا اور مدارس رشیدہ کی تعداد کا ۹۲ سے ۵۰۰ تک ترقی کر جانا، بڑے بڑے کالجوں کا جاری ہونا، ریلوے کی وسعت، ادائے قرضہ کے انتظامات، فوجی قوت کی ترقی ان واقعات کو بھول کر نہیں لکھنا۔ کسی قوم یا کسی شخص کے قابل مدح یا ذم ثابت کرنے کا یہ نہایت آسان طریقہ ہے کہ اس کے حالات اور واقعات کی ایک فرضی تصویر کھینچی جائے اور انصاف یہ ہے کہ یورپ نے اس فریب آمیز طریقے کو دنیا کی تمام قوموں سے زیادہ برتا ہے (۳۶)۔"

طبیعت کے جوش اور اس کڑی تنقید کے باوجود مولانا نے انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور حقائق سے روگردانی نہیں کی اور وہاں کی خرابیوں کو چھپانے کی کوشش نہیں کی، چنانچہ لکھتے ہیں:

ترکی کے سفر سے جو اثر میرے دل پر ہوا اس کا بیان ظاہر کرنا چنداں ضرور نہیں، اس سفرنامہ کے پڑھنے سے خود اس کا پتہ لگ سکتا ہے۔ البتہ اس قدر کہنا ضرور ہے کہ سلطنت کی حیثیت سے اگر قطع نظر کی جائے تو مسلمانوں کی حالت وہاں بھی کچھ زیادہ مسرت اور اطمینان کے قابل نہیں ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ بہت سی باتوں میں ہندوستان کے مسلمانوں کے قریب قریب ہے۔ صنعت سے ان کو کچھ واسطہ نہیں، تجارت میں ان کا بہت کم حصہ ہے، معمولی دوکاندار تک یہودی یا عیسائی ہیں، پرانی تعلیم نہایت ابتر ہے اور ہوتی جاتی ہے، نئی تعلیم کے متعلق جو شکایتیں یہاں ہے وہاں بھی ہے، پرانی تہذیب اور نئی تہذیب میں ابھی تک رقابت ہے اور دونوں سے مل کر کوئی مرکب مزاج پیدا نہیں ہوا ہے، پرانے خیال والے ابھی تک زمانے کی رفتار سے بے خبر ہیں، نئے مذاق کے لوگ جس قدر بکتے ہیں کرتے نہیں ہمت، غیرت، جوش، عزم اور استقلال کے بجائے کل قوم پر (من حیث المجموع) افسردگی سی چھائی ہوتی ہے، جو شخص جس حال میں ہے اسی پر قانع ہے۔ موجودہ حالت تو یہ ہے: ولعل اللہ یحدث بعد ذالک امرا (۳۷)۔

باوجود احتیاطوں اور مصلحتوں کے مولانا کا قلم بے باک رقم ترکوں کی مدافعت کے پروپیگنڈے کے خلاف اٹھ ہی گیا اور اس نے نہ صرف یورپ کے ڈالے ہوئے دبیز پردوں کو اٹھا دیا بلکہ یورپ کی بددیانتی کے بخیے ادھیڑ کر دیے۔ اس دیباچے سے یورپ کو عموماً اور انگریزی حکومت کو خصوصاً پسینہ آگیا ہوگا اور یہ اس شمس کی تمازت تھی جس کو کچھ ہی دن پہلے آسمان پر چڑھایا گیا تھا۔

مولانا کا سفرنامہ لوگوں میں بہت مقبول ہوا۔ مہدی حسن (۴۸) نے خط لکھ کر طلب کیا مولانا کی طرف سے جواب میں دیر ہوئی تو انھوں نے تار دینے کی دھمکی دی۔ مولانا سفر میں تھے، اس لیے جواب نہ دے سکے تھے۔ آگرے سے منگوا کر بھیجنے کا وعدہ کیا اور تار دینے سے روک دیا (۴۹)۔

حواشی:

۱۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۲۱۱
۲۔۔۔ مولانا شبلی کا ایک مخالف (انگریز) از راقم، غیر مطبوعہ
۳۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۲۲۷
۴۔۔۔ Divide and Rule کی پالیسی والوں کو اتحاد اسلامی کیسے گوارا ہو سکتی ہے۔
۵۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۲۲۷
۶۔۔۔ محمد حسین آزاد کو ۱۸۸۷ء میں شمس العلماء کا خطاب مل چکا تھا (تاریخ ادب اردو، حصہ نثر، صفحہ ۲۸)۔ ذکا اللہ، ڈپٹی نذیر احمد کو ۱۸۹۷ء میں شمس العلماء کا خطاب ملا۔ (برحاشیہ صفحہ ۲۳۸، حیاتِ شبلی) اور مولانا حالی کو جون ۱۹۰۴ء میں شمس العلماء کا خطاب ملا (حالی بحیثیت شاعر، صفحہ ۵۰) حالی کا ذہنی ارتقا، صفحہ ۸۱۷ پر یکم جولائی ۱۹۰۴ء کو خطاب کا ملنا لکھا ہے۔
۷۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۲۳۹
۸۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۲۴۰
۹۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۲۴۰-۲۴۱
۱۰۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۲۴۳
۱۱۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۲۴۴-۲۴۵
۱۲۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۲۴۶
۱۳۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۲۴۷ تا ۲۴۹
۱۴۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۲۴۹ تا ۲۵۱
۱۵۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۲۵۱ تا ۲۵۳
۱۶۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۲۵۳-حالی کا ذہنی ارتقا برحاشیہ صفحہ ۳۵-اس کا ذکر حالی بحیثیت شاعر از ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی میں نہیں ہے۔
۱۷۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۲۵۵ تا ۲۵۸
۱۸۔۔۔ مکاتیبِ شبلی، حصہ اول، صفحہ ۹۳
۱۹۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۲۶۲ تا ۲۶۳
۲۰۔۔۔ کلیاتِ شبلی اردو، صفحہ ۲۱ تا ۲۴
۲۱۔۔۔ کلیاتِ شبلی اردو، صفحہ ۲۸ تا ۲۹
۲۲۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۲۵۸
۲۳۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۲۶۱-۲۶۲
۲۴۔۔۔ ماہنامہ ادیب علی گڑھ، اکتوبر ۱۹۶۰ء برحاشیہ صفحہ ۳۰
۲۵۔۔۔ مکاتیبِ شبلی، حصہ اول، صفحہ ۵۱
۲۶۔۔۔ سفرنامہ روم و مصر و شام از شبلی پہلے پہل ۱۸۹۴ء میں شائع ہوا۔
۲۷۔۔۔ سیرت مولانا سید محمد علی مونگیری از سید محمد حسنی، مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

اپریل ۱۹۶۳ء، صفحہ ۱۱۶

۲۸ــــ ایضاً، صفحہ ۱۱۵

۲۹ــــ روئداد ندوۃ العلماء بابت سال، حصہ اول، ۲۰بحوالہ، سیرت مولانا سید محمد علی مونگیری، صفحہ ۱۱۷

۳۰ــــ سفرنامہ، صفحہ ۱۸۶ تا ۱۸۷ ۳۱ــــ سفرنامہ، صفحہ ۱۸۸

۳۲ــــ حصہ دوم روئداد ندوۃ العلماء منعقدہ ۱۵ تا ۱۷-شوال ۱۳۱۱ھ مطابق ۲۲ تا ۲۴-اپریل ۱۸۹۴ء، واقع کان پور بابت سال اول، باہتمام آسی محمد عبد العلی مداری - مطبع اصح المطابع، محمود نگر لکھنو- صفحہ ۳

۳۳ــــ ایضاً ۳۴ــــ ماہنامہ ادیب علی گڑھ، اکتوبر ۱۹۶۰ء- صفحہ ۲۸

۳۵ــــ ماہنامہ ادیب علی گڑھ، اکتوبر ۱۹۶۰ء- صفحہ ۲۹-۳۰ ۳۶ــــ ایضاً، صفحہ ۳۰

۳۷ــــ ایضاً، صفحہ ۳۰ ۳۸ــــ روئداد ندوۃ العلماء سال اول منعقدہ کان پور

۳۹ــــ ایضاً، صفحہ ۱۹ ۴۰ــــ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس

۴۱ــــ معارف نمبر۱، جلد ۴، صفحہ ۳۷، آثار علمیہ ادبیہ نامہ، سرسید-

۴۲ــــ ماہنامہ ادیب علی گڑھ، صفحہ ۲۶، اکتوبر ۱۹۶۰ء

۴۳ــــ سفرنامہ، مطبع معارف، اعظم گڑھ- ۱۹۴۰ء، صفحہ ۲

۴۴ــــ پروفیسر آرنلڈ نے خوب واقف کرادیا تھا- ۴۵ــــ سفرنامہ، صفحہ ۳

۴۶ــــ سفرنامہ، صفحہ ۳-۴ ۴۷ــــ سفرنامہ، صفحہ ۸

۴۸ــــ افادات مہدی ہوالے ۴۹ــــ مکاتیب شبلی، حصہ دوم- صفحہ ۱۹۷-۲۷، اکتوبر ۱۸۹۴ء

۱۸۹۵ء

مولانا ۱۸۹۵ء میں ۱۵۔ مارچ سے قبل لاہور گئے اور وہاں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں شرکت کی(۱)۔ اس اجلاس میں سرسیدؒ اور ان کے دیگر رفقا نے بھی شرکت کی۔ اسی سال وہ الہ باد یونیورسٹی کے فیکلٹی آف آرٹس (شعبہ، فنون) اور بورڈ آف اسٹیڈی (شعبہ، تدریس) کے ممبر ہوئے اور الہ باد یونیورسٹی کے فیلو بھی مقرر ہوئے(۲)۔

اسی زمانے میں ماسٹر محمد شفیع نے عثمان کے بچے کی ولادت کے سلسلے میں نظم کی فرمائش کی۔ مولانا ان کے خط کو پاکر خوش ہوئے اور لکھا کہ وہ خط ضرور لکھا کریں، کیوں کہ مولانا کو ان سے دلچسپی ہوتی تھی۔ مگر نظم کے سلسلے میں عذر کیا اور لکھا کہ طبیعت اس طرف مائل نہیں ہوتی۔ ہاں اگر مولوی اسحٰق یا مہدی کے یہاں ولادت ہو تو ممکن ہے کہ کچھ تحریک ہو اور شعر کہہ سکیں ورنہ شعر کہنا دشوار تھا۔ اس درمیان میں کابل کی موقوفی کی اطلاع ملی جس پر مولانا کو افسوس ہوا اور متعجب ہوئے کہ پہلے سے اس قسم کا شبہ نہ تھا اور نہ اندیشہ۔

سرسید کے ساتھ لاہور جانے اور انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسے میں شرکت کی اطلاع دی۔ سالانہ انتخاب میں الہ باد یونیورسٹی کے فیکلٹی آف آرٹس اور بورڈ آف اسٹیڈی کے ممبر ہونے کی بھی اطلاع دی اور نصاب کے متعلق ایک تفصیلی یادداشت تیار کرنے کا ارادے کا اظہار کیا(۳)۔

مولوی حمید الدین فراہی کا عربی ایم۔ اے کے امتحان میں شریک ہونے کا ارادہ تھا، لہذا مولانا نے معلومات کیں تو پتا چلا کہ بحیثیت طالب علم امتحان میں نہیں شریک ہو سکتے تھے۔ اس کے لیے کم از کم ۶ ماہ کی مدت کی قید تھی اور امتحان اکتوبر میں ہونے والا تھا۔ البتہ امتحان میں پرائیوٹ شریک ہونے کا امکان تھا، کیوں کہ قاعدے کے تحت اس میں مدت کی قید نہ تھی۔ لیکن اس کے لیے بھی ضروری تھا کہ امتحان سے دو تین مہینے پہلے پرنسپل کے دستخط سے شریک ہونے والے کا نام یونیورسٹی بھیج دیا جاتا۔ چوں کہ مولوی صاحب ان دنوں مدرستہ الاسلام (سندھ مدرسہ) کراچی میں عربی کے پروفیسر تھے، اس لیے ان کے لیے یہ بات آسان تھی کہ وہ امتحان میں پرائیوٹ طور پر شریک ہوں۔ اس کے بعد نصاب کی کتابوں کی تفصیل بھی لکھی(۴)۔

کلکتہ یونیورسٹی کا تعلیمی کیلنڈر چوں کہ علی گڑھ کالج میں موجود نہ تھا، اس لیے اس کے متعلق مولانا کوئی رائے نہ دے سکے۔ لیکن اپنی یادداشت کی بنا پر نصاب لکھا اور یہ بھی لکھا کہ خود ہی رجسٹرار کلکتہ یونیورسٹی سے پراسپکٹس منگوالیں۔ وقتی طور پر متنبی اور حماسہ کے مطالعے میں مشغول ہونے کا مشورہ دیا۔ یہ بھی لکھا کہ ایک پرچہ مضمون کا جو پورے پانچ گھنٹے کا ہوتا تھا اس میں عرب کی یا مسلمانوں کی تاریخ یا عربی ادب اور عربی قواعد کی تاریخ ہوتی تھی۔ مگر یہ مضمون چوں کہ انگریزی میں لکھنا پڑتا تھا اس لیے انگریزی لکھنے کی مشق بھی اس کے لیے ضروری تھی۔

مولانا کسی ضرورت سے اعظم گڑھ گئے ہوئے تھے لیکن وہاں بھی کالج کے حالات معلوم کرنے کے لیے بے چین تھے۔ چناں چہ سرسید کو لکھا کہ علی گڑھ گزٹ کو ایک ماہ کے لیے اعظم گڑھ کے پتے پر جاری کر دیا جائے اور چوں کہ اب تک اگست کی تنخواہ نہیں ملی تھی وہ بھی طلب کی (۵)۔ اسی زمانے میں علی گڑھ کالج میں کلرک نے ایک لاکھ کا غبن کیا تھا۔ اس سے سرسید اور ان کے رفقا پریشان تھے کیوں کہ خون پسینہ ایک کر کے ایک ایک پیسہ جمع کیا گیا تھا اور اس کے حساب کے لیے قوم کے سامنے جواب دہ تھے۔ مولانا بھی اس گڑبڑ سے متاثر اور فکرمند رہے اور سرسید کی توجہ دلائی کہ دوسرے صیغوں میں بھی گڑبڑ تھی، مگر سرسید کے علم میں لانے کی ہمت نہ ہوئی تھی۔ اس لیے مولانا چاہتے تھے کہ قاعدے کے مطابق کم از کم سال میں ایک بار حساب کی جانچ پڑتال ہونا ضروری تھی۔

سرسید نے اس کے جواب میں ۱۵۔ ستمبر ۱۸۹۵ء کو دوسرے صیغوں کے نام دریافت کیے جن میں مولانا کے نزدیک گڑبڑ تھی (۶)۔ مولانا کے ماموں نے ان کو اعظم گڑھ بلایا۔ اسی زمانے میں بڑی کشمکش میں مبتلا تھے، اس لیے کہ ان کی پہلی بیوی مجیدن بی بی کا انتقال ہو گیا تھا اور وہ دوسری شادی پر آمادہ نہ ہو رہے تھے۔ اور آمادہ نہ ہونے کا سبب علی گڑھ کالج میں رہ کر اہلیہ کی اہلیت کے لیے ایک خاص معیار کا قائم ہو جانا بھی تھا۔ ان کے ماموں نے پندرہ روپے وصول کرا دینے (غالباً اسکول کا چندہ) کا ذمہ لیا تھا۔ مولانا نے اس کا تقاضا کیا اور لکھا کہ وعدہ کے موافق وہ ذمہ دار تھے۔ مولانا اس زمانے میں پردے کے بڑے موافق تھے، لہٰذا اس کے متعلق بھی لکھا کہ اس کی پابندی کی کوشش ماموں کے گاؤں میں بھی جاری رہنا چاہیے۔ اگر کہیں بے پردگی شروع ہو گئی تو پھر دوسرے گاؤں کے لوگ بھی اس کو معیوب نہ سمجھیں گے اور یہ رسم چل جائے گی۔ لہٰذا ذمہ داری اسی گاؤں کے سر عائد ہو گی جو ابتدا کرے گا (۷)۔ مولانا اس زمانے میں مختصر

تصنیف میں معروف تھے اور امید کر رہے تھے کہ وطن پہنچنے تک شاید مکمل کر لیں ۔ اس انداز پر لکھ رہے تھے کہ ماموں کی پسند اور خوشنودی کا باعث ہوتی ۔ یہ مختصر تصنیف غالباً کتب خانہ اسکندریہ تھی جو مسلمانوں کے اسکندریہ کے کتب خانہ کے جلانے کے الزام کے رد میں تھی ۔ یہ الزام ایک زمانے میں یورپین اقوام مسلمانوں پر لگاتی چلی آرہی تھیں اور مقصد اس سے یہ تھا کہ دنیا کو بتلائیں کہ مسلمان کتنے جاہل اور وحشی تھے کہ انھوں نے اسکندریہ کے کتب خانے کی قدر نہ کی اور اس کو نذر آتش کر دیا ۔ اس طرح مسلمانوں کی جہالت اور بربریت ثابت کرنے میں مدد ملتی تھی ۔ مولانا نے ثابت کیا کہ اس کتب خانے کو خود عیسائیوں نے جلایا تھا ۔

مولانا نے ندوۃ العلماء کے دوسرے اجلاس میں بھی شرکت کی اور جو تقریر کی وہ مضامین اربعہ کے نام سے شائع کی گئی ، جس میں پہلا مضمون مولوی ابو محمد ابراہیم اور دوسرا مولوی محمد اعظم حسین اور تیسرا مولانا شبلی اور چوتھا مولوی شاہ محمد سلیمان پھلواری کا ہے ۔ یہ جلسہ ١٦ ، ١٧ ، ١٨ شوال ١٣١٢ھ مطابق اپریل ١٨٩٥ء میں لکھنؤ میں ہوا ۔ مولانا نے "زمانہ موجودہ کے لحاظ سے ہمارے فرائض کیا ہیں ؟ " پر تقریر کی ۔ مولانا کی یہ تقریر بڑی دلچسپ ، پر از معلومات ہے ۔ لکھتے ہیں :

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ والصلوٰۃ علی رسولہ وآلہ واصحابہ

جناب صدر انجمن و دیگر بزرگان قوم !

آج اس وقت مجھ کو جس مضمون پر تقریر کرنے کی اجازت دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ زمانہ موجودہ کے لحاظ سے علما کے فرائض کیا ہیں ۔ یعنی زمانہ موجودہ کی ضرورتوں کے لحاظ سے علما پر کیا ذمہ داریاں ہیں ؟ ملک اور جماعت اسلامی کا ان پر کیا حق ہے ؟ قوم کو ان کے لیے کیا کرنا ہے ؟ اور اس وقت تک انھوں نے قوم کے لیے کیا کیا ہے ؟ یہ سوالات نہایت اہم ہیں اور کچھ شبہ نہیں کہ جماعت اسلام کی بہبودی کا بہت کچھ بلکہ تمام تر دار و مدار ان ہی سوالات پر ہے ۔

اے حضرات ! جس زمانے میں یہاں اسلامی حکومت قائم تھی اس وقت قوم کے دینی و دنیوی دونوں قسم کے معاملات علما کے ہاتھ میں تھے ۔ نماز وغیرہ کے احکام بتانے کے علاوہ علما ہی ان کے مقدمے فیصل کرتے تھے ، علما ہی جرائم پر حدود و تعزیری کی سزا دیتے تھے ، علما قتل اور قصاص کے احکام صادر کرتے تھے ۔ غرض یہ کہ قوم کی دین و دنیا دونوں کی عنان اختیار علما کے ہاتھ میں تھی ۔ اب جب کہ انقلاب حکومت ہو

گیا اور دنیوی معاملات گورنمنٹ کے قبضہ۔ اختیار میں آگئے تو ہم کو دیکھنا چاہیے کہ قوم سے علما کا کیا تعلق باقی ہے۔ یعنی گورنمنٹ نے کس قدر اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے ہیں اور کس قدر باقی رہ گئے ہیں جو درحقیقت علما کا حق ہے اور جس میں دست اندازی کرنی خود گورنمنٹ کو مقصود نہیں۔

علما کی موجودہ حالات، ان کی عزلت نشینی بلکہ بے پروائی نے عام طور پر یہ یقین دلایا ہے کہ ان کو جو تعلق قوم سے باقی رہ گیا ہے وہ صرف مذہبی تعلق ہے۔ یعنی یہ کہ صرف نماز، روزہ کے مسائل بتایا کریں۔ باقی معاملات ان کے دسترس سے باہر ہیں ان کو ان معاملات میں دست اندازی کا کوئی حق حاصل نہیں۔

لیکن میرے نزدیک یہ خیال غلط اور محض غلط ہے۔ گورنمنٹ نے جو حقوق اپنے لیے مخصوص کر لیے ہیں بے شبہ ان سے علما کو کچھ تعلق نہیں ہے۔ لیکن وہ حقوق ہیں کیا ؟ مال گزاری کا وصول کرنا، امن و امان کا قائم رکھنا، دنیوی معاملات کے فیصلے کے لیے عدالتوں کا قائم کرنا، عہدیداران ملکی کا مقرر کرنا۔ یہ اور خاص اسی قسم کے امور ہیں جو گورنمنٹ نے اپنے اختیار میں لے لیے ہیں۔ لیکن قوم کی زندگی کے اجزا صرف اسی قدر نہیں ہیں۔

قوم کی اخلاقی زندگی جو تمام ترقیوں کی جڑ ہے، قوم کی علمی حالت جس پر ترقی و تنزل کا دارومدار ہے، قومی مراسم و دستورات جس سے قوم بنتی یا بگڑتی ہے اور سب سے زیادہ قوم کی دماغی زندگی یعنی خیالات کی وسعت، بلند حوصلگی، روشن ضمیری، آزاد خیالی، ان تمام اوصاف کے سرچشمے ہمارے علما اور علما کی تلقین و بدولت ہے۔ شادی بیاہ وغیرہ کی وہ مسرفانہ رسمیں جنھوں نے سیکڑوں، ہزاروں خاندان تباہ کر دیے ہیں، گورنمنٹ کا ان پر کچھ زور نہیں چل سکتا۔ لیکن الحمد للہ اس گئی گزری حالت میں بھی علما کو قوم پر وہ اختیار حاصل ہے کہ آج اگر تمام علما متفق ہو کر کربستہ ہو جائیں تو تمام ہندوستان میں اس سرے سے اس سرے تک یہ خانہ برانداز رسمیں یک لخت معدوم ہو جائیں۔ قوم کے اخلاق جو روز بروز تباہ ہوتے جاتے ہیں۔ گورنمنٹ اور گورنمنٹ کی تعلیم مطلق اس کی اصلاح نہیں کر سکتی اور نہ کر سکے گی۔ لیکن اگر علما آمادہ ہوں اور مناسب تدبیروں سے کام لیں تو قوم میں پھر وہ اخلاقی خوبیاں پیدا ہو سکتی ہیں جو سو دو سو برس پہلے موجود تھیں۔

الحاد اور دہریت کی طرف میلان جو روز بروز عام ہوتا جاتا ہے اس کا روکنا اگر گورنمنٹ کو ممکن ہوتا تو وہ زیادہ نہیں تو مذہب عیسوی کو تو اس سے محفوظ رکھ سکتی لیکن ہمارے علما اگر معقول طریقہ پر اس کو روکنا چاہیں تو اسی طرح اس کا قلع

قمع کر سکتے ہیں، جس طرح یونانی فلسفہ کے پھیلنے کے وقت امام غزالی، امام رازی، قاضی عضد، ابن رشد نے زندقہ و الحاد کا استیصال کر دیا تھا۔ ان باتوں سے ظاہر ہوا ہو گا کہ قوم کی زندگی کا بہت بڑا حصہ اب بھی علما ہی کا حق ملکیت ہے اور وہی اس حصہ کی فرماں روائی کے کامل الاختیار ہیں یا ہو سکتے ہیں۔

غرض اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ علما کو قوم پر اب بھی نہایت وسیع اختیار حاصل ہو سکتے ہیں۔ ان اختیارات کے حاصل ہونے کی شاید علما کو ضرورت نہ ہو لیکن قوم کو اس کی ضرورت اور سخت ضرورت ہے، کیوں کہ علما جب تک قوم کے خیالات، قوم کے اخلاق، قوم کے دل و دماغ، قوم کی معاشرت، قوم کا تمدن، غرض قومی زندگی کے تمام بڑے بڑے حصوں کو اپنے قبضہ اختیار میں نہ لیں گے قوم کی ہرگز ترقی نہیں ہو سکتی۔ لیکن ان اختیارات کے ہاتھ میں لینے کے وقت علما پر کچھ ذمہ داریاں عائد ہوں گی اور انھیں ذمہ داریوں کو علمائے حال کے فرائض سے تعبیر کرتا ہوں جو میرے مضمون کا عنوان ہے۔ ان فرائض کو بدفعات ذیل بیان کرتا ہوں۔

"علما کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ ایک مجموعی قوت پیدا کریں، یعنی تمام ہندوستان کے علما میں ایک خاص رشتہ اتحاد قائم ہو۔ تمام علماء ایک دوسرے کے نام سے، مقام سے، حالات سے واقف ہوں۔ آپس میں خط و کتابت ہو۔ مہتم بالشان امور میں تمام علما مشاورت اور استصواب سے کام لیں۔ کبھی کبھی وہ صرف اجتماع و اتحاد کی غرض سے ایک جگہ جمع ہو جایا کریں اور اس مقصد کے لیے ندوۃ العلماء سے زیادہ عمدہ موقع نہیں مل سکتا (۸)۔"

اس کے بعد مولانا نے علما میں اختلاف آرا کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ مسائل میں اختلافِ آرا ہونا ممکن ہے لیکن کدورت نہ ہونا چاہیے اور اگلے علما میں یہ بات ہرگز نہ تھی۔ اس لیے اتحاد و اتفاق کے حدود متعین کر لینا چاہییں۔ اختلاف مسئلہ تک رہنا چاہیے، یہ نہیں کہ تعلقات منقطع ہو جائیں۔ قرون اولیٰ میں اسی پر عمل تھا۔ حکومت کی نگاہ اور لوگوں کی نگاہ میں گرے ہوئے ہونے کا سبب اختلاف و اتفاق کا اصلی حدود میں نہ رہنا ہے۔

ندوہ کے اتحاد و اتفاق سے مولانا پر امید تھے کہ اوقاف کا لاکھوں روپیہ جو متولیوں کی وجہ سے بے دردی سے خرچ ہو رہا تھا، ندوہ کو مل سکتا تھا اور گورنمنٹ خوشی سے ندوہ کے دعوے کو قبول کر لیتی۔ تمام انگریزی مدارس میں عربی و فارسی کے نصابِ تعلیم کو بہتر بنانے اور اصلاح کرنے کے دعوے کو گورنمنٹ مان سکتی تھی۔ ندوہ کو یہ قوت بھی حاصل ہو سکتی تھی کہ تمام

جماعتِ اسلام اس کی ہدایتوں کی پابندی کرے اور اس کے فتووں کے آگے سر جھکائے۔ ندوہ قوم کو بیہودہ مراسم، خلافِ شرع باتوں سے، ناجائز امور سے بزور روک سکتا اور جماعتِ اسلام کو نماز، روزے، حج، زکوٰۃ کا پابند کر سکتا ہے۔ یہ زور تلوار کا نہ ہوتا بلکہ اتباعِ شریعت کا اور اتفاق باہمی کا اور یہ قوت سال میں ایک مرتبہ جمع ہونے سے حاصل نہیں ہو سکتی تھی بلکہ اس طرح حاصل ہو سکتی تھی کہ علما ندوہ کے کام کو اپنا ذاتی کام سمجھتے۔ مولانا کو افسوس تھا کہ احناف اور اہل حدیث کے جھگڑے کے مقدمہ میں تو دونوں فریق کے علما دور دور سے آئیں اور ندوہ میں بلایا جائے تو بہتوں کو ان کی خوشامدیں کرنا پڑیں۔ قوم کو اختلاف میں یہ شیفتگی اور اتفاق میں بے پروائی اور بے دلی۔ ندوہ کو اگرچہ سال بھر ہوا تھا، مگر اس نے اتنی قلیل مدت میں وہ طاقت پیدا کر لی تھی جو دوسری جماعتوں کو مدت میں حاصل ہوتی ہے۔ اس کا ثبوت یہ تھا کہ لوگ دور دور سے آکر شریک ہوئے۔ اب یہ علما کا کام تھا کہ وہ اس کو بلندی پر لے جائیں جو اس کے شایاں شان ہو۔

دوسرا فرض علما کا اتحاد اور دہریت کے اثر کو روکنا بتلایا اور کہا کہ عباسیوں کے زمانے میں یونانی فلسفہ کے ترجمہ سے الحاد اور دہریت کا زور ہو گیا تھا۔ اس کو دو طرح سے روکنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ایک تو فلسفہ کو بالکل پڑھایا نہ جائے۔ دوسرے یہ کہ اس کو پڑھ کر اس کا رد کیا جائے، جس کو علم کلام کہتے ہیں۔ لہٰذا مولانا نے مشورہ دیا کہ اس زمانے میں پہلے قسم کا علاج کیا گیا ہے اگر وہ فائدہ کرتا ہے۔ تو ٹھیک ہے ورنہ دوسرے قسم کے علاج کی ضرورت ہے۔

ترکی میں بھی علامہ حسین جسر نے حمیدیہ نام کی کتاب اس مضمون پر لکھی جس کی بڑی قدر ہوئی اور سلطان نے بھی انعام دیا۔ مولانا نے بھی اس کو دیکھا تھا۔ اگرچہ ان کے نزدیک وہ ضرورت کو پورا نہیں کرتی تھی مگر بنیاد پڑ گئی تھی۔ اب یہ دوسروں کا کام تھا کہ اس پر مضبوط اور مستحکم عمارت تعمیر کریں۔

تیسری چیز جس پر مولانا نے زور دیا وہ درس و تدریس میں وسعت پیدا کرنا تھا۔ اس زمانے کے حالات کے تحت علمی ترقی کے میدان میں وسعت ہو گئی تھی اور وقت کی کمی کی وجہ سے مختلف علوم و فنون میں وسعت کے ذکر کو نظر انداز کر کے صرف فن و ادب کی وسعت کو بیان کیا اس کے بعد فن و ادب پر تحقیق کی وسعت کو بیان کیا۔

مولانا نے علما کا سب سے بڑا فرض بلند حوصلگی اور عالی ہمتی پیدا کرنا بتایا اور اس ضمن میں دوسری قوموں کا ذکر کیا جو انھوں نے مسلمانوں کے علوم و فنون کو ترقی دینے میں کیں اور ان

قدیم اور نایاب کتابوں کی تفصیل دی جو یورپ نے تلاش و تحقیق سے چھاپی تھیں۔ پھر عرب جغرافیہ کے سلسلے میں نایاب کتابوں کی تفصیل دی جو یورپ کی بدولت ہاتھ آئی تھیں۔

۱۸۹۴ء میں جنیوا میں اورینٹل کانفرنس منعقد ہونے کا ذکر کیا جس میں یہ طے پایا تھا کہ مسلمانوں نے جن علوم میں ترقی کی اس کی ایک مفصل انسائیکلوپیڈیا تیار کی جائے۔ بڑے بڑے عربی دان اس کمیٹی کے ممبر مقرر ہوئے۔ اس کی مثال دے کر مولانا نے علما کو بھی رغبت دلائی کہ نصاب کی کتابوں کے دائرے میں تمام عمر نہ محدود رہیں بلکہ تحقیق کے میدان کے مرد بنیں۔ تقریر کے آخر میں مولانا کہتے ہیں:

"علمی حوصلہ مندی جس کو میں نے علما کا فرض بتایا ہے اس کا یہ اقتضا ہے کہ اگلوں نے ہمارے لیے جو سرمایہ چھوڑا تھا، دنیا سے ہم جائیں تو اس میں اضافہ کر کے جائیں۔ یہ خیال غلط اور بالکل غلط ہے کہ علمی کارخانے میں کام کرنے کے لیے اب کچھ باقی نہیں رہا۔ ابھی بہت وسعت ہے اور بہت کچھ کیا جاسکتا ہے۔"

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید دیگران نیز کنند آنچہ مسیحا میکرد

چوں کہ مولانا کا خاص موضوع تاریخ اسلام تھا اور علم کلام سے خاص مناسبت تھی اور ترکی سے محبت، اس لیے اس تقریر میں بھی ان کا ذکر ہے۔ تاریخ اسلام میں بھی دور عباسیہ کا ذکر خصوصاً ہوتا تھا اور یہ چاٹ المامون نے لگائی تھی اور علم کلام سے دلچسپی اعظم گڑھ کی یاد تھی۔ ترکی سے محبت سفر کے بعد دونی ہو گئی تھی۔

مولوی شاہ سلیمان پھلواروی نے مضامین اربعہ میں مولانا عبدالحق صاحب تفسیر حقانی کی تعریف کے بعد مولانا کی تعریف کی۔ چناں چہ فرماتے ہیں:

"دوسرے صاحب ہمارے معزز دوست شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی ہیں۔ ایک وہ زمانہ گزرا ہے کہ آپ سلیٹ پر شرح مطالع کے موجہات مشق کیا کرتے تھے اور رات دن بجز صغریٰ و کبریٰ بنانے اور وہی نتیجے نکالنے کے دوسرا شغل نہ تھا۔ پھر دینیات کی طرف توجہ کی۔ قرأت خلف الامام میں ایک پرزور رسالہ لکھا۔ مناظرہ اور مباحثہ آپ کا شہرہ آفاق تھا۔"

اسلام کو اس زمانے میں آپ سے کیا فائدہ پہنچا تھا، میں نہیں جانتا اور اب آپ کی کیا حالت ہے۔ رات دن قدما کی کتابوں کی سیر، نئے حکما کی تحریروں کا ملاحظہ، جوشیلے تالیفات، فائدہ مند تحقیقات بھی وظیفہ۔ سرمایہ۔ ناز ہے۔ اس پر طرفہ یہ کہ حضرت کو استسقا کا عارضہ بھی ہے، یعنی کتابوں سے سیری نہیں ہوتی، ہمیشہ العطش،

العطش کی فریاد ہے - جہاں کتب خانہ سنا جا پہنچے اور کتابوں کے کیڑے بن گئے - شہر عظیم آباد پٹنہ میں خان بہادر خدا بخش خاں چیف جسٹس حیدر آباد کا ایسا نامی کتب خانہ ہے، کہ شاید ہندوستان میں اس کا نظیر ہو - ہمارے دوست ہر سال وہاں بھی ضرور پہنچا کرتے ہیں - خیر یہ تو ہندوستان کی باتیں ہیں - روم، شام، مصر تمام سے ہو آئے ہیں اور پھر بھی سیر نہ ہوئے -

دریا رود از چشم لب ترنشود لیکن　　　　این طرفہ تماشا ہیں بنشستہ در آب اندر

اب آپ کے تصنیفات ضروریات زمانہ ہی کے متعلق ہوتے ہیں اور سیر و سیاحت نے مسلمانوں کی ضرورتوں سے خوب ہی واقف کر دیا - یہ بزرگان میرے قول کی تصدیق کر سکتے ہیں کہ میرا یہ خیال کہ سیر و سیاحت ایک اعلیٰ درجہ کا مفید کام اور بہت بڑا ذریعہ اولوالعزمی اور بلند حوصلگی حاصل ہونے کا ہے، کس حد تک صحیح ہے - حقیقت میں دناءت، پست ہمتی، بزدلی، جہالت وغیرہ مہلک امراض کا تیر بہدف علاج اگر ہے تو یہی سیر و سیاحت ہے - اس کے علاوہ اس کے انسان نئے تجربات کا ایک کافی ذخیرہ جمع کر لیتا ہے - خود اسے اپنی حالت پر پورا تنبہ ہو جاتا ہے اور نہایت وثوق کے ساتھ اسے اس بات کا علم بھی ہو جاتا ہے کہ میں کیا ہوں اور آئندہ مجھے کیا ہونا چاہیے - اور سچ پوچھیے تو یہی خیال دارومدار اور اصل الاصول انسان کی دینی اور دنیوی ترقیوں کا ہے (۹) -"

ہمعصر عالم جب تعریف کرے تو اس کو 'جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے' سے تعبیر کر سکتے ہیں اور مولانا شبلی کی یہ سحر بیانی کا اعجاز تھا کہ علما بھی خراج عقیدت پیش کرتے تھے اور ان کی علمی وسعت اور واقفیت کو تسلیم کرتے تھے -

حواشی:

۱.... حیات شبلی، صفحہ نمبر ۲۶۴ و مکاتیب شبلی، حصہ اول، صفحہ ۳۴۵
۲.... حیات شبلی، صفحہ ۲۶۴
۳.... مکاتیب شبلی، حصہ اول، صفحہ ۳۴۹
۴.... مکاتیب شبلی، حصہ دوم، صفحہ ۲۰۱، ۳۰-جون ۱۸۹۵ء
۵.... مکاتیب شبلی، حصہ اول، صفحہ ۶-۵، ۱۲- ستمبر ۱۸۹۵ء
۶.... مکاتیب شبلی، حصہ اول برحاشیہ صفحہ ۶
۷.... مکاتیب شبلی، حصہ اول صفحہ ۲۱، ۱۲-دسمبر ۱۸۹۵ء
۸.... روئداد ندوۃ العلما، سال دوم از مضامین اربعہ
۹.... مضامین اربعہ، صفحہ ۳۸

۱۸۹۶ء

اب مولانا ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسوں میں پابندی سے شرکت کر رہے تھے اور اپنے خیالات کو بڑی بے باکی سے پیش کر رہے تھے۔ لوگوں پر ان کی تقریر کا خاصا اثر ہو رہا تھا اور جلسہ میں لوگ ان کے ہم خیال ہو جاتے تھے۔ چناں چہ تیسرا جلسہ بانس بریلی (روہیل کھنڈ) میں ہوا۔ اگرچہ یہ جلسہ کلکتہ میں ہونا تھا کیوں کہ یہی طے ہو چکا تھا۔ اس کا سبب اس طرح تحریر ہے:

"وہ ندوۃ العلماء کا جلسہ (سال دوم) بریلی میں کیوں ہوا، جب کہ کلکتہ میں ہونا طے ہو چکا تھا؟ سال گذشتہ میں جبکہ ہمارے معزز مہربان خان بہادر منشی اطہر علی صاحب رئیس کاکوری اور ہمارے دار العلم فرنگی محل لکھنو کے حضرات علما اس جلسہ متبرکہ کے میزبان تھے۔ کلکتہ سے شیخ بخش الہیٰ صاحب تاجر نے اس مضمون کا تار دیا تھا کہ حاجی نور محمد صاحب و مولوی ابو الحسن خاں صاحب جج کی یہ آرزو ہے کہ سال آئندہ کا جلسہ کلکتہ میں ہو اور اس کی میزبانی کا فخر ہمیں دیا جائے۔ اس تار کو مولانا شاہ محمد امانت اللہ صاحب نے جلسہ میں پیش کیا تھا اور اس کا فیصلہ جلسہ انتظامیہ کی رائے پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ چناں چہ جلسہ انتظامیہ میں خط و کتابت کے بعد یہ امر منظور ہو گیا تھا، مگر سوء اتفاق سے عین اس زمانے میں جب کہ جلسہ کا اعلان ہونا چاہیے تھا، جج صاحب موصوف کے بھائی کا عرصہ تک علیل رہنے کے بعد انتقال ہو گیا۔ خاں صاحب ممدوح اپنے مرحوم بھائی کی علالت و انتقال سے ایسے سراسیمہ ہو گئے کہ ان کو اس سال جلسے کی دعوت معذرت کے ساتھ واپس لینی پڑی۔ اس کا چرچا ہوتے ہی مختلف مقاموں سے دعوتیں آگئیں سب سے پہلے روہیل کھنڈ کے مشہور شہر بانس بریلی کی انجمن اسلامیہ نے تعالوا الینا کی صدا بلند کی، جس کے صدر نشین ہمارے مکرم دوست مولوی سید اشفاق حسین صاحب ڈپٹی کلکٹر پنشنر ہیں۔ اس کے اصلی محرک ہماری انجمن کے پرجوش رکن حاجی شیخ قادر بخش صاحب اور مولوی خلیل الرحمن صاحب سہارن پوری تھے۔ اس کے بعد امرتسر سے تحریک ہوئی، مگر خوش قسمتی سے باتفاق اراکین مجلس انتظامی یہ سعادت انجمن اسلامیہ بریلی کو نصیب ہوئی اور متوکلاً علی اللہ ۱۶۔ رمضان ۱۳۱۳ھ کو بریلی میں ندوے کے اجلاس سوم کا اعلان کر دیا گیا۔ اس مرتبہ اعلان اور خطوط کثرت کے ساتھ تقسیم نہیں کیے گئے اور نیز اعلان کے شائع کرنے میں بھی معمول سے زیادہ دیر ہو گئی (۱)۔

اس جلسے کے صدر مولانا محمد لطف اللہ صاحب ہوئے۔ اس کے متعلق روئداد میں اس طرح ہے:

"اراکین انتظامی کی رائے سے جناب مولانا لطف اللہ صاحب دام ظلہ، کی خدمت میں درخواست کی گئی کہ اس مرتبہ بھی وہ ندوۃ العلماء کی صدارت منظور فرمائیں لیکن اتفاق سے مفتی صاحب موصوف جلسے سے کچھ ہی دن پیشتر ایک طویل رخصت حاصل کر چکے تھے اور جس عدالت سے تعلق ہے، اس کے ایک جج رخصت پر تھے اور ایک دورے پر، اس وجہ سے کثرت کار مانع تھی، اس لیے جناب مولانا ممدوح نے خود رخصت لینا مناسب نہیں سمجھا۔ لہذا ندوے کی جانب سے عالی جناب نوقار الامراء بہادر مدار المہام سرکار عالی کی خدمت میں درخواست بھیجی گئی اور باوجودیہ کہ معتمد عدالت نے رخصت دیے جانے سے گریز کیا تھا، مگر نواب صاحب دام اقبالہ نے بلا خیال حرج کار کے رخصت منظور فرمائی اور مفتی صاحب ممدوح کو مبلغ پان سو روپے زاد راہ دے کر اجازت دی کہ ندوے میں شریک ہو کر اپنے انفاس متبرکہ سے حاضرین کو مستفید فرمائیں۔ اس کا اعلان ہم نے ۱۸۔ شوال ۱۳۱۳ھ کو دے دیا تھا، تاکہ عام طور پر اس کی اطلاع ہو جائے (۲)۔"

ندوۃ نے مختلف جگہوں پر علماء کے وفود بھیجے تاکہ مقاصد اور اغراض کی اشاعت ہو۔ چناں چہ روئداد میں اس طرح ہے:

"یہ بھی قرار پایا کہ ندوے کے مقاصد اور اغراض کی اشاعت اور مسلمانوں کے دینی و دنیوی تنزل کے اسباب کی تفتیش و مدارس و انجمن ہائے ماتحت کی نگرانی کی غرض سے علمائے کرام کی ایک جماعت وفد الندوہ کے نام سے مختلف بلاد ہند کے دورے کے واسطے روانہ کی جائے (۳)۔"

چناں چہ چار وفود دورے پر گئے، چوتھے وفد میں مولانا شبلی بھی تھے جس کا ذکر اس طرح ہے:

"چوتھا وفد در بھنگے کو روانہ ہوا۔ اس میں مولوی شاہ سلیمان صاحب چشتی پھلواروی، مولوی عبد الوہاب بہاری، مولوی سید ظہور الاسلام صاحب فتح پوری اور مولوی شبلی نعمانی شریک تھے (۴)۔"

نصاب کے سلسلے میں مولانا نے تقریریں کر کے علما کو اس پر مائل کر دیا تھا کہ وہ درس نظامی پر نظر ثانی کریں اور نئے نصاب کے متعلق رائے دیں۔ چناں چہ اس کے متعلق مولوی محمد حبیب الرحمن خاں شروانی نے تقریر کی اور فرمایا

"ندوۃ العلماء نے اپنے مقاصد میں سب سے اول مقصد اصلاح نصابِ تعلیم مقرر کیا ہے۔ اس مقصد کے متعلق سال اول میں بہت کم کارروائی ہو سکی تھی اور صرف چند نصاب بدقت تمام دفتر ندوۃ حاصل کر سکا تھا۔ سال حال میں اس سے بہتر کارروائی ہوئی۔ تقریباً چالیس (۴۰) نصابِ تعلیم علما نے مرتب کر کے عنایت فرمائے، علاوہ نصابوں کے چودہ مستقل رائیں اس کے متعلق موصول ہوئی۔ ۱۰۔ رجب ۱۳۱۲ھ کو بڑے دن کی تعطیل کے موقع پر ایک جلسہ علما کا بمقام کان پور اس غرض سے منعقد ہوا کہ جو نصاب اور تجویزیں دفتر ندوہ میں آ چکی ہیں ان پر غور کیا جائے اور بعد غور اور بحث جو امور باہمی مشورے سے طے ہوں وہ قلمبند کیے جائیں۔ ہندوستان کے بعض نہایت مشہور عالم جن کو تعلیم میں وسیع تجربہ ہے، اس جلسہ میں تشریف لائے تھے، مثلاً مولوی محمد فاروق صاحب چریاکوٹی، مولوی عبداللہ صاحب پروفیسر پنجاب یونیورسٹی، مولوی حفیظ اللہ صاحب مدرس اعلیٰ مدرسہ عالیہ رام پور، مولوی محمد شبلی صاحب نعمانی۔ یہ جلسہ کئی روز رہا۔ مجھ کو بھی اس میں حاضر ہونے کی عزت حاصل تھی۔ نہایت مستعدی سے شب و روز جلسے ہوئے اور ایک حد تک نصاب بعد بحث کے مرتب کیا گیا (۵)۔"

مولانا نے بھی ایک تقریر کی جس کی تفصیل نہیں ہے۔ ان کی تقریر کا ذکر اس طرح ہے:

"اس کے بعد شمس العلماء مولوی شبلی صاحب نعمانی کا بیان ہونے کو تھا، مگر دیر ہو جانے کی وجہ سے گرمی کی شدت ہو چکی تھی۔ اس لیے شمس العلماء نے معذرت کی، مگر شائقین کے اصرار نے مجبور کیا تو بیان کرنے کھڑے ہوئے اور ندوے کے مقاصد کے متعلق ایک مختصر تقریر کی، مگر ہم کو افسوس ہے کہ وہ قلمبند کر کے نہیں بھیجی، اس وجہ سے اس جگہ پر درج نہ ہو سکی (۶)۔"

مولانا نے اسی جلسے میں ایک اور تقریر کی جو روئداد میں اس طرح ہے:

"تقریر شمس العلماء مولوی محمد شبلی صاحب نعمانی:

ندوۃ العلماء ایک ایسا مدرسہ جس کا نام دارالعلوم ہوگا قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس پر عربی کے دوست اعتراض کریں گے کہ مدرسہ کی بنیاد ڈالی تو کیا انوکھی بات کی، نئے تعلیم یافتہ کہیں گے کہ آج کل عربی کی کیا قدر ہے وہ ہمارے کیا کام آسکتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ دو باتیں ہیں جس سے یہ مدرسہ دیرپا یادگار ہو سکتا ہے۔ اول ظاہری

شان و شوکت سے، اس کا مکان نہایت شاندار اور مضبوط ہو گا اور اس میں ہر ایک کام کے لیے جدا جدا کمرے ہوں گے - مثلاً پڑھنے کے کمرے، رہنے کے کمرے، کھانے کا کمرہ جس میں سب یکجا ہو کر اور مل کر کھانا کھائیں گے - مکان کو شاندار بنانے کی ضرورت اس طرح کی ہے جیسے مسجد کو شاندار اور مستحکم کرنے کی - یہ ظاہر ہے کہ مسجد اس لیے بنائی جاتی ہے کہ وہاں جا کر فرض ادا کریں - وہ ہم ذرا سی جگہ میں بھی ادا کر سکتے ہیں پھر کیا وجہ کہ وہ نہایت عظمت اور استحکام سے تیار کی جاتی ہے اس سے یہی غرض ہوتی ہے کہ اس سے شان اسلام نمایاں ہو اور عرصہ تک اس کیفیت کو وہ ظاہر کرے - پس جو امر خلاف شریعت نہ ہو، اس کو جہاں تک ہو سکے باشان و عظمت بنائیں - ہمارے اسلاف اکثر اسلامی چیزوں کو شان و شوکت سے ظاہر کرتے تھے - سلطنت تیموریہ کے لیے نہایت شرم کی بات ہے کہ اس نے اپنی یادگار میں کوئی شاندار مدرسہ نہیں چھوڑا - جو کام سلطنت سے باقی رہ گیا تھا ہم اس کو پورا کریں گے - دوسری حیثیت یہ ہے کہ اصل اس کی کہاں تک ہو گی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اصلیت زیادہ ظاہری شان و شوکت بقدر ضرورت ہونا چاہیے، اس وقت کے مدارس سے اعلیٰ درجے کی ترقی علمی نہیں ہو سکتی - اس مدرسے میں ایک عالم کے سپرد ایک کام ہو گا، جس میں اس کو شہرت عام حاصل ہو - علمائے سلف کی یہ عادت تھی کہ وہ ایک ایک فن میں کمال حاصل کیا کرتے تھے اور بقدر ضرورت اور علوم بھی جانتے تھے اس وجہ سے ہم بھی چاہتے ہیں کہ ہمارے مدرسے سے بھی ہر فن کے جدا جدا عالم نکلیں یوں تو بعض صاحب ہر فن میں کامل ہوتے ہیں، جیسے مولانا مولوی لطف اللہ صاحب کہ ہر فن میں جامعیت رکھتے ہیں، لیکن یہ فضیلت ہر شخص کو حاصل نہیں ہوتی - چوں کہ ہر فن میں مشغول ہونے سے طبیعت ہر علم کی طرف متوجہ ہوتی ہے، اس لیے یک فنی ہونا مشکل ہوتا ہے -

اس دارالعلوم میں ایک کتب خانہ بھی ہو گا - جس میں ہر طرح کی کتابیں موجود ہوں گی، کہ جو طالب علم بعد تکمیل کے مطالعہ، کتب سے اپنی علمی قابلیت بڑھانا چاہے وہاں رہ کر کتب بینی سے اپنے علم کو بڑھا سکے - نئی روشنی والے سمجھ لیں کہ اس مدرسہ کی صرف ہم ہی کو ضرورت نہیں ہے بلکہ وہ بھی اس کے مشتاق رہیں، کیوں کہ یہ ناممکن ہے کہ وہ پانچ کروڑ مسلمانوں کو انگریزی داں بنادیں یا اگر ایسا ہو گا تو ہندوستان میں اسلام سے ہاتھ دھو لینا چاہیے - ہم کو ایسے گروہ کی بھی ضرورت ہے کہ جو ہمارے دین اور علم دین کو زندہ رکھے - علم عربی کی آج کل بڑی بے قدری ہے - یورپ کے ایک بادشاہ نے یہ اشتہار دیا کہ جو شخص عرب کی تاریخ قبل اسلام ایام

جاہلیت کو لکھ دے تو دو ہزار روپیہ انعام اور ایک تمغہ ملے گا- لیکن تین برس ہوئے کسی نے نہیں لکھی- بغیر پورے علمی کمال کے کسی عالم اور علوم کی پوری قدر نہیں ہو سکتی- ڈاکٹری اور یونانی طب کو دیکھیے یونانی طب کی اس وجہ سے خرابی نہیں ہے کہ یہ علم ناقص ہے، بلکہ اس کی نگہداشت اور دواؤں کی پوری جانچ نہیں ہوتی ہے- دوا کا عالم بھی کامل ہو تو طب کو بھی ترقی ہو سکتی ہے- غیر قوم کے لوگ اس فن میں ایسی ترقی کر رہے ہیں کہ ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا فن کوئی اور ہے افسوس کہ غیر ہماری چیزوں سے منتفع ہوں اور ہم اپنی چیزوں سے محروم رہیں-

بہت سے مدارس گو اس وقت قائم ہیں مگر ان میں نقص یہ ہے کہ سب علوم ایک شخص پڑھتا ہے، اس وجہ سے وہ کسی علم میں صاحب کمال نہیں ہو سکتا- اس واسطے اگر یہ مجمع علما کا انتظام کرے تو اس کے لیے زیبا ہی نہیں ہے بلکہ ضرور ہے، اور اس کا انصرام اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ اس قسم کا دارالعلوم قائم ہو جس میں ہر فن کی تعلیم کے واسطے جدا جدا ایسے شخص مقرر ہوں جو اس فن میں ممتاز ہوں بعض کو شاید یہ خیال ہو کہ اور کسی بڑے مدرسے کو ترقی دے کر کیوں نہیں دارالعلوم بنایا جاتا- بات یہ ہے کہ اس میں اور مدارس کو رشک و عناد ہو گا، اس لیے یہی مناسب ہے کہ ندوہ ایک دارالعلوم خود علاحدہ قائم کرے (۷)-"

مولانا مجلس انتظامیہ کے رکن مقرر ہوئے، لہذا روئداد میں اس طرح ہے:

"اسمائے حضرات اراکین مجلس انتظامیہ ندوۃ العلماء- ....

نمبر شمار ۴- نام نامی مولوی محمد شبلی صاحب نعمانی- پتا علی گڑھ (۸)

اخباروں کے ان مہتمموں کی فہرست بھی شائع ہوئی جو اپنے اخبار ندوہ کو بھیجتے تھے اس میں مولانا کا نام ہے-

"فہرست ان مہتممین اخبار کی جو ندوۃ العلماء کے دفتر میں ازراہ عنایت اپنے اخبار بھیجتے ہیں ------ نمبر ۷، نام اخبار- محمڈن اورینٹل کالج میگزین، علی گڑھ- نام مہتمم مولوی محمد شبلی صاحب نعمانی (۹)-"

عربی زبان اور ادب کے سلسلے میں مستشرقین کی کوششوں سے مولانا خوب واقف تھے- وہ لوگ جو نادر اور قدیم کتابیں تلاش کر کے شائع کر رہے تھے، اس سے مولانا للچا رہے تھے اور ان کی طبیعت چاہتی تھی کہ مسلمانوں میں بھی کوئی جماعت ایسی ہوتی جو اسی طرح علمی کاموں میں اپنے کو وقف کر دیتی اور کچھ مالدار افراد ایسے ہوتے جو اخراجات کا بار اٹھا لیتے - اس طرح اسلام اور

مسلمانوں کا نام دنیا میں اونچا ہوتا۔ یہ لگن مولانا کو ایسی لگی ہوئی تھی کہ مولانا نے اپنی اس خواہش کا اظہار اپنے سفرنامہ میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"میں نے کتب خانوں کے بیان میں، جو تفصیل کی، وہ ایک خاص غرض سے کی، اور میں چاہتا ہوں کہ قوم کو اس کی طرف متوجہ کروں۔ یورپ میں اس قسم کی متعدد انجمنیں قائم ہیں جن کا مقصد قدیم عمدہ کتابوں کا بہم پہنچانا اور ان کو چھاپ کر شائع کرنا ہے۔ انہی انجمنوں کی بدولت عربی زبان کی وہ قدیم اور نادر الوجود کتابیں ہم کو میسر آئی ہیں، جن کے دستیاب ہونے کا خیال بھی نہیں آتا تھا۔ یہی انجمنیں ہیں جنھوں نے تاریخ کبیر ابو جعفر جریر طبری کا کامل نسخہ بہم پہنچایا اور اس کی بہت سی جلدیں چھاپ کر شائع کیں، حالاں کہ مصر و روم کے علما اس نایاب تاریخی خزانے سے بالکل ناامید ہو چکے تھے، اور شاہ عبد العزیز صاحب نے تو یقین دلایا تھا کہ وہ دنیا سے ناپید ہو چکی ہے۔ بے شبہ یورپ کا یہ بہت بڑا احسان ہے اور ہم کو اس کا علانیہ اقرار کرنا چاہیے۔ بزرگان قوم سے میری درخواست ہے کہ وہ اس قسم کی ایک عظیم الشان انجمن بنائیں، عام چندے سے کافی سرمایہ جمع کیا جائے، قابل اور لائق مصنفین، کتابوں کے انتخاب کے لیے مقرر ہوں۔ قسطنطنیہ اور مصر سے کتابیں نقل کرا کر منگائی جائیں اور چھاپ کر شائع کی جائیں۔ یہ کام بظاہر عظیم الشان اور قوم کی موجودہ حالت کے لحاظ سے غیر ممکن معلوم ہوتا ہے لیکن فی الحقیقت ایسا نہیں ہے۔ اگر چار کروڑ مسلمانوں میں سے سو مسلمان بھی آمادہ ہو جائیں اور ایک قلیل مقدار چندے کی دینا گوارا کریں تو اس کا انجام پانا کچھ مشکل نہیں۔ حیدر آباد میں دائرۃ المعارف الدکنیہ کے نام سے جو انجمن قائم ہے اور جس کے ایک معزز ممبر نواب اقبال یار جنگ بہادر ہیں، ہم کو امید ہے کہ وہ ہماری گذارش پر توجہ کرے گی۔ ہم شکر گذاری کے ساتھ اس کی علمی فیاضیوں کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن ہم کو اس سے زیادہ فیاضیوں کی ضرورت ہے (۱۰)۔"

مندرجہ بالا خیال ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا ایک نتیجے پر پہنچا اور مئی ۱۸۹۶ء میں ایک تجویز کی شکل میں سامنے آیا۔ لکھتے ہیں:

"یہ امر مسلم ہے کہ مسلمانوں نے کسی زمانے میں تمام علوم و فنون کو نہایت ترقی دی تھی اور ہر فن میں اپنے خاص اجتہاد اور تحقیقات کے نتائج قلمبند کیے تھے، لیکن رفتہ رفتہ علمی مذاق کو اس قدر تنزل ہو گیا کہ آج جو تالیفات و تصنیفات عام طور سے رائج ہیں، اکثر وہ ہیں جن میں ایجاد و جدت کی جھلک تک نہیں پائی جاتی۔

قدما کی تصنیفات، جن میں ہر جگہ اجتہاد اور ذاتی تحقیقات سے کام لیا گیا ہے، عموماً متروک ہیں۔ خال خال کوئی قلمی نسخہ کسی بڑے کتب خانہ میں پایا بھی جاتا ہے تو ہر شخص کو وہاں تک دسترس نہیں اور اس وجہ سے گویا ان کا عدم وجود برابر ہے (۱۱)۔"

"ان واقعات کی بنا پر مجھ کو خیال آیا کہ ایک مجلس قائم کی جائے جو اس مفید اور اہم کام کو انجام دے، اگرچہ حیدر آباد کی مجلس دائرۃ المعارف کا بھی یہی موضوع ہے لیکن جو تجربہ اس کے ابتدائی قیام سے اس وقت تک ہوا ہے، اس کے لحاظ سے یہ کہنا ناموزوں نہیں کہ وہ اس درد کی پوری دوا نہیں (۱۲)۔"

آگے چل کر تجاویز کو اس طرح پیش کرتے ہیں:

(۱) وہ لوگ جو دس روپے سالانہ چندہ دینا منظور فرمائیں، اور یہی لوگ اراکین مجلس قرار دیے جائیں گے اور ان کو امور انتظامی مجلس میں رائے دینے کا حق حاصل ہوگا، اور نیز جو کتاب یا کتابیں چھاپی جائیں گی گو کہ ان کی قیمت ان کے چندہ ممبری سے زائد ہو، ان کو دی جائیں گی۔

(۲) وہ اہل علم جو اس کام میں اپنی رائے اور واقفیت و تلاش سے امداد دیں اور اس قسم کی کتابیں بہم پہنچائیں ان کو یہ حق حاصل ہوگا کہ مجلس ان کو تمام تجویزات اور حالات سے وقتاً فوقتاً مطلع کرتی رہے گی، اور ایک یا دو نسخہ کتاب مطبوعہ کا ان کو نذر کرے گی۔

(۳) وہ لوگ جو یہ منظور کریں کہ کتاب کے چھپنے پر ایک نسخہ قیمت معینہ پر خرید لیں گے ان کا نام ایک رجسٹر میں درج کر لیا جائے گا اور جو کتاب چھپے گی اس کا ایک نسخہ ان کی خدمت میں ویلو پے ایبل بھیج دیا جائے گا۔

یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ سر دست جن کتابوں کا شائع کرنا پیش نظر ہے، وہ پانچ روپیہ قیمت سے زیادہ کی نہیں، اس غرض کے لیے جو کتابیں اس وقت تک ہم بہم پہنچا چکے ہیں، یا جو نہایت جلد بہم پہنچ سکتی ہیں، حسب ذیل ہیں (۱۳)۔"

کتابوں کے نام لکھنے کے بعد لکھتے ہیں:

"ہم کو ملک کے تمام بزرگوں سے امید ہے کہ وہ اس تجویز کی بابت ہم سے خط و کتابت فرمائیں گے اور ہم کو مطلع فرمائیں گے کہ ان تین قسم کے ممبروں میں سے کسی قسم کا ممبر ہونا منظور ہے (۱۴)۔"

پہلے پہل مولانا کو دار المصنفین کا خیال روم و مصر و شام کے سفر میں آیا تھا۔ سفر نامہ لکھتے وقت اس خاکے کو ذہن سے صفحہ قرطاس پر منتقل کیا اور ۱۸۹۶ء میں اس خاکہ میں تجاویز کا

رنگ بھرا۔ گویا یہ دار المصنفین کا ابتدائی خیال تھا جس کو مولانا نے قوم کے سامنے پیش کیا۔

اسی سال مولانا نے حیدر آباد کا دوسری مرتبہ سفر کیا۔ اس کا سبب مولانا کی علی گڑھ سے بے دلی تھی اور بے دلی کا سبب انگریز پرنسپل مسٹر بک کا بے جا عمل دخل اور مولانا کی طرف سے مشکوک ہونا (۱۵) اور ان کی ہمنوائی میں سید محمود کی مدہوشی (۱۶) کے عالم میں تندی اور ہر معاملہ میں بے جا دخل دینا، بھڑجانا اور دوسروں کا گھنٹوں وقت ضائع کرنا تھا۔ سرسید عضو معطل ہو کر رہ گئے تھے، بہت سی باتوں کی ان کو خبر بھی نہ ہوتی تھی (۱۷)، لیکن انگریز کی سیاست تھی کہ وہ اپنی بدنامی لیے بغیر سید محمود کو بھڑکا کر کام نکالتا تھا۔ "رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی" چناں چہ مولانا، سید علی بلگرامی کے بلانے پر حیدر آباد تشریف لے گئے اور وہاں چار پانچ ہفتے قیام کیا۔ اس زمانے میں نواب وقار الامراء بہادر کی وزارت تھی جو مولانا شبلی سے ۱۸۸۵ء سے واقف تھے، کیوں کہ مولانا شبلی نے ان کی علی گڑھ آمد پر چھتیس شعر کا فارسی قصیدہ کہا تھا۔ انھوں نے نظام الملک محبوب علی خاں سے سفارش کی اور سو روپیہ ماہوار وظیفہ ۳۔ ربیع الثانی ۱۳۱۴ھ مطابق ۱۱۔ ستمبر ۱۸۹۶ء کو منظور ہو گیا اور مولانا کی آئندہ تصانیف کو سلسلہ آصفیہ میں شامل کرنے کا اعلان کیا گیا اور مندرجہ ذیل فرمان عنایت کیا گیا:

> "مولوی شبلی صاحب جو اس وقت علی گڑھ کالج میں عربی اور فارسی کے پروفیسر ہیں، چار ہفتہ سے بلدہ میں مقیم ہیں۔ مولوی صاحب موصوف ایک نہایت قابل اور لائق شخص ہیں اور تصنیف میں ایک خاص مذاق رکھتے ہیں۔ ان کی قدر دانی گورنمنٹ انگریزی اور گورنمنٹ روم سے بھی بہ عطائے خطاب و تمغہ ہوئی ہے، اب ان کی تمنا یہ ہے کہ اپنے پورے وقت کو تصنیف کے کام میں صرف کریں اور معمولی درس و تدریس کو ترک کر دیں۔ مولوی صاحب موصوف کو تصنیف کے کام میں فارغ البالی کے ساتھ معروف کرنا ایک قومی کام ہے اور اس وقت کوئی عالم ہندوستان میں ایسا نہیں ہے جو پرانے ذخیروں سے اس طرح کام لے۔ چوں کہ سرکار سے ایسے شخص کی اعانت ضرور ہے، لہٰذا سرکار نے بالفعل سو روپے کلدار ماہوار جاری کرنے کے لیے منظوری صادر فرمائی، اور یہ بھی حکم دیا ہے کہ ان کی تصنیفات کے دیکھنے کے بعد اضافہ کیا جاوے گا۔ جو کتابیں مولوی صاحب موصوف تصنیف کریں گے وہ سرکار آصفیہ کے نام سے مشتہر ہوں گی، پس حسب الحکم سرکار تاریخ حکم سے جو ۳۔ ربیع الثانی ۱۳۱۴ھ ہے، سو روپیہ کلدار ماہوار شمس العلماء مولوی شبلی صاحب کے نام جاری کی جاوے۔ ایک مثنیٰ اس کا مولوی شبلی صاحب کو دیا جاتا ہے (۱۸)۔"

حیدر آباد کے اکابر، اہل قلم اور اہل علم نے ۱۱۔ ربیع الثانی ۱۳۱۴ھ کو کاسمپولیٹن ہوٹل (نواب محسن الملک کی کوٹھی) میں ایک جلسہ کیا جس کی صدارت مولوی خدا بخش خاں چیف جسٹس عدالت عالیہ نے کی۔ جلسہ میں مولوی عزیز مرزا نے مولانا کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا جس پر اکابر، اہل علم اور اہل قلم کے دستخط تھے۔ سپاس نامہ یہ ہے:

"بخدمت فیض درجت جناب فضیلت انتساب شمس العلماء مولوی محمد شبلی نعمانی صاحب، تمغۂ مجیدیہ دام افضالکم۔

عالی جناب!

ہم لوگ جنھیں آپ کے ہم ملت ہونے کا افتخار حاصل ہے، اس موقع پر جبکہ آپ شہر فرخندہ بنیاد حیدر آباد میں تشریف فرما ہوئے ہیں، آپ کے خیر مقدم کے لیے حاضر ہوئے ہیں اور ان احسانوں کو یاد کر کے جو آپ نے قوم اور ملک پر اپنی عالمگیر تصنیفات کے ذریعہ سے کیے ہیں، شکر گذاری کا اظہار کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کی پر جوش مثنوی "صبح امید" نے سب سے پہلے ایک نئے مگر دلربا انداز سے قومی ترقی کے آفتاب کے طلوع ہونے کی خوش خبری سنائی، اور "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" نے ہمارے علمی عروج اور دماغی ترقی کی خوشگوار داستان سنا کر ہمارے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ جب ہمارے اجداد نے اس تاریکی کے زمانہ میں یہ کچھ کیا تو ہم اس روشن زمانے میں کیا کچھ نہیں کر سکتے۔ آپ کی مورخانہ تحقیق نے مامون الرشید کے حالات اس خوبی سے جمع کیے کہ اسلامی سلطنت کی عظمت و جبروت اور دربار خلفا کی شان و شوکت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ گیا، اور وہ اسباب جن کے لحاظ سے اس زمانہ میں مسلمان دوسری قوموں سے میدان، تہذیب و شائستگی میں آگے تھے، خود بخود ظاہر ہو گئے۔ آپ نے سیرۃ النعمان میں نہ صرف ایک ایسے پیشوائے مذہبی کے متبرک حالات سے ہم کو آشنا کیا جس کی بے لوث زندگی بعد میں آنے والوں کے لیے ایک عمدہ نمونہ تھی، بلکہ یہ بھی ثابت کر دیا کہ شریعت غرائے مصطفوی جس طرح نجات اخروی کے لحاظ سے صراط مستقیم ہے، اسی طرح دنیوی معاملات کے لیے بھی ایک دستور العمل ہے۔ اور یورپین مصنفوں کا یہ خیال ہے کہ وہ رومن جو اس پروڈنس کی ممنون احسان ہے، راستی سے کس قدر بعید ہے۔ آپ نے کتب خانہ اسکندریہ کے متعلق نہایت عالمانہ تحقیق سے کام لے کر اس دھبہ سے اسلام کے دامن عزت کو بالکل پاک و صاف کر دیا، جو صیوی تعصب نے ایسے اصرار سے لگایا تھا کہ ایڈورڈ گبن جیسے نامور مورخ کی پر جوش کوششیں بھی اس کو نہ مٹا سکیں۔ آپ نے یورپین ممتہ چینوں

کے مقابلے میں قطعی طور پر ثابت کر دیا کہ جزیہ کی بنیاد مذہبی تعصب نہ تھی، بلکہ وہ ایک فوجی ٹیکس تھا، جس کی ضرورت اس زمانے میں بھی مسلم ہے اور حال میں جب ارمنی سازشوں کی بدولت یورپ میں دریائے تعصب ایسا جوش زن ہوا کہ خود اسلام کو بنی نوع انسان کے حق میں قہرِ الٰہی سمجھنے لگے، تو یہ آپ ہی کی باریک نظر اور پر زور قلم تھا کہ جس نے حقوق الذمیین کی تشریح کر کے بتا دیا کہ جیسے فیاضانہ اصول شریعتِ اسلامیہ میں مفتوحین سے برتاؤ کے متعلق قائم کیے گئے ہیں، ان کی نظیر دنیا کی تاریخ میں بہت مشکل سے مل سکتی ہے۔ آپ نے دراصل تاریخ سے اس کی بوسیدہ ہڈیوں میں روحِ تازہ پھونک کر ایک ایسا کام لیا ہے، جو ہمارے خیال میں بھی نہ تھا، اور اس لحاظ سے اردو لٹریچر ہمیشہ آپ کا ممنون احسان رہے گا۔ آپ نے صرف اپنے علم اور دماغ ہی سے امتِ مرحوم کی حمایت نہیں کی ہے، بلکہ آپ کے علمی ذوق اور اسلامی جوش نے ایک دور دراز سفر اختیار کیا اور وہاں سے ایک ایسا بیش بہا تحفہ ساتھ لائے، جس نے ہمارے ذخیرہ معلومات میں معتدبہ اضافہ کرنے کے علاوہ ہماری قومی ہمدردی کو وسیع کر کے ٹرکی سے ہمارے رابطہ اتحاد کو اور بھی مضبوط کر دیا۔ اگرچہ سلطان المعظم اور سرکار عظمت مدار اور خود ہماری سرکار ابد پائے دار نے آپ کی بے لوث کوششوں کی قدر دانی میں غفلت نہیں کی ہے، لیکن آپ جیسے بزرگوں کی اصلی قدردانی وہی ہے جو پبلک کی طرف سے ہو۔ آپ کی تصنیفات سے ہم حیدر آبادی بھی اسی طرح مستفیض ہوئے ہیں، جس طرح کہ ہندوستان کے دوسرے خطے کے لوگ ہو سکتے ہیں۔ اور اس لیے ہم پھر اس موقع پر اپنی دلی احسان مندی کا اظہار کر کے خدا سے دعا کرتے ہیں کہ آپ مدت دراز تک اسلام اور قوم کی خدمت گزاری کے لیے زندہ و برقرار اور ہمارے لیے باعث افتخار رہیں۔ آمین ثم آمین (۱۹)۔"

اس کے بعد مولانا نے اس سپاس نامے کے جواب میں ایک تقریر کی اور ایک ترکیب بند سنایا۔ پہلا شعر یہ ہے:

اے دکن یکہ جہاں راسر و سودا باتست　　اے مجموعہ صد یاس و تمنا باتست

پہلے بند کا آخری شعر یہ ہے:

گرمی صحبت آں میکدہ سر جوش تو ہست　　مصر و غرناطہ و بغداد در آغوش تو ہست

دوسرے بند کا پہلا شعر اس طرح ہے:

اے بزرگان گراں پایہ وارکان دکن　　اے ہمہ شمع فروزندہ ایوان دکن

مقطع اس طرح ہے:

ہمہ را بزم طرب باسر و ساماں باشد　　　شبلی خستہ ہم از حاشیہ بوساں باشد (۲۰)

تمکین کاظمی (شبلی حیدر آباد میں) لکھتے ہیں:

"نہ صرف یہ ترکیب بند حیدر آباد میں مقبول ہوا بلکہ شبلی بھی اس سے زیادہ مقبول ہوئے، خوب دعوتیں ہوئیں اور مہینے بھر تک شبلی نے حیدر آباد کی سیر کی۔"

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں (۲۱):

"بعض خوش وقت شاعروں نے اس کا جواب لکھا، قصیدہ کے بعد مولانا نے اعجاز القرآن کے موضوع پر ایک دل آویز تقریر فرمائی (۲۲)۔"

ایسا اندازہ ہے کہ مولانا نے ترکیب بند سے پہلے سپاس نامے کا جواب دیا اور ترکیب بند کے بعد اعجاز القرآن پر تقریر فرمائی۔

مولانا کی حیدر آباد میں اس قدر آؤ بھگت اور پذیرائی ہوئی کہ لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ مولانا حیدر آباد ہی میں قیام فرمالیں گے۔ اس خیال میں محسن الملک بھی شریک تھے۔ چناں چہ ایک خط میں انھوں نے مولانا سے استفسار کیا تو مولانا نے جواب میں لکھا (۲۳) کہ محسن الملک کا خط پڑھ کر بے اختیار ہنسی آئی کہ لوگ ان کو اس قدر بھولا سمجھتے تھے۔ نیشنل اسکول کی خاطر اگر وہاں رہنا ہوتا تو بے شک رہ جاتے لیکن وہاں کا روپیہ وہیں خرچ ہو جاتا تھا اور پان سو سے زیادہ ملنا اس وقت ممکن نہ تھے اسی صورت میں پس انداز کیے جاسکتے تھے جبکہ وہاں کی سوسائٹی میں متبذل، بد حیثیت، بے وقعت ہو کر رہا جاتا۔ رہ گیا وہاں سے نیشنل اسکول کے لیے چندہ، یہ حماقت تھی۔

مولانا روپیہ اور دولت کے قدر دان تھے، اس لیے کہ ابراہیم ادھم یا بایزید نہ تھے۔ دنیا کی خواہشوں میں جکڑے ہوئے تھے، لیکن دنیا کو سلیقہ سے حاصل کرنے کے خواہش مند تھے۔ جوڑ توڑ، سازش، دربار داری، خوشامد، لوگوں کی جھوٹی آؤ بھگت نہ ہو سکتی تھی اور بغیر اس کے وہاں کامیابی ممکن نہ تھی۔ اس لیے گوشہ عافیت ہی پسند کیا۔

وہاں مولانا سے ان کی خواہش پوچھی گئی تو انھوں نے اس آمدنی کے ساتھ کالج سے آزادی چاہی، چناں چہ اسی قدر ماہوار منصب مقرر ہو گیا۔ الفاروق کے بعد ۱۵۰ یا ۲۰۰ روپے ہونے کی امید تھی، جو روبکار میں وعدہ کے طور پر درج کر لیا گیا تھا۔ مولانا کا ابھی تک دوسری شادی کا ارادہ

نہ تھا، اس لیے تنہا زندگی کے لیے وہ رقم کافی تھی اور دھوم دھام کی خواہش نہ تھی۔ بے زحمت اللہ نے دیا تھا، اسی پر مطمئن تھے۔ قوم کی خدمت کے سلسلے میں یہ تھا کہ چھوٹی سفارش کرکے دو چار کو ملازمت دلا دینا کچھ مناسب نہ تھا، بلکہ ان کو قابل بنانے کی ضرورت تھی۔ جب وہ قابل ہو جاتے تو ان کی قابلیت خود ان کے لیے سفارش ہوتی۔

اسی (۲۴) زمانے میں مولانا حمید الدین فراہی نے مولانا کو لکھا کہ سر سید سے ان کے لیے سر ٹیفکیٹ لے لیں تاکہ مدرسۃ الاسلام کراچی میں بحیثیت پروفیسر ان کے تقرر میں آسانی ہو، تو مولانا نے لکھا کہ انھیں کا لکھنا بہتر تھا کیوں کہ سر سید ان کی اہلیت اور قابلیت سے بخوبی واقف تھے اور یہ بھی لکھا کہ طبقات ابن سعد اور بدء الاسلام کے ترجمہ کے لیے بھی یاد دہانی کر دیں۔ مولانا کی خواہش تھی کہ طبقات ابن سعد اور بدء الاسلام (سیرۃ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر مولانا کا عربی رسالہ جو علی گڑھ کالج میں بی اے کے کورس میں تھا اور بہت مقبول ہوا تھا) کا عربی سے ترجمہ ہو جائے اور حمید الدین فراہی اس کا ترجمہ کریں۔ بعد کو بدء الاسلام کا ترجمہ مولانا فراہی نے فارسی (۲۵) میں کر دیا تھا، پھر اس فارسی نسخہ سے اردو (۲۶) میں بیگم میمونہ سلطان (اہلیہ نواب حمید اللہ خاں، بھوپال) نے ترجمہ کیا۔

ترجمہ کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"عرصہ سے میرا خیال تھا کہ میں اپنی بہنوں کی کوئی مذہبی خدمت انجام دوں علیا حضرت (سلطان جہاں بیگم) کو بھی میرا یہ ارادہ معلوم تھا، اس بنا پر حضور ممدوحہ نے شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی کے رسالہ بدء الاسلام کا ترجمہ فارسی عطا فرما کر ارشاد فرمایا کہ اس کا اردو میں ترجمہ کرکے شائع کرا دوں۔ چناں چہ میں نے ترجمہ شروع کر دیا اور الحمد للہ کہ اب وہ شائع ہو رہا ہے (۲۷)۔"

اردو ترجمہ کا نمونہ یہ ہے:

"۴۰ جلوس کسریٰ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد حضرت عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم تھے اور والدہ ماجدہ حضرت آمنہ بنت وہب اور دایہ حلیمہ سعدیہ تھیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم دو مہینے کے تھے کہ آپ کے باپ نے رحلت فرمائی اور واقعہ فیل کے آٹھ برس بعد (آپ کے دادا) عبدالمطلب نے بھی انتقال کیا۔ انھوں نے ابو طالب (آپ کے چچا) کو وصیت کی تھی کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نہایت محبت کے ساتھ پرورش کریں (۲۸)۔"

اسی زمانے میں انگریزی گرامر کی ایک مختصر کتاب پروفیسر آرنلڈ ترجمہ کرانا چاہتے تھے اور چاہتے تھے کہ مولانا فراہی اس کا ترجمہ کر دیں۔ لہٰذا مولانا نے چاہا کہ کتاب مختصر اور اصطلاحیں معلوم تھیں اس لیے ترجمہ کرنا منظور کر لینا چاہیے تھا۔ ترجمہ بھی دسمبر کی ۱۵ بلکہ اوائل جنوری میں مطلوب تھا، اس لیے دوسرے کاموں کا بھی حرج نہ ہوتا۔

اسی سال مولانا، محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین کے اردو اڈیٹر مقرر ہوئے۔ چناں چہ یکم دسمبر ۱۸۹۶ء کے میگزین میں اس طرح ہے:

"تقریباً پانچ برس ہوئے کہ اس نام کا ایک علمی رسالہ، انگریزی اور اردو ملا ہوا، علی گڑھ کالج سے نکلنا شروع ہوا اور اول اول وہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ (گزٹ) کا ضمیمہ بن کر نکلتا رہا، لیکن ۱۸۹۴ء میں اس نے ایک مستقل رسالے کی صورت اختیار کی۔ اس کے مضامین زیادہ تر کالج کی خبروں اور اس کے تعلقات پر محدود ہوتے تھے اور اس وجہ سے عام پبلک کو اس کے ساتھ چنداں دل چسپی نہ تھی۔"

اس خیال سے اس کے منتظموں نے اس کو وسعت دینی چاہی تاکہ وہ بالکل ایک علمی میگزین بن جائے۔ جس میں کالج کی خبروں کے علاوہ مسلمانوں کے علوم و فنون، تاریخ اور لٹریچر کے متعلق مفید اور پرزور مضامین لکھے جائیں۔ اس غرض سے اس کے چوبیس صفحے بالکل اردو کے لیے مخصوص کر دیے گئے اور اس صیغہ کا اہتمام مولوی شبلی صاحب نعمانی نے اپنے ذمہ لیا ہے اور وعدہ فرمایا ہے کہ اس کی ترقی میں وہ حتی الامکان کوشش فرمائیں گے۔ ملک کے مشہور اہل قلم یعنی مولانا حالی، نواب محسن الملک، مولوی نذیر احمد اور منشی ذکاء اللہ وغیرہ بزرگوں نے اس میں مضامین لکھنے کا وعدہ کیا ہے اور اہل قلم بھی اگر اس کی اعانت فرمائیں گے تو ہم نہایت فخر کے ساتھ قبول کریں گے۔

ہم کو امید ہے کہ ہندوستان کی اسلامی جماعت خریداری سے اس کی اشاعت میں مدد دے گی۔ میگزین کے کل صفحات ۴۰ ہیں اور قیمت مع محصول ڈاک تین روپے۔

تھیوڈر بیک	ایڈیٹر انگریزی
مولوی شبلی نعمانی	اردو ایڈیٹر
نیاز محمد خاں	منیجر(۲۹)"

نومبر ۱۸۹۶ء میں آغا خاں علی گڑھ تشریف لائے تو مولانا شبلی نے فارسی میں سپاس نامہ پیش کیا۔ اس کا ذکر بھی اسی دسمبر ۱۸۹۶ء کے میگزین میں ہے۔ لکھا ہے:

"After a visit to the siddaus union club his Highness procuded to the starachey Hall where all the Students had assembled to receive him. An address in Persian was read by Moulavi Shibli followed by an urdu-poem by Muhammad Ismail. His Highness (Agha Khan) then rose and addressed the audience in persian (30)."

۲۰۔ رجب ۱۳۱۴ھ مطابق ۲۶۔ دسمبر ۱۸۹۶ء کو مولانا ندوہ کے وفد کے ساتھ کان پور سے غازی پور پہنچے۔ اس وفد میں مولانا کو ملا کر کل سات علما تھے۔ مولانا عبدالاحد شمشاد لکھنوی نے اراکین ندوہ کے خیر مقدم میں چند رباعیات کہیں۔

رباعیات در خیر مقدم اراکین ندوہ وقت تشریف آوری غازی پور

کیا بات ہے جو حد سے سوا ہے یہ بھیڑ　　کھلتا ہی نہیں آج کہ کیا ہے یہ بھیڑ
وفد ندوہ کی پیشوائی ہے کیا　　یہ ہے تو حقیقت میں بجا ہے یہ بھیڑ

00000

ہر لحظہ فزوں تر ہے فروغ ملت　　صد شکر کہ اس شہر کی چمکی قسمت
انوار جلو میں ہیں جو لائے تشریف　　ندوہ کے اراکین فرشتہ خصلت

00000

تشریف لائے جو اہل ندوہ اس دم　　ہر جنس کے ہر جگہ ہیں سامان بہم
ہر طبقے کے آئے ہیں یہاں پر اشخاص　　اس دھوم سے کب ہوا ہے خیر مقدم

00000

منتظمان جلسہ کیا کیا موجود　　جو چاہیں گے کر لیں گے مہیا موجود
ذی رتبہ جو مہمان ہیں اہل ندوہ　　سامان ضیافت بھی ہیں اعلیٰ موجود

00000

اندیشہ میں کیوں پڑے ہیں اہل عبرت　　یہ جم غفیر کیوں ہے وجہ وحشت
اغراض بیاں ہوں گے ندوہ کے یہاں　　اس واسطے جھک پڑی ہے ساری خلقت

00000

ندوے کے اراکین و جناب ناظم | جو اپنے ارادوں میں ہیں پورے قائم
اے سبع شداد علم بے شک تیرے | ہفت اختر سعد ہیں یہ ساتوں عالم

ooooo

یہ سبع مثانی کے ہیں عامل عارف | یہ سبع طوال کے ہیں کامل واصف
وفد ندوہ میں ہیں جو یہ عالم سات (۳۱) | یہ سبع طباق کے ہیں حاصل واقف

ooooo

دریائے مضامیں کی روانی دیکھو | خوش فکری و جوش تر زبانی دیکھو
ندوے کے اراکین ہیں واعظ اس وقت | دیکھو اثر سحر بیانی دیکھو

ooooo

اب ہم سے سنو تھوڑے ہمارے اوصاف | ہم میں سے ہر ایک میں ہیں سارے اوصاف
ہم مجمع اوصاف نہ ہوتے تو پھر | ہر گز نہ سمجھتے تمہارے اوصاف (۳۲)

ooooo

مولانا کے لیے علی گڑھ کی آب و ہوا ناموافق تھی۔ دماغی محنت کی وجہ سے تھکن محسوس کرتے تھے اور مستقل بیٹھ کر کام کرنے کی وجہ سے معدہ ٹھیک نہ تھا (۳۱)۔ سلسلہ علالت کے ساتھ ساتھ سید محمود کا کالج کے جزو کل پر چھا جانا اور سوء مزاجی اس پر مستزاد، سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

> "وہ (سید محمود) جدھر نکل جاتے گھنٹوں اس کے پاس بیٹھ کر گپ کرتے اور وقت ضائع کرتے۔ مولانا ان کی اس عادت سے زچ ہو گئے تھے، کیوں کہ الفاروق کی تکمیل کے لیے جس یکسوئی کی ضرورت تھی وہ ملتی نہ تھی۔ اسی لیے مولانا نے ان سے ایک دو دفعہ بے رخی برتی تو ان کو اس سے شکایت پیدا ہو گئی اور وہ بڑھتی ہی گئی، یہاں تک کہ انھوں نے مولانا پر عدم لیاقت کا الزام قائم کیا اور ان سے بعض درجے چھین لیے اور کبھی ان کے اس ہنر کو عیب ٹھہرایا کہ یہ دینیات کے سبق اپنے حسن تقریر سے اس قدر دلچسپ بنا دیتے ہیں کہ لڑکے دوسرے مضامین کی طرف توجہ کم دیتے ہیں (۳۳)۔"

مولانا کی پریشانی کی تیسری چیز بک صاحب کی سیاست تھی۔ انھوں نے ایک مسلمہ مسلمان لیڈر کی حیثیت حاصل کر لی تھی اور پردے کے پیچھے سے سیاست کی کٹھ پتلیوں کو حرکت

دیا کرتے تھے۔ مولانا ان کی اس طرز سیاست کو جس کا مقصد کالج کو غلامی اور وفاداری کا دلچسپ و دلپذیر سبق پڑھانا تھا سخت ناپسند فرماتے تھے۔

بات اصل یہ تھی کہ مولانا ترکی کی محبت میں سرشار اور غیروں کی غلامی سے بیزار تھے۔ مسلمانوں کے کالج میں انگریزوں کا عمل دخل اور وہ بھی سید محمود کی آڑ میں، مولانا کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ ادھر انگریز اسٹاف خصوصاً پرنسپل مسٹر بک مولانا سے نالاں تھے اور اپنی سیاسی چال کی وجہ سے سید محمود کو بھڑار کھا تھا، تاکہ اپنی بدنامی نہ ہو۔ سرسید پر از خود رفتگی کا عالم طاری تھا، ان کو ایک لاکھ کے غبن سے ایسا دھکا لگا تھا کہ حواس باختہ ہو گئے تھے۔ جس نے ایک ایک کوڑی بڑی محنت سے جمع کی ہو اور دانت سے پکڑ رکھی ہو اور وہ بھی قوم کا سرمایہ، سرسید زندہ ہی رہ گئے یہ بڑی بات تھی۔ ایک اور سبب سید محمود کی بڑھی ہوئی مستی تھی۔ تیسرا سبب سید محمود کا کالج کا جوائنٹ سیکریٹری ہونا تھا، جو قومی سرمایہ سے قائم کیے ہوئے کالج کو سرسید کے خاندان میں وراثت کے طور پر دے دیتا تھا، جس کی وجہ سے سرسید کے بعض مخلص رفیق بھی کبیدہ خاطر ہوئے۔ سب سے بڑھ کر مولانا سے انگریز حکومت کی سیاسی بدگمانی اور اس کی کڑی نگاہیں تھیں۔ جس کے اشارے حیاتِ شبلی میں ملتے ہیں، جو انگریزی دورِ حکومت میں لکھی گئی۔

سرسید ہی مولانا کے آڑے آتے تھے ان کی یہ کیفیت تھی تو مولانا کتنے دن کالج میں ٹھہرتے! دیوان حافظ سے فال نکالی تو اس میں یہ مصرع نکلا:

وقت آنست کہ پدرود کنی زنداں را

آخر مولانا نے دسمبر ۱۸۹۶ء سے نومبر ۱۸۹۷ء تک ایک سال کی رخصت لی اور علی گڑھ سے رخصت ہو کر اعظم گڑھ میں قیام کیا (۳۴)۔

الفاروق کے بارے میں قوم سے وعدہ کیے عرصہ ہو چکا تھا، اس لیے جی لگا کے اس کو پورا کرنا چاہتے ہوں گے۔ چھٹی لینے کا ایک سبب یہ بھی ہوگا۔

حواشی:

۱۔۔۔ روئداد جلسہ سال سوم ندوۃ العلماء، منعقدہ ۲۶ تا ۲۸۔شوال ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۱ تا ۱۳۔اپریل ۱۸۹۶ء، بروز شنبہ تا دوشنبہ، واقع شہر بانس بریلی، معہ ضمیمہ مطبوعہ اصح المطابع واقع محمود نگر۔ لکھنؤ، صفحہ ۹

۲۔۔۔ روئداد جلسہ سال دوم ندوۃ العلماء، منعقدہ ۲۶-۲۷-۲۸-شوال ۱۳۱۳ھ واقع بانس بریلی، معہ ضمیمہ مطبوعہ اصح المطابع واقع محمود نگر لکھنؤ، صفحہ ۱۷۔

۳.... ایضاً، صفحہ ۳۰ ۴.... ایضاً، صفحہ ۳۴
۵.... ایضاً، صفحہ ۴۱ ۶.... ایضاً، صفحہ ۴۳
۷.... ایضاً، صفحہ ۶۶ ۸.... ایضاً، صفحہ ۱۰۶
۹.... ایضاً، صفحہ ۱۶۷ ۱۰.... سفرنامہ، صفحہ ۹۸-۹۹
۱۱.... حیاتِ شبلی، صفحہ ۲۶۷ ۱۲.... حیاتِ شبلی، صفحہ ۲۶۸
۱۳.... حیاتِ شبلی، صفحہ ۲۶۹
۱۴.... مولانا شبلی، کا ایک مخالف (انگریز) از راقم یحیٰ احمد
۱۵.... اس زمانے میں سید محمود پر ام الخبائث کا پورا پورا قبضہ تھا۔
۱۶.... اس کے سلسلے میں بابائے اردو کو بھی شکایت پیدا ہوئی تھی اور اس مضحکہ خیز وضع قطع کی شکایت سرسید سے کی تھی۔
۱۷.... حیاتِ شبلی، صفحہ ۲۷۱ ۱۸.... حیاتِ شبلی، صفحہ ۲۷۳-۲۷۵
۱۹.... حیاتِ شبلی، صفحہ ۲۷۵-۲۷۶ ۲۰.... ادیب، علی گڑھ - اکتوبر ۱۹۶۰ء، صفحہ ۷
۲۱.... حیاتِ شبلی، صفحہ ۲۷۶-۲۷۷
۲۲.... مکاتیبِ شبلی، حصہ اول صفحہ ۷-۸، ۱۵- ستمبر ۱۸۹۴ء (یہ سال غلط چھپ گیا ہے خود سید سلیمان ندوی نے صفحہ ۷ کے حاشیہ میں ۱۸۹۶ء لکھا ہے جو صحیح ہے)۔
۲۳.... مکاتیبِ شبلی حصہ دوم، فصحہ ۲، ۱۸- نومبر ۱۸۹۶ء
۲۴.... آزاد لائبریری (علی گڑھ) اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔
۲۵.... دارالعلوم ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔
۲۶.... اردو ترجمہ بدء الاسلام ۲۷.... ایضاً
۲۸.... محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین، یکم دسمبر ۱۸۹۶ء
۲۹.... محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین، یکم دسمبر ۱۸۹۶ء، صفحہ ۴۹۱
۳۰.... خزینہ، شمشاد معروف باسم تاریخی نظم دلفروز دیوان دوم، باراول در مطبع انوار محمدی، لکھنو، صفحہ ۳۱۹-۳۲۰
۳۱.... مولانا محمد علی مونگیری، مولانا شاہ سلیمان پھلواروی، مولانا سید ظہور اسلام فتح پوری، مولانا غلام محمد صاحب فاصل ہوشیار پوری، مولانا شاہ امانت اللہ غازی پوری، مولانا ابوالخیر غازی پوری اور مولانا شبلی نعمانی (حیاتِ شبلی میں صفحہ ۳۱۲-۳۱۳ پر مولانا محمد علی مونگیری کا نام رہ گیا ہے، حالاں کہ وہ ناظم وفد تھے
۳۲.... حیاتِ شبلی، صفحہ ۳۱۹ ۳۳.... ایضاً ۳۴.... حیاتِ شبلی، صفحہ ۳۲۰

۱۸۹۷ء

شروع جنوری ۱۸۹۷ء میں سات علما کا وفد غازی پور سے پٹنہ پہنچا۔ مولانا شبلی اس میں شامل تھے۔ "پٹنے میں حکیم مولوی عبدالباری صاحب کے مکان میں قیام کیا گیا۔ اگرچہ اس شہر کی کثرت آبادی کی حیثیت سے وفد کا اچھے طور پر اعلان نہیں ہوا، تاہم وفد کے پہنچ جانے سے مسلمانوں کے دلوں میں ایک جنبش پیدا ہو گئی تھی اور مولوی حکیم عبدالباری صاحب و مولوی سید فخرالدین صاحب و دیگر رؤسائے پٹنہ کے مکانوں میں متواتر جلسے ہوئے، مگر دو جلسے ان میں زیادہ شاندار تھے۔ ایک مولانا شاہ رشید الحق صاحب کی خانقاہ میں ہوا جس کے صدر نشین مولانا ممدوح تھے۔ اس میں مولوی شاہ سلیمان نے ایک بسیط اور پر مغز تقریر فرمائی۔ اس کے بعد مولانا شاہ امانت اللہ صاحب و مولوی شبلی صاحب نعمانی نے مختصر تقریریں کیں(۱)۔

مولانا، محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج میگزین علی گڑھ کے اردو ایڈیٹر جنوری ۱۸۹۷ء تک رہے۔ اس کے بعد فروری ۱۸۹۷ء کے میگزین میں عبداللہ بی اے کا نام ملتا ہے۔ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی مصروفیت کی وجہ سے علاحدگی اختیار کر لی۔

اب ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسے باقاعدگی سے ہو رہے تھے اور مولانا جلسوں میں پابندی سے شرکت کر رہے تھے۔ اس سال جلسہ چہارم میرٹھ میں ہوا۔ اس کے متعلق روئداد میں اس طرح ہے:

"میرٹھ میں جلسے کا ہونا اور اس کا اعلان"

ندوۃ العلماء کا حسن قبول جو ملک میں پھیلتا جاتا ہے اور مسلمانوں کو اس کے ساتھ دل آویزی ہوتی جاتی ہے۔ اس کا ایک یہ بھی ثبوت ہے کہ ہر سال ملک کے مختلف حصوں سے اس کی دعوت کی صدائیں آتی ہیں۔ چنانچہ اس سال بھی رؤسائے پٹنہ اور اہل میرٹھ نے اس کو دعوت دی اور باوجودیکہ چند روز پیشتر میرٹھ میں کانفرنس ہو چکی تھی اور قحط و گرانی کی سختیوں سے یہ توقع نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ فراخ دلی سے اس عظیم الشان کام کو باحسن الوجوہ انجام دے سکیں گے۔ مگر درحقیقت یہ ان کی عالی حوصلگی تھی کہ انھوں نے دعوت دی اور نہایت عمدگی اور سیر چشمی سے اس کو انجام دیا۔

جلسہ انتظامیہ نے جب رؤسائے میرٹھ کی دعوت قبول کرلی تو ۲۱- رمضان ۱۳۱۴ھ کو متوکلاً علی اللہ جلسہ کا اعلان کر دیا اور حسب دستور اعلان خطوط اور اشتہاروں کی اشاعت اسی طور پر کی گئی جیسا کہ سالہائے گزشتہ میں ہوتی رہی ہے (۲)-

آگے چل کر پاس شدہ تجاویز کے متعلق اس طرح ہے:

سالہائے پیوستہ (۳) کے جلسوں میں تین اہم تجویزیں منظور ہوئی تھیں -۱- ترتیب نصاب، ۲- دارالافتا، ۳- فراہمی سرمایہ - (نصاب میں درس نظامی کچھ تغیر و تبدل کے ساتھ مولانا لطف اللہ صاحب نے منظور فرمایا- صفحہ ۲۹)

سال گزشتہ کے جلسہ میں دو تجویزیں منظور ہوئی تھیں - "تقرر واعظین لاشاعتہ الاسلام" اور "قیام دارالعلوم"۔ مگر افسوس ہے کہ امسال ان دونوں تجویزوں کے متعلق کوئی کارروائی نہیں ہو سکی، جس کی وجہ یہی ہے کہ ندوہ کے پاس اس قدر سرمایہ نہیں ہے کہ وہ ان تجویزوں کو عمل میں لائے- دوسری وجہ یہ بھی ہوئی ہے کہ اس سال مختلف وجوہ سے اپنے وقتوں پر جلسہ انتظامیہ نہیں ہوسکے، اس وجہ سے سرمایہ جمع کرنے کی خاطر خواہ تحریک نہیں ہوئی، ورنہ ہم کو امید تھی کہ اہل اسلام ان کاموں کے لیے، جو سراسر انھیں کی بہبودی کے ہیں اور جن کو خاص و عام نے مفید تر تسلیم کر لیا ہے، ضرور توجہ کرتے - تیسری وجہ قحط و طاعون بھی ہوئی کہ ایک عالم کی پریشانی دیکھ کر چندے کی کوشش کرنے میں تامل رہا (۴)-"

آگے چل کر اس طرح ہے:

"قاعدے کی رو سے کم سے کم ہر سہ ماہی میں جلسہ انتظامیہ کا ہونا ضروری ہے، مگر اس سال ایسے وجوہ و اسباب پیش آگئے جن سے جلسہ ملتوی ہوتا چلا گیا- یہاں تک کہ آخر سہ ماہی میں ۱، ۲، ۳- جمادی الآخر کو ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں بقیہ تمام کارروائی جلسہ سالانہ کی مثل اصلاح دستور العمل و انتخاب ارکان وغیرہ کے کی گئی اور مندرجہ ذیل تجویزیں منظور ہوئیں:

۱- تجویز یہ منظور ہوئی کہ ندوہ کی منظور شدہ تجویزوں میں سے جو کام شروع کیا جائے وہ وسیع پیمانے پر ہو، جو اور انجمنوں اور مجلسوں کے کاموں سے ممتاز ہو،

۲- یہ بھی طے ہوا کہ دارالعلوم کے قائم کرنے کے لیے ایک علاحدہ مجلس قائم کی جائے اور اس کے لیے جداگانہ دستور العمل مرتب ہو-

اس تجویز کے موافق مولوی شبلی صاحب نعمانی کو تکلیف دی گئی کہ وہ اس مجلس کے قواعد مرتب کریں- چناں چہ مولوی صاحب ممدوح نے جو قواعد قلمبند کر کے

بھیجے ان کو چھپوا کر ارکان انتظامی کے پاس بھیج دیا گیا تا کہ وہ اپنی اپنی رایوں سے مطلع کریں - مگر افسوس ہے کہ باوجود مکرر تقاضوں کے بہت کم حضرات نے اس طرف توجہ کی، تاہم جس قدر رائیں آچکی ہیں وہ معہ قواعد مذکورہ کے اس جلسہ میں پیش کی جائیں گی (۵)-"

میرٹھ کے اجلاس دوم میں مولانا نے ایک تقریر کی جس کا ذکر روداد میں اس طرح ہے:

"مولوی عبد اللہ صاحب انصاری داماد مولانا قاسم صاحب علیہ الرحمہ کی تقریر کے بعد مولوی شبلی نعمانی کھڑے ہوئے اور دار العلوم پر ایک بسیط اور اعلیٰ درجے کی تقریر کی، جو تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں تمام ہوئی - اس کا ہر ہر فقرہ بلکہ ہر ہر حرف نقش کالحجر کی طرح سامعین کے قلوب پر بیٹھتا جاتا تھا اور ہر شخص جوش اور فرط انبساط سے محو حیرت ہو گیا تھا - مگر افسوس ہے کہ اپنی عادت کے موافق فاضل مقرر نے یہ تقریر پہلے سے قلمبند نہیں کی تھی اور بعد کو جو لکھ کر بھیجی وہ تلف ہو گئی، اب اگر وہ دوبارہ لکھ کر عنایت کریں گے تو علاحدہ طبع کی جائے گی (۶)-"

مولانا نے اسی جلسہ میں ایک اور تقریر کی جس کے متعلق روداد میں اس طرح ہے:

"خلاصہ تقریر مولوی شبلی صاحب نعمانی

انگریزی تعلیم کی وجہ سے مذہبی تعلیم میں جو دقت اور خرابی پیش آگئی ہے، اس کی اصلاح کے لیے اب تک جو تدبیریں اختیار کی گئی ہیں وہ سود مند نہیں ہوئیں - ان مشکلات پر نظر کر کے امروہے کے ایک مسلمان رئیس نے اپنی محنت و وقت صرف کر کے اس بات کی کوشش کی کہ انگریزی مدرسوں میں مذہبی تعلیم کا وقت دیا جائے - اس کے واسطے وہ دو مہینے نینی تال میں جا کر رہے اور آخر کو ایک حد تک کامیاب ہوئے - گورنمنٹ نے ہفتہ میں دو بار نصف نصف گھنٹہ مذہبی تعلیم کے لیے دیا ہے اور اس کا انتظام اور نصاب درس کا ردو بدل مسلمانوں کی تجویز پر رکھا ہے -

مولوی مشتاق حسین صاحب رئیس امروہہ نے اس کے قواعد علاحدہ چھپوا لیے ہیں، جو اس وقت میرے ہاتھ میں ہیں - ان کی خواہش یہ ہے کہ ندوۃ العلماء اس کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے اس کو جس طریقے سے مناسب ہو، جاری کرے اور نصاب درس تجویز کرے -

لہٰذا میں اس کو پیش کر کے یہ تحریک کرتا ہوں کہ اس رعایت کے بابت گورنمنٹ کا اور اس کوشش کے بارے میں مولوی مشتاق حسین صاحب کا شکر گزار ہونا چاہیے (۷)-

آگے چل کر اس طرح ہے:

"مولوی شاہ سلیمان نے مختصر تقریر میں تحریک پیش کی کہ تکمیل کی غرض سے چند مستعد اور ذکی طالب علموں کو ندوے کی طرف سے وظائف دے کر مصر بھیجا جائے۔ اس کی تائید مولوی شبلی صاحب نے کی اور تائید کرتے وقت پر مغز اور بسیط تقریر کی جو قلمبند نہ ہونے کی وجہ سے درج نہیں ہو سکتی۔

یہ تحریک بالاتفاق منظور ہوئی۔ مولوی شبلی صاحب نے کہا کہ اس کے واسطے علاحدہ چندہ ہونا چاہیے۔ حاضرین نے تائید کی اور اسی وقت کسی قدر چندے کا وعدہ کیا گیا(۸)۔"

چندہ دینے والوں میں مولانا شبلی بھی تھے جس کا ذکر اس طرح ہے:

فہرست ان حضرات کی جنھوں نے وظائف مصریہ کے لیے چندہ دینے کا وعدہ کیا تھا:

"نمبر شمار ۲۔ مولوی شبلی صاحب نعمانی یکمشت ایک سو روپے (۹)۔"

اسی جلسے میں مولانا حبیب الرحمن شروانی رئیس بھیکن پور (حبیب گنج) نے علمائے سلف پر لکھا ہوا مضمون پڑھا(۱۰)۔ مولانا کی تقریر تلف ہونے کی وجہ سے روداد میں اس طرح چھپی ہے:

"محرم کے مہینے میں بہمہ وجوہ روداد مرتب ہو چکی تھی اور جس قدر مضمون اور تقریریں آ چکی تھیں وہ سب اس کے ساتھ منسلک کر دی گئی تھی اور جو نہیں آئی تھیں ان کے شائع کرنے کو مجبوراً ہم نے دوسرے وقت پر انحصار کیا تھا مگر سوء اتفاق سے مکان دفتر کے غیر محفوظ ہونے سے چوری ہوئی اور جس بکس میں روداد کے متعلق کاغذات رکھے تھے تلف ہو گیا۔ سب سے زیادہ ہم کو دو تقریروں کے ضائع ہونے کا افسوس ہے۔ ایک شمس العلما مولوی شبلی نعمانی کی وہ تقریر تھی جس کو فاضل مقرر نے اجلاس چہارم ندوۃ العلماء منعقدہ میرٹھ میں بیان کیا تھا اور دوسری مولوی ابو محمد عبدالحق صاحب دہلوی مصنف تفسیر حقانی کی تقریر تھی، جو ان کے عمدہ مضمون برکات اسلام کا دوسرا حصہ تھا۔ ان تقریروں کے ضائع ہونے کے بعد ہم عرصے تک اس کی کوشش کرتے رہے کہ وہ تقریریں پھر ہم کو دوبارہ حاصل ہوں، مگر افسوس ہے کہ نہ اس چوری کا سراغ ملا، نہ ان حضرات نے وہ تقریریں دوبارہ قلمبند کر کے عنایت فرمائیں (۱۱)۔"

یہاں پر ندوۃ العلماء کا دستور العمل لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے کیوں کہ اس کے مقصد نمبر ۲ کی آگے چل کر خلاف ورزی ہوئی اور نتیجے کے طور پر مولانا شبلی کو استعفیٰ دینا پڑا۔

روداد جلسہ چہارم میں اس طرح ہے:

"دستورالعمل ندوۃ العلماء

دفعہ ۱: یہ مجلس مسلمانوں سے مخصوص ہوگی۔

دفعہ ۲: اس مجلس کا نام ندوۃ العلماء ہوگا۔

مقاصد ندوۃ العلماء

دفعہ ۳: ندوۃ العلماء کے مقاصد حسب ذیل ہوں گے:

۱- ترقی تعلیم، ۲- طریقہ تعلیم کی اصلاح ضروری، ۳- درستی اخلاق، ۴- رفع نزاع باہمی، ۵- اہل اسلام کی بہبودی۔

دفعہ ۴: ندوۃ العلماء کو امور سیاست مدن سے تعلق نہ ہوگا، بلکہ اس صورت میں کہ گورنمنٹ خود کسی معاملے میں اس کو مخاطب کرے اور جلسہ انتظامیہ اس میں دخل دینا پسند کرے (۱۲)۔"

مولانا محمد علی مونگیری ناظم ندوۃ العلماء مولانا کے خلوص، عمل اور جذبہ خدمت کی وجہ سے ان کی رائے کو بڑی وقعت دیتے تھے اور ندوے کے معاملے میں اکثر مشورہ کرتے تھے۔ چناں چہ انھوں نے مولانا سے ندوہ کے وفد کو مالیر، کوٹلہ اور اجمیر بھیجنے کے متعلق دریافت کیا، تو مولانا نے جواب دیا کہ ضرور جانا چاہیے، مگر آمد و رفت کے اخراجات وہاں کے لوگ برداشت کریں، کیوں کہ مقامی لوگوں کے مفاد میں ہے۔ اگر ندوہ اس بار کو اٹھاتا ہے تو وہ برداشت نہ کرسکے گا۔

مولانا چاہتے تھے کہ اشاعت اسلام کے لیے کسی مقبول اور مشہور شخص کو معتمد بنادیا جاتا تو کام بنتا، خواہ کانپور میں قیام نہ کرتا۔ ویسے تو تمام اراکین اور معتمدین کچھ نہ کچھ حصہ لیتے ہی تھے۔ معتمد کے نامزد کرنے سے قوم پر اچھا اثر پڑتا اور ضابطہ سے کام ہوتا۔ علی گڑھ کالج کے اراکین اور معتمدین بھی اکثر باہر ہی رہتے تھے مگر کام ضابطہ سے ہوتا تھا (۱۳)۔

مولانا کے منجھلے بھائی مہدی حسن علیل تھے اور اب حالت خطرناک ہوگئی تھی۔ مولانا شبلی اور پورا خاندان پریشان تھا۔

مولانا فکر مند تھے کہ مولانا فراہی کے حالات معلوم کریں۔ اس لیے کہ ان کا تقرر سندھ مدرسۃ الاسلام کراچی میں پروفیسر کی حیثیت سے ہوگیا تھا۔ مولوی اسحٰق نے ان کے متعلق لکھا تو فکر میں کمی ہوئی، مگر یہ معلوم کرنے کے لیے پھر بھی بے چین رہے کہ وہاں کون سی کلاسیں ان سے متعلق ہیں اور کون سے مضامین وہ پڑھاتے ہیں۔ مولوی اسحٰق کا کہیں درخواست دینے کا ارادہ

تھا، اس کے لیے استفسار کیا۔

مولانا الفاروق کے کچھ اجزا لکھ چکے تھے اور کان پور میں مطبع نامی میں چھپنے کے لیے دے آئے۔ چند مطبوعہ اوراق مولوی اسحٰق کے ذریعہ میر ولایت حسین کو بیرنگ بھجوائے تاکہ بحفاظت پہنچ جائیں۔ کلکٹر نے نیشنل اسکول کی امداد والی درخواست خود بورڈ میں پیش کر کے اعانت میں اضافے کی منظور دلا دی، اس وقت تک اضافہ شدہ رقم کا علم نہیں ہو سکا تھا (۱۴)۔

جون کے پہلے ہفتہ میں مولانا مونگیری نے مولانا کو جلسہ، انتظامیہ ندوہ میں شرکت کے لیے لکھا، مگر مولانا اس میں شرکت نہ کر سکے۔ کیوں کہ کالج ۵۔ جون کو کھلتا تھا اگر وہ ٹھہر جاتے تو چھٹی لینا پڑتی اور وہ رخصت گرمیوں کی چھٹی میں شمار ہو جاتی۔ لہٰذا ان کو لکھا کہ مولانا مونگیری مولانا کے بجائے جس کو چاہیں وکیل مقرر کر دیں۔ مولانا کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ اسی زمانے میں ندوہ حجاج کے لیے ایک ریزولیشن پیش کرنے والا تھا، جس سے مولانا کو اختلاف تھا، اس لیے کہ ابھی ندوہ میں یہی تعین نہیں ہو سکا تھا کہ وہ اپنے ہاتھ میں کون سے کام لے گا اور جو مقصد بتلایا گیا تھا وہ بجز عہدہ افتاء کے اور کچھ نہ تھا (۱۵)۔

۲۹۔ جون ۱۸۹۷ء کو مولانا کے منجھلے بھائی مہدی نے انتقال کیا۔ مولانا کو بے حد صدمہ ہوا، چوں کہ آخر وقت مولانا تیمار دار تھے، اس لیے ان پر ان کی موت کا بہت اثر ہوا، اگرچہ مولانا مرحوم کی بعض باتوں سے ناراض رہتے تھے۔ مثلاً یہ کہ انگلینڈ کی عورتوں کی بے باکی کا خطوط میں ذکر یا سوتیلی والدہ کی طرف داری اور اپنے حقوق سے دستبرداری وغیرہ، مگر بہر حال حقیقی بھائی تھے اور بڑے ذہین، لہٰذا مولانا کو افسوس تھا کہ اگر معلوم ہوتا کہ وہ اس قدر جلد دنیا سے سدھار جائیں گے تو ان کی باتوں کو برداشت کرتے اور ناراض نہ رہتے۔ مہدی مرحوم کی یتیم بچی شافیہ کو تسلی دینا چاہتے تھے، لیکن خود بے قرار ہو کر رونے لگتے تھے۔ اپنی چھوٹی بھاوج کی رنجیدہ صورت دیکھ کر بھی رو پڑتے تھے۔ مولوی سمیع سے شکوہ کیا کہ وہ اور دیگر اعزا وطن سے دور ہونے کی وجہ سے اتنے متاثر نہیں، جتنے مولانا تھے کیوں کہ خود غمزدہ اور پھر غمزدوں کو تسلی دینے کی ذمہ داری۔ جب اپنا ہی دل قابو میں نہیں تو دوسروں کو تسلی کیا دیں (۱۶)۔

مولانا فراہی نے مولانا کو تسلی آمیز خط لکھا تو ان کو تسکین ہوئی۔ مولانا اس زمانے میں مہدی مرحوم کی رحلت کے سلسلے میں اعظم گڑھ میں مقیم تھے۔ مولانا فراہی کا یادگار بنانے کا ارادہ تھا اور شاید تنہا بنانے کا ارادہ تھا۔ اس پر مولانا نے استفسار کیا کہ کیا یادگار بنانا چاہتے تھے اور تنہا

کیسے بنواتے۔ نیشنل اسکول کے لیے مولانا ان سے معقول چندہ لینا چاہتے تھے۔ لیکن یادگار کی صورت میں مولانا اس کو بدل خیال کرتے ہوئے چندہ معاف کرنے پر تیار تھے۔ غالباً مولانا فراہی نے مہدی مرحوم کی تصویر مانگی تھی تو مولانا نے حامد نعمانی (اپنے صاحبزادے) کو اس بارے میں لکھنے کا ارادہ کیا۔ مولانا نے الفاروق کے اجزا مطبع نامی کان پور میں چھپنے بھیجنے کی ان کو بھی اطلاع دی اور یہ بھی لکھا کہ ابھی ثلث لکھنا باقی تھی۔ پانی کی کمی ہو جانے کی وجہ سے زمینداری کے لیے قحط کا اندیشہ تھا، اس لیے مولانا متفکر تھے۔ مولانا کراچی کے حالات معلوم کرنے کے لیے بے چین تھے۔ لوگوں کو بھی اشتیاق تھا کہ کراچی کے لوگوں کی حالت، تعلیم کی کیفیت اور وہاں کے رہن سہن کے متعلق معلوم کریں۔ مولانا کو یہ بھی فکر تھی کہ مولانا فراہی اپنے فرائض منصبی کے علاوہ کیا شغل رکھتے تھے کہیں ایسا تو نہیں کہ علمی کاموں سے فرائض کے علاوہ دلچسپی نہ لیتے ہوں (۱۷)۔

مہدی مرحوم کے انتقال کا حادثہ ایسا تھا کہ ان کے والد شیخ حبیب اللہ اس صدمے سے بیمار پڑ گئے تھے اور مولانا جیسے زود حس کے رنج کا تو ٹھکانا نہ تھا۔ مولانا کے والد کو اس بیماری سے ۳۱۔ جولائی کو صحت ہو چکی تھی، مگر مولانا کی طبیعت اس قدر افسردہ تھی کہ وہ کہیں تفریحی سفر کو جانا چاہتے تھے مگر جلسہ، قومی اور والد کی صحت یابی کے جلسے کی خاطر رکے ہوئے تھے۔ مولوی سمیع کے آنے کا امکان نہ تھا، لہٰذا ان سے خواہش کی کہ مطبوعہ نقشہ مع اصلاح و ترمیم کے مولانا کے پاس بھیج دیا جائے تاکہ وہ جلسے میں پیش کر سکیں۔ جلسہ شروع اگست میں ہونے والا تھا (۱۸)۔

مولانا کی خواہش کے مطابق مولوی سمیع نے نقشہ بھیجا تو مولانا بہت خوش ہوئے اور ان کی محنت تحقیق اور مستعدی کی تعریف کا اظہار جلسہ میں کرنے کا ارادہ کیا۔ جلسہ ۱۳۔ اگست تک نہ ہو سکا۔ مولوی سمیع کے خیال میں اسکول سے متعلق جو چیزیں تھیں، ان سے مولانا واقف تھے، مگر اسکول کی نازک حالت کو پہلے بہتر بنانا چاہتے تھے اور اس کے لیے لوگوں میں جوش اور ولولہ پیدا کرنا ضروری سمجھتے تھے ورنہ اسکول کے مستقبل سے مایوس تھے۔ ایک سو روپیہ ماہوار کی آمدنی میں کمی ہو گئی تھی، اس کو پورا کرنے کے لیے بہت متفکر تھے۔ جب ہی جلسہ کرنا ضروری سمجھ رہے تھے کہ لوگ اس بہانے شریک تو ہوتے۔ یہ ضرور ہے کہ تعزیت (مہدی مرحوم کے انتقال کے سلسلے میں) اور تہنیت (والد کی صحت یابی پر) کا اجتماع الضدین تھا تو مگر مولانا جلسے کی کارروائی اس ہوشیاری سے کرنے کا ارادہ رکھتے تھے کہ لوگوں کو اعتراض کا موقع نہ ملتا (۱۹)۔

مولانا اب علی گڑھ واپس آ چکے تھے اور پڑھانے میں مصروف ہو گئے تھے۔ مولانا نے

مولوی سمیع سے دریافت کیا کہ انھوں نے اپنا چندہ بھیجا یا نہیں؟ مولانا کو بعض اپنی باتیں یاد نہ تھیں، لہٰذا مولوی سمیع سے دریافت کیں۔ مثلاً وکالت کا امتحان کس سال دیا؟ رام پور وغیرہ کا سفر (تعلیمی) کب کیا؟ اعظم گڑھ میں تحصیل داری کا مدرسہ کس سال قائم ہوا تھا؟ (۲۰)

جلسہ سالانہ قومی کی روداد چھپوانے کا ارادہ قدرت علی خاں کے وہاں نہ تھا، بلکہ خوش خط صاف اور عمدہ کاغذ پر کسی اور جگہ چھپوانے کا ارادہ تھا۔ اب تک مولوی سمیع کا چندہ نہ ملا تھا، لہٰذا فوراً بندوبست کرنے کو لکھا۔ اس سال انسپکٹر آف اسکول، اسکول دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور بڑی اچھی رپورٹ لکھی اور ہائی اسکول کے لیے بھی اعانت کی سفارش کی، لیکن اس میں ایک شرط تھی کہ نومبر ۹۸ء تک اسکول کی عمارت مکمل ہو جائے۔ لہٰذا مولانا کو عمارت مکمل کرانے کی فکر ہو گئی۔ دسمبر میں حامد نعمانی کی شادی کا ارادہ کیا اور یہ بھی کہ اس روز شادی کی حقیقت اور اس کے مراسم پر پرزور لیکچر دینے کا ارادہ تھا اور بے ہودہ رسموں پر کوئی تنقید اور ان کو مٹانے کا تہیہ کیا (۲۱)۔

شادی کے موقع پر مولوی سمیع کو خصوصی دعوت دی تاکہ لیکچر سے بھی محظوظ ہوں۔ مولانا کا لکھنؤ جانے کا ارادہ نہ تھا۔ شادی دسمبر میں ہونے کی امید نہ تھی، کیوں کہ لڑکی والوں کا خیال تھا کہ وہ دن منحوس تھے، لہٰذا ۱۹۔ جنوری ۱۸۹۸ء کو شادی ہو۔

اس بارے میں خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا۔ اسکول کی عمارت کسی خاص شخص کے برتے نہیں بن رہی تھی، مولانا کا خیال تھا کہ لوگ اسکول کو اپنا نہیں سمجھتے ورنہ اپنے مکان پر تو ہزاروں روپیہ خرچ کرتے تھے اور اسکول کے لیے کچھ نہیں۔ اگر اسکول کی تعمیر پر لوگوں نے توجہ نہ دی تو خود اپنے خرچ سے مکمل کرانے کا ارادہ تھا (۲۲)۔

مولانا دسمبر ۱۸۹۶ء سے رخصت پر تھے اور اعظم گڑھ میں قیام تھا۔ لیکن وہاں جی نہ لگا اور فروری میں علی گڑھ گئے لیکن واپس آگئے (۲۳) اور نومبر ۱۸۹۷ء تک یہیں قیام کر کے علی گڑھ چلے گئے اور کالج میں پڑھانا شروع کر دیا، مگر مزید طویل رخصت کے خواہاں رہے۔ کالج کی کیفیات کا علم مولانا کے اعزا کو ہوتا رہتا تھا۔ لہٰذا مولانا فراہی نے مولانا سے تصدیق کی تو مولانا نے جواب میں لکھا کہ جو خبریں ان تک پہنچیں وہ سب صحیح نہ تھیں، مثلاً یہی خبر غلط تھی کہ شخص مذکور (سید محمود کی طرف اشارہ ہے) نے مولانا کے ساتھ دراندازی کی۔ واقعہ یہ تھا کہ ایک صاحب اور سرسید چاہتے تھے کہ مولانا مستقل طور سے علی گڑھ میں قیام کریں۔ لیکن سید محمود دفعۃً اس کے مخالف ہو گئے

اور اسی اپنی حالت میں بہت کچھ کہہ گئے اور یہ چیز ان کی ہر ایک کے ساتھ عام ہو گئی تھی، حتیٰ کہ وہاں کے رؤسا، ٹرسٹیز اور ارکان کالج اس کے عادی ہو چکے تھے۔ مولانا اس واقعے کے بعد سے پھر سرسید کی کوٹھی نہ گئے۔

مولانا کو علی گڑھ کی آب و ہوا اس زمانے میں موافق تھی۔ کالج سے ترکِ تعلق کا معاملہ یہ تھا کہ سال بھر کی رخصت اسی تجربے کے لیے لی تھی۔ مگر اعظم گڑھ میں مشغول طبیعت نہ لگ سکی کیوں کہ ایسی کوئی دلچسپی نہ تھی کہ سال بھر تک وہ کفایت کر سکتی (خاص دلچسپی کتابوں کی تھی جو وہاں افراط سے میسر نہ تھیں)، اس لیے سوچ رہے تھے کہ کچھ دن علی گڑھ میں کچھ وقت اعظم گڑھ میں اور کچھ ندوے میں گزارتے۔ مولانا اپنی بیماری سے بھی تنگ تھے اس لیے کہیں دل نہیں لگتا تھا اور خانہ بدوش ہو کر رہ گئے تھے اور سوچتے تھے کہ پتا نہیں کیا ہونا ہے (٢۴)۔

حواشی:

١۔۔۔ روداد جلسہ، چہارم، صفحہ ٣٣

٢۔۔۔ روداد جلسہ، چہارم، ندوۃ العلماء، منعقدہ ١۵ تا ١٧- شوال ١٣١۴ھ مطابق ٢١ تا ٢٣- مارچ ١٨٩٧ء، جمعہ تا یکشنبہ، واقع کیمپ میرٹھ، حسبِ ایمائے مجلس انتظامیہ ندوۃ العلماء انتظامی پریس، کان پور میں چھپی، صفحہ ٨

٣۔۔۔ روداد جلسہ، چہارم، ندوۃ العلماء، صفحہ ٢٨

۴۔۔۔ ایضاً، صفحہ ٣١

۵۔۔۔ ایضاً، صفحہ ٣٢

٦۔۔۔ روداد جلسہ میرٹھ، اجلاس دوم، صفحہ ۵٦

٧۔۔۔ روداد جلسہ میرٹھ، صفحہ ٨۴

٨۔۔۔ ایضاً، صفحہ ٨٩

٩۔۔۔ روداد جلسہ میرٹھ، صفحہ ١۵٩

١٠۔۔۔ ایضاً، صفحہ ٩١

١١۔۔۔ روداد ضمیمہ، صفحہ ١٩

١٢۔۔۔ روداد جلسہ چہارم میرٹھ، صفحہ ١

١٣۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ٣١٨، ۴- اپریل ١٨٩٧ء

١۴۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ٣٠، ٢٣- جون ١٨٩٧ء

١۵۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ٣١٩، ٣٠- جون ١٩١۵ء (سال غلط چھپ گیا ہے - ١٨٩٧ء ہونا چاہیے، کیوں کہ

جون ۱۸۹۷ء میں مولانا کا علی گڑھ سے تعلق تھا)

۱۶..... مکاتیبِ اول، صفحہ ۹۷-۹۸، ۲-جولائی ۱۸۹۷ء۔

۱۷..... مکاتیبِ دوم، صفحہ ۲-۳، ۱۱-جولائی ۱۸۹۷ء، اعظم گڑھ سے (مولانا فراہی کے اس خط کو مولانا سید سلیمان ندوی نے مولانا کی پہلی بیوی کے انتقال پر تعزیت سمجھا ہے۔ حالاں کہ مرحومہ کا انتقال پہلے ہی ہو چکا تھا یعنی ۱۸۹۵ء میں تازہ حادثہ مہدی کی موت تھا، جو ۲۹-جون کو ہوا۔ مولانا فراہی کو کراچی اطلاع دی گئی، اس کے بعد تعزیت کا خط آیا پھر مولانا نے اس کا جواب ۱۱-جولائی کو دیا)۔

۱۸..... مکاتیبِ اول، صفحہ ۹۸، ۳۱-جولائی ۱۸۹۷ء۔

۱۹..... مکاتیبِ اول، صفحہ ۹۹، ۱۳-اگست ۱۸۹۷ء۔

۲۰..... مکاتیبِ اول، صفحہ ۹۹، ۱۱-نومبر ۱۸۹۷ء۔

۲۱..... مکاتیبِ اول، صفحہ ۱۰۰، ۲۴-نومبر ۱۸۹۷ء۔

۲۲..... مکاتیبِ اول، صفحہ ۱۰۰-۱۰۱، ۶-دسمبر ۱۸۹۷ء۔

۲۳..... حیاتِ شبلی، صفحہ ۲۳۰

۲۴..... مکاتیبِ دوم، صفحہ ۵-۶، ۹-نومبر ۱۸۹۷ء، (مکاتیب میں ۱۸۹۸ء غلط چھپ گیا ہے جس کی تصحیح حیاتِ شبلی، صفحہ ۳۲۱ کے حاشیہ پر ہے)۔

۱۸۹۸ء

مولانا کو جواہر القرآن کی ضرورت پڑی تو مولوی حسین عطاء اللہ حیدر آبادی (۱) سے منگوائی۔ اس کے وصول ہونے پر ان کو رسید لکھی۔ اس کے بعد طبقاتِ ابن سعد سے حضرت عمرؓ کے متعلق ترجمہ طلب کیا، کیوں کہ الفاروق مکمل ہو رہی تھی، اس کے لیے ضرورت تھی۔ لکھنو اور قرب و جوار میں یہ کتاب نہ مل سکی تھی، ایک صاحب کے پاس تھی مگر انھوں نے دینا مناسب نہ سمجھا۔ ویسے یہ کتاب مولانا کی پڑھی ہوئی تھی، مگر مولانا اس کے اقتباس کا ترجمہ چاہتے تھے اور یہ کتاب ان کے بھائی صاحب کے کتب خانہ میں موجود تھی اس لیے ان کو حاصل کرنے اور ترجمہ کرنے میں بھی دشواری نہ ہوئی (۲)۔

مولانا حمید الدین فراہی نے مولانا کے ذریعے مصر سے کچھ کتابیں منگوانا چاہیں تو مولانا نے منگوا دینے پر رضامندی کا اظہار کیا اور کتابوں کی فہرست طلب کی۔ مولانا کا کالج سے ۶ ماہ کے لیے چھٹی لینے کا ارادہ ہوا۔ یکم مئی سے چھٹی لینا چاہتے تھے، مگر یہ طے نہ کر سکے تھے کہ یہ چھٹیاں کہاں گزاریں۔ الفاروق حصہ دوم بھی مولانا نے تیار کر لی تھی اور تقریباً نصف چھپ بھی گئی تھی (۳)۔

مولانا کو مولانا فراہی نے پھر لکھا تو انھوں نے جواب میں لکھا کہ کتابوں کے لیے مصر و بیروت کی زحمت اٹھانا بے کار ہے، اس کی وجہ یہ تھی کہ بیروت کی ڈاک کا انتظام ناقص تھا۔ باوجود یہ کہ مولانا عرصے سے کتابیں منگواتے رہتے تھے پھر بھی متعدد منی آرڈر ضائع ہو گئے۔ ڈاک خانے سے خط و کتابت کرنے کے بعد ایک دو منی آرڈر کی رقم ملی اور بعض کا پتا نہ لگا۔ مصر ڈاک کے معاملہ میں بہتر تھا مگر اطمینان پھر بھی نہ تھا کیوں کہ وہاں کا منی آرڈر بھی بڑے جھگڑوں میں پڑ گیا تھا اور چھ ماہ بعد رقم واپس ملی تھی۔ لہٰذا مولانا نے ان کی بھیجی ہوئی فہرست کے متعلق اطمینان دلایا کہ مولوی نور الدین توپ خانہ بازار قدیم کان پور سے ساری کتابیں مل سکتی تھیں، لہٰذا انھیں سے خط و کتابت کی جاتی تو بہتر تھا۔ جو موجود نہ ہوتیں، وہ منگوا دیتے، مولانا بھی انھیں سے خرید لیتے تھے۔

بیروت وغیرہ خط بھیجنے کا طریقہ بھی لکھا، یعنی لفافہ پر ڈھائی آنے کا ٹکٹ لگانا، پتا انگریزی اور عربی دونوں میں۔ سب سے مقدم یہ کہ وہاں کی رائج زبان میں خط و کتابت کرنا اور خصوصاً

اصطلاحی الفاظ مثلاً ڈاک خانہ، رجسٹری، قیمت، ٹکٹ وغیرہ کا وہاں کی رائج اصطلاحات میں لکھنا ضروری تھا جواب نہ آنے کی وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ مولانا فراہی کے دوست نے انھیں چیزوں میں غلطی کی ہوگی۔

پروفیسر آرنلڈ علی گڑھ کالج سے چلے گئے جس کا مولانا کو بہت افسوس ہوا۔ ان کے وداعی جلسے بڑی دھوم سے ہوئے۔ کالج میں گرمیوں کی چھٹی جون سے ہونے والی تھی۔ مولانا کا ارادہ وطن یا کشمیر میں چھٹیاں گزارنے کا تھا(۴)۔ مولانا اس زمانے میں بیمار تھے اس کے باوجود اسکول کے لیے فکرمند رہے۔ لہٰذا مولوی اسحٰق کو ان کے غیر ضروری مصارف پر اور اسکول کی خاطر خواہ امداد نہ کرنے پر سختی سے توجہ دلائی(۵)۔

بھوپال میں شاہ جہاں بیگم صاحبہ نے ۱۳۱۵ھ میں نواب سید علی حسن خاں کو ریاست کی تعلیم کا افسر اعلیٰ (ڈائریکٹر) بنایا تھا۔ نواب صاحب نے تعلیمی حالت کا جائزہ لیا تو حالت اچھی نہ پائی لہٰذا انھوں نے نظارۃ المعارف کے نام سے ایک تعلیمی مجلس شوریٰ قائم کی اور اس میں مولانا شبلی اور مولانا ابراہیم صاحب آروی کو شرکت کی دعوت دی۔ مقامی علما اور ان دونوں عالموں کے مشورے سے بھوپال کے مدارس کی اصلاح و تنظیم کا کام شروع کیا۔ مولانا مجلس شوریٰ کے جلسے میں شرکت کے لیے فروری ۱۸۹۸ء میں بھوپال گئے اور فروری کے آخر میں علی گڑھ پہنچ واپس آکر ۲۷۔ فروری اور ۲۔ مارچ کو دو نشستوں میں عام انتظامی معاملات کی تیرہ دفعات لکھیں اور نواب صاحب کو بھیجیں۔ مولانا کا بھوپال کا یہ دوسرا سفر تھا(۶)۔

۸۔ ۹۔ مارچ ۱۸۹۸ء کو ندوۃ العلماء کا کان پور میں جلسہ ہوا تو مولانا شرکت کے لیے کان پور تشریف لائے۔ کان پور میں جلسہ خاص ہونے کی وجہ تمہید میں اس طرح ہے:

"تمہید"

چہ زہرہ خاک مسکیں را کہ توحید خدا گوید	بدیں آلودگی ذات مقدس را ثنا گوید
براوج قاب قوسینش بود ہر شب مقام او	اگر سالک طریق مصطفیٰ را اقتدا گوید

ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسے اب تک جس شان و شوکت کے ساتھ ہوئے اور ملک و قوم ان سے جس قدر متاثر ہوئی ان کو دیکھنے والوں نے دیکھا ہے اور جاننے والے جانتے ہیں۔ اس سال بھی ہمارے احباب چاہتے تھے کہ پانچواں جلسہ اسی پیمانے پر کیا جائے اور بعض مقامات سے اس کی تحریک بھی ہوئی تھی۔ مگر چند دنوں سے ہندوستان پر جو مصائب و آفات نازل ہو رہے ہیں،

ان کو دیکھتے ہوئے اکثر زمانہ شناس حضرات کی رائے اس کے خلاف تھی اور غور کیا جائے تو وہ صحیح بھی تھی، اس لیے کہ وہ مصیبت خیز قحط جو ۱۸۹۵ء میں نازل ہوا اور اپنے شداید اور ہولناک مصیبتوں سے ہزاروں گھر ویران کر دیے، اگرچہ ۱۸۹۶ء کے آخر مہینوں میں دفع ہو چکا تھا، مگر ہنوز اس کی تمام مصیبتوں کا خاتمہ نہیں ہوا تھا کہ بمبئی کے طاعون نے اپنے حدود سے باہر قدم نکالا اور اضلاع پنجاب میں پے در پے اس سے یہ وارداتیں ہونے لگیں اور گورنمنٹ نے اس کو فرد کرنے کے لیے جابجا قرنطینے قائم کیے اور ہر مقام پر حفظ صحت کے قواعد جاری کر دیے، جن کے خیال کرنے سے آرام طلب لوگوں کو سفر کرنے میں سخت دشواریاں پیدا ہو گئیں اور باقتضاے زمانہ یہ امر مشکل نظر آنے لگا کہ لوگ عام طور پر اس اسلامی خدمت کے لیے رنج و راحت کی پروا نہ کر کے سفر کی زحمتیں برداشت کریں گے۔

یہ تمام امور ارکان انتظامیہ کے پیش نظر تھے، اس لیے جلسہ انتظامیہ منعقدہ ۲۹۔ شعبان ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۸ء میں یہ طے ہوا کہ اس سال جلسہ سالانہ اس پیمانے پر نہ کیا جائے، مگر جن ضروری اور مفید تجویزوں کا جاری کرنا منظور ہے۔ ان کا عمل درآمد بدون جلسے کے نہیں ہو سکتا تھا۔ بس اس کے بارے میں فیصلہ ہوا کہ ۱۴۔ ۱۵۔ شوال ۱۳۱۵ھ کو کان پور میں ارکان ندوۃ العلماء کا ایک جلسہ ترتیب دیا جائے اور اسی میں وہ سب ضروری اور اہم امور طے کر لیے جائیں۔

جلسے کی صدارت مولانا مسیح الزماں خاں صاحب استاد حضور نظام دکن و رئیس شاہ جہان پور نے مولانا محمد علی مونگیری کی تحریک اور خاں بہادر منشی اطہر علی صاحب وکیل لکھنو کی تائید سے کی(۷)۔

ندوۃ العلماء کا خاص کارنامہ دو فریق کے علما کو ملانا تھا، جس کے متعلق روداد میں اس طرح ہے:

سب سے زیادہ یورپ میں ان ہنگاموں کی کثرت تھی اور اسی کے متعلق جو مقدمہ بازیاں ہوا کرتی تھیں۔ اس میں بلا مبالغہ ہزار ہا روپیہ مسلمانوں کا ضائع ہو رہا تھا، مگر الحمد للہ جب سے مولانا شاہ امانت اللہ صاحب علیہ الرحمہ اور مولانا ابو محمد ابراہیم بانی مدرسۃ احمدیہ آرہ کے درمیان ندوۃ العلماء نے صلح کرا دی، وہ سب ہنگامے فرو ہو گئے اور پھر ان بزرگوں کے اثر سے احناف اور غیر مقلدین میں کوئی نزاع نہیں پیدا ہوا۔ یہ کارنامہ ندوۃ العلماء کا سرسری نگاہ سے دیکھنے کے قابل نہیں(۸)۔

جلسے میں پہلی تجویز دار العلوم کے مقام کے سلسلے میں پاس ہوئی، جس میں دہلی کے بجائے لکھنو میں دار العلوم قائم کرنا طے پایا۔ دوسری تجویز میں طے ہوا کہ دار العلوم کا ابتدائی درجہ وسیع پیمانے پر کھولا جائے، پھر بتدریج اس کے اور درجے کھولے جائیں۔ تیسری تجویز مولانا سید محمد علی مونگیریؒ ناظم ندوۃ العلماء نے پیش کی کہ ندوۃ العلماء کا ایک وفد روسائے لکھنو کی خدمت میں بھیجا جائے، وہ وہاں پہنچ کر دار العلوم کے لیے زمین تجویز کر کے اسے حاصل کرے اور بالفعل کام شروع کرنے کے لیے کوئی مکان پسند کرلے۔ مولوی شبلی نے اس کی تائید کی اور باتفاق آرا یہ تجویز منظور ہوئی لکھنو کے لیے وفد کے ارکان کا چناؤ اتفاق آرا سے ہوا اور اس میں مولانا شبلی بھی منتخب کیے گئے (۹)۔

اجلاس دوم میں مولانا شبلی نے مولانا شاہ امانت اللہ صاحب مرحوم کے انتقال پر افسوس ظاہر کیا اور دعاے مغفرت کی تحریک کی۔ اس تحریک کے وقت مندرجہ ذیل تقریر کی:

"قبل اس کے کہ آج اور کوئی کارروائی شروع کی جائے، ایک افسوسناک لیکن ناگزیر اور ضروری کام ندوہ کے سامنے ہے۔ آپ صاحبوں کو شاید معلوم ہو کہ مولانا شاہ امانت اللہ صاحب نے جو ایک مشہور و معروف بزرگ اور ہماری مجلس ندوۃ العلماء کے بہت بڑے رکن اور معاون تھے، چند روز ہوئے دار فانی سے عالم جاودانی کو انتقال فرمایا۔ مولانا کے اوصاف اور فضائل کی تفصیل اس وقت بیان نہیں کی جاسکتی، لیکن اس قدر کہنا ضروری ہے کہ مولانا میں ایسی بہت سی خصوصیات تھیں، جن کی وجہ سے وہ تمام علما کی جماعت میں ایک ممتاز اور جداگانہ حیثیت رکھتے تھے۔ وہ جس عظمت و شان، خودداری اور پاس وضع، بلند نظری اور عالی حوصلگی سے زندگی بسر کرتے تھے، اس سے اسلامی شان کا جلوہ نظر آتا تھا۔ جب وہ وعظ و تبلیغ کی ضرورت سے سفر کرتے تھے تو جس طرف ان کا گزر ہوتا تھا ایک غلغلہ پڑ جاتا تھا اور غیر مذہب والوں پر اس کا اثر پڑتا تھا۔ وہ ندوۃ العلماء کے بہت بڑے قوت بازو تھے۔ اکثر جلسوں میں تشریف لاتے تھے۔ ندوے کے وفود کے ساتھ سفر کرتے تھے۔ جب ندوے نے غازی پور کا سفر کیا تو مولانا نے جس عظمت و شان سے ندوے کی جماعت کا استقبال کیا، کسی بڑے سے بڑے حاکم یا افسر کو بھی کسی موقع پر یہ بات نصیب نہ ہوگی۔ مولانا مرحوم کی ذات سے ندوہ کی بہت سی امیدیں وابستہ تھیں، لیکن افسوس ہے کہ ہماری بدقسمتی سے موت نے سب کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن جہاں ہم کو مولانا کے بے وقت انتقال کرنے سے سخت صدمہ پہنچا ہے، یہ بات تسلی اور اطمینان کے قابل ہے کہ ان کے

فرزندِ رشید مولوی شاہ ابوالخیر صاحب، (۱۰) جو اس موقع پر تشریف رکھتے ہیں، مولانا مرحوم کے ایسے قائم مقام ہیں جن سے ہم کو وہی تمام امیدیں ہیں جو مولانا مرحوم کی ذات سے تھیں۔ مولوی ابوالخیر صاحب کی وجاہت، فصاحت لسانی، صورت، شکل، لب و لہجہ سے ہر شخص قیاس کر سکتا ہے کہ جس طرح ان ظاہری اور محسوس باتوں میں وہ اپنے پدر بزرگوار کے نمونہ اور گویا ان کی تصویر ہیں، اور تمام محاسن و اخلاق میں بھی وہ سرتاپا مولانا مرحوم کی نظیر ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ غازی پور میں جو مولانا کا محل اقامت تھا۔ مسلمانوں نے ان کو مولانا مرحوم کا سجادہ نشین تسلیم کیا اور خاص غازی پور کے لوگوں سے زیادہ کوئی شخص قائم مقامی کے حق کا اندازہ نہیں کر سکتا ہے۔ مولوی ابوالخیر صاحب کو ندوے کے اجلاس میں، ہم اسی حیثیت سے دیکھتے ہیں جس طرح ان کے والد بزرگوار کو دیکھتے تھے اور ان کی ذات سے، ہم کو وہی تمام امیدیں ہیں جو مولانا مرحوم کی ذات سے تھیں۔ آخر میں میں یہ تحریک پیش کرتا ہوں کہ ندوے کی طرف سے اظہار تاسف کے ساتھ مولانا مرحوم کے لیے دعاے مغفرت کی جائے اور یہ امر درج کارروائی اجلاس ہذا کیا جائے (۱۱)۔"

اس کے بعد مولوی شبلی صاحب نعمانی نے یہ تحریک کی کہ اس یادداشت (ندوۃ العلماء کی کارروائی معہ درخواست) نواب لفٹنٹ گورنر بہادر بالقابہ کی خدمت میں خان بہادر منشی اطہر علی صاحب وکیل اور خان بہادر چودہری نصرت علی صاحب رئیس سندیلہ اسسٹنٹ سکریٹری انجمن تعلقداران اودھ پیش کریں (۱۲)۔

مولوی محمد شبلی صاحب نعمانی نے کہا کہ علما پر یہ الزام دیا جاتا ہے کہ وہ خود کسی کام کو اپنے روپے سے نہیں کرتے۔ اس واسطے میں یہ تحریک پیش کرتا ہوں کہ درجہ ابتدائی دارالعلوم کے ابتدائی مصارف کے متکفل ارکان انتظامیہ ہو جائیں۔ مولوی مسیح الزماں صاحب نے تائید کی اور تجویز بالاتفاق منظور ہوئی۔ شمس العلما شبلی صاحب نے ۔۔۔۔ روپیہ چندہ دینا منظور کیا۔

ایک اور تجویز گورنمنٹ اسکول کان پور میں دینیات کی تعلیم کے سلسلے میں حکیم سید عبدالحی صاحب نے پیش کی جس کی تائید مولانا شبلی نے کرتے ہوئے کہا:

"میرا قیام اگر کان پور میں ہوتا تو میں نہایت خوشی سے اس کو قبول کر لیتا۔ اس کے بعد مولوی عبداللطیف صاحب مفتی دفتر ندوۃ العلماء سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ کسی قدر وقت تدریس میں بھی صرف کرتے ہیں۔ اس دینی خدمت کو بالفعل قبول کر لیجیے۔" مولوی صاحب نے اظہار مسرت کے ساتھ اس کو قبول کر لیا۔

چوں کہ گورنمنٹ اسکولوں میں دینیات کی تعلیم کے محرک مولوی مشتاق حسین رئیس امروہہ (وقار الملک) تھے اور انھوں نے کوشش کرکے گورنمنٹ سے منظوری حاصل کی تھی اور اس تعلیم کو ندوۃ العلماء سے متعلق یا نگرانی میں کرنا چاہتے تھے، اس لیے مولانا نے تحریک کی مندرجہ بالا تجویز کی ایک نقل مولوی صاحب کے پاس بھیجی جائے۔ خان بہادر منشی اطہر علی وکیل نے اس کی تائید کی اور تحریک بالاتفاق منظور ہوئی۔

وفد ۱۰۔ مارچ ۱۸۹۸ء کو لکھنو کے لیے روانہ ہوا مگر باوجود اس کے کہ وفد کے لیے مولانا بھی نامزد ہوئے تھے، مگر نہ جاسکے اور علی گڑھ چلے گئے (۱۳)۔ مولانا ندوے کے جلسے کے بعد علی گڑھ چلے گئے۔ ۲۷۔ مارچ ۱۸۹۸ء کو سرسید نے چند روز کی علالت کے بعد انتقال کیا۔ مولانا پر ان کی موت کا بے حد اثر ہوا۔ ۲۹۔ مارچ کو انھوں نے بڑے دکھ کے ساتھ نواب علی حسن خاں کو اس سانحہ کی اطلاع بھوپال لکھی۔ لکھتے ہیں:

نمی دانم حدیث نامہ چوں است ہمیں دانم کہ عنوانش بخوں است

نزعت ارکان الملت اعنی انتقل السید احمد خان بہادر الیٰ جوار رحمۃ ربہ، وذالک یوم الاحد ۲۷ مارچ وتفرق شملنا انی لااقدر علی ان اشتغل بشیء الا بعد برھۃ من الزمان، والسلام شبلی نعمانی علی گڑھ۔ ۲۹۔ مارچ ۱۸۹۸ء(۱۴)

مولانا نے ۲۔ اپریل ۱۸۹۸ء کو بھوپال کے لیے دوسری یادداشت مرتب کی۔ سید سلیمان ندوی نے اس کی تفصیل اس طرح لکھی ہے:

"ایک میں طلبہ کے امتحان اور وظیفوں کے قواعد ہیں اور دوسرے میں پہلے مدرسین کی حاضری اور رخصت کا دستور العمل اور پھر اس کے نصاب کا خاکہ اور تقسیم اوقات کا نقشہ ہے۔

دستور العمل وہدایات برائے مدرسین

دفعہ نمبر ۱ تمام مدرسین کو ضرور ہوگا کہ وقت معین پر مدرسہ آئیں۔

دفعہ نمبر ۲ ایک حاضری کی کتاب مدرس اول کے کمرے میں موجود ہوگی۔ ہر مدرس مدرسہ میں آنے کے ساتھ ہی اپنی حاضری اپنے قلم سے اس میں لکھ دے گا۔ اس کتاب میں تاریخ، دن، وقت، نام اور دستخط کے خانے ہوں گے (پنجاب میں عموماً یہ طریقہ جاری ہے)۔

دفعہ نمبر ۳ ہر مدرس اپنے طلبہ کی حاضری لے گا۔ طالب العلم غیر حاضر ہو تو اس پر جرمانہ اور دیر میں آئے تو خفیف تنبیہ کرے گا۔

دفعہ نمبر ۴ کسی مدرس کو جائز نہ ہو گا کہ اوقاتِ مدرسہ میں (بغیر کسی اتفاقیہ خاص ضرورت کے) مدرسہ سے باہر جائے یا ان اوقات میں کوئی شخص اس سے ملنے آئے۔

دفعہ نمبر ۵ مدرسین کو ایک دن کی رخصت دینے کا اختیار مدرس اعلیٰ کو ہو گا اور اس سے زیادہ کے لیے بتوسط مدرس اعلیٰ کے سررشتہ تعلیم کے افسر کے پاس درخواست بھیجنی ہوگی۔

دفعہ نمبر ۶ جو مدرس کسی دن مدرسے میں نہ آئے تو ضرور ہو گا کہ وہ رخصت کی درخواست پہلے بھیج کر منظوری حاصل کرلے۔

دفعہ نمبر ۷ تعلیم نقشہ۔ انضباط اوقات کے موافق دی جائے گی اور ہر مہینہ کے آخر میں ایک کتاب میں جو اسی غرض کے لیے تیار کی جائے گی۔ ہر مدرس کو یہ درج کرنا ہو گا کہ اس مہینہ میں ہر صف کو کس قدر تعلیم دی گئی۔

دفعہ نمبر ۸ ہر مہینہ کے اخیر میں ہر مدرس اپنے طلبہ کا امتحان لے گا اور تاریخ امتحان ایک کتاب میں درج کرے گا۔

دفعہ نمبر ۹ امتحانات نہایت احتیاط کے ساتھ بلارورعایت لیے جائیں گے (۱۵)۔"

اس کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نے اپنے سامنے قدیم و جدید تعلیم کے طریقوں کو سامنے رکھ کر یہ یادداشت مرتب کی تھی اور چوں کہ ان کا تعلق دونوں طرز تعلیم سے تھا۔ اس لیے تجربات سے فائدہ اٹھا کر تیار کی تھی۔

مولانا کے دوست حکیم مولوی محمد عمر کو کسی خانگی معاملے میں غلط فہمی کی وجہ سے کچھ تکلیف پہنچی، جس پر انھوں نے مولانا کو سخت خط لکھا۔ مولانا نے اس کے جواب میں ان کے رنج کو تسلیم کیا اور اس معاملے سے اپنی برأت کی اور یہ بھی لکھا کہ وہ جو کچھ مولانا کے لیے کرنا چاہتے تھے، نہ کریں۔ اس لیے کہ وہ بجز قومی کام کے کسی کا احسان لینا پسند نہیں کرتے (۱۶)۔

سرسید کے انتقال کے بعد تو مسٹر بک کو کھل کھلانے کا موقع ملا تھا۔ کالج کے سیاہ و سفید کے مالک تھے اور سید محمود ان کی مٹھی میں۔ پھر ان کی حالت (مے نوشی کی زیادتی سے) اور بگڑ گئی تھی۔ مولانا اسکول میں خاصا چندہ دے چکے تھے اور مزید اس امید پر دینے کو تیار تھے کہ شاید لوگوں کو احساس ہو اور قومی کام سمجھ کر اس میں حصہ لیں (۱۷)۔

مولانا کا ارادہ تو پہلے ہی سے چھٹی لینے کا تھا۔ لہٰذا مئی ۱۸۹۸ء سے ۶ ماہ کی رخصت لی اور بعد کو استعفیٰ بھیج دیا۔ اب مولانا کا کالج میں رہنا بے کار بھی تھا، اس لیے کہ ایک ہمدرد تھا نہ رہا۔ سرسید کے بعد کالج جن ہاتھوں میں پہنچا، ان سے مولانا مطمئن نہ تھے (۱۸)۔ جون ۱۸۹۸ء میں اعظم گڑھ آئے اور اپنے خاندانی باغ میں چھوٹے سے کچے بنگلہ میں قیام کیا۔ اس بنگلہ کو ۱۸۹۲ء سے پہلے بنوالیا تھا اور اس کا نام شبلی منزل رکھا تھا (۱۹)۔

اس قیام میں مولانا نے تین کام کیے، ایک تو الفاروق کے ناتمام حصے کی تکمیل شروع کی، دوسرے نیشنل اسکول پر پوری توجہ دی اور اس کے لیے لوگوں پر زور ڈالا کہ پابندی سے چندہ دیں، تیسرے اپنے ذاتی کتب خانہ کو ترتیب دیا، جس میں یورپ کی مطبوعات، مصری مطبوعات اور ہدیۃً ملی ہوئی کتابیں شامل تھیں۔ طبیعت اس زمانے میں بھی مضمحل رہتی تھی، لہٰذا کشمیر جانے کے خیال کو تقویت ہوئی اور جون کے آخر میں کشمیر روانہ ہو گئے۔ کشمیر کی آب و ہوا بھی مولانا کو راس نہ آئی اور کمزور کو اور کمزور بنا دیا۔ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"کشمیر میں خواجہ سعد الدین صاحب مرحوم جن کے خاندان میں کشمیر کا عہدہ قضا موروثی تھا، وہ علی گڑھ میں مولانا لطف اللہ صاحب مرحوم سے پڑھتے تھے۔ یہیں قیام کے زمانے میں ان سے مولانا کے مراسم قائم ہو گئے تھے۔ مولانا نے کشمیر کا قصد فرمایا تو انھوں نے میزبانی کا فرض ادا کرنا چاہا، مگر مولانا ایک ایسے محلے میں ایک مکان لے کر رہے، جو نہایت نمناک تھا۔ خواجہ سعد الدین صاحب نے منع بھی کیا مگر مولانا نے اسی مقام کو پسند کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک ہی ہفتہ رہنے پائے تھے کہ سخت بیمار پڑے۔ الفاروق جلد دوم کا خاتمہ وہیں ۵۔ جولائی ۱۸۹۸ء کو قلم سے لکھا۔ مولانا فرماتے تھے جس وقت ہاتھ سے قلم رکھا ہے میں بستر پر بے ہوش پڑ گیا۔"

اور آگے چل کر لکھتے ہیں:

"اور جب تک وہاں رہے، بیمار ہی رہے، آخر ذرا طبیعت سنبھلی تو وطن کا رخ کیا (۲۰)۔"

۳۱۔ جولائی ۱۸۹۸ء کو مولانا وطن میں تھے اور اس کمزوری میں بھی نیشنل اسکول کے لیے حمید الدین فراہی کو تعمیر کی مد میں چندہ دینے کے لیے لکھا، اور لکھا کہ چندہ دینے کا وقت یہی ہے۔ میں چندے کے علاوہ ڈھائی سو روپے تعمیر میں مزید دے چکا ہوں، پھر بھی سو دو سو کی رقم کے بغیر تمام کمرے ناتمام پڑے ہیں اور خراب ہوتے ہیں۔ لہٰذا جو کچھ بھیجنا ہے جلد بھیجا جائے (۲۱)۔

اگست میں مولانا کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی اور ان کی علالت سے ان کے منجھلے بھائی

مولوی اسحق بہت پریشان ہوئے اور ان کو الہ آباد بلایا تاکہ وہاں باقاعدہ علاج کرائیں۔ مولانا نے معذوری لکھی کہ چوں کہ طبیعت دو چار گھنٹے بھی یکساں نہیں رہتی، بلکہ کئی مرتبہ حالت بہت خراب ہو گئی، اس لیے خطرہ تھا کہ ایسی حالت سفر میں پیش آئی تو جان کے لالے پڑ جانے کا اندیشہ تھا۔ اگر مرض کی تشخیص پر ایسے ہی اصرار تھا تو حکیم صاحب کو اعظم گڑھ ہی بھیج دیا جاتا تاکہ وہیں آکر تشخیص کر کے باقاعدہ علاج کرتے، ورنہ پھر انتظار کیا جاتا کہ بنارس کی ریل چلنا شروع ہو جاتی۔ اس زمانے میں اعظم گڑھ سے براہ شاہ گنج بنارس کے لیے ریل جاری نہیں ہوئی تھی، اس لیے الہ آباد کے سفر میں بڑی دشواری تھی اور پھر مریض کے لیے تو جان جوکھم کا کام تھا (۲۲)۔

اسی زمانے میں محسن الملک عیادت کو آئے اور بنگلہ (شبلی منزل) میں تین دن رہے۔ ان کی آؤ بھگت میں ان کو چلنا پھرنا پڑا مگر اس کو برداشت کر لیا۔ گرمی کی وجہ سے بدن میں طاقت محسوس ہو رہی تھی۔ مولوی اسحق سے خواہش کی کہ کوئی ماہر طبیب یا ڈاکٹر اعضائے رئیسہ کی تشخیص کے لیے بھیج دیں اور خود آنے میں جلدی نہ کریں کیوں کہ پانچ چھ دن سے طبیعت بہتر تھی (۲۳)۔

جب ذرا طبیعت سنبھلی تو اپنے بھائی کے پاس الہ آباد چلے گئے۔ ایم مہدی حسن (مہدی افادی) کی لطیف اور نکتہ خیز تحریروں کے بڑے معترف تھے، چناں چہ ان کا خط پڑھ کر ان کو لکھا کہ اس قسم کی تحریریں کسی تصنیف کے لیے وقف ہوتیں تو خوب ہوتیں۔ ان کی کوشش تھی کہ الفاروق تمام خوبیوں کی جامع ہو۔ الہ آباد سے جلد اعظم گڑھ واپسی کا ارادہ تھا۔ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ اعظم گڑھ واپس آکر پھر لکھنو چلے آئے (۲۴)۔ اسی زمانے میں الفاروق مطبع نامی کان پور میں بڑے اہتمام سے چھپ رہی تھی۔ اس وقت تک ایک حصہ، جس کے ۳۱۲ صفحات تھے، چھپ کر تیار ہو گیا تھا۔ لوح طلائی اور لاجوردی تھی اور کاغذ اس قدر اعلیٰ تھا کہ ہندوستان میں اس وقت تک استعمال نہیں ہوا تھا۔ مہدی افادی نے کسی قدر داں کا ذکر کیا تھا کہ چرمی کاغذ پر لوح چھپوانا چاہتے ہیں۔ مولانا نے لکھا کہ وہ قدر داں اگر اس کاغذ کو دیکھیں گے تو چرمی کاغذ پر بھی ترجیح دیں گے۔ الفاروق کے کل صفحات کا اندازہ تقریباً چھ سو تھا۔ مولانا اس وقت بھی بیمار ہی تھے اور جھوائی ٹولہ کے مشہور حکیم عبدالعزیز صاحب کے زیر علاج تھے۔ مہدی حسن کلیات قاآنی منگوانا چاہتے تھے، لہٰذا مولانا نے کتب فروش کا نام لکھا (۲۵)۔

لکھنو میں مولانا کا قیام دفتر ندوۃ العلماء میں تھا جو کان پور سے ۱۵۔ ربیع الثانی ۱۳۱۶ھ

مطابق ۲۔ ستمبر ۱۸۹۸ء کو گولہ گنج میں راجہ سینڈی سے خریدے ہوئے مکان میں منتقل ہو گیا تھا (۲۶)۔

دار العلوم کو اسی مکان میں ۹۔ جمادی الاول ۱۳۱۶ھ مطابق ۲۶۔ ستمبر ۱۸۹۸ء کو کھولا گیا اور افتتاحی جلسہ کا اعلان ۱۷۔ جمادی الآخر ۱۳۱۶ھ مطابق ۲۔ نومبر ۱۸۹۸ء کے لیے کیا گیا۔ چوں کہ دار العلوم ۲۶۔ ستمبر کو کھولا گیا اور مولانا ۱۹۔ ستمبر کو لکھنو میں موجود تھے، لہذا گمان غالب یہی ہے کہ مولانا دار العلوم کے افتتاح کے موقع پر موجود تھے۔ مگر افتتاحی جلسہ جو ۲۔ نومبر ۱۸۹۸ء کو ہوا اس میں شریک نہیں ہوئے، کیوں کہ کارروائی جلسہ۔ افتتاح دار العلوم میں شریک حضرات میں ان کا نام نہیں ملتا ہے۔ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"مگر پھر وہ اعظم گڑھ واپس آگئے، کچھ نہ کچھ علاج ہوتا رہا، مگر طبیعت راہ پر نہ آتی تھی (۲۷)۔"

اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ افتتاحی جلسہ سے قبل ہی اعظم گڑھ واپس چلے گئے۔ آگے چل کر سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"معلوم ہوتا ہے کہ نومبر و دسمبر ۱۸۹۸ء میں ان کی حالت سنبھل گئی۔ چناں چہ وہ سفر کے قابل ہو گئے۔ بعض حالات کی بنا پر جس کی تفصیل نہیں ۳۔ دسمبر ۱۸۹۸ء کو وہ علی گڑھ جاتے ہیں (۲۸)۔"

۱ یہ بھی ممکن ہے کہ ۳۔ دسمبر سے کچھ قبل علی گڑھ گئے ہوں، کیوں کہ ۳۔ دسمبر کو مولوی حمید الدین کو خط لکھا۔

علی گڑھ میں اس قسم کے حالات تھے کہ کچھ قیام کا ارادہ تھا۔ مولوی حمید الدین سے دریافت کیا کہ ان کی معروفیت کیا تھی، کوئی علمی کام بھی کر رہے تھے یا نہیں؟ اسکول کے سلسلے میں ان کا ماہوار چندہ وصول نہ ہونے پر یاد دہانی کی اور باقی اور حال کا چندہ جلد طلب کیا۔ ان کے ذاتی کتب خانے میں چند کتابوں کا اضافہ ہوا تھا، اس کی فہرست سے بھی اطلاع دی (۲۹)۔

حواشی:

۱.... مولانا حسین عطاء اللہ صاحب سر آسمان جاہ کے اسٹاف میں سے تھے اور کتابوں کا ایک ذاتی کتب خانہ رکھتے تھے۔

۲.... مکاتیب اول، صفحہ ۲۷-۳۲۶، ۱۹-جنوری ۱۸۹۸ء۔

۳.... مکاتیب دوم، صفحہ ۳، ۴-فروری ۱۸۹۸ء۔

۴..... مکاتیب دوم، صفحہ ۲-۳، ۷- فروری ۱۸۹۸ء - علی گڑھ

۵..... مکاتیب اول، صفحہ ۲۹، ۱۶- فروری ۱۸۹۸ء

۶..... حیاتِ شبلی، صفحہ ۳۰-۳۲۳-

۷..... روداد جلسہ پنجم ندوۃ العلماء منعقدہ ۱۳، ۱۵، شوال ۱۳۱۵ھ مطابق ۸، ۹- مارچ ۱۸۹۸ء بروز دو شنبہ و سہ شنبہ، واقع کان پور (جلسہ خاص) حسب ایمائے مجلس انتظامیہ ندوۃ العلماء، اسلامی پریس تحفہ محمدیہ کان پور-

۸..... روداد، صفحہ ۱۰، ۵ و ۱۳

۹..... ایضاً، صفحہ ۲۱، ۲۷ و ۳۱

۱۰..... مولانا شاہ ابوالخیر صاحب فصیحی غازی پوری مولانا ابوالخیر صاحب دہلوی سے مختلف ہیں-

۱۱..... اجلاس دوم منعقدہ ۱۵- شوال ۱۳۱۵ھ مطابق ۹- مارچ ۱۸۹۸ء بروز سہ شنبہ، صفحہ ۳۲

۱۲..... روداد، صفحہ ۳۶

۱۳..... روداد، صفحہ ۳۷، ۳۹ و ۳۸

۱۴..... مکاتیب دوم عربی، صفحہ ۲۶۱، ۲۹- مارچ ۱۸۹۸ء

۱۵..... ایضاً، صفحہ ۲۶-۳۲۵

۱۶..... مکاتیب اول، صفحہ ۳۹، ۱۴- اپریل ۱۸۹۸ء

۱۷..... مکاتیب دوم، صفحہ ۵-۳، ۱۹- اپریل ۱۸۹۸ء

۱۸..... حیاتِ شبلی، صفحہ ۳۳۲

۱۹..... اسی میں دارالمصنفین قائم ہے-

۲۰..... حیاتِ شبلی، صفحہ ۳۳۴، ۳۳۵

۲۱..... حمید الدین کے نام مکاتیب دوم، صفحہ ۱۰۵، ۳۱- جولائی ۱۸۹۸ء

۲۲..... مکاتیب اول، صفحہ ۳۰-۲۹، ۲۲- اگست ۱۸۹۸ء - اس خط پر غلطی سے مارچ چھپ گیا ہے، اگست ہونا چاہیے - حیاتِ شبلی، صفحہ ۳۳۴

۲۳..... مکاتیب اول، صفحہ ۳۱

۲۴..... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۹۷، ۳- دسمبر ۱۸۹۸ء

۲۵..... مکاتیب دوم، صفحہ ۹۸-۱۹۷

۲۶..... کارروائی جلسہ افتتاح دارالعلوم

۲۷..... حیاتِ شبلی، صفحہ ۳۳۶

۲۸..... ایضاً، صفحہ ۳۳۶

۲۹..... حمید الدین کے نام مکاتیب دوم، صفحہ ۱۰۶

۱۸۹۹ء

مہدی حسن افادی کو الفاروق کا انتظار اور اس کے پڑھنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ وہ مولانا سے اس کے متعلق بار بار دریافت کرتے تھے، لہذا مولانا نے اطلاع دی کہ الفاروق چھپ گئی، پھر بھی مطبع سے آتے آتے ڈیڑھ دو ہفتے انتظار کرنا ہوگا، اس وقت بھیجی جا سکے گی۔ چھ ماہ سے بیمار رہنے کی اطلاع بھی دی (۱)۔ ۸۔ جنوری ۱۸۹۹ء کو بھی بیمار ہی تھے۔

مولانا نے اپنے دوست مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کو چھپا ہوا مسودہ بھیجا اور یہ بھی خواہش کی کہ عبدالشکور خاں (مکتوب الیہ کے چچا) کو بھی دکھلایا جائے۔ لیکن زیادہ شہرت کی ضرورت نہ تھی (۲)۔ اس زمانے میں علم کلام پر لکھنا شروع کر دیا تھا، چناں چہ اس فن پر کتابیں دور دور سے منگوا رہے تھے۔ اس فن پر کوئی قلمی کتاب شروانی صاحب کے پاس تھی، لہذا مولانا نے اس کی نقل چاہی (۳)۔

مولانا کی تمام بیماریوں کا سبب معدے کا فساد تھا جو دور ہونے کا نام نہیں لیتا تھا۔ غذا ٹھیک ہضم نہیں ہوتی تھی۔ کئی کئی وقت بھوک نہیں لگتی تھی۔ کبھی نفخ رہتا تھا، کبھی قبض اور اکثر تبخیر کی شکایت رہتی تھی۔ اس وجہ سے نہ قوت آتی تھی اور نہ بظاہر تندرستی ٹھیک ہو رہی تھی۔ شب و روز پلنگ پر پڑے رہتے تھے۔ ضروری ڈاک کے لیے ایک ملازم دس روپے ماہوار پر رکھ لیا تھا۔

مولانا اپریل میں بھی بیمار رہے۔ ۱۵ یا ۱۶۔ اپریل سے بخار میں شدت تھی۔ پروفیسر آرنلڈ اس زمانے میں لاہور میں تھے اور انھوں نے غزنوی دور کے مشہور شاعر منوچہری کا دیوان مطبوعہ یورپ مستعار مانگا تھا، لہذا مولانا نے شروانی صاحب کو لکھا کہ وہ اپنا نسخہ لاہور کالج کے پتے پر بھیج دیں۔ اب الفاروق چھپ چکی تھی اور مولانا کی خواہش تھی کہ اس پر شروانی صاحب ریویو لکھیں جس طرح انھوں نے المامون پر ریویو لکھا تھا۔

مولانا نے اس سے قبل الفاروق کے شائع ہونے کی اطلاع دی تھی۔ غالباً شروانی صاحب کو وہ خط نہیں ملا تو انھوں نے اس کے متعلق دریافت کیا۔ پھر الفاروق کے متعلق لکھا اور یہ بھی لکھا کہ چوں کہ وہ قدردان تھے، لہذا مجلد بھیجی جاتی اور اس میں ذرا دیر تھی (۴)۔ مولانا کی طبیعت

اب بھی خراب تھی۔

مسلسل بیماری سے اب وہ بہت پریشان تھے اور اس بیماری کی وجہ سے سفر میں دشواری تھی۔ لہذا اس سے بہت پریشان تھے کہ بیماری احباب سے ملنے میں رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ ڈاکٹری علاج کر رہے تھے (۵)۔ اپنی بیماری کی وجہ سے ندوۃ العلماء کے جلسے منعقدہ ۱۳۔ ذی قعدہ ۱۳۱۶ھ مطابق ۲۶۔ مارچ ۱۸۹۹ء میں بھی شریک نہ ہو سکے تھے۔ الفاروق پر ریویو معارف کو بھیجنے کو لکھا، اگر اس کے اڈیٹر (وحید الدین سلیم) اس کو شائع کرنے پر تیار ہوں، کیوں کہ وہ مولانا سے ناراض تھے (۶)۔

جب ڈاکٹری علاج سے بھی فائدہ نہ ہوا تو مولانا نے سوچا کہ دہلی کے مشہور طبیب حکیم عبدالمجید خاں صاحب سے علاج کرائیں۔ لہذا شروانی صاحب سے خواہش کی وہ حکیم صاحب کو خط لکھیں۔ ان کا جواب آنے پر دہلی کے سفر کا ارادہ کیا۔ شروانی صاحب سے خواہش کی کہ وہ بھی دلی چلیں۔ اس کا بھی امکان تھا کہ نواب محسن الملک بھی دلی جائیں (۷)۔

اسی زمانے میں اعظم گڑھ میں ایک مسلمان اسسٹنٹ سول سرجن تبادلہ ہو کر آئے تو مولانا نے ان سے رجوع کیا۔ انھوں نے بڑی توجہ سے علاج شروع کیا اور کچھ فائدہ بھی معلوم ہوا۔ لہذا مولانا نے سفر کے ارادے کو ملتوی کر دیا اور شروانی صاحب کو لکھا کہ ان کے دوسرے خط تک کوئی انتظام نہ کریں، پھر بھی حکیم صاحب کا جو جواب آئے اس سے ضرور مطلع کریں۔ ریویو کے متعلق دریافت کیا کہ کہاں چھپنے کو بھیجا (۸)۔

ڈاکٹری علاج سے خاصا فائدہ تھا۔ شروانی صاحب کو ادب الکاتب کا ایک نسخہ مل رہا تھا، مگر ناقص تھا تو لکھا کہ ناقص خریدنے کی کیا ضرورت تھی جبکہ مصر میں مثل السائر کے حاشیے پر مکمل چھپ گئی تھی اور مل رہی تھی (۹)۔ دار العلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ سے مولانا مطمئن نہ تھے کیوں کہ وہ قدیم و جدید تعلیم کا سنگم چاہتے تھے اور وہاں سب قدیم طرز کے اساتذہ تھے اور وہ بھی دیوبند سے کم تر، لہذا ان کے خیال میں قوم کو غلط امیدیں دلائی گئی تھیں (۱۰)۔

ابھی پورے طور پر تو طبیعت ٹھیک نہیں ہوئی تھی، لیکن ڈاکٹری علاج سے اتنا فائدہ تھا کہ امید بندھی تھی پوری صحت ہو جائے گی۔ لہذا سوچ رہے تھے کہ صحت ہو جانے پر اپنے خاص دوستوں کو بلائیں جن میں مولانا حالی پانی پتی، خواجہ عزیز الدین لکھنوی اور میر ولایت حسین شامل تھے۔ مولانا شروانی کو خاص طور پر بلانے کا ارادہ تھا، بلکہ ان کو یہاں تک لکھ دیا تھا کہ اگر

وہ نہ آئے تو ان کو اپنے نیاز مندوں کی فہرست سے مولانا کا نام نکال دینا پڑے گا۔ ندوہ میں خرابیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ لہٰذا ان خرابیوں سے ناامید تھے (۱۱)۔

شروانی (۱۲) صاحب نے مولانا کی دعوت پر اعظم گڑھ آنے کی آمادگی کا اظہار کیا تو مولانا کو بے حد مسرت ہوئی اور لکھا "ااے ویرانے میں ہو جائے گی دم بھر چاندنی"۔

اور آمادگی کے اظہار والے خط کو دیکھ کر بار بار کہتے تھے "سچ سچ بتا یہ حرف انھیں کے قلم کے ہیں (۱۲)"۔ مولانا فراہی نے رسائل شبلی طلب کیا تو لکھا کہ ان کے پاس کوئی نسخہ نہ تھا، لہٰذا انھوں نے علی گڑھ لکھا کہ حمید الدین فراہی کو بھیج دیا جائے، البتہ الفاروق روانہ کر دی۔ اسی زمانے میں مولانا سے امیر عبدالرحمن والی کابل (افغانستان) نے ابن خلدون کے ترجمہ کی خواہش کی اور دس ہزار نقد دینے کا وعدہ کیا، مگر مولانا نے اپنی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے انکار کر دیا اور مولانا فراہی سے خواہش کی کہ وہ اس کام کو کر دیں۔ اس طرح مولانا چاہتے تھے کہ وہ اپنی اہلیت اور قابلیت کو پبلک کے سامنے پیش کر سکیں گے، مگر ان کے علمی کاموں کے نہ کرنے اور اپنی اہلیت کو بروئے کار نہ لانے کی وجہ سے مولانا ان سے ناخوش تھے۔ اس ناخوشی کا اظہار بھی کیا (۱۳)۔

نیشنل اسکول (۱۴) کے جمع خرچ میں گڑبڑ کی وجہ سے اور ہر مہینے کمی پڑ جانے سے پریشان رہے۔ دو سو پچیس کے ماہانہ خرچ کے علاوہ ضرورت تھی جو درخواست کی صورت میں مولوی اسحق کے پاس جانے والی تھی۔ اس کی تحقیق پر معلوم ہوا کہ سازش کا نتیجہ تھی۔ لہٰذا مولانا نے مشورہ دیا کہ تمام کاغذات اور سرشتہ تعلیم کا سرکلر منگوا کر مولوی اسحق خود دیکھیں اور جمع خرچ برابر کر دیں۔ اگر ہر استاد کے لیے تعلیم کے پانچ گھنٹے رکھے جاتے تو ایک ماسٹر زائد بھی تھا۔ تنخواہوں میں انتظامیہ کمیٹی کے مشورے کے بغیر اضافہ کیا گیا تھا۔ لہٰذا وہ گھٹایا بھی جا سکتا تھا۔ مولانا نے مزید تحقیقات شروع کر دی تھی جس کے نتیجے سے ان کو آگاہ کرنے کا ارادہ تھا۔ ان حالات کے تحت مولوی اسحق کے بھیجے ہوئے ماسٹر کو واپس جانا پڑا، کیوں کہ ایک ماسٹر یونہی زائد ہوتا تھا۔ پھر کسی نئے ماسٹر کا اضافہ کیسے ہوتا (۱۴)۔

معارف میں الفاروق پر شروانی صاحب کا ریویو شائع ہو گیا۔ مولانا کو پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ انھوں نے اس ریویو کی بہت داد دی اور ارادہ کیا کہ الفاروق میں اس کو شامل کر دیں، مگر اس میں خود ستائی کا پہلو نکلتا تھا، اس لیے باز رہے۔ شروانی صاحب سے خواہش کی اس زور قلم کو مضامین اور رسالوں تک محدود نہ رہنا چاہیے، بلکہ کسی مستقل تصنیف میں لگانے کی

ضرورت پر زور دیا اور کوئی مفید سلسلہ چھیڑنے کا مشورہ دیا (۱۵)۔

اسی زمانے میں اٹلی میں اورینٹل کانفرنس ہونے والی تھی اور پروفیسر آرنلڈ اس میں شرکت کے لیے ۲۶۔ جولائی کو جانے والے تھے۔ مولانا کو بھی بلایا گیا تھا۔ مولانا ضعف کی وجہ سے ہمت نہ کرتے تھے، لہٰذا شروانی صاحب سے دریافت کیا کہ اگر وہ بھی تیار ہوئے تو مولانا ہمت کر لیتے اور اسی سفر کے ساتھ ساتھ ممالکِ اسلامیہ کا سفر بھی کرنے کا ارادہ تھا۔ اگر وہ ارادہ کرتے تو مولانا کچھ ٹھہر کر بھی چلنے کو تیار تھے۔

اب مولانا اچھے تھے مگر کمزوری بہت تھی، چناں چہ دس منٹ تک بات نہ کر سکتے تھے۔ شروانی صاحب نے اٹلی جانے پر آمادگی ظاہر نہ کی تو مولانا نے لکھا کہ ایسا موقع آئندہ ملنا مشکل ہے۔ مولانا نے شروانی صاحب کو تصنیفی کام کی طرف جو توجہ دلائی تھی اس کے متعلق انھوں نے استفسار کیا کہ کیا کام کیا جائے، تو مولانا نے لکھا کہ انھوں نے اپنے سامنے تین کام رکھے تھے۔ قرآن مجید پر ریویو جس میں فن بلاغت و فلسفۂ کلامیہ کے مطالب کو بیان کیا جاتا، عرب کی شاعری کی تاریخ، امام غزالی کی لائف، (سرسید نے بھی مولانا سے اس کی خواہش کی تھی) جس میں علم کلام پر پورے ریویو کا ارادہ تھا، کیوں کہ مروجہ علم کلام کے موجد وہی تھے۔ لہٰذا مولانا نے چاہا کہ شروانی صاحب اگر ان تینوں میں سے کسی کام کو کرنا چاہیں تو مولانا اس کو نہ کریں۔ ایک مضمون اور بھی تھا یعنی مسلمانوں کے فن تاریخ کی تاریخ لیکن اس میں استقراء کی ضرورت تھی، جس کے لیے شروانی صاحب اس وقت تیار نہ ہو سکتے تھے (۱۶)۔

مولانا نے یہ بھی دریافت کیا کہ اگر ان کو پسند ہو تو فارسی شاعری کی تاریخ اور عہد بہ عہد کی خصوصیتیں اور ترقیاں لے لیں۔ مواد تحریر اور مضامین کے عنوانات وغیرہ میں وہ مدد دینے کو تیار تھے۔ اس پر بھی تیار تھے کہ مل کر کام کیا جائے اور ترکی کی طرح وہ دونوں کے نام سے شائع ہو، مثلاً "حبیب شبلی"۔ غرض کہ ان کے علمی کام میں ہر طرح مدد کو تیار تھے۔

مولانا کے ذہن میں شعرالعجم کا خاکہ پہلے پہل اسی زمانے میں آیا، جس کا اس خط میں اظہار ہے۔

شروانی صاحب سے مایوس ہو کر مولانا نے نواب علی حسن خان صاحب کو اٹلی کی اورینٹل کانفرنس میں ساتھ چلنے کو لکھا اور یہ بھی لکھا کہ یورپ، مصر اور شام کے علما کا اجتماع تھا۔ حیدرآباد (دکن) کی طرف سے سید علی بلگرامی اور پنجاب گورنمنٹ کی طرف سے پروفیسر آرنلڈ شرکت کر

رہے تھے اور خود ان کا ارادہ تھا، لہٰذا نواب صاحب بھی ہمراہ ہوتے۔ اس میں ان کا (نواب صاحب) کا بھی فائدہ تھا، اس لیے کہ ریاست بھوپال کی ناموری ہوتی۔ وہ آسانی سے یونیورسٹی کے فیلو مقرر ہو جاتے۔ عہدہ ڈائرکٹری (ایجوکیشن) کی گورنمنٹ میں وقعت بڑھ جاتی۔ واپسی کے وقت مصر اور قاہرہ کی سیر ہو جاتی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم سفری نصیب ہوتی اور لطف یہ کہ آمدورفت میں زیادہ سے زیادہ ایک ہزار روپیہ خرچ ہوتا۔ یہ بھی خواہش کی کہ اپنے ارادے سے مطلع کریں (۱۷)۔

نیشنل اسکول کی طرف سے مولانا بڑے متفکر رہتے تھے۔ اساتذہ وغیرہ کی تنخواہ چڑھی ہوئی تھی۔ لہٰذا مولانا نے دوڑ دھوپ اور قرض لے کر دو سو پچیس روپے اسکول بھیجے اور تنخواہیں دے دی گئیں۔ لیکن اس سے ان کی طبیعت پر اتنا بار پڑا اور اس قدر تکان ہوا کہ تبخیر ہونے لگی۔ یہ ضرور ہوا کہ اس کوشش سے جمع خرچ برابر ہو گئے اور تنخواہ ماہ بہ ماہ ادا ہونے کا امکان پیدا ہو گیا پوری رپورٹ مولوی اسحٰق کو بھیجی جانے والی تھی۔ قرض کی ادائیگی کی صورت یہ تھی کہ ممبروں سے بقایا چندہ کا تقاضا کیا جاتا۔ اعظم گڑھ والوں سے تو مولانا وصول کرنے پر آمادہ تھے مگر حمید الدین فراہی سے تقاضے کے لیے مولوی اسحٰق کو لکھا، کیوں کہ ان کے ذمہ بھی بیس، پچیس روپے نکلتے تھے، خود مولوی اسحٰق کے ذمے چالیس روپے تھے۔ ان سب رقموں کی وصولیابی پر قرض کی ادائیگی کا دارومدار تھا۔ ادھر اسکول کی عمارت بھی گر رہی تھی، جس کی مرمت کی بھی فکر تھی، لیکن اس بار کو مولانا اٹھانے کو تیار تھے۔ مولانا اسکول کی پریشانی سے بچنے کے لیے باہر چلے جانا چاہتے تھے کیوں کہ اس کی فکر سے پھر طبیعت کی خرابی کا اندیشہ تھا، مگر برسات کی وجہ سے مجبور تھے (۱۸)

شروانی صاحب کو الغزالی لکھنے کا خیال ہوا تو مولانا نے لکھا کہ اگرچہ امام غزالی کی سوانح کا پہلا حصہ تفحص طلب ضرور ہے، مگر وہ بخوبی انجام دے سکتے تھے۔ چناں چہ تمام مآخذ سے اطلاع دینے کا وعدہ کیا لیکن اصل چیز تہافۃ الفلاسفہ پر ریویو کرنا تھا، جو بہت مشکل تھا۔ اس کا رد ابن رشد نے لکھا تھا۔ مولانا نے اگرچہ فلسفہ بڑی محنت سے پڑھا تھا اور علی گڑھ جانے سے قبل اس میں خاصا وقت لگایا تھا، پھر بھی وہ سمجھ میں نہ آئی تھی۔ مولوی فاروق سے پڑھنا چاہی تو وہ بھی ٹال گئے، یہی وجہ تھی کہ الغزالی کے کئی کئی صفحے لکھنے کے بعد چھوڑ دیے کہ جب ان کی کتابوں پر ریویو نہ ہو سکا تو بے کار تھا۔ الغزالی کے ضمن میں علم کلام کی تاریخ اور اس پر ریویو بھی لکھنا ضروری تھا جس

کے لیے مصر سے کتابیں نقل کرانا تھیں اور اس کی اس وقت گنجائش نہ تھی۔ فارسی شاعری کے سلسلے میں مولانا اس وقت بھی مدد دینے کو تیار تھے (۱۹)۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید کی توجہ دلانے سے الغزالی لکھنا شروع کر دی تھی، مگر تہافتہ الفلاسفہ کے پورے طور پر سمجھ نہ سکنے کی وجہ سے اس کام کو پس پشت ڈال دیا تھا۔

مولانا نے علالت کے زمانے میں بھی تندرستی کے زمانے جیسی محنت کر کے اسکول کی حالت بہتر بنائی اور چھان بین کر کے معلوم کر لیا کہ ہیڈ ماسٹر نے عرصے سے یہ کر رکھا تھا کہ اپنے حکم سے اپنی تنخواہ بڑھاتے جاتے تھے اور زبان بندی کے لیے دوسرے اساتذہ کی تنخواہ میں بھی اضافہ کر دیتے تھے۔ یہاں تک کہ تین چار اساتذہ کی تنخواہ دوگنی ہو گئیں۔ لیکن بعض اساتذہ کے ساتھ ناانصافی کی کہ ان کی تنخواہ میں کچھ بھی اضافہ نہ کیا۔ اضافہ، تنخواہ کی وجہ سے آمدنی سے تیس روپے مستقل خرچ بڑھ گیا۔ اس خرچ کو وہ قرض سے پورا کرتے رہے۔ ان کی علاحدگی پر تحقیق سے معلوم ہوا کہ دو سو پچاس روپے قرض چھوڑ گئے اور تیس روپیہ ماہوار کی کمی اس کے علاوہ۔ آمد و خرچ تو خیر برابر کر دیا گیا مگر بقایا کی فکر رہی اس لیے کہ تنخواہیں رک گئیں جس کی وجہ سے لوگ پریشان ہوئے۔ لہٰذا دو تدبیریں سوچی گئیں۔ ممبروں سے بقایا چندہ وصول کرنا۔ غیر ممبروں سے عطیہ لینا۔ اگرچہ ان تدبیروں کی بنا پر وصول تو نہ ہوا لیکن امید تھی، لہٰذا ارادہ کیا کسی مہاجن سے قرض منگوا کر تنخواہیں تو ادا کر دی جائیں، پھر آمدنی سے قرض ادا ہوتا رہے گا (۲۰)۔

شروانی صاحب نے امام غزالی کے متعلق مزید دریافت کیا تو ان کو لکھا کہ فقہ شافعیہ کی علمی تدوین و ترتیب کی بنا امام الحرمین نے ڈالی، پھر امام غزالی نے وسیط، بسیط، وجیز لکھیں۔ ان کے بعد ان کتابوں کی بے شمار شرحیں لکھی گئیں اور بعد کی تمام تصنیفات انھیں سے ماخوذ تھیں۔ اصول فقہ میں جدید طرز کی سب سے پہلی کتاب امام صاحب نے منخول لکھی جو مولانا کے مطالعے میں برسوں رہی، لیکن بخلاف ان کی دوسری کتابوں کے، وہ مشکل تھی۔ اصول میں اور بھی کتابیں تھیں۔ انتقال سے ایک سال پہلے اسی فن پر ایک کتاب مستصفیٰ لکھی تھی، جس کو مولانا نے پڑھا تھا۔ تصوف پر تو بے شمار کتابیں لکھی تھیں۔ جدید علم کلام کے چوں کہ وہ موجد تھے، لہٰذا اس میں بھی ان کی بہت سی کتابیں تھیں۔ ان کے بعد شیخ الاشراق نے فلسفہ، اسلامی پر خاصی کتابیں لکھیں جن میں حکمت الاشراق سب سے بہتر تھی اور مولانا نے اس کا مطالعہ کیا تھا۔ ان کے بعد امام رازی نے مطالب العالیہ، نہایتہ العقول، اربعین، مباحث مشرقیہ لکھیں جو بڑی ضخیم تھیں اور سوائے

دو کے مولانا نے سب پڑھی تھیں۔ امام غزالی نے فلسفہ و منطق کو بھی صاف کر کے لکھا تھا۔ اس میں ان کی کتابیں محک النظر، مقاصد الفلاسفہ، منتخل وغیرہ تھیں۔

عیسائیوں کے رد اور انجیل کی تحریف میں بھی ایک کتاب تھی جو مولانا نے پڑھی تھی۔ اس فہرست کو بیان کرنے کے بعد انھوں نے لکھا کہ جب تک ساری کتابیں مہیا نہ ہوں اور جب تک ان پر اور اصل علوم پر ریویو نہ ہو سوانح عمری لکھنا مناسب نہیں۔ ریویو کے لیے اصل فن پر احاطہ کرنا ضروری تھا۔ اگرچہ لکھا کم جائے مگر وہ وسعت نظر اور غور و فکر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ فلسفہ شرعیہ کے بہت سے مسائل کے متعلق ان کا طرز تحریر خود ان کی ایجاد بتلایا تھا۔ حالاں کہ متعدد تحقیقات بو علی سینا کی کتاب میں پائی گئیں۔ اس لیے ان کے کہنے پر اکتفانہ کی جائے بلکہ ہر جگہ سے پتا لگانے کی ضرورت تھی۔ لہٰذا امام غزالی پر لکھنے کے لیے ان مشکلات کو پیش نظر رکھنا ضروری تھا اگرچہ ساری کتابیں مولانا کی نظر سے گزری تھیں، مگر تھیں نایاب اور ان کا مستعار ملنا بھی مشکل تھا۔

فارسی شاعری کے سلسلے میں اپنی یاد پر بھروسا کر کے مولانا لکھ سکتے تھے کیوں کہ ان کے پاس ایک بھی دیوان نہ تھا اور اس کے لیے ذہن میں یہ خاکہ تھا۔ ادوار کی تقسیم، ہر دور کے خصوصیات شاعری اور متروکات الفاظ و محاورات، مشہور شعرا کے کلام پر ریویو، شاعری سے ملکی، اخلاقی اور معاشرتی اثر کیا ہوئے (۲۱)۔

۱۴۔ اگست کو ندوہ کا لکھنؤ میں اجلاس ہونے والا تھا اور شروانی صاحب کا شرکت کا ارادہ تھا۔ مولانا کا بھی شرکت کا ارادہ تھا مگر ضعف رکاوٹ بن رہا تھا۔ لہٰذا شروانی صاحب کو لکھا کہ اگر وہ لکھنؤ آئے اور مولانا نہ پہنچ سکے تو ان کو اعظم گڑھ جانا چاہیے۔ علی گڑھ سے بھیکن پور (شروانی صاحب کا وطن جو بعد کو حبیب گنج ہو گیا) جانے میں مولانا کو جو زحمت ہوئی تھی، اس سے بہت آسان تھا لکھنو سے اعظم گڑھ جانا۔ کیوں کہ لکھنو سے بنارس اور بنارس سے اعظم گڑھ براہِ راست ریل جاتی تھی۔ یہ بھی لالچ دلایا کہ بنارس اور جونپور دیکھنے کے قابل ہیں (۲۲)۔

بھوپال کی تعلیم میں مولانا شبلی کی تجاویز اور نواب علی حسن خان کی کوششوں سے علمی ترقی شروع ہو گئی تھی، جس سے مولانا بہت خوش ہوئے اور ریاست کو مبارک باد کا مستحق سمجھا۔ کیوں کہ اس میں ریاست کی ترقی تھی۔ وہ نواب صاحب کے لیے دعائے خیر کیا کرتے تھے اور اس لیے کہ ان کی ذات سے بھوپال کے لوگوں کی تربیت کی امید تھی، جہاں پہلے علم کا چرچا نہ تھا۔

نواب صاحب نے تجویز پیش کی تھی کہ مولانا قوم کے روپے سے اورینٹل کانفرنس میں شرکت کرنے جائیں۔ اس کو مولانا نے ان کے علمی مذاق کی دلیل ٹھہرایا، لیکن اس کو پسند اس لیے نہ کیا کہ اس معاملے میں مالی اعانت پسند نہ تھی اور اگر اعانت کی ضرورت تھی تو حمیت گوارا نہ کرتی تھی۔ دوسری چیز قوم کی علمی قدر دانی کا ثبوت، تو اس قدر دانی کا ثبوت دوسروں پر بھی ہو سکتا تھا۔

ایک بات اور تھی کہ ملک کی حالت ابھی ایسی نہیں ہوئی تھی کہ اس قسم کے کاموں کو تحسین کی نظر سے دیکھا جاتا۔ نواب صاحب کے پیش نظر تو بے شک یہ ہو گا کہ قوم نے مل کر اچھا کام کیا، مگر لوگ یہ سمجھتے کہ مولانا قوم کے روپوں سے یورپ گئے۔

مولانا کا ارادہ تھا کہ اچھے ہوتے ہی بھوپال جائیں لیکن اس کے لیے وقت چاہیے تھا۔ نواب صاحب کو مولانا کی شدید علالت کا اندازہ نہ تھا، حالاں کہ ان کی ایسی حالت ہو گئی تھی کہ وصیت نامہ لکھ دیا تھا اور باوجود دولت مند نہ ہونے کے علاج میں تقریباً ہزار روپے خرچ کیے تھے۔

مولانا نے سفیر کابل مقیم شملہ سے ابن خلدون کے ترجمہ کرنے کے لیے علالت کے زمانے میں انکار کر دیا تھا، مگر طبیعت ٹھیک ہونے کے بعد بھی انکار کیا۔ اس انکار کے بعد امیر کابل نے چاہا کہ انگریزی علوم و فنون جدیدہ کے ترجمے کا ایک محکمہ کھولا جائے۔ چناں چہ دفتر خارجہ سے مشورہ بھی لیا اور مولانا کو معقول مشاہرہ پر اس کا سیکریٹری بنانا چاہا، مگر مولانا نے کلکتہ کے مستقل قیام کی وجہ سے انکار کیا۔ اس محکمہ میں ۴ انگریز اور ۱۶ مترجم رکھنے کا ارادہ تھا۔ مترجموں کا انتخاب مولانا کے مشورے سے ہو رہا تھا۔ مولانا نے افغانستان کی مثال دے کر لکھا کہ جب افغانستان اتنا کر سکتا تھا تو بھوپال اس سے بڑھ کر کر سکتا تھا۔

مولانا نے مکاتیبِ سلاطین کا قلمی نسخہ نواب صاحب کو بھیجا (۲۳)۔

ریاض حسن خاں نے مولانا سے عربی اخبارات منگوانے کے سلسلے میں مشورہ چاہا تو لکھا کہ ان کی پسند کیا تھی۔ اگر علمی مضامین چاہتے تھے تو مصر کا ماہوار رسالہ المقتطف تھا اور اگر سیاسیات پر چاہتے تھا تو قاہرہ کا اخبار المویَد، ورنہ جو مولانا (اخباروں کے نام لکھے) کے پاس آتے تھے وہ ان کے لیے بھیجے جا سکتے تھے۔

الفاروق کی قیمت لوگوں کے اصرار سے تین روپے کر دی گئی تھی (۲۴)۔

مولانا کو اس زمانے میں نیشنل اسکول کی وجہ سے بڑی پریشانی تھی، لہذا تعطیل میں

مولوی اسحٰق کو بلایا تاکہ بعض امور پر مل کر غور کرتے۔ گورنمنٹ سے بھی ایڈ نہیں ملی تھی۔ قحط اور وبا کی وجہ سے فیس سے پچاس روپے کی کمی ہو گئی تھی۔ تنخواہیں رک جانے کی وجہ سے اساتذہ تنگ تھے، لہذا چند روزہ چندہ جو مستقل چندے کے علاوہ تھا برقرار رکھا گیا اور مولوی اسحٰق کے ذمہ پانچ روپے آئے، لہذا اس رقم کو فوراً طلب کیا۔ حامد نعمانی، مولوی اسحٰق کے پاس الہ آباد میں پڑھتے تھے۔ لہذا یہ بھی لکھا کہ بجز خوراک کے باقی اخراجات چوں کہ وہ (مولانا) بھیجتے تھے اس لیے پانچ روپے کی گنجائش نکالنا مشکل نہ تھا (۲۵)۔

مولانا کی طبیعت پھر خراب ہو گئی۔ لہذا گونڈہ گئے اور اسپتال میں داخل ہو گئے۔ بھیں شروانی صاحب کا خط ملا، جس میں انھوں سیر الصحابہؓ پر کام کرنے کو لکھا۔ مولانا بہت خوش ہوئے اور لکھا کہ، یہ تو ان کے دل کی بات چھین لی۔ اس لیے کہ صحابہؓ کے حالات سے بڑھ کر کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی تھی، مگر ہر پہلو کو دکھلانے کی ضرورت تھی اور خصوصاً ان پہلوؤں کو دکھلانے کی ضرورت تھی، جن کو علما عمداً نہیں دکھلاتے تھے۔

استیعاب قاضی عبدالبر، اسد الغابہ، اصابہ، ابن کثیر، شامی، سیر الصحابہؓ پر لکھنے کے لیے ضروری تھیں۔ ان کا ارادہ تھا کہ اگر اٹلی جانے کے قابل ہوئے تو پہلے ندوہ لکھنو ضرور آئیں گے (۲۶)۔

اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کے زمانے کی ایسی کتابیں مہیا ہو رہی تھیں کہ اس زمانے کی علمی خدمت کا اندازہ ہوتا تھا۔ خصوصاً ان میں ایک کتاب الآلات کا عمدہ نسخہ تھا۔ سب سے زیادہ مولانا خوش نویسوں کے قطعات اور تصاویر دیکھ کر خوش ہوئے، جو خدا بخش لائبریری بانکی پور، پٹنہ میں بھی نہ تھے۔ قیمتوں کا تعین اس وقت تک نہیں ہوا تھا۔ مولانا ان کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور ندوہ کی لائبریری کے لیے پسند کیا۔ ایک آدھ کا خود بھی خریدنے کا ارادہ تھا (۲۷)۔

اب مولانا کی طبیعت پھر بہتر ہو رہی تھی۔ (مولوی خلیل الرحمن خلف احمد علی محدث سہارن پوری مولانا کے استاد) مولانا کی عیادت کے لیے گونڈہ گئے۔ اسی ملاقات میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کی خدمت کے لیے انھوں نے مولانا کو متوجہ کیا اور مولانا نے بھی ندوہ کا ارادہ کیا مگر فکر یہ ہوئی کہ وہاں کام کیا کریں گے؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ منشی اطہر علی صاحب، مولوی خلیل الرحمن صاحب، مولوی فاروق صاحب کے ذہن میں دارالعلوم کے متعلق انتہائی تھا کہ طلبہ کتب درسیہ سمجھ کر پڑھیں اور بس۔ اس میں کمی بیشی کے لیے وہ تیار نہ تھے اور یہ زبانی گفتگو سے مولانا

کو پتا چل گیا تھا اور جو منشا تھا وہ یہ لوگ پورا کر ہی رہے تھے۔ مولانا کے ذہن میں قدیم و جدید علوم دونوں کی تعلیم، نصاب کی تبدیلی، فنون میں مہارت پیدا کرنا تھی۔ اس تبدیلی پر یہ لوگ تیار نہ تھے۔ لہذا مولانا نے شروانی صاحب سے یہ دریافت کیا کہ اگر ارکان ندوہ مولانا سے کام لینا چاہتے ہوں تو مولانا کا کیا کام ہوگا۔ ان کی جو تجویزیں تھیں وہ چلنے نہ پاتیں، گروہ بندیاں اور جھگڑے شروع ہو جاتے، پھر اس سے فائدہ کے بجائے نقصان ہوتا، سوچ کر اور مولانا محمد علی مونگیریؒ سے مشورہ کر کے جواب لکھنے کو لکھا (۲۸)۔

مولوی خلیل الرحمن صاحب نے مولانا کو ندوہ میں اس لیے چاہا ہوگا کہ وہ ان کے والد کے شاگرد ہونے کی وجہ سے ان کی ہمنوائی کریں گے اور مولانا نے ان کی ذہنیت کا اندازہ لگا کر اصلاحات کے سلسلے میں مشکلات محسوس کیں۔ جب ہی یہ پیشن گوئی کی جو بعد کو سچ ثابت ہوئی۔

مولانا نے پھر لکھا کہ اگر ایسا ارادہ ہے کہ وہ ندوہ کی خدمت کریں تو پھر دس پندرہ دن کے لیے شروانی صاحب کو لکھنؤ آکر قیام کرنا چاہیے تاکہ وہ کارروائی اور طرز عمل کا نقشہ پیش کریں شروانی صاحب اور ارکان پورے غور و فکر کے بعد بحث کریں اور رائے دیں تو اس پر عمل کیا جائے اور خاکہ تیار کیا جائے، ورنہ جس طرح کام ہو رہا ہے اس میں دخل دینا مناسب نہیں، کیوں کہ بڑے بڑے ارکان کے نزدیک قدیم تعلیم اور نصاب ٹھیک ہے پھر بھی جلد لکھنؤ پہنچنے کا خیال تھا، تاکہ ان کو کوئی الزام نہ دے (۲۹)۔

تعطیل میں مولانا فراہی آنے والے تھے۔ مولانا بھی ملاقات کے متمنی تھے، تاکہ ان کے ذمے کوئی علمی کام پابندی سے لگا دیتے۔ لیکن خود مولانا کا کچھ ٹھیک نہ تھا کہ کہاں ہوں، اس لیے کہ کلکتہ کانفرنس سے بلاوا تھا اور رام پور کا ارادہ تھا۔ بہرحال کوئی بات طے نہ تھی پھر بھی ملنے کی کوشش کرتے۔ چند باتیں ان سے دریافت کیں۔ بوشہر و بصرہ کے لیے کتنے دن کے بعد جہاز ملتے تھے۔ سیکنڈ کلاس کا کرایہ بوشہر یا بندر عباس تک کیا تھا۔ قرنطینہ کہاں کہاں ہوتا ہے؟ (۳۰)

مولانا نے جلسہ انتظامیہ میں دارالعلوم میں باقاعدہ انگریزی داخل کرنے کی تحریک کی تھی اور اصرار کیا تھا کہ تحریک درج کر لی جائے، البتہ اس پر بحث نہ ہو سکی تھی۔ لیکن کارروائی میں وہ تحریک لکھی بھی نہیں گئی۔ مولانا نے نائب ناظم سے دریافت کیا کہ ایسا کیوں ہوا، تو جواب ملا کہ شروانی صاحب کی اجازت کی ضرورت ہے، تو مولانا نے شروانی صاحب کو لکھا کہ وہ اجازت دیں (۳۱)۔

مولانا نے پھر لکھا کہ نائب ناظم بہانہ کرتے ہیں۔ حالاں کہ انگریزی کے سلسلے میں تحریک ردوکد کے بعد پیش ہوئی تھی اور اس پر بحث ہونا ضروری تھی۔ جب یہ دیکھا گیا کہ بحث کو نظر انداز کیا جارہا ہے تو اس پر مولانا نے سختی کے ساتھ کہا کہ آخر گریز کیوں ہے؟ تو اس پر یہ جواب ملا کہ کوئی محرک نہیں تو انھوں نے کہا کہ میں محرک ہوں اور مولوی یونس خاں نے تائید کی۔ البتہ شروانی صاحب کے خیال سے اس پر مولانا نے بحث نہیں کی، لیکن یہ پھر بھی باقی رہ جاتا ہے کہ انھوں نے نائب ناظم سے کہا یا نہیں کہ مولانا کے نام سے تحریک کی جائے۔ اگر کہا تو لکھی کیوں نہیں گئی اور اگر نہیں لکھی تو کیوں اور اگر لکھی تو اس کے درج کارروائی سے انکار کیوں؟ صدر انجمن کو بے شک اختیار تھا کہ کسی تحریک کو پیش کیے جانے سے روک دے، لیکن یہ حق نہ تھا کہ کارروائی میں درج بھی نہ ہونے پائے کہ فلاں شخص نے اس کو پیش کرنا چاہا یا پیش کیا۔

جلسے کے بعد مولانا نے پوچھا بھی کہ بحث سے شروانی صاحب کیوں کتراتے ہیں تو جواب دیا کہ مولانا کی بدنامی ہے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ باوجود یاد دلانے کے اگر شروانی صاحب بھول گئے تو نظیری کا یہ مصرع سمجھ میں آگیا:

آنکہ نسیاں آورد خاصیت یادِ من است (۳۲)

مولانا کو اس بے اعتنائی پر بڑا رنج ہوا۔

حواشی:

۱.... مکاتیب، دوم، صفحہ ۱۹۸

۲.... سید سلیمان ندوی نے مکاتیب، اول، صفحہ ۱۱۱ کے حاشیے میں انجمن ترقی اردو کے متعلق مسودہ لکھا ہے حالاں کہ انجمن ترقی اردو آخر دسمبر ۱۹۰۲ء یا شروع جنوری ۱۹۰۳ء میں قائم ہوئی (حیاتِ شبلی، صفحہ ۳۰۲-۳۰۳) لہٰذا یہ چھپا ہوا مسودہ الفاروق کا معلوم ہوتا ہے۔ ایسا بھی شبہ ہوتا ہے کہ یہ مکتوب ۱۸۹۹ء کا نہ ہو۔ مکاتیب، اول، صفحہ ۱۱۱-۱۲، ۱۵- فروری ۱۸۹۹ء، مکاتیب، اول صفحہ ۱۱۲، ۱۸- اپریل ۱۸۹۹ء۔

۳.... مکاتیب، اول، صفحہ ۱۱۱، ۸- فروری ۱۸۹۹ء   ۴.... مکاتیب، اول، صفحہ ۱۱۲-۱۱۳، ۸- مئی ۱۸۹۹ء۔

۵.... مکاتیب، اول، صفحہ ۱۱۳، ۱۰- مئی ۱۸۹۹ء۔

۶.... روداد اجلاس ششم منعقدہ ۱۳ تا ۱۵- ذی قعدہ ۱۳۱۶ھ مطابق ۲۶ تا ۲۸- مارچ ۱۸۹۹ء، واقع شاہجہاں پور۔

۷.... ایضاً، صفحہ ۱۱۳، ۲۸- مئی ۱۸۹۹ء۔   ۸.... ایضاً، صفحہ ۱۱۳-۱۱۴

۹.... ایضاً، صفحہ ۱۱۴، ۱۱- جون ۱۸۹۹ء۔

۱۰۔۔۔ مولوی حفیظ اللہ صاحب سابق مدرس اعلیٰ مدرسہ عالیہ، رام پور ایک ضرورت سے وطن گئے، مگر واپس نہ آئے۔ لہٰذا محمد فاروق عباسی چریاکوٹی کا انتخاب ہوا۔ دوسرے دینیات کی تعلیم کے لیے مولوی عبداللطیف صاحب سنبھلی جو ندوۃ العلماء میں پہلے فتویٰ نویسی کا کام کرتے تھے، تیسرے عبدالحی صاحب مددگار ناظم، جو علاوہ فرض منصبی کے دو گھنٹے ادب کی کتابوں کی تعلیم پر مقرر ہوئے، چوتھے مفتی عبدالحمید صاحب فرنگی محلی، جن کے ذمہ صرف ایک گھنٹے پڑھانا اور باقی وقت میں افتاء کا کام اور مدرسے کا اہتمام ہوا، پانچویں مولوی عبدالشکور صاحب فاروقی کاکوروی (بعد کے اڈیٹر النجم لکھنو)، جن کے ذمے صرف اور نحو کی تعلیم رکھی گئی، چھٹے منشی محمد علی صاحب جو دفتر ندوۃ العلماء میں سیاہہ نویس تھے، ان کے ذمہ اپنے کام کے علاوہ تین گھنٹے حساب کی تعلیم رکھی گئی، ساتویں منشی واجد علی صاحب خوش نویس جو خط کی مشق کراتے تھے۔ (روداد اجلاس ششم، ۱۸۹۹ء، صفحہ ۳۲)

۱۱۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۱۱۴، ۱۸۔جون ۱۸۹۹ء۔

۱۲۔۔۔ شروانی کے نام مکاتیب اول، صفحہ ۱۱۵، ۲۵۔جون ۱۸۹۹ء۔

۱۳۔۔۔ حمید الدین کے نام مکاتیب اول، صفحہ ۷، ۳۔جولائی ۱۸۹۹ء۔

۱۴۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۳۲، ۵۔جولائی ۱۸۹۹ء۔ ۱۵۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۱۱۵، ۵۔جولائی ۱۸۹۹ء۔

۱۶۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۱۱۶، ۱۰۔جولائی ۱۸۹۹ء۔ ۱۷۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۱۶۷، ۱۳۔جولائی ۱۸۹۹ء۔

۱۸۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۳۳، ۱۳۔جولائی ۱۸۹۹ء۔

۱۹۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۱۷-۱۱۶، ۱۶۔جولائی ۱۸۹۹ء۔

۲۰۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۳۱، ۲۔جولائی ۱۸۹۹ء۔

۲۱۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۱۸-۱۱۷، ۲۶۔جولائی ۱۸۹۹ء۔

۲۲۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۱۱۹، ۷۔اگست ۱۸۹۹ء۔

۲۳۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۶۹-۱۶۷، ۹۔اگست ۱۸۹۹ء۔

۲۴۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۱۸۱، ۱۰۔اگست ۱۸۹۹ء۔

۲۵۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۳۴، ۱۱۔اگست ۱۸۹۹ء۔

۲۶۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۱۱۹، ۸۔ستمبر ۱۸۹۹ء۔

۲۷۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۲۰-۱۱۹، ۱۸۔ستمبر ۱۸۹۹ء۔

۲۸۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۲۱-۱۲۰، ۲۸۔ستمبر ۱۸۹۹ء۔

۲۹۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۲۲-۱۲۱، ۱۳۔اکتوبر ۱۸۹۹ء۔

۳۰۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۸-۷، ۱۰۔دسمبر ۱۸۹۹ء۔

۳۱۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۲۲-۱۲۱، ۱۰۔دسمبر ۱۸۹۹ء۔

۱۹۰۰ء

مولانا نے دسمبر ۱۸۹۹ء میں بوشہر اور بصرہ وغیرہ کے سفر کا ارادہ کیا تھا مگر ہندوستان سے باہر نہ جاسکے اور وطن ہی میں رہنے پر مجبور ہوئے۔ اس سال زیادہ تر اپنے وطن اعظم گڑھ شبلی منزل میں بسر کیا۔

بعض خانگی ضرورتوں نے بھی قیام پر مجبور کیا، پھر علالت کا سلسلہ بھی کچھ نہ کچھ چلتا رہا۔ ۱۸۹۵ء میں پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا اور مولانا کا دوسری شادی کا ارادہ نہ تھا مگر ان کے معالج ڈاکٹر مصطفٰے خاں نے دوسری شادی کا مشورہ دیا۔ مسلسل بیماری سے تنگ تھے لہذا مجبوراً تیار ہوئے اور مولوی سمیع صاحب کی ماموں زاد بہن سے نسبت طے ہوئی (۱)۔

مولانا اب الہ آباد میں تھے۔ یہیں مولانا فراہی کا خط آیا، علی گڑھ کالج والے مولانا فراہی سے اسپنسر کی کتاب کا ترجمہ کرانا چاہتے تھے۔ مولانا فراہی نے مولانا سے مشورہ کیا تو مولانا نے مشورہ دیا کہ تمام شرائط تو قابل قبول ہو سکتے تھے لیکن جس قدر ترجمہ ہوگا معاوضہ دیا جائے گا۔ اگر کتاب پوری نہ ہو سکی تو جو لوگ ترجمہ کے معاوضہ کے طور پر چندہ دیں گے ان کو کیا جواب دیا جائے گا

دوسرے یہ کہ اسپنسر کے فرسٹ پرنسپلز (آف) سوشلزم کا حصہ چھوڑ کر غالباً چار سو صفحات سے زیادہ تھے۔ لہذا کم سے کم چار سو اور زیادہ سے زیادہ پانچ سو معاوضہ بنتا تھا۔ مولانا اس کو پسند نہیں کرتے تھے کہ سب کا سب کالج یا اسکول میں دیا جاتا ہے۔ اس وجہ سے کام میں طبیعت نہ لگنے کا اندیشہ تھا اور بیگاری معلوم ہوتی (۲)۔

عقدِ ثانی کا مولانا نے ارادہ کر لیا تھا۔ اس ارادے سے جب مولانا کے صاحبزادے حامد نعمانی واقف ہوئے تو ان کو ناگواری ہوئی اور وہ لاپتہ ہو گئے، انھوں نے دربھنگہ پہنچ کر مولانا کو خط لکھا کہ "اب آپ ہم سے مایوس ہو جائیے (۳)۔" مولانا کو بڑی تکلیف ہوئی۔ دو روز تک کھانا نہ کھایا اور روتے رہے۔ یہاں تک کہ نکاح کی تاریخ گزر گئی۔ لڑکی والوں کو ناگواری ہوئی، مگر مولانا نے اس کی پروانہ کی۔ مولانا نے اپنی پریشانی کا ذکر ایک صاحب کے نام خط مورخہ ۲۔ اپریل ۱۹۰۰ء میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"حامد کے مفرور ہونے کا قصہ تم نے پہلے سنا ہوگا - ۱۱- اپریل ۱۹۰۱ء کو میرے پاس ان کا خط آیا کہ مجھ کو بھول جایئے - اس خط سے اتنی پریشانی ہوئی کہ بالکل بدحواس ہوگیا، چار وقت کھانا نہ کھایا ہر وقت رویا کرتا تھا۔"

اسی اثنا میں شادی کی تاریخ آئی، لوگوں کو اصرار تھا کہ تاریخ نہیں ٹالنی چاہیے، لیکن مجھ کو دل پر قابو نہ تھا، نہ جاسکا - ادھر مہمان وغیرہ آچکے تھے اور اس وجہ سے ان لوگوں کو بہت سبکی ہوئی، وہاں سے سمیع آئے کہ اعظم گڑھ ہی میں نکاح ہو جائے، اس پر بھی راضی نہ ہوا - البتہ زیور اور کپڑا بھیج دیا کہ بعد طبیعت ٹھہرنے کے عقد ہو جائے گا (۴)"۔

میاں حامد چند روز دربھنگہ میں رہ کر وہاں سے بھی کہیں چل دیے اور بالکل پتا نہیں اور غالباً مہینوں پتا نہ لگا، حامد نعمانی دربھنگہ سے قصبہ بہار شریف پہنچے وہاں حضرت شرف الدین یحییٰ منیری کی خانقاہ میں قیام کیا - اس وقت وہاں کے سجادہ نشین شاہ امین احمد صاحب تھے جو بہت اچھے ادیب اور شاعر تھے - ان سے حامد نعمانی بیعت ہوئے اور مولانا کا ذکر کیا - مولانا کے علمی کاموں سے وہ بخوبی واقف تھے - لہٰذا انھوں نے مولانا کو اطلاع دی اور اپنی فارسی مثنویاں مولانا کو بھیج دیں - ان کی ایک مثنوی بہاء الدین آملی کی مثنوی "نان و حلوا" کے جواب میں شہد و شیر بھی تھی - بیٹے کی اطلاع پاکر مولانا نے ایک دو معتبر آدمیوں کو ان کو لینے کے لیے بھیجا - شاہ صاحب نے بھی حامد نعمانی کو سمجھا بجھا کر ساتھ کر دیا۔

مولانا سے مولوی اسحٰق نے کچھ کاغذات منگوائے تھے جو مولانا نے ۴- مئی ۱۹۰۰ء کو بھیج دیے تھے اور کوئی آدمی مولانا کی مرضی کے مطابق کام کا نہ تھا - مولوی اسحٰق نے کچھ ہدایتیں خط میں لکھی تھیں، مولانا کی کوشش تھی کہ اس پر عمل کیا جائے - گھر کے اخراجات بھی بڑھ گئے تھے - والد خاصے ضعیف ہوگئے تھے اس لیے انتظامی معاملات میں دقتیں پیش آرہی تھیں (۵)۔

حامد نعمانی کے متعلق مولانا نے ایک خیال قائم کر لیا تھا، لہٰذا ان کے چلے جانے پر اپنی رائے کے صحیح ہونے کا اظہار کیا - لہٰذا ان کے صحیح حالات ملاقات کے وقت معلوم ہونے کا امکان تھا۔

ماسٹر شفیع، حامد نعمانی کو واپس لے آئے تھے - انھوں نے فقر اختیار کر لیا تھا - گیروا کرتہ اور گیروا تہبند پہن کر آئے تھے اور صرف اس وجہ سے مولانا کے پاس آنے پر راضی ہوئے تھے کہ پیر کا حکم تھا کہ والد کی اطاعت کی جائے - لیکن وہ کسی طرح نہیں ٹھہر رہے تھے اور واپس جانے پر

اصرار تھا۔ فقر کو مولانا برا نہ سمجھتے تھے اور جوگیانہ قالب کو ریا بھی نہیں سمجھتے تھے، لیکن دماغ کی خرابی ضرور سمجھتے تھے، لہذا اس چیز کو مولانا نے اپنی بد قسمتی سے تعبیر کیا۔

اسی زمانے میں مولانا فراہی کا فارسی کلام شائع ہوا تو مولانا بہت خوش ہوئے اور مولانا شروانی کو اس کا ایک نسخہ تحفے میں بھیجا۔ اخیر کے دو قصیدوں کی فارسی کی بڑی تعریف کی (۶)۔

اس تفکرات کے زمانے میں بھی نیشنل اسکول کی بڑی فکر تھی۔ لہذا مولوی اسحٰق کو لکھا کہ اگر مولوی عبدالرحمن ڈپٹی کلکٹر الہ آباد میں موجود ہوں تو عمارت کے لیے چندہ وصول کر لیا جائے (۷)۔

لوئی کی ہسٹری آف فلاسفی میں لکھا ہوا تھا کہ احیاء العلوم از امام غزالی کا ترجمہ فرنچ میں ہو چکا تھا تو یہ خیال کیا جاتا کہ دیکارٹ کا فلسفہ اخلاقی غزالی کی اس کتاب سے ماخوذ ہے۔ لیکن مولوی اسحٰق کی نظر سے کوئی کتاب گزری تھی، جس میں ذکر تھا کہ احیاء العلوم کا فرنچ ترجمہ ہو چکا ہے۔ مولانا نے ان دونوں کتابوں کا لفظ بلفظ ترجمہ طلب کیا اور لکھا کہ بہت ضرورت ہے۔

مولانا کے بنگلے میں بو تراب صاحب مقیم تھے۔ انھوں نے اپنے صرف سے مولانا کے بنگلے کے گرد مکانات اور اصطبل خانہ وغیرہ بنوایا تھا، اس سے مولانا شرمندہ تھے۔ ان کے پاس آرام اور سہولت کی سب چیزیں تھیں، مگر گاڑی خراب تھی۔ مولانا نے اپنی گاڑی کا ذکر کیا جو مولوی اسحٰق کی نگرانی میں الہ آباد میں درست کرائی جا رہی تھی، تو انھوں نے کہا کہ اگر آجاتی تو شام کی سیر مولانا کے ساتھ ہوتی۔ اسی زمانے میں ملازمت نہ ہونے کی وجہ سے اور علالت میں خاصہ خرچ ہو جانے کی وجہ سے مولانا تنگی محسوس کر رہے تھے۔ لہٰذا گاڑی کے مصارف تنہا نہ برداشت کر سکتے تھے، اس لیے خواہش کی کہ گاڑی جلد آجاتی تو مفت میں بگھی نشین ہو جاتے۔ مولوی اسحٰق نے گاڑی کے سلسلے میں نوے روپے کا مزید مطالبہ کیا تھا تو مولانا نے دریافت کیا کہ دو سو پچاسی روپے تو وہ پہلے ہی بھیج چکے تھے۔ یہ رقم اس کے علاوہ درکار تھی یا کیا، اور اگر ایسا تھا تو اس پر بہت خرچ ہو گیا تھا۔ بہر حال اس کو بہت جلد تیار کرا کے بھیجنے کی ضرورت تھی۔ اس کی آخری تیاری کے لیے ۲۵ روپے طلب کیے تھے، لہذا اس کا خود ہی انتظام کر کے اور گاڑی تیار کرا کے بھیجنا چاہیے تھا (۸)۔

اسی زمانے میں علی گڑھ کالج کے لیے دینیات کی رپورٹ تیار کر کے پیش ہوئی تھی۔ اس کے انگریزی ترجمے کے متعلق شروانی صاحب سے دریافت کیا کہ ترجمہ ہو کر منظوری کے لیے پیش ہوا اور اس پر ممبروں نے کیا کارروائی کی۔ ندوے کے جلسے میں شروانی صاحب کی آمد کی خبر

کے بارے میں دریافت کیا، فن نحو پر سیوطی کی کتاب الاشباہ والنظائر چھپی تو مولانا نے دریافت کیا کہ اگر خریدی نہ ہو تو وہ بھیج دیں، بڑی کتاب تھی اور قیمت ساڑھے پانچ روپے تھی۔ مصر سے مولانا کے پاس چند جدید کتابیں بھی آئی تھیں ان میں سے ایک فلسفہ، جدیدہ پر بھی تھی، ان کی بھی اطلاع دی (۹)۔

مولانا نے پھر مولانا فراہی کو لکھا کہ ترجمے کا خیال امیر کابل کو پیدا ہوا ہے اور بڑے وسیع پیمانے پر اس کے لیے انھوں نے اپنے سفیر ہندوستان کو لکھا اور سفیر نے مولانا، مولانا حالی اور ڈپٹی نذیر احمد کو۔ مولانا نے پہلے انکار کیا پھر اعزا اور احباب کے اصرار پر رضامندی ظاہر کی۔ سفیر نے یہ معلوم کر کے کل ترجمہ اور اس کے اہتمام کی کل ذمہ داری مولانا کے سپرد کر دی اور دس ہزار کی رقم منظور کی کہ خواہ بالاقساط لی جاتی یا یکمشت۔

مولانا کا خیال تھا کہ مولانا فراہی ابن خلدون کا ترجمہ کر سکتے تھے، لیکن اس میں تاریخی تلمیحات اور اجمال اور حوالے اس قدر تھے کہ مولانا کا اندازہ تھا کہ ابتدائی جلدوں میں ان کو دقت پیش آتی۔ اس کتاب کے سات ہزار صفحات تھے اور وہ بھی ٹائپ کے، تین برس میں ترجمہ کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ کچھ باتیں اور بھی تھیں یعنی مولانا فراہی کے نام سے، مستقل ترجمے پر سفیر راضی نہ ہوتے بلکہ مولانا کے نام کی شمولیت ضروری تھی۔ کتاب اتنی ضخیم تھی کہ دو ایک برس مستقل کام کرنے کے بغیر ممکن نہ تھا۔ لہٰذا ضروری مشوروں کے لیے مولانا کے ساتھ رہنا ضروری تھا۔ صرف ابتدائی کام اور خاکہ بنانے تک ان کا رہنا ضروری تھا، پھر اس کے بعد کہیں بھی قیام کر سکتے تھے۔ ترجمہ کا کام شہرت اور عزت کا ذریعہ تھا اور آگے کے لیے راہیں نکلنے کا امکان، کیوں کہ گورنمنٹ انگریزی کی سرپرستی میں وہ تمام ہوتا، اگر مولانا گھر پر قیام کر کے کام کرتے تو اخراجات کم ہوتے اور کم از کم اور ایک سو پچاس روپے کی بچت ہوتی۔ امیر صاحب کا ارادہ تھا کہ انگریزی کتابوں کے ترجمہ کا بھی محکمہ قائم کیا جاتا۔ چار انگریز اور سولہ ہندوستانی مترجم ملازم ہوتے۔ محکمہ کا صدر مقام کلکتہ رکھا جا رہا تھا۔ اس محکمہ کا سیکریٹری مولانا کو مقرر کیا جا رہا تھا، لیکن مولانا نے انکار لکھ بھیجا اور زیادہ تر امید تھی کہ اگر مولانا، مولانا فراہی کے لیے تحریک کرتے تو ان کو عہدہ مل جاتا۔ اتنے بڑے وسیع پیمانے پر کام کا مولانا فراہی کی ماتحتی میں انجام پانا بعد کی ترقیوں کا پیش خیمہ تھا، لہٰذا ان کی رائے دریافت کی (۱۰)۔

مولانا (۱۱) کو شروانی صاحب کا خط ملا اس میں حیات جاوید کے متعلق انھوں نے کچھ لکھا

تھا، اس کے جواب میں مولانا کو لکھتے ہیں ۔ اختلافِ آرا کیا چیز ہے ۔ حیاتِ جاوید کو مولانا لائف نہیں بلکہ کتاب المناقب سمجھتے تھے اور وہ بھی غیر مکمل ۔ مولانا کا ارادہ تھا کہ کتاب الآلات سررشتہ، علوم و فنون حیدر آباد کی طرف سے چھپ جاتی ۔ لہٰذا شروانی صاحب سے ان کا نسخہ طلب کیا اور نسخہ منقولہ کے متعلق لکھا کہ اگر اس میں تصویریں بنوانا ہوں تو وہ بھی اچھی بن سکتی تھیں ۔

مولانا کے فارسی ذوق کو دیکھ کر شروانی صاحب نے اپنی فارسی غزلیں بھیجی تھیں ۔ مولانا نے بعض اشعار کی بڑی تعریف کی مثلاً چو آشنا نگہے کرد، کچھ الفاظ بیکار اور بھدے معلوم ہوئے ان پر مولانا نے خط کھینچ دیا اور بعض تراکیبِ الفاظ کی اصلاح فرمائی (۱۲) ۔

مولانا کے والد کی طبیعت خراب ہوئی اور رفتہ رفتہ حالت نازک ہوتی گئی ۔ مولوی اسحٰق کو ان کی طبیعت کی خرابی کی برابر اطلاع مل رہی تھی، مگر وہ اب تک نہ آسکے تھے ۔ مولانا نے انھیں طنزیہ انداز میں لکھا کہ استقلال اور متانت کی حد کر دی کہ والد کی اتنی حالت خراب تھی اور اطلاعیں برابر بھیجی جا رہی تھیں اور پھر بھی وہ نہیں آئے تھے ۔ اطراف کے لوگ برابر دیکھنے آرہے تھے ۔ مستورات بھی دیکھنے آئیں ۔ والد نے بھی مولوی اسحٰق کو دریافت کیا، وہ نہ خود آئے نہ خط اور نہ حال دریافت کیا ۔ علاج وغیرہ کے سلسلے میں روپیوں کی بھی ضرورت تھی اور بینک سے روپیہ نکالنا تھا ۔ مولانا نے بینک سے روپیہ نکالنے کی ترکیب بھی دریافت کی تھی، اس کا بھی کوئی جواب نہ آیا (۱۳) ۔

۱۲ ۔ نومبر ۱۹۰۰ء کو مولانا کے والد کا انتقال ہو گیا ۔ مولانا پر گویا مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا جائداد کے جھگڑے وغیرہ نپٹانا انھیں کے ذمے تھا (۱۴) ۔

ادھر دسمبر ۱۹۰۰ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس رام پور میں ہو رہا تھا اور محسن الملک اس میں شرکت کے لیے مولانا کو بلا رہے تھے، لہٰذا وہ چاہتے تھے کہ دسمبری میں سارے معاملات طے ہو جائیں ورنہ جانا مشکل تھا ۔ اگر مجبور آجانا ہی پڑا تو معذور تھے اس لیے دریافت کیا کہ قیام ضروری تھا یا نہیں ۔ مولانا کا خیال تھا کہ اگر دیوارہ میں تقسیم جائداد کے لیے انتظار کرنا تھا تو اس سال کی تحصیل وصول غارت ہو جاتی، لہٰذا ان کے خیال میں اسی وقت سے اپنا خاص کارندہ مقرر کرنے کی ضرورت تھی جو اس سال اپنے حصے کی تحصیل وصول کرے ۔ باقی علاقہ جات کو ٹھیکے پر دینا تجویز کیا ۔ مصارف سیر، مشاہرہ ملازمان، خرچ مقدمات، خرچ ڈیوڑھی، بندول کا موازنہ مولوی اسحٰق سے طلب کیا تاکہ اس کے مہیا کرنے کا بندوبست کرتے (۱۵) ۔

مولانا نے انتظامات کی تفصیل اس طرح لکھی۔ سیر کا کل خرچ غلام محمد قرض سے کر رہے تھے جو ۳۰ سے زائد ہو چکا تھا۔ نوکروں کی تنخواہ مبلغ چودہ روپے، مولانا نے اپنے وظیفے سے ادا کی تھی۔ پانچ روپے کیلنڈر کی قیمت مولانا نے مولوی محمد عمر کو ادا کیے۔ سوتیلے بھتیجے مظفر کی تعلیم کے لیے مولوی صاحب کو مقرر کیا، ان کی تنخواہ پانچ روپے مقرر ہوئی۔

مقدمے میں اسم نویسی گواہوں کا خرچ تو تھا ہی لیکن تحصیل دار نے آدمی بھیجا کہ شیخ صاحب (مولانا کے والد) پر بابت سال گزشتہ اٹھارہ روپے کا ٹیکس تھا، ادا کیا جائے۔ چوں کہ سال تمام ہو رہا تھا لہذا مہلت نہ ملی۔ لہذا اتار سے جواب مانگا کہ کہاں سے ادا کیا جائے (۱۶)۔

بھورو کا مقدمہ لڑا جارہا تھا چوں کہ حکام دورے پر تھے، لہذا مختار ہر پیشی کے دس روپے لے رہے تھے کئی پیشیاں ہو چکی تھیں اور یہ تمام مصارف دیوارہ سے لیے جارہے تھے۔ دیوارہ کا حساب مولانا درست کرا چکے تھے۔ دیوارہ اسی قسم کے مصارف سے زیر بار تھا۔ مولانا چاہتے تھے کہ مولوی اسحٰق آتے تو دیوارہ کو فوراً خاص تحصیل کرتے اور مقدمات کا سلسلہ گھٹاتے۔ چھوٹے چچا بھی پریشان تھے کہ مقدمات کی وجہ سے کچھ نہیں بچتا تھا۔ گاؤں پٹی کی تحصیل مع دھان ماموں سلیم صاحب اپنے قرضے میں وضع کر لیتے تھے کیوں کہ مولانا کے والد پر کئی برس کا تین سو روپیہ قرض تھا۔ لہذا مولوی اسحٰق کو جلد بلا رہے تھے تاکہ مولانا کو پریشانی سے کچھ نجات ملتی۔ چوں کہ مولانا کی طبیعت ان جھگڑوں سے دور بھاگتی تھی اس لیے ان کے لیے بڑی مصیبت تھی۔ کہاں علمی کام اور کہاں یہ دنیا بھر کے جھگڑے۔ عجیب اتفاق کہ اعظم گڑھ میں والد کے انتقال کے وقت موجود بھی تھے ورنہ ممکن ہے ان جھگڑوں سے دور رہتے، پھر یہ کہ اولاد میں بڑے بھی تھے اس لیے سارا بوجھ انھیں پر پڑا اور ذمہ داریاں سنبھالنا پڑیں (۱۷)۔

سید سلیمان ندویؒ مولانا کے والد کے انتقال کے متعلق اس طرح لکھتے ہیں:

> "خاندان بلکہ تمام شہر میں کہرام مچ گیا، حکام تک متاثر ہوئے، عدالتیں بند ہو گئیں پورے ضلع نے ان کے وجود سے محرومی کا غم کیا۔ یہ صرف ایک کامیاب وکیل کی موت نہ تھی، بلکہ ایک فیاض، ہر دلعزیز اور قوم کے ایک ممتاز نامور زبردست فرد فرید کی موت تھی (۱۸)۔"

مولانا کے غم کا ذکر سید سلیمان ندویؒ اس طرح کرتے ہیں:

"مولانا سید عبدالحئی صاحب مرحوم مددگار ناظم ندوہ کو اس زمانے میں اپنے والد کی وفات

کی خبر ایک کارڈ پر لکھ کر دی تھی۔ ایک ہی سطر تھی۔ دریغا کہ یتیم گشتم (۱۹)۔"

خانگی مصائب کے بارے میں لکھتے ہیں:

"شیخ صاحب کی موت ایک تنہا مصیبت نہ تھی بلکہ بہت سی مصیبتوں کا مجموعہ تھی۔ وہ ایک ہرے بھرے، سرسبز و شاداب خاندان کے سرپرست تھے۔ ان کی سرپرستی سے محرومی سے سارے خاندان پر زوال آیا۔"

آگے چل کر سید صاحب لکھتے ہیں:

"شیخ صاحب نے اپنی چھ سات ہزار کی آمدنی کی جائداد کے ساتھ تیس ہزار کا قرض چھوڑا۔ قرض کے سوا شیخ صاحب کا بڑا کارخانہ پھیلا تھا، جس کو قائم رکھنے کے لیے ماہانہ آمدنی کی ضرورت تھی۔ سوتیلی ماں اور ان کے طرف داروں سے الگ جھگڑے کی صورت تھی (۲۰)۔"

باپ کی زندگی بھر مولانا اپنی سوتیلی ماں سے ملنا کیا معنی، ان کے نام سے بیزار تھے۔ ان کا ذکر سننا نہیں چاہتے تھے مگر باپ کی وفات کے بعد یہ انقلاب ہوا کہ وہ خود چھاؤنی (۲۱) جہاں وہ رہتی تھیں تشریف لے گئے۔ ماں کے قدموں پر گرے، عمر بھر کی معافی مانگی اور ایسی سعادت مندی دکھائی کہ اپنے بیٹے سے بھی ممکن نہیں، یہ بھی مولانا کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے۔ "صرف یہ ایک واقعہ ہی مولانا کی بڑائی اور عظمت کے بیان میں کافی ہے۔

آگے چل کر سید سلیمان ندویؒ پھر لکھتے ہیں:

"لیکن یہ گھنگھور بادل مولانا کی حسن نیت کی برکت سے چھٹ گیا۔ مولانا نے مظفر (۲۲) کو جو محروم و محجوب تھا اپنی جائداد میں شریک کر لیا اور اس کا نام بھی ورثہ میں رضا مندی سے حصہ داروں میں داخل کرا دیا۔ بچہ کی دادی یعنی مولانا کی سوتیلی ماں نے مولانا کا یہ برتاؤ دیکھ کر یہ کیا کہ جو جائداد شیخ صاحب ان کو ہبہ (۲۳) کر گئے تھے واپس کر دی۔ یہ واپس شدہ جائداد قرض خواہوں کو دے دی گئی اور قرض کے بڑے حصے کے بوجھ سے وہ ہلکے ہو گئے۔ باقی قرض کی ادائیگی کی فکر بھی ان کو دامن گیر ہوئی۔ ان ہی دنوں مسٹر آرنلڈ نے، جو گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کے پروفیسر تھے، ان کو لاہور میں ایک خدمت پر بلوایا (۲۴)، جو غالباً اورینٹل کالج لاہور میں عربی یا فارسی کی پروفیسری ہو گی۔ مگر انھوں نے وہاں جانے سے انکار کیا اور اعظم گڑھ ہی میں رہے۔ مگر قرض خواہوں اور مقدمات کے چپراسیوں کی آمد و رفت سے پریشان خاطر تھے (۲۵)۔"

مولانا پر اپنے والد کی موت کا بڑا اثر تھا۔ شاعر کی حیثیت سے انھوں نے فارسی مرثیے میں خون کے آنسو بہائے ہیں۔ اس میں بتیس (۳۲) اشعار ہیں۔ شروع کے دو شعر یہ ہیں:

ہاں اے پدر نہ گویمت ایں وزرد آں مکن — زنہار عزم رہروی آں جہاں مکن
دعوائے صبر گہ بہ غلط ہم نہ کردہ ام — ہاں اے پدرا بہ صبر را امتحاں مکن (۲۶)

آخری اشعار یہ ہیں:

شبلی رسید دو نالہ زدو بسمل افتاد — اسحاق آمد و مژہ را اشکبار کرد
مستور خانہ آمد و از سینہ برکشید — آں تیر آہ کزدل گردوں گذار کرد
حالی ہم رسید کہ طفل و جوان و پیر — از ہوش رفت و جامہ، خود تار تار کرد
آہ از جفائے مرگ کہ با حاتلے چنیں — رحمی فکرد و شیوہ، جور اختیار کرد
المختصر چو جان بہ جہاں آفریں سپرد — جا درکنار رحمت پروردگار کرد

چوں ہر کسے بہ درگہش امیدوار ہست
آمرزدش خدائے کہ آمرزگار ہست (۲۷)

اسی سال بھی مولانا ندوہ کے سالانہ جلسے میں علالت اور گھریلو پریشانیوں کی وجہ سے شرکت نہ کرسکے۔ محسن الملک نے البتہ اسی سال ندوے کا معائنہ کیا۔ روداد میں اس طرح ہے:

معائنہ نواب محسن الملک

"چوں کہ اس مدرسے کے منتظم اپنے علوم سے بھی واقف ہیں اور نئے طریقہ، تعلیم سے بھی جس کو علمائے روم و مصر نے پسند کیا ہے، آگاہ ہیں اور مولوی محمد فاروق صاحب خوش قسمتی سے ان کو مل گئے ہیں۔ اس لیے جو اصلاح طریقہ، تعلیم میں ہوئی اور جو ترقی آئندہ ہوگی اس پر مجھے کچھ تعجب نہیں۔ لڑکوں کا امتحان میرے سامنے لیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو کچھ ان کو پڑھایا جاتا ہے وہ ان کے حافظے ہی میں نہیں رہتا، بلکہ دماغ میں۔ میں اس قسم کی تعلیم کو اپنے مسلمان بچوں کے لیے نہایت مفید سمجھتا ہوں اور اس مدرسے میں کامیابی کے لیے دعا کرتا ہوں۔

محسن الملک (۲۸)۔"

۲۰-اگست ۱۹۰۰ء

اچھا ہوا مولانا کی غیر موجودگی میں یہ معائنہ ہوا، ورنہ مولانا کے سر ایک یہ بھی الزام ہوتا کہ علی گڑھ والوں کو انھیں نے ندوۃ العلماء کی راہ دکھائی؛ ندوۃ والوں کو نیچریت کی دعوت دی

حواشی

۱..... حیاتِ شبلی، صفحہ ۳۴۸

۲..... مکاتیبِ دوم، صفحہ ۸، الہ آباد سے ۲-مارچ ۱۹۰۰ء

۳..... حیاتِ شبلی، صفحہ ۳۴۸

۴..... حیاتِ شبلی، صفحہ ۳۴۸

۵..... مکاتیبِ اول، صفحہ ۳۵-۳۴

۶..... مکاتیبِ اول، صفحہ ۱۲۴، ۱۴-مئی ۱۹۰۰ء

۷..... مکاتیبِ اول، صفحہ ۳۵، ۸-جون ۱۹۰۰ء

۸..... مکاتیبِ اول، صفحہ ۳۶، ۱۰-جون-۱۹۰۰"

۹..... مکاتیبِ اول، صفحہ ۱۲۴-۱۵-جولائی ۱۹۰۰ء

۱۰..... مکاتیبِ دوم، صفحہ ۹-۸، ۱۸-جولائی ۱۹۰۰ء

۱۱..... مکاتیبِ اول، صفحہ ۱۳۵، ۷-اگست ۱۹۰۰ء

۱۲..... شروانی صاحب نے حیاتِ جاوید پر تعریف کے ساتھ تبصرہ لکھا ہے- مقالات شروانی صفحہ ۶۸ تا ۷۲

۱۳..... مکاتیبِ اول صفحہ ۳۷-۳۶، ۱۰-نومبر ۱۹۰۰ء

۱۴..... حیاتِ شبلی، صفحہ ۳۵۳

۱۵..... مکاتیبِ اول، صفحہ ۳۷، ۱۵-دسمبر ۱۹۰۰ء

۱۶..... مکاتیبِ اول، صفحہ ۳۹-۳۸

۱۷..... دریائے گھاگھرا کے کنارے مواضعات کا سلسلہ

۱۸..... حیاتِ شبلی، صفحہ ۳۵۴

۱۹..... حیاتِ شبلی، صفحہ ۳۵۵

۲۰..... حیاتِ شبلی، صفحہ ۳۵۵

۲۱..... اعظم گڑھ میں زمینداری عملہ کے مکان کو جن کو ہماری طرف زمینداری کچہری کہتے ہیں، چھاؤنی کہتے ہیں-

۲۲..... مولانا کا سوتیلا بھتیجا (اپنے والد کے فارسی مرثیہ میں بھی ان کا ذکر کیا ہے) لکھتے ہیں:

پسند ایں کہ بیکس و بے خانماں شد　　ہاں آں قدر بماں کہ مظفر جواں شد

(کلیاتِ شبلی فارسی، صفحہ ۴۹)

۲۳..... یہ ہبہ ۱۸۹۲ء میں کیا تھا- (اس کا ذکر مکاتیبِ اول صفحہ ۲۷-۲۶ پر ہے)

۲۴..... مولانا حالی نے بابائے اردو کے نام ایک خط میں ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں "شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کا تقرر مددگار معتمد امور مذہبی کے عہدہ پر عزیزی غلام الثقلین کی تحریر سے معلوم ہو کر بے انتہا

مسرت ہوئی ہے - اگر آپ ان سے ملیں تو میری طرف سے بعد سلام و نیاز کے کہہ دیجیے گا کہ اگرچہ آپ کے علم و فضل و لیاقت کے مقابلے میں یہ عہدہ چنداں امتیاز نہیں رکھتا مگر بہرحال لاہور کی خدمت سے جس پر مسٹر آرنلڈ آپ کو بلانا چاہتے تھے، میرے نزدیک بہت بہتر ہے -" (مکتوباتِ حالی حصہ اول - حالی پریس، پانی پت ۱۹۲۵، صفحہ ۲۱)

۲۵ .... حیاتِ شبلی، صفحہ ۳۵۷

۲۶ .... کلیاتِ شبلی فارسی، صفحہ ۴۸

۲۷ .... کلیاتِ شبلی فارسی، صفحہ ۵۰

۲۸ .... روداد اجلاس ہفتم ندوۃ العلماء منعقدہ ۱۰ تا ۱۲-رجب ۱۳۱۸ھ مطابق ۴ تا ۶-نومبر ۱۹۰۰ء، روز یک شنبہ تا سہ شنبہ، واقع عظیم آباد پٹنہ، صفحہ ۱۳۰

۱۹۰۱ء

مولانا فروری کے آخر تک اعظم گڑھ میں قیام پذیر رہے اور زمینداری کے بکھیڑوں میں پھنسے رہے۔ قرض کی ادائیگی کی فکر سے پریشان اور مقدمات کے جھگڑوں سے متفکر رہے۔ آخر ان الجھنوں سے گھبرا کر گھر سے نکل پڑے۔ سید سلیمان ندوی اس کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

آخر (۱) فروری ۱۹۰۱ء کی کسی تاریخ کو ایک دن، جیسا کہ مولانا خود فرماتے تھے، شہر سے نکل گئے۔ پہلے تو یونہی غازی پور کا ٹکٹ لیا، وہاں سے دفعتاً علی گڑھ چل کھڑے ہوئے۔ علی گڑھ میں محسن الملک نے حیدر آباد کا مشورہ دیا اور وہ حیدر آباد روانہ ہو گئے۔ ممکن ہے کہ اس سفر کی عجلت اور حیدر آباد کے انتخاب کے مشورے میں بعض سیاسی اسباب سے جن کا اشارہ اوپر گزر چکا ہے (۲)، برطانوی ہند سے دور ہو جانے کی مصلحت بھی شامل ہو۔ علی گڑھ کے آخری زمانے میں ہی حکومت مولانا سے سیاسی بدگمانی میں مبتلا ہو گئی تھی۔ پھر ندوہ کے اجلاس کی شرکت نے حکومت کو اور بھی بدگمان کر دیا تھا۔ پھر جب کہ لفٹننٹ گورنر کے کان (۳) بھی بھرے گئے ہوں۔ مولانا کا برطانوی ہند میں کسی جگہ بھی ملازمت اختیار کرنا (۴) خطرے سے خالی نہ تھا۔

مولانا (۵) ۲۲۔ فروری ۱۹۰۱ء کی علی گڑھ میں تھے اور وہیں حمید الدین فراہی سے خط کا جواب مانگا۔ مولانا فراہی سے مولانا کو بڑی محبت تھی اور ان کی قابلیت کے بھی معترف تھے۔ اگرچہ مولانا کسی کی سفارش کرنے میں بڑے محتاط تھے، مگر مولانا فراہی کے لیے سفارش کرنے کو تیار رہتے تھے اور اس کام میں وہ اپنی خودداری کی بھی پروا نہ کرتے تھے۔ چناں چہ مولانا فراہی نے کسی معاملے میں مولانا کی مسٹر ماریسن پرنسپل علی گڑھ کالج سے سفارش چاہی تو مولانا اس پر تیار ہو گئے، مگر ان کو چند باتیں غور کرنے کو لکھیں:

۱۔ انگریز بغیر اپنی ذاتی واقفیت کے کسی شخص کی نسبت ایسی سفارش کرتے تھے یا نہیں؟

۲۔ ان سے (مولانا فراہی سے) ماریسن سے ایسی ذاتی واقفیت تھی یا نہیں؟

بہرحال مولانا آخر فروری ۱۹۰۱ء میں حیدر آباد پہنچ گئے اور مولوی عزیز مرزا کے مہمان ہوئے مگر سید علی بلگرامی مولانا کو مجبور کر کے اپنے گھر لے گئے (۶)۔

مارچ ۱۹۰۱ء میں ولی عہد میر عثمان علی خاں کے ہاتھ میں بندوق پھٹ گئی اور وہ بالکل

محفوظ رہے۔ اسی خوشی میں بیگم پیٹھ میں ایک جلسہ ہوا جس کے متعلق تمکین کاظمی اس طرح لکھتے ہیں:

۹۔ مارچ کو بیگم پیٹھ میں یہ جلسہ مقرر کیا گیا تھا۔ چوں کہ شبلی یہاں موجود تھے اس لیے مدار المہام دکن نے شبلی سے نظم سنانے کی خواہش کی تھی اور شبلی نے اس جلسہ میں یہ نظم سنائی۔ اس نظم کو شمسی پریس میں فل اسکیپ کاغذ پر دو رخ طبع کرا کے غالباً شبلی ہی نے اپنے احباب کو جلسہ گاہ میں تقسیم بھی کی تھی (۷)۔

پہلے دو شعر اس طرح ہیں:

یارب ایں بزم چہ بزم است کہ از زینت و ساز   ہست ہر گوشہ تماشہ کدہ نعمت و ناز
بارک اللہ زہے کہ نظیرش بہ جہاں   خود ندید است و نہ بیند فلک عربدہ باز

آگے چل کر جلسہ، تہنیت اور میر عثمان علی کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

مجلس تہنیت نوبر اقبال شہی است   میر عثمان علی زیب دہ نعمت ناز

خاص واقعہ کا اشارہ اور گزند سے بچنے کا ذکر اس طرح ہے:

چوں نگہ داشتش از حادثہ خدائے   از دکن غلغلہ مژدہ رسد تا بہ حجاز
ہم بریں مژدہ جاں بخش تواں خواند غزل   ہم بشکرانہ ایں لطف تواں کرد نماز

آخری شعر اس طرح ہے:

باد خاک رہ او قبلہ اصحاب کمال   باد سنگ در او کعبہ ارباب نیاز

یہ نظم کل اٹھائیس اشعار کی ہے (۸)۔

۲۷۔ مارچ ۱۹۰۱ء کو ایک ماہ سے مولانا حیدر آباد میں تھے۔ حیدر آباد جاتے ہوئے ان کو بھوپال ٹھہرنے کا خیال پیدا ہوا، مگر اس خیال سے باز رہے کہ شاہجہاں بیگم صاحبہ والیہ بھوپال بیمار تھیں اور ان کی وجہ سے نواب علی حسن خاں پریشان تھے۔ اس پریشانی میں ان کو اپنے قیام سے مولانا پریشان کرنا مناسب نہ سمجھے۔ مولانا کو حیدر آباد میں امور مذہبی کی خدمت پیش کی گئی تھی لیکن اس وقت تک مولانا نے اس کو منظور نہیں کیا تھا۔ مارچ ہی میں ایک بڑا جلسہ ان کے لکچر کا ہوا، جس میں تقریباً ڈیڑھ ہزار بزرگوں کا مجمع تھا۔ انھوں نے علم کلام پر لکچر دیا، اس کو ایک صاحب نے قلم بند کر لیا تھا جو بعد کو چھاپا جانے والا تھا جس کا ایک نسخہ نواب علی حسن خاں کو بھیجنے کا ارادہ تھا۔

سید علی بلگرامی سے مولانا نے نواب علی حسن خاں کا ذکر خیر کیا۔ مولانا نے چاہا کہ نواب صاحب اپنے والد نواب صدیق حسن خاں مرحوم کی عربی تصنیفات مطبوعہ۔ مصر و ہند تحفہ کے طور پر سید علی بلگرامی کو ارسال کرتے۔ بھوپال کے مدارس کی روداد پر انھوں نے اظہار مسرت کیا اور دن دونی رات چوگنی ترقی کے لیے دعا کی اور یہ بھی ارداہ کیا کہ واپسی میں مدارس کو دیکھ کر ایک یادداشت لکھ دیتے لیکن نواب صاحب کی خواہش پر روداد ہی پر اپنی رائے لکھ کر اخبارات وغیرہ میں بھیجنے کو تیار تھے۔ انگریزی روداد سید علی بلگرامی نے لے لی تھی اور اس کی بھی اطلاع دی (۹)۔

مولانا نے جمودر اور چھاؤنی کی دستاویزوں کے مختار نامے کا مسودہ مولوی اسحاق سے طلب کیا تاکہ تکمیل کرا کے جلد واپس کر دیتے۔ مولانا کا تقرر ۴۲۵ روپے پر ہو رہا تھا، مگر مولانا نے اس کو قبول کرنے سے انکار کیا تو مدار المہام نے نظام کے حضور میں پرزور تحریری سفارش کی کیوں کہ وہ خود اس سے زیادہ دینے کے مجاز نہ تھے اور اس سفارش کے نتیجے سے بھی مایوس تھے کیوں کہ مدار المہام سے نظام کی ناچاقی بڑھتی جارہی تھی۔ اسی زمانے میں سید علی حسن (محسن الملک کے بھائی) جو مدار المہام کے خاص آدمی تھے ان کو نظام نے فوری طور پر معزول کر دیا اور ایک انگریز کو بھی۔ اس واقعے سے سب لوگ گھبرا گئے اور خصوصاً غیر حیدر آبادی اپنی خیر منانے لگے۔ اس لیے مولانا نے ارادہ کیا کہ اگر کوئی صورت ہو جاتی تو ٹھیک تھا ورنہ سو روپے وظیفہ سے سوتیلی والدہ، مہدی کی بیوی، نیشنل اسکول وغیرہ کے چالیس، پچاس روپے نکال کر بقیہ سے بسر کرنے کو تیار تھے اور لکھنو یا علی گڑھ میں قیام کا ارادہ تھا اور ندوہ یا کالج کا مشغلہ۔ تنہائی اور بے تعلقی میں قوم کی خدمت زیادہ ہونے کی امید تھی۔ ان کے خیال میں کالج کو تو ان کی ضرورت نہیں تھی، البتہ ندوہ کام کرنے کی جگہ تھی اور اس کی اصلاح بہت کچھ ہو سکتی۔ اگرچہ اس ارادے کو بدلنے پر تیار نہ تھے پھر بھی مولانا اسحاق کی رائے دریافت کی (۱۰)۔

مولانا کے علم کلام پر لکچر کے جلسے میں وزیر عدالت صدر ہوئے۔ حیدر آباد کے وزیر اعظم نے مولانا کو شرف نیاز بخشا اور حیدر آباد کے قیام کی ترغیب دی اور ملازمت کا تحریری حکم بھی بھیج دیا مگر مولانا نے منظور نہیں کیا۔ چوں کہ نظام اپنے وزیر اعظم سے ناخوش تھے، اس لیے ان کے اختیارات گھٹا دیئے تھے، لہذا ہر کام میں نظام سے منظوری لینا پڑتی تھی اور یہ چند ہی دنوں سے ایسا ہوا تھا (۱۱)۔ دنیاداری اگر بن پڑتی تو بہت سے دنیوی فائدے تھے مگر یہ مولانا کے بس کا نہ تھا

حیدر آباد کا جانا اور ملازمت کی امید کرنا بھی گھر کے مصائب (قرض وغیرہ) کی وجہ سے تھا ورنہ آپ گوشہ، عافیت کو کسی فلک نما (۱۲) سے کم نہ سمجھتے تھے۔ اس قدر پریشان تھے کہ عرب کی ہجرت کا ارادہ کر رہے تھے۔

علم کلام پر لکچر دینے کی وجہ یہ تھی کہ مولانا الغزالی کی تیاری میں مصروف تھے اور اس سلسلے میں علم کلام کا وسیع مطالعہ کر رہے تھے۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ مولانا کا یہ پریشانی کا زمانہ تھا اس لیے الجھنوں کے زمانے میں الجھے ہوئے فلسفیانہ مسائل سے دلچسپی بے جانہ تھی۔ تیسرا سبب یہ تھا کہ خشک فلسفیانہ مسائل سے مولانا کا تعلق اسی دور میں ممکن تھا اس لیے کہ شاعرانہ طبیعت کا فراخی اور کشادگی، اطمینان و سکون، مسرت و شادمانی کے زمانے میں کچھ اور تقاضا ہوتا اور وہ بعد کو شعر العجم کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ چوتھے یہ کہ تنگی اور افسردگی یا تو بغاوت پر آمادہ کرتی ہے یا وحدانیت کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ مذہبی جوش بغاوت (الحاد) کے لیے رکاوٹ اور وحدانیت اور اس کے لوازمات (مابعد الطبیعاتی مسائل) کے معاملے میں معاون ثابت ہوا۔ پانچویں وجہ یہ تھی کہ مولانا کا تصوف سے اور روحانیت سے کبھی تعلق نہ رہا۔ حالاں کہ ان کا خاندان بزرگوں سے بیعت کا تعلق رکھتا تھا لیکن ان کے بزرگوں سے مراسم ضرور تھے اور وہ بھی مراسم کی حد تک مگر حیدر آباد (دکن) میں تصوف سے عام دلچسپی تھی اور اس کا اتنا اثر ہوا کہ تصوف سے دلچسپی نہ ہوئی مگر اس کے مسائل پر اسی زمانے میں غور کیا جو الغزالی، علم کلام اور الکلام میں کہیں کہیں ملتے ہیں۔

مولانا شیروانی نے کتاب الآلات کے لیے تصاویر کے متعلق دریافت کیا تو ان کو جواب دیا کہ رحمت اللہ رعد کو لکھا جائے وہ انتظام کر دیتے یا علمی جنتری والوں کو لکھا جاتا۔ شروانی صاحب سے جہاں گیر کا مرقع عیش (۱۳) جلد طلب کیا کیوں کہ بہت جلد حیدر آباد سے واپس ہونے والے تھے۔ اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ مولانا کا تقرر (۱۴) ۲۲۔ مئی ۱۹۰۱ء کو سررشتہ، علوم و فنون کی نظامت پر ہو گیا تھا مگر وہ حیدر آباد میں قیام کے متعلق طے نہیں کر پا رہے تھے۔

یورپ کی مطبوعات کے متعلق لکھا کہ انھوں نے اس مرتبہ نہیں منگوائیں اور کوئی کہاں تک منگوا سکتا تھا، اس لیے کہ قدمائے اسلام کی تصنیفات بکثرت چھپ رہی تھیں اور قیمتیں بہت زیادہ رکھی گئی تھیں، اس لیے کہاں تک ہمت کر سکتے تھے۔ ہاں البتہ سید علی بلگرامی کی ہفتہ وار ڈاک میں کچھ کتابیں آئی تھیں۔ بعض کتابیں تو یورپ میں ایسی شائع ہوئی تھیں جن سے مولانا پہلے سے واقف نہ تھے۔ ان اعلیٰ قدیم تصنیفات میں سے تاریخ ایران ثعلبی (غرر تاریخ الفرس) تھی جس

کے ایک حصہ کی قیمت ۹۰ روپے تھی۔ کتاب المحاسن والمساوی بیہقی، عیون الاخبار ابن قتیبہ، کتاب البخلاء للجاحظ وغیرہ عجیب کتابیں تھیں (۱۵)۔

مولانا ندوہ کے معاملات سے باخبر رہتے تھے چناں چہ نصاب کی تبدیلی کے لیے بڑے شد و مد سے کوشاں تھے اور اسی سلسلے میں مولوی عبدالحی نائب ناظم ندوۃ العلماء کو مفصل خط لکھا تھا جو شروانی صاحب تک نہیں پہنچا تھا ندوہ کی حالت پر افسوس کرتے ہوئے لکھا کہ شرح عقائد نسفی، ہدیہ، سعیدیہ، نور الانوار درس میں پھر رکھی گئیں اور مولوی حفیظ اللہ نے رکھیں جو دیگر کتابوں سے واقف بھی نہیں (طنز کیا ہے)۔ مولانا شروانی کے متعلق لکھتے ہیں کہ ایک روشن خیال شروانی تھے جن پر مولانا اعتماد کرتے تھے۔ اور امید کرتے تھے کہ دارالعلوم میں انگریزی تعلیم کو رائج کرنے میں وہ مولانا کی ہمنوائی کرتے کیوں کہ ان کا علی گڑھ کالج سے بھی تعلق تھا، مگر وہ بھی خاموش رہتے تھے۔ چناں چہ مولانا نے لکھا۔

> ایک ہمارے روشن خیال شروانی ہیں، جن کو میں اپنا امام کہتا ہوں۔ ان کا یہ حال ہے کہ انگریزی کے نام سے ان کو لرزہ آتا ہے، بڑی مشکل سے مسلمانوں کے پھسلانے کو تجویز پر راضی ہوئے تو عمل درآمد میں حیران ہیں، حالاں کہ تمام طالب علموں کو انگریزی پڑھانا مقصود نہیں، نہ میرا یہ خیال ہے، صرف اس قدر مقصود ہے کہ دو چار لڑکے انگریزی بھی پڑھیں۔ اتنی ذرا سی بات ان کے نزدیک اتنی عظیم الشان ہے جس قدر محسن الملک کی فرضی یونیورسٹی ان ہمتوں پر کوئی کیا کر باندھے (۱۶)"۔

اب مولانا نے حیدر آباد میں قیام کا ارادہ کر لیا تھا، لیکن نہ جی لگ رہا تھا نہ وہاں کے سیاسی حالات ایسے تھے کہ مولانا کو اطمینان ہوتا۔ مولانا نے دوسری شادی ایک جگہ جم کر قیام کی غرض سے بھی کی تھی مگر حالات نے ایسا مجبور کیا کہ حیدر آباد جانا پڑا اور وہاں کے حالات سے بھی مطمئن نہ تھے۔ مولانا کی اہلیہ بندول سے خاصدبہ چلی گئی تھیں۔ مولانا چاہتے تھے کہ دوسری بیوی کچھ تعلیم حاصل کر لیں اس لیے اپنی صاحبزادی کو تاکید کی تھی کہ ان کی تعلیم کا خیال رکھیں لہذا ان کا خیال تھا کہ کچھ نہ کچھ تعلیم ہو گئی ہوگی، اس کے بعد مزید تعلیم کا بندوبست حیدر آباد میں کرنا تھا کیوں کہ وہاں بلانے اور اپنے ساتھ رکھنے کا ارادہ تھا اور اس کے لیے وہ چاہتے تھے کہ جلد کوئی انتظام ہو جائے ورنہ جوں جوں وقت گزرے گا تعلیم نہ ہو پائے گی۔ لہذا مولوی سمیع کو خاص انتظام کرنے کی ضرورت تھی، ورنہ اب تک جو کچھ تعلیم ہوئی تھی وہ بھی ضائع ہونے کا اندیشہ تھا۔ مولانا جیب خرچ کے لیے اپنی اہلیہ کو ۵ روپیہ بھیجا کرتے تھے۔ لہذا مولوی سمیع سے خواہش کی کہ

وہ بھیج دیں اور اطلاع دیں تاکہ مولانا ان کو بھیج دیں۔ مولانا حسن صورت کو پسند کرتے تھے مگر اس میں ان کو مایوسی ہوئی تھی۔ لہذا چاہتے تھے کہ حسن سیرت ہی ہو جائے جو ان کی تسکین کا سبب ہو اور حسن سیرت کے لیے وہ تعلیم کو مقدم سمجھتے تھے۔ حیاتِ جاوید کے سلسلے میں اپنی رائے سے گریز کرتے ہوئے لکھا کہ پڑھ کر خود ہی فیصلہ کریں کیوں کہ ان کو شعور تھا اور وہ صحیح فیصلہ کر سکتے تھے (۱۷)۔

مولانا محمد علی مونگیریؒ نے بعض حالات کی بنا پر ندوہ کی نظامت سے استعفا (۱۸) دے دیا تھا۔ اس پر مولانا نے شروانی صاحب کو لکھا کہ ابو محمد عبدالحق دہلوی مؤلف تفسیر حقانی اور عبدالقیوم کی طرف لوگوں کا خیال تھا جو مناسب نہ تھا، کیوں کہ ندوہ جس بنیاد پر قائم تھا یہ حضرات اس کو پورا نہ کر سکتے۔ لہذا ارکان سے خط و کتابت کرنے اور ندوہ کو سنبھالنے کی ضرورت تھی۔ مولوی مسیح الزماں کو نظامت کے لیے اوروں سے بہتر سمجھتے تھے اور شاہ سلیمان کو بھی غنیمت جانتے تھے۔ یہ بھی لکھا کہ وقت سستی اور بے پروائی کا نہیں (۱۹)۔

حیدر آباد میں سیاسی اکھاڑ پچھاڑ تو ہوتی رہتی تھی۔ آج وہ مقبول بارگاہ ہوا، کل وہ نظروں سے گرا، آج کسی کی عزت اوج و کمال پر، کل وہی پستی و زوال پر۔ چناں چہ اسی قسم کا انقلاب آیا اور وقار الامراء وزارت سے خوار ہوئے اور راجہ کشن پرشاد صاحب وقار ہوئے۔ ریاستوں میں عام طور سے یہی ہوتا ہے کہ وزارت نے چولا بدلا تو ہر شعبہ کی چولیں ڈھیلی کر دی جاتی تھیں پھر نئی وزارت اپنے استحکام کے لیے نئی کیلیں ٹھونکتی ہے۔ لہذا وزارت (۲۰) کی تبدیلی سے مولانا کو اپنے لیے بھی خطرا پیدا ہوا۔ شروانی صاحب نے کتاب الآلات مولانا کو بھیج دی۔ مولانا کو شروانی صاحب نے اپنی فارسی غزل بھی بھیجی تھی جس کی تڑپ اور بے چینی دیکھ کر مولانا نے اندازہ لگایا کہ شروانی صاحب کی شادی طے ہو رہی تھی اور صرف عقد باقی تھا۔ اس کے بعد مولانا نے اس غزل کے سلسلے میں مشورہ دیا ہے جس میں الفاظ و محاورات کے بعض نکات بیان کیے تھے۔

اب مولانا سررشتہ علوم فنون کی نظامت قبول کر چکے تھے مگر انقلابِ وزارت کی وجہ سے اندیشہ تھا کہ وہ خدمت بھی مولانا کو قبول کرتی یا نہیں (۲۱)۔

مولانا کو ایسا شعبہ ملا تھا جو ان کی مرضی کے مطابق تھا اور وہ علم کی خدمت سکون سے کرتے، مگر

"سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں"

اگر قدرت کے کارخانے میں سکوں محال ہے تو ریاستوں کی وزارت میں بھی محال تھا۔ لہٰذا وہاں سے جو امیدیں وابستہ تھیں وہ خاک (۲۲) میں مل گئیں۔ اس لیے کہ ان کے قدر داں پر نگاہ عتاب پڑی اور وہ ملازمت سے الگ ہو گئے (۲۳)۔ اس لیے مولانا بھی پا بر کاب تھے اور اپنی ملازمت کی خیر مناتے ہوئے وقت گزاری کر رہے تھے۔ کتاب الآلات کے چھپنے کی بھی اب امید نہ تھی کیوں کہ سید علی بلگرامی کے علمی ذوق پر اس کا دارومدار تھا اور وہی اس کے طبع کرانے کے خواہش مند تھے۔ شروانی صاحب نے مولانا کو صاحبِ دل لکھا تو اس کے جواب میں لکھا کہ ابن خلکان وغیرہ تو مدت سے صاحب دل لکھتے اور سمجھتے تھے۔ انھوں نے اب سمجھا تھا۔ ایمان بالحضور ایمان بالغیب کو نہیں پہنچتا۔ ان کی تحسین ان کے عیب خورد گیری اور ناتواں بینی کو رائج کرتی تھی۔

ہر عیب کو سلطاں بہ پسندد ہنر است

ان کی باقی غزلیں بھی طلب کیں اور لکھا کہ اگر اپنا دیوان مکمل کرنا منظور ہو تو عقد کی تاریخ ملتوی کرتے جائیں تاکہ تڑپ، بےچینی اور اضطرابی کیفیات باقی رہیں، جو شاعری کے لیے محرک اور جذبات کو برانگیختہ کرنے والی تھیں اور اگر شادی ہو گئی تو جو ناسور پھوٹ رہا تھا اور جو لاوا ابل رہا تھا اس کے بند ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اسی زمانے میں یورپ کی نادر تصنیفات شائع ہوئی تھیں اور کانفرنس (مسلم ایجوکیشنل کانفرنس) کے مدراس میں منعقد ہونے کی اطلاع دی۔ لہٰذا خواہش کی جب مدراس جائیں تو حیدر آباد جانے کا موقع اچھا تھا۔ اب مولانا الگ مکان میں رہتے تھے اور معتمد تعمیرات کی کوٹھی سے منتقل ہو گئے تھے۔ ان کی شہرت وہاں اتنی ہو گئی تھی کہ پتے میں صرف نام کافی تھا یا زیادہ سے زیادہ سررشتہ علوم و فنون بھی۔ شروانی صاحب کے مصرعے "چوں بخواہد داشت تاب بوسہائے بیدریغ" کی تعریف کی۔

شروانی صاحب (۲۴) نے ایک اور غزل بھیجی اس میں انداز کا لفظ مولانا کو کھٹکا۔ اگرچہ مرزا غالب نے بھی اس کو استعمال کیا تھا مگر مولانا کسی اہل زبان کی مثال چاہتے تھے۔ نئی غزل میں کوئی غلطی نہ تھی، مگر چوں کہ ایک خاص مضمون یعنی آرزو کا التزام کیا گیا تھا۔ لہٰذا اس میں طبیعت کی جولانی کم پاتے تھے۔ ایسی طرح اختیار کرنے کا مشورہ دیا جس میں خاصی وسعت ہو۔ ریاست میں نئے نئے شگوفے کھل رہے تھے۔ سید علی بلگرامی کے اپنے عہدہ سے الگ ہونے کی وجہ سے بھی پر تول رہے تھے۔

مولانا حیدر آباد کے حالات سے بہت دل برداشتہ تھے اور اپنے کو دو چار روز کا مہمان سمجھتے تھے۔ حامد نعمانی وطن گئے تھے اور پھر مولانا کے پاس حیدر آباد واپس ہونے والے تھے۔ حیدر آباد سے علاحدگی کے بعد وطن جانے کا ارادہ نہ تھا اس لیے چاہتے تھے کہ مولوی سمیع تعطیل میں آجاتے تو زنانی سواریوں کو ان کے ساتھ وطن بھیج دیتے وہ حیدر آباد دیکھ لیتے۔ صرف ایک طرف کا کرایہ دینا ہوتا۔ یادگار زمانہ داغ دہلوی، عبدالحلیم شرر لکھنوی، سید علی و سید حسین بلگرامی کو بھی دیکھ لیتے (۲۵)۔

مولانا (۲۶) امید و بیم میں مبتلا تھے ابھی کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ دو ایک مہینے میں فیصلہ کی امید تھی۔ نصاب دینیات جو مولانا نے تیار کیا تھا اس کے متعلق شروانی صاحب نے بعض مجبوریاں لکھی تھیں اس کا علاج مولانا کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ علم کلام کے متعلق مولانا کا خیال تھا کہ اگر کبھی لکھ سکے تو شروانی صاحب کے بھی کام کی ہوتی۔ سید علی بلگرامی کی علاحدگی سے کتاب الآلات کا کوئی انتظام نہیں ہو رہا تھا، لہٰذا اس کو واپس بھیجنے پر آمادہ تھے۔ شروانی صاحب کی غزلوں میں اب پختگی ہو گئی تھی لہٰذا ڈھونڈ کر نکتہ چینی کرنا پڑتی تھی۔ لہٰذا ان کو کچھ مشورے دیے اور لکھا کہ خود انھوں نے بھی ایک نظم لکھنی شروع کی تھی جس کا پہلا مصرع ہے:

اے دکن! ایکہ بہار چمن جاں از تست

ایک شعر اس زمانے سے متعلق تھا:

چوں تو اند کہ زہر پردہ برآرد صد نقش　　　گر نہ نیرنگی ایں گنبد گرداں از تست

حیدر آباد کی جامعیت کس خوبی سے بیان کی ہے:

ہند یاں نیز چو از حلقۂ بگوشان تو اند　　　ہر چہ ذیشاں بود آں نیز کنوں ہاں از تست
ہاں تو دعویٰ کن و ما نیز مسلم داریم　　　شبلی سحر فن و داغ غزل خواں است قست

پوری غزل یہ ہے:

اے دکن اے کہ سر و برگ عزیزاں از تست　　　اے کہ شیرازہ، اوراق پریشاں از تست

(۲۷)

کیست امروز کہ پروردہ، احسان تو نیست　　　از جہاں دامن دولت گہر افشاں از تست
آں قدر خوان کرم پہن کشیدی کا مروز　　　در جہاں گرمی ہنگامہ، احساں از تست
بسکہ صیت تو در افواہ جہاں افتاد است　　　گرمی صحبت شیراز و صفاہاں از تست

زخم برہر کہ رسد سوزن و مرہم از تو   درد ہر جا کہ بود چارہ و درماں از تست
عدل را پایہ بہ اندازنگہ داشتہ۔   آں توئی کا شتی گبر و مسلمان از تست
علم و فن رانبود جزدبہ حریم تو پناہ   دانش و فلسفہ راکار بہ ساماں از تست
ہم فروغ گہر و فضل کمال است از تو   ہم بہار چمن عالم امکان از تست
ما غریبان وطن نیز چواز آں توئیم   ہرچہ از مابود آں نیز کنوں ماں از تست
مایہ دار چشم وردہ بابت شاہی   عزہ افسر و اورنگ ترخاں از تست
ہاں بہ خود ناز کہ زیندہ اورنگ شہی   شاہ جم مرتبہ محبوب علی خاں از تست
چوں تو اند کہ زہر پردہ بر آرد صد نقش   گرنہ نیرنگی ایں گنبد گرداں از تست
ہندیاں نیز چواز حلقہ بگوشان تواند   ہرچہ زیشاں بود آں نیز کنوں ہاں از تست

ہاں تو دعویٰ کن دمانیز مسلم دارم
شبلی سحر فن و داغ غزلخواں از تست (۲۸)

چوں کہ غزل حیاتِ شبلی اور کلیاتِ شبلی فارسی میں نہیں ہے۔ اس وجہ سے پوری نقل کر دی گئی ہے۔ مولانا کلکتہ کے قاضی صاحب سے خط و کتابت کرنا چاہتے تھے اس وجہ سے شروانی صاحب سے ان کا پتہ دریافت کیا۔ سید علی بلگرامی کے کتب خانے میں یورپ کی عربی مطبوعات دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی اور اپنے علماء پر افسوس کہ جو ان کے کرنے کا کام تھا وہ غیر کر رہے تھے۔ نظام کا عتاب اب بھی لوگوں پر تھا۔ چناں چہ رسالہ حسن کے مالک حسن کے اخراج کا بھی حکم ہو گیا تھا (۲۹)۔

شروانی صاحب نے نعت لکھی تو مولانا نے انھیں لکھا کہ علمائے ادب کا خیال ہے کہ حضرت حسان بن ثابتؓ جاہلیت کے نامور شاعروں میں سے تھے۔ اسلام کے دور میں نعت کہنی شروع کی تو وہ بات نہ رہی۔ فارسی میں بھی نعت گو بہت کم پھیلے۔ خسرو اور جامی کے علاوہ باقی کم مرتبہ تھے۔ چوں کہ نعت احترام کے قیود میں ہوتی ہے اور ان قیود سے آزادی میں شاعری کے جوہر کھلتے ہیں اس لیے مولانا نے ان کے لیے پسند نہ کیا اور یہی وجہ تھی کہ ان کی نعتیہ غزل کے متعلق لکھا کہ نہ صرف پھیکی بلکہ غلطیوں سے معمور تھی۔ اس کے بعد مختلف زاویوں سے ان کے اشعار کا جائزہ لیا اور فرد گذاشت سے مطلع کیا۔ مدراس آنے کی دوبارہ دعوت دی اور حیدر آباد بلانے کے لیے ایک شعر لکھا جس میں اپنے یہاں بلانے کی لطیف خواہش کا اظہار ہے۔

شبلی کا گھر بھی خانۂ دشمن کے پاس ہے محشر خرام اور بھی دو اک قدم سہی (۳۰)

مولانا اس سال بھی ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسے میں شرکت نہ کر سکے۔ چناں چہ روداد میں ان کے خط کی نقل اس طرح ہے:

"شمس العلماء مولانا محمد شبلی نعمانی صاحب ناظم سررشتہ علوم و فنون حیدرآباد دکن

"رخصت ملنے کی توقع نہیں۔ اس لیے شاید کلکتے نہ پہنچ سکوں لیکن اب کی مرتبہ ندوہ میں اعلان کر دیجیے کہ میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ سب چھوڑ چھاڑ ندوے کے آستانے پر آبیٹھوں اور اپنی تمام عمر اس کی خدمت میں صرف کروں (۳۱)۔

مولانا حسب وعدہ آبیٹھے تھے اور شاید مر کر ہی اٹھتے، مگر لوگوں نے چین سے بیٹھنے نہ دیا آخر ۱۹۱۳ء میں استعفا دینا پڑا تھا۔

مولانا سید محمد علی مونگیریؒ ناظم ندوۃ العلماء درد گردہ کی وجہ سالانہ رپورٹ نہ پڑھ سکے۔ لہٰذا مولوی سید عبدالحی صاحب مددگار ناظم ندوۃ العلماء نے رپورٹ پڑھی۔ جس میں بعض حضرات کے شرکت نہ کرنے پر افسوس کیا گیا تھا۔ رپورٹ کا وہ جز اس طرح ہے:

ملک کے کس قدر قابل اور برگزیدہ حضرات بعض مجبوریوں سے جلسے کی شرکت کو تشریف نہیں لا سکے اور اپنی معذوری پر متاسف ہیں۔ ازاں جملہ مولانا محمد لطف اللہ صاحب مفتی عدالت عالیہ حیدرآباد دکن مولانا نور اللہ خاں صاحب استاد حضور نظام دکن۔ جناب مولانا محمد عبدالحق صاحب قاضی ملک محروسہ بھوپال۔ مولانا محمد شبلی صاحب نعمانی ناظم سررشتہ علوم و فنون، حیدرآباد کے خطوط پیش کیے (۳۲)

"

اگرچہ مولانا جلسے میں شریک نہیں ہو سکے تھے مگر دستور العمل کی ترمیم و تنسیخ کی مجلس کے ارکان میں ان کا نام شامل کیا گیا۔ روداد ہشتم میں اس طرح ہے:

جناب صدر انجمن صاحب (مولانا شاہ محمد رشید الحق صاحب عمادی قادری) نے یہ تحریک پیش فرمائی کہ، حسب دفعہ ۵۶ دستور العمل ندوۃ العلماء کے ایک مجلس خاص منتخب کی جائے جو ندوۃ العلماء کے دستور العمل پر غور و فکر کر کے اس کی ترمیم کرے۔ آپ نے فرمایا کہ اس وقت جو دستور العمل موجود ہے وہ ابتداءً ضرورت کے مطابق بنایا گیا تھا اب وہ ضرورتیں بدل گئی ہیں اور اس بات کی حاجت پیش آئی ہے کہ اس کو زیادہ وسیع کیا جائے۔"

مولوی سید عبدالحی صاحب مددگار ناظم نے اس تحریک کی تائید کی اور کہا کہ دفعہ ۵۶ کا منشا یہ ہے کہ اس دستور العمل کی ترمیم و تنسیخ و اضافہ صرف جلسہ خاص میں جو اسی غرض کے واسطے منعقد ہوگا، ہو سکے گی اور وہ جلسہ خاص فہرست ہائے دفعہ ۹ سے بہ پابندی قاعدہ حصہ آخر دفعہ ۲۴ کے جلسہ عام میں منتخب ہوا کرے گا۔ یہ تحریک آرا منظور ہوئی اور اس مجلس کے ارکان مندرجہ ذیل منتخب ہوئے۔ ۱- ....، ۲- ....، ۳- ....، ۴- ....، ۵- ....، ۶- مولوی محمد شبلی صاحب نعمانی ناظم سررشتہ علوم و فنون۔ حیدر آباد دکن (۳۳)۔

حواشی:

۱.... حیاتِ شبلی، صفحہ ۳۵۷

۲.... حیاتِ شبلی، صفحہ ۵۳-۳۵۲

۳.... ایضاً، صفحہ ۵۳-۲۵۲

۴.... اس خطرے کا اندیشہ مولانا حالی کو جولائی ۱۹۰۰ء میں ہوا تھا۔ جب مولانا بیمار تھے۔ چناں چہ مولانا حالی نے لکھا تھا۔ مدت سے شمس العلماء مولانا شبلی کا حال معلوم نہیں۔ ندوۃ العلماء کی نسبت عجیب عجیب افواہیں سنی جاتی ہیں، مگر معتبر ذریعے سے کوئی بات آج تک نہیں سنی گئی۔ نواب لفٹنٹ گورنر کے دل میں اس کی طرف سے شکوک کا پیدا ہونا معلوم نہیں کیا کہاں تک صحیح ہے (مکتوبات حالی حصہ اول، صفحہ ۱۲، ۶- جولائی ۱۹۰۰ء)

۵.... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۰-۹، ۲۲- فروری ۱۹۰۱ء

۶.... ماہنامہ ادیب علی گڑھ

۷.... ماہنامہ ادیب، صفحہ ۸

۸.... کلیاتِ شبلی (فارسی)، صفحہ ۳۸

۹.... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۷۰-۱۶۹، ۲۷- مارچ ۱۹۰۱ء

۱۰.... مکاتیب اول، صفحہ ۴۰-۳۹، ۷- اپریل ۱۹۰۱ء

۱۱.... مکاتیب اول، صفحہ ۴۰-۳۹، ۱۲- اپریل ۱۹۰۱ء

۱۲.... نظام کا محل

۱۳.... شروانی صاحب کے پاس قدیم شاہی مرقعے تھے جن میں سے ایک میں جہانگیر کو شراب پیتے اور کنیزوں کو با ۔ ب کھڑے دکھلایا گیا تھا۔

۱۴ ...یاتِ شبلی، صفحہ ۳۶۳

...تیب اول، شروانی کے نام، صفحہ ۱۲۵-۱۲۷، ۲۵- مئی ۱۹۰۱ء

۱۶ ... مکاتیب اول، صفحہ ۲۷-۱۲۵، ۲۵-مئی ۱۹۰۱ء
۱۷ ... مکاتیب اول، صفحہ ۴۲-۱۰۳، ۱۷-جون ۱۹۰۱ء
۱۸ ... مولانا محمد علی نے اس سے قبل ۸-رجب ۱۳۱۳ھ مطابق ۲۶-دسمبر ۱۸۹۵ء کو بھی استعفیٰ دیا تھا (جلسہ انتظامیہ میں) بوجہ ضعف اور دائم المرض ہونے کے، جس پر مولوی شاہ سلیمان نے فرمایا کہ استعفیٰ منظور کرنا جلسہ عام کا کام ہے - صدر انجمن مولوی عبداللہ ٹونکی نے اس کی تائید کی اور استعفیٰ منظور نہ ہوا (رجسٹر خصوصی صفحہ ۳ دفتر ندوۃ العلماء)
۱۹ ... مکاتیب اول، صفحہ ۱۲۷، ۲۷-جون ۱۹۰۱ء
۲۰ ... مکاتیب اول، صفحہ ۲۹-۱۲۷، ۲-اگست ۱۹۰۱ء
۲۱ ... ۳-صفر ۱۳۱۹ھ مطابق ۲۲-مئی ۱۹۰۱ء کو مولانا کا تقرر سررشتہ علوم و فنون کی نظامت پر ہوا۔
۲۲ ... مکاتیب اول، صفحہ ۳۰-۱۲۹، ۸-ستمبر ۱۹۰۱ء
۲۳ ... سید علی بلگرامی
۲۴ ... مکاتیب اول، صفحہ ۱۳۰، ۷-اکتوبر ۱۹۰۱ء
۲۵ ... مکاتیب اول، صفحہ ۱۰۴، ۱۰-اکتوبر ۱۹۰۱ء
۲۶ ... مکاتیب اول، صفحہ ۳۲-۱۳۰، اکتوبر ۱۹۰۱ء
۲۷ ... تمکین کاظمی نے پہلا مصرع اسی طرح لکھا ہے ممکن ہے مولانا نے بعد کو تبدیل کر دیا ہو۔
۲۸ ... ادیب - علی گڑھ، اکتوبر ۱۹۶۰ء، صفحہ ۱۰-۹
۲۹ ... مکاتیب اول، صفحہ ۱۳۲، ۹-نومبر ۱۹۰۱ء
۳۰ ... مکاتیب اول، صفحہ ۳۴-۱۳۲-دسمبر ۱۹۰۱ء
۳۱ ... روداد اجلاس ہشتم ندوۃ العلماء منعقدہ ۲۳ تا ۲۶-شعبان ۱۳۱۹ھ مطابق ۵ تا ۸-دسمبر ۱۹۰۱ء، روز پنج شنبہ، جمعہ، شنبہ، یک شنبہ واقع کلکتہ حسب ایمائے مجلس انتظامیہ ندوۃ العلماء، محمود المطابع - کانپور۔
۳۲ ... ایضاً، صفحہ ۳۷
۳۳ ... روداد اجلاس ہشتم ندوۃ العلماء منعقدہ ۲۳ تا ۲۶-شعبان ۱۳۱۹ھ مطابق ۵ تا ۸-دسمبر ۱۹۰۱ء، بروز پنج شنبہ تا یک شنبہ واقع کلکتہ حسب ایماے مجلس انتظامیہ ندوۃ العلماء، محمود المطابع - کانپور، صفحہ ۱۰، ۳۷، ۳۵

۱۹۰۲ء

مولانا شروانی نے مولانا کو حیاتِ جاوید کے بارے میں کچھ لکھا تھا تو مولانا نے اس پر جواب دیا کہ سرسید کی یک رخی تصویر دکھائی گئی ہے اور اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ کسی کے معائب دکھانا تنگ خیالی اور بد طینتی ہے۔ اگر اس کو صحیح مان لیا جائے تو یورپ کا مذاق اور علمی ترقیاں دو کوڑی کی ہو کر رہ جائیں۔ اس طرح تو ایشیائی شاعروں میں بھی کچھ برائی نہیں۔ کیوں کہ وہ دعویٰ کرتے تھے، واقعات کی شہادت پیش نہیں کرتے تھے۔ بہر حال حیاتِ جاوید کو مولانا مدلل مداحی سمجھتے تھے۔

ندوہ میں اب انگریزی جاری ہو گئی تھی، سرمایہ الہ آباد بینک میں رکھا گیا تھا۔ اس خبر سے مولانا خوش ہوئے اور شروانی صاحب کو لکھا کہ اب ندوہ میں رہنے کو جی چاہتا ہے۔ مولانا کے ذہن میں ندوہ کا جو تصور تھا وہ پورا ہوتا نظر آ رہا تھا۔ اب شروانی صاحب کی غزلیں مولانا کو برابر موصول ہو رہی تھیں اور مولانا نکات شاعری کو مدنظر رکھتے ہوئے اصلاح کر دیتے تھے (۱)۔

مولانا اس زمانے میں اچھے تھے مگر پریشان تھے اس لیے کہ ایک چیز کا فیصلہ برسوں میں ہوتا تھا۔ اس لیے یکسوئی نہ تھی پھر سازشوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ سررشتہ، اور دائرۃ المعارف پر کمیشن بیٹھا تھا اور اس کی رپورٹ پر اس محکمے کا قائم رہنا یا نہ رہنا منحصر تھا۔ اس ذہنی کوفت کی وجہ سے کچھ بنائے نہ بنتی تھی۔ مولانا اب الغزالی لکھ چکے تھے اور وہ چھپنے بھی بھیج دی گئی تھی۔ سلسلہ آصفیہ میں ایک فرنچ کے دو سفرنامے دکن کے (۲) اور ایک تاریخ دکن مصنفہ مولوی عبد الغفور ملازم سررشتہ چھپ چکی تھیں۔ لہٰذا مولانا کی کتاب بھی اسی سررشتہ کی طرف سے چھپنے کو دی گئی۔ مولانا چاہتے تھے کہ دیہات کو فروخت کر کے اگر قرض ادا ہو جاتا تو مولانا ایسی سازشی جگہ پر دو ہزار کی ملازمت بھی نہ کرتے مگر قرض سے مجبور تھے۔ ندوہ میں قیام کا پختہ ارادہ کر چکے تھے اور اس آرزو کے پورا ہونے کے متمنی تھے۔ سید علی بلگرامی ملازمت سے سبکدوش ہو ہی چکے تھے۔ لہٰذا انھوں نے ۸۔ مارچ ۱۹۰۲ء کو ولائت روانہ ہونے کا ارادہ کر لیا تھا۔

مولانا نے وہاں ایک عجیب کتاب دیکھی جو بڑی قابل قدر تھی یعنی مرزا صائب نے تمام شعراء کے کلام کا مجموعہ تیار کیا تھا۔ یہ کتاب اس کا بہت اچھا نسخہ تھی۔ بے مثل اشعار کا انتخاب تھا

مگر کتاب کے مالک اس کو فروخت کرنے پر کسی طرح راضی (۳) نہیں ہوتے تھے (۴)۔

منتخب چھپنے کی اطلاع شروانی صاحب کو دی اور لکھا کہ اس کی عمدگی کا اندازہ دیکھ کر ہو سکتا تھا۔ اب بھی پریشانیوں میں مبتلا تھے۔ شاعری کے سلسلے میں لکھا کہ وہ جو طرحیں استعمال کرتے تھے وہ مقید اور محدود ہوتی تھیں، اس لیے قافیہ اور ردیف نبھانے کے لیے شاعری وقف ہو جاتی تھی۔ لہذا ایسی طرحیں لینے کی ضرورت تھی کہ جو خیال دل میں آتا بے تکلف بندھ جاتا اس طرح ہر شعر شگفتہ، برجستہ اور رواں ہوتا۔ مرزا صائب کے انتخابی مجموعہ کی ان کو بھی اطلاع دی اور عرفی کے چند اشعار بھی اس سے نقل کر کے بھیجے (۵)۔

مولانا کو شکایت تھی کہ مولانا فراہی خطوط نہیں لکھتے، لہذا ان کے حالات دوسروں سے معلوم کرتے تھے۔ مولانا نے لکھا کہ شاید وہ مولانا پر بھی یہی الزام لگائیں مگر حیدرآباد میں رہ کر انسان خدا کو بھی بھول جاتا تھا، اس لیے کہ ایک منٹ بھی سکون سے بسر نہیں کر سکتا تھا۔ اگرچہ مولانا اس سیاست سے بہت دور تھے مگر ہندوستان کے لحاظ سے پورے سیاست دان معلوم ہوتے تھے۔۔ بہرحال ذکر غم بدتر از غم کہہ کر اس ذکر کو چھوڑ دیا۔ لیکن ان حالات میں بھی تالیف کا سلسلہ جاری تھا۔ غزالی مطبع کو بھیج چکے تھے جو حجم میں تقریباً سیرۃ النعمان کے لگ بھگ تھی۔ علم کلام کی تاریخ بھی قریب الختم تھی۔ اب کلام جدید کا مرحلہ تھا اس کے لیے چاہتے تھے کہ کوئی انگریزی داں مل جاتا تو کام چلتا، کیوں کہ حکمائے یورپ کے دلائل جو روح و واجب الوجود کی تائید میں تھے ان کو شامل کر کے کتاب کو رونق دینا چاہتے تھے۔ مولانا فراہی سے چاہتے تھے کہ وہ کچھ مدد کرتے، عربی داں، انگریزی داں اور عزیز بھی تھے مگر ان کی سستی سے نالاں تھے۔ ان سے پہلے چاہا تھا کہ یورپ کے فلسفہ کا ہلکا سا ڈھانچا کھڑا کر دیتے تو بصیرت ہوتی، مگر انھوں نے نہ کیا، اس وقت جو کام کر رہے تھے اس میں مدد کرنا ایک مذہبی اور قومی کام تھا۔ مولانا کو پتا چلا کر عربی عبارت لکھ کر داؤد بھائی کے پاس ان دنوں بھیج رہے تھے تو لکھا کہ سوائے اپنا دل خوش کرنے کے اور کیا حاصل، اس لیے کہ دوسرے حریری بننے سے رہے، اور اگر بن بھی جاتے تو اس زمانے میں حریری یا امرؤ القیس کی کیا ضرورت تھی۔

مرزا صائب کے انتخاب کی پھر داد دی اور لکھا کہ اس میں چودہ ہزار اشعار تھے اور سب اچھے تھے۔ جرجانی کی اسرار البلاغہ مصر میں چھپنے کی اطلاع دی، مولانا نے منگوائی تھی مگر ابھی تک پہنچی نہ تھی۔ امام غزالی کی کتاب محک النظر جو منطق میں تھی اس کی تعریف کی کہ جامع، صاف اور

سادہ تھی اور چھپ گئی تھی (۶)۔

۱۴۔ مارچ ۱۹۰۲ء کو مولانا بخار میں مبتلا تھے۔ مولانا شروانی نے کسی عنوان پر کتاب لکھنا چاہی تھی۔ اس عنوان کو پسند کرتے ہوئے مولانا نے بعض مشورے دیے اور لکھا کہ ساری چیزیں تو ان کے پیش نظر ضرور تھیں لیکن اگر ممکن ہو تو یورپ کے فلسفہ۔ اخلاق اور اسلام کے فلسفہ اخلاق کا فرق بتانے کی ضرورت تھی، اس لیے کہ اکیلے یورپ کے فلسفہ۔ اخلاق کو لینا کوئی چیز نہ تھی، فلاسفرز کو لینے کی ضرورت تھی۔ حکمائے یورپ کا یہ بیان بھی لکھا کہ اسلام کا اخلاق ایک وحشی قوم کو مہذب بناتا ہے، لیکن مہذب کو مہذب تر نہیں کر سکتا، بلکہ اعلیٰ تہذیب کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اس کا رد لکھنے کی ضرورت تھی۔ اس زمانے میں مولانا سو روپیہ کی اجرت پر خصائص ابن جنی نقل کرا رہے تھے جو مختصر کتاب تھی اور عربی فلسفہ پر تھی۔ ابن جنی متنبی کا شاگرد تھا۔ کاتب عرب تھا اور عربی داں بھی۔ اگرچہ اجرت زیادہ تھی مگر نقل کا انتظام اچھا تھا۔ مصر میں معمولی کتابیں چھپتی تھیں۔ ان کے لیے نواب محسن الملک نے سو روپے رکھے تھے۔ وہ بیکار تھے اس لیے کہ ایک کتاب بھی کام کی نہیں لکھی گئی تھی۔ بعض قدیم کتابیں مولانا نے منگائی تھیں جو ابھی تک آئی نہیں تھیں۔ مثلاً قسطاس المستقیم غزالی، میزان العمل غزالی منطق میں، تاریخ غرناطہ للسان الدین الخطیب وزیر اندلس مخصص لابن سیدہ۔

علم کلام کا مسودہ مولانا شروانی کو بھیجنے کا ارادہ تھا تاکہ وہ دیکھ کر بتلاتے کہ کون سا حصہ رکھنے کے قابل ہے اور کون سا نہیں۔ یہ شروانی صاحب سے خصوصیت کی بنا پر تھا ورنہ اس معاملے میں اب تک کسی سے شاگردی کی نسبت گوارا نہ کی تھی۔ توحید لکھ چکے تھے، نبوت لکھ رہے تھے، معاد لکھنا تھا، لہٰذا دریافت کیا کہ عقائد کے مسائل اور کیا تھے اور اس میں مزید کیا لکھنا تھا۔ کتب کلام میں جو عقائد لکھے تھے، مولانا ان کو عقائد میں داخل نہیں سمجھتے تھے، مثلاً حدوث عالم، صفات باری کا لاعین لاغیر ہونا وغیرہ۔ لہٰذا ان کے عنوان طلب کیے۔ مولانا شروانی سے جلد ملاقات کی امید کر رہے تھے، کیوں کہ ندوہ یا کالج ان دو میں سے کہیں رہنے کا ارادہ کر چکے تھے۔ علی گڑھ کالج کے دینیات کے امتحان سے مطمئن ہوئے مگر امتحان کی نگرانی اور پرچوں کے بھیجنے کے انتظام سے مطمئن نہ تھے (۷)۔

مولانا نے اپنے فرزند حامد نعمانی کے لیے چاہا تھا کہ حیدر آباد میں پاس رہیں، لہٰذا وہ میں ان کی ملازمت چاہتے تھے مگر ان سے پہلے ہی کے لوگ اب تک برسرکار نہ ہوئے تھے تو پھر ان کا نمبر

بعد کو تھا۔ کمیشن نے فیصلہ کر دیا تھا کہ سررشتہ، علوم وفنون کا محکمہ ختم کر دیا جائے مگر یہ فیصلہ قطعی نہ تھا، کیوں کہ اس کی رپورٹ کیبنٹ کونسل میں پیش ہونا تھی۔ اس میں اسی فیصلے پر عمل ہونے کا امکان تھا۔ اس لیے مولانا بہت پریشان تھے، خصوصاً قرض کی فکر تھی۔ اگر قرض کی فکر نہ ہوتی تو کب کے لات مار کر الگ ہو چکے ہوتے۔ گھر اس لیے نہ جانا چاہتے تھے کہ قرض خواہوں اور چپراسیوں سے جان چھوٹتی نظر نہ آتی تھی۔ قرضے کا انتظام کرنا چاہا مگر اعزا نے مدد نہ کی۔ زندگی عجیب پریشانی میں تھی بلکہ زندگی سے عاجز تھے۔ کہیں چلے جانا چاہتے تھے مگر کہاں جاتے۔

مولانا نے حامد نعمانی کو مشورہ دیا کہ حیدر آباد کی ملازمت کا خیال چھوڑ کر کہیں اور ملازمت کی کوشش کریں۔ اس زمانے میں ایران جانے کی تیاری کر رہے تھے (۸)۔

مولانا شروانی کی اسی زمانے میں شادی ہوئی تو مولانا نے بڑی پرجوش مبارک باد دی۔ مولانا شروانی فرید وجدی کا رسالہ المراۃ المسلمہ منگوانا چاہتے تھے۔ لہذا مولانا نے لکھا کہ رسالہ کی قیمت ۲ شلنگ تھی کچھ ڈاک کا خرچ۔ المراۃ المسلمہ کی قیمت اندازاً دو روپے ہوگی، کیوں کہ انھوں نے لکھی نہیں مجموعی قیمت بھیج دی جاتی۔

ندوہ لکھنو سے شاہجہان پور اٹھ گیا تھا، اس لیے یہ منتقلی قابل اعتراض تھی، مگر یہ اس لیے بہتر تھی کہ لکھنو میں منشی اطہر علی صاحب اپنے لکھنو کے قیام اور رکن ندوہ ہونے کی وجہ سے چھا گئے تھے اور مولانا کو پسند نہ کرتے تھے، بلکہ ایک انتظامیہ جلسہ میں یہ تحریک (۹) کی تھی کہ مولانا کو ندوہ کے جلسے میں تقریر سے باز رکھا جائے۔ وہ تحریک مولانا کی مقبولیت کی وجہ سے کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ مولانا نے منتقلی کو بہتر سمجھا کہ نادان دوست کے تسلط سے نجات ملی اگرچہ ان کو ان اسباب کا پتہ نہ تھا، جن کی بنا پر منتقلی ہوئی تھی۔

مولانا شروانی نے الغزالی پر ریویو میں نکتہ چینی کی تو مولانا نے اس کو پسندیدگی سے دیکھا اور مشتبہ باتوں کو جس عمدگی سے صاف کیا تھا اس کی داد دی، اور دوسرے ایڈیشن میں اس کے مطابق اصلاح کرنے پر تیار ہوئے۔ مولانا شروانی نے علم کلام کی فرمائش کی تھی تو لکھا کہ دفتر دور ہونے کی وجہ سے فرمائش کی تعمیل کا علم نہیں۔ محرم کی تعطیل کے بعد دریافت کرنے کا ارادہ تھا۔ مولانا نے شروانی صاحب کے مملوکہ فارسی تذکروں کے نام دریافت کیے تھے اس کے جواب سے محروم رہنے پر شکایت کی (۱۰)۔

نواب وقار الملک نے مولانا سے ایڈریس لکھنے کی خواہش کی تو مولانا نے جواب دیا کہ

ان کے ہوتے ہوئے مولانا ایڈریس کیا لکھتے لیکن بہرحال تعمیل ارشاد میں ندوہ کے دفتر سے بعض چیزیں دریافت کیں اور جواب آنے پر لکھنے کا ارادہ کیا۔

الغزالی اکتوبر یا نومبر ۱۹۰۱ء میں رحمت اللہ رعد کے مطبع میں چھپنے کو بھیجی گئی تھی۔ ۶ ماہ سے زاید کے عرصے میں صرف ۱۳۷ صفحات لکھے گئے تھے۔ اس قدر سست کام تھا، لہٰذا وہاں کی سستی کا تجربہ کر کے علم کلام کی تاریخ ۲۱۔ اپریل ۱۹۰۲ء کو آگرہ چھپنے کو بھیجی جس کے جلد چھپنے کی امید تھی (۱۱)۔

لکھنو میں محسن الملک کی صدارت میں اردو کے لیے جلسہ ہوا تھا اس کا چندہ جون پور سے آیا تھا اس کو انجمن ترقی اردو کے سیکریٹری کی حیثیت سے طلب کر رہے تھے، مگر نہیں مل رہا تھا پھر کالج کے چندے میں سے بھلا کون دیتا، جبکہ کالج میں دیا گیا ہو اور انجمن ترقی اردو کے لیے منتقل کرایا جا رہا ہے۔

انجمن ترقی اردو کے قواعد نواب علی حسن خاں کو بھیجے تھے۔ انھوں نے اپنے خط میں اپنے فرائض پوچھے تو جواب دیا کہ کیا انجمن کے قواعد ان کو نہیں بھیجے گئے تھے، اگر نہیں تو اب بھیج دیتے، ان کو پڑھ کر اپنے فرض کو پورا کرنا تھا۔ ندوۃ العلماء کی طرف سے اسی زمانے میں ایک ماہوار علمی رسالہ کا اجرا ہونے والا تھا۔ مولانا اس کو نہایت اعلیٰ علمی مضامین کا مجموعہ بنانا چاہتے تھے مولانا نے اس میں نواب علی حسن خاں صاحب کو لکھنے کی ترغیب دی۔ انجمن ترقی اردو کی طرف سے مولانا کا مصحفی اور میر تقی میر وغیرہ کا تذکرۃ الشعرا چھپوانے کا ارادہ تھا، اس لیے دریافت کیا کہ نواب صاحب کے کتب خانے میں کوئی تذکرہ تو نہ تھا۔

اب مولانا نے مثنوی مولانا روم پر ریویو اور سوانح مولانا روم لکھنا شروع کر دیا تھا۔ یہ حیدر آباد کی تصوف کی فضا کا اثر تھا، کسی حد تک تو متاثر ہونا ہی تھا (۱۲)۔

مولانا شروانی کی اہلیہ کی طبیعت خراب تھی جس سے مولانا فکرمند تھے۔ حامد نعمانی اس زمانے میں بغیر اطلاع پھر کہیں چلے گئے تھے، جس سے مولانا پریشان تھے۔ لوگوں کو ادھر ادھر تلاش کے لیے بھیجا، پتا چل گیا تھا مگر اب تک واپس نہ آئے تھے۔

مولانا شروانی کو اعظم گڑھ بلانے میں یہ جھجک تھی کہ اس بار منت کے اٹھانے کے قابل ہونے میں اپنے متعلق مشتبہ تھے۔ اسی زمانے میں مولانا شروانی کا بنارس اور مرزاپور میں قیام رہا تو یہ دریافت کیا کہ وہاں کتنے دن قیام رہا اور اعظم گڑھ پھر بھی نہ گئے۔

انوری کے دیوان کو منگوانے کا ارادہ تھا لہٰذا اس کے ملنے کا پتا دریافت کیا۔ مولانا شروانی نے ایک شعر لکھا تو جواب میں اپنا ایک شعر لکھا مگر اس کو زمانہ جاہلیت کا بتلایا:

وہ جو آتے بھی تو میں آپ سے باہر ہوتا ... بے خودی وصل کی، حظ کب مجھے لینے دیتی

ان دنوں مصر سے ایک رسالہ اسلام کے ثبوت اور اس زمانے کے فلسفے کی تطبیق میں نکل رہا تھا۔ یہ ماہانہ رسالہ بہت اچھا تھا۔ اڈیٹر فرید وجدی تھا جو فرنچ اور جرمن زبان کا ماہر تھا۔ مولانا اس کو ہر ماہ منگا رہے تھے اور مسلسل آرہا تھا مگر صفحات کم ہوتے تھے۔ قاہرہ میں اس زمانے میں تفسیر ابن جریر طبری چھپ رہی تھی جس کے لیے مولانا بے چین تھے۔ البشیر (۱۳) میں شائقین علم لیے ایک عمدہ خبر شائع ہونے والی تھی مولانا اس سے فائدہ اٹھانے والے تھے (۱۴)۔

مولانا کے حالات حیدر آباد میں بد سے بدتر ہوتے جاتے تھے، مولانا کچھ زود حسی کی وجہ سے محسوس بھی زیادہ کر رہے تھے۔ ان کو فکر تھی کہ نیشنل اسکول سے کوئی قومی لڑکا بھی پاس ہوا یا نہیں۔ مولانا نے موازنہ ترقی قومی نام کی ایک مجلس قائم کی تھی جس کے سیکریٹری مولوی سمیع صاحب تھے۔ اس کا مقصد اعزا اور احباب میں علم کا شوق پیدا کرنا اور ان کی تعلیم کا بندوبست کرنا تھا۔ نیشنل اسکول کے دروازے ممبروں کے لڑکوں کے لیے ہر وقت کھلے ہوئے تھے۔ مولانا کو ایک تو نیشنل اسکول سے بے حد دلچسپی تھی دوسرے ترقی قومی سے، اس لیے قومی لڑکے سے مراد ترقی قومی سے تعلق رکھنے سے ہے۔ مولوی سمیع کے پاس نذر کے سلسلے میں کچھ روپے تھے۔ اس کا مصرف مولانا نے بتلایا کہ ان کو ترقی قومی کے مصارف کے لیے رکھا جائے یا نیشنل اسکول میں اس غرض سے بھیجے جائیں کہ چھوٹے سے چھوٹا فرنیچر خرید لیا جائے، کیوں کہ اس کی بڑی کمی تھی، یا پھر کسی غریب طالب علم کو وظیفہ میں دے دیا جائے (۱۵)۔

مولانا اب وقار آباد میں تھے۔ علالت کا سلسلہ پھر چل رہا تھا۔ بدن میں خون کی کمی ہو گئی تھی، بالکل سپید ہو گئے تھے۔ وطن کا ارادہ کر رہے تھے کہ مولوی اسحق کا تار ملا، لہٰذا سفر ملتوی کر دیا اور آب و ہوا کی تبدیلی کے خیال سے وقار آباد چلے گئے جو حیدر آباد کا شملہ تھا۔ وہاں پہنچ کر ایک ٹانگ میں درد پیدا ہو گیا اور اس کی وجہ سے سخت تکلیف ہو گئی۔ پیشاب کی مقدار زیادہ ہو گئی اور بار بار لگنے لگا یہاں تک کہ بارہ بارہ دفعہ آتا تھا (۱۶)۔

ندوہ کی پچھلی کارروائیوں سے مولانا کو یقین ہو گیا تھا کہ ندوہ والے مولانا سے بدظن رہتے تھے، اس لیے کسی علمی کام میں شرکت سے خائف تھے، لہٰذا مولانا نے کسی کے خیالات پر بار

ڈالنا مناسب نہ سمجھا مگر خود منافق بننا اور دوسروں کو منافق بنانے سے بچنا چاہتے تھے۔ لہٰذا اس سلسلے میں نائب ناظم کو ایک خط لکھا اور چاہا کہ شروانی صاحب اس خط کو منگوا کر پڑھیں اور مولانا کو اجازت ہو کہ وہ ندوہ کے معاملات سے آزاد ہو جائیں (۱۷)۔

اسی ہفتہ اگست کے تیسرے ہفتہ میں نواب محسن الملک کا خط ملا جس میں انھوں نے اطلاع دی کہ انھوں نے لیفٹننٹ گورنر سے مل کر مولانا کی طرف سے گورنمنٹ کے شکوک کو رفع کر دیا، جو علی گڑھ کے زمانے میں قائم ہوئے تھے۔ شکوک رفع ہونے کی وجہ یہ بھی تھی کہ گورنمنٹ کے سربراہ مسٹر مکڈانلڈ لیفٹننٹ گورنر یوپی اب گورنر نہ تھے، وہ بے چارے مسلمانوں سے بڑا خار کھاتے تھے اور مولانا سے بہت بدگمان تھے۔ دوسرے علی گڑھ کالج میں اب وہ انگریز اساتذہ نہ رہے تھے جو گورنمنٹ کے خاموشی سے کان بھرنے میں کمال رکھتے تھے، اور علی گڑھ کالج سے خیر خواہی، حکومت سے وفاداری اور قوم پروری کا ثبوت اس طرح دیا کرتے تھے۔ لفٹننٹ گورنر نے بھی یہ کہا کہ اگر محسن الملک چاہتے تو اب مولانا کو علی گڑھ کالج بلا سکتے تھے، لہٰذا محسن الملک نے کالج بلانا چاہا اور ترغیب دی کہ وظیفہ حیدر آباد کے ساتھ ساتھ کالج سے سو روپے ملتے، مگر مولانا نے کالج میں دوبارہ جانا پسند نہ کیا اور چاہا کہ اگر وظیفہ مل جاتا تو ندوہ کی خدمت کرتے۔

کالج چھوڑنے کا ایک سبب ندوہ بھی تھا، گو اتفاقی واقعات کی وجہ سے اس کا اب تک موقع نصیب نہ ہوا تھا۔ یہ تو مولانا کی کیفیت تھی، ادھر ندوہ والوں کا یہ حال تھا کہ جس کام میں مولانا نے برسوں غور کیا تھا، اس کے سامان بہم پہنچائے تھے اور اس کو اچھی طرح کر سکتے تھے اس میں ان کو ہاتھ نہیں لگانے دیا جاتا تھا۔ ندوہ کا رسالہ اور نصاب تعلیم یہ دونوں مولانا کے خاص مذاق کی چیزیں تھیں، اس لیے اس کام کو بخوبی انجام دے سکتے تھے، مگر اسی میں ان کو دخل نہیں دینے دیا جاتا تھا۔ اگر یہ ناموری اور شہرت کی خاطر تھا تو اس کے لیے علی گڑھ میں بڑا میدان تھا۔ مولانا کی شرکت سے ندوہ کے علماء کو یہ خیال ہو گیا تھا کہ وہ مذہب اور طرز تعلیم کی بساط ہی الٹ دیں گے، بہرحال ان کو کسی کے خیال پر اعتراض نہ تھا۔ مگر اس کیفیت کے تحت بے فائدہ دخل در معقولات سے رکتے تھے۔ مولانا کی شہرت سے البتہ ندوہ والے فائدہ اٹھاتے تھے۔ ان کا نام ضرور رکھتے تھے مگر کام میں دخل پسند نہ کرتے تھے۔ اس لیے انھوں نے نقارچی کے کام کو اپنے لیے پسند نہ کیا اور اس کے لیے ان کے نزدیک دوسرے بھی ہو سکتے تھے۔ اس سال کے جلسے کی تیاری انھوں نے کر لی تھی مگر ایسے مجمع میں شرکت کو پسند نہ کرتے تھے، جہاں ان کی طرف سے لوگوں میں

بدظنی ہو (۱۸)۔

مولانا ندوہ کی حالت سے مایوس تھے، اس لیے ارادہ تھا کہ دو ماہ کی رخصت لے کر لکھنو آتے اور کم از کم دو چیزوں کو جاری کرنے کی کوشش کرتے، ایک تو نصاب دوسرے ماہانہ رسالہ۔ اس کے علاوہ دوسرے شعبوں کی ترقی کے لیے بھی سوچنے کا ارادہ تھا، لیکن وہ چاہتے تھے کہ مولانا شروانی بھی لکھنو آکر کم از کم ایک ماہ قیام کرتے۔ بغیر ان کے مشورے اور مدد کے اصلاح کرنے میں پس و پیش کر رہے تھے۔ لہٰذا چاہتے تھے کہ اگر وہ اپنے کاموں کا حرج کر کے آسکتے تھے تو ان کو لکھنا چاہیے تھا، ورنہ ندوہ کی خیر نہ تھی۔ اگرچہ مولانا کو رخصت لینے میں خاصا نقصان اور تنخواہ نہ ملنے کا اندیشہ تھا۔ ملازمت کی مستقلی کا معاملہ بھی پیش تھا اور حیدر آباد میں اہلیہ کی تنہائی کا مسئلہ بھی مگر ان سب رکاوٹوں، دشواریوں اور ذاتی نقصانات پر ندوہ کے معاملات اور قومی کام کو ترجیح دے رہے تھے، اس لیے کہ دار العلوم ندوۃ العلماء کو اپنے خوابوں کی تعبیر اور تجربات و مشاہدات اور خیالات کی عملی اور مثالی تصویر دیکھنا چاہتے تھے۔

یہ بھی ارادہ تھا کہ دوران قیام (دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو) میں طلبہ کے سامنے روزانہ طرز قدیم میں لکچر دیتے تاکہ ان کی معلومات میں دو چند اضافہ ہوتا (۱۹)۔

مولانا اب ندوہ کے لیے بہت بے چین تھے اور ایک عجیب بے کیفی محسوس کر رہے تھے ۵۔ ستمبر کو ہی خط لکھ چکے تھے مگر اضطراری کیفیت میں ۶۔ ستمبر کو پھر ایک تفصیلی (۲۰) خط لکھا اور ان اسباب پر روشنی ڈالی جس کی وجہ سے وہ ندوہ آنا چاہتے تھے۔

مولانا کو دوسروں کی نیت سے غرض نہ تھی ان کی اپنی نیت یہ تھی کہ وہ ایک مذہبی خدمت انجام دیتے۔ ندوہ کی خدمت کو دینی خدمت سمجھتے تھے۔ دنیوی جاہ و اعزاز، ناموری اور شہرت کے لیے علی گڑھ کالج کافی تھا، جہاں سے اس وقت بھی بلاوے آرہے تھے۔ نواب محسن الملک، لیفٹنٹ گورنر سے مل کر مولانا کے بارے میں غلط فہمی دور کر چکے تھے اور علی گڑھ کالج میں ان کو اب بلانے پر اعتراض نہ تھا۔ مسٹر بیک (۲۱) بھی راہی ملک بقا ہو چکے تھے اور سید محمود معتمدی سے الگ ہو چکے تھے۔ غرض کہ علی گڑھ کی فضا ان کے لیے مناسب ہو گئی تھی۔ مالی فائدہ اور شہرت دونوں کا موقع تھا باوجود اس کے ندوہ آنا چاہتے تھے۔ اس لیے اس میں خود غرضی کو دخل نہ تھا۔ اس بے غرضی کے باوجود ندوہ والوں کا یہ سلوک تھا کہ مولانا نے لوگوں کے ناموں کی فہرست مانگی تاکہ ندوہ کے بارے میں مراسلت کریں تو باوجود اصرار کے ناظم اور مددگار ناظم

نے ٹالنا چاہا اور بڑی مشکل سے کل بارہ نام عنایت کیے۔

انھوں نے نصابِ تعلیم پر برسوں غور کیا تھا۔ مصر کی اصلاحات کو دیکھتے اور اس پر غور کرتے رہتے تھے، وہاں سے جدید کتابوں کے منگوانے کا سلسلہ جاری تھا اور وہ کتابیں لوگوں کے پاس نہ تھیں اور نہ منگوائی تھیں ان سب تجربات کے باوجود نصاب کمیٹی سے الگ رکھے گئے۔ رسالے کے معاملے میں دخل انداز نہیں ہونے دیا جاتا تھا تو پھر دعا گوئی اور طبل نوازی کے لیے تیار نہ تھے۔ مذہبی مجلس میں شریک ہو کر جوڑ توڑ کرتے اور اپنا اثر بڑھاتے اور مخالف کو شکست دیتے۔ یہ قطعاً پسند نہ تھا اور ندوہ کے بارے میں طبعاً متنفر تھے، جب یہ صورت تھی تو سیکرٹری کوئی ہوتا، ناظم اور مددگار ناظم کوئی بنتا اور اس عزت پر اتراتا ان کی بلا سے (۲۲)۔

غلط فہمی سے مولانا شروانی نے یہ سمجھا کہ مولانا ان کو ندوہ سے علاحدہ ہونے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اس کی انھوں نے (مولانا نے) تردید کی کہ ان (شروانی) پر ندوہ کو اعتبار تھا اور وہ (شروانی) اس اعتبار کی وجہ سے سب کچھ کر سکتے تھے اور ان کو کرنا چاہیے تھا۔ مولانا کے لیے یہ شرط رکھی گئی تھی کہ حیدر آباد چھوڑ کر آتے اور نصاب کا کام انجام دیتے۔ یہ شرط خود شروانی صاحب کے خط میں تھی اس پر مولانا نے اعتراض کیا اور لکھا کہ نصاب کا کام لاہور سے جب ہو سکتا ہے تو حیدر آباد سے کیوں نہیں ہو سکتا تھا۔

وہ ندوہ کے دشمن نہ تھے، جو اپنی علاحدگی سے اس کو نقصان پہنچانے میں مدد لیتے۔ امرتسر میں سالانہ اجلاس ہونے والا تھا، مولانا کے ساتھ یہ شرط لگائی گئی تھی کہ لکھ کر لکچر دیں، اس کو انھوں نے نامنظور کیا اور لکھا کہ انھوں نے کبھی لکھ کر لکچر نہیں دیا، زبانی ہو تو ٹھیک ورنہ جانے دیا جائے۔

ندوہ میں جو لوگ خلاف تھے ان میں مولانا کے ایک ہم وطن اور عزیز بھی تھے اور مخالفت کی وجہ بھی مولانا کو معلوم تھی۔ لیکن تعجب مولانا شروانی سے تھا کہ مولانا کے لیے ترکِ معاش کی شرط لگانے میں ندوہ والوں کے ہمنوا تھے، اس زمانے میں مولانا اعظم گڑھ آئے ہوئے تھے (۲۳)۔

اکتوبر ۱۹۰۲ء میں ندوہ کا سالانہ جلسہ امرتسر میں منعقد ہوا۔ شاہ محمد سلیمان چشتی قادری کی تحریک اور مولانا قاضی علی احمد صاحب بدایونی کی تائید سے مولانا محمد مسیح الزماں خاں صاحب رئیس شاہجہان پور صدر انجمن قرار پائے۔ مولانا نے بھی اس جلسے میں شرکت کی۔ رودداد میں اس

طرح ہے:

"شیخ عبد القادر صاحب بی - اے جس وقت اپنی تقریر تمام کر چکے، معزز حاضرین نے بے چینی سے شمس العلماء مولوی محمد شبلی نعمانی صاحب کی طرف نگاہیں دوڑائیں - وفور شوق اور شدت انتظار کے جھرمٹ میں مولوی صاحب ممدوح منصہ (اسٹیج) پر تشریف لائے اور اپنا ترکیب بند ایسے مؤثر انداز اور درد انگیز لہجے میں پڑھا جس کو سنتے وقت سامعین ہمہ تن گوش اور سراپا حیرت بن گئے تھے - خصوصاً دو بند اول کے کچھ ایسے پڑھے گئے، جنھوں نے علما پر ایک خاص کیفیت پیدا کر دی، اور جہاں تک دریافت ہوا ہے اس کا مزہ اب تک لوگ نہیں بھولے - اس ترکیب بند کے پڑھنے سے پہلے مولوی صاحب نے ایک مختصر تقریر بھی کی تھی اور درمیان میں بھی جابجا حالات اور موقع کے مناسب تقریر کرتے جاتے تھے - جس سے سامعین کو زیادہ لطف آتا تھا - اس ترکیب بند کو مولوی صاحب نے کانپور میں چھپوایا تھا - جس کی سو کاپیاں اس وقت موجود تھیں - ان کو حاضرین نے ہاتھوں ہاتھ خرید لیا (۲۴) پہلا شعر یہ ہے:

یکہ پرسی چہ کسانیم ؟ وچہ ساماں داریم ؟ — انچہ بایچ نیر زد بجہاں آں داریم (۲۵)

قدیم و جدید تعلیم کے متعلق بیان کرنے کے بعد ندوہ کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

حل ایں مشکل اگر خواہی زند وہ میخواہ — او کشاید گرہے راکہ بکار افتاد است
حکمت و شرع درینجا بہم آمیختہ اند — نمک و بادہ دریں میکدہ یار افتاد است
عقل راینست سرعربدہ اینجا بانقل — پنبہ را آتشی اینجا بہ شرار افتاد است

آخر میں یہ دعا تو پڑھنے کے قابل ہے:

شبلی آہنگ دعا کن کہ سخن گشت دراز — گرچہ دانم کہ قلم سحر نگار افتاد است
ہاں بدرگاہ خدای دو جہاں روی بنہ — کہ نم رحمت او بر گل وخار افتاد است
می تواند اثر قدرت او داد اماں — خرمنے را کہ بہر گوشہ شرار افتاد است
صدرہ افتاد کہ طوفاں زدہ، از کرمش — رستہ از لطمہ، موج دبہ کنار افتاد است
صدرہ افتاد کہ فیض کرمش جاں بدمید — مردہ، را کہ در آغوش مزار افتاد است
ای خداوند جہاں رحم بفرما برما — کہ چو ما بردر فیض تو ہزار افتاد است

طرح انجام مرا نیز، چو آغاز انداز (۲۶)
ای خدا ہاں نگہ، لطف، بہ ما باز انداز

آگے چل کر روداد میں اس طرح ہے:

اس کے بعد شمس العلماء مولوی محمد شبلی صاحب نعمانی کھڑے ہوئے اور آپ نے ناسازی طبع کا عذر اور سامعین سے بے حد انتظار کی معافی طلب کرنے کے بعد فرمایا کہ میں ختم نبوت پہ تقریر کرنے سے پہلے ندوۃ العلماء کی ضرورت پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں جو ہمیشہ ندوۃ العلماء کے نظام کا ایک جزو رہا ہے اور اس مرتبہ چھوٹ گیا ہے۔ اس کے بعد مندرجہ ذیل تقریر فرمائی:

ندوۃ العلماء کی ضرورت پر شمس العلماء مولوی شبلی صاحب نعمانی کی تقریر

"حضرات! ندوۃ العلماء کے جلسے میں جو سب سے زیادہ ضروری مضمون ہے وہ خود ندوۃ العلماء کی ضرورت کا ظاہر کرنا ہے۔ آج تک ندوہ کے جتنے سالانہ اجلاس ہوئے سب میں اس ضرورت کا لحاظ رکھا گیا اور اس مضمون پر پرزور تقریریں کی گئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ندوے کی تمام تر کامیابی کا مدار اسی پر ہے کہ یہ مسئلہ پوری طرح سے حل کر دیا جائے۔

ندوہ جب اول اول قائم ہوا تو قدیم اور جدید گروہ نے اس کو حیرت اور تعجب کی نگاہ سے دیکھا۔ قدیم گروہ کا خیال تھا کہ اگر ندوے کا مقصد علوم قدیمہ کو ترقی دینا ہے تو ہندوستان میں آج سیکڑوں عربی مدارس موجود ہیں جو اس مقصد کو بخوبی انجام دے رہے ہیں۔ جدید گروہ کہتا تھا کہ بڑی مشکل اور بڑی بارے پکار سے مسلمان خواب غفلت سے چونکے تھے اور جدید تعلیم کی طرف مائل ہوئے تھے۔ کیا ندوے کی یہ خواہش ہے کہ ترقی کی جس حد تک ہم پہنچ گئے تھے اس سے ہٹ کر پھر پہلے مرکز پر آجائیں اور قدیم تعلیم کے جس شکنجے میں ہم گرفتار تھے، دوبارہ پھر اس میں پھنس جائیں۔

اس قسم کا استعجاب جو ندوے کے متعلق ظاہر کیا گیا کوئی نئی بات نہ تھی۔ دنیا میں ہمیشہ جب کوئی نئی تحریک ہوئی ہے تو زمانے نے اسی طرح حیرت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ اسلام کا سب سے بڑا ضروری کام قرآن کا جمع کرنا تھا لیکن اول اول جب حضرت عمرؓ کے دل میں یہ خیال آیا تو حضرت ابو بکرؓ اور خود کاتب وحی نے اس ارادے پر سخت حیرت ظاہر کی اور کہا جو کام جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا، دوسرا شخص اس کے کرنے کی کیوں کر جرأت کر سکتا ہے۔ لیکن بالآخر سب نے اسی کام کو ضروری سمجھا اور اس کو انجام دیا۔

اسی طرح فقہ، حدیث، اسماء الرجال، علم کلام کی بنیاد قائم ہوئی اور ان میں سے ہر علم کے قائم ہونے کے وقت ابتدا میں مخالفت کی گئی۔

اب میں دونوں گروہوں کی طرف الگ الگ خطاب کرتا ہوں، قدیم گروہ کا یہ خیال کہ مدارس موجودہ میں علوم قدیمہ کی تعلیم کافی طور سے ہو رہی ہے۔ اس لیے ندوے کی کیا ضرورت ہے، یہ صحیح نہیں۔ ندوے کا مقصد صرف علوم قدیمہ کی تعلیم نہیں ہے بلکہ کچھ اور بھی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اسلام میں جتنے علم پیدا ہوئے سب زمانے کی خاص خاص ضرورتوں سے پیدا ہوئے، مثلاً علم کلام صرف اس ضرورت سے پیدا ہوا تھا کہ فلسفۂ یونان کی تعلیم نے لوگوں کے مذہبی خیالات متزلزل کر دیے تھے۔ اس بنا پر آج بھی چوں کہ فلسفۂ جدیدہ کی تعلیم نے ہزاروں آدمیوں کو مذہب کی طرف سے بے دل کر دیا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ فلسفۂ جدیدہ کے مقابلے میں ایک نیا علم کلام ایجاد کیا جائے، نہ صرف اسی قدر بلکہ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ جس طرح ہمارے قدما نے یونان، مصر، ایران اور ہندوستان کے علوم و فنون ایجاد کیے ہیں، ہماری زبان میں منتقل کیے جائیں۔

اس موقع پر مجھ کو ایک عالمگیر غلطی کا رفع کرنا ضرور ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ ہمارے علما انگریزی تعلیم تعصب کی وجہ سے نہ خود حاصل کرتے ہیں اور نہ دوسروں کو اجازت دیتے ہیں اس دعوے کا اس قدر حصہ تو بدیہی اور حقیقت واقعی ہے کہ علما انگریزی تعلیم سے بالکل الگ ہیں، لیکن بحث طلب یہ ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے؟ کیا جیسا کہ عام خیال ہے اس کی وجہ تعصب ہے؟ اگر تعصب ہی ہے تو ہمارے علما جن علوم و فنون کی تعلیم میں رات دن مشغول ہیں اور جس کو وہ اپنا مایۂ نیاز سمجھتے ہیں کیا وہ اسلامی علوم ہیں۔ منطق، فلسفہ، ریاضی، ہیئت یہ وہ علوم ہیں جن کو پڑھنے پڑھانے میں ہمارے علما کی تمام عمر صرف ہوئی ہے اور علما ان علوم کو اسی شوق اور محنت اور سرگرمی سے سیکھتے ہیں۔ جس طرح خالص مذہبی علوم مثلاً تفسیر اور فقہ اور حدیث کو۔ پس جب کہ ہمارے علما نے تمام غیر قوموں کے علوم و فنون کے حاصل کرنے میں اس قدر بے تعصبی اور فیاض دلی ثابت کی ہے تو کیوں کر کہا جا سکتا ہے کہ انگریزی علوم و فنون کے سیکھنے سے ان کو تعصب نے باز رکھا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ علما نے انگریزی تعلیم کا جو نمونہ دیکھا اور اسی تعلیم کا جو سرسری تجربہ ان کو ہوا اس نے ان کو یقین دلا دیا ہے کہ انگریزی زبان میں دقیق علوم اور نازک مسائل کا وجود نہیں بلکہ صرف سرسری اور عامیانہ باتیں ہیں جو درس و تدریس کے قابل نہیں۔ جغرافیہ، زمین کے نقشے، جانوروں کا حال، معمولی تاریخی واقعات، نجاری اور حدادی وغیرہ یہی انگریزی کی کل

کائنات ہے۔

علما کا یہ خیال اگرچہ بالکل غلط ہے لیکن اس کا منشاء انتزاع ضرور ہے۔ انگریزی خوانوں کا جو گروہ ملک میں موجود ہے اس سے ایک ناواقف شخص اور کیا قیاس کر سکتا ہے؟ آج ملک میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں انگریزی اعلیٰ درجے کے تعلیم یافتہ ہیں لیکن کیا ان میں ایک بھی فلسفہ داں ہے؟ منطقی ہے؟ شاعر ہے؟ اور اگر نہیں ہے تو اس نمونے کو دیکھ کر ہمارے علما اور کیا قیاس کر سکتے تھے؟ بہت بڑی چیز جو علم کا معیار ہے وہ علمی ذوق ہے۔ ہمارے علما علانیہ دیکھ رہے ہیں کہ انگریزی خواں جماعت میں علمی ذوق بالکل مفقود ہے، یعنی ایک شخص بھی علم کو علم کی غرض سے نہیں پڑھتا، یہاں تک کہ اگر گورنمنٹ کی طرف سے نوکریوں کے لیے انگریزی کی قید اٹھالی جائے تو اس سرے سے اس سرے تک تمام اسکول اور کالجز دفعتاً خالی ہو جائیں گے۔ اس سے ایک ناواقف شخص خواہ مخواہ یہ قیاس کرے گا کہ انگریزی میں دقیق، لطیف، نازک اور دلچسپ مسائل علمی نہیں ہیں، ورنہ یہ کیوں کر ممکن تھا کہ ایک مدت تک مشغول رہنے کے بعد ایک شخص کو بھی علمی ذوق نہ پیدا ہوتا۔

اس بنا پر ہمارے علما کو انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ کرنے کا صرف یہ طریقہ ہے کہ ثابت یہ کیا جائے کہ اس زبان میں بھی علوم و فنون لطیفہ موجود ہیں۔

اب میں علما سے مخاطب ہو کر کہتا ہوں کہ یورپ میں بہت سے ایسے علوم و فنون ہیں کہ ہمارے ہاں ان کا نام و نشان نہیں ملتا۔

خود ہمارے فن ادب میں بھی یورپ والوں کا قدم ہم سے آگے بڑھا ہوا ہے۔ لغت میں ہمارے یہاں سب سے زیادہ جامع تصنیف علامہ مجد الدین فیروز آبادی کی کتاب قاموس ہے اور اس سے بڑھ کر لسان العرب، صحاح جوہری میں الفاظ عربی کے چالیس ہزار مادے تھے، لسان العرب کے مؤلف نے چالیس ہزار مادے بڑھا کر اسی ہزار کر دیے۔ آج کل فرانس کے پروفیسر دوزی نے پچاس برس کی سخت محنت میں ایک ایسی کامل کتاب عربی فن لغت میں لکھی جس میں مذکورہ بالا کتب لغت کے اوپر صدہا کیا بلکہ ہزارہا الفاظ کا اور بھی اضافہ کر دیا۔ یہ کتاب میرے پاس موجود ہے۔

ہمارے فن ادب میں سب سے قیمتی ذخیرہ شعرائے جاہلیت کا کلام ہے۔ لیکن اس میں سے ہمارے پاس بہت تھوڑا سا حصہ ہے۔ مثلاً سبعہ معلقہ، متنبی، حماسہ وغیرہ لیکن یورپ نے

زہیر بن ابی سلمہ کے استاد اوس بن حجر اور لبید ابن ربیعہ اور بہت سے شعرا کا کلام مع شرح اور حل لغات طبع کیا ہے اور صدہا کتابیں اس فن کے متعلق ایسی تلاش کر کے شائع کیں جو بالکل نایاب تھیں۔

جب ہمارے علما پر یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ یورپین زبانوں میں ہر قسم کے علوم و فنون موجود ہیں اور خود ہمارے اسلامی علوم کے متعلق یورپ نے نہایت بیش بہا تحقیقات کی ہیں تو یقیناً ہمارے علما یورپ کے علوم و فنون کو بھی اسی ذوق اور سرگرمی سے حاصل کریں گے جس طرح انھوں نے یونانی علوم و فنون کو حاصل کیا تھا۔

ندوے کے مقاصد میں سے ایک بہت بڑا مقصد یہ ہے کہ یورپ کے سرمایہ، علمی سے فائدہ اٹھایا جائے اور یہ وہ چیز ہے جو اور مدارس عربیہ میں موجود نہیں اور نہ ہو سکتی ہے، کیونکہ اس کے لیے جو سامان درکار ہے وہ ہر مدرسہ مہیا نہیں کر سکتا، بلکہ اس کے لیے تمام قوم کی مجتمع قوت درکار ہے۔

اس موقع پر مجھ کو اپنا یہ بھی ظاہر کر دینا ضرور ہے کہ ندوے کا اگرچہ بڑا مقصد یہی تھا، لیکن ابھی تک اس میں مطلق کامیابی نہیں ہوئی، بلکہ یہ کہنا صحیح ہے کہ اب تک اس کا شائبہ بھی نہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ تمام ملک میں جو علما درس و تدریس میں مشغول ہیں، ان کو اب تک یورپ کی نسبت وہی بد اعتقادی ہے اور اس وجہ سے ندوے کو باوجود سخت کوشش کے ایک بھی روشن خیال مدرس ہاتھ نہیں آتا۔ اب میں جدید گروہ کی طرف خطاب کر کے ندوے کی ضرورت ثابت کرتا ہوں۔

جدید گروہ نے یہ غلط خیال کیا ہے کہ ندوہ مسلمانوں کو پھر قدیم تعلیم کے گڑھے میں ڈھکیلنا چاہتا ہے۔ ندوے کا اصلی مقصد یہ ہے کہ مشرقی اور مغربی تعلیم کے ڈانڈے ملا دیے جائیں۔ یہ قطعی ہے کہ جدید تعلیم اسلامی علوم اور اسلامی اثر سے بالکل خالی ہے، اس لیے اگر محض جدید تعلیم پر قناعت کی جائے تو مسلمانوں میں قومیت اور مذہب کی روح قائم نہیں ہو سکتی۔

نہ صرف اس قدر بلکہ جدید تعلیم بجائے خود بھی نوکری اور غلامی کے سوا اور کسی کام کی نہیں۔ انگلش حکمرانوں نے سیکڑوں بار علی رؤس الاشہاد کہا کہ علم کو علم کے لیے سیکھو، لیکن اس ہدایت اور نصیحت کا کیا اثر ہوا؟ کیا ہندوستان میں اس سرے سے اس سرے تک ایک شخص نے بھی علم کی غرض سے پڑھا یا اب پڑھ رہا ہے؟ جدید تعلیم کا جو اسلوب ہے وہ ثابت کر رہا ہے کہ یہ

حالت ماضی اور حال پر محدود نہیں بلکہ آئندہ بھی اس فرقے سے کبھی یہ امید نہیں کی جا سکتی ہے کہ وہ علم کو علم کی غرض سے پڑھیں گے۔

اے حضرات! (انگریزی خوانوں کی طرف مخاطب ہو کر) یہ خدمت اور یہ فرض جس کی ہدایت بڑے بڑے وائسرایان ہند نے کی ہے اس کو وہی غریب اور مسکین گروہ ادا کرے گا جس کو آپ پرانی تعلیم والا کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ اسی غریب گروہ نے ہمیشہ علم کو علم کی غرض سے پڑھا ہے اور یہی اب بھی اس خدمت کو انجام دے رہا ہے۔ ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ عربی علوم و فنون آج کل محض بے کار ہیں اور ان سے دنیاوی معاش کی ضرورت میں کچھ مدد نہیں ملتی۔ تاہم آج بھی سیکڑوں، ہزاروں طلبہ انھیں علوم کی تحصیل میں مصروف ہیں۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ وہ علم کو علم کی غرض سے سیکھتے ہیں نہ زر و مال و جاہ و جلال کے لیے۔

شاید کسی کو خیال ہو کہ مذہبی جوش کا اثر ہے اور صرف مذہبی خیال سے یہ علوم حاصل کیے جا سکتے ہیں، لیکن ان لوگوں کی نسبت کیا کہیے گا جو منطق، فلسفہ، ریاضی اور ادب کی تحصیل میں نہایت سرگرمی سے مشغول ہیں اور جنھوں نے صرف انھیں علوم میں اپنی عمریں صرف کر دی ہیں۔ ان علوم میں کون علم مذہب سے تعلق رکھتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ جدید تعلیم یافتہ گروہ کوئی علمی گروہ نہیں، بلکہ ایک کاروباری گروہ ہے اور اسی وجہ سے وہ علم کو اس غرض سے پڑھتا ہے کہ کاروبار میں کام آئے، اس لیے ان کو علم کی تحصیل سے اصل میں کچھ غرض نہیں۔ علمی گروہ وہی غریب علما ہیں جو فاقے کر کے علوم کی تحصیل کرتے ہیں، صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ اس فرقے کو علوم جدیدہ کی فضیلت اور اس کی ضرورت ذہن نشین کرا دی جائے، پھر یہی گروہ ان علوم جدیدہ کو بھی اسی ذوق و شوق اور سرگرمی سے سیکھے گا جس طرح وہ آج علوم قدیمہ کو حیرت انگیز کوششوں سے حاصل کر رہا ہے اور یہی ندوے کی تمام تر غرض اور تمام تر غایت ہے" (۲۷)۔

مولانا نے ایک اور تقریر کی جس کا ذکر اس طرح ہے:

"شمس العلماء مولوی محمد شبلی صاحب نعمانی چاہتے تھے کہ صرف اسی تقریر پر اکتفا کریں، مگر حاضرین جلسہ کے بے حد اصرار سے ختم نبوت پر تقریر شروع فرمائی، جس پرواز پر تقریر فرما رہے تھے اس کا نتیجہ یہ تھا کہ تقریر ناتمام رہے باوجود کہ ایک گھنٹہ صرف اسی عنوان پر تقریر فرماتے رہے، مگر تقریر کے بعض حصے چھوٹ گئے، اور بعض بہت مجمل طریقے پر بیان ہوئے تاہم

جس قدر بیان ہوئے وہ ایسا فاضلانہ مضمون تھا جس کے سننے کے لیے سامعین ہمہ تن گوش ہو رہے تھے اور اس عالم خاموشی میں بھی حسن بیان کا یہ اثر تھا کہ سبحان اللہ اور جزاک اللہ کی صداؤں سے تمام ہال گونج جاتا تھا۔ افسوس ہے کہ اردو میں اب تک آواز نویسی کا طریقہ ایجاد نہیں ہوا اس وجہ سے ایسی دلاویز تقریریں اسی وقت تک کے لیے ہوتی ہیں جب تک کہ ان کی آواز کانوں میں گونجتی رہے۔ یہ تقریر اس قابل تھی کہ حرفاً حرفاً قلم بند کی جاتی مگر باوجود کوشش کے نہیں ہو سکی۔ جس قدر حصے قلم بند ہوئے وہ ایسے نامربوط ہیں جن میں زیادہ لطف (۲۸) نہیں آسکتا۔ مولوی صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اس تقریر کو مستقل رسالے کی صورت میں قلم بند کریں گے۔"

مولانا چوں کہ علم کلام اور الغزالی لکھ چکے تھے اور الکلام لکھ رہے تھے اس وجہ سے اسی کے متعلق مطالعہ کر رہے تھے اور تقریر میں بھی اس کا ذکر اس زمانے کی ان کی اپنی دل چسپی کے لحاظ سے ملتا ہے۔ اس تقریر میں انھوں نے بڑی صراحت کے ساتھ اپنے مجوزہ دار العلوم کو پھر پیش کیا ہے اور قدیم و جدید تعلیم کی خامیوں پر گرفت کی ہے اور خوبیوں کو بھی بیان کیا ہے، پھر دونوں ڈانڈوں کو ملانے پر زور دیا ہے۔

فہرست ارکان میں اس طرح ہے:

"فہرست ارکان قسم اول ندوۃ العلماء بابت سال نہم۔ نمبر شمار ۲۶۔ اسم گرامی شمس العلماء مولوی محمد شبلی صاحب نعمانی۔ تعداد للعہ (۲۹)۔

مولانا پھر بیمار پڑ گئے اور ۸۔ نومبر ۱۹۰۲ء کو بھی اس کا سلسلہ باقی تھا۔

مولانا شروانی کو نصاب کے متعلق اصل نقشہ پر ریمارک لکھ کر بھیج دیے۔ ارادہ تھا کہ علی گڑھ کانفرنس سے پہلے پہنچ سکے تو رسالت پر لکچر دینے کا ارادہ تھا۔ مولانا کا خیال تھا کہ رسالے کے ایڈیٹروں میں ان کے نام کو ندوہ والے پسند نہ کرتے، ایسی صورت میں وہ خود بھی پسند نہیں کر رہے تھے کہ بلاوجہ اختلاف کا موقع دیں۔ دار العلوم اور دار الافتاء وغیرہ کے سلسلے میں ندوے نے جو تجاویز رکھی تھیں ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ رسالہ بھی اسی نمونے پر ہوتا۔ علما خود تو مضامین لکھ نہ سکتے تھے اس لیے خواہ مخواہ دوسروں سے مدد لیتے اور وہ لوگ ندوے کے مقصد کو پورا نہ کر سکتے تھے اور مولانا شروانی اکیلے کیا کیا کر سکتے تھے (۳۰)۔

دینیات کے سلسلے میں یادداشت مولانا شروانی کو بھیجی اور خواہش کی کہ علی گڑھ کالج کے

پرنسپل مسٹر ماریسن کو اس کا انگریزی ترجمہ پیش کیا جانا چاہیے تھا۔ چوں کہ سرسری لکھا تھا لہذا اس کا شائع کرنا مناسب نہ تھا۔ لیکن ممبروں کے علم میں اصل حقیقت کا لانا ضروری تھا۔ مولانا شروانی کو اختیار دیا کہ قابل اشاعت حصے کو خود ہی انتخاب کر کے رپورٹ میں شامل کر دیتے۔ انوری کا دیوان آگیا تھا، مگر ویسا نہ تھا جیسا کہ امید کر رہے تھے (۳۱)۔

مولانا شروانی نے ایک اور غزل بھیجی تو لکھا کہ بڑی مرصع غزل تھی اور یہ مصرع تو بہت خوب تھا۔

اگر بر افگند از رخ نقاب را چہ کنم

مگر بر وقت ملاقات داد دینے کا لطف اور تھا۔

ندوہ کے جلسے کے لیے شروانی صاحب کو مدراس بلا رہے تھے اور چاہتے تھے کہ حیدر آباد بھی جاتے اگرچہ نہ اب وہاں سید علی بلگرامی تھے اور نہ سید حسن اور عزیز مرزا ان دنوں باہر تھے پھر بھی؛

خزان کشمیر ہم بہاری دارد

والی بات اب بھی تھی۔

مولانا قرض سے اتنا پریشان تھے کہ اپنا ذاتی کتب خانہ فروخت کرنے کا ارادہ کر رہے تھے، جس میں اگرچہ کتابیں تو زیادہ نہ تھیں لیکن اکثر نایاب، مطبوعات یورپ اور نایاب قلمی کتابیں تھیں۔ تیس ہزار کے قرض سے چوبیس ہزار ادا کر دیے تھے مگر چھ ہزار پھر بھی باقی تھا۔ لہذا تین ہزار کتب خانہ کی فروخت سے ادا کرنے کا خیال تھا، اور بقیہ تین ہزار کا کچھ اور انتظام کرنا تھا اگر حیدر آباد کی ملازمت مستقل ہو جاتی اور مزید قیام کرتے تو امید تھی کہ ادا کر لیتے، مگر وہاں قیام ممکن نہیں رہا تھا۔ اور ملازمت سے علاحدگی کا ہر وقت خطرہ تھا۔ اس قرضے ہی کی وجہ سے مولانا ناگوار حالات میں بھی حیدر آباد میں قیام پذیر تھے۔ ورنہ ان کو ملازمت کی اتنی پروانہ تھی (۳۳)۔

حواشی:

۱۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۳۵-۱۳۳، ۱۹-جنوری ۱۹۰۲ء۔

۲۔۔۔ سیاست نامہ موسیو تیورنر مطبوعہ آگرہ-۱۸۹۶ء۔ سیاحت نامہ موسیو تھیونو مطبوعہ آگرہ ۱۸۹۷ء۔ تاریخ دکن جلد اول ۱۸۹۷ء۔ تاریخ دکن جلد دوم مطبوعہ آگرہ ۱۹۰۰ء۔ مصنف مولوی عبدالغفور (حیات شبلی چودھا شیہ صفحہ ۲۹۳)۔

۳ ـــ مولانا نے بعد کو وہ کتاب خریدلی اور ندوہ کے کتب خانہ کو دے دی تھی - اس کتاب کا ایک نسخہ آصفیہ لائبریری حیدر آباد دکن میں بھی ہے -

۴ ـــ مکاتیب اول، صفحہ ۳۵ - ۱۳۴، ۲۲ - جنوری ۱۹۰۲ء

۵ ـــ مکاتیب اول، صفحہ ۳۸ - ۱۳۷، ۱۴ - فروری ۱۹۰۲ء

۶ ـــ مکاتیب دوم، صفحہ ۱۰ - ۱۱، ۲۰ - فروری ۱۹۰۲ء

۷ ـــ مکاتیب اول، صفحہ ۳۰ - ۱۳۸، ۱۴ - مارچ ۱۹۰۰ء

۸ ـــ مکاتیب اول، صفحہ ۳۳۵، ۲۸ - مارچ ۱۹۰۰ء

۹ ـــ خصوصی رجسٹر دفتر ندوۃ العلماء، گوئن روڈ، لکھنو

۱۰ ـــ مکاتیب اول، صفحہ ۴۱ - ۱۴۰، ۱۸ - اپریل ۱۹۰۲ء

۱۱ ـــ مکاتیب اول، صفحہ ۳۹ - ۱۳۸، ۲۱ - اپریل ۱۹۰۲ء

۱۱ ـــ مکاتیب دوم، صفحہ ۷۱ - ۷۰، ۲۱ - اپریل ۱۹۰۲ء

۱۲ ـــ مولوی بشیر الدین صاحب - اڈیٹر البشیر اٹاوہ -

۱۳ ـــ مکاتیب اول صفحہ ۴۲ - ۱۴۱، ۲۵ - اپریل ۱۹۰۲ء

۱۴ ـــ مکاتیب اول، صفحہ ۱۰۹، ۲۸ - اپریل ۱۹۰۲ء

۱۵ ـــ مکاتیب اول، صفحہ ۴۰، ۲۹ - جون ۱۹۰۲ء

۱۶ ـــ مکاتیب اول، صفحہ ۱۴۲، ۲۴ - اگست ۱۹۰۲ء

۱۷ ـــ مکاتیب اول، صفحہ ۴۳ - ۱۴۲، ۲۴ - اگست ۱۹۰۲ء

۱۸ ـــ مکاتیب اول، صفحہ ۱۴۴، ۵ - ستمبر ۱۹۰۲ء

۱۹ ـــ مکاتیب اول، صفحہ ۳۵ - ۱۳۴، ۶ - ستمبر ۱۹۰۲ء

۲۰ ـــ مسٹر بیک ۱۸۹۹ء میں راہی ملک بقا ہوئے تھے - حالی کا ذہنی ارتقا، صفحہ ۱۸۹

۲۱ ـــ "مگر کثرت رائے اور گورنمنٹ کے ایماء سے ۳۱ - جنوری ۱۸۹۹ء کے اجلاس ٹرسٹیان میں جس میں پنجاب کے ممتاز اصحاب بہ کثرت شریک تھے نواب محسن الملک ۵۱ ٹرسٹیوں کی رائے سے سیکریٹری منتخب ہوئے اور سید محمود لائف پریسیڈنٹ کیے گئے -" (حیات محسن از امین زبیری، صفحہ ۷۸، مسلم یونی ورسٹی پریس، علی گڑھ ۱۹۳۴ء) آگے چل کر صفحہ ۸۰ پر ہے - "بہرحال سید محمود پریسیڈنٹ سے وزیٹر بنائے گئے اور اس طرح ملاّان کی مداخلت کا خاتمہ ہوگیا -

۲۲ ـــ مکاتیب اول، صفحہ ۴۴ - ۳۵، ۶ - ستمبر ۱۹۰۲ء

۲۳ ـــ مکاتیب اول، صفحہ ۱۳۶، ۱۸ - ستمبر ۱۹۰۲ء

۲۴ ـــ روداد اجلاس نہم ندوۃ العلماء، منعقدہ ۶ تا ۸ رجب ۱۳۲۰ھ مطابق ۹ تا ۱۱ - اکتوبر ۱۹۰۲ء، بمقام امرتسر، محمود المطابع - کانپور، صفحہ ۳۷

۲۵.... روداد صفحہ ۳۸- دیوان شبلی مطبع نامی - کانپور، صفحہ ۵۷

۲۶.... دیوان شبلی، صفحہ ۶۳

۲۷.... روداد اجلاس نہم، صفحہ ۱۰۲

۲۸.... روداد اجلاس نہم، صفحہ ۱۰۸

۲۹.... روداد اجلاس نہم، صفحہ ۱۵۲

۳۰.... مکاتیب اول صفحہ ۴۷-۱۳۶، ۸- نومبر ۱۹۰۲ء

۳۱.... مکاتیب اول، صفحہ ۳۸-۱۴۷، ۱۳- نومبر ۱۹۰۲ء

۳۲.... مکاتیب اول، صفحہ ۳۹-۱۴۸، ۱۹- ستمبر ۱۹۰۲ء

۱۹۰۳ء

مولانا فراہی کو مولانا کے تبیہی خطوط سے کچھ جنبش ہوئی اور تحریک ہوئی کہ اپنی اہلیت و قابلیت کو علمی کاموں میں لگائیں۔ چناں چہ مولانا سے اشعار جاہلیت عرب کے متعلق کچھ دریافت کیا۔ مولانا ان کے اس علمی سوال سے باغ باغ ہو گئے اور لکھا کہ وہ ان سے اسی قسم کے خطوط کے خواہاں تھے۔ لہٰذا بڑی خوشی سے جواب لکھنے بیٹھ گئے اشعار جاہلیت کے متعلق لکھا کہ مدت سے ان کی نظر میں تھے (یہ مولانا فیض الحسن کا فیض تھا جس کے متعلق پہلے ذکر آچکا ہے) لیکن ان پر مولانا نے توجہ نہ کی تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اشعار ایسے ماخذوں سے جمع کیے گئے تھے مثلاً اغانی وغیرہ جن میں ضعاف اور موضوعات تک تھے۔ اب یہ ناقد پر تھا کہ وہ خود صحیح اور موضوع کی تمیز کرتا۔

مولانا فراہی نے نظام القرآن بھیجنے کی اطلاع دی تھی اس سے بھی خوش ہوئے اور لکھا کہ وہ اس کا بڑے شوق سے خیر مقدم کرتے اور یہ بھی لکھا کہ ابو مسلم (۱) ہی ایک شخص تھا جو دل و دماغ رکھتا تھا۔ اس کی لکھی ہوئی قرآن مجید کی تفسیر (۲) بارہ جلدوں میں تھی اور امام رازیؒ کی تفسیر کبیر سے مقدم تھی اس کا نام کبیر تھا، لیکن بعد کو امام رازیؒ کی تفسیر، تفسیر کبیر کے نام سے مشہور ہوئی۔ مولانا نے اپنی تصنیف علم الکلام میں بھی اس کا مختصر تذکرہ کیا تھا جو اس وقت تک شائع نہیں ہوئی تھی۔ ابو مسلم کا پورا نام محمد بن علی بن مہریزد تھا اور اس نے ۴۵۷ھ میں وفات پائی وہ بہت بڑا ادیب اور معقولی تھا۔

ابن خلکان نے رجال پر مختصر لکھا تھا۔ دوسرے لوگوں نے بھی مختصر لکھا تھا۔ سوائے طبقات الشافعیہ ابن السبکی کے جس میں کسی قدر مفصل تراجم تھے۔ لیکن وہ بھی ۱۹۰۳ء تک چھپی (۳) نہیں تھی۔ حیدر آباد میں اس کا ایک نسخہ موجود تھا۔ ابن ابی اصیبعہ کی طبقات الاطباء مولانا کو غنیمت معلوم ہوئی۔

مسٹر آرنلڈ کی فرمائش کا ذکر اس سے قبل گزر چکا ہے۔ اس کے متعلق مولانا نے دریافت کیا کہ اس فرمائش کے متعلق مولانا فراہی نے کام شروع کیا یا نہیں۔ نیشنل اسکول سے متعلق حیدر آباد سے برابر بد اتیں بھیجتے رہتے تھے، لہٰذا مولانا فراہی کو اطلاع دی کہ اس کے متعلق بھی اعظم گڑھ

لکھ رہے ہیں۔

مولانا علم الکلام کو ناتمام کتاب سمجھتے تھے اور تصنیفات میں ناقص خیال کرتے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے لکھنے کے وقت وہ سخت بیمار تھے بلکہ اس بیماری کی وجہ سے زندگی سے بھی مایوسی تھی۔ کرسی پر بیٹھ نہیں سکتے تھے۔ فرش پر لیٹ کر لکھتے تھے۔ علم الکلام کو ناتمام اس وجہ سے سمجھتے تھے کہ متکلمین اسلام کے جو مختلف اسکول تھے، اشعری، ماتریدی، معتزلی، ظاہری ان میں سے علم الکلام میں صرف اشعری کلام کی تاریخ ہی لکھی تھی۔ دوسرے مکتبہ خیال کو پیش نہ کرسکے تھے۔ اس لیے کہ جس تفصیل سے یہ باب مستقل لکھا تھا اسی تفصیل سے دوسرے فرقوں کے علم کلام کی تاریخ بھی لکھنا چاہتے تھے، مگر نہ لکھ سکے۔ لیکن اس کا احساس رہا جب ہی اس کو ناقص سمجھتے تھے۔ جدید علم کلام پر بھی لکھنا شروع کر دیا تھا اور اس کے متعلق پر امید تھے کہ غالباً وہ اس سے بہتر لکھتے۔

مولانا کا جلد ہی ابن رشد کی سوانح لکھنے کا خیال تھا جو بعد کو الندوہ میں قسط وار شائع ہوئی ابن رشد جیسے متکلم پر لکھنے کا خیال علم الکلام کی تیاری کے زمانے میں پیدا ہونے کا مطلب علم کلام کا تاثر اور متکلمین کو پیش کرنا تھا۔ آج کل مولانا علم کلام کے کوچے میں تھے اور متکلمین مولانا کے ذہن میں چکر لگا رہے تھے (۴)۔

مولانا فراہی نے قرآن مجید کی تفسیر لکھنا شروع کی تھی، جس کا نام نظام القرآن رکھا تھا، جس میں قرآن مجید کی آیات اور سورتوں میں ربط معنوی کی تحقیق تھی۔ پورے قرآن مجید اور اس کی ایک ایک سورت کا موضوع الگ الگ قرار دیا تھا اور اس کو سورت کی ہر آیت سے تطبیق دی تھی۔ معترضین کو قرآن مجید میں جو بے ربطی معلوم ہوئی تھی اس سے ان کے شکوک کا اندازہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ مولانا نے اس کو شوق سے پڑھنے کا اظہار کیا، مگر اس کے نام بدلنے کے لیے لکھا اور اس کا نام نظم القرآن پسند کیا اور یہ بھی لکھا کہ مولانا فراہی سے قبل اسی موضوع پر جاحظ اور عبدالقاہر نے بھی کتابیں لکھی تھیں۔

اسی زمانے میں حامد نعمانی اپنی ملازمت کے انتخاب کے لیے الہ آباد گئے، لیکن پچھلے سال کے امیدواروں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ وہ پیش نہ ہو سکے۔

علی گڑھ کالج میں عربی کا اجراء اب تک نہیں ہوا تھا۔ مولانا نصاب بنا چکے تھے اور ان کو اس کے اجرا کی جلدی تھی، مگر بعض دشواریوں کی وجہ سے نواب محسن الملک اس کو جاری نہ کر

سکے تھے۔ مولانا نے محسن الملک کے خلاف ایک مضمون لکھایا، ممکن ہے وہ ایک یادداشت ہو مگر اس کو ایک حیدر آبادی نے دکن ریویو میں شائع کرا دیا، جس پر محسن الملک نے ایک گمنام خط شائع کرایا۔ اندازہ ایسا ہے کہ وہ مولانا کے خلاف تھا اس پر مولانا نے مولانا فراہی کو لکھا کہ محسن الملک نے گمنام خط شائع کرنے میں غلطی کی، ان کو براہ راست مولانا سے غلط فہمی دور کرنا تھی جو کچھ مولانا کی طرف سے ہو وہ ایک مفسد کی شرارت تھی۔

اسی زمانے میں مصر میں رفیق بک العظم ایک مشہور مصری مورخ نے اشہر مشاہیر الاسلام کا سلسلہ مولانا کے ہیروز آف اسلام کے طرز پر لکھنا شروع کیا تھا۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی حضرت عمرؓ کی سیرت بھی تھی جو سیرۃ الفاروق کے نام سے شائع ہوئی تھی مگر وہ الفاروق سے لگا نہیں کھاتی تھی۔ اس لیے مولانا کو خیال ہوا کہ الفاروق کا ترجمہ عربی میں کرا لیا جاتا تو بہتر تھا۔ مولانا کو فرصت نہ تھی اس لیے ایک شخص کو ترجمہ کے لیے دی اور تیاری کے بعد اس کو خود درست کرنے کا ارادہ تھا اور یہ بھی ارادہ تھا کہ اس کو مصر ہی میں شائع کراتے۔ اسی زمانے میں انجمن ترقی اردو کے کام کو بڑے جوش و خروش سے کرنے کا ارادہ کر رہے تھے (۵)۔

مہدی حسن کو انجمن ترقی اردو کا دستور العمل بھیجا اور چاہا کہ وہ لوگوں کو اردو کے ہمدرد بنائیں (۶)۔ اب مولانا نے مولانا فراہی کے نظام القرآن کے مسودے کو پڑھ لیا تھا۔ عبارت اور طرز بیان کی خوبی کو پسند کیا تھا لیکن ابھی پورے طور پر رائے دینے سے قاصر تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ مولانا فراہی نے جو ربط بتایا تھا وہ وسیع معنوں کے لحاظ سے تھا۔ لیکن دشواری یہ تھی کہ دفعہ وار جو مطالب بیان کیے گئے تھے اور ان میں ربط ثابت کیا گیا تھا اس کے ساتھ قرآن مجید کی آیتیں نقل نہیں کی گئی تھیں اس لیے قرآن مجید کو بار بار دیکھنا پڑتا تھا۔

ایک اور مشکل یہ تھی کہ انھوں نے مربوط چیزوں کو لے لیا تھا، حالاں کہ دو مربوط مطالب کے بیچ میں جو غیر متعلق باتیں آگئی تھیں وہ سلسلہ کلام کو غیر منظم کر دیتی تھیں۔ لہٰذا ان کا بھی تعلق اور ربط ثابت کرنے کی ضرورت تھی۔ بہر حال مولانا اپنی رائے کے معاملے میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچے تھے، اس لیے چاہتے تھے کہ مزید اجزاء دیکھ کر اپنی رائے دیتے۔ لیکن پھر بھی اسی نتیجے پر ضرور پہنچے تھے کہ وہ بڑا کام تھا، لہٰذا جس قدر کامیابی ہوتی وہ غنیمت تھی۔ یہ ضرور ہے کہ ان کو کوئی ایسا کام شروع کرنا چاہیے تھا جس میں کامیابی کی زیادہ امید ہوتی۔

مولانا نے انجمن ترقی اردو کا کام بڑی دلچسپی سے شروع کر رکھا تھا اس لیے اعانت کرنے

والوں اور خریداروں کے خواہاں تھے (۷)۔

مولانا نے اسی زمانے میں حضور انور نبی کریم سرور کائنات سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح (۸) لکھنا شروع کی تھی، لہذا سیرت سے متعلق کتابوں کی ضرورت تھی۔ مولانا کا اپنا کتب خانہ وطن میں تھا اس لیے دوسروں کے کتب خانوں سے استفادہ کر رہے تھے۔

مولوی حسین عطاء اللہ کو زرقانی کی رسید شکریے کے ساتھ لکھی۔ اسی دوران میں شرح طوالع اصفہانی کا قدیم، صحیح اور خوشخط مگر قدرے ناقص نسخہ فروخت کے لیے آیا تھا۔ مولانا نے مولوی حسین عطاء اللہ کے لیے اس کو پسند کیا (۹)۔

مولانا فراہی نے نظام القرآن کے اجزا پر ہندسے لگا کر بھیجا اور ہندسوں کی مدد سے پڑھنے اور غور کرنے کو لکھا تو مولانا کو معلوم ہوا کہ اب ربط زیادہ واضح تھا، مگر پھر بھی جن دو آیتوں میں ربط بتلایا گیا تھا ان کے درمیان جو آیتیں آئی تھیں وہ اپنے سابقہ اور لاحقہ آیتوں سے پھر بھی غیر متعلق معلوم ہوتی تھیں۔ مولانا نے خواہش کی کہ المنار (۱۰) میں چند اجزا شائع ہونے کے لیے بھیج دیے جاتے، مگر ہندسوں کی مدد سے سمجھنے میں دشواری ہوتی۔ لہذا ان کو توجہ دلائی کہ حاشیے میں تمام آیتیں نقل کر دی جائیں۔

اردو کے شرکاء کے نام مولانا فراہی کے بھیجے ہوئے گم ہو گئے تھے، لہذا دوبارہ طلب کیے۔ اس زمانے میں انھوں نے شرح بخاری از عینی، کتاب سیبویہ، شرح طوالع خریدیں۔ اب مولانا پر اپنے والد مرحوم کا چھوڑا ہوا قرض صرف ایک ہزار رہ گیا تھا، جسے وہ ہر ماہ ادا کر رہے تھے (۱۱)۔

مولانا نے ربط آیات کے لحاظ سے قرآن مجید کو پڑھنا شروع کیا تاکہ نظام القرآن کے متعلق کوئی رائے قائم کرتے۔ چوں کہ نیشنل اسکول کے تمام ممبر مسلمان تھے، اس لیے مولانا کی خواہش تھی کہ ہیڈ ماسٹر بھی مسلمان مل جائے لیکن اس وقت تک مایوسی ہوئی تھی۔ چوں کہ قرض پورا ادا ہونے کے قریب تھا اس لیے اب وہ حیدر آباد ٹھہرنا نہ چاہتے تھے اور ندوہ یا علی گڑھ کالج کا ارادہ کر رہے تھے۔ وطن میں قیام کا ارادہ نہ تھا کیوں کہ زمینداری کے جھگڑے اور انتظامات مولانا کے بس کا روگ نہ تھا اور قرض کے بارے پہلے ہی گھبرائے ہوئے تھے۔ انجمن ترقی اردو کی کارروائیاں اور اس کی خدمات کو علی گڑھ گزٹ جون ۱۹۰۳ء میں چھپوانے کا ارادہ تھا۔ مولانا کا ارادہ تھا کہ عربی [illegible] کی کتابوں کے ترجمے کرا کے انجمن ترقی اردو سے شائع کراتے، لہذا مولانا فراہی سے عربی کتابوں کے نام دریافت کیے تاکہ ان کے ترجمے کرا کے شائع کراتے۔ اس زمانے میں بخار میں مبتلا

تھے (۱۲)۔

مولانا کو ۲۲۔ جون کو دار العلوم ندوۃ العلماء کے نصاب جاریہ کا نقشہ ملا تو مولانا شروانی کو لکھا کہ نصاب میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی تھی جب کہ تبدیلی طے ہو چکی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ دیوبند جیسی پڑھائی ہو رہی تھی تو پھر دار العلوم ندوۃ العلماء کی کیا ضرورت تھی۔ یہ ضرور ہے کہ نصاب کی بعض کتابوں کے متعلق اختلاف تھا مگر جن کتابوں کے متعلق متفقہ فیصلہ طے پا گیا تھا وہ بھی تو داخل نصاب نہ ہوئی تھیں اور چوں کہ مولانا شروانی نصاب کے ناظم تھے اس لیے ان کی ذمہ داری تھی کہ وہ ان فیصلوں پر عمل کرتے جو طے پا چکے تھے (۱۳)۔

مولانا انجمن ترقی اردو کے کام میں بھی لگے ہوئے تھے اور لوگوں کو ممبر بنانے کے لیے کوشاں تھے اور لوگوں کو ترغیب دلاتے رہتے تھے چناں چہ محمد ریاض حسن خاں (۱۴) نے مولانا کو لکھا کہ ان کو ممبر بنا لیا جائے۔ لہذا مولانا نے ان کا نام ارکان اعانت کی فہرست میں شامل کر لیا اور مستقل خریداروں کی فہرست میں بھی نام درج کر لیا۔ انجمن ترقیء اردو کی جانب سے نامہء دانشوراں کا ترجمہ شائع کرانے کا ارادہ تھا۔ مولوی ریاض حسن خاں نے ترجمہ کرنے کا ارادہ کیا تو ان کو اطلاع دی کہ دو اور صاحب بھی ترجمہ کر رہے تھے، اگرچہ ترجموں کا نمونہ انجمن کے دفتر میں اس وقت تک موصول نہیں ہوا تھا۔ اس کے ترجمے کے سلسلے میں دوسری کتابوں سے بھی مدد لینے کی ضرورت تھی اور اس کا اندازہ مترجم کو ہونا چاہیے تھا۔ یہ کتاب مولانا کے استعمال میں رہی تھی مگر اس وقت موجود نہ تھی اس کتاب کی دوسری جلد بھی شائع ہو چکی تھی (۱۵)۔

مولانا شروانی نے مولانا سے نظامت قبول کرنے کی خواہش کی تو مولانا نے انکار لکھا کہ وہ نظامت کے قابل اپنے کو نہیں سمجھتے، اگر اس قابل ہوتے تو ضرور کسی دوست سے اپنا نام پیش کرا دیتے کیوں کہ موقع ایسا آ گیا تھا کہ ایسے موقع پر خاکساری ایمان داری کے خلاف سمجھتے تھے۔ وہ اعانت بے شک کر سکتے تھے مگر پوری ذمہ داری سنبھالنے کے قابل اپنے کو نہیں پاتے تھے اور اس زمانے کے حالات کے تحت اس میں ندوہ کا نقصان بھی سمجھتے تھے۔ لیکن اتنا ضرور چاہتے تھے کہ ایسا شخص منتخب کیا جاتا کہ جب مولانا ندوے میں رہ کر کام کرنا چاہتے تو وہ روڑے نہ اٹکاتا۔ مولانا کے نزدیک اس وقت کوئی موزوں شخص نہیں نظر آ رہا تھا جو اس بار کو سنبھال سکتا اور دار العلوم میں قدیم و جدید تعلیم کے ڈانڈوں کو ملا دیتا (۱۶)۔

مولانا، مولانا فراہی کو اپنے عزیزوں میں دل سے عزیز رکھتے تھے۔ ایک وجہ ان کی عربی اور

ساتھ ساتھ انگریزی میں قابلیت تھی، ان کی اہلیت کو مولانا اجاگر کرنا چاہتے تھے اور علمی اور ادبی کاموں کے لیے اکساتے رہتے تھے۔ اسی زمانے میں ان کی طبیعت کی خرابی معلوم ہوئی تو بے چین ہو گئے اور ان کو تسلی دیتے ہوئے مشورہ دیا کہ وہ چھٹی لے لیں اور وطن جاکر آرام کریں اور کچھ دن مولانا کے ساتھ حیدر آباد جاکر رہیں۔ ان دنوں انجمن ترقی اردو کے کاموں میں بے حد مصروف تھے جو وقت اس سے بچتا تھا وہ خط و کتابت کے لیے وقف تھا (۱۷)۔

ندوے کا نصاب تبدیل نہ ہونے کی وجہ سے ان کی بے چینی بہت بڑھ گئی تھی نہ صرف نصاب کے ناظم مولانا شروانی کو اس طرف توجہ دلاتے رہتے تھے بلکہ دوسرے ارکان اور ناظم سے انتظامیہ کمیٹی سے پاس شدہ نصاب کو رائج کرنے کے بارے میں خط و کتابت کرتے رہتے تھے۔ اب ان کی بے حسی اور ٹال مٹول اور سستی دیکھ کر مولانا کے خطوط میں تیزی آگئی تھی۔ اسی زمانے میں ایک سخت خط مدرس اعلیٰ دار العلوم ندوۃ العلماء کو لکھا کہ قدیم نصاب کیوں پڑھایا جارہا تھا جب کہ امرتسر کے جلسے میں اس کی تبدیلی طے کی جاچکی تھی۔ انھوں نے جواب میں لکھا کہ نیا نصاب ان کو دکھایا تک نہیں گیا۔ اس پر مولانا شروانی سے دریافت کیا کہ کیا نیا نصاب دار العلوم کو نہیں بھیجا گیا تھا۔ نصاب میں جن کتابوں پر اختلاف رائے تھا ان کو وقتی طور پر نظر انداز کیا جاسکتا تھا، لیکن جو متفق علیہ تھیں ان کو جاری نہ کرنا مولانا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ انھوں نے چاہا کہ فوری طور پر متفق علیہ کتابوں سے دار العلوم کو اطلاع دی جاتی تاکہ وہ پڑھائی جائیں (۱۸)۔

جلسہ، انتظامیہ میں اصولی طور پر یہ طے ہو گیا تھا کہ کسی علم کو مخلوط کر کے نہ پڑھایا جائے۔ ایسی صورت میں بہت سی کتابیں خود بخود خارج ہو جاتی تھیں اگر ان کتابوں کو رائے لے کر ہی خارج کرنا مقصود تھا تو یہ طریقہ اختیار کیا جاتا کہ مخلوط فن کتابوں کو لکھ کر ہر ممبر کو بھیج دیا جاتا اور دریافت کیا جاتا کہ ان کو نصاب میں شامل رکھا جائے یا نہیں اور ممبروں کی رائے سے عمل درآمد کیا جاتا تاکہ کسی کو اعتراض کی گنجائش نہ ہوتی۔ تمہید میں وجہ یہ لکھی جاتی کہ درس کی مدت کم کرنا مقصود تھی۔ ان اصلاحات کے بعد ہی ندوہ، دیوبند سے ممیز ہو سکتا تھا (۱۹)۔

مولانا کی نظر چھوٹے چھوٹے تاریخی واقعات پر بہت گہری تھی، اس لیے ان کی نگاہ تاریخی واقعے کی غلطی پر فوراً پڑتی تھی۔ نامہ، دانشوران والوں نے سلطان محمود کے مذہبی تعصب کی بنا پر ابن سینا کی گرفتاری کا ذکر کیا تو مولانا نے سختی سے اس کی تردید کی اور نوٹ میں اس کی تردید

شائع کرنے پر زور دیا (۲۰)۔

ندوے کی حالت کو مولانا نے مسلمانوں کے سود کے لین دین سے تشبیہ دیتے ہوئے لکھا کہ سود لینا اور دینا دونوں حرام ہے، مگر سود لینے میں چوں کہ فائدہ اور دینے میں نقصان ہے اس لیے دیتے ہیں اور لیتے نہیں۔ یہی حالت ندوے کی تھی کہ جس نصاب سے نقصان پہنچ رہا تھا وہ جاری تھا اور جس میں فائدہ تھا اس کے اجرا میں پس و پیش تھا اور یہ محض مولانا شروانی کی وجہ سے تھا کیوں کہ وہ نصاب کے ناظم تھے۔ ندوے میں بہت سی باتیں بے ضابطہ ہوتی رہتی تھیں، مگر نصاب کے معاملے میں ضابطے کی بڑی پابندی تھی۔ یعنی جب تک سب کا اتفاق نہ ہو نیا نصاب جاری نہ کیا جائے۔ اس طرح سرسید نے بھی کالج کا کام نہیں چلایا تھا۔ جب اصولی طور پر نصاب میں تبدیلی امرتسر کے اجلاس میں طے ہو گئی تھی تو لیت و لعل کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ مدرسین کو جب لکھا جاتا تھا تو وہ معتمد نصاب کی آڑ لیتے تھے۔ لہٰذا کتاب پر سب کے اتفاق ہو جانے کا انتظار نہ کرنا چاہیے تھا ورنہ اس طرح کبھی بھی نیا نصاب نہیں جاری ہو سکتا تھا (۲۱)۔

اسی زمانے میں مولانا شروانی نے غزل گوئی کی تاریخ لکھنا شروع کی تو مولانا نے مسرت کا اظہار کیا لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ندوے کے نصاب جاریہ کا ذکر تھا جس سے مولانا چڑھ گئے اور اس کو ناپاک اور نجس کورس قرار دیا۔ مولانا نے اپنے جواب میں ہر درجے کے کورس سے مختلف کتابوں کو خارج کرنے کو لکھا اور یہ بھی لکھا کہ پھر مشورے کے بکھیڑ میں نہ پڑیں ورنہ پھر معاملہ ٹل جائے گا۔ اسی طرح وہ اس بات سے بھی گھبرا رہے تھے کہ ندوے کے بارے میں جو وعدے ہیں ان کو پورا نہ کر کے اللہ تعالیٰ کے ہاں جواب دینا ہو گا (۲۲)۔

اسی سال بھاول پور میں جشن منایا جا رہا تھا۔ اس موقع پر ندوے کی طرف سے نواب صاحب کے لیے ایک دعا نامہ تیار کیا گیا کہ جشن کے موقع پر علما کا وفد اس کو پیش کرتا۔ مولانا نصاب وغیرہ کے تبدیل نہ ہونے سے جھلائے ہوئے تو تھے ہی، اس کو پسند نہ کیا کہ مانگنے والوں کا طریقہ اختیار کیا جاتا اور سید عبدالحی صاحب کو یہاں تک لکھ دیا کہ "علما کی شرکت اسی قسم کے خیلات پیدا کرتی ہے" کیا علی گڑھ کالج بھی ایسی بدہمتی کر سکتا ہے (۲۳)۔

اب مولانا میر و انیس کے کلام پر مفصل ریویو (موازنہ انیس و دبیر) لکھ چکے تھے اور علم الکلام پر کتاب زیر طبع تھی۔ انجمن ترقی اردو کی تیار کردہ کتابیں بھی زیر طبع تھیں۔ انجمن کے قواعد میں بھی ترمیم کر دی گئی تھی، وہ یہ کہ مستقل خریداروں کو ارکان اعانت کی حیثیت دے دی

گئی تھی۔ لہٰذا مولوی سمیع کو لکھا کہ وہ اپنے بنائے ہوئے خریداروں کو اس کی اطلاع کر دیں (۲۴)۔

حواشی:

۱۔۔۔ اس کی تفسیر اب نایاب ہے۔ امام رازیؒ کی تفسیر میں اس کے بعض فقرے منقول ہیں۔ مکاتیب دوم بر حاشیہ، صفحہ ۱۲

۲۔۔۔ بعد کو مصر میں شائع ہوئی۔

۳۔۔۔ یہ مصنف چھٹی صدی ہجری میں گزرا تھا اس نے تراجم کے ضمن میں مسلمانوں کی علمی تاریخ کے متعلق بہت سی کام کی باتیں لکھی تھیں اور مولانا نے اپنے رسائل میں اس سے استفادہ کیا تھا۔

۴۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۱۱-۱۲، ۹- مارچ ۱۹۰۳۔

۵۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۱۳-۱۴، ۱۱-اپریل ۱۹۰۳۔

۶۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۱۹۹، ۵- مئی ۱۹۰۳۔

۷۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۱۴۰، ۱۱- مئی ۱۹۰۳۔

۸۔۔۔ صرف ہجرت تک لکھ کر چھوڑ دیا تھا۔ اس لیے نامکمل رہی ناتمام مسودہ دار المصنفین میں موجود ہے۔

۹۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۴۷-۳۴۶، ۲۷- مئی ۱۹۰۳۔

۱۰۔۔۔ مصر کا مشہور اخبار جو علامہ رشید رضا کی ادارت میں نکل رہا تھا۔

۱۱۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۱۴-۱۵، یکم -جون ۱۹۰۳۔

۱۲۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۱۵-۱۶، ۱۷-جون ۱۹۰۳۔

۱۳۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۱۴۹، ۲۲-جون ۱۹۰۳۔

۱۴۔۔۔ مولوی محمد ریاض حسن خاں خیال رئیس رسول پور ضلع مظفر پور (بہار)

۱۵۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۸۲-۱۸۱، ۲۲-جون ۱۹۰۳۔

۱۶۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۵۰-۱۴۹، ۹-جولائی ۱۹۰۳۔

۱۷۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۱۶، ۱۳-جولائی ۱۹۰۳۔

۱۸۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۱۵۰، جولائی ۱۹۰۳۔

۱۹۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۱۵۱، ۱۹۰۳۔

۲۰۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۱۸۲، ۲۷-اگست ۱۹۰۳۔

۲۱۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۱۵۲، ۱۳- ستمبر ۱۹۰۳۔

۲۲۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۵۳-۱۵۲، ۱۳-اکتوبر ۱۹۰۳۔

۲۳۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۳۱۰، ۲۵-اکتوبر ۱۹۰۳۔

۲۴ــ مکاتیب اول، صفحہ ۱۰۶، ۷۔ نومبر ۱۹۰۳ء

۱۹۰۴ء

مولانا پہلے ہفتہ، جنوری میں مدراس تشریف لے گئے تاکہ ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسے میں شرکت فرمائیں۔ مشاہیر میں سے مندرجہ ذیل حضرات تشریف لائے تھے۔ جناب مولانا ابو محمد عبدالحق صاحب دہلوی، جناب مولانا شاہ محمد سلیمان صاحب چشتی قادری، جناب مولانا شاہ ابوالخیر صاحب فصیحی غازی پوری، جناب مولانا خلیل الرحمن صاحب سہارن پوری، جناب شمس العلماء مولانا محمد شبلی نعمانی(۱)۔

روز چہار شنبہ ۱۷۔ شوال ۱۳۲۱ھ مطابق ۶۔ جنوری ۱۹۰۴ء کو ۹ بجے سے ۲ بجے تک تینام پیٹھ اسپرنگس گارڈن مدراس میں ایک جلسہ ہوا۔ خان بہادر مولوی غلام محمود صاحب نیجر سرجن جنرل آفس مدراس کی تحریک اور جناب احمد محی الدین خان بہادر رئیس مدراس کی تائید سے شمس العلماء مولوی محمد شبلی صاحب نعمانی ناظم سررشتہ علوم وفنون حیدر آباد (دکن) صدر نشین منتخب ہوئے(۲)۔

اس جلسے کے متعلق روداد میں اس طرح ہے:

"اس تقریر (تقریر شیخ عبدالقادر صاحب بی۔ اے، ایڈیٹر آبزرور۔ لاہور، "ہمارا دارالعلوم اور عالم خیال") کے ختم ہونے پر پہلے سے کچھ زیادہ شوق اور بے چینی کے آثار جلسے میں پیدا ہو گئے۔ ہر شخص کے ہاتھ میں جلسے کا نظام (نامہ) تھا اور صدر نشین کی طرف نگاہیں تھیں، کیوں کہ یہ وقت آج کے جلسے کے صدر نشین مولانا شبلی نعمانی کی تقریر کا تھا اور آپ دارالعلوم کی ضرورت پر بیان فرمانے والے تھے۔ مولانا ممدوح کھڑے ہوئے، ہاتھ میں ایک کاغذ تھا، جس میں چند عنوانات لکھے ہوئے تھے۔ حسب عادت مولانا ممدوح نے یہ تقریر پہلے سے قلم بند نہیں فرمائی تھی اور بعد جلسے کے بھی قلم بند نہیں فرما سکے اور ان کو یہ پسند نہیں ہے کہ دوران تقریر میں جو حصہ اس کا قید تحریر میں لایا گیا ہو شائع کیا جائے(۳)۔"

"مولانا شبلی صاحب نعمانی نے یہ تحریک بھی پیش کی کہ دارالعلوم میں ایک کمرہ صرف علما کے چندے سے تعمیر کیا جائے۔ آپ نے اس کو پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ لوگوں کی یہ بدگمانی ہے کہ علما دوسروں سے لینے کے عادی ہیں، خود دینا نہیں جانتے۔ ملا عبدالقیوم صاحب نے اس

تجویز کی تائید کی اور سب نے اس سے اتفاق ظاہر کیا اور اسی وقت مندرجہ ذیل بزرگوں نے چندہ دینے کا وعدہ کیا۔ فہرست چندہ موعودہ برائے کرہ تفسیر دارالعلوم۔ نمبر شمار ــ ۲۔ اسم گرامی جناب مولوی شبلی صاحب نعمانی۔ چندہ مار (ایک سو روپے) (۴)۔"

اسی جلسہ۔ انتظامیہ میں" مولانا سید محمد علی صاحب نے عہدہ۔ نظامت سے استعفا دیا جو منظور ہوا اور مولانا محمد مسیح الزماں صاحب استاد حضور نظام دکن کو تین سال کے لیے نظامت کے عہدے پر مقرر کیا گیا (۵)۔

جلسہ۔ انتظامیہ مدراس سے مولانا فارغ ہو کر حیدر آباد واپس آگئے۔ دوسرے ہفتے جنوری میں مولانا حیدر آباد میں تھے، کیوں کہ مکاتیب میں ۱۲۔ جنوری کی تاریخ میں حیدر آباد سے دو خط ملتے ہیں۔

مولانا نے اسی زمانے میں مولوی شہباز کی نامکمل سوانح عمری دیکھی تو خواہش ہوئی کہ وہ مکمل کرلی جاتی۔ مگر اس پر مزید مواد دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے مجبور رہے۔ انجمن ترقی اردو کی طرف سے مختلف فنون کی کتابوں کے ترجمے آرہے تھے۔ کیمسٹری (علم کیمیا) کی کتاب اصطلاحات کا ترجمہ نہیں کرایا گیا تھا، بلکہ اصلی الفاظ چھپوائے گئے تھے اور ارادہ تھا کہ مختلف مترجمین کے پاس الگ الگ جلدیں بھیجی جائیں اور وہ اس پر رائے دیتے (۶)۔

مدراس کے جلسے سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مولانا کو ندوہ والوں سے علاحدگی میں گفتگو کا موقع ملا اور انھوں نے اپنا نقطہ۔ نظر پیش کیا اور ان کی باتیں سن کر غلط فہمیاں دور ہوئیں۔ مولانا ندوہ سے علاحدہ ہونے پر بھی تیار ہوگئے تھے اور اس کے جواب میں مولوی مسیح الزماں نے فرمایا اور حکیم سید عبدالحی صاحب (گل رعناوالے) نے تائید کی کہ جب تک دارالعلوم لکھنو میں منشی اطہر علی صاحب کے زیر اثر رہے گا دیگر حضرات کچھ نہ کر سکیں گے۔ لہذا دارالعلوم انھیں کے ذمہ رکھا گیا اور اشاعت اسلام کا کام شاہجہاں پور سے جاری رکھا گیا۔ ان حضرات نے یہ بھی فرمایا کہ مولوی حبیب الرحمن شروانی سے بار بار نصاب مانگا گیا مگر انھوں نے اس کا مسودہ نہ بھیجا، لہذا مولانا نے چاہا کہ جب شروانی صاحب اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے یا اور کسی وجہ سے کام نہیں کر سکتے تھے تو استعفیٰ دینا بہت بہتر تھا۔ چوں کہ مولانا "کتاب الآلات" کے چھپوانے کا بندوبست نہیں کر سکے تھے، اس وجہ سے مجبوراً مولانا شروانی کو واپس بھیج دی۔ الندوہ کے اجرا کے سلسلے میں مولوی مسیح الزماں درخواست دینے میں اب بھی تذبذب میں مبتلا تھے (۷)۔

مولانا حیدر آباد کے سازشی ماحول سے پھر بہت پریشان تھے۔ مولانا فراہی نے کسی بادشاہ کے متعلق دریافت کیا تو مولانا نے بلاذری کے حوالے سے لکھا کہ عسیفان، کشمیر اور ملتان کے درمیان کوئی جگہ تھی اور یہ بھی کہ اس شہر کا بادشاہ معتصم باللہ کے زمانے میں اپنی خواہش سے مسلمان ہوا تھا۔ مگر عربی کے کسی جغرافیہ میں عسیفان کا نام نہیں ملا۔ اس لیے قیاس سے یہ اندازہ کیا کہ عسیفان، یوسف زئی کا محرف تھا۔

مولانا فراہی کو سندھ مدرسۃ الاسلام، کراچی کے لیے مسلمان انگریزی اردو داں کی ضرورت ہوئی۔ سو روپے تنخواہ تھی۔ مولانا نے لکھا کہ سو روپیوں پر وہاں سے اتنی دور آنے پر کوئی تیار نہ تھا۔ اگر حامد نعمانی معیار پر پورے ہوں تو ان کو بندول کے پتے پر خط لکھ کر بلایا جاسکتا تھا اور وہ شاید قبول بھی کر لیتے کیوں کہ ان کو سیر و سیاحت سے بڑی دل چسپی تھی۔

انھوں نے امیر خسرو کے قصیدے کے متعلق بھی دریافت کیا تھا تو اس کے جواب میں مولانا نے لکھا کہ وہ قصیدہ نہ "ضرب الامثال" کے نام سے مشہور تھا اور نہ کہیں چھپا تھا، البتہ ان کے قلمی دیوان میں دیکھا تھا۔ اس کا مطلع یہ تھا:

کوس شہ خالی و بانگ غلغلش درد سراست

انھی زمانے میں مسٹر براؤن نے کوئی تجویز پیش کی تھی۔ اس تجویز پر مسٹر ماریسن (پرنسپل علی گڑھ کالج) سے مولانا کی خط و کتابت ہو رہی تھی مگر ابھی تک کوئی بات واضح نہیں ہوئی تھی (۸)۔

مولانا کو اطلاع ملی کہ پروفیسر آرنلڈ ملازمت سے سبکدوش ہو کر ولایت جا رہے تھے۔ ان کو کالج کی طرف سے سپاسنامہ پیش کرنے کی تجویز تھی اور مولانا سے فرمائش کی گئی تھی کہ فارسی میں وہ لکھ دیں، لیکن مولانا کا خیال تھا کہ وہ فارسی اچھی نہیں لکھتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے مولانا فراہی سے خواہش کی کہ وہ لکھ کر پروفیسر ابوالحسن علی گڑھ کالج کو بھیج دیں اور عربی میں خود مولانا کا لکھنے کا ارادہ تھا (۹)۔

مولانا کو اس زمانے میں روپیوں کی ضرورت تھی، کیوں کہ پروفیسر آرنلڈ کو ۵۰ کا تحفہ دینا چاہتے تھے اور ۲۵ ایڈریس کا چندہ دینا تھا اور پچاس ساٹھ روپے بمبئی کا خرچ۔ مولانا فراہی کے ۰ ے روپے تھے وہ انھوں نے بھیجے تو مولانا کی ضرورت پر کام آئے۔ ویسے ان کا تقاضہ کرنے کا ارادہ نہ تھا اس لیے کہ مولانا فراہی اس زمانے میں خود بھی زیر بار تھے۔ کسی زمانے میں مولانا

فراہی نے مثنوی مولانا روم بڑے غور و فکر سے پڑھی تھی اور کچھ اصول متعین کیے تھے۔ اس لیے مولانا نے ان کو لکھا کہ اگر وہ ذہن میں ہوں تو بھیج دیں، کیوں کہ اس زمانے میں وہ سوانح مولانا روم لکھ رہے تھے (۱۰)۔

مولانا نے مہدی حسن کو انجمن ترقی اردو کے متعلق کئی خطوط لکھے مگر جواب نہ آیا، جس سے فکر مند تھے۔ آخر پتا چلا کہ ان کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ جس سے وہ بہت پریشان تھے اور جواب نہ دے سکے تھے۔ لہٰذا مولانا نے تعزیت کا خط لکھا۔ اب تک انجمن ترقی اردو نے صرف ایک کتاب گوتم بدھا اور سری کرشن کی سوانح اور فلسفہ پر شائع کی تھی، جس کی اطلاع مہدی حسن کو دی۔

انیس و دبیر پر کتاب تیار کر چکے تھے، مگر سازشی الجھنوں کی وجہ سے اب تک مطبع نہ بھیج سکے تھے، لیکن جلد ہی چھپوانے کا ارادہ تھا۔ فارسی شاعری پر مولانا کا عرصے سے لکھنے کا خیال تھا مگر اب تک نوبت نہ آئی تھی اور ارادہ تھا کہ وہ ایک برس کے بعد اس پر کام کرتے۔ ویسے ایک شاگرد مولانا کی ہدایت پر ایک بسوط تذکرہ مرتب کر رہے تھے۔ اسی زمانے میں پروفیسر براؤن کی پرشین لٹریچر چھپ گئی تھی اور مولانا نے اس پہلے حصے کو اپنی مرضی اور خیال کے مطابق نہ پایا، لیکن دوسرے حصے کے متعلق بہتر لکھے جانے کی امید کر رہے تھے کیوں کہ براؤن کی فارسی مہارت کو تسلیم کرتے تھے۔ یورپ نے رباعیات خیام کی بڑی قدر کی تھی اور اس کے ترجمے اور اس پر کئی کتابیں شائع کی تھیں۔ مولانا کا خیال تھا کہ اگر یورپ کو سحابی استرآبادی کی دس ہزار فلسفیانہ رباعیات کا علم ہوتا تو بڑی قدر کے ساتھ شائع کی جاتیں۔ مولانا کے پاس بھی اس کی کئی سو رباعیات موجود تھی۔

مولانا کا یہ بھی ارادہ تھا کہ وہ اردو اشعار کا علمی حیثیت سے ایک مجموعہ تیار کرتے۔ اس پر کچھ کام کر بھی چکے تھے۔ لہٰذا مہدی حسن سے بھی اس ضمن میں مشورہ طلب کیا۔ مثنوی مولانا روم پر اس زمانے میں تقریظ لکھ رہے تھے۔ چوں کہ حیدر آباد کی الجھنوں سے بہت پریشان تھے اور ندوے میں دال گلتی نظر نہیں آ رہی تھی، اس لیے علی گڑھ کالج کے تعلق پر کچھ آمادہ ہو رہے تھے۔ اسی زمانے میں مولانا کے یہاں بچے کی ولادت ہوئی۔ اس پر بہت مسرور نظر آتے تھے (۱۱)۔

مولانا حیدر آباد سے اعظم گڑھ آ گئے تھے۔ اس وقت مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی معتمد دار العلوم ندوۃ العلماء تھے۔ لہٰذا انھوں نے مولانا سے دار العلوم ندوہ کے چندے کا مطالبہ

کیا تو مولانا نے چندہ دینا بہ خوشی منظور کیا۔ مولانا کی علالت کا سلسلہ ابھی چل رہا تھا، لہذا ان کو لکھنو بغرض علاج بلایا تھا۔ اس پر مولانا نے لکھا کہ ان کے لیے ایک الگ کمرہ اور غیر مشترک بیت الخلا کی ضرورت تھی، جس کا بند و بست دار العلوم میں اس وقت ممکن نہ تھا، اس لیے لکھنو آنا ممکن نہ تھا۔ ندوہ کے نصاب کے متعلق پھر لکھا کہ اس میں تبدیلی ہونی چاہیے (۱۲)۔

مولانا اب ندوہ آ گئے تھے، لہذا چاہتے تھے کہ مولانا شروانی ان کی عیادت کے لیے آ جاتے اور ہفتہ دو ہفتہ قیام کر کے چند امور کو طے کرنے میں مدد دیتے (۱۳)۔

ایسا اندازہ ہے کہ مولانا کا ندوہ میں یہ قیام وقتی تھا۔ اس قیام کے بعد مولانا حیدر آباد پھر چلے گئے مولانا کی علالت کا سلسلہ چھ سات مہینے سے چل رہا تھا۔ موازنہ انیس و دبیر مکمل تو ہو گئی تھی مگر اب تک مطبع نہ جا سکی تھی۔

اسی زمانے میں مولانا حالی ایک رسالہ لکھ رہے تھے جو غالباً ختم نہیں کر پائے تھے (۱۴)۔ انجمن ترقی اردو نے ہربرٹ اسپنسر کی کتاب شائع کر دی تھی اور باقی مشہورہ کتابیں زیر طبع تھیں۔ الکلام کی قیمت میں کمی کا امکان نہ تھا، کیوں کہ وہ سلسلۂ آصفیہ میں شامل تھی۔ مولانا چاہتے تھے کہ سید سلیمان ندوی کچھ دن مولانا کے ساتھ رہتے تو تصنیفی کام میں منجھ جاتے، اس لیے کہ وہ جوہر قابل تھے ان کو صرف رہنمائی کی ضرورت تھی (۱۵)۔

شروع ۱۹۰۴ء میں علی گڑھ میں تحریک ہوئی کہ کالج میں علوم عربیہ کی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ اس تحریک کی مخالفت میں ایک جدید تعلیم یافتہ نے مضمون لکھا۔ مولانا عربی کے علوم کے ہمدردوں میں تھے اور ہمدرد بھی ایسے کہ مخالفت برداشت نہ کر سکتے تھے ان کا نظریہ تھا کہ قدیم تعلیم کو اولیت اور جدید تعلیم کو ثانوی حیثیت حاصل ہو۔ لہذا اس مضمون کو پڑھ کر ان کو جوش آ گیا اور بڑا مدلل مضمون لکھا۔ حال ہی میں الغزالی، علم کلام اور الکلام سے فارغ ہوئے تھے، اس لیے اس مضمون کے استدلال میں بڑی قوت ہے۔ مضمون کا عنوان "احیاء علوم عربیہ اور ایک ریڈیکل" (۱۶) رکھا اور اس کو "دکن ریویو" میں مئی ۱۹۰۴ء میں شائع کرایا۔

مولانا نے اپنے مضمون کو ایک شعر سے شروع کیا ہے۔ وہ شعر یہ ہے:

ضبط کروں میں کب تک آہ چل رے خامہ بسم اللہ

مولانا مضمون نگار کے بعض اقتباسات نقل کرنے کے بعد ان پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہم ریڈیکل صاحب اور تمام مخالفین عربی سے پوچھتے ہیں کہ اگر تھوڑی دیر کیلیے بفرض محال یہ تسلیم کر لیا جائے کہ عربی میں قابل قدر ذخیرہ۔ علمی موجود ہے، تو وہ کیا عربی تعلیم کو جائز رکھیں گے؟ مسٹر ماریسن نے عربی کے ساتھ ساتھ جدید سائنس کی تعلیم کی اسکیم بھی پیش کی تھی، کیا مخالفین عربی نے اس اسکیم کی تائید کی؟ کیا سائنس بھی عربی کی طرح قابل التفات نہیں ہے؟ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ کیا جدید گروہ علم کو علم کے لیے پڑھتا ہے؟ کیا اگر انگلش تعلیم سرکاری ملازمت کا ذریعہ نہ رہے، تو ایک شخص بھی کسی کالج کے احاطے میں نظر آئے گا؟ کیا کالج سے نکلنے کے بعد بھی انگریزی کے ذخائر علمی کو اس گروہ کے دربار میں باریابی کی عزت ملتی ہے؟"

جب یہ حالت ہے تو احیاء عربی کی تجویز سے انکار کے لیے صرف یہ وجوہ کافی تھے کہ ہماری زندگی اور ہماری تعلیم کا مقصد سرکاری ملازمت اور نوکری ہے، اور یہ عربی علوم سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ بالکل بجا استدلال تھا، جس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا تھا۔

شاید ریڈیکل صاحب کو یہ خیال ہو کہ اگر علوم عربی کی فضیلت ثابت ہو گی، تو ممکن ہے کہ کچھ طلبہ اس طرف بھی متوجہ ہو جائیں۔ لیکن ہم ان کو پورا اطمینان دلاتے ہیں کہ جدید گروہ ایک عاقبت اندیش اور علمی گروہ ہے، اس نے اپنا راستہ متعین کر لیا ہے، اور وہ ہرگز اس فریب میں نہیں آسکتا کہ علم کو علم کے لیے سیکھنا چاہیے (۱۷)۔

مولانا عرصے سے چاہتے تھے کہ ندوۃ العلماء کی طرف سے ایک رسالہ نکالا جائے اور چوں کہ مولانا کو تصنیف و تالیف اور مضامین لکھتے رہنے کی وجہ سے اس کام میں خاصا دخل تھا، لہٰذا مولانا کی خواہش قدرتاً یہ تھی کہ وہ اس رسالے کی ادارت سنبھالیں، مگر علمائے ندوۃ العلماء مولانا سے خائف رہتے تھے۔ کیوں کہ ان سے پیش نہیں پاتے تھے، لہٰذا مولانا کی ادارت کو پسند نہ کرتے تھے۔ اس لیے مولانا حبیب الرحمن شروانی کو مجوزہ رسالے کا مدیر مقرر کیا گیا۔ مگر مولانا شروانی بھی چاہتے تھے کہ مولانا بھی ادارت میں شریک ہو جائیں۔ چناں چہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"مولانا شروانی اس کوشش میں تھے کہ اپنی ذمہ داری میں وہ مولانا شبلی کو بھی شریک کر لیں اور اس کے لیے وہ ارکان سے خط و کتابت کر رہے تھے (۱۸)۔"

بہر حال مولانا بادل نخواستہ ادارت میں شریک کر لیے گئے اور الندوہ اس آب و تاب سے نکلا کہ اس کے دو ایڈیٹر تھے، ایک مولانا شروانی جو علی گڑھ میں تھے اور دوسرے مولانا شبلی جو حیدر آباد (دکن) میں تھے اور اس کا پہلا شمارہ اگست ۱۹۰۴ء مطابق جمادی الاول ۱۳۲۲ھ میں نکلا۔

جب مولانا دوسرے رسائل کو اپنے تحقیقی مقالات اور مدلل مضامین سے نوازتے رہتے تھے تو الندوہ تو ان کا اپنا تھا اور پھر ایک خاص مقصد کے تحت نکالا گیا تھا۔ مولانا کے پیش نظر ندوے کا مقصد جدید و قدیم تعلیم کی آمیزش اور اصلاح نصاب تھا۔ چناں چہ مولانا کی پہلی تقریر ۱۸۹۴ء میں اسی رنگ میں ہوئی تھی اور ان کی اسی پہلی تقریر کی مقبولیت سے علما خائف ہو گئے تھے پھر تو برابر اسی موضوع پر تقریریں کرتے رہے۔ اب تو الندوہ کی ادارت ہاتھ میں آگئی تھی اپنے خیالات کے اظہار اور لوگوں کو متاثر کرنے کا طریقہ کار جانتے تھے۔ اس لیے اسی موضوع پر پہلے شمارے میں مقالہ لکھا جس کا عنوان "ندوہ اور نصابِ تعلیم" تھا۔ تمہید میں لکھتے ہیں:

"ندوہ کے قائم ہونے کی سب سے بڑی ضرورت جو ظاہر کی گئی اور واقعی تھی بھی، وہ نصاب تعلیم کی اصلاح تھی۔ ندوہ کے مقاصد میں یہ اہم المقاصد تھا، اور آج تک ندوہ کے جتنے اجلاس ہوئے اس مقصد کو ہمیشہ نہایت بلند آہنگی سے بیان کیا گیا، لیکن یہ امر بظاہر تعجب انگیز ہے کہ پار سال تک جو نصاب جاری تھا، وہ قریباً وہی قدیم نصاب تھا، جو دیوبند وغیرہ میں جاری رہا۔

اس کی وجہ بہت بڑی یہ ہے کہ اصلاح نصاب کا خیال صرف چند روشن خیال علما کے دل میں پیدا ہوا ہے، باقی تمام لوگ اسی لکیر کے فقیر ہیں اور چوں کہ فیصلہ عموماً کثرتِ رائے پر ہوتا ہے اس لیے انھی بزرگوں کا پلہ بھاری رہتا ہے۔

اس سے بڑھ کر یہ مشکل ہے کہ مدرسین جو ہاتھ آسکتے ہیں، اسی قدیم نصاب کے تعلیم یافتہ ہیں، اس لیے وہ جدید نصاب (جس میں قدما کی تصنیفات داخل کی گئی ہیں) کے پڑھانے سے عاجز ہیں، مثلاً مختصر المعانی و مطول ہزاروں دفعہ کی پڑھی پڑھائی ہیں، ان کے بیسیوں حاشیے موجود ہیں، اس لیے ان کا پڑھا لینا ہر کس و ناکس کو آسان ہے۔ لیکن جدید نصاب میں ان کے بجائے دلائل الاعجاز عبد القاہر جرجانی رکھی گئی ہے۔ یہ کتاب اگرچہ فن بلاغت کی جان ہے اور مطول وغیرہ سب اس کے خوشہ چیں ہیں، لیکن نہ ہمارے مدرسین نے کبھی اس کتاب کو دیکھا تھا نہ اس پر شرحیں اور حاشیے موجود ہیں۔ اس لیے یہ لوگ اس کے پڑھانے سے عاجز ہیں اور چوں کہ اپنے عجز کا تسلیم کرنا کسرِ شان ہے، اس لیے یہ کہتے پھرتے ہیں کہ اس قسم کی کتابوں سے کافی استعداد پیدا نہیں ہوتی، بہرحال سال حال میں یہ قطعی فیصلہ کیا گیا کہ جو کچھ ہو جدید نصاب جاری کر دیا جائے۔ اس کے اجرا کے ساتھ فوراً ایک مدرس صاحب نے استعفا دیا اور اب اخبارات وغیرہ میں مضامین شائع کیے جا رہے ہیں کہ جدید نصاب درس کے قابل نہیں، بے شبہ اس نئے راستہ کا اختیار کرنے میں نہایت

مشکلات پیش آئیں گی، لیکن اگر ندوہ میں اس قدر بھی ہمت اور حوصلہ نہیں کہ وہ ان مشکلات کا مقابلہ کرے، تو اس کو سرے سے اصلاح نصاب کا نام لینا نہ چاہیے، یہ سخت بددیانتی ہے کہ تمام دنیا میں اصلاح نصاب کا غل مچایا جائے اور ایک ذرہ اصلاح نہ کی جائے۔

ہم نے اسی خیال سے اصلاح نصاب کے متعلق، ایک سلسلہ وار مضمون شروع کیا ہے جس کا پہلا نمبر آج کے پرچے میں درج ہے (۱۹)۔"

اسی زمانے میں طبقات ابن سعد کی پہلی جلد جو اسماء الرجال میں ایک مستند کتاب تھی، جرمنی سے شائع ہوئی۔ چوں کہ یہ نایاب کتاب تھی جس کو بڑی تلاش و تحقیق کے بعد جرمنی نے شائع کیا تھا۔ مولانا یورپ میں چھپنے والی کتابوں سے بھی باخبر رہتے تھے اور لوگ بعض کتابیں تحفے میں بھیجتے تھے، لہذا مولانا کو ایک انگریز نے یہ کتاب تحفے میں بھیجی۔ مولانا تو اس کتاب کی تلاش ہی میں تھے۔ اس پر ایک مضمون لکھا تاکہ دوسرے حضرات بھی اس کتاب سے واقف ہو جائیں اور اس سے استفادہ کریں۔ مضمون کا عنوان "طبقات ابن سعد" رکھا اور الندوہ کے پہلے شمارے میں شائع کیا، اس میں لکھتے ہیں:

"اس وقت ہم جس کتاب کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں، وہ "طبقات ابن سعد" ہے جو ہمارے مضمون کا عنوان ہے۔ یہ کتاب مشہور محدث ابن سعد کی تصنیف ہے۔ ابن سعد اگرچہ واقدی کے شاگرد تھے، لیکن محدثین نے تصریح کی ہے کہ وہ اپنے استاد کے خلاف ثقہ اور صادق الروایہ تھے۔ اس کتاب میں انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر اپنے زمانے تک کے لوگوں کے تراجم اور حالات لکھے ہیں۔ یہ کتاب بارہ ضخیم جلدوں میں ہے، لیکن قوم کی بدمذاقی سے اس کا کامل نسخہ کہیں کسی مقام پر پایا نہیں جاتا۔ ہم نے قسطنطنیہ اور مصر کے کتب خانے دیکھے ہیں، وہاں بھی اس کا پورا نسخہ موجود نہیں۔ جرمن کے ایک مشہور فاضل نے، جس کا نام پروفیسر ساخو ہے، اس کتاب کے چھاپنے کا ارادہ کیا، اور اس کے نسخوں کے بہم پہنچانے کی فکر کی، شہنشاہ جرمن کو جب یہ حال معلوم ہوا تو انھوں نے پورے ایک لاکھ روپے، اس کتاب کے مصارف کے لیے شاہی خزانے سے عطا کیے (۲۰)۔"

مولانا کو شروع سے علم کلام اور فلسفے سے دل چسپی تھی۔ المامون کی ترتیب کے وقت تو خصوصاً مطالعہ کیا تھا، مگر حیدر آباد میں علم کلام کے حالات موافق ہونے کی وجہ سے علم کلام پر قلم اٹھایا تو فلسفہ، منطق، علم کلام اور متکلمین کے متعلق وسعت معلومات میں بڑا اضافہ ہوا اور یہ

اثرات الندوہ کے ابتدائی زمانے اور شعر العجم کی ابتدائی زمانے تک قائم رہے۔ فلسفہ، منطق، علم کلام کی خشکی پر شعر العجم کی شگفتگی رفتہ رفتہ غالب آئی۔ چوں کہ حیدر آباد کی فضا علم کلام کی خشکی کے لیے مناسب تھی اس لیے الندوہ کے ابتدائی دور میں مولانا کے قلم سے فلسفہ، منطق، علم کلام اور متکلمین پر مقالات ملتے ہیں۔ چناں چہ الندوہ کے ستمبر کے شمارے میں مولانا کے دو مقالے ملتے ہیں، ایک کا عنوان "فلسفہ۔ یونان اور اسلام" اور دوسرے کا "فلسفہ۔ یونان اور اسلام"۔ یونانی منطق کی غلطیاں ہے۔

مولانا اس طرح ابتدا کرتے ہیں:

"علمی تاریخ کا یہ ایک اہم مسئلہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنے دور میں، فلسفہ و سائنس پر کچھ اضافہ یا اصلاح و ترمیم کی یا نہیں، یورپ کے مستشرقین (اورینٹلسٹ) میں بعض اس کے مقر ہیں اور بعض منکر، لیکن ہم کو جہاں تک معلوم ہے جو لوگ مسلمانوں کے طرف دار ہیں انھوں نے بھی یہ فیصلہ اجتہاداً نہیں بلکہ تقلیداً کیا ہے۔"

طرف داران اسلام میں پروفیسر لیبان، پروفیسر مونک، دوزی، دوگا، پروفیسر سید یو (یہ سب فرنچ ہیں) گبن، ڈریپر، میکڈ انلڈ زیادہ نامور ہیں۔

ان میں سے سید یو اور مونک کے سوا باقی عربی سے بالکل آشنا ہیں۔ سید یو اور مونک کی تصنیفات ہم نے اچھی طرح دیکھی اور پڑھی ہیں۔ ان سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ وہ عربی فلسفہ سے نہایت سطحی واقفیت رکھتے تھے، گبن، ڈریپر وغیرہ سرے سے عربی زبان ہی نہ جانتے تھے۔ اس لیے ان کی تحسین، تحسین ناشناس ہے۔

یہ تو ہمارے دوستوں کی حالت ہے، لیکن مخالفوں کی حالت ان سے بھی عجیب تر ہے، یہ لوگ مدعی ہیں کہ مسلمانوں نے ارسطو کی کورانہ تقلید کے سوا اور کچھ نہیں کیا، ایک صاحب نے لکھا ہے کہ مسلمان ارسطو کی گاڑی کے قلی تھے، پرفیسر رینان نے ایک لکچر دیا تھا جس میں بیان کیا تھا کہ "اسلام اور علم دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔" لطف یہ ہے کہ ان میں سے ایک کو بھی مسلمانوں کی نادر فلسفیانہ تصنیفات سے اطلاع نہیں (۲۱)۔"

آگے چل کر اسی مقالہ میں لکھتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں میں فلسفہ حکومت اور سلطنت کی راہ سے آیا، یعنی خلفائے عباسیہ نے اپنے شوق سے یونانی کتابوں کے ترجے کرائے۔ ان کو پڑھ کر خود مسلمانوں نے بھی فلسفہ میں تصنیفات و تالیفات شروع کیں، لیکن یہ گروہ بھی

وہی محدود گروہ تھا جو دربار خلافت سے تعلق رکھتا تھا، عوام اور مذہب سے کسی فرقے کو کسی قسم کی دلچسپی نہ تھی، چار سو برس کے بعد امام غزالی نے فلسفہ اور منطق کو نصاب تعلیم میں داخل کیا اور اس وقت سے یہ فن عام طور پر رواج پا گیا، لیکن امام غزالی نے فلسفے سے جو کچھ واقفیت حاصل کی تھی وہ صرف بو علی سینا اور فارابی کی کتابوں سے کی تھی، چناں چہ ابن رشد نے تہافتہ الفلاسفہ میں جابجا تصریح کی ہے اور خود امام غزالی کی تصنیفات اس کی شاہد ہیں (۲۲)۔"

دوسرے مقالے کو اس طرح شروع کرتے ہیں:

"اس امر کی نسبت اتفاق عام ہے کہ سب سے پہلے اس فن (منطق) کی تدوین ارسطو نے کی اور اسی بنا پر وہ اس فن کا موجد شمار کیا جاتا ہے۔ یہ امر بھی عموماً تسلیم کیا جاتا ہے کہ ارسطو نے منطق کے جو قواعد مقرر کر دیے، آج تک اس میں نہ کوئی غلطی ثابت ہوئی، نہ ان پر کچھ اضافہ ہو سکا، البتہ یورپ کا دعویٰ ہے کہ بیکن نے منطق کی ایک نئی شاخ ایجاد کی، جو منطق عملی یا استقرائی کے لقب سے ملقب ہے، ہم اس مسئلے پر کہ یہ منطق درحقیقت منطق کی کوئی نئی شاخ ہے یا نہیں؟ آئندہ بحث کریں گے، اس موقع پر صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ اس شاخ کو چھوڑ کر یورپ کو بھی تسلیم ہے کہ ارسطو کی منطق پر آج تک نہ اضافہ ہو سکا نہ اصلاح و ترمیم، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حکمائے اسلام نے اس فن میں نہ صرف اصلاح و ترمیم کی، بلکہ بہت سے مسائل کی غلطیاں ثابت کیں (۲۳)۔"

اسپین کے مشہور فلسفی اور متکلم ابن رشد کے متعلق اب تک لوگ کم جانتے تھے۔ مولانا نے جب فلسفہ، علم کلام اور منطق کے کوچے میں قدم رکھا تو ان کی عقابی نگاہیں ابن رشد پر بھی پڑیں۔ گویا:

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں　　مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

(داغ)

چناں چہ مولانا نے ابن رشد پر الندوہ کے تین شماروں (اکتوبر ۱۹۰۴ء، جنوری ۱۹۰۵ء و فروری ۱۹۰۵ء) میں مقالات لکھے جن کو سید سلیمان ندوی نے یکجا کر کے ایک مکمل مقالہ بنا دیا۔ اس کا ایک جز معارف جلد ۲، عدد ۱۲ میں بھی چھپا تھا۔ مولانا اپنے مقالے میں اس طرح رقم طراز ہیں:

"ابن رشد کے فلسفے نے اگرچہ تمام یورپ میں رواج پایا، لیکن اعلیٰ صدر

مقام اس فلسفے کا پیڈوا کی یونی ورسٹی تھی جو اٹلی میں واقع تھی۔ اس یونی ورسٹی میں سب سے پہلے جس نے ابن رشد کے فلسفہ کو داخل کیا، پطرس دابانو تھا۔ اب یورپ کے تمام علمی طبقہ میں ابن رشد کی یہ عزت کی جاتی تھی کہ لوگ اس کے نام پر فخر کرتے تھے (۲۴)۔"

نومبر ۱۹۰۴ء کے شمارے میں مولانا نے ایک مقالہ پھر "فلسفہ یونان اور اسلام" یونانی منطق کی غلطیاں پر لکھا۔ اس میں لکھتے ہیں:

"اہل منطق نے ادراک معلومات کے دو مختلف طریقے قرار دیے ہیں، معرف و حجت اور اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ علم کی دو قسمیں ہیں "تصور و تصدیق" اور چوں کہ یہ دونوں دو مختلف قسم کے علم ہیں، اس لیے ان کے ادراک کے طریقے بھی مختلف ہیں، جن کا نام معرف و حجت ہے۔ لیکن غور کرنا چاہیے کہ جس چیز کو ہم معرف کہتے ہیں، وہ تصور ہے یا تصدیق۔ اس سوال کے جواب دینے سے پہلے ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ معرف کیوں کر حاصل ہوتا ہے، یعنی کسی شے کی حقیقت ہم کیوں کر معلوم کرتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے ہم اس بات کا پتا لگاتے ہیں کہ اس شے میں کیا کیا چیزیں پائی جاتی ہیں، پھر یہ دیکھتے ہیں ان میں کیا کیا چیزیں ایسی ہی جو اور اشیا میں بھی مشترک ہیں، اور کیا کیا چیزیں جو اسی شے کے ساتھ خاص ہیں، پھر یہ دیکھتے ہیں کہ یہ چیزیں اس شے کی ذات میں داخل ہیں، یا اس کے خارجی اوصاف ہیں (۲۵)۔"

مولانا نے موازنۂ انیس و دبیر بھی حیدرآباد (دکن) کے قیام میں لکھی تھی، لہٰذا شاعری کی خوبیاں اور فنی نکات ان کے ذہن میں چکر لگا رہے تھے۔ انھیں اثرات کے تحت انھوں نے فن بلاغت پر نومبر ۱۹۰۴ء میں ایک مضمون لکھا جو الندوہ دسمبر ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں موازنۂ انیس و دبیر کا رنگ صاف جھلکتا ہے، بلکہ بعض مثالیں تو وہی ہیں جو موازنے میں موجود ہیں۔ مولانا لکھتے ہیں:

"فصاحت کے مدارج میں اختلاف ہے، یعنی بعض الفاظ فصیح ہیں، بعض فصیح تر، بعض اس سے بھی بڑھ کر فصیح۔ مثال کے طور پر ہم دو چار مثالیں نقل کرتے ہیں، جن سے فصاحت اور فصاحت کے اختلاف مراتب کا اندازہ ہو سکے گا۔ (ان مثالوں میں ایک ہی مضمون مختلف الفاظ میں ادا کیا گیا ہے)۔

کس نے نہ دی انگوٹھی رکوع و سجود میں ‏ ‏ سائل کو کس نے دی ہے انگوٹھی نماز میں
آنکھوں میں پھرے اور نہ مردم کو خبر ہو ‏ ‏ آنکھوں میں یوں پھرے کہ مژہ کو خبر نہ ہو

رویا میں بھی حسین کو رویا ہی کرتے ہیں   حسرت یہ ہے کہ خواب میں بھی رویا کیجیے
جیسے مکاں سے زلزلہ میں صاحبِ مکاں   جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے (۲۶)

اس شمارے کے بعد مولانا نے دوسرے شمارے میں فن نحو کی مروجہ کتابوں پر ایک مضمون لکھا اور عنوان "فن نحو کی مروجہ کتابیں" رکھا۔ اس میں لکھتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ ہر زبان میں ادائے مطلب کے لیے الفاظ کی ترتیب کا خاص طریقہ ہے، یہ طریقے بعض مشترک ہوتے ہیں، بعض اور کسی دوسری زبان میں بھی پائے جاتے ہیں، اور بعض غیر مشترک، جو خاص ایک ہی زبان کے ساتھ مخصوص ہیں، انہی طریقوں کے جزئیات کا نام نحو ہے اور نحو کی تدوین کے یہ معنی ہی کہ ان تمام جزئیات کا استقصا کر کے ان کو کلیات کے تحت میں لایا جائے (۲۷)۔"

حواشی:

۱۔۔۔ روداد اجلاس دوم ندوۃ العلما۔ منعقدہ ۱۴ تا ۱۶ شوال ۱۳۲۱ھ مطابق ۳ تا ۵۔ جنوری ۱۹۰۴۔ بمقام مدراس اسلامی پریس۔ شاہجہاں پور، صفحہ ۵۔

۲۔۔۔ روداد، صفحہ ۸۱

۳۔۔۔ روداد، صفحہ ۹۶

۴۔۔۔ روداد، صفحہ ۹۷

۵۔۔۔ روداد، صفحہ ۱۷

۶۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۱۸۶، ۱۲۔ جنوری ۱۹۰۴۔

۷۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۵۵۔۱۵۴، ۱۲۔ جنوری ۱۹۰۴۔

۸۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۱۶۔۱۷، ۲۵۔ جنوری ۱۹۰۴۔

۹۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۱۷۔۱۸، ۱۵۔ فروری ۱۹۰۴۔

۱۰۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۱۸، ۱۲۔ جنوری ۱۹۰۴۔

۱۱۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۱۰۹ تا ۱۰۲، ۲۔ مئی ۱۹۰۴۔

۱۲۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۳۶۔۳۳۵، ۲۰۔ ستمبر ۱۹۰۴، اعظم گڑھ سے۔

۱۳۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۱۵۵، ۲۸۔ ستمبر ۱۹۰۴۔

۱۴۔۔۔ غالباً یہ رسالہ مولانا حالی کا مختصر مضمون تھا جو انھوں نے خواجہ غلام الحسنین کے اردو ترجمہ "ایجوکیشن" (ہربرٹ اسپنسر کی کتاب) پر لکھا تھا۔ اردو میں اس ترجمے کا نام "فلسفۂ تعلیم" تھا۔ یہ انجمن ترقی اردو کے لیے لکھا گیا تھا۔ (حالی کا ذہنی ارتقا، صفحہ ۱۸۵)

۱۵..... مکاتیب اول، صفحہ ۳۰۴، ۲۷-نومبر ۱۹۰۳ء
۱۶..... مقالاتِ شبلی-(تعلیمی) جلد سوم، مطبع معارف-اعظم گڑھ، ۱۹۵۵ء، صفحہ ۱۶۴ تا ۱۷۷-
۱۷..... مقالاتِ شبلی (تعلیمی)، جلد سوم، مطبع معارف-اعظم گڑھ، ۱۹۵۵ء، صفحہ ۱۶۶ تا ۱۶۷-
۱۸..... حیاتِ شبلی، صفحہ ۲۳۸
۱۹..... مقالاتِ شبلی (تعلیمی)، جلد سوم، صفحہ ۱۲۶ تا ۱۲۷
۲۰..... مقالاتِ شبلی (تنقیدی)، جلد چہارم- مطبع معارف-اعظم گڑھ، ۱۹۵۶ء، صفحہ ۱-۲
۲۱..... مقالاتِ شبلی (فلسفیانہ)، جلد ہفتم، مطبع معارف-اعظم گڑھ، ۱۹۳۸ء، صفحہ ۱-۲
۲۲..... مقالاتِ شبلی (فلسفیانہ)، صفحہ ۲
۲۳..... مقالاتِ شبلی (فلسفیانہ)، صفحہ ۱۳
۲۴..... مقالاتِ شبلی (تاریخی حصہ اول)، جلد پنجم، صفحہ ۷۵-(الندوہ، اکتوبر ۱۹۰۴ء)
۲۵..... مقالاتِ شبلی (فلسفیانہ)، صفحہ ۱۸-(الندوہ، نومبر ۱۹۰۴ء)
۲۶..... مقالاتِ شبلی (ادبی) جلد دوم، مطبع معارف-اعظم گڑھ، طبع دوم ۱۹۵۰ء، صفحہ ۸-(الندوہ دسمبر ۱۹۰۴ء)
۲۷..... مقالاتِ شبلی (تعلیمی) جلد سوم، مطبع معارف-اعظم گڑھ-طبع دوم، ۱۹۵۵ء

۱۹۰۵ء

حیدر آباد میں مولانا کو اطمینان نہ تھا۔ سیاسی سازشوں سے بہت گھبراتے تھے۔ ہمدرد (۱) حساب میں تھے۔ علمی کام، درباری سیاست کے ماتحت تھے۔ مولانا اپنے کمزور مالی حالات اور گھریلو معاملات کی وجہ سے مجبور تھے، ورنہ پہلے ہی حیدر آباد سے اپنی جان چھڑا لیتے۔ اب والد مرحوم کا چھوڑا ہوا قرض ادا ہو چکا تھا قدر دانوں کی علاحدگی نے مولانا کو بددل کر دیا تھا۔ (۲) محکمے میں بھی کچھ ایسی تبدیلیاں ہوئیں کہ مولانا نے آخر ۱۹۰۴ء میں استعفےٰ دے دیا، جو مدار المہام کے یہاں سے منظور ہو گیا اور (۳) نظام کی آخری منظوری کے لیے پیش ہوا۔ مولانا کا ارادہ تھا کہ استعفےٰ منظور ہوتے ہی وہاں سے روانہ ہو جائیں تاکہ وہاں کی سازشوں کے جو برے اثرات پڑے تھے ان سے ذہنی طور پر سکون اور یکسوئی حاصل ہو۔ ابھی یہ طے نہیں کر پائے تھے کہ کہاں قیام کریں، لیکن یہ ضرور طے کر لیا تھا کہ اپنی صحت کی خاطر چار پانچ ماہ سیر و تفریح میں گزاریں گے۔ یہ بھی ارادہ تھا کہ مولوی ضیاء الحسن صاحب علوی کاکوروی جو ہر قابل تھے (۴) ان کو ادب اور فلسفے کی بعض کتابیں پڑھائیں اور مضمون نگاری کی مشق کرائیں (۵)۔

حیدر آباد سے مولانا ۵۔ فروری ۱۹۰۵ء سے قبل وطن آ گئے تھے۔ حیدر آباد کے مدار المہام کا اصرار تھا کہ مولانا حیدر آباد میں قیام فرمائیں۔ مگر مولانا حیدر آباد کی ریشہ دوانیوں سے ایسے گھبرائے ہوئے تھے کہ ٹھہرنا مناسب نہ تھا۔ مولانا کا فرصت میں مشغلہ موازنہ ترقی اور نیشنل اسکول کی ترقی کی فکر تھی۔ چناں چہ وطن پہنچتے ہی مولوی سمیع صاحب سیکریٹری موازنہ ترقی سے رپورٹ طلب کی اور خود ان کو بھی اتوار کی چھٹی میں طلب کیا (۶)۔

دار العلوم ندوۃ العلماء کے نقیب الندوہ کا اب اجرا ہو چکا تھا اور مولانا شبلی کی ادارت میں نکل رہا تھا۔ جس دن سے الندوہ نکلا اس وقت سے مولانا کی طبیعت خراب رہی۔ اس لیے مولانا الندوہ پر پوری توجہ نہ دے سکے۔ اس کے باوجود تحقیقی، علمی اور ادبی مضامین کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ مولانا حمید الدین فراہی نے بھی تحسین کی۔ اسی زمانے میں حامد نعمانی کو طاعون ہو گیا جس سے مولانا بدحواس ہو گئے، اس لیے کہ حامد نعمانی مولانا کی تنہا اولاد نرینہ رہ گئے تھے (۷)۔

نواب محسن الملک نے مولانا کو علی گڑھ کالج کی سنٹرل کمیٹی کا ممبر بنایا اور ایک خط کے

ذریعے اطلاع دی۔ مولانا نے ممبری کو اپنے لیے باعث فخر سمجھا لیکن اس کو پسند نہ کیا کہ بغیر کسی خدمت اور محنت کے ممبر بنتے، اس زمانے میں بیمار تھے اور سال بھر سے بیماری کا سلسلہ چل رہا تھا۔ بیماری اور کمزوری کی وجہ سے تصنیف کا مشغلہ بھی بند تھا، لہٰذا محسن الملک مرحوم کو لکھا کہ اس عہدہ کو بعد صحت قبول کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے اس وقت کچھ کام بھی کر سکتے تھے۔ (۸) لیکن مولانا کا یہ عذر محسن الملک نے تسلیم نہ کیا اور لکھا کہ:

> "منظوری کا عنایت نامہ عنایت ہو۔ عذر نا مسموع، براہ کرم ضرور منظور فرمائیے مجھ پر احسان ہو گا(۹)۔"

مولانا اپنے احباب اور تلامذہ کو الندوہ میں مضامین لکھنے پر اکساتے رہتے تھے اور مولانا حمید الدین کو تو عزیز دارانہ تعلق اور ان کی عربی فارسی اور انگریزی کی مہارت کی وجہ سے برابر مضامین لکھنے کی تاکید کرتے رہتے تھے، چناں چہ مولانا نے ان کو الندوہ کے لیے مضمون لکھنے کو لکھا، انھوں نے مصروفیت کی وجہ سے معذرت کی (مولانا حمید الدین اس زمانے میں قرآن مجید کی تفسیر لکھ رہے تھے) تو مولانا نے لکھا کہ جب فرصت ہو تب ہی لکھیں۔ اس زمانے میں مولانا سے اور مولوی حمید الدین سے جرجانی اور جاحظ کے متعلق بحث چلی۔ مولانا جرجانی کو بہت پسند کرتے تھے اور مولوی حمید الدین اس کو لفاظ کہتے تھے۔ مولانا نے ارسطو کی منطق پر الندوہ میں ایک مضمون لکھا تھا۔ اس سلسلے میں مولوی حمید الدین فراہی کو خیال ہوا کہ شاید مولانا نے انسائیکلوپیڈیا سے استفادہ کیا ہو۔ لہٰذا مولانا نے اس کی تردید کی۔ مولوی حمید الدین نے اپنے مضمون میں یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ ارسطو کا مطلب مسلمان مترجم نہیں سمجھ سکے۔ اس پر مولانا نے لکھا کہ اگر مسلمان نہیں سمجھ سکے تو یورپ پر بھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا نے توجہ دلائی کہ ارسطو کی منطق پر مولانا کے مضمون کا ذکر انھوں نے (حمید الدین) نہیں کیا۔ حالاں کہ مولانا نے اس کو بڑی محنت سے لکھا تھا۔

اس زمانے میں مولانا بہت پریشان تھے کیوں کہ اپنی علالت اور کمزوری کا سلسلہ تو لگا ہوا تھا ہی، حامد نعمانی طاعون میں مبتلا ہوئے، وہ کچھ بہتر ہونے لگے تو مولانا کی اہلیہ (دوسری بیوی) کی طبیعت خراب ہو گئی اور مولانا ہی تنہا تیمار دار تھے (۱۰)۔

مولانا اب لکھنو تشریف لے آئے اور ۱۵۔ صفر ۱۳۲۳ھ (۱۱) مطابق ۲۲۔ اپریل ۱۹۰۵ء (۱۲) کو ندوۃ العلماء کے باقاعدہ معتمد تعلیم منتخب ہوئے۔ طلبائے دار العلوم مولانا سے جلسے سے

واقف تھے اور ان کی قدر کرتے تھے، لہٰذا وہ بہت خوش ہوئے۔ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"مولانا کی مستقل تشریف آوری اور قیام کی خبر جب دارالعلوم کے طلبہ کو ملی تو ان کو بے حد خوشی ہوئی اور اس خوشی کا اظہار مختلف طریقوں سے کیا گیا۔ طلبہ نے جلسے کیے، تقریریں کیں، نظمیں لکھیں (۱۳)۔"

سید سلیمان ندوی نے مولانا کے خیر مقدم میں ایک فارسی قصیدہ کہا جس میں ستائیس اشعار ہیں۔ مطلع یہ ہے:

بدہ ساقی مے کو، بفگند جلباب ظلمانی خرد را نور بخشد از چراغ طور ایمانی (۱۴)

مولانا شبلی کی نثر و نظم وغیرہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

خجل از حسن نثرش لعبتان جملہ، گردوں عرق از در نظمش برجبیں ابر نیسانی
دلش نتواں کشیدن منت ارباب نعمت را کہ نشتری خورد از ہمتش اقبال سلطانی
بیانش ابر باراں است می بخشد چوں بارد بہوم شور سر سبزی و سبزہ را فراوانی
مسیحا دم، باعجاز قلم جان دگر بخشد بحکم قم باذن العلم آتن را کہ شد فانی
بخواہم از خداوندے کہ نامش حی و قیوم است بماند زندہ، جاوید ایں شبلی نعمانی
نوشتم چوں مدیح حضرۃ الاستاد و برخواندم ندا آمد مرا از پردہ، ناموس ربانی

اپنے نام سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مقطع کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

دلیل فیض ممدوحت زمدح تو ہویدا شد بہ پیش مور سر نہ نہی کہ بنام سلیمانی

اس قصیدے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا طلبائے دارالعلوم میں کس قدر مقبول تھے۔ یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ طلبہ بھی مولانا کے تعلیمی نظریات کو تحسین کی نظر سے دیکھتے تھے۔ نہ وہ قدیم طرز تعلیم کو پسند کرتے تھے اور نہ جدید تعلیم کی بے باکیوں کے خواہاں تھے، بلکہ دونوں کے امتزاج کو پسند کرتے تھے اور دونوں کی خوبیوں سے فائدہ اٹھانا اور خرابیوں سے بیزاری ان کے پیش نظر تھی۔

حیدر آباد سے مولانا کے استعفے کی خبر جب بھوپال پہنچی تو بیگم بھوپال نے مولوی محسن الملک کے ذریعہ چاہا کہ وہ بھوپال میں خدمت قبول کرلیں مگر اب وہ ندوے کا ارادہ کر چکے تھے، اس لیے منظور نہ کیا۔ سید سلیمان ندوی مولوی محسن الملک کا خط اس طرح نقل کرتے ہیں:

"مولانا! ہر ہائینس بیگم صاحبہ نے مجھ سے دریافت کیا ہے کہ "مولوی شبلی صاحب یہاں آنا پسند کریں گے یا نہیں؟ اگر آئیں گے تو کیا مشاہرہ قبول کریں گے۔"

فرمائیے کیا جواب دیا جائے۔ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ الندوہ کب نکلے گا؟ آپ کے قبضے میں ندوہ کے آنے سے حضرات علما کا کیا حال ہے، مدد دیں گے یا فرنٹ ہو جائیں گے (۱۵)۔"

اس خط کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کے ندوے کے قیام کے زمانے میں یہ خط لکھا گیا تھا اور مولوی محسن الملک کو اندیشہ تھا کہ علمائے ندوہ مولانا کی روشن خیالی کو پسند نہ کریں گے۔ الندوہ کے اجرا کو ابھی چند ماہ ہی ہوئے تھے اس لیے محسن الملک کو اس کے اجرا کی خبر نہ تھی۔

اسی زمانے میں مولوی حمید الدین نے سورۃ ابی لہب کی تفسیر اور جمہرۃ البلاغۃ کے نام سے فن بلاغت کی تحقیق اور ارسطو کے نظریے کی تردید میں ایک رسالہ لکھا تھا۔ مولانا نے تفسیر کی بڑی تعریف کی، بلاغۃ کے بعض اجزا کو سرسری اور معمولی بتلایا لیکن ارسطو کے رد کی تعریف کی، عبارت کی بعض کمزوریوں کی طرف توجہ دلائی، اذا اور لما میں فرق نہ کرنے پر تنبیہ کی۔ مولانا نے مولوی حمید الدین کو ترغیب دی کہ ارسطو کی کتاب کو تھیکر (۱۶) کے یہاں سے منگوا لیں۔ مولانا نے الندوہ میں جمہرۃ البلاغۃ کے اقتباس دینے کا ارادہ کیا اور اس ارادے کی مولوی حمید الدین کو بھی اطلاع دی۔

مولانا نے ندوے کے نصاب میں دروس الاولیہ فی العلوم الطبعیہ جدید طبیعات میں ایک جدید عربی تصنیف کو شامل کیا تھا اور چاہتے تھے کہ ایسا شخص پڑھائے جو عربی سے واقفیت کے ساتھ ساتھ انگریزی خواں بھی ہو۔ اس لیے مولانا کی نظر حمید الدین پر پڑی لہٰذا ان کو لکھا کہ اگر وہ وقت نکال سکیں تو پڑھا دیں۔ اس کے لیے انھوں نے دو طالب علموں کو تیار کیا کہ وہ مولوی حمید الدین کے پاس جا کر اس کتاب کا درس لیں (۱۷)۔

مولانا کی دوسری اہلیہ کی بیماری اب خطرناک ہو چکی تھی۔ تپ کہنہ اور کھانسی تجویز ہوئی تھی، جس کو دق کہتے ہیں۔ مولانا مایوس ہو گئے تھے۔ چناں چہ بعد کو ان کی اہلیہ کا اسی بیماری میں انتقال ہوا۔

مولوی حمید الدین کا وعدہ تھا کہ وہ طلبائے دار العلوم کو دروس الاولیہ آکر پڑھائیں گے۔ اسی بھروسے پر کتاب کے پڑھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ لہٰذا مولانا نے اس وعدے کو یاد دلایا اور یہ بھی لالچ دلائی کہ ان کی تصنیف کے لیے بھی ندوہ میں مواد موجود تھا (۱۸)۔

ریاض حسن خاں نے مولانا کو ایک مسودہ بھیجا تھا۔ مولانا نے اس کو فرصت میں دیکھنے

اور اصلاح کرنے کا ارادہ کیا اور لکھا کہ اس میں کہیں کہیں ترمیم کی ضرورت تھی۔ بو علی سینا کے متعلق کچھ بے سروپا باتیں حبیب السیر وغیرہ میں تھیں اور انھیں کی تقلید نامہ دانشوران وغیرہ میں بھی کی گئی تھی۔ مولانا نے اس کو غلط بتلایا۔ طبقات الاطبا اور تاریخ الاطبا شہزوری کی معتبر کتابیں بتلائیں، جن میں ابن سینا اور خوارزم کے تعلقات اور اختلافات کا ذکر تھا۔ ان میں بھی بے سروپا باتوں کا ذکر نہ تھا۔ لہٰذا مولانا نے بے سروپا باتیں شیعوں کی من گھڑت بتلائیں (۱۹)۔

مولوی حمید الدین نے لکھا کہ وہ بعد رمضان آسکتے تھے، مولانا نے یہ بات پسند کی۔ ۱۶۔ اکتوبر کو دو چار دن بعد مولانا کا ارادہ دورے پر جانے کا تھا۔ اس لیے کہ ندوے کو مالی اعتبار سے مضبوط کرنا چاہتے تھے۔ اگرچہ رمضان المبارک میں چھٹی نہیں ہوتی تھیں۔ لیکن محنت بخوبی نہ ہو سکتی تھی، اس لیے رمضان شریف لکھنو سے باہر گزارنے کا ارادہ تھا۔

اسی زمانے میں حامد نعمانی کے نائب تحصیلدار ہونے کا امکان تھا۔ اس کی اطلاع مولوی حمید الدین کو دی۔ علی گڑھ کالج سے برابر اصرار ہوتا رہا تھا کہ مولانا دوبارہ چلے آئیں دو سو روپے مشاہرے کا وعدہ کیا جارہا تھا، لیکن مولانا ندوے کی خدمت کے علاوہ اب کسی اور طرف متوجہ نہ تھے۔ لہٰذا لکھ دیا:

"شاخ بریدہ را نظرے بر بہار نیست"

ان دنوں مولوی اسحٰق (مولانا کے چھوٹے بھائی) شملہ گئے ہوئے تھے اور ان کے یہاں بچی کی ولادت ہوئی تھی۔ گو فرصت نہ تھی، لیکن اسی زمانے میں مولانا نے شعرالعجم لکھنے کا پختہ ارادہ کر لیا اور بچپن سے اب تک کے فارسی شاعری کے مذاق کو بروئے کار لانا چاہتے تھے۔ اس کی اطلاع مولوی حمید الدین کو دی۔

مولانا گھر کی علالت اور ندوے کی کمزور مالی حالت سے اگرچہ پریشان تھے مگر نادر کتابوں کا ذوق ذخیرہ، کتب میں اضافہ کرتا رہتا تھا، لہٰذا اس زمانے میں بھی ابن تیمیہ کی کتاب العقل و النقل چار جلدوں میں اور محصل امام رازی مع نقد المحصل طوسی کا اضافہ ہوا (۲۰)۔

مولانا نے مولوی حمید الدین کو جس سفر کی اطلاع دی تھی وہ بھوپال کا سفر تھا۔ چناں چہ بھوپال پہنچ کر سرکار عالیہ بھوپال سے ملاقات کی اور پچاس روپے ماہانہ ندوے کے لیے مقرر کرالیے اور اب بھوپال سے بمبئی کا ارادہ تھا۔ مولوی حمید الدین کو پھر لکھا کہ لکھنو میں دو تین مہینے قیام کر کے دروس الاولیہ طلبہ کو پڑھا دیں اور مولانا کے کوٹھے پر قیام کریں جو ان کی طبیعت کے

مطابق تھا اور اگر ان کا ارادہ سندھ مدرستہ الاسلام، کراچی کی ملازمت ترک کرنے کا ہو تو مختصر ہی مگر کچھ بندوبست بھی ہو سکتا تھا، لہذا جیسا بھی ان کا ارادہ ہو اس سے واقف ہونا چاہتے تھے۔ چوں کہ واپسی کا جلد ارادہ تھا اس لیے جواب ندوے کے پتے ہی پر طلب کیا (۲۱)۔

۲۴۔ نومبر ۱۹۰۵ء سے پہلے مولانا لکھنو آگئے تھے مگر لرزہ بخار میں مبتلا تھے۔ مہدی حسن نے سوانح مولانا روم کے متعلق دریافت کیا کہ کب چھپے گی تو ان کو جواب دیا کہ اس کو رحمت اللہ رعد کے چھاپے خانے میں بھیجے ہوئے دو سال ہو گئے مگر چھپنے کی اطلاع نہ آئی (۲۲)۔

مولوی حمید الدین وعدہ ہی کرتے رہے اور لڑکوں کو پڑھانے نہ آئے اور اپنے وطن چلے گئے۔ بس مولانا کو غصہ آگیا اور انھیں ڈانٹا کہ ندوے میں تو اس بات کا شہرہ ہے کہ حمید الدین چھٹی لے کر آئیں گے اور طلبہ کو پڑھائیں گے اور انھوں نے یہ کہا کہ اپنے وعدے، مولانا کی ضمانت و اعتبار اور طلبہ کی امید اور قومی کام پر گھر کے قیام کو ترجیح دی، اس لیے مولانا کو بہت افسوس ہوا۔

دنیا کا کوئی کام تو رک نہ سکتا تھا لیکن مولانا کو ان سے جو امیدیں تھیں ان سے ناامید ہو گئے اور اس کا بھی افسوس تھا کہ سات سالہ حقوق کا بھی کچھ پاس نہ کیا اور صرف ایک مہینہ بھی مولانا کی خاطر طلبہ کو پڑھانے کے لیے نہ نکال سکے۔ اس کا افسوس نہ تھا کہ طلبہ کی پڑھائی رہ جائے گی لیکن افسوس اس کا تھا کہ جن کو وہ عالی ظرف اور بلند ہمت سمجھتے تھے ان کا یہ حال تھا۔ مولانا کو اتنا غصہ تھا کہ انھوں نے لکھ دیا کہ خط کے جواب کی ضرورت نہیں (۲۳)۔

مہدی حسن نے الندوہ کے لیے اپنا پتا تبدیل کرایا اور دو نئے حضرات کے نام الندوہ کا اجرا کرایا۔ مولانا نے ان کی قومی ہمدردی کی تعریف کی اور مزید خریدار مہیا کرنے کی خواہش کی اور الندوہ کی طرف سے ان کی کوششوں کا شکریہ ادا کیا (۲۴)۔

مولانا کو اسلامی تاریخ سے علی گڑھ کے زمانے میں لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ مصر و روم و شام کے سفر میں بعض نادر کتابوں کو دیکھ کر مولانا کو مسلمانوں کے علمی کارناموں سے مزید دل چسپی پیدا ہو گئی۔ چناں چہ جب بھی موقع ملا انھوں نے اس پر قلم اٹھایا۔ مولانا نے اپنے سفر کے دوران مصر میں ایک کتاب حضرت عمر بن عبد العزیزؒ از ابن جوزی کا مطالعہ کیا تھا۔ اس وقت سے مولانا کے ذہن میں تھا کہ حضرت عمر بن عبد العزیز از ابن جوزی پر قلم اٹھائیں۔ لہذا اس کا موقع فروری ۱۹۰۵ء میں آیا اور انھوں نے ایک مقالہ لکھا جس کا عنوان مناقب عمر بن عبد العزیزؒ (از ابن جوزی)

رکھا۔ اس میں لکھتے ہیں:

"علامہ ابن جوزی نے جو مشہور محدث گزرے ہیں، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے حالات میں ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام سیرۃ العمرین رکھا تھا ہم نے یہ کتاب مصر میں کتب خانہ خدیویہ میں دیکھی تھی، جس سے الفاروق کے لیے بہت سے مفید معلومات انتخاب کیے تھے۔ لیکن چونکہ اس وقت عمر بن عبد العزیزؒ کے متعلق کوئی خاص ضرورت پیش نہ تھی (۲۵)، ہم نے دوسرے حصے کو نظر انداز کر دیا تھا۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہے ہندوستان میں اس کتاب کا کوئی نسخہ موجود نہیں۔ اس لحاظ سے بار بار افسوس آتا تھا کہ اب اس گنجینے سے تمتع اٹھانے کی کوئی امید نہیں رہی۔ لیکن ہم یورپ کے فضلا کے ممنون ہیں کہ ان کی بدولت اس نادر اور دل چسپ کتاب کو گو اصلی صورت میں نہیں لیکن اس کے قریب قریب ایک دوسرے قالب میں دیکھ سکے۔"

سلطان صلاح الدین کے زمانے میں اسامہ بن منقذ ایک عرب سپہ سالار تھا جو فوجی قابلیت کے ساتھ علمی مذاق بھی رکھتا تھا۔ اس نے متعدد دل چسپ کتابیں تصنیف کیں، جن میں سے کتاب العصا اور ایک اور کتاب جس میں مصنف نے اپنے زمانے کے دل چسپ اور نادر چشم دید واقعات قلم بند کیے ہیں، یورپ میں چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔ اسی مصنف نے علامہ ابن جوزی کی کتاب مذکورہ بالا میں دوسرا ٹکڑا جو عمر بن عبد العزیز کے متعلق تھا جدا کر کے ایک علاحدہ کتاب کی شکل میں مرتب کیا۔ اس مصنف نے اصل کتاب میں جو کچھ تصرف کیا وہ صرف روایتوں کے اسناد کا حذف کرنا اور مکرر طریق روایت میں ایک انتخاب کر لینا تھا۔

اس کتاب کو یورپ کے ایک فاضل نے جس کا نام ہنری بیکر ہے، ۱۹۰۰ء میں چھاپ کر شائع کیا چوں کہ یہ کتاب نہایت دل چسپ معلومات پر مشتمل ہے، اس لیے ہم اس پر ایک مختصر سا ریویو کرنا مناسب سمجھتے ہیں (۲۶)۔ آگے چل کر لکھتے ہیں:

"سوانح نویسی کے فرائض میں سے بڑا فرض مصنف سے رہ گیا ہے، وہ تنقید ہے یعنی مصنف نے اپنے ہیرو کی صرف خوبیاں دکھائی ہیں، اس کے کسی قول و فعل پر کسی قسم کی نکتہ چینی نہیں کی ہے۔ لیکن یہ اس زمانے کے تمام سوانح نگاروں کا انداز ہے۔ مورخین اسلام نے جو کتابیں عام فن تاریخ یا رجال پر لکھی ہیں ان میں محاسن و معائب میں سے ہر واقعے کا استقصا کیا ہے، لیکن خاص خاص اشخاص اور خصوصاً مقتدایان مذہب کے حالات میں جو کتابیں لکھی ہیں، ان میں معائب کو قلم

اندازکردیا ہے - امام رازی نے امام شافعی کی جو سوانح عمری لکھی ہے اس میں البتہ امام شافعی پر ہر قسم کے اعتراضات بھی نقل کیے ہیں، لیکن بیان واقعہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ جواب دینے کی غرض سے (۲۷)۔"

مولانا کی نگاہ سے مشہور مصنفین کہاں چھپے رہ سکتے تھے پھر پاک وہند کے مصنفین کا تو ان پر حق تھا، اس فرض کو بھی انھوں نے بڑی حد تک پورا کرنے کی کوشش کی۔ لہذا مولوی غلام آزاد بلگرامی پر بھی مضمون لکھا۔ اس مضمون میں انھوں نے ان کے خاندانی اور ذاتی حالات اور تصانیف کا ذکر کیا ہے۔ یہ مضمون الندوہ، اپریل ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا۔ اس کو اس طرح شروع کرتے ہیں:

"دلی اور لکھنؤ میں جو مساویانہ رقابت قائم کردی گئی ہے وہ اور کسی اعتبار سے صحیح ہو یا نہ ہو، لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ایک خاص بات میں (اور یہ کوئی معمولی بات نہیں) لکھنؤ ہندوستان کے تمام شہروں سے ممتاز رہا ہے، وہ یہ کہ اس کے اطراف وجوانب میں جو مردم خیز بستیاں ہیں انھوں نے جس درجے کے علماو فضلا پیدا کیے، دلی ایک طرف کل ہندوستان نے اس پائے کے اہل کمال پیدا نہیں کیے - ملا قطب الدین شہید، ملا نظام الدین بحر العلوم، حمد اللہ (۲۸)، ملا حسن، ملا کمال، قاضی مبارک جو آسمان علم کے ثوابت و سیارے ہیں، انھیں بستیوں کی خاک سے اٹھے تھے - سہالی، گوپامئو، نیوتنی، موہان گو خود عالم شہرت میں روشناس نہیں، لیکن انھوں نے جو علمی جواہر پیدا کیے، آج تمام ہندوستان ان کے نام سے گونج رہا ہے - انہی مردم خیز بستوں میں ایک بلگرام بھی ہے جو آج بھی علمی حیثیت سے ایک خاص امتیاز رکھتا ہے - مولوی غلام علی آزاد، جن کا حال ہم لکھنا چاہتے ہیں، یہیں کے رہنے والے تھے (۲۹)۔"

مولانا شاعر تھے اور عربی کے متنبی بلکہ متنبی حضرات کی تربیت کرنے والے، اس لیے اگر عربی شاعری سے متاثر نہ ہوتے تو تعجب کی بات تھی - عربی شاعری پر لکھنا مولانا اپنا حق سمجھتے - اس میں بعض خوبیاں ایسی ہیں جو ہر شاعر کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں - مگر لوگوں میں عربی کا ذوق کم سے کم ہوتا جارہا تھا، اس لیے مولانا نے عربی شاعری پر مقالہ لکھنے ہی پر اکتفا کی اور یہ شعر العجم سے پہلے لکھا۔ گویا اس کی قدامت کو مقدم رکھا اس مقالے میں بھی شعر العرب نہ لکھنے کے اسباب بیان کیے ہیں۔ (شعر العجم کے بعد ممکن ہے مولانا شعر العرب اور شعر الہند لکھتے، مگر مہلت نہ ملی - پھر بھی شعر الہند کے لیے مولوی عبدالسلام ندوی مرحوم اور شعر العرب کے لیے مولوی خواجہ

عبد الواجد ندوی کان پوری مدظلہ (۳۰) کو توجہ دلائی تھی۔ شعرالہند تو لکھ لی گئی مگر شعرالعرب مولانا کان پوری کی معاشی مصروفیات کی وجہ سے نہ لکھی جا سکی)۔ مولانا نے اپنے مقالے کا عنوان شعرالعرب رکھا ہے اور یہ الندوہ، جون ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کو اس طرح شروع کرتے ہیں:

"رجحان طبع کی اور بات ہے ورنہ یہ ظاہر ہے کہ اقتضائے حالات کے لحاظ سے مجھ کو شعرالعجم سے پہلے شعرالعرب لکھنا چاہیے تھا، بلکہ سچ یہ ہے کہ قومی ضروریات کی فہرست میں شعرالعجم کا نام سیکڑوں نمبروں کے بعد آنے کی چیز ہے، لیکن کیا کیا جائے شعرالعرب لکھتا تو سمجھنے والے کہاں سے آتے؟ مدرسوں میں فن ادب کا مذاق نہیں اور کالج والے عربی خود نہیں پڑھتے بلکہ یہ لقمہ زبردستی ان کے منہ میں ڈالا جاتا ہے، جس کو امتحان کے بعد وہ اگل دیتے ہیں۔

یہ سب کچھ سہی لیکن یہ کانٹا مرتے دم تک دل سے نہیں نکل سکتا، بلکہ عربی شاعری اس قدر وسیع، پر اثر اور قومی جذبات سے لبریز اور اس کے متعلق ہماری زبان میں ایک حرف بھی نہیں زیادہ افسوس یہ کہ شعرالعرب کے لیے کچھ بہت زیادہ کدو کاوش کی ضرورت نہیں، کسی قدیم تصنیف کو سامنے رکھ لیا جائے اور انہی عنوانوں کو کچھ پھیلا کر کچھ نئے مذاق کا رنگ چڑھا کر لکھ دیا جائے تو اچھی خاصی تالیف ہو جائے گی اس قسم کی قدیم تصنیفوں میں سب سے بہتر اور سب سے جامع ابن رشیق قیروانی کی کتاب العمدہ ہے۔ اس کا نسخہ ہندوستان میں موجود نہ تھا۔ مدت ہوئی میں نے یہ صرف کثیر مصر کے کتب خانہ سے لکھوا کر منگوایا تھا لیکن وہ ایک دوست کی نذر ہوا اور شاید ایشیا سے یورپ پہنچ گیا۔

اتفاق سے اب کی ڈاک سے جو مصری کتابیں آئیں ان میں کتاب العمدہ کا بھی ایک نسخہ تھا یار گم گشتہ کے ملنے سے جو خوشی ہوئی اس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ شعرالعرب کی یاد پھر تازہ ہو گئی۔ کتاب تو جب لکھی جائے گی لکھی جائے گی، لیکن سردست اس کتاب کا ریویو لکھتا ہوں جس سے شعرالعرب کی داغ بیل پڑ جائے گی اس پر کبھی عمارت بھی بن جائے گی اور میں اس کام کو نہ کر سکوں گا تو کوئی اور خدا کا بندہ پیدا ہو جائے گا۔

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند (۳۱)۔"

مولانا کے عربی شاعری کے ذوق کا پتا اس واقعے سے بھی چلتا ہے جو ڈپٹی عبدالمجید صاحب مرحوم (۳۲) نے مجھ سے بیان فرمایا۔ انھوں نے فرمایا کہ:

"میں اور چند کیننگ کالج (۳۳) کے طلبہ ایک شام کو مولانا (شبلی) کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک صاحب سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسٹاف کے گھبرائے ہوئے آئے اور کہا کہ "مستشرقین کے بعض اعتراضاف ایسے ہیں جن کا ہمارے پاس جواب نہیں۔" مولانا نے دریافت کیا، مثلاً؟ انھوں نے کہا کہ چند الفاظ ہیں جن کے لغوی معنی لکھے گئے ہیں اور وہ قرآن مجید کے معنوں سے مختلف ہیں، لہٰذا ان کا اعتراض یہ ہے کہ قرآن مجید میں جب الفاظ کے معنی مختلف ہیں تو اس کو زبان کے لحاظ سے مستند نہیں مانا جاسکتا ان الفاظ میں ایک لفظ فرقان تھا (۳۴) - مولانا، ندوہ کے عربی ادب کے استاد سے مخاطب ہوئے اور دریافت کیا، آپ کے پاس کیا جواب ہے؟ انھوں نے کہا کہ میں کتابیں وغیرہ دیکھ کر جواب دوں گا۔ اس پر مولانا نے کہا کہ یہ انگریزی تعلیم یافتہ آپ کے سامنے بیٹھے ہیں۔ ان کے سامنے ابھی جواب دینا چاہیے ورنہ یہ لوگ دین سے مشکوک ہو جائیں گے۔ اس کے بعد یہ فرمایا کہ ہر زبان میں لغت وغیرہ بعد کو مدون ہوتی ہیں، اس لیے لغت تو سند نہیں ہو سکتی۔ اس زمانے کے علم و ادب کے ماہرین سند ہو سکتے ہیں، لہٰذا ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ انھوں نے ان الفاظ کو کن کن معنوں میں استعمال کیا ہے۔ یہ کہہ کر ہر لفظ کی سند میں شعرائے جاہلیت عرب کے بکثرت اشعار سنائے اور فرمایا کہ جن معنوں میں ان الفاظ کو شعرا نے لیا ہے، بالکل وہی معنی قرآن مجید نے بھی لیے ہیں۔ اس طرح معترضین کا جواب مل جاتا ہے (۳۵)۔"

عربی شاعری کے ساتھ ساتھ مولانا کو عرب شعرا سے بھی تعلق تھا، لہٰذا انھوں نے الندوہ جون ۱۹۰۵ء میں متنبی شاعر پر ایک مقالہ لکھا جس کا عنوان متنبی رکھا۔ اس میں لکھتے ہیں:

"الندوہ میں ہم نے اخلاق عرب کے عنوان سے ایک سلسلہ شروع کیا تھا، جس کا صرف ایک نمبر نکل کر رہ گیا۔ آئندہ وہ سلسلہ پھر شروع ہوگا، لیکن اس مضمون میں بھی اس عنوان کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

متنبی اگرچہ چوتھی صدی کا شاعر ہے جبکہ شعرائے عرب کے تمام اوصاف لٹ چکے تھے اور جبکہ شاعری صرف بھٹئی اور گداگری رہ گئی تھی، تاہم چوں کہ متنبی کا بچپن صحرائے عرب اور بدویوں میں گزرا تھا اس لیے عرب کے بہت سے شریفانہ اخلاق اس میں نظر آتے ہیں۔ متنبی کا کلام درس میں داخل ہے لیکن درس کا طریقہ ایسا ہے جس سے طلبہ میں، بجز اس کے کہ اشعار کے معمولی معنی یاد کر لیں، کسی قسم کی استعداد پیدا نہیں ہوتی۔ اس کا یہ نتیجہ ہے کہ اگر یہ پوچھا جائے کہ متنبی کا خاص انداز کیا ہے؟ اس کے ہمعصر شعرا سے اس کو کیا نسبت ہے؟ اس کی شاعری میں کیا

عیوب اور محاسن ہیں تو طلبہ ایک طرف اکثر علما بھی اس کے جواب سے قاصر رہیں گے اس لیے ہم نے اختصار کے ساتھ اس کے کلام پر تنقید بھی کی ہے اور یہ حصہ طلبہ اور علما کے خاص ملاحظہ کے قابل ہے (۳۶)۔"

مولانا نے ستمبر ۱۹۰۵ء کے الندوہ کے شمارے میں ایک مقالہ موبدان مجوس (ہندوستان میں) لکھا۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کا تاریخی سرمایہ جو بہت کچھ مفقود ہو چکا اور ہوتا جارہا ہے، اس نے علاوہ اور بہت سے نقصانات کے سب سے بڑا نقصان یہ پہنچایا کہ خود مذہب اسلام کے متعلق دنیا کو عجیب عجیب غلطیاں اور بدگمانیاں پیدا ہو گئیں اور ہوتی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ اب خود مسلمان بھی ان غلطیوں سے بچ نہیں سکتے وہ بھی مذہب کی حقیقت وہی سمجھتے ہیں جو معلومات کے مفقود ہونے نے کئی سو برس سے قائم کر دی ہے۔

اہل یورپ کا خاصہ ہے کہ وہ ہم زماں واقعہ کو عموماً علت و معلول فرض کر لیتے ہیں۔ مثلاً جب تاریخ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے بعد ایرانیوں کا لٹریچر برباد ہو گیا تو وہ قطعی طور سے فیصلہ کر لیتے ہیں کہ یہ اسلام کے طرز عمل کا نتیجہ تھا۔ اس طرح جب وہ دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کی کسی اسلامی تاریخ میں پارسی قوم کے معابد کا پیشوایان مذہبی کا، تصنیفات کا، تعلیم و تلقین کا پتا نہیں چلتا تو ان کو یقین ہو جاتا ہے کہ سلاطین ہندوستان نے تعصب کی وجہ سے یا تو سرے سے ان کو ملک میں گھسنے نہ دیا یا ایسی حالت میں رکھا کہ ان کی کوئی امتیازی حیثیت قائم نہ رہی جس سے ان کے متعلق کسی قسم کی کوئی اطلاع حاصل ہو سکتی۔

لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ جو کچھ ہے تاریخی کم مائیگی کا تصور ہے۔ ہم اس مضمون میں پارسیوں کے پیشوایان مذہبی (جن کو موبد کہتے ہیں) کا مختصر حال لکھنا چاہتے ہیں جو ہندوستان میں سکونت رکھتے تھے اور جن کی تصنیفات و تالیفات وسعت کے ساتھ اہل علم میں پھیلی ہوئی تھیں اور چوں کہ ان کے یہ حالات اسلامی ہی تصنیفات سے لیے گئے ہیں، اس لیے اس سے یہ بھی ظاہر ہو گا کہ مسلمانوں نے غیر قوموں کے لٹریچر اور تاریخ کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے (۳۷)۔"

مولانا نے الندوہ، اکتوبر ۱۹۰۵ء کے شمارے میں ابن حزم ظاہری کی کتاب الملل والنحل پر ایک مقالہ لکھا جس میں وہ لکھتے ہیں:

"اس کتاب میں مصنف نے فلاسفہ، ملاحدہ، مادیین یہود و نصاری غرض اکثر

اہل مذاہب کے عقائد و خیالات نقل کیے ہیں اور ان کا رد لکھا ہے۔ غیر مذاہب کے رد میں علمائے اسلام کی بہت سی تصنیفات ہیں لیکن اس کتاب میں یہ خصوصیت ہے کہ دوسروں کے عقائد و خیالات کو نہایت تحقیق سے لکھا ہے توراۃ اور انجیل کے محرف ہونے پر جو بحث کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہود و نصاریٰ کی کتابوں پر مجتہدانہ عبور تھا غیر مذاہب کے ابطال کے بعد مصنف نے خود اسلامی عقائد سے بحث کی ہے اور ہر فرقے کے ان مسائل کا رد کیا ہے جو اس کے نزدیک غلط اور باطل ہیں ہم کو صرف اسی حصے سے بحث ہے (۳۸)۔"

مولانا ۱۹۔ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو ندوۃ العلما کا ایک وفد لے کر بھوپال گئے انھوں نے وہاں کے تاثرات کو ایک مضمون " بھوپال میں ندوۃ العلماء کا وفد " اور حضور سرکار عالیہ خلدہا اللہ تعالیٰ کی فیاضی، میں لکھا جو الندوہ، اکتوبر ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا۔ اس میں لکھتے ہیں:

"یہ طے پا چکا تھا کہ اوائل سرما میں ندوۃ العلماء کا وفد (ڈیپوٹیشن) مستقل سرمایے کے جمع کرنے کے لیے اطراف ملک میں روانہ ہو گا۔ چنانچہ ۱۹۔ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو پہلا وفد لکھنو سے روانہ ہوا اور سب سے پہلے اس نے بھوپال کی طرف رخ کیا۔ وفد کا جس طرح استقبال ہوا، جو کارروائیاں ہوئیں، جن کامیابیوں کی امید ہے یہ امور ہم آئندہ لکھ سکیں گے۔ لیکن اس وقت ہم اس کیفیت اور اثر کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں جو ہمارے دل پر حضور سرکار عالیہ کی باریابی اور ان کی ہم کلامی کا شرف حاصل ہونے سے ہوا۔ مجھ کو حکمرانان اسلام میں متعدد رؤسا اور والیان ملک کی خدمت میں حاضر ہونے کا اتفاق ہوا ہے۔ ان سے گفتگو اور ہم کلامی کی بھی نوبت آئی ہے، لیکن میں بغیر کسی قسم کی رواداری اور تملق کے اس کہنے پر مجبور ہوں کہ میں نے اس وقت تک کسی رئیس یا والی، ملک کو اس قدر وسیع المعلومات، خوش تقریر، فصیح اللسان، نکتہ سنج اور دقیقہ رس نہیں دیکھا۔ وہ تقریر فرمارہی تھیں اور میں محو حیرت تھا کہ کیا دہلی اور لکھنو کی سرزمین کے سوا اور کسی ملک کا آدمی بھی ایسی شستہ اور فصیح اردو بولنے پر قادر ہو سکتا ہے (۳۹)۔"

مولوی حمید الدین فراہی کی قابلیت کے مولانا بڑے مداح تھے، مگر یہ بات پسند نہیں کرتے تھے کہ اتنے قابل آدمی کوئی علمی کام نہ کریں اور اپنی سستی کی وجہ سے گمنامی کی زندگی بسر کریں، اس لیے ان کو وقتاً فوقتاً اکساتے رہتے تھے۔ کبھی ناراض ہوتے اور کبھی ان کی ہمت افزائی کرتے۔ جب انھوں نے نظم القرآن پر علمی کام کیا تو مولانا بہت خوش ہوئے اور اس کو شائع کرنے پر زور دیا اور الندوہ کے لیے بار بار طلب کیا۔ مولوی حمید الدین نے جب بھیجا تو مولانا نے اس پر ریویو

کیا اور آخر ۱۹۰۵ء یا شروع ۱۹۰۶ء میں شائع کیا، لیکن ۱۹۰۵ء میں شائع کرنا قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ مولانا نے اس کا عنوان نظم القرآن و جمہرۃ البلاغۃ رکھا ہے۔ اس میں اس طرح لکھتے ہیں:

"عام قیاس یہ ہے کہ صاحبِ کمال کسی حالت میں گمنام نہیں رہ سکتا۔ تجربہ اور تاریخ بھی اس کی شہادت دیتے آئے ہیں۔ لیکن کوئی کلیہ مستثنیٰ سے خالی نہیں۔ مولوی حمید الدین جن کی ایک عجیب و غریب تصنیف کا اس وقت ہم ذکر کرنا چاہتے ہیں، اس استثنا، کی ایک عمدہ مثال ہے۔ مولوی صاحب موصوف نے پہلے قدیم طریقے کے موافق تعلیم پائی، یعنی درس نظامیہ کے مطابق فارغ التحصیل ہوئے، پھر مولانا فیض الحسن صاحب شارح حماسہ سے، جو میرے بھی استاد ہیں، ادب کی تکمیل کی، اس کے بعد انگریزی شروع کی اور مدرسۃ العلوم میں رہ کر بی۔ اے کی سند حاصل کی۔ زمانہ طالب علمی ہی میں سرسید مرحوم کے حکم سے انھوں نے سیرت نبویؐ کے متعلق دو کتابیں عربی سے فارسی میں ترجمہ کیں جو مدرسۃ العلوم کے نصاب دینیات میں شامل ہیں اور چھپ کر شائع ہو چکی ہیں۔ مدرسہ سے نکل کر کراچی کے مدرسۃ الاسلام میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے اور اب تک اسی عہدے پر ہیں۔ ان کا فارسی دیوان چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ لارڈ کرزن جب سواحل عرب کی مہم پر گئے تھے تو یہ بھی ساتھ تھے اور سرداران عرب کے سامنے عربی زبان میں لارڈ کرزن کی طرف سے جو تقریر پڑھی گئی وہ انہی کی لکھی ہوئی تھی۔ اس قسم کے واقعات میں سے ایک واقعہ بھی انسان کی شہرت کے لیے کافی ہو سکتا ہے لیکن مولوی صاحب اب بھی گمنام ہیں۔ ان کی یہی خواہش ہے اور اگر وہ اس خواہش میں ہمیشہ کامیاب رہیں تو ہمارا کوئی ہرج نہیں۔ لیکن ان کی جس تصنیف پر ہم ریویو کرنا چاہتے ہیں اس کے متعلق ہم ان کی خواہش کی پیروی نہیں کر سکتے۔ یہ تصنیف (خصوصاً اس زمانے میں) اسلامی جماعت کے لیے اسی قدر مفید اور ضروری ہے جس قدر ایک تشنہ لب اور سوختہ حال کے لیے آبِ زلال۔ اس لیے ہم اس کتاب پر مفصل ریویو لکھنا چاہتے ہیں۔ افسوس ہے کہ مصنف نے یہ کتاب عربی زبان میں لکھی ہے اور اس لیے عام لوگ اس سے متمتع نہیں ہو سکتے ہم نے ان سے بارہا کہا کہ اس زمانے میں جو کچھ لکھنا چاہیے ملکی زبان میں لکھنا چاہیے، لیکن ان کی قدامت پرستی اردو کی طرف ان کو مائل نہیں ہونے دیتی (اور سچ یہ ہے کہ وہ اردو لکھ بھی نہیں سکتے)۔ عربی ہونے کی وجہ سے ہم ان کی عبارت کے اصلی اقتباسات نہیں دے سکتے، بلکہ اس کے مطالب پر اکتفا کریں گے۔"(۳۰)

حواشی:

۱..... سید علی بلگرامی وغیرہ۔

۲..... تمکین کاظمی لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر سید علی کے جانے کے بعد شبلی بھی پردل ہو گئے اور ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ہی انھوں نے بھی روانگی کا ارادہ کیا، مگر لوگوں نے سمجھا منا کہ روکا چناں چہ مہاراجہ کشن پرشاد اور استاد داغ نے شبلی کو حیدر آباد رہنے کے لیے مجبور کیا۔ ڈاکٹر سید علی بلگرامی یہاں معتمد تعمیرات تھے۔ ذاتی اور شخصی طور پر انھیں سررشتہ علوم و فنون کی نگرانی سپرد کی گئی تھی۔ جب وہ اپنی معتمدی سے سبکدوش ہوئے تو ان کی جگہ مولوی کاظم علی معتمد سررشتہ تعمیرات ہوئے اور علوم و فنون چوں کہ شروع ہی سے معتمد تعمیرات کی نگرانی میں تھا، اس لیے کاظم علی صاحب کی نگرانی میں چلا گیا۔ مولوی کاظم علی صاحب شبلی سے ناواقف تھے، کیوں کہ وہ کوئی علمی ادبی آدمی نہیں تھے، بلکہ فنی بزرگ تھے۔ معلوم نہیں دفتری کارروائیوں میں کیا کیا الجھنیں ہوئیں کہ چند ہی روز کے بعد شبلی کو کاظم علی صاحب سے شکایت پیدا ہو گئی اور وہ استعفے دینے کو تیار ہو گئے۔ اس نوبت پر مہاراجہ کشن پرشاد بہادر بھی خاموش رہے، کیوں کہ وہ کسی طرح الجھنوں کو دور نہ کر سکتے تھے اور استاد داغ بھی حیران رہ گئے۔" (ادب، اکتوبر ۱۹۶۰ء)

۳..... ریاست حیدر آباد کے والی نظام

۴..... مولوی ضیاء الحسن صاحب علوی نے علی گڑھ سے ایم۔اے کیا اور عربی مدارس صوبہ ممالک متحدہ آگرہ اودھ کے انسپکٹر ہو گئے۔ الہ آباد میں انتقال ہوا (۱۹۳۴ء کے لگ بھگ)۔

۵..... مکاتیب دوم صفحہ ۱۳۲، اس مکتوب کا سال ۱۹۰۵ء ہونا چاہیے کیوں کہ مولانا نے ۱۹۰۵ء میں استعفا دیا تھا۔ نیا سال شروع ہونے پر لوگ اکثر پرانا سال گزرا ہوا سال غلطی سے لکھ دیتے ہیں، لہذا ۱۹۰۴ء غلط ہے۔

۶..... مکاتیب اول، صفحہ ۱۰۷، ۱۵۔فروری ۱۹۰۵ء

۷..... مکاتیب دوم صفحہ ۱۸-۱۹، ۱۸۔مارچ ۱۹۰۵ء ۸..... مکاتیب اول، صفحہ ۸-۹، ۱۹۰۹۔مارچ ۱۹۰۵ء

۹..... مکاتیب اول، برحاشیہ، صفحہ ۹

۱۰..... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۰، ۱۵۔اپریل ۱۹۰۵ء، اعظم گڑھ

۱۱..... حیاتِ شبلی صفحہ ۴۱۲

۱۲..... تقویم از مولوی میر احمد علی حیدر آباد دکن۔

۱۳..... حیاتِ شبلی، صفحہ ۴۰۹

۱۴.... حیاتِ شبلی، صفحہ ۲۱۰

۱۵.... مکاتیب اول، صفحہ ۲۰۹

۱۶.... مشہور کتب فروش کمپنی

۱۷.... مکاتیبِ شبلی دوم، صفحہ ۲۰

۱۸.... مکاتیبِ شبلی، دوم، صفحہ ۲۱، ۳- ستمبر ۱۹۰۵ء، لکھنو

۱۹.... مکاتیب دوم، صفحہ ۸۳-۱۸۲، ۷- ستمبر ۱۹۰۵ء

۲۰.... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۱-۲۲، ۱۶-۱ اکتوبر ۱۹۰۵ء، لکھنو

۲۱.... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۳، ۲-نومبر ۱۹۰۵ء، بر مکان ڈائریکٹر تعلیمات بھوپال-

۲۲.... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۰۲، ۲۳-نومبر ۱۹۰۵ء، لکھنو

۲۳.... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۲-۲۷-نومبر ۱۹۰۵ء، لکھنو

۲۴.... مکاتیب دوم، مہدی حسن کے نام، صفحہ ۲۰۲، دسمبر ۱۹۰۵ء

۲۵.... اس لیے کہ الفاروق کے لیے مواد کی تلاش تھی (ہاشمی)

۲۶.... مقالات شبلی، جلد چہارم طبع سوم، صفحہ ۳-۴

۲۷.... مقالات شبلی، جلد چہارم طبع سوم، صفحہ ۵

۲۸.... حمد اللہ سندیلوی

۲۹.... مقالاتِ شبلی، جلد پنجم، طبع دوم، صفحہ ۱۱۲

۳۰.... مولانا عبدالواجد کان پوری نے زبانی گفتگو میں فرمایا (ہاشمی)

۳۱.... مقالاتِ شبلی، جلد دوم، طبع دوم، صفحہ ۲۹-۳۰

۳۲.... مولانا عبدالماجد دریابادی کے بڑے بھائی متوفی ۱۹۶۰ء (مرحوم کے متعلق حکم حافظ عبدالقوی دریا بادی بی اے نے ایک کتاب ذکر مجید لکھی ہے)-

۳۳.... موجودہ لکھنو یونیورسٹی

۳۴.... دوسرے الفاظ ڈپٹی صاحب بھول گئے تھے - مجھے فرقان کے لفظ پر بھی اپنی یادداشت پر شبہ ہو گیا ہے مگر اس نفس واقعہ سے زیادہ تعلق نہیں کوئی لفظ بھی رکھ لیا جائے تو نفس واقعہ پر اثر نہ پڑے گا-

۳۵.... ڈپٹی صاحب مرحوم نے مجھ سے زبانی گفتگو میں فرمایا، ۱۹۵۹ء میں-

۳.... مقالاتِ شبلی، جلد پنجم، طبع دوم، صفحہ ۷۷

۳۷.... مقالاتِ شبلی، جلد پنجم، طبع دوم، صفحہ ۹۲-۹۳

۳۸.... مقالاتِ شبلی، جلد چہارم، طبع سوم، صفحہ ۳۵-۳۶

۳۹.... مقالاتِ شبلی، جلد ہشتم ۱۹۳۸ء، صفحہ ۱۰۶

۴۰.... مقالاتِ شبلی، جلد دوم، طبع دوم ۱۹۵۰ء، صفحہ ۱۳-۱۴

۱۹۰۶ء

ندوے میں ایک انجمن المعین قائم تھی۔ اس کا مقصد تھا کہ فرصت میں طلبہ ملک کا دورہ کرکے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی خوبیوں کو بیان کرتے اور غریب طلبہ کے لیے رؤسا سے امداد حاصل کرتے۔ سید سلیمان ندوی اس کے ناظم تھے اور مولانا دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمد۔ لہٰذا سید سلیمان ندوی نے ضروری سمجھا کہ مولانا سے اس کی کامیابی کے ذرائع پر مشورہ حاصل کریں۔ مولانا نے رائے دی کہ ہر وفد کے ساتھ مقرر ہونا ضروری ہے۔ جو ندوے کی اہمیت واضح طور پر ذہن نشین کر سکے۔ وفد جہاں بھی جائے اسلام پر تقریریں کی جائیں اور اہل علم کے جلسوں میں علم کے کسی مسئلے پر گفتگو کی جائے۔ غرض ندوے کی تعلیم و تربیت کے نمونہ کو اپنے اعمال، افعال اور قابلیت سے پیش کیا جائے اور الندوہ (ندوے کا نقیب) میں یہ اغراض شائع کیے جائیں۔ طلبہ کے انتخاب میں ان کی اسلامی وضع قطع اور احکام شرعیہ کی پابندی مولانا کے نزدیک ضروری تھی اور طلبہ کے یہ نمونے ان کی کامیابی کی دلیل ہو سکتے تھے (۱)۔

آج کل مولانا الہ آباد میں تھے اور لیاقت حسین کوتوال کی کوٹھی میں مقیم تھے۔ دو ماہ کے بعد لرزہ بخار سے نجات پا چکے تھے، لیکن ابھی کمزوری خاصی تھی۔ مہدی حسن کو مولانا نے لکھا کہ اپنا مضمون اردوے معلے، وکیل اخبار، امرتسر یا مخزن، لاہور میں چھپنے کو بھیج دیں۔ مہدی حسن کو ملاقات کے لیے بلایا (۲)۔

اب مولانا لکھنؤ آگئے تھے اور ندوے کے سالانہ جلسے کی تیاری میں منہمک تھے۔ اسی جلسے میں ایک علمی نمائش (۳) بھی کرنا چاہتے تھے۔ جس میں کتب نادرہ اور شاہی فرامین رکھنے کا ارادہ تھا۔ یاقوت مستعصمی کا قرآن مجید جو نادرہ روزگار تھا وہ بھی ہاتھ آگیا تھا اور نمائش میں رکھا جانے والا تھا۔ اس زمانے میں مولانا اپنی علالت کی وجہ سے تین ماہ سے کوئی مضمون نہ لکھ سکے تھے۔ آخری مضمون بھوپال کے قیام کے درمیان لکھا تھا، جو ان کے نزدیک اور مہدی حسن کے نزدیک مختصر تھا۔ مگر الندوہ کی قیمت کم ہونے کے باوجود پانچ سو خریدار ابھی نہ مل سکے تھے (۴)۔

مولانا علالت اور کمزوری کے بعد اب پھر کچھ علمی کام کرنے لگے تھے۔ لیکن ندوے کا سالانہ اجلاس قریب آجانے سے یکسوئی نہ تھی۔ تقریظ مثنوی (بسلسلہ۔ سوانح مولانا روم) بہت کچھ

چھپ گئی تھی لیکن موازنہ انیس و دبیر جو حیدر آباد (دکن) کے قیام میں لکھی تھی، اس کے چھپنے کی نوبت نہ آئی۔ مسودہ کو مرتب کرنا تھا اور مولانا کو ندوہ کے سالانہ جلسے اور علمی نمائش کی وجہ سے بالکل وقت نہیں مل رہا تھا۔ بیضہ بھی حیدر آباد میں ہی تھا اور اس کے ملنے کی امید نہ تھی جو اس کو نظر ثانی کر کے چھپواتے۔ مہدی حسن نے مولانا ابوالکلام آزاد کے مضمون کو الندوہ میں پڑھ کر استفسار کیا کہ کون ہیں، تو مولانا نے آزاد کے متعلق لکھا کہ وہ پہلے مخزن لاہور میں لکھتے تھے۔ لیکن اب ان کی معلومات میں خاصا اضافہ ہو چکا تھا۔ مہدی حسن نے خیام کی سوانح لکھنے پر توجہ دلائی تو لکھا کہ شعر العجم کی وجہ سے خیام کی سوانح لکھنا ممکن نہ تھا۔ گویا شعر العجم جو ان کے ذہن میں عرصے سے جگر نگاری تھی ان اس کی ابتدا کر چکے تھے اور اس میں اپنے فارسی ذوق کو پیش کرنے میں ہمہ تن لگے ہوئے تھے۔ اسی زمانے میں حامد نعمانی کا نائب تحصیلداری کی جگہ پر تقرر ہو گیا۔ مولانا اس تقرر سے بہت مسرور ہوئے۔ اسی زمانے میں مہدی حسن کے یہاں بچے کی ولادت ہوئی تو اس پر مبارک باد دی۔ مولانا نے اپنا دیوان تحفہ کے طور پر ارسال کیا (۵)۔

ریاض حسن خان کی والدہ محترمہ کا انتقال ہوا تو مولانا کو اپنی والدہ مرحومہ یاد آ گئی جن کا انتقال مولانا کی جوانی میں ہوا تھا۔ مولانا کو ان لوگوں کو دیکھ کر بڑی مسرت ہوتی تھی جن کے والدین زندہ تھے (۶)۔

مولانا چاہتے تھے کہ ان کے ماموں زاد بھائی شیخ رشید الدین انصاری ندوے کی طرف سے علمی نمائش منعقدہ ۱۴۔ اپریل ۱۹۰۶ء کا انتظام کرتے اور شاہی فرامین وغیرہ کے فوٹو لیے جانے کی ذمہ داری بھی سنبھال لیتے کیوں کہ وہ اس کام کو بخوبی انجام دے سکتے تھے۔ لہذا مولانا نے ان سے استفسار کیا کہ کیا آیا وہ آ سکتے تھے (۷)؟

ریاض حسن خاں صاحب نے مولانا کو اپنی رباعیاں بھیج دیں تو مولانا نے ان کی تعریف کی مگر موقع استعمال کو صحیح قرار نہیں دیا اور اپنی شاعری کے متعلق لکھا کہ عطائی ہے اور اس میں کبھی اشتغال نہیں رہا اور برسوں کچھ کہنے کا اتفاق نہیں ہوتا۔ ارادہ تھا کہ ندوے کے سالانہ جلسے منعقدہ ۱۴۔ اپریل ۱۹۰۶ء میں فارسی (نظم) کی پوری تاریخ ابتدا سے اس وقت تک کا کلام ترتیب زمانہ کے لحاظ سے جمع کیا جاتا۔ نادر الوجود دواوین بھی بہم پہنچائے گئے تھے۔ مولانا چاہتے تھے کہ ان کے احباب، اعزا اور اہل علم زیادہ سے زیادہ اس جلسے میں شرکت اور نمائش دیکھتے۔ چناں چہ ریاض حسن خان کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دی (۸)۔

مولانا ۱۱۔ اپریل کو بنارس میں تھے اور چاہتے تھے کہ مہدی حسن جیسے قدر شناس بھی جلسے میں شرکت کریں۔ چناں چہ ان کو فوراً بلایا اور ان کی تشریف آوری کو اپنے اوپر عنایت کا سبب قرار دیا (۹)۔

اس زمانے میں مولانا کو ایک اچھا کاتب کم اجرت پر مل گیا تھا، اس لیے انھوں نے مولوی حمید الدین کو لکھا کہ اپنے بلاغت کے مقالے کے وہ اجزا بھیج دیں جن کا تعلق حقائق قرآنی سے تھا۔ ویسے بھی مولانا کو اس کی ضرورت تھی۔ ۱۴۔ اپریل کو ندوے کا سالانہ جلسہ تھا۔ اسی دوران مولانا کو صائب کی بیاض مل گئی تھی اس لیے وہ بہت مسرور تھے۔ مولوی حمید الدین کو بھی شعر العجم لکھنے کی اطلاع دی (۱۰)۔

۱۶۔ اپریل ۱۹۰۶ء (۱۱) تک جلسہ ہوا۔ جلسہ بڑا کامیاب رہا۔ تقریباً دس ہزار روپیہ کا مستقل مد میں چندہ ہوا۔ مہدی حسن نے کچھ رقم بھیجنے کا وعدہ کیا تھا جو اب تک نہیں ملی تھی۔ لہذا مولانا نے اس رقم کے لیے یاد دہانی کی۔ باوجود مولانا کی خواہش کے مہدی حسن اس جلسے میں شرکت نہ کر سکے (۱۲)۔

مولانا چاہتے تھے کہ سید سلیمان ندوی اور جواد علی خان عالی (۱۳) جلسے سے دو دن پہلے بنارس پہنچ جاتے تاکہ انتظام میں ان کی مدد ملتی۔ مولانا ابوالکلام آزاد اس زمانے میں ندوے میں مقیم تھے اور الندوہ کے اڈیٹر تھے۔ ان کی کتابیں بھی وہیں رکھی تھیں۔ مولانا نے سید سلیمان ندوی کو ہدایت کی کہ ان کی کتابیں دار الاخبار میں رکھوا دی جائیں۔ مولوی حفیظ اللہ صاحب جو اس زمانے میں ندوے کے پرنسپل تھے، مولانا نے ان کو بھی جلسے میں شرکت کے لیے بلایا اور دوسرے مدرسین کو بھی، مگر ندوے سے کرایہ ملنے کی امید نہ تھی۔ مولانا کی ایک کتاب مکرارت قرآن از علامہ کرمانی شارح بخاری جس کا موضوع قرآن مجید کی ہم معنی و مکرر آیتوں کی تکرار کی تاویل ہے، وہ مولوی عبدالحی صاحب کے پاس تھی، اس کو مولانا نے طلب کیا۔ قاسم فرشتہ (صاحب تاریخ فرشتہ) کی کتاب اختیارات قاسمی جو ہندی طریقہ طب پر تصنیف تھی، مولانا کو بنارس میں اس کی بھی ضرورت تھی، لہذا اس کو بھی منگوایا (۱۴)۔

ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس میں جو نمائش ہوئی اس میں فرامین شاہی اور قطعات وغیرہ کے فوٹو لے لیے گئے تھے اور ان کی متعدد کاپیاں کرالی گئی تھیں۔ مولانا نے چاہا کہ ان کی عام اشاعت ہو، لہذا انھوں نے فرامین شاہی وغیرہ کی تفصیل اور قیمت وغیرہ لکھ کر اڈیٹر جرائد اسلامیہ

کو بھیجا اور لکھا کہ اگر خریدنا مقصود ہو تو سیکریٹری تعلیم ندوۃ العلماء لکھنو (مولانا) کے نام درخواست بھجوانا چاہیے۔ فرامین اور قطعات کی فہرست اسی طرح ہے:

فرمان ہمایوں شاہ جو ہندو گوشائیں کو جاگیر کے متعلق عطا ہوا تھا (۲) فرمان اکبر شاہ (۳)، فرمان عالمگیر (۴)، قطعہ نوشتہ خاص شہزادہ داراشکوہ (۵)، قطعہ نوشتہ آغا رشید دلی خوش نویسی خاص شاہجہان (۶)، سند منصب قضا کتابوں کے دو صندوق بنارس سے اس ہدایت کے ساتھ مولانا نے بھیجے کہ سید سلیمان ندوی، مولانا کی اور ندوے کی کتابیں الگ الگ رکھوائیں۔ نواب علی حسن خاں کی کتابیں بھی مولانا کی کتابوں کے ساتھ ہی رکھنے کی ہدایت کی۔ ایک قرآن مجید حکیم مرزا مہدی کا تھا جس کا صرف پہلا صفحہ طلائی تھا، اس کو ان تک پہنچانے کے لئے لکھا۔

مولانا کا ابھی بنارس میں کچھ دن قیام کا ارادہ تھا۔ سید سلیمان ندوی کو ہدایت کی کہ انگریزی پر زیادہ توجہ کریں۔ بنارس سے واپسی کے بعد مولانا کا ارادہ تھا کہ سید سلیمان ندوی وغیرہ کو تفسیر کا درس دیں، چناں چہ واپسی کے بعد درس دیا۔ درس کا موضوع قرآن بحیثیت بلاغت و کلام تھا۔ مولانا کا ارادہ نمائش کی رپورٹ تیار کرنے کا تھا۔ اس زمانے میں مولوی شبلی متکلم کے نام کے خطوط غلطی سے مولانا کے پاس پہنچ گئے، جس سے مولانا کو پریشانی رہی (۱۵)۔

مولانا چوں کہ نمائش کی رپورٹ تیار کر رہے تھے اس لیے مندرجہ ذیل چیزیں ندوہ سے منگوائی۔ ابوریحان بیرونی کی جغرافیہ ریاضیہ پر تصنیف جس کو اس نے سلطان مسعود غزنوی کے نام سے لکھا تھا۔ اس پر دس بارہ سطروں میں ایک شخص کا قول لکھا ہوا تھا، جو حرکت ارض کا قائل تھا۔ اس عبارت کی نقل منگوائی۔ قدرت اللہ قدرت کا تذکرہ اور ایک اور تذکرہ جو نادر تھا ان کو بھی طلب کیا۔ نمائش کی کتابوں کے ٹکٹ پر جن کتابوں کا حال درج تھا اور ایک اور کتاب جس کے پشتہ پر اوپنشد لکھا ہوا تھا۔ یہ داراشکوہ کی فارسی تصنیف تھی۔ اس کا اقتباس نقل کرا کے منگوایا (۱۶)۔

سید سلیمان ندوی اب ندوہ کے آخری درجے میں زیر تعلیم تھے۔ مولانا نے ان کو جوہر قابل سمجھ کر الندوہ کا کام ان کے ذمہ کر دیا تھا۔ لہذا مولانا چاہتے تھے کہ سید صاحب اپنے نام کے ساتھ ندوہ کا تعلق بھی الندوہ میں لکھا کریں۔ مولانا نے نمائش کی تیاری، جلسے کے انتظام اور رپورٹ کی تیاری میں اس قدر محنت کی کہ بخار آنے لگا اور جو مضمون (۱۷) شروع کیا تھا وہ بھی ادھورا رہ گیا۔ مولانا نے سید صاحب کو ہدایت کی کہ فرامین کے فوٹو سید برادرز کمپنی بنارس سے

منگوالیں اور الندوہ میں الکلام کا اشتہار دیں۔ انھوں نے ایک مضمون ترجمہ، رسالہ اسلام الندوہ کے رجب کے شمارے میں شائع کرنے کو لکھا۔ اداریے میں بھی اس بات کو شامل کرنے کا لکھا کہ مدراس والوں نے سالانہ جلسہ، کانفرنس میں انگریزی زبان کو عربی مدرسہ میں لازمی قرار دینے کا اعلان کیا اور یہ ندوے کے اثر سے کیا گیا اور دوسری چیز ایک انگریز (۱۸) کا مسلمان ہونا اور ندوے میں عربی تعلیم کی زبان حاصل کرنا اور ندوے سے اس کی کفالت کا ہونا اشاعتِ اسلام کی غرض سے کیا گیا (۱۹)۔

مولانا کو فکر تھی کہ الندوہ میں سالانہ جلسے کی کچھ کارروائی چھپ جاتی تو لوگوں کو ندوہ کی خدمات کا پتا چلتا۔ لہٰذا سید سلیمان ندوی کو لکھا کہ انھوں نے مولوی عبدالحی (۲۰) کو مختصر تمہید بھیجی تا کہ چھپ جائے۔ اس سے قبل مولوی عبدالحی صاحب کو لکھا تھا کہ کارروائی وغیرہ اخبارات کو اشاعت کے لیے دے دی جائیں، لیکن ان کی طرف سے جواب نہ موصول ہونے کی وجہ سے سید صاحب کو ہدایت کی کہ اخبارات میں شائع کرائیں۔ سید صاحب اردو تذکروں کا سنہ لکھنا بھول گئے تھے، لہٰذا اب لکھ کر منگوایا۔ منشی احمد علی کی کتابوں کو واپس کرنے کا لکھا اور یہ بھی کہ خمسہ، نظامی جو مطلا اور بہت خوشخط تھا ابھی واپس نہ کیا جائے (۲۱)۔

مولانا مصروفیات کی وجہ سے اتنا تھک گئے تھے کہ مہینے دو مہینے سستانا چاہتے تھے۔ اس لیے ابھی لکھنو آنے کا ارادہ نہ تھا۔ بنارس میں ایک بنگلہ کرایے پر لے لیا تھا اور لوگوں کو پتا نہیں دیا، کیوں کہ علمی کاموں اور ان کے آرام میں مخل ہوتے۔ ممکن ہے یہ قیام صبح بنارس سے لطف اندوز ہونے کی وجہ سے بھی ہو کیوں کہ شام اودھ کا لطف لکھنو میں حاصل تھا اور شعرالعجم کے لیے ایک باذوق شاعر کی وجدانی کیفیت کی ضرورت تھی۔ صبح بنارس کا لطف اٹھانے کے بعد کنار آب چوپاٹی کی منزل تھی جو اس کے بعد آئی۔

نمائش کی رپورٹ لکھ کر ندوہ بھیج دی مگر مفصل نہ لکھ سکنے کا افسوس رہا اور مجمل ہونے کی وجہ کتابوں کی غیر موجودگی تھی، اس لیے کہ وہ پہلے ہی واپس بھیجی جا چکی تھیں۔ اس زمانے میں سید سلیمان ندوی سیرتِ عائشہؓ لکھنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ لہٰذا مولانا سے کتابوں کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے طبقات ابن سعد اور اسد الغابہ کے متعلق لکھا کہ وہ ناکافی تھیں۔ مسانید اور کتبِ حدیث کی چھان بین کی ضرورت تھی لیکن مناسب یہی تھا کہ ابھی کوئی علمی اور تحقیقی کام نہ چھیڑا جاتا، ورنہ تعلیم کی تکمیل میں حرج ہونے کا اندیشہ تھا۔ ندوے میں کتب خانہ کے کھلنے اور

مدرسے کی پڑھائی میں حرج ہونے کا اندیشہ تھا، اس لیے کتب خانے کا وقت ۳ بجے سہ پہر سے ۶ بجے شام تک کھلنے کی رائے دی اور مہتمم کے لیے ہدایت کی کہ وہ مولانا کی رائے کے مطابق حکم دے دیں (۲۲)۔

مولانا بنارس میں تھے مگر نادر کتابوں کی حفاظت اور الندوہ کے معیاری نکالنے کی فکر دامن گیر تھی اور سید سلیمان ندوی کو اس سلسلے میں برابر ہدایتیں دیتے رہتے تھے۔ چناں چہ ان کو لکھا کہ صندوقوں میں قطعات اور وصلیاں بھی تھیں، ان کو احتیاط سے رکھنے کی ضرورت تھی۔ نیز دیوان آملی طلائی اور دارا شکوہ کے اپنشد کی حفاظت نہایت ضروری تھی (۲۳)۔

مہدی حسن نے مولانا سے وان کریمر کے متعلق دریافت کیا تو مولانا نے اس کو مستند قرار دیا، مگر اس کی عربی دانی کے متعلق اپنی لاعلمی ظاہر کی۔ اس کی کتاب کے مترجم نے مولانا کو خط لکھا تو ان کو خیال ہوا کہ مہدی حسن اگر اس کے مقتبس مقامات کا ترجمہ کرتے تو مولانا اس کو الندوہ میں اپنے نوٹ کے ساتھ شائع کر دیتے۔ اب کی الندوہ کے شائع ہونے میں دیر ہونے کی وجہ مولانا کی کوتاہی نہ تھی۔ انھوں نے تو بنارس سے وقت پر مواد بھیج دیا تھا مگر عبدالعلی آسی مدراسی رحمت اللہ رعد کے مطبع میں چھپنے کو بھیجا، انھوں نے غیر معمولی دیر کی۔ مولانا کو ان کے متعلق پہلے ہی تلخ تجربہ تھا۔ اسی زمانے میں حامد نعمانی کا اکلوتا بچہ بیمار ہو گیا۔ مولانا پریشان ہو کر بھاگم بھاگ غازی پور پہنچے۔ وہاں سے ندوہ کی ضرورتوں کی وجہ سے ۱۰۔ مئی ۱۹۰۶ء کو لکھنو آئے اور دوبارہ جانے کا ارادہ تھا (۲۴)۔

۲۵۔ مئی تک الندوہ کا شمارہ نہ چھپ سکا مولانا تاکید کر رہے تھے، مگر اب امید ہو چلی تھی کہ اسی مہینے میں شائع ہو جاتا۔ دوسرے شمارے کا بھی سارا مواد مطبع میں بھیجا جا چکا تھا۔ ندوے کی بدولت الندوہ اور الندوہ کی بدولت ندوے کو نقصان پہنچ رہا تھا اور مولانا کا کوئی ہاتھ بٹانے والا نہیں تھا۔ مولانا اپنی ہمت سے علمی کام کیے جا رہے تھے ورنہ روز بروز گھلتے جا رہے تھے، جس کی کوئی خاص وجہ نہ تھی (۲۵)۔

مولانا ندوے کے کارکنوں سے مطمئن نہ تھے، لیکن اس کے باوجود کام کی نوعیت کے لحاظ سے مذہبی امیدیں اس سے وابستہ سمجھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ آج نہیں تو کل ندوے کے کارکن اس کی اہمیت کو سمجھیں گے اور ندوے کے فارغ التحصیل طلبہ اپنے علمی اور تحقیقی معلومات اور خدمات سے لوگوں سے اپنا لوہا منوا لیں گے۔ مولانا یہ بھی جانتے تھے کہ ندوے کا

ایک سالانہ جلسہ حیدر آباد (دکن) میں بھی ہو، تاکہ حیدر آباد سے ندوہ کو امداد بھی ملے اور سرپرستی ہو۔ چوں کہ ندوہ کی آواز پر سب سے پہلے بھوپال نے لبیک کہا تھا، اس لیے اس کا حق مقدم جانتے تھے اور اس بات کا اظہار انھوں نے اکثر موقعوں پر کیا ہے۔ مولانا نے حیدر آباد میں ندوے کے جلسے کے متعلق بعض علماء سے خط و کتابت کی اور یہ چاہتے تھے کہ نواب مدار المہام بہادر یا ظفر جنگ بہادر جلسے کی صدارت قبول کر لیتے تو ممکن ہو سکتا تھا۔ مولانا کے تو دل سے لگی ہوئی تھی، لہٰذا املا صاحب کو لکھا کہ وہ سرپرستی قبول کر لیں اور اطلاع دیں (۲۶)۔

۴۔ اگست کو فلارنس ہاؤس اپالو بندر۔ بمبئی میں مولانا مقیم تھے۔ یہیں مہدی حسن کا بھیجا ہوا ان کریمر کی کتاب کا ترجمہ ملا، جس کو پڑھ کر بڑی مایوسی ہوئی، کیوں کہ اس کی تحریر میں بھی وہی تیر تھے جو پادریوں کے ترکش میں اسلام کے خلاف ملتے تھے۔ اگرچہ الندوہ میں اس کا شائع کرنا خلاف مصلحت تھا پھر بھی مولانا کا ارادہ اس کے شائع کرنے کا تھا۔ مولانا جب نومبر ۱۹۰۵ء میں بھوپال گئے تھے، تب ہی ندوہ کی خاطر بمبئی جانے کا ارادہ تھا، مگر بعض وجوہ کی بنا پر اس ارادے کی تکمیل نہ ہو سکی تھی۔ مولانا کو اب موقع ملا اور بمبئی پہنچ گئے۔ ۲۔ اگست ۱۹۰۶ء کو بمبئی میں تھے۔ یہاں سے الندوہ کے آئندہ شمارے کے لیے ترتیب لکھ کر بھیجی اور سید سلیمان ندوی کو ہدایت کی کہ اگر کمی پڑے تو کوئی اور مضمون لکھ لیا جائے۔ الندوہ میں مولانا کا مقالہ ابن رشد پر نکل رہا تھا، اس کا بقایا بھی ارسال کیا۔ بمبئی کے خوشگوار موسم سے مولانا اس قدر متاثر تھے کہ اگر وہاں کے اخراجات برداشت کرنے کی ہمت ہوتی تو وہیں رہ پڑتے۔ ندوے کو متعارف کرنے کے لیے مولانا کسی واعظ کی ضرورت محسوس کر رہے تھے، خود اپنے کو اس قابل نہ سمجھتے تھے۔ شاہ سلیمان اچھے واعظ تھے مگر بمبئی کے لوگ ان سے خوش نہ تھے۔ اب ندوے میں قرآن مجید کا درس مولوی حفیظ اللہ دے رہے تھے۔ مولانا چاہتے تھے کہ درس قرآن تحقیق کے ساتھ ہو ورنہ سرسری بے کار تھا (۲۷)۔

اس موضوع پر ایک پادری نے ایک مستقل کتاب لکھی تھی جس میں یہ بتلایا تھا کہ قرآن مجید کن کن کتابوں اور افسانوں سے ماخوذ ہے اور اس کتاب کا ترجمہ مختلف زبانوں میں شائع کرایا تھا، تاکہ مسلمانوں کو اپنے مذہب سے بیزاری پیدا ہو اور اسلام کی بدنامی ہو۔ اردو اور فارسی میں بھی ہندوستان اور ایران کو گمراہ کرنے کے لیے ترجمہ کرایا گیا تھا اور اس کا نام ینابیع الاسلام رکھا گیا تھا (۲۸)۔

مولوی حمید الدین نے والشمس کی تفسیر لکھ کر بھیجی تو مولانا کو اس میں مولوی حمید الدین کی وہم پرستی کا دخل معلوم ہوا، مگر مولانا نے اس پر تعرض نہ کیا۔ مولانا چاہتے تھے کہ مولوی حمید الدین اپنی تفسیر کے سلسلے میں ابن القیم کی کتاب اقسام القرآن اور کتاب فی القضاء والقدر بھی دیکھ لیتے تاکہ ان کو تفسیر لکھنے میں سہولت ہوتی۔ ان دونوں کتابوں کو بمبئی سے منگوانے کے لیے لکھا۔ اب مولانا نے سوانح مولانا روم تیار کر لی تھی اور اس کو چھپوانے کا ارادہ تھا۔ حامد نعمانی دیوگام سے جون پور کی کسی تحصیل میں نائب تحصیل داری کے عہدے پر تبادلہ ہو کر چلے گئے تھے (۲۹)۔

مولوی حمید الدین نے سورہ۔ قیامت کی تفسیر لکھ کر بھیجی تو مولانا کو "لا" کے متعلق تعرض ہوا، کیوں کہ مولانا کا خیال تھا کہ یہ محاورہ عام تھا مگر عام مفسرین اس "لا" کو ہمیشہ زائد لکھتے ہیں، یعنی اس کا معنی میں دخل نہیں سمجھتے تھے۔ مگر مولانا اس کے استعمال کو خصم کے دعوے کی نفی اور قسم سے اپنے دعوے کی تائید مقصود سمجھتے تھے۔ چناں چہ عربی میں ایسے جملے بولے جاتے تھے، مثلاً لا واللہ لا ورب الکعبہ اردو میں بھی بولتے ہیں۔ نہیں خدا کی قسم نہیں۔ بیکار نہیں۔ اس سے مخالف کی تردید مقصود ہے۔ مولانا کو بمبئی میں بخار آگیا تھا اس لیے کئی روز تک لکھنا پڑھنا بند رہا۔ اب بہتر ہو رہے تھے (۳۰)۔

ملا عبدالقیوم حیدر آبادی نے ندوے کی کھلم کھلا تائید سے اپنی معذوری ظاہر کی تو مولانا نے لکھا کہ ان کی خاموش اور مخفی تدابیر بھی ندوے کے لیے مفید تھیں اور علی گڑھ کے متعلق استفسار کے جواب میں ان کو لکھا کہ ندوے کا علی گڑھ میں ضم ہونا ناممکن تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ارکان میں سوائے مولانا کے اور کوئی علی گڑھ کا طرف دار نہ تھا۔ خود مولانا ندوہ کو علی گڑھ سے الگ رکھنا چاہتے تھے۔ ہاں انگریزی کو البتہ ندوہ کے نصاب میں شامل کرنے کے حق میں تھے۔

مولانا نے ملا صاحب سے دریافت کیا کہ اگر ندوہ کا وفد مدار المہام کے پاس جائے تو کیا وہ حضور نظام کی خدمت میں اس کو پیش کریں گے۔ اگر اس کا امکان ہو تو مولانا وفد بھیجتے اور یہ مشورہ اس لیے درکار تھا کہ ملا صاحب حیدر آبادیوں کی نفسیات سے بخوبی واقف تھے اور دربار داری کے لوازمات میں ان کا خاصا دخل تھا (۳۱)۔

مہدی حسن کے مضمون کو منیجر الندوہ نے بعض مصلحتوں کی بنا پر شائع نہ کیا تو مولانا نے ان کو تسلی دی کہ ان کی (مولانا) تصحیح کے ساتھ کسی اور رسالے میں شائع کر دیا جائے گا۔ بمبئی

کا موسم بڑا خوشگوار تھا مگر مولانا کی شاعرانہ طبیعت اس سے پورا لطف نہیں اٹھا رہی تھی، اس لیے کہ ندوہ پیش نظر تھا اور ندوہ کی خاطر ان کی تقاریر ہو رہی تھیں۔ چناں چہ ۹۔ اگست ۱۹۰۶ء کو بھی ایک تقریر تھی اور آیندہ ایک بہت بڑے مجمع میں تقریر کا پروگرام تھا لیکن دشواری یہ تھی کہ بمبئی کے تجار اردو نہیں سمجھتے تھے اس لیے مافی الضمیر کو پیش کرنے اور ندوے کے لیے اعانت حاصل کرنے میں دشواری محسوس کرتے تھے (۳۲)۔

برسات کے دن تھے، مولانا کو خیال ہوا کہ ان کی کتابیں کرہ کے مرطوب ہونے کی وجہ سے خراب نہ ہو جائیں، لہٰذا سلیمان ندوی کو ہدایت کی کہ ان کو دھوپ دکھلائی جائے۔ قرآن مجید کے درس کے لیے متفکر تھے، اس لیے استفسار کیا کہ ہوتا ہے کہ نہیں۔ نواب علی (پروفیسر۔ نواب علی کسنڈوی) کا مضمون مولانا کی مرضی کے مطابق نہ تھا، اس لیے الندوہ کے لیے مجبوراً بھیجا، لیکن سید سلیمان ندوی کو اختیار دیا کہ اگر کوئی دوسرا مضمون مل جاتا تو اسے شامل کر لیا جاتا۔

الہلال کے دفتر سے مجموع الادب اور الخواطر الحسان ندوے کے لیے منگوائی تھیں چوں کہ وہ آگئی تھیں اس لیے سید سلیمان ندوی کو ہدایت کی کہ ان کی قیمت ندوے سے بھیج دی جائے۔

شیخ محمد (نومسلم) کے تعلیمی اور رہائشی اخراجات ندوے کی طرف سے کرنا چاہتے تھے کیوں کہ اس سے اشاعت اسلام میں مدد ملتی، مگر وہ منشی احتشام علی کاکوروی کے وہاں چلے گئے۔ اس پر مولانا نے اعتراض کیا اس لیے وہ انفرادی اعانت نہ چاہتے تھے۔ انفرادی اعانت تو کوئی بھی کر سکتا تھا۔ مولانا یہ بھی چاہتے تھے کہ ندوہ ان کے ساتھ جو کچھ کر رہا تھا اس کو مختلف اخبارات میں مشتہر ہونا چاہیے تھا، تاکہ ندوے کی نیک نامی ہو اور لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں۔ مولانا کا ارادہ بھی ایک مضمون لکھنے کا تھا مگر بشرط صحت۔ مولانا کو اس زمانے میں اپنے اخراجات کے لیے روپوں کی ضرورت تھی، اس لیے منشی محمد علی کو توجہ دلائی گئی (۳۳)۔

۱۱۔ ستمبر ۱۹۰۶ء کو مولانا چار روز سے بخار میں مبتلا تھے۔ بمبئی میں چوپاٹی اور اپالو پر حسن کی آزادی اور بے باکی شاعر کی شعریت کو بھڑکا دیتی ہے۔ اور ۱۸۸۷ء سے غزل کے کوچے کو چھوڑنے والا پھر غزل کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، لیکن جذبات کے اظہار کا ذریعہ فارسی کو بناتا ہے اور خیالات کی بلندی ہندوستان میں فارسی شاعری کو انتہا پر پہنچا دیتی ہے اور مولانا شبلی پر فارسی شاعری کا خاتمہ سمجھا جاتا ہے۔ مولانا حافظ کی مشہور غزل کی زمین میں غزل کہتے ہیں جس کا مطلع ہے:

نثار بمبئی کن ہر متاع کہنہ و نو را　　طراز مسند جمشید و فر تاج خسرو را

مقطع یہ ہے:

بیا شبلی بہ یاد پنجہ گیرائی مژگانش دگر رہ پارہ سازم این قبای زہد صد تورا (۳۴)

مولانا ۱۱۔ ستمبر تک چار غزلیں لکھ چکے تھے۔ ایک غزل کا مطلع یہ ہے:

چند بیہودہ بہ بند غم دنیا باشم زین سپس باقدح و بادہ و مینا باشم

اس کا مقطع یہ ہے:

دامن عیش زدستم نہ رود تا شبلی دامن بمبئی از کف ندہم تا باشم (۳۵)

دوسری غزل کا مطلع یہ ہے:

غمزہ اش طرح نہد رسم جفا کوشی را جلوہ یادت دہد از خویش فراموشی را

اور مقطع یہ ہے:

شبلی نامہ سیہ گرچہ سراپا گنہ است بس بود دامن عفو تو خطا پوشی را (۳۶)

تیسری غزل کا مطلع یہ ہے:

گردم ازمد مدحت شیراز و صفاہاں زدہ ام شرم بادم کو نواہاے پریشاں زدہ ام

اور مقطع یہ ہے:

پے تواں برد کہ ایں زمزمہ بی چیزے نیست شبلی ایں تازہ نواہا چو ستاں زدہ ام (۳۷)

اس زمانے میں بمبئی کا موسم کشمیر جیسا تھا۔ گلابی سردی تھی جو مولانا کو بہت پسند تھی۔ بمبئی میں مولانا نے موازنہ۔ انیس و دبیر کو مرتب کیا اور چھپنے کے لیے مطبع بھیج دیا۔ مولانا کا اب دھن کاسٹ، کلیر روڈ۔ بمبئی میں قیام تھا (۳۸)۔

مولانا کے لیے ایک سر سیکڑوں مواد کا مضمون تھا مین سچ نکلنے والے تو بہت تھے مگر ہاتھ بٹانے والا کوئی نہیں تھا پھر جب کسی کام میں کامیابی ہوتی تھی اور ان کی شہرت ہوتی تھی تو حسد پیدا ہوتا تھا۔ بمبئی میں قیام کے باوجود ندوہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں کی خبر رکھنا اور خرابیوں کو دور کرنے کی فکر کرنا انھیں کا کام تھا۔ مولانا عبد اللہ بلوچی نے مولانا کو دار الاقامہ کی خرابیوں کی طرف توجہ دلائی تو ان کو لکھا کہ بے شک اس کی حالت خراب ہے، لیکن اگر اس کام میں الجھوں تو دوسرے کام کون کرے۔ پھر مولانا تعلیم کے معتمد تھے، لیکن بہر حال انتظامی معاملات میں بھی سوجھ بوجھ رکھتے تھے اور دخل دے سکتے تھے۔ بلوچی کو مایوس نہیں کیا اور ان کی ہمت افزائی کرتے ہوئے لکھا کہ ان کے آنے سے (ندوہ میں) بڑی تقویت ہوئی۔ سید سلیمان کے مشورے سے انتظامی امور میں جو

اصلاح پسند کی جائے گی اس کو جاری کرنے میں مولانا کو اعتراض نہ تھا۔ مولانا نو مسلم محمد کی دل دہی کرنا چاہتے تھے، چناں چہ منشی محمد علی کو ان کے لیے بندوبست کرنے کی تاکید کی تاکہ وہ دل برداشتہ نہ ہونے پائیں اور بلوچی صاحب کو بھی اس کی تاکید کر دی۔ بلوچی صاحب کو توجہ دلائی کہ ندوہ کو اپنا سمجھ کر اس کی خدمت کریں (۳۹)۔

مولانا کے پاس ان شعرائے فارسی کا تذکرہ تھا، جنھوں نے ساقی نامہ لکھا تھا۔ سید محمد سلیمان ندوی کو انھوں نے تاکید کر دی تھی کہ وہ خواجہ حسین الدین صاحب پھاٹک سلیم شاہ بنارس کو رجسٹری کر دی جائے۔ ۱۸۔ ستمبر ۱۹۰۶ء کو الندوہ کے لیے ایک مضمون بھیجا (۴۰)۔

اکتوبر ۱۹۰۶ء میں مہدی حسن تبادلہ ہو کر الہ آباد آگئے۔ مولانا کو بہت خوشی ہوئی اس لیے کہ مولانا کے چھوٹے بھائی مولوی اسحق کا قیام بھی الہ آباد میں تھا اور اسی تقریب سے الہ آباد جاتے رہتے تھے۔ اب مہدی حسن کے آجانے سے زیادہ الہ آباد میں دل چسپی بڑھ گئی تھی۔ اسی زمانے میں مولانا نے اپنی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے مسہل لیے جن کی وجہ سے کمزوری بڑھ گئی۔

مولانا چاہتے تھے کہ براؤن A Literary History of Persia سے بھی اپنے شعر العجم کے لیے استفادہ کریں۔ چناں چہ بمبئی میں بہت تلاش کی مگر نہ ملی۔ لہذا مہدی حسن کو لکھا کہ اگر کوئی خاص بات ہو تو اطلاع دیں۔ الندوہ کی طباعت وغیرہ میں خرابی کی وجہ سے انتظام بدل دیا۔ اسی زمانے میں مولانا نے مسلمانوں کی بے تعصبی کا دوسرا حصہ لکھا اور الندوہ کو اشاعت کے لیے دیا۔ یہ حصہ مولانا کے لیے اچھوتا تھا۔ اسی شمارے میں مولانا حبیب الرحمن شروانی کا سوانح مولانا روم پر تبصرہ شائع ہونے والا تھا۔ موازنہ انیس و دبیر نہایت عمدہ چھپنے پر مہدی حسن کو اطلاع دی اور یہ لکھا کہ موازنہ کی ترتیب کی وجہ سے شعر العجم لکھنے میں حرج ہوا۔ چار مہینے سے کچھ نہ لکھ سکتے تھے۔ مولوی عبد السلام ندوی جو اس زمانے میں ندوے کے طالب علم تھے، ان کی ہونہاری کی بہت تعریف کی اور یہاں تک خیال ظاہر کیا کہ وہ غالباً خالی ہونے والی کرسیوں پر جلوہ فگن ہوں گے۔

اسی زمانے میں ابن النحاس کی کتاب ناسخ و منسوخ القرآن شائع ہوئی تو مولانا نے اس مضمون کو ساری کتابوں سے بہتر قرار دیا۔ اب سوانح مولانا روم شائع ہو گئی تھی، لہذا مولوی حمید الدین کو بھیجی۔ مولانا کی صحت ابھی خراب تھی، بخار برابر آرہا تھا۔ مسہل کا سلسلہ ۲۱۔ اکتوبر کو ختم ہوا، اس کے باوجود طبیعت ٹھیک نہ تھی۔ غالباً مولوی حمید الدین کا انگریزی میں اسسٹنٹ

پروفیسر کی جگہ کے لیے علی گڑھ کالج میں کوشش کرنے کا ارادہ تھا۔ اس پر مولانا نے لکھا کہ جب تک انگریزی کے لیے کوئی پروفیسر نہ رکھا گیا، اسسٹنٹ پروفیسر کا تقرر ناممکن نہیں اور ابھی تک نہ انگریز پروفیسر ملا تھا نہ مستقبل قریب میں ملنے کی امید تھی۔ مولانا کا ارادہ تھا کہ اگر طبیعت ٹھیک رہی تو عید بعد (نومبر یا دسمبر ۱۹۰۶ء میں) دورہ پر جائیں گے۔ شوال میں ندوے میں دستار بندی کا جلسہ تھا۔ مولانا چاہتے تھے کہ مولوی حمید الدین بھی اس میں شرکت کریں۔ مولانا نے مولوی حمید الدین کی لکھی ہوئی تفسیر کے اجزا دیکھ کر واپس کر دیے۔ حامد نعمانی سے رعایا اور حکم دونوں (۴۱) خوش تھے۔

اسی زمانے میں مولانا نے جہاں آرا بیگم (ہمشیرہ عالمگیر) کی ایک تصنیف کا نسخہ جو خود اس کا تیار کیا ہوا تھا سو روپے میں خریدا، جو دیکھنے کے قابل تھا۔ اس کی اطلاع حمید الدین کو بھی دی (۴۲)۔ مولانا کی ایک غزل مخزن، لاہور میں شائع ہوئی البتہ جا بجا غلط چھپی تھی (۴۳)۔

ندوے کی فکر مولانا کو ہر وقت رہتی تھی۔ چوں کہ علی گڑھ کے مخیر حضرات سے تعلقات تھے، لہٰذا ندوہ اور ندوے کے غریب طلبہ کے لیے ان سے امداد لینا چاہتے تھے۔ چناں چہ نواب مزمل اللہ خاں کو مولانا نے ندوے کے غیر مستطیع طلبہ کے وظیفے کے بارے میں لکھا، لیکن اس کا جواب نہیں آیا تھا، جس سے فکر تھی۔ اسی زمانے میں ندوے میں دستار بندی کا جلسہ کرنا چاہ رہے تھے اور چاہتے تھے کہ اس جلسے میں مولانا شیروانی بھی شرکت کریں، کیوں کہ دستار بندی کا یہ پہلا جلسہ تھا اور اس کے ذریعے لوگوں کو ندوے کی خدمات اور طلبہ کی خدمات کا پتا چلتا۔ چوں کہ شروانی صاحب امیرانہ ٹھاٹ سے سفر کرتے تھے، اس لیے مصارف بہت ہوتے تھے۔ لہٰذا مولانا نے ان کو مشورہ دیا کہ حضرت عمرؓ کی طرح سفر کریں تاکہ نہ مصارف زیادہ ہوں اور نہ بار بار شرکت میں دشواری ہو۔ مولانا کا دستار بندی کے جلسے کے بعد ندوے کے سلسلے میں لمبا سفر کرنے کا ارادہ تھا۔ اسی زمانے میں علی گڑھ کالج میں نائب ناظم دینیات کی جگہ کے لیے مولانا شبلی سے مولوی اسلم جیراج پوری کے لیے سفارش چاہی گئی تو مولانا نے ان کی نیک بختی کی تو تعریف کی مگر ان کی دینی معلومات اور فرائض کی پابندی کے متعلق لاعلمی کا اظہار کیا اور مولانا شیروانی کو لکھا کہ اس کی تحقیق کرلی جائے۔

اب مولانا موازنہ انیس و دبیر پر نظر ثانی کر چکے تھے اور شعر العجم کے لیے سارا وقت لگانا چاہتے تھے اور اس کے لیے والہ داغستانی کے دیوان کی ضرورت تھی، لہٰذا آگرہ سے منگانا چاہتے تھے

چونکہ شعرالعجم کا میدان سامنے تھا، لہٰذا شعریت میں ڈوب جانے کی ضرورت تھی۔ مولانا کی فارسی شاعری اسی دور میں اپنے شباب پر ملتی ہے۔ اسی زمانے میں ایک فارسی غزل کہی جس کا مطلع ہے:

گرچہ من مرد ہوسناکی و رندی بیستم   ایں چنیں ہم گاہ گاہم اتفاق افتادہ بود

اس کا مقطع ہے:

از دل صد پارہ ات آگہ نیم شبلی و ے   شیشہ دیدم کہ از بالاے طاق افتادہ بود

(۴۴)

دینیات کے نائب ناظم کی جگہ ابھی تک خالی تھی، اس کے لیے کوئی مناسب اور موزوں شخص اب تک نہیں ملا تھا۔ مولانا شیروانی نے مولانا شبلی سے کسی موزوں شخص کے بارے میں دریافت کیا تو مولانا نے لکھا کہ دینیات کے سلسلے میں مولانا شیروانی خود خاصی واقفیت رکھتے ہیں اس لیے انھیں کیا مشورہ دیا جا سکتا تھا۔ ان کے نزدیک مولانا اشرف علی تھانوی بہت مناسب تھے، لیکن وہ اس خدمت کو قبول نہ کرتے تھے۔ مولوی عبدالحق (تفسیر حقانی والے) اور شاہ پھلواری علی گڑھ پسند نہ کرتے تھے اور شاید ان دونوں حضرات کو علی گڑھ والے پسند نہ کرتے۔ بہرحال مولانا کسی موزوں شخص کی تلاش میں تھے۔

انجمن ترقی اردو کے تقریباً سو روپے بنک میں جمع تھے جو مولانا بھیج نہ سکے تھے، لہٰذا بھیجنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ مولانا ندوے کے سلسلے میں بمبئی گئے تھے اور ان کو وہاں کا موسم بہت پسند آیا وہاں کے بے محابا اور بے باک حسن نے شاعر کی طبیعت میں جولانی پیدا کر دی تھی۔ حساس طبیعت وہاں کے بے باک حسن اور حسینوں کی شوخیوں سے متاثر ہوئی تو فارسی غزلوں کی طرف متوجہ ہوئے اور شعرالعجم نے بھی حالات سازگار کر دیے۔ لہٰذا ایک اور فارسی غزل کہی جس کے دو شعر یہ تھے:

بنگر دستگہ حسن کہ آں نرگس مست   ہم آمیختہ ہشیاری و مدہوشی را

من فداے بت شوخے کہ بہ ہنگام وصال   بمن آموخت خود آئین ہم آغوشی را

مولانا نے اپنی رفعت تخیل کی بنا پر ایک بات کہی تھی مگر لکھنو کے ایک صاحب نے شعر سن کر کہا کہ ایسے شوخ بمبئی کے لیے مخصوص نہیں، یہاں (لکھنو میں) بھی مل سکتے ہیں۔

نواب مزمل اللہ خان نے ندوے کے غیر مستطیع طلبہ کے لیے وظیفہ منظور کیا تو مولانا کو بے حد خوشی ہوئی (۴۵)۔

اب مولانا کلکتہ کا ارادہ کر رہے تھے۔ ان کی غیر موجودگی میں مولوی حمید الدین وطن آنے والے تھے، لہٰذا مولانا نے ہدایت کی کہ لکھنو ہوتے ہوئے وطن جائیں اور لکھنو سے اپنے ساتھ دو مستعد اور ہوشیار طالب علم ساتھ لے آئیں اور اپنے وطن میں رہ کر ان دونوں کو دروس الاولیہ اور اپنی (مولوی حمید الدین کی) لکھی ہوئی تفسیر پڑھائیں۔

اور مولانا کا یہ خط مولوی حفیظ اللہ صاحب کو دکھا دیں تاکہ ان کو طالب علموں کے ساتھ کرنے میں پس و پیش نہ ہو (۴۶)۔

مولانا کلکتہ جاتے ہوئے چند گھنٹے بانکی پور ٹھہرے پھر کلکتہ پہنچے۔ کلکتہ سے مسلم ایجوکیشن کانفرنس میں شرکت کے لیے ڈھاکہ جانے کا ارادہ کر رہے تھے۔ مسز مہدی حسن البشیر میں ایک مضمون شائع کرانا چاہتے تھے۔ جس کی دوسری قسط مولانا کو دیکھنے کے لیے بھیجی تھی۔ مگر وہ پہلی ہی قسط اب تک شائع نہیں ہوئی تھی۔ چوں کہ مولانا شعر العجم لکھ رہے تھے، لہٰذا چاہتے تھے کہ براؤن A Literary History of Persia کا دوسرا حصہ بھی دیکھ لیں اور اس سے بھی استفادہ کر لیں۔ لہٰذا مہدی حسن سے اس کے اقتباسات کا ترجمہ طلب کیا اور اس کو الندوہ میں بھی شائع کرنے کا ارادہ کیا۔ مولانا نے براؤن کی فارسی تحریر کی تعریف کی اور خیال ظاہر کیا کہ مسلمانوں سے بہتر فارسی لکھتا ہے۔ اسی زمانے میں عالمگیر پر ایک مضمون لکھا جو الندوہ میں شائع کیا۔

مولانا کا خیال تھا کہ مولوی عبد السلام ندوی بہت ہونہار تھے اور وہ اچھے مصنف ہو سکتے تھے، لیکن انگریزی نہیں جانتے تھے، انگریزی شروع کر دی تھی۔ ندوہ ایسے ہی لوگوں کو چمکانے والا تھے، لیکن علی گڑھ کالج سے ہمت افزائی نہ ہونے کی وجہ سے ندوہ کی ترقی میں رکاوٹ تھی، جس کا مولانا کو افسوس تھا۔ اب موازنہ انیس و دبیر آگرے میں چھپنے کو بھیجی جا چکی تھی اور اس کی تقطیع اور خط تمدن عرب کا رکھا گیا تھا۔ براؤن نے لباب الالباب (۴۷) کا دیباچہ فارسی میں لکھا تو مولانا کو بہت پسند آیا۔ مولانا چاہتے تھے کہ مہدی حسن بھی ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کرتے۔ چوں کہ اس زمانے میں فارسی غزلیں لکھ رہے تھے، لہٰذا دکن ریویو میں اور مخزن لاہور میں دو غزلیں اس زمانے میں چھپیں۔ کلکتہ پہنچ کر مولانا نے امرتلا لین نمبر ۵ میں قیام کیا (۴۸)۔

اسی زمانے میں البشیر میں مہدی حسن نے مضمون لکھا جس میں مولانا کی تعریف تھی۔ مولانا نے اپنی تعریف کا شکریہ ادا کرنے سے پہلو تہی کی۔ مولانا کے کلکتہ کے قیام میں شاہ وحید عالم

نے بھی کلکتہ جانے کا ارادہ کیا تو مولانا نے مہدی حسن کو کلکتہ آنے کی ترغیب دی ۔ کلکتہ کے دوران قیام میں مولانا کو مآثر رحیمی (عبد الرحیم خان خاناں کی سوانح عمری) پڑھنے کو ملی ۔ لہٰذا اس کے مطالعے سے بہت محظوظ ہوئے (۴۹) ۔

ریاض حسن خاں صاحب چاہتے تھے کہ مولانا لکھنو سے کلکتہ جاتے ہوئے مظفر پور میں ٹھہرتے اور تقریر کرتے ۔ چناں چہ انھوں نے جلسے کا بندوبست کر لیا تھا، مگر مولانا پٹنہ میں چند گھنٹے قیام کے بعد کلکتہ روانہ ہو گئے ۔ اس سے ریاض حسن خاں کو افسوس ہوا اور انھوں نے مولانا کو کلکتہ تار دیا تو مولانا نے جواب دیا کہ ندوہ جس عمارت میں قائم ہے وہ بد حیثیت ہے، جو ندوے کی ترقی میں مانع ہے ۔ لہٰذا ساری توجہ عمارت کی طرف ہے اور کلکتہ کا سفر بھی عمارت کے لیے چندہ کی خاطر تھا ۔ اگرچہ اس وقت تک کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی تھی، پھر بھی امید تھی ۔ لکھنو کی ایک شاہی عمارت موقع سے مل بھی رہی تھی مگر رقم کی ضرورت تھی ۔ چندے کی فراہمی کے بعد کانفرنس کی شرکت کے لیے ڈھاکہ جانا تھا، لہٰذا واپسی ہی میں مظفر پور کا ارادہ کر سکتے تھے (۵۰) ۔

ریاض حسن خان صاحب نے مولانا کے ایما کے بغیر ہی جلسے کا اعلان کر دیا تھا اور مولانا کے بغیر قیام کیے کلکتہ پہنچ جانے سے ان کی زحمت ہوئی، جس کا مولانا کو بھی افسوس تھا ۔ نواب سلیم اللہ خان (نواب ڈھاکہ) کا اور محسن الملک کا اصرار تھا کہ مولانا کانفرنس میں شرکت کریں، لہٰذا کانفرنس کی شرکت کے لیے ڈھاکہ جانا ضروری تھا اور کانفرنس کے آخر تک یعنی ۳۰ ۔ دسمبر تک قیام کرنا تھا ۔ واپسی پر ایک دن آرام کی خاطر کلکتہ پر ٹھہرنا تھا، پھر ۸ ۔ جنوری ۱۹۰۷ء کو آگرے میں امیر کابل کا جلوس دیکھنا تھا، لہٰذا ۸ ۔ جنوری سے پہلے ریاض حسن خان کے پاس پہنچ سکتے تھے ۔ مولانا کا خیال تھا کہ ریاض حسین خاں بھی کانفرنس میں شرکت کریں گے، مگر ان کے خط میں کوئی اشارہ نہ تھا ۔ مولانا نے یہ بھی دریافت کیا کہ مظفر پور کے جلسے کے لیے چھٹی کا دن ہونا ضروری تھا یا نہیں ۔ جلسہ چوں کہ رات کو ہوتا اس لیے چھٹی کا دن ہونا ان کے خیال میں ضروری نہ تھا (۵۱) ۔

سفر کلکتہ و ڈھاکہ کی وجہ سے شعر العجم میں رکاوٹ پڑ رہی تھی اس لیے مولانا کو افسوس تھا لیکن کلکتہ جانے سے اتنا فائدہ ہوا کہ ڈاکٹر راس کی جمع کردہ کتابوں میں اورنگ زیب کے ہاتھ کا قرآن مجید، زیب النساء اور دارا شکوہ کی تحریریں دیکھنے کو ملیں ۔ مولانا کا کلکتہ میں سلیمان اور فن

(٥٥)-

[illegible]

اور تہنیت نامہ اس طرح شروع کیا گیا ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بہ حضور لامع النور بندگان عالی متعالی رستم دوران، افلاطون زماں فلک بارگاہ، مظفر الممالک، فتح جنگ ہز ہائنس میر محبوب علی خان بہادر نظام الملک آصف جاہ سلطان دکن خلد اللہ ملکہ"۔

آخر میں لکھتے ہیں:

"اکنون کہ تقریب جشن چہل سالہ بندگان شہریاری عالم و عالمیان راشردہ نواز آمد ارکان و اعضائے ایں جملہ انجمن اخلاص و نیاز و نہایت مسرت وابتہاج مراسم تبریک و تہنیت راز جاں بجای آریم و بمقتضائے من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ ادائے ایں فرض رابعملہ واجبات دینی من رنگاریم واز صمیم قلب خواستگاریم کہ

تا جہاں باشد و ایں گنبد گردان باشد دہر فرمان بر محبوب علی خاں باشد (۵۶)

اپریل ۱۹۰۶ء میں بنارس میں ندوے کا سالانہ اجلاس اور علمی نمائش ہونے والی تھی، مولانا اس کو کامیاب بنانے کی فکر میں تھے۔ اہل علم حضرات کو توجہ دلا رہے تھے کہ اس میں شرکت کریں۔ الندوہ ہاتھ میں تھا۔ لہٰذا مولانا نے مارچ ۱۹۰۶ء میں ایک مضمون شائع کیا، جس میں لوگوں سے اپیل کی کہ اس جلسے میں شریک ہوں۔ مضمون کا عنوان تھا "ندوۃ العلماء کا نیا دور اور اس کا جلسہ سالانہ (بنارس میں) مضمون کو اس طرح شروع کرتے ہیں۔

"ندوۃ العلماء پر اس تھوڑی سی مدت میں دو تین دور گزرے ہیں - ایک اس کا آغاز، جو اس زور شور کا تھا جس کے غلغلے سے دفعتہ تمام ہندوستان گونج اٹھا- دوسرا مڈل ایجز (عہد ظلمت)، یہ دور اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب مولوی محمد علی صاحب (۵۷) (سکریٹری ندوۃ العلماء) اپنے ضعف و ناتوانی کی وجہ سے ندوے کی خدمات سے علاحدہ ہونے لگے یہاں تک نوبت پہنچی کہ باوجود تمام اصرار کے اپنے عہدے سے مستعفی ہوگئے"۔

تیسرے دور کو ۱۹۰۵ء سے شروع کرتے ہیں جب کہ ارکان کو یہ دیکھ کر سخت پریشانی ہوئی۔ معتمد دارالعلوم نے ترک تعلقات کرکے خود ندوے میں سکونت اختیار کی، دفتر شاہ جہان پور سے اٹھ آیا، مصارف جو آمدنی سے بہت زیادہ تھے گھٹا کر مداخل کے قریب قریب کر دیے گئے،

نصاب مجوزہ جس پر اب تک عمل نہیں کیا گیا تھا جاری کر دیا گیا، انگریزی زبان بطور سیکنڈ لینگویج کے لازمی کر دی گئی، مقامی ارکان میں مولوی محمد نسیم صاحب وکیل اور مولوی ظہور احمد صاحب وکیل کا اضافہ ہوا، شملہ اور امرتسر کو ڈیپوٹیشن گیا اور کامیاب آیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جناب معلی الالقاب سرکار عالیہ ریاست بھوپال نے سرپرستی فرما کر چھ سو روپے سالانہ کی رقم مقرر کر دی (۵۸)۔ آخر میں اس طرح اپیل کی۔

"ہم کو تمام بہی خواہان قوم سے اور خصوصاً ان لوگوں سے جن کے دل میں ذرا بھی مذہب کا درد ہے، امید ہے کہ ضرور جلسے میں شریک ہوں گے، کیوں کہ ہندوستان میں یہی ایک مذہبی تعلیم گاہ ہے جو اپنے اصول کے لحاظ سے بالکل ایک جداگانہ چیز ہے اور اگر اس کو وسعت اور ترقی دی جائے تو یہ مسلمانوں کے ہر درد کی دوا ہو سکتا ہے" (۵۹)۔

الندوہ کے مارچ ۱۹۰۶ء کے شمارے میں ایک اور مضمون لکھا جس کا عنوان تھا " ندوۃ العلما کا گیارھواں سالانہ اجلاس بنارس میں اور علمی نمائش "۔ اس مضمون میں نمائش کے مقاصد کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

(۱) عربی نمائش کی جو نادر الوجود قلمی کتابیں خاص خاص خاندانوں، کتب فروشوں، پرائیویٹ کتب خانوں میں محفوظ ہیں اور جن میں قوم کے قدیم علمی کارنامے موجود ہیں، ان کا اجتماعی منظر قوم کے پیش نظر کر دیا جائے۔

(۲) قدیم شاہی فرامین جو مسلمانوں کی قدیم تہذیب اور انشا پردازی کی یادگار ہیں اور نہایت بے دردی سے شخصی حفاظت میں برباد ہو رہے ہیں۔ ان کو ایک خاص ترتیب سے جمع کیا جائے اور ان سے کارآمد نتائج پیدا کیے جائیں۔

(۳) اہم ترین مقصد یہ ہے کہ عربی اور فارسی لٹریچر کی خاص خاص شاخوں کی تاریخ مرتب کی جائے اور اس مقصد کے لحاظ سے ان شاخوں کی تمام موجودہ کتابیں جمع کی جائیں اور ان کو اس ترتیب سے یکے بعد دیگرے رکھا جائے کہ بہ یک نظر عہد بہ عہد کی تبدیلیاں اور ترقیاں معلوم ہو جائیں اور بغیر کسی غیر معمولی کوشش کے معلوم ہو جائیں کہ ابتدا میں اس فن کی کیا حالت تھی، پھر اس کے بعد کس قسم کی تبدیلی ہوئی۔ کیا کیا اضافے ہوئے اور موجوہ حالت میں اور اصلی حالت میں کیا فرق ہے (۶۰)۔ (اس مقصد کی تفصیل آگے آئے گی) مولانا نے ستمبر ۱۹۰۶ء میں ندوے میں

ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا، ندوۃ العلماء کیا کر رہا ہے؟ اس میں لکھتے ہیں:

"نکتہ سنج پہلے ہی دن سے سمجھتے تھے کہ ندوے کے جو کام ہیں وہ پچھلی نسل سے جو قدیم زمانے کی تربیت یافتہ ہے ہرگز انجام پذیر نہیں ہو سکتے - ندوے کے کیا کیا کام تھے -

(۱) علما میں ایثار نفس کا پیدا کرنا -
(۲) انگریزی داں علما پیدا کرنا -
(۳) مذاق حال کے مطابق علما کے گروہ میں مقررین اور ارباب قلم پیدا کرنا -
(۴) ایسے علما کا پیدا کرنا جو غیر ممالک میں اسلام کی اشاعت کر سکیں -"

اب غور کرو کہ ہندوستان کی درسگاہوں میں تربیت کا جو طریقہ ہے یعنی دونوں وقت کسی کے دروازے پر جا کر فقیروں کی طرح کھانا مانگ لانا یا بڑی معراج ہوئی تو نان بائی (۶۱) کی دوکان پر جا کر کھا آنا، اس سے کسی قسم کی ہمت، غیرت یا ایثار نفس پیدا ہو سکتا ہے - اس طریقے کے تربیت یافتہ صدقہ، نذر اور خیرات کے سوا اور کسی طریقے پر زندگی بسر کر سکتے ہیں؟ کیا ان لوگوں سے کسی قسم کی بلند خیالی کی توقع ہو سکتی ہے؟

تربیت کو قطع نظر کر کے تعلیم کو لو تعلیم میں، جب تک یورپ کی کسی زبان کی تعلیم لازمی نہ قرار دی جائے اور زمانہ ، موجودہ کے علوم و فنون نہ پڑھائے جائیں - اس وقت تک مذاق حال کے مطابق یا موافق کیوں کر ارباب قلم پیدا ہو سکتے ہیں؟"

اس بنا پر ندوے کے اصلی بانیوں نے ہر طرف سے توجہ ہٹا کر صرف دار العلوم (یعنی مدرسہ مجوزہ ندوہ) پر اپنی امیدوں کا دارومدار رکھا، دار العلوم میں بھی سخت دشواریاں تھیں - علما نصاب قدیم میں کسی قسم کی اصلاح منظور نہیں کرتے تھے - انگریزی زبان کے جاری کرنے اور بعض مقرر ارکان ندوے نے اس زور کی مخالفت کی کہ کئی برس تک یہ مسئلہ مردہ ہو کر پڑا رہا سب سے بڑی مشکل یہ تھی اور وہ اب بھی بہت کچھ باقی ہے کہ مدرسین جو ندوے کو مل سکتے تھے اس قدیم لکیر کے فقیر تھے اس لیے ان سے نئے راستے پر قدم نہیں رکھا جاتا اور زور لگا کر چلائے جاتے ہیں تو پاؤں الٹی طرف پڑتا ہے (۶۲) -

اپریل ۱۹۰۶ء بنارس میں علمی نمائش ہوئی تو مولانا کو اس وقت سے فکر تھی کہ اس کی روئداد ایک مضمون کی شکل میں شائع کر لیں، تاکہ جو لوگ شرکت نہیں کر سکتے تھے وہ بھی واقف ہو جائیں اور ندوے کے کاموں کو سراہ سکیں - چناں چہ ستمبر ۱۹۰۶ء کے الندوہ میں مولانا نے

ندوہ کے سالانہ جلسے پر ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا "ندوۃ العلماء کا اجلاس سالانہ اور علمی نمائش گاہ"۔ اس میں لکھتے ہیں:

"ندوہ کے پہلے (۶۳) اجلاس مورخہ ۱۳-اپریل ۱۹۰۶ء مقام بنارس میں یہ تمام علمی سرمایہ ٹون ہال (۶۴) میں ایک خاص ترتیب سے سجایا گیا مشہر کے اکثر انگریزی حکام بڑے شوق سے شریک ہوئے۔ خصوصاً صاحب کمشنر ایک ایک چیز کو نہایت شوق اور تفحص کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اس کے متعلق تاریخی حالات و واقعات پوچھتے جاتے تھے۔ علماء و فضلا جو بہت دور دراز مقامات سے آئے تھے ان کو گرچہ فرامین وغیرہ سے دل چسپی نہ تھی، لیکن فن حدیث کی جو نادر کتابیں مہیا کی گئیں تھیں اور جن میں سے متعدد کتابیں صحیح بخاری سے پیشتر زمانے کی تصنیف تھیں ان کو خواہ مخواہ اپنی طرف مائل کرتی تھی، اس تمام نادر سرمایہ کی تقسیم حسب ذیل تھی۔

فرامین و توقیعات۔ شاہی نادر الوجود کتابیں۔

نہایت قدیم زمانے کی لکھی ہوئی کتابیں

مشہور خطاطوں کے خط کے نمونے

سلاطین اور امرا کے ہاتھ کے مسودات

مصنفین کے ہاتھ کے مسودات

فن بلاغت کا پورا سلسلہ (۶۵)"

اسی زمانے میں ایک سربرآوردہ ہندو اڈیٹر نے ایک مضمون لکھا جس میں مسلمانوں کی ہندی ادب میں بے اتفاقی کا ذکر تھا۔ مولانا، جن کی نگاہ تاریخ ادب پر محیط تھی، اس الزام کو کب تسلیم کر سکتے تھے۔ انھوں نے الندوہ کے اکتوبر کے شمارے میں ایک مضمون "بھاشا زبان اور مسلمان" لکھا جو مدلل ہونے کے ساتھ ساتھ مولانا کی وسعت معلومات کا پتہ دیتا ہے، مولانا اس کی ابتدا اس طرح کرتے ہیں:

"عام طور پر مشہور ہے کہ سب سے پہلے جس شخص نے بھاکھا زبان میں شاعری کی وہ امیر خسرو ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے اس سلسلے کا پتا آگے تک چلتا ہے۔ مسعود پہلا مسلمان جو سلطنت غزنویہ کا مشہور شاعر گزرا ہے اور جو امیر خسرو سے تقریباً دو سو برس پہلے تھا، اس کی نسبت تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ ہندی زبان میں بھی اس نے ایک دیوان لکھا تھا۔ تذکرہ مجمع الفصحا اس میں لکھا ہے:

"الحاصل وے راسہ دیوان بود تازی، ہندی و پارسی"

اس واقعے سے صرف والہ داغستانی نے صرف اسی بنا پر انکار کیا ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے ملک کی زبان میں اس قدر کمال پیدا نہیں کر سکتا کہ اس میں شاعری کر سکے۔ لیکن مولوی غلام علی آزاد نے اس شبہ کو اس طرح رقم کر دیا کہ مسعود سعد سلمان، گو خاندان کے لحاظ سے ایرانی تھا لیکن پیدا لاہور میں ہوا تھا، اس لیے ایک ہندوستان زاد کا ہندوستان کی ہندی میں اس درجہ کمال پیدا کرنا کچھ بعید نہیں (۶۶)۔

جب سے مولانا نے ندوے کی معتمدی کی باگ اپنے ہاتھ میں سنبھالی تھی، ان کی کوشش تھی کہ اس کو ترقی کے بام و عروج پر پہنچائیں اور ترقی پر پہنچانے کے لیے اس کو لوگوں سے روشناس کروائیں اور خوبیوں کو بتلانا بھی تھا اور اس لیے مولانا کا قلم ہی موزوں تھا اور الندوہ ہی کی آواز مناسب تھی۔ چناں چہ مولانا نے نومبر ۱۹۰۶ء میں ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا "دار العلوم کی ایک اور خصوصیت" اس میں لکھتے ہیں:

"ہندوستان میں آج جس قدر عربی مدارس موجود ہیں اور جن کی تعداد سیکڑوں، ہزاروں تک پہنچ گئی، ان میں جو طلبہ تعلیم پاتے ہیں وہ صرف وہ ہیں جن کو مدرسے کی طرف سے کھانا، کپڑا ملتا ہے یا مدرسے کی سفارش پر دوسری جگہوں سے کھانا مقرر ہو جاتا ہے۔ اس واقعے سے متعدد نتائج حاصل ہوتے ہیں۔

(۱) عربی کی تعلیم صرف ان لوگوں میں محدود رہ گئی جو افلاس کی وجہ سے اور کسی قسم کی تعلیم حاصل نہیں کر سکتے۔

(۲) عربی کی تعلیم ایسی بے کار شے سمجھی جاتی ہے۔ بغیر اس قسم کی ترغیب دینے کے کوئی شخص اس طرف متوجہ نہیں ہو سکتا۔

(۳) ان مدارس میں اس قسم کا انتظام نہیں کہ ذی وجاہت لوگ اپنی اولاد کو وہاں بھیجنا گوارا کریں اس لیے امرا کا گروہ عربی اور ہندی تعلیم سے قطعاً محروم ہو جاتا ہے۔

(۴) چوں کہ صرف غریب لوگ عربی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور ان کی جماعت میں ایک شخص بھی خوشحال نہیں اور صاحب جاہ و دولت نہیں ہوتا، اس لیے اس گروہ کے خیالات اور ہمتیں پستی کی طرف مائل ہوتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ کوئی بڑا اولوالعزم شخص اس گروہ میں پیدا نہیں ہوتا۔

لیکن دار العلوم ندوہ کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ اس میں دو ثلث کے قریب وہ طلبہ نہیں جو اپنے مصارف کے خود کفیل ہیں اور اگر دار الاقامہ (بورڈنگ

ہاؤس) میں جگہ ہوتی، اس قسم کے طلبہ کی تعداد بہت زیادہ ہوتی - اس واقع سے متعدد امور ثابت ہوتے ہیں -

(۱) یہاں کی عربی تعلیم میں کچھ ایسی خصوصیت ہے کہ دولت مند اور خوشحال لوگ بھی اس کو بے کار نہیں سمجھتے -

(۲) یہاں کے دار الاقامت میں ذی وجاہت لوگ بھی اپنی اولاد کو بھیجنا گوارا کرتے ہیں -

(۳) دار العلوم سے بہت بڑا فائدہ یہ متوقع ہے کہ دولت مند گروہ میں بھی عربی اور ہندی تعلیم بقدر ضرورت رواج پائے -

اگرچہ بعض لوگوں کے نزدیک یہی امر ندوے کے برے ہونے کا بڑا ثبوت ہو سکتا ہے، کیوں کہ وہ لوگوں کو ضروری تعلیم (یعنی انگریزی) سے روک کر، ایک بیکار چیز میں پھنساتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ عربی تعلیم اگر صحیح اصول پر ہو تو وہ انگریزی تعلیم کی سد راہ نہیں بلکہ اور اس کے لیے راستہ صاف کرنے والی ہے (۶۷) -

مولانا نے الندوہ کے نومبر ۱۹۰۶ء کے شمارے میں ایک مضمون لکھا جس کا عنوان فلسفۂ یونان اور اسلام اجرام فلکی تھا - اس میں مولانا یونانیوں کے آسمان کے متعلق خیالات اور ان کے استدلال کو بیان کر کے لکھتے ہیں:

"ہم جانتے ہیں کہ ہمارے ناظرین کو ان لغو اور بے ہودہ خیالات اور دلائل کے سننے میں زحمت ہوئی ہوگی اور ان کے عزیز وقت کا بے فائدہ نقصان ہوا ہو گا، لیکن یہی بے ہودہ گورکھ دھندے یونانیوں کے مایۂ ناز ہیں اور کئی ہزار برس تک دنیا انہی مہملات کو رموز آسمانی سمجھتی رہی - بو علی سینا، محقق طوسی، قطب الدین شیرازی انہی جھوٹے طلسموں کے کلید بردار تھے اور اس پر فخر کرتے کرتے مر گئے -"

لیکن متکلمین اسلام پر یہ جادو نہ چل سکا انھوں نے اس طلسم کی دھجیاں (۶۸) اڑا دیں سب سے پہلے انھوں نے اس سے انکار کیا کہ آسمان ٹھوس ہے، مجسم ہے، حرکت کرتا ہے اور دوری حرکت کرتا ہے، ظلمات بعضہا فوق بعض، خواجہ زادہ تہافۃ الفلاسفۃ میں لکھتے ہیں: (عربی عبارت کا ترجمہ ہے) -

" ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ آسماں حرکت کرتے ہیں - ریاضی دان کہتے ہیں کہ آسمان کی حرکت مشاہدہ سے ثابت ہے، لیکن مشاہدہ سے ستاروں کی حرکت ثابت ہوتی ہے نہ آسمان کی - حقیقت یہ ہے کہ آسمان کے جو اوصاف یونانی حکماء بیان کرتے ہیں، متکلمین اس کو اس

وجہ سے بھی تسلیم نہیں کر سکتے تھے کہ وہ نص قرآنی کے خلاف ہیں۔ قرآن مجید میں صاف آیا ہے:

کل فی فلک یسبحون O

تمام ستارے آسمان میں تیرتے پھرتے ہیں (۶۹)۔

حواشی:

۱۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۵۶، ۵۔جنوری ۱۹۰۶ء

۲۔۔۔ مکاتیب دوم صفحہ ۳-۲۰۲، ۹۔جنوری ۱۹۰۶ء، الہ آباد سے

۳۔۔۔ ندوہ کا سالانہ جلسہ اور کتب نادرہ کی نمائش بنارس میں اپریل ۱۹۰۶ء میں ہوئی۔ افسوس اس سال کی روئداد ندوہ کتب خانہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، دفتر ندوۃ العلماء گوئن روڈ لکھنؤ۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ، مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے ذاتی کتب خانہ میں موجود نہیں، ورنہ مولانا کی کوشش اور ان کی کامیابی کا دستاویزی ثبوت ہوتا۔ آزاد لائبریری اور نیشنل سیکشن کے مہتمم مشتاق صاحب نے اس کی موجودگی کی تصدیق کی مگر تلاش کے باوجود نہیں ملی۔ ہاشمی۔

۴۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۳-۲۰۳، ۴۔مارچ ۱۹۰۶ء، لکھنؤ

۵۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۲۰۴ ۲۰۴۔مارچ ۱۹۰۶ء

۶۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۱۸۳، ۲۴۔مارچ ۱۹۰۶ء، لکھنؤ

۷۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۳۲۴، ۲۴۔مارچ ۱۹۰۶ء

۸۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۳-۱۸۳، ۳۱۔مارچ ۱۹۰۶ء

۹۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۲۰۴، ۱۱۔اپریل ۱۹۰۶ء

۱۰۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۲۳، ۱۳۔اپریل ۱۹۰۶ء

۱۱۔۔۔ ندوے کا سالانہ جلسہ تین دن ہوتا تھا۔ ۱۴۔اپریل سے شروع ہوا اور ۱۶۔اپریل ۱۹۰۶ء کو ختم ہوا۔

۱۲۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۵-۲۰۳، ۱۷۔اپریل ۱۹۰۶ء

۱۳۔۔۔ مولانا جواد علی خاں عالی رئیس محمد پور بشن پور ضلع بارہ بنکی اس زمانے میں ندوے کے طالب علم تھے۔ سید سلیمان ندوی کے ہم سبق تھے۔ ایک سال فیل ہو جانے کی وجہ سے سید صاحب سے پیچھے رہ گئے تھے۔ مولانا سے اور ان کے چچا سے بڑی دوستی تھی۔ مولانا سے اور ان کے چچا سے مذاق ہوتا تھا۔ چناں چہ جواد علی خاں کی شادی کے موقع پر مولانا نے اپنی شرکت کے لیے ندوے کے سلسلے میں ایک رقم کی شرط کی تھی۔ چناں چہ ان کی شادی میں شرکت کی اور شادی کے موقع پر غلط رسم و رواج کے خلاف بڑی زبردست تقریر کی قرب و جوار کے قصبات میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی تقریر تھی۔ اس سے مولانا کی بڑی شہرت ہوئی۔ جواد علی خاں صاحب بسلسلہ ملازمت حیدرآباد دکن چلے گئے تھے۔ ملازمت سے سبکدوش ہو کر واپس آچکے ہیں اور اب نجگور ضلع بارہ بنکی میں قیام پذیر ہیں۔ لکھنؤ آتے رہتے ہیں۔ راقم الحروف نے ملاقات کی ہے۔ (ہاشمی)

۱۴ــــ مکاتیب دوم، صفحہ ۵۷، ۱۸-اپریل ۱۹۰۶ء (۱۸-اپریل غلط معلوم ہوتی ہے کیوں کہ خط کے متن سے معلوم ہوتا ہے کہ جلسہ ابھی نہیں ہوا تھا اور جلسہ ۱۶-اپریل کو ختم ہو گیا تھا۔ لہٰذا ۱۸-اپریل ۱۹۰۶ء صحیح معلوم نہیں ہوتی ہے۔

۱۵ــــ مکاتیب دوم، صفحہ ۵۷-۵۸، ۱۹-اپریل ۱۹۰۶ء۔

۱۶ــــ مکاتیب دوم، صفحہ ۵۸-۵۹، ۲۱-اپریل ۱۹۰۶ء۔

۱۷ــــ رپورٹ کے متعلق مضمون۔

۱۸ــــ انگریز کا نام کرپٹی تھا اس کا اسلامی نام محمد رکھا گیا۔ یہ مسلمان ہو کر تعلیم کی غرض سے ندوہ آیا تھا۔

۱۹ــــ مکاتیب دوم، صفحہ ۵۹-۶۰، ۲۱-اگست ۱۹۰۶ء (مہینہ غلط چھپ گیا کیوں کہ اگست ۱۹۰۶ء میں مولانا بمبئی میں تھے، لہٰذا اپریل ہونا چاہیے کیوں کہ اپریل میں مولانا بنارس ہی میں تھے)

۲۰ــــ مددگار ناظم ندوہ (گل رعنا والے)

۲۱ــــ مکاتیب دوم، صفحہ ۶۰، ۲۴-اپریل ۱۹۰۶ء، بنارس

۲۲ــــ مکاتیب دوم، صفحہ ۶۰-۶۱، ۲۸-اپریل ۱۹۰۶ء۔

۲۳ــــ مکاتیب دوم، صفحہ ۶۱، ۲۸-اپریل ۱۹۰۶ء۔

۲۴ــــ مکاتیب دوم، صفحہ ۲۰۵، ۱۰-مئی ۱۹۰۶ء۔

۲۵ــــ مکاتیب دوم، صفحہ ۲۰۵-۲۰۶، ۲۵-مئی ۱۹۰۶ء۔

۲۶ــــ مکاتیب اول، صفحہ ۳۲۰، ۱۵-جولائی ۱۹۰۶ء۔

۲۷ــــ مکاتیب دوم، صفحہ ۶۲، ۲-اگست ۱۹۰۶ء۔

۲۸ــــ مکاتیب دوم، صفحہ ۲۰۶، ۴-اگست ۱۹۰۶ء۔

۲۹ــــ مکاتیب دوم، صفحہ ۲۴، ۴-اگست ۱۹۰۶ء۔

۳۰ــــ مکاتیب دوم، صفحہ ۲۴، ۴-اگست ۱۹۰۶ء۔

۳۱ــــ مکاتیب اول، صفحہ ۳۲۰-۳۲۱، ۹-اگست ۱۹۰۶ء۔

۳۲ــــ مکاتیب دوم، صفحہ ۲۰۶-۲۰۷، ۱۰-اگست ۱۹۰۶ء۔

۳۳ــــ مکاتیب دوم، صفحہ ۶۲-۶۳، ۳۱-اگست ۱۹۰۶ء۔

۳۴ــــ کلیات شبلی فارسی، صفحہ ۶۷-۶۸

۳۵ــــ کلیات شبلی فارسی، صفحہ ۶۷

۳۶ــــ کلیات شبلی فارسی، صفحہ ۶۸

۳۷ــــ کلیات شبلی فارسی، صفحہ ۶۸ تا ۷۰

۳۸ــــ مکاتیب دوم، صفحہ ۲۰۷، ۱۱-ستمبر ۱۹۰۶ء۔

۳۹ــــ مکاتیب اول، صفحہ ۳۲-۳۳، ۱۱-ستمبر ۱۹۰۶ء۔

۴۰ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۶۳، ۱۸- ستمبر ۱۹۰۶ء
مسہل دینے سے قبل اطبا مریض کو منضج دیتے- لیکن منضج میں وہ دوائیں ہوتی ہیں جو خرابی کے مادے کو تیار کرتی ہیں اور معدے کو مسہل کے لیے تیار کرتی ہیں- پھر جب مسہل دیے جاتے ہیں تو وہ مادہ خارج ہو جاتا ہے اور مرض جاتا رہتا ہے- مولانا نے منضج کو اصطلاح کے طور پر اپنے خط میں استعمال کیا ہے یعنی بمبئی والوں کو اپنی تقاریر سے اس قابل کیا کہ وہ ندوے کی بابت سننے کو تیار ہو سکیں-

۴۱ .... حامد نعمانی کے لیے مشہور ہے کہ وہ جج کے طور پر مدعی و مدعا علیہ کو ڈانٹ پھٹکار کر، کبھی پھسلا اور دھمکا کر راضی کر لیا کرتے تھے اور دونوں ان کا فیصلہ مان لیا کرتے تھے- اس کے بعد عدالت میں ان کا فیصلہ عموماً یہ ہوا کرتا تھا- Heard the case and decided in compromise - اس طرح وہ مدعی اور مدعا علیہ کا روپیہ ضائع ہونے سے بچا لیتے تھے- اور حکام اس لیے خوش رہتے تھے کہ جب سنتے تھے کہ مقدموں کی کثیر تعداد ہے اور وہ ان میں سے اکثر نپٹا چکے ہیں اور Pending cases نہ ہونے کے برابر ہیں-

۴۲ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۴، ۲۲- اکتوبر ۱۹۰۶ء
۴۳ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۰۸، ۲۶- اکتوبر ۱۹۰۶ء
۴۴ .... مکاتیب اول، صفحہ ۵۶-۱۵۵، ۵- نومبر ۱۹۰۶ء
۴۵ .... مکاتیب اول، صفحہ ۵۷-۱۵۶، ۱۴- نومبر ۱۹۰۶ء
۴۶ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۶، ۱۲- نومبر ۱۹۰۶ء
۴۷ .... یعنی محمد عوفی کی لباب الالباب جو پروفیسر براؤن نے ایڈٹ کی تھی-
۴۸ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۰۹، ۱۳- دسمبر ۱۹۰۶ء
۴۹ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۱۰، ۱۹- دسمبر ۱۹۰۶ء
۵۰ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۸۴
۵۱ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۸۵-۱۸۴
۵۲ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۱-۲۱۰
۵۳ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۸۵، ۲۴- دسمبر ۱۹۰۶ء
۵۴ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۸۶ تا ۱۸۷، ۳۱- دسمبر ۱۹۰۶ء، ڈھاکہ سے
۵۵ .... مقالاتِ شبلی جلد ہشتم، مطبع معارف- اعظم گڑھ، صفحہ ۱۹۷
۵۶ .... مقالاتِ شبلی، جلد ہشتم، مطبع معارف- اعظم گڑھ ۱۹۳۸ء
۵۷ .... مولانا محمد علی مونگیریؒ
۵۸ .... مقالاتِ شبلی، جلد ہشتم، مطبع معارف- اعظم گڑھ ۱۹۳۸ء، صفحہ ۱۱-۱۱۰
۵۹ .... مقالاتِ شبلی، جلد ہشتم، صفحہ ۱۱۲،

۶۰ ..... مقالاتِ شبلی، جلد ہشتم، مطبع معارف-اعظم گڑھ ۱۹۳۸ء، صفحہ ۶۰

۶۱ ..... اس کا مشاہدہ مولانا نے اپنے سفر میں جامعہ۔ازہر کے طلبہ کے بارے میں لکھا تھا اور بہت متنفر ہوئے تھے۔بعد میں اپنے سفرنامے میں بھی اپنے تاثر کا اظہار کیا۔

۶۲ ..... مقالاتِ شبلی جلد ہشتم، صفحہ ۶۷-۶۸

۶۳ ..... پہلے اجلاس سے مراد علمی نمائش کے سلسلے میں پہلا اجلاس

۶۴ ..... ٹاؤن ہال

۶۵ ..... مقالاتِ شبلی (فلسفیات)، جلد ہفتم، ۱۹۳۸ء، صفحہ ۹۲

۶۶ ..... مقالاتِ شبلی (ادبی)، جلد دوم، طبع دوم ۱۹۵۹ء، صفحہ ۸۰

۶۷ ..... مقالاتِ شبلی، جلد ہشتم-۱۹۳۸ء، صفحہ ۱۳۱-۱۳۰

۶۸ ..... امام غزالی نے تہافتہ الفلاسفہ میں نہایت تفصیل سے اس استدلال کی غلطیاں ظاہر کی ہیں۔علم کلام کی اور کتابوں میں بھی یہ بحث بہ تفصیل مذکور ہیں۔

۶۹ ..... مقالاتِ شبلی، جلد ہفتم، صفحہ ۲۵-۲۶

۱۹۰۷ء

مولانا شبلی، امیر کابل کا جلوس دیکھنے آگرے بدجا سکے اور ڈھاکہ سے بمبئی چلے گئے۔ ممکن ہے ریاض حسن خاں صاحب کے یہاں دوران سفر ٹھہرے ہوں۔ بمبئی میں بھی ندوے کے لیے چندے کی فراہمی پیش نظر تھی۔ بمبئی میں بھی الندوہ کی فکر تھی۔ لہذا سید سلیمان ندوی کو لکھا کہ المنار میں جو مسلمانان روس کی تعلیمی و تجارتی حالت مفصل چھپی ہے، اس کو الندوہ میں لے لیا جائے۔ اگر المنار نہ ملے تو مولانا عبداللہ عمادی (رسالہ البیان عربی کے اڈیٹر) سے وہ شمارہ منگوالیا جائے۔ یہ بھی ہدایت کی کہ ان کی (مولانا) کی کتابوں کا خیال رکھا جائے، کہیں کیڑا نہ لگ جائے۔ مولوی ضیاء الحسن علوی کاکوروی نے ایک کتاب مولانا سے مستعار لی تھی، اس کو واپس لے کر الماری میں رکھنے کی ہدایت کی اور مولوی عبدالحلیم شرر سے طبقات سبکی بھی واپس منگانے کی ہدایت کی(۱)۔

مولانا کا ارادہ تھا کہ ندوے میں دستار بندی کا جلسہ بڑی شان سے کیا جائے، لہذا انھوں نے اس جلسے کے متعلق الندوہ جنوری ۱۹۰۷ء کے شمارے میں ایک مضمون لکھا، تاکہ لوگ ندوہ کی طرف متوجہ ہوں اور اس جلسے میں شرکت کریں۔ اس مضمون کا عنوان "جلسہ دستار بندی ندوۃ العلماء" (۱۵-۱۶ محرم ۱۳۲۴ھ) (۲) تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

> "ندوہ کے مقاصد میں سے ایک بڑا مقصد ایک وسیع دارالعلوم کھولنا اور طلبہ کو جدید ضرورتوں کے موافق تعلیم و تربیت دینا تھا، چناں چہ نمونے کے طور پر ایک دارالعلوم کھولا گیا اور اس میں دو نصاب مقرر کیے گئے، ایک فراغ تحصیل کا اور دوسرا تکمیل کا۔ خدا کا شکر ہے کہ پہلے نصاب کے موافق طلبہ کی ایک جماعت فارغ التحصیل ہو گئی اور اس تقریب سے ان کی عطائے سند اور تقسیم انعام کا جلسہ ۱، ۲ مارچ ۱۹۰۷ء کو لکھنؤ میں ـــــ ہو گیا۔ ان جلسوں کی کارروائی حسب ذیل ہو گی۔
>
> ۱- مشہور علما و واعظین تقریر کریں گے اور وعظ فرمائیں گے۔
>
> ۲- طلبہ کے فارغ التحصیل مختلف علمی عنوانوں پر تقریر کریں گے، جس سے ان کی قابلیت اور لیاقت و خیالات اور قوت تقریر کا اندازہ ہو گا۔
>
> ۳- طلبہ سے عربی زبان میں مضامین لکھوائے جائیں گے۔
>
> ۴- طلبائے فارغ التحصیل کو سند دی جائے گی اور انعام تقسیم ہو گا۔

۵- تجاویز ترقی و استحکام دارالعلوم پیش ہوں گی۔
۶- ناظم ندوہ اور صدر ندوہ اور ارکان ندوہ کا جدید انتخاب ہو گا۔
تمام ہی خواہان اسلام سے عموماً اور علما و واعظین و ناظمان انجمنہائے اسلامیہ و مدارس اسلامیہ سے خصوصاً امید ہے کہ تاریخ معینہ پر ضرور تشریف لائیں۔
مہمانوں کے ٹھہرنے کا انتظام دارالعلوم ندوہ واقع گولہ گنج (۳) میں کیا جائے گا، خورد و نوش اور قیام کا انتظام ندوے کی طرف سے صرف ان لوگوں کے لیے کیا جائے گا، جو ندوہ کے ممبر ہوں، ممبر کی فیس (۴) دو روپیہ (۵)۔"

مولانا شروانی دستار بندی کے جلسے میں شرکت نہ کر سکے تو مولانا کو افسوس ہوا، کیوں کہ وہ ندوے کے ارکان خصوصی میں تھے اور ان کے شرکت نہ کرنے کا لوگوں پر برا اثر پڑا تھا۔ مولانا سے لوگوں نے ان کی عدم شرکت پر استفسار بھی کیا۔ شاہ سلیمان صاحبؒ بھی شرکت نہ کر سکے تھے، لیکن جلسہ (۶) بڑی کامیابی سے ہوا۔ اس جلسے میں سید سلیمان ندوی کی طرف سے درخواست کی گئی کہ کوئی مضمون بتلا دیا جائے، اس پر وہ عربی میں تقریر کریں۔ چناں چہ غلام الثقلین (۷) نے ایک مضمون دیا اور بغیر توقف کے سید صاحب نے نہایت مسلسل فصیح اور صحیح عربی میں تقریر کی جس سے شرکائے جلسہ پر بڑا اثر ہوا اور لوگوں نے نعرہ ہائے تحسین بلند کیے۔

اس جلسے کی خصوصیت یہ تھی کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ خاصا متاثر ہوا اور اس نے خواہش کی کہ ۱۰۔ مارچ ۱۹۰۷ء بروز یکشنبہ ایک خاص جلسہ رفاہِ عام کلب (۸) کی عمارت میں ہو اور اس میں جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور اربابِ ندوہ شرکت کریں، جس میں یہ مشورہ کیا جائے کہ ندوہ کو کس طرح ترقی دی جا سکتی ہے اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ اس کی ترقی میں کیا حصہ لے سکتا ہے۔

مولانا شروانی نے مولانا سے کلیاتِ ناظم طلب کی تو مولانا نے بھیج دی اور ان کو توجہ دلائی کہ اس میں خود مصنف کے ہاتھ کی ایک دو رباعیاں موجود ہیں۔ مولانا شروانی کے ذمے خود ان کے وعدہ کے مطابق ساٹھ روپے بابت وظیفہ تھے، لہٰذا مولانا نے وہ روپے طلب کیے (۹)۔

الندوہ پہلے مطبع آسی لکھنؤ میں چھپتا تھا بعد کو سید سلیمان ندوی نے اس کو آگرے میں چھپوانا شروع کیا، جس میں بکثرت غلطیاں تھیں۔ مولانا نے یہ دیکھ کر سید صاحب کو تنبیہ کی کہ بد خطی اور ناموزونی تو تھی ہی، اس کے علاوہ الفاظ مسخ ہو گئے تھے اور اس کو سید صاحب کیسے گوارا کرتے تھے۔ لہٰذا ان کو چاہیے تھا کہ کاپیاں خود مقابلہ کرتے یا عبدالصمد سے صحیح کراتے۔ آگرے کے کاتبوں سے ان کی علمی ناواقفیت کی بنا پر مولانا بہت بیزار تھے (۱۰)۔

مولانا کچھ عرصہ سے تصنیفی کام نہ کر سکے تھے، کیوں کہ ندوے کے کاموں میں بہت مصروف رہے اور چوں کہ مولانا کا اصلی میدان تصنیفی کام تھا۔ اس لیے انھوں نے ندوے سے چند مہینوں کی رخصت لے کر اعظم گڑھ میں اپنے بنگلے (۱۱) میں قیام کیا اور اپنے ذاتی کتب خانے کی مدد سے شعرالعجم میں مصروف ہو گئے۔ نواب علی حسن خاں صاحب کا ارادہ بمبئی یا حیدر آباد جانے کا تھا اور مولانا کو بھی ساتھ لے جانا چاہتے تھے، تو مولانا نے لکھا کہ وہ ضرور جاتے مگر ان دونوں جگہوں پر گرمی اور برسات میں لطف رہتا ہے، جب کہ شمالی ہندوستان میں گھس ہوتی ہے، اس لیے ایک ماہ بعد چلنا مناسب ہوگا۔ اس وقت تک کچھ لکھ بھی لیں گے۔ جیسی رائے ہو جواب دیں

اسی زمانے میں نواب صدر الدین خان بڑودہ اپنے چھوٹے بچے کو ندوے بھیجنا چاہتے تھے، تو مولانا نے کچھ توقف کے لیے لکھا۔ ہسٹری آف پرشین لٹریچر مصنفہ براؤن کی نواب علی حسن خان صاحب کو ضرورت تھی تو مولانا نے ان کے پاس اپنے ساتھ لے جانے کو لکھا (۱۲)۔

مولانا کو ہسٹری آف پرشین لٹریچر کی دوسری جلد کی ضرورت ہوئی تو مسٹر مہدی حسن کو لکھا کہ ٹھیکر کو لکھ دیں کہ وی پی سے مولانا کے پاس بھیج دے۔ چوں کہ مولانا جلد ہی الہ آباد جانے والے تھے اور پتھر کی گلی میں قیام کا ارادہ تھا، لہٰذا وہیں کے پتے پر کتاب منگوائی (۱۳)۔

مولانا کو الہ آباد میں مسٹر مہدی حسن کا انتظار تھا، مگر وہ اس وقت آئے جب کہ مولانا کہیں گئے ہوئے تھے، لہٰذا مولانا کو ملاقات نہ ہونے کا افسوس ہوا۔ اب دو ہی تین روز الہ آباد میں قیام کا انتظار تھا۔ ۹۔ اپریل ۱۹۰۷ء کو مولانا نے ایک غزل کہی۔ اکبر الہ آبادی کو وہ غزل بہت پسند آئی۔

مطلع یہ تھا:

من کہ در سینہ دلے دارم و شیدا چہ کنم　　میل با لالہ رخان گر نکنم تا چہ کنم

اور مقطع یہ تھا:

شاہد و بادہ و طرف چمن و جوش بہار　　شبلیا خود تو بفرما کہ بہ اینہا چہ کنم (۱۴)

موازنہ انیس و دبیر کے اجزاء جدید غزلیں اور خود مولانا الہ آباد میں موجود تھے، اس لیے مسٹر مہدی حسن کے لیے کشش تھی، بشرطیکہ وہ ملاقات کے لیے آتے (۱۵)۔

اب مولانا کے پیش نظر شعرالعجم میں فردوسی تھا، اس لیے مواد کی تلاش میں مختلف کتابیں

کھنگال رہے تھے۔ لہٰذا اسی سلسلے میں براؤن کی ہسٹری آف پرشین لٹریچر مولوی اسحٰق سے پڑھوا کر سنی اور خود بھی اپنی انگریزی استعداد کے مطابق پڑھنے کی کوشش کی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اس نے اچھا نہ لکھا تھا۔ خصوصاً فردوسی پر تو چند ہی صفحے لکھے تھے، جس سے مولانا کو مایوسی ہوئی۔ لہٰذا مسٹر مہدی حسن سے کتاب کی قیمت مع سود اور ہرجے کا مطالبہ کیا (۱۶)۔

سید سلیمان ندوی اس زمانے میں الندوہ کے سب اڈیٹر تھے۔ وہ ایک اتفاقی ضرورت سے بغیر اطلاع لکھنو سے چلے گئے۔ مولانا کو معلوم ہوا تو سخت تنبیہ کی (۱۷) اور آیندہ پرچے کے مضامین کے لیے استفسار کیا۔ مولانا کے خط کا جواب بھی سید صاحب نہ دے سکے تھے۔ مولانا اس پر بھی ناراض تھے۔ چناں چہ لکھا کہ خدا قابل طبیعتوں میں ایک نہ ایک عیب ایسا پیدا کر دیتا ہے کہ وہ دنیا میں کام نہیں کر سکتے۔ فوٹو گرافر جس نے فرامین وغیرہ کے فوٹو تیار کیے تھے اس کی رقم بھی باقی تھی اور اس کے مطالبے کے جواب میں سید صاحب نہ لکھ سکے تھے۔ اس پر بھی مولانا نے ناراضی کا اظہار کیا۔ مولانا میں یہ بڑی خوبی تھی کہ ناراضی کے ساتھ ساتھ ہمت افزائی بھی کرتے تھے، تاکہ مکتوب الیہ دل شکستہ نہ ہو۔ لہٰذا اس خط میں بھی سید صاحب سے خواہش کی ہے کہ وہ اپنی جلسہ دستار بندی والی تقریر کو پھیلا کر لکھیں، تاکہ روداد ندوہ میں شائع کی جا سکے (۱۸)۔

۱۸۔ اپریل ۱۹۰۷ء کو مولانا ایک فارسی غزل لکھ رہے تھے، جس کا ایک شعر یہ تھا:

پیکر آرائے ازل ، طلعت زیبائے ترا   نقش می بست و بروے تو تماشای کرد

اس شعر کے سلسلے میں مولوی حمید الدین فراہی سے دریافت کیا کہ اس شعر سے ملتا جلتا قدیم یا جدید شعرا کے یہاں کوئی شعر تو نہیں ہے، اس لیے کہ توارد سے بچنا چاہتے تھے (۱۹)۔ بعد کو مولانا نے اس شعر میں الفاظ کے رد و بدل سے معنویت بڑھا دی تھی اور شعر کو اس طرح کر دیا تھا:

پیکر آرا ے ازل طلعت زیبائے ترا   نقش می بست و ہم از ذوق تماشا میکرد (۲۰)

بروے تو سے چہرے کی خصوصیت ہو جاتی ہے، حالاں کہ محبوب کا ہر عضو ذوق تماشا کو دعوتِ دید ہوتا ہے۔ اس غزل کا مطلع یہ ہے:

صوفی آں سر حقیقت کہ ہویدا میکرد   ہر حدیثے کہ بجا کرد و ہم ازما میکرد

اور مقطع یہ ہے:

شبلی از قامت و بالائے تو میکرد سخن   یا مگر خود سخن ، از عالم بالا میکرد (۲۱)

عجیب اتفاق ہے کہ فارسی شاعری پر بیک وقت تین اشخاص لکھ رہے تھے، براؤن

(لٹریری ہسٹری آف پرشیا)، محمد حسین آزاد (سخندان فارس) اور مولانا شبلی (شعرالعجم)۔ براؤن کی پہلی جلد مولانا دیکھ چکے تھے اور اس سے مطمئن نہیں ہوے تھے۔ محمد حسین آزاد کی سخندان فارس کا ڈھر کا البتہ لگا ہوا تھا کیوں کہ مولانا، آزاد کی زبان اور انداز بیان کے بڑے مداح تھے اور یہ جانتے تھے کہ وہ تحقیق کے میدان میں تو نہ بڑھ سکیں گے مگر زبان اور انداز بیان میں پالا مار لے جائیں گے۔ لیکن جب سخندان فارس پڑھی تو مولانا کو اطمینان ہو گیا کہ شعرالعجم کی قدر ہو گی، اس لیے کہ گیارہ ابواب تک شعرالعجم سے مختلف رہے۔ بارھویں میں جب اس میدان میں اترے تو قلم کے جوہر دکھا چکے تھے۔ لہٰذا وہ زور باقی نہ رہا اور سرسری طور پر لکھتے ہوئے آگے بڑھ گئے، پھر بھی براؤن کی کتاب سے ان کو سخندان فارس بہتر نظر آئی (۲۲)۔

ندوے کے متعلق شاہ سلیمان پھلواروی کو کچھ غلط فہمی ہو گئی تھی۔ وہ غلط فہمی اس طرح دور ہوئی کہ شاہ صاحب مرحوم ایک جلسے میں شرکت کے لیے اعظم گڑھ آئے اور مولانا کے یہاں قیام کیا اور گفتگو کے بعد غلط فہمی دور ہو گئی۔

اگر اختلاف ان میں باہم دگر تھا — تو بالکل مدار اس کا اخلاص پر تھا (۲۳)

اختلاف دور ہونے کے بعد مولانا اور شاہ سلیمان میں یہ طے ہوا کہ ندوے کے لیے حیدر آباد (دکن) کے دورے پر دونوں جون کے مہینے میں جائیں گے۔ مولانا نے چاہا کہ مولانا شروانی بھی ہمراہ ہوں۔ اسی زمانے میں کلیاتِ جامی کا ایک نسخہ، جس پر شاہجہان کی مہر لگی ہوئی تھی، مولانا نے دیکھا اور اس کو خریدنا چاہا۔ سخندان فارس کا دوسرا حصہ مولانا کو بہت پسند آیا، مگر شعرالعجم سے مختلف تھا، اس لیے اطمینان ہو گیا۔ اسی زمانے میں مولانا نے ایک اور فارسی غزل کہی جو نواب مزمل اللہ خان کو بھیجی، مگر اس کی رسید کی اطلاع نہ ملی (۲۴)۔ اس وقت الکلام کا مصنف چوں کہ شعرالعجم کے کوچہ میں تھا اور خود شاعر تھا، اس لیے شاعری اس کے قلم سے پھوٹی پڑتی تھی۔ اس وقت کی فارسی غزلیں مولانا کی پوری عمر کی شاعری کی جان ہیں، جو شباب و شراب کی شاعری پر مبنی ہیں۔

مولانا شعرالعجم کے معاملے میں محمد حسین آزاد کی طرف سے مطمئن ہو گئے تھے، مگر مسٹر مہدی حسن نے توجہ دلائی کہ وہ تذکرۃ الشعرا میں نظم کو ہاتھ لگائیں گے اور شعرالعجم کے میدان میں آئیں گے۔ اس سے وہ متفکر ہوئے اور خیال کیا کہ اس مضمون پر ناحق قلم اٹھایا۔ اسی زمانے میں ایک صاحب کا انتقال ہوا تو مہدی حسن نے قطعہ، تاریخ کہنے کی فرمائش کی۔ مولانا نے لکھا کہ تاریخ

ضرور لکھتے مگر اب ان کا شاعری پر قابو نہیں رہا تھا، بلکہ اب وہ اس کے قابو میں تھے۔

سلطان ابو سعید ابو الخیر پر براؤن نے خاصا لکھا تھا۔ مولانا صفحات کی تعداد دیکھ دیکھ کر للچار ہے تھے اور اعظم گڑھ میں کوئی ایسا نہ تھا کہ سرسری طور سے ہی سنا دیتا (۲۵)۔

مولانا نے مولانا شروانی سے پھر خواہش کی کہ وہ حیدر آباد (دکن) ساتھ چلیں، کیوں کہ عزیز مرزا بلا رہے تھے اور ابو الکلام آزاد کے جانے کا بھی امکان تھا۔ محمد حسین آزاد نے نظم کا حصہ الگ کر دیا تھا اور تذکرۃ الشعرا کے نام سے الگ شائع کرا رہے تھے۔ اس کی ضخامت بھی سخندان فارس کے برابر تھی۔ لہٰذا یہ اطلاع مولانا شروانی کو دی اور یہ بھی خواہش کی کہ وہ سخندان فارس پر ریویو لکھ دیں، اس لیے کہ مولانا شعر العجم میں مصروف ہونے کی وجہ سے نہ لکھ سکتے تھے۔ اس ریویو کو مولانا الندوہ میں شائع کرنا چاہتے تھے۔ اب گرمی خاصی بڑھ گئی تھی، اس لیے مولانا اس کی شدت سے پریشان تھے۔

خدا بخش خان کے کتب خانہ بانکی پور کا مملوکہ نسخہ مرزا کامران کا دیوان مولانا نے دیکھا تو بہت خوش ہوئے۔ یہ نسخہ اکبری کتب خانے کا تھا، جس پر شاہجہان اور جہانگیر کے ہاتھ کی تحریریں تھیں۔ چوں کہ مولانا ایسی نادر علمی چیزوں کی تلاش میں رہتے تھے اور اس میں بخل سے کام نہ لیتے تھے، اس لیے اس کے فوٹو کرائے اور شوقین حضرات کے لیے اس کو عام کر دیا۔ لاگت کے لحاظ سے اس کی قیمت عہ ۸۔ (ڈیڑھ روپے) رکھی اور مولانا شروانی سے دریافت کیا کہ وی۔ پی سے دو نسخے بھیجے جائیں، ایک مولانا شروانی کے لیے اور دوسرا نواب عبد الشکور خان (مولانا شروانی کے چچا) کے لیے (۲۶)۔

مولانا نے مآثر رحیمی اور عبد الرحیم خان خانان کے عنوان پر اپنا مضمون (۲۷) ۱۷۔ اپریل ۱۹۰۷ء کو ختم کیا اور کتابت کے لیے بھیج دیا۔ اس سلسلے میں مولوی عبد السلام ندوی کو ہدایت کی کہ مضمون کی تصحیح کی درستی توجہ سے ہونا چاہیے۔ اگر خراب چھپا تو ان کو تکلیف ہوگی۔

جلسہ دستار بندی کی رپورٹ کے لیے متفکر رہے اور اس کے لیے مولوی عبد السلام کو یاد دہانی کی، تاکہ سید صاحب اپنی تقریر کو اور جلسے کی رپورٹ کو جلد تیار کر کے الندوہ میں شائع کر دیں۔

چوں کہ سید صاحب پر اعتماد تھا کہ الندوہ کی ترتیب بڑی خوش سلیقگی سے کریں گے اور خود بھی مضمون لکھیں گے، اس لیے مولانا نے اور کوئی مضمون نہیں بھیجا۔ پھر بھی ڈارون کی

جمہوری پر لکھنا شروع کر دیا تھا (۲۸)۔

۱۷۔ مئی کو مولانا کا حادثہ گزند پا ہوا۔ سید سلیمان ندوی اس حادثے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"۱۷۔ مئی ۱۹۰۷ء کو صبح کو دس بجے وہ میز سے اٹھ کر ہال میں تشریف لے گئے، جو ان دنوں زنان خانے میں شامل تھا یہاں تخت بچھے تھے، یہیں مولانا ایک پاؤں لٹکا کر تخت پر بیٹھ گئے۔ اس بنگلے میں باغ بھی تھا، جس میں پھلیاں لگی تھیں اور کوے آکر ان کو نقصان پہنچاتے تھے۔ مولانا کے اکلوتے صاحبزادے حامد صاحب نے ان کے اڑانے کے لیے بندوق میں چھروں کے کارتوس بھر کر رکھے تھے اور اس کو ہال ہی میں چھوڑ گئے تھے۔ مولانا نے اس بندوق کو اپنے ہاتھ سے اٹھایا تو بہت وزنی معلوم ہوئی، پاس ہی مقابل میں ان کی بہو یعنی حامد صاحب کی بیوی بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کو یہ کہہ کر دی کہ "یہ عورتوں سے تو اٹھ بھی نہیں سکتی"۔ اس دینے لینے میں ہاتھ بندوق کے گھوڑے پر پڑ گیا اور بندوق سر ہو گئی جس کا نشانہ مولانا کا پاؤں (قدم) تھا" ۔(۲۹)

اس حادثے کی تفصیل خود مولانا کی زبانی مولانا شروانی کے نام خط میں ملتی ہے، جو ۲۵۔ مئی ۱۹۰۷ء کو لکھا گیا اور ۳۱۔ مئی ۱۹۰۷ء کو ڈاک کے حوالے کیا گیا (۳۰)۔

اس ناگہانی واقعے کے خبر سے مولانا کے احباب وغیرہ کو تشویش ہوئی، چناں چہ طلبائے دار العلوم ندوۃ العلماء نے تار کے ذریعے خیریت دریافت کی۔ مولوی عبدالحلیم شرر، مولانا حکیم سید عبدالحی، نواب سید علی حسن خان، مولوی ریاض حسن خان، مولوی اعجاز حسن خان اور دوسرے احباب عیادت کے لیے گئے۔ طلبہ میں سید سلیمان ندوی اور مولانا جواد علی خان (رئیس محمد پور بشن پور، تحصیل فتح پور، ضلع بارہ بنکی، اودھ، یوپی) مولانا کو دیکھنے اعظم گڑھ گئے۔

دسویں دن ٹانکے کھولے گئے۔ ایک ٹانکے میں مواد آگیا تھا اور ۳۱۔ مئی ۱۹۰۷ء (۳۱) تک سخت تکلیف تھی۔ مولانا کے احباب اور شاگرد شاعروں کے لیے یہ واقعہ لمحہ فکریہ تھا۔ نیا مضمون ہاتھ آگیا تھا، فکر کو جولانی کا موقع ملا اور شاعری میں نئے نئے مضمون باندھے اور پاؤں کٹنے کی عجیب عجیب توجیہیں کیں۔ خود مولانا نے بھی اس واقعے سے شاعرانہ فائدہ اٹھایا اور مزاح کا سامان پیدا کیا۔

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ مولانا اس دن شعر العجم میں فردوسی کے شاہنامہ پر تبصرہ

لکھ رہے تھے اور اس کو اتفاق کہیے یا فال بد کہ اس تبصرے کو اس شعر پر ختم کیا تھا:

بریدہ و دریدہ و شکستہ و بہ بستہ   یلاں را سر و سینہ و پا و دست

اور اس کے بعد ہی زنان خانے میں تشریف لے گئے اور یہ حادثہ پیش آیا (۳۲)۔

سید سلیمان ندوی، حادثے کی اطلاع پا کر دیر میں پہنچ پائے، اس لیے معذرت کے طور پر عربی نظم کے چند شعر کہے۔ مطلع یہ ہے:

دع اغترف منک بحر الفضل و الحکما   واقتبس منک شمس العلم و العلما

مجھے اے فضل و حکمت کے سمندر چلو بھر کے پانی دے اور اے علم اور عالموں کے آفتاب مجھے اپنے سے روشنی حاصل کرنے دے (۳۳)۔

چند اشعار یہ ہیں:

اے ذات تو در علم و عمل گشتہ علم   و اے مفتخر از وجود پاکت عالم
یک پاے تو چوں شد بعدم دانستم   داری دو جہاں، سرور ما! زیر قدم

اے آنکہ تو اہل قوم را ملجائی   حق داد ترا بہ ملک فن دارائی
چوں نسبت سے بہمسر تو در پایہ   پس پاے ترا ہمی سزد یکتائی

صد حیف ہوا شکستہ پاے شبلی   اب سلسلہ سفر بھی مفقود ہوا
مشتاق زیارت جو ہو خود آئے یہاں   رہبر جو تھا اب کعبہ مقصود ہوا

اللہ نے آپ کو جو ممتاز کیا   ہر وصف میں بے نظیر و انباز کیا
باقی تھا فقط فخر شہادت ملنا   اک پاؤں کو اس سے بھی سرافراز کیا (۳۴)

"احباب نے بھی رباعیاں لکھیں، الندوہ کے لیے بھیج دوں گا (۳۵)۔ ایک صاحب کو خوب مضمون ہاتھ آیا (۳۶) کہتے ہیں:

کیا اس سے بھی ہو گی کوئی ساعت منحوس   زخمی ہوا جب کہ پائے شبلی افسوس
اک پاؤں، عدم کو کیوں نہ جاتا اقبال (۳۷)   تھا اہل فنا کو اشتیاق پا بوس"

سید سلیمان ندوی حیات شبلی میں لکھتے ہیں:

"خود مولانا نے بھی اس حادثے پر کئی نظمیں کہیں۔

بلنا بھی جگہ سے گرچہ اب ہے دشوار　　اس پر بھی خدا کا شکر ہے احساں ہے
یعنی کہ پہنچ چکا ہوں جس منزل تک　　یاں سے سفرِ عدم بس اب آساں ہے
ہرچند کہ زخم سخت جاں فرسا تھے　　آثار ہلاک سربسر پیدا تھے
ممنون ہوں ضبط کا کہ اس حال میں بھی　　گو پاؤں کٹے قدم برجا تھے
مقبول نہیں ہے بے نوائی میری　　آلودۂ نخوت ہے گدائی میری
تقدیر نے پاؤں کاٹنے پر بس کی　　ناقص ہے ابھی بے سروپائی میری

OOO

حالت از گردش ایام اگر گشت تبر　　صبر فرما کہ ازیں نیز تبری بالیست
شبلی نامہ سیہ را بجز اے غمکش　　پا بریدندہ صدا خاست کہ سری بالیست

مولوی اقبال سہیل نے مولانا کی شکستہ پائی کے متعلق لاجواب شعر کہے ہیں۔ کہتے ہیں:

کیجیے نہ غم شکست پا مولانا　　اس میں بھی تھی حکمت خدائے دانا
تھی اہل عدم کو آرزوئے پابوس　　اک پاؤں وہاں بھی چاہیے تھا جانا

اور مولانا کے پہلے قطعے کے جواب میں سہیل نے یہ قطعہ لکھا:

شکستہ پائی تو تھی سرنوشت میں حضرت　　نہ ہاتھ آئے گا کچھ اب تو ہاتھ ملنے سے
عدم کی دور ہے منزل نہ جا سکیں گے حضور　　چلے گا قوم کا کام آپ کے نہ چلنے سے

مولوی عبدالسلام ندوی نے بھی ایک رباعی لکھ کر پیش کی تھی جو محفوظ نہیں رہی۔ صرف ایک مصرع محفوظ رہ گیا، جو یہ ہے:

ہمت کا قدم زمیں میں اب گاڑ چکے

اسی مہینے میں موازنہ انیس و دبیر شائع ہوئی تھی۔ اس کو پیش نظر رکھ کر سید سلیمان ندوی نے بھی ایک قطعہ کہا تھا:

تنقید مراثی کے صلے میں استاد　　دربار حسینی نے سعادت بخشی
پرسر سے ابھی کام تھا لینا باقی　　اس واسطے پاؤں کو شہادت بخشی (۳۸)

مولانا کے طویل (۳۹) خط کے جواب میں مولانا شروانی نے خیریت دریافت کی تو ان کو پھر اپنی حالت کے بارے میں لکھا کہ زخم کی حالت دس بارہ دن تک اچھی تھی مگر بعد کو ورم آنے

گی، جس کا سلسلہ ۶۔ جون تک جاری تھا۔ اسسٹنٹ سرجن دن میں دو بار زخم دھوتا تھا۔ تکلیف میں کمی نہیں ہوئی تھی، لیکن مولانا کو اس سے قلبی سکون تھا کہ بزرگوں نے سر کٹوائے تھے، پاؤں کٹنے پر کیا روتے۔ فصبرٌ جمیلٌ۔ خط و کتابت میں البتہ دشواری تھی، اس لیے کہ اعزا تیمار داری میں مصروف تھے (۴۰)۔

۱۶۔ جون تک مولانا کی رگوں میں تشنج اور کھچاوٹ رہی، جس کی وجہ سے راتوں کو نیند نہیں آتی تھی، لیکن اب زخم بھر گیا تھا (۴۱)۔

۲۶۔ جون تک مولانا کا زخم برائے نام باقی رہ گیا تھا۔ تکلیف میں بھی کمی تھی۔ مولوی ریاض حسن خان نے کچھ اشعار لکھے تھے۔ ان کے کلام کی مولانا نے داد دی اور ان کے بھیجے ہوئے لیچی کے پارسل کے نہ ملنے کی اطلاع دی۔ وہ پارسل اسٹیشن ماسٹر نے غلطی سے ایک شخص شمشیر خان کو دے دیا، کیوں کہ ان کے نام بھی مظفر پور ہی سے پارسل آیا تھا (۴۲)۔

چند نایاب کتابیں فروخت کو آئیں تو مولانا شروانی کو اطلاع دی اور ان کے نام لکھے، مثلاً مثنوی گودی و چوگان، مناجات عبد اللہ انصاری، کلیات جامی سلاطین اور امرا کی مہر شدہ جو شاہجہان کے کتب خانے کا نسخہ تھا اور خوشخط اور مکمل تھا اور مصنف کے قریب کے زمانے کا لکھا ہوا تھا۔ کلیات قمی اور مثنوی مولانا روم، عالمگیری کتب خانے کی، جس کو ملتفت خاں نے پیش کیا تھا، اس پر بھی شاہی مہریں تھیں (۴۳)۔

سید سلیمان ندوی کو الندوہ کے متعلق پھر ہدایت کی کہ اگر آگرے میں صحیح بھی چھپا تو بدخطی اور خرچ کی زیادتی تو پھر بھی باقی رہے گی اور اس صورت میں پرچہ نہ نکل سکے گا۔ اگر مضامین وقت پر مل جایا کریں تو مطبع آسی لکھنو میں بھی دیر نہ ہو۔ مولانا شبلی کا لکھنو میں دار العلوم ندوۃ العلماء کی قدیم عمارت (۴۴) میں سب سے بلند کمرے پر قیام رہتا تھا۔ جب سید سلیمان ندوی نے مولانا کے پیر کے حادثے کے بعد لکھنو آنے کے لیے لکھا تو جواب میں لکھا کہ اگر کوٹھے پر قیام کیا تو حضرت ادریس کی طرح پھر کبھی اترنا نصیب نہ ہوگا۔ اگر کوئی دوسرا مکان مل جاتا تو آنے کے لیے تیار تھے (۴۵)۔

مولانا کا ارادہ تھا کہ بمبئی جا کر لکڑی کا مصنوعی پیر بنوائیں، لہٰذا لکھنو آنے کا ارادہ بھی تھا نواب محسن الملک نے لکھا تھا کہ وہاں کے مشہور ڈاکٹر بلا معاوضہ علاج کریں گے اور قیام کا بندوبست بھی انھیں کی طرف سے ہوگا، مگر مولانا ابھی حرکت بھی نہ کر سکتے تھے۔ مولانا کا ارادہ تھا

کہ احباب کے خلوص اور محبت کی بنا پر حادثہ، گزندپا کے سلسلے میں بھیجی ہوئی رباعیاں الندوہ میں شائع کرنے کے لیے بھیج دیں۔ مولوی اقبال احمد بی۔ اے کے اشعار بھی سید سلیمان ندوی کو لکھے، (۴۶) جو اوپر نقل کیے جا چکے ہیں (۴۷)۔

مولانا شروع اگست میں لکھنو آگئے تھے اور ڈاکٹر عبدالرحیم کو دکھلایا۔ (یہ مولانا عبداللہ غازی پوری کے داماد تھے اور ان کا قیام جھاؤلال کے پل پر تھا۔) انھوں نے ایک مرہم بنا کر دیا مگر اس سے فائدہ نہ ہوا (۴۸)۔ جس حد تک فائدہ ہو گیا تھا اس سے آگے نہیں بڑھ رہا تھا۔ اپنی حالت سے مولوی حمید الدین کو، جو اب علی گڑھ کالج میں اسسٹنٹ عربک پروفیسر ہو گئے تھے، مطلع کیا اور جو تین ماہ اعظم گڑھ میں فضول ضائع (۴۹) ہوئے تھے، اس سے افسردہ تھے۔ مولوی حمید الدین کو دعوت دی کہ آکر ندوہ کے بالاخانے پر قیام کریں اور تفسیر کا درس دیں۔ اگر جی نہ چاہے تو نہ سہی البتہ دروس الاولیہ کا ایک سبق طلبہ کو پڑھائیں اور چوں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بلند پایہ بنایا تھا تو بلند خیال بھی بننا چاہیے تھا۔ مولانا کا ارادہ بمبئی جانے کا تھا اس لیے چاہتے تھے کہ ان کی موجودگی ہی میں وہ لکھنو پہنچ جاتے (۵۰)۔

مولانا کو پیر میں تکلیف اور تشنج کی شکایت ۲۹۔ اگست کو بھی تھی۔ گویا مکمل آرام نہیں ہوا تھا۔ مولانا کے ماموں زاد بھائی رشید الدین انصاری نے مرزا غالب کے متعلق کچھ دریافت کیا تھا، تو ان کو لکھا کہ مولوی حالی کی کتاب کے بعد کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں ہے (۵۱)۔

مولانا نے الندوہ میں ایک مضمون حکمائے اسلام اور مسئلہ، ارتقا پر لکھا تھا۔ اس پر بعض حلقوں سے اعتراضات کا سلسلہ شروع ہو گیا تو سید سلیمان ندوی نے قرآن مجید اور مسئلہ، ارتقا کی سرخی کے تحت ایک مضمون الندوہ میں شائع کیا۔ اس پر مولانا نے ناراضی کا اظہار کیا اور ناراضی کی وجہ یہ لکھی کہ اس سے کم ظرفوں کا حوصلہ بڑھتا ہے کہ ہم بھی لتنے ہوئے کہ لوگ ہمارا جواب لکھیں۔ پھر یہ بھی کہ کون سمجھے گا کہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے، سب یہی سمجھیں گے کہ مولانا ہی نے لکھا ہے۔ اس لیے مولانا نے سید سلیمان ندوی کو ہدایت کی کہ ان کی ناراضی ظاہر کریں۔ مضمون کے بارے میں بھی لکھا کہ مولانا روم کے شعروں سے استدلال کرنے کی ضرورت تھی، اس لیے کہ وہ ارتقا کے قائل تھے اور قرآن مجید کے مخالف نہ تھے۔ کسی نے الفاروق کا رد بھی لکھا تھا اور اس نے حوالوں کی غلطیاں بھی نکالی تھیں۔ اس پر مولانا کو تعجب ہوا، اس لیے کہ حوالوں کے معاملے میں وہ بڑی احتیاط کرتے تھے۔ مولانا نے حوالے کی، غلطیوں کی کچھ مثالیں معلوم

کیں تاکہ ان کو اصل سے مقابلہ کر کے دیکھا جائے۔ سید سلیمان ندوی نے طبری کے راوی سری کے متعلق دریافت کیا کہ کون تھا، تو ان کو جواب میں لکھا کہ تاریخ طبری ماخوذ ہے۔ لیکن انھیں رجال کی تمام کتابوں میں، حتیٰ کہ تاریخ اسلام ذہبی میں بھی اس شخص کا پتا نہیں چلا۔

اب ندوے کی طرف صوبائی حکومت کی نگاہیں اٹھ رہی تھیں اور ندوے سے دریافت کیا گیا تھا کہ ندوہ کس قسم کی امداد لینا پسند کرے گا، تو مولانا کی راے یہ ہوئی کہ صوبائی حکومت کو لکھا جائے کہ مالی اور اعزازی دو نوع امداد چاہییں۔ مولانا نے مشیر حسین (۵۲) قدوائی بیرسٹر و تعلقدار گدیہ ضلع بارہ بنکی کو بھی لکھنے کا ارادہ کیا کہ وہ حکومت سے ندوے کی امداد کے سلسلے میں خط و کتابت کریں اور اثر کو کام میں لائیں (۵۳)۔

اب مولانا شعرالعجم کا پہلا حصہ رکاوٹوں کے باوجود مکمل کر چکے تھے اور مطبع میں بھی بھیج چکے تھے۔ اگرچہ پہلے حصے سے مطمئن نہ تھے، اس حصے کو نظامی پر ختم کر دیا تھا۔ دوسرے حصے کے لیے مولانا کو امیر خسرو کی غرۃ الکمال کے دیباچے کی ضرورت تھی اور کمیاب ماخذوں کی تلاش میں تھے، لہٰذا مولانا شروانی سے بھی دریافت کیا۔

ہفتہ بھر سے بخار میں مبتلا تھے اور اس زمانے میں مسہل لے رہے تھے۔ بھوپال سے بلایا جا رہا تھا لیکن نہ جا سکے۔ ندوے کا ایک وفد حیدر آباد (دکن) جانے والا تھا۔ اس میں نواب علی حسن خان، مشیر حسین قدوائی اور شاہ سلیمان پھلواروی شامل تھے۔ مولانا چاہتے تھے کہ مولانا شروانی بھی وفد میں شامل ہو جائیں تاکہ (۵۴) رباعی مکمل ہو جائے (۵۵)۔

ندوے کے نصاب میں ہدایۃ النحو کے بعد اوضح المسالک ابن ہشام درس میں تھی۔ مولانا کا خیال تھا کہ اس سے بہتر آسان اور جامع مسائل پر کوئی کتاب نہیں ہو سکتی۔ مولانا کو شکایت تھی کہ مولانا شروانی ندوہ تشریف نہیں لاتے تھے۔ ان کے آنے سے ندوے کی وقعت ہوتی تھی، ورنہ لوگ سمجھتے تھے کہ ایک مردہ (ندوہ) کے سرہانے ایک از کار رفتہ (مولانا شبلی) بیٹھے ہوئے ہیں۔ مولانا شروانی کا اور نواب مزمل اللہ خاں کا وظیفہ اب تک نہ آیا تھا، اس کے لیے بھی مولانا نے یاد دہانی کی۔

یہ رمضان شریف کا زمانہ تھا، لہٰذا مولانا کا ارادہ تھا کہ بعد رمضان حیدر آباد (دکن) جائیں۔ اس زمانے میں مولانا دارالعلوم کی زمین کے لیے متفکر تھے۔ دو چار معزز ارکان کے منتظر تھے تاکہ مشورے سے ایک بات طے کر لی جاتی (۵۶)۔

اب مولانا الہ آباد میں تھے اور عالمگیر پر مضمون لکھ رہے تھے، لہذا برنیر کی کتاب (اورنگ زیب پر) مسٹر مہدی حسن کی مولانا کے پاس تھی، لیکن اس کا مطالعہ (۵۷) ۴۔ نومبر ۱۹۰۷ء کو ختم کر چکے تھے۔ مولانا نے یہ کتاب مسٹر مہدی حسن کو واپس کر دی تھی، مگر وہ اسے لے جانا بھول گئے۔ اس لیے اس کو احتیاط سے رکھوا دی اور مسٹر مہدی حسن کو اطلاع دی کہ کتاب واپس لے لی جائے (۵۸)۔

مولانا شعر العجم کے دوسرے حصے کے ساتھ ساتھ مضامین عالمگیر بھی لکھ رہے تھے، اس لیے مسٹر مہدی حسن سے سخندان فارس اور ترجمہ لین پول عالمگیر طلب کیا (۵۹)۔

۱۷۔ نومبر کو حیدر آباد (دکن) جانے کے لیے ندوے کا وفد بالکل تیار تھا، جس میں شامل ہونے کے لیے مولانا نے مولانا شروانی کو لکھا تھا۔ اس لیے مولوی حکیم سید عبد الحی مددگار ناظم ندوہ کو مولانا نے اخراجات کی رقم کے لیے لکھا کہ بھیجیں اور اگر شاہ ابو الخیر (فصیحی غازی پوری) بھی وفد میں شامل ہوں تو رقم زیادہ چاہیے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کو بھی لے جانا مناسب سمجھتے تھے اور شاہ سلیمان صاحب قادری کا لے جانا تو ضروری سمجھتے تھے (۶۰)۔

۲۳۔ نومبر کو مولانا کو تشنج کی شکایت نہ تھی لیکن ابھی زخم باقی تھا (۶۱)۔ ۲۳۔ نومبر ۱۹۰۷ء کو میر اکبر حسین صاحب اکبر الہ آبادی نے مولانا کو دعوت کا ایک منظوم رقعہ بھیجا، جس میں یہ اشعار تھے:

آتا نہیں مجھ کو قبلا قبلی   ہے بات یہ صاف بھائی شبلی
مل جائے یہاں جو دال دلیا   سمجھو تم اسے پلاؤ قلیا (۶۲)

مولانا نے منظوم رقعہ کے جواب میں منظوم جواب لکھا، جس میں یہ اشعار ہیں:

آج دعوت میں نہ آنے کا مجھے بھی ہے ملال   لیکن اسباب کچھ ایسے ہیں کہ مجبور ہوں میں
آپ کے لطف و کرم کا مجھے انکار نہیں   حلقہ درگوش ہوں، ممنون ہوں مشکور ہوں میں
لیکن اب (۶۳) میں وہ نہیں ہوں کہ پڑا پھرتا تھا   اب تو اللہ کے افضال (۶۴) سے تیمور ہوں میں
دل کے بہلانے کی باتیں (۶۵) ہیں یہ شبلی ورنہ   جیتے جی مردہ ہوں، مرحوم ہوں، مغفور ہوں میں (۶۶)

پہلی دسمبر کو مولانا بھوپال میں تھے اور نومبر کے آخر میں آچکے تھے۔ یہاں سے بمبئی جانے ... اپنا پاؤں بنوانا تھا۔ واپسی میں حیدر آباد (دکن) جانا تھا۔ اس زمانے میں

مولانا ندوے کی عمارت کی تعمیر کے سلسلے میں بڑے متفکر رہے ۔ تعمیر کے سلسلے میں جو بھی منصوبے اب تک بنائے تھے وہ غلط ثابت ہوئے تھے ۔ ریاض حسن خاں کے بھانجے مولوی ابوالمجد سید محی الدین احمد جعفری ندوی اس زمانے میں ندوے میں تعلیم پا رہے تھے ۔ مولانا کو جب علم ہوا کہ یہ ریاض حسن خان کے بھانجے ہیں تو ان کو بلا کر ملے اور بہت خوش ہوئے اور ان کی تعلیمی دیکھ بھال کا ارادہ کیا (۶۷) ۔

شاہ سلیمان پھلواروی بمبئی پہنچنے والے تھے تاکہ حیدر آباد (دکن) مولانا کے ساتھ جائیں، لیکن مولانا کا خیال تھا کہ وہ بمبئی سے سمندر کے راستے کراچی جائیں گے، اس کے بعد حیدر آباد (دکن) ۔ مولانا کو اس میں اعتراض نہ تھا، حیدر آباد (دکن) جانا تھا، کراچی کے بعد ہی سہی ۔

اس وفد میں مولانا اب شاہ ابوالخیر فصیحی غازی پوری کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے، لیکن اس کا اندیشہ تھا کہ شامل نہ کرنے سے کہیں وہ ناراض نہ ہو جائیں ۔ بہر حال مولانا ان کو لے جانے کو تیار تھے، لیکن اندازہ یہ تھا کہ وفد کے ارکان جنوری ۱۹۰۸ء سے پہلے نہ پہنچ سکیں گے ۔ مولانا چاہتے تھے کہ شروانی صاحب ضرور جاتے، اس لیے حکیم عبدالحی صاحب کو لکھا کہ وہ لکھیں کہ شروانی صاحب کراچی سے بمبئی جائیں اور وہاں سے حیدر آباد (دکن) ۔ خود مولانا شروانی حیدر آباد کے شائق بھی تھے ۔ پاؤں کے چلنے میں ابھی دیر تھی اس لیے خیال تھا اس کا انتظار کیے بغیر حیدر آباد (دکن) جانا ہوگا ۔ ندوے سے رپورٹ دارالعلوم کی کاپیاں طلب کیں، کیوں کہ بمبئی اور حیدر آباد (دکن) والوں میں تقسیم کرنا تھیں (۶۸) ۔

مولانا نے اپریل یا مئی ۱۹۰۷ء کے الندوہ کے شمارے میں ایک مقالہ "مآثر رحیمی" اور "عبدالرحیم خان خانان" کے عنوان کے تحت لکھا، جس میں وہ لکھتے ہیں:

> "کہنا یہ تھا کہ اب بھی بہت سی علمی یادگاریں ایسی موجود ہیں، جن سے مسلمانوں کی تصنیفات کے متعلق جو رائے قائم ہو چکی ہے، دفعۃً بدل جاتی ہے ۔ ہمارا خیال تھا کہ فارسی مورخوں نے صرف سلاطین اور رؤسا کے حالات قلم بند کیے ہیں ۔ وزرا، امرا، سپہ سالار اور فوجی افسروں کے حالات مستقل تصنیفوں میں اس طرح نہیں لکھے تھے جس سے ظاہر ہو کہ انھوں نے کس طرح تعلیم و تربیت پائی، کیا کیا فن حاصل کیے، کیا کیا کارنامے دکھائے، رفاہ عام کے کیا کیا کام کیے، کن کن چیزوں کو رواج دیا، کون کون سی باتیں ایجاد کیں، ذاتی شوق کی کیا کیا چیزیں تھیں وغیرہ وغیرہ ۔
> لیکن دسمبر ۱۹۰۶ء میں جب میں کلکتہ گیا تو ایشیاٹک سوسائٹی میں مآثر رحیمی کا ایک نسخہ

نظر سے گزرا - یہ کتاب عبد الرحیم خان خانان کے حالات میں ہے، جو اکبر شاہ کا سپہ سالار تھا، مصنف کا نام عبد الباقی ہے، جو ایران کا باشندہ ہے اور ایک معزز خاندان کا ممبر تھا، کتاب خود خان خانان کی زندگی میں لکھی گئی ہے اور سرمایہ، معلومات زیادہ تر ذاتی مشاہدہ اور سرکاری کاغذات ہیں - یہ نسخہ مصنف کا اصلی مسودہ ہے، جو کسی کتاب سے لکھوایا ہے، لیکن الحاقات اور اضافے مصنف نے اپنے ہاتھ سے لکھے ہیں - بعض جگہ سادے صفحے چھوڑ دیے ہیں اور لکھا ہے کہ مزید اطلاع کے لیے صفحے خالی چھوڑ دیے گئے تھے - لیکن چوں کہ حالات نہ مل سکے، اس لیے یہ جگہ سادی کی سادی رہ گئی سرورق پر امرائے شاہی کی مہریں ہیں، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ نسخہ اکثر امرا کے کتب خانوں میں رہ چکا ہے - مولوی غلام علی آزاد نے خزانۂ عامرہ میں لکھا ہے کہ "میں نے اس کتاب کا اصلی مسودہ دکن میں دیکھا تھا، جس پر الحاقات خود مصنف کے ہاتھ کے تھے - " غالباً یہ وہی نسخہ ہے جو دکن سے کلکتہ پہنچ گیا - کتاب کی ضخامت دو ہزار صفحوں کی ہے - نصف کے قریب خان خانان کے اسلاف اور سلاطین تیموری کے حالات ہیں، باقی نصف خود خان خانان کے کارنامے ہیں (۶۹) - "

مولانا نے ایک اور مقالہ "فلسفۂ اسلام"، "مسئلۂ ارتقا اور ڈارون" پر لکھا جو الندوہ کے جون ۱۹۰۷ء کے شمارے میں شائع ہوا - وہ اس میں لکھتے ہیں:

"ڈارون کی ۲۰ برس کی پیہم کوشش اور غور و محنت کی داد ہمارے ملک نے تو یہ دی ہے کہ وہ انسان کی اصل بندر قرار دیتا ہے - اس لیے خود بندر قرار دیتا ہے، اس لیے خود بندر ہے - لیکن ایک ایسا مسئلہ جس کو قریباً یورپ کے تمام حکما تسلیم کرتے جاتے ہیں، اس قابل نہیں کہ اس کو ہنسی میں اڑا دیا جائے - اس لیے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ پہلے یہ بتائیں کہ اس مسئلے کی حقیقت کیا ہے، ڈارون کا کیا دعویٰ ہے، اس کے کیا اصول ہیں؟ پھر یہ دیکھیں کہ حکمائے اسلام کا اس کے متعلق کیا خیال تھا (۷۰) - "

آگے چل کر لکھتے ہیں:

"عام لوگوں کا خیال ہے کہ دنیا جب پیدا ہوئی تو جمادات، نباتات، حیوانات سب ایک ہی زمانے میں پیدا ہوئے اور الگ الگ پیدا ہوئے - ڈارون کی رائے ہے کہ پہلے صرف نوع پیدا ہوئی، وہی ترقی کرتے کرتے انسان کی حد تک پہنچ گئی -

یہ ظاہر ہے کہ دونوں احتمالوں میں سے کوئی قطعی نہیں، یوں بھی ہو سکتا ہے اور دوں بھی، اس لیے اتنا تو بہرحال مان لینا چاہیے کہ ڈارون جو کچھ کہتا ہے، وہ

ایسی چیز نہیں جس کی ہنسی اڑائی جائے - وہ بھی ایک احتمال ہے اور تم جو کہتے ہو وہ بھی احتمال ہے اور دونوں میں کوئی قطعی اور یقینی نہیں (۱۷)-"

مولانا نے ایک اور مضمون "جذب یا کشش" پر ستمبر ۱۹۰۷ء کے الندوہ میں لکھا جس میں وہ لکھتے ہیں:

"سر آیزک نیوٹن، یورپ کا مشہور فلاسفر ہے، جو ۱۶۴۲ء میں پیدا ہوا اور ۱۷۲۷ء میں وفات پائی - یورپ کا خیال ہے کہ مسئلہ کشش یعنی یہ کہ ہر جسم دوسرے جسم کو اپنی طرف کھینچتا ہے، اسی فلسفی کی ایجاد ہے اور سیکڑوں فلسفیانہ مسائل اسی مسئلے پر مبنی ہیں -

لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسئلہ کشش مختلف صورتوں میں مدت دراز سے تسلیم ہوتا چلا آتا ہے - یہ نہایت قدیم خیال ہے کہ ہر شے اپنے مرکز کی طرف کھنچتی ہے اسی بنا پر یونانی یہ خیال کرتے تھے کہ ڈھیلا جب اوپر پھینکنے کے بعد زمین پر گرتا ہے تو اس وجہ سے گرتا ہے کہ اس کا مرکز یا حیز طبعی زمین ہے، اس لیے زمین اس کو اپنی طرف کھنچتی ہے - اس مسئلے کو غلطی سے یونانیوں نے بے موقع بھی وسعت دی - مثلاً یہ کہ آگ کا شعلہ اس لیے اوپر کو اٹھتا ہے کہ آگ کا مرکز زمین سے اوپر ہے اور اسی لیے شعلہ اپنے مرکز کی طرف جانا چاہتا ہے، حالاں کہ اس کی وجہ یہ نہیں، بلکہ یہ وجہ ہے کہ ہلکی چیز بھاری چیز کے اوپر ہوتی ہے -

لیکن ہم کو اس غلطی سے اس موقع پر بحث نہیں، صرف یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ کشش کا خیال نہ تھا بلکہ ایک خاص صورت یعنی کشش مرکزی تک محدود تھا (۲۷)-"

نواب محسن الملک اکتوبر ۱۹۰۷ء میں شملہ میں تھے کہ ان کا انتقال (۳۷) ہو گیا - مولانا شبلی ان کے اور وہ مولانا شبلی کے بڑے قدر داں اور مداح تھے - مولانا کو بڑا صدمہ اور افسوس ہوا اور اس کا اظہار مولانا نے اپنے ایک تعزیتی مضمون "ہائے نواب محسن الملک مرحوم" میں الندوہ اکتوبر ۱۹۰۷ء میں کیا، جس میں وہ لکھتے ہیں:

"آج ہماری قدیم تعلیم و تربیت کی ایک اور یادگار مٹ گئی - جدید تعلیم ایک مدت سے جاری ہے اور آج سیکڑوں ہزاروں تعلیم یافتہ بڑے بڑے خدمات پر ممتاز ہیں، لیکن قومی علم ابھی تک ان ہی لوگوں کے ہاتھ میں ہے، جنھوں نے کالجوں کے ایوانوں میں نہیں، بلکہ مکتب کی چٹائیوں پر تعلیم پائی تھی - جدید تعلیم بھی انھی کی بدولت پھیلی اور آج خود جدید تعلیم یافتہ گروہ ان ہی کے اشاروں پر حرکت کر رہا

ہے۔

لوگوں کو ڈر تھا کہ سرسید مرحوم کے بعد ان کے منصوبوں کو کون انجام دے گا؟ لیکن خدا نے ان ہی کے ہم نشینوں میں سے ایک ایسا شخص (نواب محسن الملک) پیدا کر دیا جو اور امور میں گو سرسید کا ہمسر نہ تھا، لیکن کالج کی ترقی، وسعت اور مقبول عام بنانے میں سرسید سے کسی طرح کم رتبے پر نہ تھا۔ اس نے تھوڑی مدت میں سات، آٹھ لاکھ روپیہ جمع کر دیا۔ کالج کی ہر شاخ اس قدر ترقی کر گئی کہ اگر کوئی شخص جس نے سرسید مرحوم کی زندگی میں کالج کو دیکھا تھا آج جاکر دیکھے تو کالج کو پہچاننا مشکل ہو گا۔ کانفرنس جو روز بروز پژمردہ ہوتی جاتی تھی، نواب محسن الملک مرحوم نے اس کو دوبارہ زندہ کیا اور لاہور سے ڈھاکہ تک اس کے ڈانڈے ملا دیے "۔(۷۴)

مولانا کے حادثہ، گزند پا کے سلسلے میں احباب شاعروں کو ایک مضمون ہاتھ آگیا تھا۔ اس حادثہ کی شاعروں نے عجیب عجیب توجیہیں کی تھیں اور ان کی تسلی کے سامان بہم پہنچائے تھے۔ چناں چہ سید سلیمان ندوی مولانا شروانی کا ایک مقولہ لکھتے ہوئے اس طرح کہتے ہیں:

"حادثہ جو ہونا تھا ہو گیا، مگر بقول مولانا شروانی "علمی آدمیوں کی ہر بات علمی ہوتی ہے"۔ اس حادثے نے علم و ادب کا ایک نیا پہلو سامنے کر دیا۔ مولانا حالی مرحوم، نواب سید علی حسن خان مرحوم، خواجہ عزیز الدین مرحوم اور تلامذہ میں مولوی اقبال احمد صاحب سہیل، مولوی عبدالسلام صاحب اور خاکسار نے متعدد رباعیاں کہیں، جن میں اس واقعے کی عجیب عجیب لطیف شاعرانہ توجیہات کی گئیں۔ مولانا نے یہ تمام رباعیاں راقم کو عنایت فرمائیں اور راقم نے مناسب سمجھا کہ دوسرے غمزدوں کو بھی حسن تعلیل کے اس تسلی نامے میں شریک کرے، اس لیے ان کو ستمبر اور اکتوبر ۱۹۰۷ء کے الندوہ میں شائع کر دیا گیا۔

(مولانا حالی)

-----ooo-----

(نواب سید علی حسن خان)

شبلی! ترے قوم پر بہت احساں ہیں — باتیں تری، درد قوم کی درماں ہیں
اک پاؤں اگر گیا تو کچھ رنج نہ کر — اس ایک قوم پہ لاکھ سر قرباں ہیں

(خواجہ عزیز الدین مرحوم)

اے پایہ، تو بلند تر از افلاک — پلٹت چو بریدہ شد، چہ ہستی غم ناک؟

زیر قدمت بلندی و پستی ہست پاے بفلک داری و پاے بر خاک (۷۵)"

مولوی اقبال سہیل بڑے پرگو شاعر تھے۔ انھوں نے بکثرت اشعار لکھے تھے، جس میں سے ایک یہ ہے:

جادت یمینک بالاسفار من قلم به غدی ذرة ماکان مخشابا (۷۶)

تیرے ہاتھ تصنیفات کی سخاوت ایک ایسے قلم سے کی ہے، جس سے کوڑی بھی رتبہ پاکر موتی بن گئے

مولانا کے لیے قابل فخر وہ اشعار تھے جو ان کے استاد مولوی فاروق چریاکوٹی نے کہے۔ اس کے متعلق سید سلیمان ندوی اس طرح لکھتے ہیں:

"ان نظموں میں سب سے زیادہ فخر کے قابل مولانا کے استاد فاروق صاحب چریاکوٹی کی فارسی مثنوی ہے، جس میں مولانا نے بڑے پیار اور محبت سے اپنے شاگرد کی بیمار پرسی کی ہے (۷۷)۔

آگے چل کر لکھتے ہیں:

"مثنوی اسی زمانے میں الندوہ میں چھپ چکی ہے، فرماتے ہیں:

مطلع:

اے دل افروز شمع علم و ہنر نور چشم جہان و جان پدر

حادثہ گزند پا کا اس طرح ذکر کرتے ہیں:

آفت ناگہاں رسید بہ پاے پاے آں رہرو جہاں پیماے

آخری شعر یہ ہے:

اے خداوند واحد اعمار دائمش بررہ سعادت دار (۷۸)

چوں کہ مولانا حالی کے اشعار مولانا نے تحسین کے ساتھ الندوہ دسمبر ۱۹۰۷ء میں الگ شائع کیے تھے اس لیے ان کو الگ ہی پیش کرنا مناسب معلوم ہوا۔ مولانا نے اس کا عنوان "مولانا حالی کی ذرہ نوازی" رکھا تھا۔ اس میں لکھتے ہیں:

"خاکسار کے پاؤں کے زخمی ہونے پر بعض بزرگوں اور دوستوں نے رباعیاں لکھ کر بھیجیں۔ سید سلیمان اسسٹنٹ اڈیٹر الندوہ نے ان میں سے بعض پچھلے پرچے میں چھاپ دیں۔ ان کو دیکھ کر ہمارے مخدوم مولانا حالی نے منیجر الندوہ کو ایک خط لکھا، جو بعینہٖ درج ہے۔"

"رسالہ الندوہ میں مولانا شبلی کے احباب کی رباعیات دیکھ کر مجھے بھی یہ خیال ہوا کہ ان کے زمرہ، احباب میں ہونے کا فخر حاصل کروں، لہٰذا ذیل کے چار مصرعے موزوں کرکے آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں - الندوہ کے کسی آئندہ نمبر میں ان کو بھی درج فرمادیجیے گا-

۱ شبلی کہ گزندِ پاش پر دل شکن ست — با خستگیش خجستگی مقترن ست
چنداں کہ بکا ہند فزایند اینجا — کار استن چمن زپیر استن ست (۷۹)"

خاکسار الطاف حسین حالی

از پانی پت، ۱۶-اکتوبر ۱۹۰۷ء

"مولانا کا میری نسبت ایسے خیالات ظاہر کرنا محض ان کی ذرہ نوازی ہے، وہ میرے احباب میں شامل ہونے کا ننگ گوارا فرماتے ہیں، لیکن میری عزت یہ ہے کہ مجھ کو اپنے نیاز مندوں کے زمرہ میں شامل ہونے کی اجازت دیں، اب چند ہی ایسی صورتیں باقی رہ گئی ہیں، جن کو دیکھ کر قدما کی یاد تازہ ہو جاتی ہے - خدا ان بزرگوں کا سایہ قائم رکھے، آمین (۸۰) -"

مولانا اس زمانے میں شعرالعجم کے کوچے میں تھے - ستمبر ۱۹۰۶ء میں بمبئی سے واپس آئے تھے - وہاں بے محابا حسن نے بھی شاعر کو متاثر کیا تھا - ان کے ذہن میں ہر وقت فارسی اشعار چکر لگا رہے تھے - اس عالم میں مولانا فارسی شاعری نہ کرتے اور گرما گرم نہ لکھتے تو تعجب ہوتا - دل میں بمبئی کے بے باک حسن کی یاد سمائی ہوئی اور دماغ پر شعرالعجم چھائی ہوئی - اس کیفیت میں مولانا کی وجدانی کیفیت دیکھنے والی ہے - چناں چہ ۷-اپریل ۱۹۰۷ء کو ایک غزل لکھی، جس کا مطلع یہ تھا:

شب وصل ست، حیا گر بگزاری چہ شود — یکدم تنگ در آغوش فشاری چہ شود

مقطع:

شبلی دل زدہ را کار ز اندازہ گذشت — تو ہم اے خواجہ بہ حالش بگذاری چہ شود (۸۱)

اور ۹-اپریل کو ایک غزل لکھی جس کا مطلع یہ ہے:

من کہ در سینہ دلے دارم وشید اچہ کنم — میل بالالہ رخاں گرنکنم تاچہ کنم

مقطع:

شاہد و بادہ و طرف چمن و جوش بہار — شبلیا خود تو بفرما کہ باینہا چہ کنم (۸۲)

اور ۱۰-اپریل کو ایک اور غزل لکھی جس کا مطلع یہ ہے:

مرا کشت ست واز اندیشہ آزاد ست پنداری — چناں بیباک خوں ریزد کہ جلاد ست پنداری

مقطع:

بہ آب و رنگ نظم خویشتن نازد چناں شبلی — کہ در اقلیم معنی کہنہ استاد ست پنداری (٨٣)

اور ١٦۔ اپریل کو غزل لکھی جس کا مطلع یہ ہے:

ہر جا کہ روی روشن تو جلوہ ساز بود — ہر ذرہ را نظر بہ جمال تو باز بود

مقطع:

غمگین مباش گر سخن از مدعا نرفت — شبلی ہنوز اول راز و نیاز بود (٨٤)

اور ١٧۔ اپریل کو یہ غزل لکھی جس کا مطلع یہ ہے:

در وادی سلوک زخود دور بودہ ایم — یعنی کہ مست بادہ، منصور بودہ ایم

مقطع:

شبلی مباش منکر رفتار ماکہ ما — مست از مے شبانہ، پر زور بودہ ایم (٨٥)

اور ١٩۔ اپریل کو غزل لکھی جس کا مطلع یہ ہے:

برق عشقی کہ مرا، بردل و برتن زدہ بود — ایں ہماں ست کہ بر وادی ایمن زدہ بود

مقطع:

شبلی امروز بہ سجادہ، تقویٰ بنشست — آں کہ صد سال رہ شیخ و برہمن زدہ بود (٨٦)

کچھ اور غزلیں بھی اپریل میں لکھی ہیں جن کی تاریخ کا تعین نہ ہو سکا۔ ایک غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے:

چرخ کیں فتنہ گری ہاے تو آغاز گرفت — مگر ایں شیوہ ازاں چشم فسوں ساز گرفت

مقطع:

بزم را دید کہ از نغمہ، دو شینہ تہی ست — شبلی آں زمزمہ را باز ز آغاز گرفت (٨٧)

دوسری غزل کا مطلع یہ ہے:

صوفی آں سر حقیقت کہ ہویدا میکرد — ہر حدیثے کہ بما کرد ہم از ما میکرد

مقطع:

شبلی از قامت و بالاے تو میکرد سخن — یا مگر خود سخن، از عالم بالا میکرد (٨٨)

تیسری غزل کا مطلع یہ ہے:

ای اجل گر بہ من خستہ ترا کارے ہست — اند کے باش کزو وعدہ دیدارے ہست

مقطع:

شبلی شیفتہ در حلقہ سود از دگان — گوئیا و قافلہ سالارے ہست (۸۹)

مولانا دسمبر ۱۹۰۷ء میں اپنا پیر بنوانے کی وجہ سے بمبئی میں تھے۔ بمبئی سے ستمبر ۱۹۰۶ء کی واپسی کے بعد کی غزلیں اگر قال تھیں تو دسمبر ۱۹۰۷ء کی غزلیں، حال تھیں۔ چناں چہ ۲۔ ستمبر ۱۹۰۷ء کو ایک غزل کہی جس کا مطلع یہ ہے:

چہ غم از بند و زنداں شاہد رعنای کنعان را — کہ از یک جلوہ گلشن می تواند کرد زنداں را

مقطع:

بیا اینجا کہ ہر سو کاروان در کارواں بینی — بتان آزری را دلبران شام و ایران را (۹۰)

۸۔ دسمبر کو ایک غزل اور لکھی جس کا مطلع یہ ہے:

ساقی مست چو سوی من مدہوش آید — ساغر از کف بنہد میکدہ بردوش آید

مقطع:

می رسد وقت کی شبلی بہ بتے بادہ گسار — از در صومعہ تاے کدہ ہمدوش آید (۹۱)

۱۱۔ دسمبر ۱۹۰۷ء کو دو غزلیں لکھیں۔ پہلی غزل کا مطلع یہ ہے:

شب کہ تیر نالہ من برگ و ساماں کردہ بود — رخنہ ہا در گنبد گردون گرداں کردہ بود

مقطع:

شیوہ رندی چناں شبلی بہ آب و رنگ کرد — گوئیا زیں پیش ہم کردو بہ ساماں کردہ بود (۹۲)

دوسری غزل کا مطلع یہ ہے:

آں دل کہ خاک گشتہ آں رہ گزار بود — سرجوش بادہ کہن روز گار بود

مقطع:

شبلی بیا کہ گرمی بازار بینے — امسال نیز ہست بہ رنگے کہ پار بود (۹۳)

۱۷۔ دسمبر کو دو غزل لکھیں۔ پہلی کا مطلع یہ ہے:

تاچہرہ زیبائے توام در نظر افتد — یکبارہ اساس خرد و ہوش برافتاد

مقطع:

شبلی دگر از صومعہ درے کدہ آمد — ایں غلغلہ تازہ بہ مے خانہ درافتاد (۹۴)

دوسری غزل کا مطلع یہ ہے:

آں شوخ چو از پردہ بہ یکبار برآمد　　ہنگامۂ مستوری زاہد بسر آمد

مقطع:

لب را ز تبسم نتوانست نگہ داشت　　وقتے کہ زجاں دادن شبلی خبر آمد (۹۵)

دسمبر ۱۹۰۷ء میں کچھ اور غزلیں کہیں تھی جن کی تاریخ کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ ایک غزل کا مطلع یہ ہے:

من کہ خود را فارغ از گبر و مسلماں کردہ ام　　انچہ چشم کافرش فرمودہ است آں کردہ ام

مقطع:

یارمی پر سید شبلی را کہ چوں برباد رفت　　مشت خاکے در ہوائے کشش پریشاں کردہ ام (۹۶)

ایک اور غزل کا مطلع یہ ہے:

اے کہ صد طعنہ بہ خورشید و براختر زدہ　　باز بر قتل کہ دامن بہ کمر برزدہ

مقطع:

بوے زخم از دل آغشتہ بہ خوں می آید　　شبلیا سینہ مگر بردم خنجر زدہ (۹۷)

ایک اور غزل کا مطلع یہ ہے:

چناں نہ شہرت عشق تو بر زباں انداخت　　کہ پردہ بررخ ایں کار میتواں انداخت

مقطع:

بہ پارسائی شبلی ہم اعتماد نماند　　نگاہ شوخ تو، تافتنہ در جہاں انداخت (۹۸)

مولانا نے شعر العجم حصہ اول ۱۹۰۷ء میں ختم کی۔ مادہ، تاریخ آغاز تصنیف "تاریخ عجم" (۱۳۲۴ھ) اور مادہ، تاریخ اختتام تصنیف "تذکرہ" (۱۳۲۵ھ) سے نکالا گیا۔ چوں کہ پہلا حصہ شعر العجم کی دوسری سیڑھیوں کی بنیاد ہے، اس لیے اس کا ابتدائیہ پیش کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ اس کے لکھنے کے اسباب وغیرہ مولانا ہی کے قلم سے معلوم ہوں۔ لکھتے ہیں:

"بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرم جویاں، دری را می پرستند　　فقیہاں، دفترے را می پرستند

برافگن پردہ تا معلوم گردد　　کہ یاراں دیگرے را می پرستند

والصلوۃ علیٰ رسولہ محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین

اسلام ایک ابر تمام تھا اور سطح خاک کے ایک ایک چپے پر برسا، لیکن فیض بقدر استعداد پہنچا۔ جس خاک میں جس قدر زیادہ قابلیت تھی، اسی قدر زیادہ فیضیاب ہوئی۔ عرب، ایران، افغانستان، ہند، ترکستان، تاتار، مصر، شام، روم، سب اس کے حلقے میں آئے، لیکن قبول اثر میں سب یکساں نہ تھے۔ فرق مراتب تھا اور فرق مراتب کی حیثیتیں بھی مختلف تھیں۔ جس قوم میں جس قسم کی قابلیت تھی، اسلام نے اس کو اور چمکایا۔ ترک شجاع تھے، شجاع تر ہو گئے۔ ایرانی ہمیشہ سے تہذیب، معاشرت اور علوم و فنون میں ممتاز تھے، اسلام نے ان کو ممتاز تر کر دیا۔ بو علی سینا، غزالی، رازی، طوسی، امام بخاری، مسلم، سیبویہ، جوہری، سب ایران ہی کی خاک سے اٹھے تھے آج تمام اسلامی دنیا میں ایران ہی کی تہذیب و معاشرت جاری ہے۔ ترکوں نے بڑی بڑی پر زور سلطنتیں قائم کیں، لیکن دفتر کی زبان اور دربار کے دستور اور آئین سب فارسی ہی رہے۔

ایران کی خاک فنون لطیفہ کی قابلیت میں بھی سب سے ممتاز تھی اور بالخصوص شاعری اس کا خمیر تھا۔ اسلام نے خاص اس جوہر کو زیادہ چمکایا اور اس حد تک پہنچایا کہ تمام دنیا کی شاعری ایک طرف اور صرف ایران کی شاعری ایک طرف۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ آج تک کسی اسلامی زبان میں، ایران کی شاعری کی کوئی ایسی تاریخ نہیں لکھی گئی جس سے ظاہر ہوتا کہ شاعری کب شروع ہوئی، کن اسباب سے شروع ہوئی؟ کس طرح عہد بہ عہد بڑھی؟ کیا کیا انداز قائم ہوئے؟ کیا کیا صورتیں بدلیں؟ ملکی اور قومی حالتوں نے اس پر کیا کیا اثر کیے؟ خود اس نے ملک اور قوم پر کیا اثر ڈالا؟

شعرا کے تذکرے بہت ہیں لیکن وہ در حقیقت بیاض اشعار ہیں، جن میں شعرا کے عمدہ اشعار انتخاب کر کے لکھ دیے ہیں۔ شعرا کے حالات اور واقعات کم اور نہایت کم ہیں اور شاعری کے عہد بہ عہد کے انقلابات اور ان کے اسباب کا تو مطلق ذکر نہیں۔

میں اس کمی کو مدت سے محسوس کر رہا تھا اور اکثر اس ادھیڑبن میں رہتا تھا۔ مئی ۱۸۹۴ء میں میرے معزز دوست اور استاد مسٹر آرنلڈ نے مجھ کو اطلاع دی کہ جرمن کے ایک پروفیسر جیمس ڈارمستیٹر نے اس موضوع پر فرنچ میں ایک کتاب لکھی ہے۔ میں اس زمانے میں فرنچ زبان سیکھ رہا تھا۔ بڑے شوق سے کتاب منگوائی لیکن وہ ۸۸ مضمون کا ایک رسالہ تھا، جس میں شعرا کے نہایت معمولی حالات تھے۔ ایک مدت کے بعد اس مصنف کی ایک اور ضخیم کتاب شائع ہوئی، جو تحقیق اور تدقیق کے لحاظ سے نہایت حیرت انگیز تھی۔ لیکن وہ زبان کی تاریخ ہے جس میں ژند،

پہلوی وغیرہ زبانوں پر نہایت محققانہ بحث کی ہے اور اسلام کے قبل کی تصنیفات کا سراغ لگایا ہے شاعری کی تاریخ سے اس کو لگاؤ نہیں۔

اس اثنا میں سررشتہ علوم وفنون حیدرآباد کے تعلق سے سلسلہ، کلامیہ کی طرف متوجہ ہوا اور چند کتابیں لکھیں جو چھپ کر شائع ہوئیں۔ اس سلسلے میں فی الجملہ فراغت ہوئی تو پچھلے سال پرانا خیال پھر تازہ ہوا اور ۶۔ مارچ ۱۹۰۶ء کو میں نے اس عمارت کا سنگ بنیاد رکھا، لیکن بیچ بیچ میں موازنہ، انیس ودبیر اور الندوہ سد راہ ہوتے رہے۔ جب موازنہ سے بالکل فارغ ہو کر ہمہ تن اس کام میں مصروف ہوا اور فردوسی کے حال تک پہنچا تو ۱۷۔ مئی ۱۹۰۷ء کو صدمہ، پاکر واقعہ پیش آیا، یعنی اتفاق سے میرے پاؤں میں گولی لگی اور پاؤں کاٹ ڈالا گیا (۹۹)۔ یہ بھی فردوسی کی کرامت تھی کہ واقعے سے ذرا پہلے شاہنامہ کا یہ مصرع "در ید و بر ید شکست و بہ بست" قلم کی زبان پر تھا۔ اس حادثے نے تین چار ہفتہ لکھنے سے معذور رکھا، پھر وہ سلسلہ شروع ہوا اور باوجود درد اور تکلیف کے کچھ نہ کچھ کام ہوتا گیا، یہاں تک کہ ستمبر ۱۹۰۷ء کی چھٹی تاریخ کو دور اول کا پہلا حصہ انجام پذیر ہوا۔

کتاب کی اجمالی ترتیب یہ ہے کہ قدما، متوسطین، متاخرین کے تین دور ہیں، پہلا دور حنظلہ سے شروع ہو کر نظامی پر تمام ہوتا ہے، دوسرا کمال اسمٰعیل سے جامی تک اور تیسرا افغانی سے ابو طالب کلیم تک۔ کلیم کے بعد شاعری، شاعری نہیں رہی بلکہ چیستان گوئی بن گئی۔ ان دوروں کے لحاظ سے کتاب تین حصوں پر منقسم ہے۔ چوتھے حصہ میں شاعری پر عام ریویو ہے اور یہی حصہ گویا کتاب کی جان اور اس کی روح رواں ہے" (۱۰۰)۔

اس اقتباس میں بھی مولانا نے اسلامی تاریخ کو پیش نظر رکھا ہے اور وہ فارسی شاعری پر اسلام ہی کے اثرات دیکھتے ہیں اور فارسی شاعری کے جوہر کو چمکانے والے مسلمانوں ہی کو سمجھتے ہیں۔ اس وقت بھی ان کے ذہن پر تاریخ اسلام کا اثر ہے اور ان کو فارسی شاعری میں اسلام ہی کی ضیاپاشی نظر آرہی ہے۔ فارسی شاعری کی عہد بہ عہد ترقی کا جائزہ ان کی تاریخ سے دلچسپی کا بین ثبوت ہے۔

اسی اقتباس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کے ذہن میں فارسی شاعری کا تذکرہ لکھنے کا خیال ۱۸۹۳ء سے پہلے سے تھا۔ ۱۸۹۴ء میں اس خیال کو تقویت پہنچانے والی جیمس ڈارمسٹیٹر کی فرنچ میں لکھی ہوئی کتاب تھی۔ لیکن یہ فارسی لسانیات کی تحقیق پر تھی اور مولانا شاعری کی تاریخ کا

جائزہ لینا چاہتے تھے۔

مولانا اس کام کو عملی جامہ اس لیے نہ پہنا سکے کہ ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ کالج سے الگ ہو گئے الگ ہونے کے بعد "الفاروق" مکمل کی۔ ۱۸۹۸ء سے آخر فروری ۱۹۰۱ء تک وطن میں قیام کیا اور بیماری اور مالی پریشانیوں میں مبتلا رہے۔ اسی دوران میں مولانا کے والد کا انتقال (۱۰۱) ہو گیا۔ ان کے چھوڑے ہوئے قرضے نے اتنا پریشان کیا کہ حیدر آباد چلے گئے (۱۰۲) اور حیدر آباد کے سررشتہ علوم و فنون سے منسلک ہو گئے اور وہاں وہ سلسلہ، کلامیہ میں الجھ کر رہ گئے۔ وہاں سے واپسی کے بعد ۶۔ مارچ ۱۹۰۶ء کو شعرالعجم کی طرف متوجہ ہوئے، لیکن اس دوران میں بھی موازنہ انیس و دبیر اور الندوہ کے کام رکاوٹ بنتے رہے۔ موازنہ، انیس و دبیر اگرچہ حیدر آباد کے قیام میں لکھ لی تھی مگر اس وقت تک چھپی نہ تھی اور مسودہ ویں پڑا ہوا تھا۔ آخر مولانا حالی کی کوششوں سے وہ مسودہ ملا تو اس پر شعرالعجم کے ابتدائی زمانے میں نظر ثانی، اصلاح اور ترتیب کی۔ موازنہ سے یکسوئی ہوئی تھی کہ ۱۷۔ مئی کو حادثہ، گزند پا کی وجہ سے شعرالعجم میں رکاوٹ ہوئی، مگر چند ہی دنوں کے بعد باوجود تکلیف کے انھوں نے لکھنا شروع کر دیا اور آخر کار ۶۔ ستمبر ۱۹۰۷ء کو پہلا حصہ ختم کر دیا۔ اس طرح مولانا نے اس اقتباس میں شعرالعجم کے لکھنے کے اسباب اور اس کے پہلے حصے کی تحریر بھی لکھ دی ہے جس سے ان کے ذہن پر پڑتے ہوئے اثرات کی ارتقائی تاریخ بھی مرتب ہو جاتی ہے۔

حواشی:

۱.... مکاتیب دوم، صفحہ ۹۳-۹۴۔ ۵۔ جنوری ۱۹۰۷ء، بمبئی سے

۲.... چوں کہ چند ہی روز قبل ۱۳۲۴ھ ختم ہوا تھا اس لیے مولانا نے غلطی سے ۱۳۲۴ھ لکھ دیا ہے۔ ۱۳۲۵ھ ہونا چاہیے جو مطابق ہوتا ہے یکم و ۲۔ مارچ ۱۹۰۷ء کے۔

۳.... موجودہ خاتون منزل، لکھنو۔

۴.... آج کے دو روپیوں پر قیاس نہ کیا جائے۔ سستے زمانے میں دو روپے بہت تھے۔

۵.... مقالات شبلی جلد، ہشتم ۱۹۳۸ء۔ صفحہ ۹۴-۹۵

۶.... جلد دستار بندی طلبائے فارغ التحصیل دارالعلوم۔

۷.... آنریبل خواجہ غلام الثقلین بی۔ اے، ایل ایل۔ بی، المتوفی ۱۹۱۵ء۔

۸.... اس زمانے میں رفاہِ عام کلب کی عمارت میں پبلک جلسے ہوا کرتے تھے (یہ عمارت گولہ گنج کے چوراہے سے چوک جانے والی سڑک پر واقع ہے۔ آگے چل کر اس کی دو شاخیں ہو جاتی ہیں۔ ایک سٹی اسٹیشن کو

چلی جاتی ہے اور دوسری چوک کو)۔

۹۔۔۔ مکاتیب اول، شروانی کے نام صفحہ ۵۸-۵۷، ۱۵ مارچ ۱۹۰۷ء

۱۰۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۶۴، ۱۷۔ مارچ ۱۹۰۷ء (اس خط کے حاشیہ میں سید صاحب نے مولانا کے مضمون نہ لکھنے کا سبب "ادھ گرنڈپا" بتلایا ہے، جو غلط معلوم ہوتا ہے۔ مضمون نہ لکھنے کا سبب کچھ اور ہو گا، اس لیے کہ حادثہ بعد کو یعنی ۱۷۔ مئی ۱۹۰۷ء کو ہوا تھا)

۱۱۔۔۔ دارالمصنفین کی موجودہ عمارت مولانا کے بنگلے میں ہے۔

۱۲۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۲-۱۷۱، ۲۹۔ مارچ ۱۹۰۷ء

۱۳۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۲۲۱، ۲۔ اپریل ۱۹۰۷ء

۱۴۔۔۔ کلیاتِ شبلی، فارسی، صفحہ ۷۰-۷۱

۱۵۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۲۱۱، ۱۰۔ اپریل ۱۹۰۷ء

۱۶۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۱۲-۲۱۱، ۱۱۔ اپریل ۱۹۰۷ء

۱۷۔۔۔ سید صاحب کو استاد کی ناراضی پر ہمیشہ فخر رہا ہو گا۔ کوئی اور ہوتا تو اس خط کو مکاتیب میں شائع نہ کرتا، لیکن سید صاحب کا ظرف بڑا وسیع تھا۔

۱۸۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۶۴-۶۵، ۱۲۔ اپریل ۱۹۰۷ء

۱۹۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۲۶، ۱۸۔ اپریل ۱۹۰۷ء

۲۰۔۔۔ کلیاتِ شبلی فارسی، صفحہ ۷۴

۲۱۔۔۔ ایضاً

۲۲۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۲۱۲، ۳۔ مئی ۱۹۰۷ء

۲۳۔۔۔ مسدس حالی، صفحہ ۲۳، تاج کمپنی لمیٹڈ، لاہور۔

۲۴۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۵۹-۱۵۸، ۶۔ مئی ۱۹۰۷ء

۲۵۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۲۱۲، ۸۔ مئی ۱۹۰۷ء

۲۶۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۶۰-۱۵۹، ۱۳۔ مئی ۱۹۰۷ء

۲۷۔۔۔ مقالاتِ شبلی، جلد چہارم، صفحہ ۸۱۔

۲۸۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۱۳۹، ۱۶۔ مئی ۱۹۰۷ء

۲۹۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۶۱-۳۶۰

۳۰۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۱۶۰ تا ۱۶۲، ۲۵۔ مئی ۱۹۰۷ء

۳۱۔۔۔ ایضاً

۳۲۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۳۶۳

۳۳۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۳۶۸

۳۴ .... حیاتِ شبلی، صفحہ ۳۶۸

۳۵ .... الندوہ نمبر ۸-۹، جلد ۴

۳۶ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۹۶

۳۷ .... مولوی محمد اقبال - بی - اے، مولانا کے ایک عزیز شاگرد۔

۳۸ .... حیاتِ شبلی، صفحہ ۳۶۵

۳۹ .... مکاتیب اول، صفحہ ۱۶۰ تا ۱۶۲، ۲۵- مئی ۱۹۰۷ء

۴۰ .... مکاتیب اول، صفحہ ۱۶۳، ۶- جون ۱۹۰۷ء

۴۱ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۱۳، ۱۶- جون ۱۹۰۷ء

۴۲ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۸۶، ۲۶- جون ۱۹۰۷ء

۴۳ .... مکاتیب اول، صفحہ ۱۶۳ تا ۱۶۴، ۱۷- جولائی ۱۹۰۷ء

۴۴ .... موجودہ خاتون منزل، لکھنو جس کے مالک اب شیخ محمد قدیر الناس سندیلوی ہیں (یہ سندیلہ کے دیوان محمد علی کی اولاد میں ہیں)

۴۵ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۶۵-۶۶، ۲۲- جولائی ۱۹۰۷ء

۴۶ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۶۶، ۳۱- جولائی ۱۹۰۷ء

۴۷ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۹۶، ۳۱- جولائی ۱۹۰۷ء

۴۸ .... حیاتِ شبلی، صفحہ ۳۶۶

۴۹ .... حادثہ، گزند پا کی وجہ سے علمی کاموں میں بڑی رکاوٹ ہوئی تھی۔

۵۰ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۶-۲۷، ۱۱- اگست ۱۹۰۷ء

۵۱ .... مکاتیب اول، صفحہ ۳۲۴، ۲۹- اگست ۱۹۰۷ء

۵۲ .... مشیر حسین قدوائی ندوے کے ہمدردوں میں تھے۔ انھیں کی تحریری تحریک امداد میں شامل تھی۔

۵۳ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۶۷-۶۸، ۱۹۰۷ء

۵۴ .... رباعی میں چار مصرعے ہوتے اور چوں کہ وفد میں تین آدمی تھے، اس لیے مولانا نے مزاح کے طور پر مولانا شروانی کو رباعی کا چوتھا مصرع کہا۔ (شعرالعجم کی تصنیف کے زمانے میں ایسا خطاب تعجب کی بات نہیں۔)

۵۵ .... مکاتیب اول، صفحہ ۱۶۴، ۱۵- اکتوبر ۱۹۰۷ء

۵۶ .... مکاتیب اول، صفحہ ۱۶۴-۱۶۵، ۲۸- اکتوبر ۱۹۰۷ء

۵۷ .... قرائن سے اس خط کی تاریخ ۲۴- نومبر معلوم ہوتی ہے کیوں کہ اسی روز ۲ بجے روانگی تھی۔ یہ روانگی غالباً الہ آباد سے ہے اور چوں کہ دوسرے مکاتیب سے ثابت ہے کہ وہ ۳- نومبر کے بعد الہ آباد میں قیام پذیر رہے، اس لیے اس مکتوب کی تاریخ ۴- نومبر کی بجائے ۲۴- نومبر معلوم ہوتی ہے۔

۵۸ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۱۴، ۳- نومبر ۱۹۰۷، الہ آباد سے

۵۹ ۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۲۱۳، ۱۴-نومبر ۱۹۰۷ء الہ آباد سے

۶۰ ۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۳۱۰، ۱۷-نومبر ۱۹۰۷ء الہ آباد سے

۶۱ ۔۔۔ منظوم رقعہ کی تاریخ سید سلیمان ندوی نے حیاتِ شبلی، صفحہ ۴۷۴ پر ۲۳-نومبر لکھی ہے، لیکن ریاض حسن خاں کے نام ۲۳-نومبر کے خط (مکاتیب دوم، صفحہ ۱۸۶) میں مولانا نے لکھا ہے کہ "کل" میر اکبر حسین صاحب سابق جج کے ہاں سے دعوت کا رقعہ آیا تھا، یعنی ۲۲-نومبر کو۔ مہدی حسن کے نام ۲۳-نومبر کے خط (مکاتیب دوم، صفحہ ۲۱۳-۲۱۴) میں مولانا نے لکھا ہے کہ "آج" میر اکبر حسین صاحب کے ہاں سے دعوت کا رقعہ آیا تھا، یعنی ۲۳-نومبر کو۔ ایسا اندازہ ہوتا ہے، ریاض حسن خاں کے نام خط میں تاریخ غلط چھپ گئی۔ حیاتِ شبلی اور مہدی حسن کے نام خط میں صحیح ہے۔

۶۲ ۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۴۷۴

۶۳ ۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۴۷۴ پر "اب وہ میں نہیں ہوں" ہے۔

۶۴ ۔۔۔ مہدی حسن کے نام مکاتیب دوم، صفحہ ۲۱۴ پر "اقبال" ہے، لیکن افضال صحیح ہے۔

۶۵ ۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۴۷۴ پر اس طرح ہے "دل کے بہلانے کی باتیں ہیں وگرنہ شبلی"، چوں کہ ریاض حسن اور مہدی حسن کے نام خطوط میں ایک ہی چیز ہے اس لیے یہی صحیح معلوم ہوتی ہے۔

۶۶ ۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۱۸۶-۱۸۷، ۲۳-نومبر ۱۹۰۷ء (یہ نظم اسی زمانے میں دکن ریویو میں بھی شائع ہوئی تھی)

۶۷ ۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۱۸۷، یکم دسمبر ۱۹۰۷ء

۶۸ ۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۳۱۱، ۲۲-دسمبر ۱۹۰۷ء

۶۹ ۔۔۔ مقالاتِ شبلی (تنقیدی) جلد چہارم، طبع سوم، صفحہ ۶۸-۶۹

۷۰ ۔۔۔ مقالاتِ شبلی، جلد ہفتم، صفحہ ۵۱

۷۱ ۔۔۔ مقالاتِ شبلی، جلد ہفتم، صفحہ ۵۶

۷۲ ۔۔۔ مقالاتِ شبلی، جلد ہفتم، صفحہ ۷۴

۷۳ ۔۔۔ "حیاتِ محسن"، صفحہ ۱۹۳ پر امین زبیری اس طرح لکھتے ہیں: ۱۴-اکتوبر کو مرض کا یہ حملہ شروع ہوا تھا اور وہ خود زندگی سے مایوس ہو گئے تھے۔ انھوں نے اپنے دوستوں اور ملازموں کو جمع کر کے فرمایا کہ: "مجھے اب زندگی کا اعتبار نہیں ہے۔ آپ سب صاحب گواہ رہیں کہ میں صدق دل سے کلمہ، لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھتا ہوں، میں نے جو کچھ قومی خدمات کی ہیں وہ نیک نیتی کے ساتھ کی ہیں، اگر ان میں کوئی غلطی ہوئی تو میں بے قصور ہوں کیوں کہ میری نیت ہر حال میں نیک تھی اور خدا میری نیکی کا شاہد ہے"۔ نواب صاحب مرحوم پہلے سیسل ہوٹل میں مقیم تھے، پھر شملہ سے دو میل پر سنجولی میں بابو عبدالاحد صاحب کی کوٹھی پر اٹھ آئے تھے اور وہیں ۱۶-اکتوبر کو شام ۶ بجے انتقال ہوا۔"

۷۴ ۔۔۔ مقالاتِ شبلی جلد ہشتم، صفحہ ۲۰۲

۷۵ .... حیاتِ شبلی، صفحہ ۳۶۶-۳۶۷
۷۶ .... حیاتِ شبلی، صفحہ ۳۶۸
۷۷ .... حیاتِ شبلی، صفحہ ۳۷۲
۷۸ .... حیاتِ شبلی، صفحہ ۳۷۲
۷۹ .... چہار مقالہ۔ نظامی عروضی (مقالہ دوم) میں عنصری کا مصرع تھا: ع- کار استن سرو زپیراستن ست-
۸۰ .... مقالاتِ شبلی، جلد ہشتم، صفحہ ۲۰۱
۸۱ .... کلیاتِ شبلی، فارسی، صفحہ ۷۲
۸۲ .... کلیاتِ شبلی، فارسی، صفحہ ۷۱
۸۳ .... ایضاً
۸۴ .... کلیاتِ شبلی، فارسی، صفحہ ۷۴
۸۵ .... کلیاتِ شبلی، فارسی، صفحہ ۸۵-۸۶
۸۶ .... کلیاتِ شبلی، فارسی، صفحہ ۷۵-۷۶
۸۷ .... کلیاتِ شبلی، فارسی، صفحہ ۷۲-۷۳
۸۸ .... کلیاتِ شبلی، فارسی، صفحہ ۷۴
۸۹ .... کلیاتِ شبلی، فارسی، صفحہ ۸۶
۹۰ .... کلیاتِ شبلی، فارسی، صفحہ ۷۶-۷۷
۹۱ .... کلیاتِ شبلی، فارسی، صفحہ ۷۷
۹۲ .... کلیاتِ شبلی، فارسی، صفحہ ۸۰-۸۱
۹۳ .... کلیاتِ شبلی، فارسی، صفحہ ۸۱
۹۴ .... کلیاتِ شبلی، فارسی، صفحہ ۸۲-۸۳
۹۵ .... کلیاتِ شبلی، فارسی، صفحہ ۸۳
۹۶ .... کلیاتِ شبلی، فارسی، صفحہ ۷۹-۸۰
۹۷ .... کلیاتِ شبلی، فارسی، صفحہ ۸۳-۸۴
۹۸ .... کلیاتِ شبلی، فارسی، صفحہ ۸۴
۹۹ .... شبلی نامہ

سیہ را بہ جزاے عملش پابریدند و صدا خاست کہ سرمی بایست

۱۰۰ .... شعر العجم حصہ اول، معارف اعظم گڑھ- طبع چہارم ۱۹۳۰ء، صفحہ ۱ تا ۴
۱۰۱ .... ۱۲-نومبر ۱۹۰۰ء کو مولانا کے والد کا انتقال ہوا-(حیاتِ شبلی، صفحہ ۳۵۳)
۱۰۲ .... آخر فروری ۱۹۰۱ء میں مولانا حیدر آباد گئے-(حیاتِ شبلی، صفحہ ۳۵۷)

۱۹۰۸ء

مولانا نایاب کتابوں کی تلاش میں رہتے تھے اور یورپ میں جو نئی کتابیں چھپتی رہتی تھیں، ان کی تلاش میں بھی رہتے تھے۔ اس کے لیے وہ اپنے اعزا اور احباب سے خط و کتابت رکھتے تھے۔ کبھی براہِ راست اور کبھی احباب کے ذریعے کتابیں منگاتے رہتے تھے۔ پھر جب کوئی تصنیف شروع کرتے تھے تو اس کے حوالوں کے لیے اکثر کتابوں کی ضرورت ہوتی تھی، لہٰذا اس سلسلے میں احباب سے دریافت کرتے تھے۔

اسی زمانے میں کچھ کتابیں پروفیسر عبدالقادر نے بھیجیں تو ان کا شکریہ ادا کیا۔ احادیث الخوانین کے جوابات مولانا کو پسند نہ آئے۔ یہ اسلام آباد چاٹگام کی فارسی تاریخ تھی، جس کے آخر میں عالمگیر کی طرف سے مدافعت کی گئی تھی۔ عالمگیر کے متعلق دکن میں مشہور تھا کہ حیدر آباد (دکن) گن پتی کا دیول، جو بہت بڑی جاترا ہے، اس کو عالمگیر نے گاؤں کی جاگیر دی تھی۔ مولانا اس کی سند چاہتے تھے، لہٰذا پروفیسر عبدالقادر کو سند کی تلاش کے لیے لکھا کیوں کہ ان کو مضامین عالمگیر کے لیے اس کی ضرورت تھی۔

پروفیسر عبدالقادر نے خواہش کی تھی کہ مولانا ان کے لیے بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کی ممبری کے لیے تحریک کریں۔ مولانا نے وعدہ کیا کہ وہ ضروری تحریک کریں گے۔ پروفیسر مذکورہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کی کتابیں منگوانا چاہتے تھے، مگر ممبر نہ ہونے کی وجہ سے ان کو نہیں مل سکتی تھیں، اس لیے مولانا کو لکھا کہ وہ اپنے نام سے منگوا کر بھیج دیں۔ چوں کہ یہ بات خلافِ قاعدہ تھی اس لیے مولانا نے معذوری ظاہر کی اور یہ بھی لکھا کہ شرح انوری خود ان کے پاس تھی، لہٰذا وہ بھیجنے پر تیار تھے۔ لیکن مآثر رحیمی البتہ کہیں نہیں ملتی تھی۔ خسروؔ کا کوئی عمدہ دیوان سوسائٹی کے پاس نہ تھا جو پروفیسر صاحب کو بھیجا جاتا۔ امیر خسروؔ کے تیسرے دیوان غرۃ الکمال کی بڑی تلاش تھی، کیوں کہ ایشیاٹک سوسائٹی میں جو نسخہ تھا وہ ناقص تھا۔ لہٰذا انھوں نے پروفیسر صاحب کو بھی لکھا کہ وہ کھوج میں رہیں۔(۱)

اب مولانا شعر العجم کا دوسرا حصہ لکھ رہے تھے اور اس کے لیے مشہور شاعر کمال خجندی اور خواجوی کے وہ اشعار مولانا شروانی سے طلب کیے تھے جو حافظ کے ہم مضمون تھے اور مولانا

شروانی نے انتخاب کیے تھے۔

اس زمانے میں مولانا کا قیام نور محمد بلڈنگ بھائی کلہ بمبئی میں تھا۔ پاؤں ابھی تک نہیں بنا تھا، اس لیے ابھی بمبئی سے جانا نہ چاہتے تھے۔ اسی زمانے میں پٹیالہ کے کرنیل عبدالمجید خان نے گورنمنٹ سے ندوے کے لیے ماہانہ آمدنی اور اس کے لیے زمین کی کوشش کی (۲)۔

مولانا شروانی نے خواجوی کی غزل بھیجنا چاہی تو مولانا نے لکھا کہ بھیج دیں اور ساتھ ہی غرۃ الکمال کا دیباچہ بھی، جو امیر خسروؒ نے لکھا تھا اور اب تک کہیں چھپا نہ تھا۔ مولانا شروانی اب سندھ سے واپس آگئے تھے۔ اس پر مولانا نے لکھا کہ اکیلے اکیلے گھوم لیے۔ مولانا کا پاؤں اب تک نہ بن سکا تھا۔ وعدے کو تین ہفتے ہو چکے تھے۔ مولانا شروانی نے مولانا سے اپالو بندر کی تفریح کے بارے میں دریافت کیا تو ان کو لکھا کہ اب اپالو کی تفریح کی ضرورت نہیں اس لیے کہ وہ اب جس ہوٹل میں مقیم تھے، وہاں بے باک حسن کی کمی نہ تھی۔ اسی لیے مولانا نے کئی غزلیں لکھی تھیں۔ ان غزلوں میں سے ایک غزل کا ایک شعر یہ بھی تھا:

این غزل اول فیض اثر بمبئی است　　　　باش تا بادہ، این میکدہ در جوش آید

مولانا چاہتے تھے کہ شروانی صاحب بھی بمبئی جاتے تو لطف رہتا اور پھر وہیں سے پروگرام کے مطابق حیدر آباد (دکن) جاتے۔ پٹیالہ کے کرنیل عبدالمجید خاں نے مقامی حکام سے مل کر مولانا اور ندوے کے متعلق ان کی غلط فہمی دور کی۔ اس سے قبل محسن الملک اور وقار الملک بھی خاصی کوشش کر چکے تھے۔ مگر ان کو پوری کامیابی نہیں ہوئی تھی (۳)۔

اسی زمانے میں لکھنو کے ڈپٹی کمشنر ٹیلر (۴) کو ترقی ملی اور وہ ترقی پر جانے لگے تو اس کی اطلاع سید عبدالحی صاحب نے مولانا کو دی۔ مولانا نے اس پر انھیں لکھا کہ ٹیلر کی ترقی بھی ندوے کے لیے مضر ثابت ہوئی۔۔ بہر حال اب یہ پتا لگانے کی ضرورت تھی کہ متعلقہ کاغذات انھوں نے کس محکمے کو واپس کیے یا ندوے واپس آگئے۔ مولانا کا خیال تھا کہ ٹیلر شملہ گئے ہوں گے، لہٰذا وہ چاہتے تھے کہ شملہ میں کوئی صاحب مل کر ان کے جانشیں کے نام خط لے لیتے تو زمین وغیرہ ملنے میں جلد آسانی ہوتی۔

ندوے کا سالانہ جلسہ قریب آرہا تھا۔ مولانا نے اس کے متعلق لکھا کہ جب ان کی ایک ماہ بعد واپسی بھی کافی ہو سکتی تھی تو وہ کیوں نہ حیدر آباد (دکن) بھی لگے ہاتھوں ہو لیتے۔ لیکن شاہ سلیمان صاحب پھلواروی کا ساتھ ہونا بھی ضروری تھا، اس لیے تار دے کر ان کے ارادے کو

دریافت کیا جاتا اور مولانا کو ان کے ارادے سے اطلاع دی جاتی۔

منشی احتشام علی صاحب کاکوروی کے متعلق بھی دریافت کیا کہ کیا وہ لکھنو میں ندوے کے جلسہ عام ہونے پر راضی تھے۔ مولانا چاہتے تھے کہ جلسہ سالانہ کے لیے چند طلبہ کو عربی تقریر کی مشق کرا کے تیار کیا جائے۔ اسی زمانے میں مولانا کو بھوپال سرکار کی طرف سے ایک کتاب کی درستی کے صلہ میں ۲۰۰ روپے ملنے کا اعلان ہوا تو مولانا نے وہاں لکھا کہ وہ رقم بجائے ان کو بھیجنے کے ندوے کو بھیج دی جائے، لیکن اس کا کوئی جواب نہ آیا تو مولانا نے دو سو روپے اپنے پاس سے ندوے کو بھیجے اور حکیم سید عبدالحی صاحب کو لکھا کہ مدرسے میں کھانے کا کوئی کمرہ نہیں ہے۔ پانچ سو کی لاگت سے کھانے کے کمرے کا نقشہ تجویز کیا جائے اور اس رقم کو اس میں صرف کیا جائے، بقیہ تین سو بھی مولانا دینے کو تیار تھے اور اس کمرے کو اہلیہ مرحومہ کے نام سے موسوم کرنا چاہتے تھے (۵)۔

مولانا کو اب دیباچہ غرۃ الکمال اور غزلیں (خواجہ وغیرہ کی) مل گئی تھیں۔ مولانا شروانی صاحب کے بڑے مشکور تھے اور ان کا کہنا تھا کہ گویا یہ حصہ مولانا شروانی کا لکھا ہوا ہوگا۔

اب مولانا امیر خسرو پر قلم اٹھانے والے تھے اور سارا زور ان کی سوانح حیات پر صرف کرنے والے تھے۔ ریویو بھی لکھنے کا ارادہ تھا، لیکن ریویو پرچی کھول کر لکھنے کا ارادہ نہ تھا (۶)۔

سید سلیمان ندوی تعلیم سے فراغت پا چکے تھے اور اب کسی مشغلے کی تلاش میں تھے۔ اگرچہ الندوہ کے اسٹاف میں کام کر رہے تھے، لیکن اس میں آمدنی بہت کم تھی۔ چناں چہ مولانا کو دبے الفاظ میں لکھا تو مولانا نے تسلی دی اور لکھا کہ ان کو خود خیال تھا اور اس کے کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ مگر مولانا فکر میں تھے کہ کوئی موقع ہو تو ان کے لیے کوشش کی جائے۔ مولانا کو یہ بھی خیال ہوا کہ اگر دیر ہوئی اور کوئی صورت نہ نکلی تو کہیں وہ دل شکستہ نہ ہوں، اس لیے انھوں نے مولوی حمید الدین فراہی اور مولانا عبداللہ عمادی کی مثالیں دیں کہ باوجود قابلیت اور لیاقت کے عرصے کے بعد مناسب کام میں لگے۔ بہرحال موقع کی تلاش میں تھے لیکن بھوپال میں ناقدری کا امکان تھا۔ حیدر آباد میں کوئی صورت نکلنے کا امکان تھا، مگر اس کے لیے مزید علمی شہرت کی ضرورت تھی اور وہ الندوہ کے ذریعے رفتہ رفتہ حاصل ہو رہی تھی۔ پھر وہ خود بھی ہر جگہ سید صاحب کی حمایت کرتے رہتے تھے۔ مولانا موجودہ صورت میں بھی (الندوہ کی ادارت) مالی فائدہ پہنچانے کے لیے فکرمند رہتے تھے (۷)۔

بمبئی میں پیر بھنے میں دیر کی وجہ سے الجھنیں، ندوے کی مالی امداد کے لیے کوششیں، فارسی غزلوں کی طرف رغبت اور وجدانی کیفیتیں ایسی تھیں کہ مولانا الندوہ کے لیے کوئی مضمون نہ لکھ سکے اور سید سلیمان ندوی کو لکھا کہ کچھ دنوں تک الندوہ میں ان کا کوئی مضمون شائع نہ ہو سکے گا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ پرچے کا معیار گر جائے۔ معیار کو برقرار رکھنے کی ضرورت تھی۔ اسی زمانے میں ایک تازہ غزل کہی تھی، اس کو پرچے کے آخر میں شائع کرنے کی ہدایت کی۔ اس کا مطلع یہ تھا:

اے آں کہ ہمی گوئی "کز راز خبر دارم" اندیشہ خامے است من نیز بہ سردارم

مقطع:

اے شبلی نعمانی، ایں پردہ دری از چیست اینہا کہ زخود گفتی من نیز خبر دارم

یہ پوری غزل بڑی مرصع ہے مگر یہ شعر تو بڑا رنگین ہے:

رندی وسیہ کاری مستی و نظر بازی زی گر نہ اگر خواہی بسیار ہنر دارم (۸)

مولانا شروانی کو بھی ایک تازہ غزل بھیجی جس کا مطلع یہ ہے:

ساقی مست چو سوے من مدہوش آید ساغر از کف ہند مے کدہ بردوش آید

مقطع:

باش تا شبلی آزاد بہ زیبا صنمے از در صومعہ تا مے کدہ ہم دوش آید

اپنی شاعری پر بمبئی کے اثر کو کس خوبی سے بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

ایں غزل اول فیض اثر بمبئی است باش تا بادہ، ایں مے کدہ در جوش آید (۹)

اس خط میں مولانا شروانی کو لکھتے ہیں:

"افسوس یہ ہے کہ ہم نہ صرف پارسائی میں بلکہ رندی میں بھی عالم بے عمل ہیں (۱۰)۔"

اب مولانا وقف علی الاولاد کا مسئلہ اٹھا رہے تھے اور گورنمنٹ کو توجہ دلا رہے تھے۔ اس پر مولانا شروانی کو خیال ہوا کہ علما تائید نہ کریں گے، تو مولانا نے لکھا کہ اگر وہ تائید نہ کریں گے تو تعجب ہے، اس لیے کہ یہ ہر مکتبہ خیال کے علما کا متفقہ مسئلہ ہے اور فقہ میں وقف اولاد کا مستقل باب ہے، جس کو پریوی کونسل نے اڑا دیا ہے اور اسی کا اعادہ مقصود ہے۔ دیوبند وغیرہ کو بھی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ سرسید کے قانون وقف سے اس کا تعلق نہ تھا۔

ندوہ کے سلسلے میں کرنیل عبدالمجید خان کی مسلسل دو سال کی کوشش سے حکومت کی غلط فہمیاں دور ہو گئی تھیں اور لیفٹننٹ گورنر نے ندوے سے دریافت کیا تھا کہ ندوے کس قسم کی امداد چاہتا ہے۔ ڈائریکٹر کا اس سلسلے میں ایک مراسلہ بھی آگیا تھا۔ چوں کہ اس مسئلے کو ۱۹۰۷ء ہی میں طے کر چکے تھے، اس لیے امداد قبول کرنے میں مولانا کوئی حرج نہ سمجھتے تھے۔ چوں کہ حکومت اب ندوے کے متعلق ہمدردانہ غور کر رہی تھی، اس لیے اس کا بڑا امکان تھا کہ روٗسا اور تعلقہ دار بھی ہمدردانہ رویہ اختیار کریں گے۔ ندوے کا سالانہ جلسہ بھی اب کی زور شور سے ہونے کا امکان تھا۔

اسی زمانے میں مصر سے معجم البلدان ارزاں قیمت پر شائع ہوئی۔ مولانا شروانی کے لیے اس کو خریدنے کا ارادہ کیا۔ یورپ والے نسخے کی قیمت دو سو تھی اور مصر کی بیس، پچیس روپے (۱۱)۔

پروفیسر عبدالقادر کو جب معلوم ہوا کہ مولانا بمبئی آکر حیدر آباد (دکن) گئے تو پروفیسر صاحب نے ان کو پونہ آنے کا وعدہ یاد دلایا تو مولانا نے جواب دیا کہ پونہ کا وعدہ حیدر آباد (دکن) کے سفر کے ساتھ تھا۔ حیدر آباد (دکن) سے لوٹ کر پونہ جانا شکست پائی کی حالت میں مشکل ہے۔ پھر بھی اگر پونہ گئے تو پروفیسر صاحب کے یہاں ہی ٹھہریں گے۔

نواب صاحب جنجیرہ (۱۲) نے مولانا کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دی، لہٰذا مولانا نے وہاں جانے کا ارادہ کیا، مگر وہاں جانے کی صورت میں پونہ جانا اور مشکل تھا۔

پروفیسر صاحب کے پاس فرامرز نامہ (۱۳) تھا۔ اس کے متعلق مولانا تفصیلی معلومات چاہتے تھے۔ اسی زمانے میں بمبئی میں ہندو عورتوں کی کانفرنس ہوئی، جس میں گجراتی اور مرہٹی عورتوں نے بڑی اچھی تقریریں کیں۔ بعض عورتوں نے بالکل مردوں کے انداز پر تقریر کی جس کو مولانا نے پسند کیا (۱۴)۔

ریاست بھاول پور کو ندوے سے بڑی دلچسپی ہو گئی تھی، لہٰذا ریاست نے ندوے کے معائنے کے لیے ایک وفد ترتیب دیا کہ وہ جاکر ندوے کو اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اس کے متعلق مفصل رپورٹ پیش کرے تاکہ اس کی مالی امداد کی جائے۔ مولانا کی علمی شہرت اور ندوے سے وابستگی ایسی تھی کہ ندوے کا کوئی کام بغیر ان کے نہ ہوتا۔ لہٰذا بھاول پور کے عہدیداروں نے مولانا کو بمبئی لکھا کہ ندوے کے معائنے کے وقت ان کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اس وقت مولانا

پر بمبئی کی شعریت میں ڈوبی ہوئی فضا کا اثر تھا اور شعرو شاعری کا غلبہ تھا۔ اس وجدانی کیفیت میں دخل اور خلل مولانا کو گراں گزرا، مگر قومی کام جس کا مولانا نے ذمہ لیا تھا لاکھ بے مزہ سہی مگر تھا مولانا کی عین دلچسپی کا۔ لہٰذا بادل نخواستہ لکھنؤ آگئے۔ بھاول پور نے مالی اعانت کی امید دلائی تھی۔ گورنمنٹ کی بھی ہمدردی کی نگاہ ندوے پر پڑرہی تھی۔ لکھنؤ کے ڈپٹی کمشنر مسٹر ٹیلر نے نزول کی زمین دینے پر رضامندی کا خود اظہار کیا۔ ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن نے تعلیمی امداد کے لیے خود لکھا۔ مگر مولانا کو شک تھا کہ قوم بھی ہمدردی کرتی ہے یا نہیں، حالاں کہ سب کچھ اسی کے لیے کیا جارہا تھا۔

مولانا نے بمبئی کے اس قیام میں خواجہ حافظ پر کام ختم کرلیا تھا اور اب امیر خسرو پر شروع کرنے والے تھے۔ گویا مولانا کی اس زمانے کی غزلیں خواجہ حافظ کا فیض تھیں اور ان ہی کی شاعری مولانا کے ذہن میں چکر لگارہی تھی۔

مولانا کو اب نہ سپہر، آئینہ، سکندری اور عشقیہ کی ضرورت تھی، لہٰذا اس کو مولانا شروانی سے طلب کیا۔ مولانا اپنی بمبئی والی غزلیں چھپنے کو دینے والے تھے۔ ان غزلوں میں مولانا کو اپنا ایک شعر بہت پسند تھا کیوں کہ اس میں واقعیت اور اظہار قدرت تھی۔ وہ شعر یہ ہے:

بے حاصلی نگر! کہ باایں دوری از رخش   صد جائے بہربوسہ نشاں کردہ ایم ما

مولانا بمبئی سے ہمایوں نامہ، گلبدن بیگم اور لباب الالباب عوفی یزدی جو یورپ میں چھپی تھی، اپنے ساتھ لائے تھے۔ ندوے کے سالانہ جلسے کی تاریخیں جلد ہی مقرر ہونے والی تھیں (۱۵)۔

مولوی حمید الدین فراہی اب علی گڑھ کالج میں بحیثیت اسسٹنٹ عربک پروفیسر تھے۔ مولانا نے ان کو لکھا کہ مولوی غلام محمد شملوی علی گڑھ آرہے ہیں اور بڑے کام کے آدمی ہیں۔ نہ صرف ندوے کے وکیل اور سفیر ہیں بلکہ قومی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ دہلی کانفرنس اور شملہ کے ڈیپوٹیشن میں انھوں نے بڑی خدمات انجام دیں۔ لہٰذا ان کی آرجیولڈ اور جرمنی کے پروفیسر مسٹر جوزف ہارویز سے ملاقات کرادی جائے۔ مولانا چاہتے تھے کہ آرجیولڈ اور مسٹر ہارویز ان کو سرٹیفکیٹ دے دیں تو بہت اچھا ہے۔ مسٹر ماریسن اور مسٹر آرنلڈ ان کو پہلے ہی سرٹیفکیٹ دے چکے تھے (۱۶)۔

مولانا خوش تھے کہ بمبئی کے لطف کو انھوں نے قوم اور مذہب پر نثار کردیا اور لکھنؤ

واپس آگئے ۔ ان کو اب تک آئینۂ سکندری، نہ سپہر اور عشقیہ کا انتظار تھا۔ خسرو کے قصائد کی بھی ضرورت تھی ۔ مولانا شروانی نے امیر خسرو کے طالب علمی کے حالات مخزن لاہور یا اور کسی پرچے میں لکھے تھے ۔ مولانا کو اس کی بھی ضرورت تھی ۔

سعدی پر مولانا حالی لکھ چکے تھے اور مولانا روم پر خود مولانا شبلی لکھ چکے تھے اس لیے ان پر تو زیادہ لکھنے کا خیال نہ تھا، مگر خواجہ حافظ اور امیر خسروؔ پر بڑی محنت سے اور پھیلا کر لکھنے کا ارادہ تھا اور یہی جز شعرا لعجم کی جان ہوتا (۱۷) ۔

سید سلیمان ندوی اس زمانے میں ایک ناگہانی ضرورت سے لکھنو سے باہر چلے گئے اور الندوہ کی متعلق کچھ بتلا کر نہ جاسکے تھے اس لیے مولانا نے دریافت کیا کہ ان کا (مولانا کا) مضمون کہاں رکھ گئے اور صفر کے شمارے کے لیے انھوں نے (سید سلیمان ندوی) نے کچھ لکھا تھا یا نہیں اگر لکھا تھا تو کہاں رکھ گئے ۔ (سید سلیمان ندوی) کی بے پروائی پر سخت تنبیہ اور الندوہ کے صفر کے شمارے کے لیے فکر مند رہے ۔ مولانا قرآن مجید پر طلبہ کو درس دیتے تھے اور وہ یادداشت کے طور پر لکھ لیتے پھر مولانا اس کو مضمون کی شکل دے کر الندوہ کی زینت بناتے تھے ۔ اس کے متعلق بھی دریافت کیا کہ وہ کہاں رکھ گئے (۱۸) ۔

مولانا سے ڈپٹی صاحب کی ملاقات ہوئی تو انھوں نے مسٹر مہدی حسن کے متعلق بتلایا کہ ان کی ترقی کے لیے سفارش کی گئی ہے اور وہ جلد ہی تحصیلدار ہو جائیں گے ۔ اس پر مولانا پھولے نہ سمائے اور فوراً مبارک باد کا خط لکھا اور یہ لکھا کہ اس مبارک باد کو پیشگی کی مد میں محفوظ کیا جائے ۔ وجہ یہ تھی کہ ابھی احکامات نہیں ہوئے تھے ۔ مولانا کا اب پاؤں بن گیا تھا، لیکن ابھی رفتار میں کمی باقی تھی ۔

بمبئی کی شعریت جو موزوں ہو کر نکلی تھی، اس کے جب ۱۶ صفحات ہو گئے تو چھپنے کو دے دیے تھے، جن میں پچھلے سال (۱۹۰۷ء) کی بھی چند غزلیں شامل تھیں ۔ بعض غزلیں زیادہ شوخ ہو گئی تھیں جس پر مولانا کو خیال ہوا کہ ممکن ہے پچاس سالہ شخص (مولانا) کو زیب نہ دیتی ہوں ۔ لیکن اپنی تسلی کے لیے حافظ کا قول پیش کیا: "ہر گہ کہ یاد روی تو کردم جواں شدم" اور ایک اور شاعر کا مقولہ لکھا: "عشق در ہنگام پیری، چوں بہ سرما آتش است" ۔ یہ لکھ کر مولانا نے مسٹر مہدی حسن سے دریافت کیا کہ کیا یہ فلسفہ صحیح ہے ۔ لیکن مسٹر مہدی حسن سے اس وقت صحیح جواب کی توقع نہ تھی، اس کی وجہ یہ کہ ابھی وہ جوان تھے، اس لیے کہ لکھا کہ ۱۵ برس کے بعد اس کا جواب (۱۹) دیکھیے

(۲۰)۔

مولانا شروانی کے پاس امیر خسروؔ کے بچپن کا کلام (تحفۃ الصغیر) دیباچہ کے ساتھ تھا۔ مولانا نے اس کو طلب کیا اور لکھا کہ اگر وہ نہ ملا تو کتاب ناتمام رہ جائے گی۔ اس زمانے میں مولانا عالمگیر پر مضامین کا مجموعہ مکمل کر رہے تھے اور اس وقت اصلاحات ملکی اور فضائل اخلاقی کے متعلق لکھ رہے تھے اور اس طرح اس مضمون کو تیار کیا تھا کہ کتابچے کی شکل میں علاحدہ بھی شائع کیا جا سکتا تھا۔ مولانا محمد علی مرحوم (جو اس وقت مسٹر محمد علی بی۔ اے تھے اور ریاست بڑودہ میں ملازم تھے) اس کا انگریزی میں ترجمہ کر رہے تھے (۲۱)۔

ندوے کا سالانہ جلسہ ہو گیا ہوتا مگر منشی احتشام علی صاحب کا خیال تھا کہ گورنمنٹ سے زمین اور مالی امداد مل جائے تو جلسہ کیا جائے، تاکہ شاندار طریقے پر ہو اور اودھ کے تمام مسلمان تعلقہ داروں کو شریک کیا جائے۔ مولانا کا ارادہ دوبارہ بمبئی جانے کا تھا مگر زمین اور مالی امداد کے سلسلے میں گورنمنٹ سے خط و کتابت ہو رہی تھی اور معاملات طے ہو رہے تھے، اس لیے ٹھہر گئے۔ ڈائریکٹر آف انسٹرکشن نے دریافت کیا کہ کس صیغے میں امداد کی ضرورت ہے۔ زمین کا نقشہ بھی مانگا گیا۔ لہٰذا مولانا کو اب امید ہو چلی تھی کہ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا اور ان کے خواب کی تعبیر پوری ہونے کی امید تھی۔

بمبئی کا سفر اس لحاظ سے بھی بہت اہم رہا کہ مولانا کے ہاتھ ایک فرمان آیا جس کی رو سے اکبر بادشاہ نے پارسیوں کو نوساری میں جاگیر عطا کی تھی۔ یہ حکم خان خانان کے محکمے کا تھا اور اکبر کے فرمان کے حوالے سے تھا۔ مولانا کا ارادہ اس کو الندوہ میں شائع کرنے کا تھا۔

بہار کے مولوی شرف الدین صاحب جج نے اپنی سب کتابیں ندوہ کو عنایت کیں ان میں بعض بڑی اچھی کتابیں تھیں۔ مولانا ان کی اس خدمت سے بہت خوش ہوئے۔

مولانا کو بمبئی میں غرۃ الکمال کا بھی ایک نسخہ مل گیا تھا، مگر اس میں خاصی غلطیاں تھیں۔ بمبئی میں مولانا نے تعلیم نسواں کے عجیب و غریب نمونے دیکھے اور تعلیم یافتہ خواتین کی پبلک تقریریں سنیں اور مخصوص محفلوں میں ان کی گفتگو اور قابلیت (۲۲) سے متاثر ہوئے لیکن پھر بھی کوئی خوشی نہیں ہوئی (۲۳)۔

اب مولانا کو امیر خسروؔ کے پانچویں دیوان اور اس کے دیباچے کی تلاش تھی اور اس کا پتا ان کو برٹش میوزیم کے کتب خانے کی فہرست سے چلا، جس کو ڈاکٹر ریو نے مرتب کیا تھا اور

مرآت آفتاب نما میں اس کو پانچواں دیوان لکھا تھا۔ مولانا چاہتے تھے کہ اس کے دیباچے سے استفادہ کریں جو اس طرح شروع ہوا تھا: بسم اللہ الواھب اللذی وھب الخ (۲۴)۔

سید سلیمان ندوی کے بغیر اطلاع چلے جانے سے مولانا ناراض تھے، لہٰذا اسی ناراضی میں ایک اور سخت خط لکھا، جس میں ان کو توجہ دلائی کہ وہ الندوہ کے لیے کم از کم دو مہینے پہلے تمام مضامین تیار رکھا کریں تاکہ پرچہ وقت پر تیار رہے اور اہل قلم حضرات سے خط و کتابت رکھنا ضروری ہے اور اگر یہ کام پابندی سے کرنا ہیں تو اطلاع دیں ورنہ کیا فائدہ، اس لیے کہ طبیعت میں تکدر پیدا ہوتا ہے۔ چوں کہ آیندہ مہینہ (صفر) کا پرچہ تیار نہ تھا اور سید سلیمان ندوی خود مولانا کا مضمون بھی ساتھ لیتے گئے تھے، اس لیے مولانا اور زیادہ فکر مند تھے (۲۵)۔

۱۲۔ مارچ ۱۹۰۸ء کے بعد مولانا راجپوت کانفرنس میں شرکت کی غرض سے پٹیالہ جانے کا ارادہ کر رہے تھے (۲۶)۔ اب وقف علی الاولاد کے متعلق مولانا کی کوششوں سے لوکل کمیٹی قائم ہو گئی تھی اور لوگوں کی رائے کے مطابق مولانا وقف علی الاولاد پر ایک رسالہ لکھ رہے تھے، جس پر علما کے دستخط ہونے والے تھے۔ اس کے بعد اس کا انگریزی ترجمہ کرانے کا ارادہ تھا اور یہ ترجمہ میموریل کے ساتھ گورنمنٹ میں بھیجنے کا ارادہ تھا۔ شعرالعجم کا پہلا حصہ مکمل تو ہو چکا تھا مگر ابھی تک مطبع سے چھپ کر واپس نہیں ہوا تھا۔ خواجہ حافظ پر تو لکھ ہی چکے تھے، اب امیر خسروؔ کی باری تھی اور اس کے لیے بعض نادر تصنیفات مہیا کر لی تھیں۔ بھاول پور سے ندوہ کی مالی امداد کا اعلان ہوا تھا، جس کا ذکر مولانا اپنے مضمون میں کرنا چاہتے تھے اور وہ مضمون الندوہ میں شائع کرنے کا ارادہ تھا۔ حکومت سے ابھی تک امداد طے نہیں ہوئی تھی۔ پاؤں بن چکا تھا اور کام بھی دے رہا تھا مگر اصل اور نقل میں فرق تھا، پھر بھی امید تھی کہ رفتہ رفتہ عادی ہو جائیں گے (۲۷)۔

مولانا ۱۲۔ مارچ ۱۹۰۸ء کو چار بجے شام پٹیالہ کے لیے روانہ ہونے والے تھے۔ پٹیالہ میں راجپوت کانفرنس، کرنیل عبدالمجید خان وزیر پٹیالہ کی سرکردگی میں ہو رہی تھی۔ چوں کہ کرنل صاحب سے مولانا کے بڑے تعلقات تھے اور مولانا خود بھی راجپوت نسل سے تھے، اس لیے اس کانفرنس میں شرکت کی غرض سے جانے کا ارادہ تھا۔ واپسی میں ۱۷ یا ۱۸۔ مارچ کو علی گڑھ جانے کا ارادہ تھا۔ شعرالعجم حصہ اول، جو علی گڑھ میں چھپ رہی تھی، اس کی کاپیوں کی تصحیح کا موقع سفر کی وجہ سے نہ ملنے کا امکان تھا، اس لیے مولوی حمیدالدین فراہی کو اس کی تصحیح پر مقرر کیا اور یہ بھی لکھا کہ فردوسی کے اشعار میں چوں کہ موجودہ دور کے لیے بعض نامانوس الفاظ ہیں، لہٰذا ان کے

معنی بھی حاشیے میں لکھ دیے جائیں۔

انھیں دنوں مولانا کو الہ آباد سے خبر ملی کہ مولوی اسحاق نعمانی کی نواسی کا بندوق کے صدمے سے انتقال ہو گیا۔ مولانا کو بہت افسوس ہوا اور اپنے پیر کے حادثے کو پیش نظر رکھتے ہوئے انھوں نے خیال ظاہر کیا کہ بارود نے ان کا گھر دیکھ لیا تھا (۲۸)۔

مولانا اب سفر سے واپس آچکے تھے اور لکھنؤ میں تھے کہ ۲۴۔مارچ کو گورنمنٹ کی طرف سے انسپکٹر آف اسکولس دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معائنے کو آئے اور مطمئن واپس ہوئے۔ کتب خانے کو دیکھ کر تو خوشی کا اظہار بھی کیا۔ دارالعلوم کی زمین کے لیے ڈپٹی کمشنر نے کمشنر کو سفارش کے ساتھ کاغذات بھیج دیے۔ ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن بھی لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔ اتفاق سے وہ مولانا کے جاننے والے تھے، لہٰذا ندوہ کا ایک وفد ان سے ملنے والا تھا جس میں مولانا بھی شریک تھے۔

مولانا کو تحفۃ الصغیر اب تک نہیں ملی تھی، لہٰذا انھوں نے مولانا شروانی کو یاد دہانی کی اور یہ بھی لکھا کہ ندوے کے وفد کے ساتھ دس پندرہ دن کے لیے حیدر آباد (دکن) چلیں۔ دو تین روز بمبئی کی بھی سیر کر لی جائے (۲۹)۔

الندوہ کے انتظام میں اب تبدیلی کر دی گئی تھی اور یہ کر دیا گیا تھا کہ یکم اپریل ۱۹۰۸ء سے سید سلیمان ندوی کے بجائے عبداللہ عمادی کام کریں۔ مگر مولانا کو یہ گوارا نہ تھا کہ سید سلیمان ندوی کو بالکل ہٹا دیا جائے، لہٰذا ان کو لکھا کہ وہ اگر انگریزی واقعی محنت سے پڑھنا چاہتے ہیں اور دو برس تک مستقل پڑھیں اور اس حد کتب پڑھیں کہ کتب بینی کر سکیں تو الندوہ کی اجرت کے برابر وظیفہ مقرر کر دیا جائے اور اگر مولویانہ کاہلی سرایت کر گئی ہو تو کوئی اور صورت نکالی جائے (۳۰)۔

مولانا محمد علی اب تک مضامین عالمگیر کا انگریزی ترجمہ شروع نہ کر سکے تھے۔ چوں کہ بہت مصروف تھے، اس لیے مولانا نے دریافت کیا کہ دوسرے لوگوں سے ترجمہ کرا لیا جائے۔ مگر وہ اس پر تیار نہ ہوئے اور لکھا کہ جون سے ترجمہ کا کام شروع کر دیں گے۔

پروفیسر عبدالقادر مولانا کو بار بار پونہ آنے کی دعوت دے رہے تھے۔ اس پر مولانا نے اپنی معذوری ظاہر کی اور لکھا کہ لکھنؤ میں کچھ ایسی ضرورتیں پیش ہیں کہ آنا مشکل ہے۔ دوسرے یہ کہ تصنیف کے کام میں سفر میں رکاوٹ ہو جاتی ہے۔ مولانا کا ارادہ تھا کہ برسات تک شعرالعجم

کا دوسرا حصہ مکمل کر دیں۔ اب پہلا حصہ مولانا کی مرضی کے مطابق شائع ہو رہا تھا۔

پروفیسر مذکور کا ارادہ تھا کہ وہ شعر العجم کا انگریزی ترجمہ کریں۔ اس پر مولانا نے لکھا کہ حالات تو یورپین بھی لکھ چکے ہیں، اصل چیز شعرا کے کلام پر ریویو ہے، جس میں اصل اصل اشعار نقل کیے گئے ہیں۔ لہذا اس کو پیش نظر رکھ کر اگر ترجمہ کیا جائے تو مقصد حاصل ہو سکے گا۔

پروفیسر صاحب نے نکلسن، جس نے لٹریری ہسٹری آف عربیا لکھی تھی، کہ اس کے متعلق استفسار کیا تو مولانا نے لکھا کہ عربی میں یورپین ہندوستان کے لوگوں (پاک و ہند کے لوگوں) سے بہت پیچھے ہیں۔

پروفیسر صاحب کو شرح انوری از ابوالحسن فراہانی کی ضرورت تھی تو مولانا نے لکھا کہ اس کو تلاش کر کے بھیجوں گا۔ بمبئی کی غزلوں کو دستہ۔ گل کے نام سے شائع کرا رہے تھے۔ کچھ نئی غزلیں بھی اس میں شامل کر دی تھیں۔ چھپنے کے بعد پروفیسر صاحب کو بھیجنے کا ارادہ تھا۔ مولانا بمبئی اور پونہ میں برسات گزارنے کا ارادہ کر رہے تھے (۳۱)۔

اب مولانا وقف علی الاولاد پر اپنا رسالہ لکھ چکے تھے اور چھپوانے کا ارادہ کر رہے تھے۔ اس کے بعد انگریزی میں ترجمہ کرا کے اور عام میموریل کے ساتھ شامل کر کے حکومت کو بھیجنے کا ارادہ تھا۔ شعر العجم کا دوسرا حصہ امیر خسرو تک پہنچ چکا تھا (۳۲)۔ پروفیسر عبدالقادر نے مسعود سعد سلمان پر ایک انگریزی مضمون سے ترجمہ کر کے مولانا کو بھیجا تو مولانا نے اس کی بڑی تعریف کی اور لکھا کہ اردو کی غلطیاں ضرور تھیں جن کو درست کر کے مختصر تمہید اور پروفیسر صاحب کے لیے تعارفی نوٹ کے ساتھ الندوہ میں شائع کرنے کا ارادہ تھا۔ مولانا نے پروفیسر صاحب کے علمی مذاق کی بھی بڑی داد دی۔

اسی زمانے میں زہرا فیضی اور عطیہ فیضی سے بھی مولانا کی خط و کتابت رہی اور بعض خطوط میں علمی مضامین بھی تھے۔ مولانا کو ان دونوں کی اردو نویسی پر بڑا تعجب ہوا۔

چوں کہ مولانا حالی حیاتِ سعدی لکھ چکے تھے اور ان کے نزدیک یہ کتاب اردو ادب میں پائے کی کتاب تھی، اس لیے مولانا اس کے بعد سعدی پر قلم اٹھانا نہ چاہتے تھے۔ مگر لوگوں کے اصرار سے اور اس خیال سے کہ تسلسل نہ رہے گا ناچار قلم اٹھایا اور اب سعدی پر خامہ فرسائی کر رہے تھے۔ بمبئی کی فارسی غزلیں اب دستہ۔ گل کے نام سے شائع ہو گئی تھیں۔ اس کا ایک نسخہ پروفیسر عبدالقادر کو تحفے کے طور پر بھیجنے کا ارادہ تھا (۳۳)۔

ترجمے کا بقیہ حصہ پروفیسر صاحب نے ۵۔ مئی کے بعد ۱۹۔ مئی ۱۹۰۸ء سے پہلے بھیجا تو مولانا نے اس کی رسید لکھی۔ چوں کہ اشعار کی تعداد بہت زیادہ تھی اس لیے نثر دب کر رہ گئی تھی اور اندیشہ تھا کہ عام پڑھنے والوں کو اس میں دلچسپی نہ ہو۔ اس لیے مولانا کا ارادہ تھا کہ اشعار کم کر کے اور نثر میں کچھ اضافہ کر کے عام پڑھنے والوں کی دلچسپی کے قابل بنادیں۔ انھوں نے پروفیسر صاحب کو یہ بھی لکھا کہ اگر وہ برا نہ مانیں تو ان کی غلطیاں درست کردی جایا کریں۔

مولانا کو بمبئی کی مذکورہ خواتین کی اردو نویسی پر اس لیے اور حیرت تھی کے عورتیں جو کچھ سیکھتی ہیں مردوں سے سیکھتی ہیں اور ان عورتوں کو اردو داں مل نہ سکتے تھے، اس لیے کہ ان کے مردوں کی اردو بمبئی کے انداز کی ہوتی تھی۔ اس کے باوجود وہ نہایت بے تکلف اور صحیح اردو لکھتی تھیں۔

چوں کہ مولانا اب شعرالعجم میں شیخ سعدی پر لکھ رہے تھے اس لیے پروفیسر عبدالقادر کو لکھا کہ اگر وہ مواد کی فراہمی میں مدد کرسکیں تو عنایت ہو (۳۴)۔

بھوپال کی بیگم صاحبہ نے امین زبیری صاحب کے ذریعے پردے کے متعلق مولانا سے دریافت کیا تو مولانا نے لکھا کہ وہ پردے کے متعلق ایک مضمون الندوہ میں شائع کرچکے تھے، جو مذہب اور تاریخ کی روشنی میں لکھا گیا تھا، جو پردے کے متعلق قطعی فیصلہ تھا اور اس کے بعد ایک حرف بھی نہیں لکھا جاسکتا تھا۔ عورتوں کی تعلیم کے سلسلے میں مصر میں دو رسالے (تحریر المرأۃ اور المرأۃ الجدیدہ) نہایت آزادی اور قابلیت سے لکھے گئے تھے۔ مولانا نے ان دونوں رسالوں کی اطلاع دی اور یہ بھی لکھا کہ تحریر المرأۃ کا جواب بھی غایت عالمانہ اور فلسفیانہ لکھا گیا تھا۔ مولانا نے اپنا خیال ظاہر کیا کہ اردو میں جو رسالے لکھے گئے، مثلاً حقوق نسواں وغیرہ وہ عامیانہ تھے۔ اخلاق کی قدیم کتابوں کے متعلق لکھا کہ اخلاق جلالی اور احیاء العلوم میں بھی عورتوں کی تعلیم و تربیت کے متعلق جستہ جستہ باتیں ہیں (۳۵)۔

جولائی میں مولانا حیدرآباد (دکن) میں تھے۔ یہاں بلائے ہوئے آئے تھے اور حیدرآباد کی سرکار علوم شرقیہ کی یونیورسٹی قائم کرنا چاہتی تھی اس کے نصاب وغیرہ کی تیاری مولانا کے سپرد کی گئی تھی۔ مولانا کا چند روز قیام کا ارادہ تھا۔ ویسے ان کو یونیورسٹی کی نظامت پیش کی جارہی تھی، جس کا مشاہرہ معقول تھا، لیکن مولانا اس کو قبول کرنے پر تیار نہ تھے۔ وہاں کی سازشوں کا ان کو خاصا تجربہ ہوچکا تھا، اس لیے دودھ کا جلا مٹھا پھونک کر پی رہے تھے۔ نصاب کی تیاری بے شک کر

رہے تھے، مگر ملازمت کے لیے تیار نہ تھے۔ مسٹر مہدی حسن ندوے کے مقصد کو نہیں سمجھتے تھے اور وہ انگریزی تعلیم کو ترجیح دیتے تھے، اس لیے کالج کی تعلیم کے حامی تھے۔ اس پر مولانا نے لکھا کہ جن لوگوں کی وہ قدر دانی کرتے تھے وہ بھی انگریزی تعلیم پائے ہوئے تھے، یہ دوسری بات تھی کہ اب ایسے لوگوں کی ضرورت نہ محسوس کی جارہی ہو۔ مولانا کو اس بات کا بڑا احساس تھا کہ حیدر آباد (دکن) کے قیام کے دوران میں الندوہ کی نگرانی اور شعرالعجم کا کام نہ کر سکیں گے۔ مولانا کو حیدر آباد (دکن) میں فنون جنگ پر عربی میں ایک قدیم تصنیف ہاتھ آگئی تھی جس کا خط بھی قدیم تھا مگر پڑھی کم جارہی تھی اور اس قابل نہ تھی کہ عربی سے اردو میں ترجمہ کی جاسکتی (۳۶)۔

۶۔ جولائی کو مولانا کا خیال تھا کہ حیدر آباد (دکن) میں شاید دو تین ہفتے قیام رہے۔ ندوے کی تمام کارروائیوں کے متعلق مولانا کا خیال تھا کہ ابھی خواب ہیں، تعبیر نکلے تو اطمینان ہو زمین کے متعلق رپورٹ لکھنؤ سے جاچکی تھی اور گورنر کے حکم کا انتظار تھا۔

حیدر آباد میں کچھ نئی آسامیوں کی تجویز ہوئی تھی ان میں سے ایک کے لیے مولانا نے سید سلیمان ندوی کے لیے تحریک اور سفارش کی۔ اگرچہ سال بھر کی دیر تھی، لیکن کامیابی کی بڑی امید تھی (۳۷)۔

مولانا کا خیال تھا کہ وہ دو تین ہفتے قیام کریں گے مگر وہ ۹۔ اگست تک ٹھہرے رہے اور مزید ٹھہرنے کا ارادہ تھا کیوں کہ وہاں ایک دن کا کام مہینوں میں ہوتا تھا اور اب وہ شعرالعجم کے کام میں رکاوٹ کی وجہ سے حیدر آباد (دکن) میں مزید قیام سے گھبرا رہے تھے۔ یونیورسٹی کے قیام کے سارے سامان مہیا تھے، لیکن مناسب آدمی نہیں ملتے تھے اور آدمی ملتے بھی تھے تو وہاں کی سازشوں کی وجہ سے کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ اور خود مولانا ملازمت تو کسی قیمت پر کرنے کو تیار نہ تھے، البتہ اگر حالات مناسب رہتے تو سال دو سال رہ کر کام چلانے کا ارادہ تھا، تاکہ بنیاد مستحکم ہو جاتی اور آئندہ بھی کام چلتا رہتا۔ مسٹر مہدی حسن نے قاضی تلمذ حسین کے لیے سفارش کی تو مولانا نے لکھا کہ قاضی صاحب کام کے لیے موزوں نہیں کیوں کہ ان کی عربی استعداد معیاری نہ تھی اور عربی میں ایم۔ اے تو گویا بے کار تھا۔ ہاں اگر انھوں نے بی۔ ایس سی کیا ہوتا تو بے شک ان کی قدر ہو سکتی تھی (۳۸)۔

مولانا عبداللہ عمادی امرتسر چلے گئے تھے اور مولانا حیدر آباد میں تھے، اس لیے الندوہ کے لیے بے حد فکر مند تھے۔ لہٰذا مسٹر مہدی حسن کو لکھا کہ الندوہ کے لیے جلد کوئی مضمون بھیجیں۔

براؤن کی کتاب کا اقتباس یا ترجمہ ہی بھیج دیں۔ اسی زمانے میں ٹرکی میں پارلیمنٹ قائم ہوئی تو مولانا نے خیال ظاہر کیا کہ اس پر تبصرہ ابھی قبل از وقت تھا۔ کچھ دنوں کے بعد اس کے عملی نتائج پر کچھ کہا جاسکتا تھا۔

مولانا نے بمبئی میں کتاب الآلات حرب پر تیسری صدی ہجری کی تصنیف دیکھی جو ان کو عجیب و غریب معلوم ہوئی۔ مولانا کا خیال تھا کہ اگر وہ بمبئی جائیں تو پھر وہاں کی فضا شاعری کا ذریعہ بن جائے۔

فرید وجدی کا فوٹو مولانا کو ہاتھ آگیا تھا اور ان کا پتا بھی معلوم ہو گیا تھا۔ مولانا کا ارادہ تھا کہ اس کو الندوہ میں شائع کر دیں۔ لہٰذا مسٹر مہدی حسن کو لکھا کہ الندوہ میں ان کا فوٹو دیکھیں (۳۹)۔

ندوے میں حکام بار بار معائنہ کر رہے تھے اور خط و کتابت بھی چل رہی تھی، مگر کوئی بات اب تک یقینی طور پر طے نہیں ہوئی تھی۔

کچھ دن پہلے گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہوئی تھیں۔ ان چھٹیوں میں مولوی حمید الدین فراہی دروس الاولیہ پڑھانے کے لیے ندوے نہ آسکے تھے۔ مولانا نے ان کو شکایت لکھی کہ لمبی تعطیل گزر گئی اور وہ اب کی بھی دروس الاولیہ پڑھانے نہ آئے۔ وظیفہ جو مقرر کیا تھا اس کے متعلق بھی استفسار کیا کہ بھیجا یا نہیں۔

اسی زمانے میں گورنمنٹ نے ندوے کے لیے ۳۲ بیگھہ زمین دی تو اس کی اطلاع بھی مولوی صاحب کو دی۔ ۳۰۔ اگست بروز یک شنبہ شکریے کا بہت بڑا جلسہ ہونے والا تھا۔ اب مولانا کو اطمینان ہو گیا تھا، لہٰذا متعدد امور ندوے کی ترقی کے ظہور میں آنے کی امید تھی۔

مشرقی یونیورسٹی کا نصاب ابھی تیار نہیں ہوا تھا، لہٰذا حیدر آباد (دکن) جانے کا پھر ارادہ تھا۔ مصروفیت کے باوجود مولانا نے بہت سی غزلیں لکھیں۔ بعض اشعار یہ تھے:

در شوق پاس گرمی نازش بجا نماند — باآنکہ کار باصنم خود پسند ہست
ہرگز حدیث شوق بہ پایاں نمی رسد — یارب کدام جاسر ایں رشتہ بند ہست
می بینم ایں کہ قیمت دل تاکجا کشد — پرسد زمن، کہ نرخ متاع تو چند ہست
دل در ادائے طاعت حق حیلہ جو نبود — عذرم بنہ کہ بادہ بقدر وضو نبود (۴۰)

مولانا جلد ہی الندوہ میں آلات الحرب کا مختصر تذکرہ اور آلات حرب کے چند نقشے شائع

کرنے والے تھے۔ فرید وجدی کے متعلق بھی تذکرہ شائع ہو رہا تھا، مگر فوٹو وغیرہ الندوہ میں شائع نہیں ہوتے تھے اس لیے فوٹو شائع کرنے کو نہیں دیا گیا تھا۔

مسٹر مہدی حسن، قاضی تلمذ حسین کی سفارش کر رہے تھے اور چاہتے تھے کہ نارمل اسکول میں ان کو رکھا دیا جائے، لیکن دشواری یہ تھی کہ انھوں نے تعلیم کی ٹریننگ نہیں لی تھی۔ یہ صراحت پانیر اخبار میں شائع ہونے سے رہ گئی تھی۔ معتمد تعلیمات سے مولانا نے ان کے بارے میں گفتگو کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔

ٹرکی میں نیم جمہوریت قائم ہونے سے مولانا بہت خوش تھے۔ عربی اخبارات، جن میں وہاں کی روئداد چھپتی تھی، ان کو مزے لے لے کر پڑھتے تھے۔ مولانا ایران اور ٹرکی کی پارلیمنٹ کو یورپ کا اثر نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسلام کا اثر سمجھتے تھے اور امرھم شوریٰ کے تحت جانتے تھے۔ چناں چہ ترکی کا جوش، صداقت، مسرت، اعتدال، دنیا کی تاریخ میں اسلام ہی کا اثر جانتے تھے۔ یہی وجہ تھی بغیر خون خرابے کے سلطان عبدالحمید خان نے عوام کے مطالبات مان کر پارلیمنٹ قائم کر دی تھی۔

گورنمنٹ نے جو ندوے کو زمین دی تھی وہ نہایت خوش منظر اور وسیع تھی اور دریائے گومتی کے دوسرے کنارے پر تھی۔ عمارت کی بنیاد قائم ہو چکی تھی اور عمارت بھی کچھ بن گئی تھی شکرے وغیرہ کے جلسے بھی کیے گئے تھے اور اس قسم کے جلسوں میں شرکت کی غرض سے مولانا مشرقی یونیورسٹی (حیدرآباد) کا نصاب نامکمل چھوڑ کر لکھنؤ آگئے تھے۔ ۳۰۔ اگست کے شکریے کے جلسے کے بعد، جس میں کمشنر بھی شرکت کر رہے تھے، مولانا نصاب کو مکمل کرنے پھر حیدرآباد (دکن) جانے والے تھے۔

اب شعرالعجم کا دوسرا اور تیسرا حصہ بھی ختم کے قریب تھا اور مطبع سے ۲۲۷ صفحے بھی چھپ کر آگئے تھے (۳۱)۔

مولانا نے ندوے کی مجلس انتظامیہ میں یہ پاس کرا دیا تھا کہ ایک طالب علم کو وظیفہ دے کر مولوی حمید الدین فراہی کے پاس (علی گڑھ) دروس الاولیہ اور ہیئت جدیدہ پڑھنے بھیجا جائے اور اگر ممکن ہو سکے تو کالج کے بیت الآلات میں تجربہ وغیرہ بھی سکھا دیا جائے۔ مولوی حمید الدین سے انھوں نے دریافت کیا کہ اس طالب علم کے قیام تعلیم و تجربہ کے سلسلے میں وہ (حمید الدین) مولانا کو اطلاع دیں کہ کیا کر سکتے ہیں اور اگر وہ اس کے قیام کا انتظام اپنے یہاں کر سکیں تو

ان کا (حمید الدین کا) ندوے کے لیے وظیفہ اس کے قیام کے عوض وضع کیا جاسکتا تھا (۴۲)۔

ریاست کپورتھلہ کے برکت علی شاہ نے مولانا سے امیر حمزہؓ کا نسب دریافت کیا تو مولانا نے سید سلیمان ندوی کو ہدایت کی کہ طبقات ابن سعد سے لکھ کر بھیج دیں ۔ آج کل مولانا کی طبیعت پھر کچھ خراب تھی، لہذا یہ بھی ہدایت کی کہ الندوہ کے مضامین کی فکر رکھیں اور طبیعت ٹھیک ہونے پر خود بھی لکھیں گے (۴۳)۔

مولانا کو شکایت تھی کہ مسٹر مہدی حسن الہ آباد میں رہتے ہوئے بھی نہیں ملتے، مگر پتا چلا کہ وہ اب گورکھپور میں تھے۔

۲۸۔ نومبر کو دار العلوم ندوۃ العلماء کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھنا طے ہوا تھا اور اس کو گورنر کے ہاتھ سے رکھا جانا تھا۔ مولانا نے مسٹر مہدی حسن سے خواہش کی کہ وہ بھی اس جلسے میں شرکت کریں۔

اسی زمانے میں ترکی کے کچھ صوبے اس کے ہاتھ سے نکل گئے تو مولانا نے اپنے دل کو اس طرح تسلی دی اور اس کی اطلاع مسٹر مہدی حسن کو دی کہ یہ نظر بد کے لیے اسپند ہے ۔ اندرونی حالت کی درستی کے بعد وہ صوبے پھر قبضے میں آجائیں گے ۔

مسٹر مہدی حسن نے مولانا کو لکھا کہ "کچھ دنوں آپ اور جوان رہتے" تو مولانا نے لکھا کہ اگر آپ جوان ہوں تو مرتے دم تک بوڑھا ہونے کا کوئی سوال نہیں "آں قدر عشق بورزم کہ جواں گردم باز"۔

۹۔ اکتوبر کو عطیہ فیضی یورپ سے واپس آئیں تو مولانا نے خیر مقدم میں چند اشعار کہے دو شعر یہ تھے:

شیشہ ہائے دل عشاق بمپنید زراہ   کہ گزندش رسد ار درتہ پائی آید
مزنید آب بہ خاک سر راہش کین کار   شیرہ ہست کہ از دیدہ ماہی آید (۴۴)

مولانا نے کسی کے حسن و جمال کی تعریف کی تھی۔ مسٹر مہدی حسن کو اس کی نقلی تصویر ہاتھ لگی تو انھوں نے مولانا کو بھیج دی ۔ چوں کہ مولانا کا حسن کا معیار بڑا بلند تھا، اس لیے انھوں نے جواب دیا کہ اس بھدی تصویر کو حسن کا نمونہ سمجھنے والا شعر العجم نہیں لکھ سکتا۔ مطلب یہ تھا کہ ان کا معیار بڑا بلند تھا (۴۵)۔

مولوی ضیاء الحسن ندوی ندوہ سے فراغت کے بعد انگریزی تعلیم کے لیے علی گڑھ جانے

کے لیے تیار ہوئے تو مولانا نے مولوی حمید الدین سے ڈاکٹر پارویز کے نام ان کے لیے تعارفی خط منگوایا تاکہ ان کو کالج میں سہولتیں حاصل ہو جائیں۔

مولانا نے اسی زمانے میں ایک غزل کہی، جس کا مطلع یہ تھا:

خواہید اگر کہ عیش فردوس (۳۶) از فردوں کنید | دیوانہ الیست عقل زشہرش بروں کنید
فرصت زدست میرود ، از دیر میکشید | گر کردن است چارہ۔ شبلی کنوں کنید (۴۷)

مولانا اب ندوے کے افتتاحی جلسے کی تیاری میں مصروف تھے، جو ۲۸۔ نومبر کو ہونے والا تھا۔ عطیہ فیضی ندوے سے دل چسپی کی بنا پر آج کل لکھنو آئی ہوئی تھیں۔ چوں کہ مولانا سے خصوصیت تھی، اس لیے ان کی مہمان نوازی ان کے ذمے تھی۔ مگر وہ جلسے کی تیاری کی وجہ سے مہمان نوازی نہ کر سکتے تھے۔ اس کا ان کو افسوس تھا، کیوں کہ وہ جب بمبئی جاتے تھے تو ان کی شایاں شان پذیرائی کی جاتی تھی اور جنجیرہ بلایا جاتا تھا۔ مولانا عطیہ کی ذہانت اور اردو، فارسی، انگریزی، فرنچ زبان دانی، مصوری، نقشہ کشی، سیاست، قوتِ تحریر وغیرہ میں قابلیت سے بہت متاثر ہوئے (۴۸)۔

عطیہ فیضی کا خیال تھا، بلکہ تجربہ اور مشاہدہ تھا کہ ترکی یورپین طاقت کا بازیچہ تھا۔ جدید قرنس نے اس کی رہی سہی ساکھ بھی ختم کر دی تھی۔ مولانا باوجودیکہ عطیہ کی ذہانت اور قابلیت سے خاصے متاثر تھے مگر اس کے باوجود عطیہ کی اس رائے سے ان کو اتفاق نہ تھا۔

آج کل شعرالعجم میں رکاوٹ ہو رہی تھی، اس لیے کہ مولانا موسمی امراض میں مبتلا تھے۔ مطبع والے کام کے منتظر تھے اور کام ہو نہیں رہا تھا، اگرچہ چند ہی روز کا کام باقی تھا۔ "دستہ گل" کے بعد جدید غزلوں کا مجموعہ "بوے گل" کے نام سے جلد شائع ہونے والا تھا۔ اس کی اطلاع مولانا نے مسز مہدی حسن کو دی۔ مولانا آج کل الہ آباد آئے ہوئے تھے (۴۹)۔

مولانا شعرالعجم لکھ رہے تھے تو ان کو فارسی شاعری پر عربی شاعری کے اثرات نظر آئے، اس لیے انھوں نے ایک مضمون عربی اور فارسی شاعری کا موازنہ (۵۰) کے عنوان کے تحت لکھا۔ یہ مضمون الندوہ کے اپریل کے شمارے میں شائع ہوا، جس میں وہ لکھتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ فارسی کی شاعری اگرچہ بالکل عرب کا سایہ ہے، لیکن دونوں ملکوں کے تمدن، معاشرت اور مقامی حالات میں اس قدر اختلاف ہے کہ ہر طرح کے تعلقات کے ساتھ بھی دونوں شاعریوں میں زمین و آسمان کا فرق پیدا ہو گیا

ہے۔ عرب کا تمدن یہ تھا کہ بڑے بڑے جتھے پہاڑوں اور میدانوں میں رہتے تھے۔ کسی بادشاہ یا فرمانروا کے محکوم نہیں تھے۔ آزادی اور خود سری کے خیالات ساتھ لے کر پیدا ہوتے تھے اور ساتھ لے کر جاتے تھے۔ طبیعت جنگجو اور شوریدہ تھی، اس لیے آپس میں لڑتے بھڑتے رہتے تھے، اور ذرا ذرا سی بات پر قبیلے کے قبیلے لڑ کر فنا ہو جاتے تھے۔ فصاحت اور بلاغت کا ملکہ فطری تھا۔ اس لیے جو حالت پیش آتی اور جو خیالات پیدا ہوتے ان کو اسی اسلوب اور جوش و خروش کے ساتھ ادا کر دیتے تھے"۔

رزمیہ شاعری

ان باتوں کا اثر یہ تھا کہ ان کے اشعار میں شجاعت، جانبازی، مخاطرہ، نفس، اندھا دھند دلیری کے جو خیالات پائے جاتے ہیں، فارس بلکہ دنیا کی کسی قوم کو نصیب نہیں ہو سکتی۔ اس قسم کے اشعار کو حماسیات کہتے ہیں۔ ان حماسیات کو پڑھو تو یہ عالم نظر آتا ہے کہ جنگل میں شیر گونج رہا ہے۔ فردوسی نے بھی شاہنامہ میں بڑے بڑے زور کے معرکے لکھے ہیں، لیکن وہ اوروں کے افسانے ہیں۔ فردوسی داستان گو بن کر ان کو بیان کرتا ہے، لیکن عرب کا شاعر جو کہتا ہے، اپنی سرگزشت کہتا ہے، اس لیے اس کا جو اثر ہوتا ہے شاہنامہ کا نہیں ہو سکتا۔ عرب میں جو مشہور شاعر گزرے ہیں وہی مشہور بہادر اور جنگ آور تھے۔ مثلاً امراء القیس، عمرو بن کلثوم، عمرو معدی کرب، اس لیے وہ زبان سے وہی کہتے تھے جو ہاتھ سے کرتے تھے (۵۱)۔

الندوہ کے اپریل کے شمارے میں مولانا نے ایک مضمون ہمایوں نامہ اور گل بدن بیگم پر لکھا۔ اس میں لکھتے ہیں:

"ہمایوں نامہ چوں کہ ایک خاتون کی تصنیف تھی، یورپ کی خوش مذاقی نے اس کتاب کی اشاعت کے لیے ایک خاتون ہی کو انتخاب کیا، یعنی لیڈی اینیٹ ایس بیورج کو اس کتاب کے بہم پہنچانے کا خیال ہوا۔ لیڈی موصوف نے اس کتاب کی تلاش میں بے انتہا جاں فشانیاں کیں۔ اس سلسلے میں یہ بات بیان کرنے کے قابل ہے کہ لیڈی صاحبہ نے شوق جستجو میں اردو تصنیفات پر بھی نظر ڈالی، اور چوں کہ وہ ناامید ہو چکی تھیں، اس لیے جب ان کو مولوی محمد حسین آزاد کی دربار اکبری میں گلبدن بیگم کا نام ملا تو ان کی امیدیں دوبارہ تازہ ہو گئیں۔ انھوں نے بمبئی میں اپنے ایک دوست کو خط لکھا کہ مولوی صاحب موصوف سے مل کر ہمایوں نامہ کا پتا لگائیں۔ لیکن مولوی محمد حسین آزاد سے مل کر ان کو معلوم ہوا کہ آزاد نے جو کچھ لکھا

تھا وہ خود لیڈی صاحبہ کی خوشہ چینی تھیں - یعنی اس آرٹیکل سے ماخوذ تھا جو لیڈی صاحبہ اس سے پہلے ایک انگریزی پرچہ گل بدن بیگم کے متعلق لکھ چکی تھیں۔

آنکس کہ گفت قصہ ما ہم زما شنید فاعتبروا یا اولی الابصار "

بہرحال لیڈی صاحبہ کی تحقیقات کا سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ انھوں نے اس نایاب کتاب کے متعدد نسخے بہم پہنچائے اور نہ صرف کتاب کو چھاپا بلکہ حسب ذیل باتیں اضافہ کیں:

۱۔ گل بدن بیگم کی نہایت مفصل سوانح عمری لکھی۔

۲۔ کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔

۳۔ ترکی الفاظ نہایت کثرت سے تھے، ان کی تحقیق کی اور ان کو حل کیا۔

۴۔ کتاب میں سیکڑوں شاہی خاندان کی بیگمات کے نام آگئے تھے، ان سب کے حالات لکھے۔

۵۔ جس قدر نام کتاب میں آئے ہیں ان کی مفصل فہرست شامل کی کہ جس شخص کے متعلق کچھ دیکھنا چاہیں فوراً اس کا پتا لگ جائے۔

یہ کتاب ۱۹۰۲ء میں چھپ کر بمقام لندن شائع ہوئی اور نو روپے قیمت پر بمبئی میں تھیکر کی دکان سے مل سکتی ہے (۵۲)۔

مولانا نے اپریل ۱۹۰۸ء میں ایک مضمون اور لکھا، جس کا عنوان "تفسیر کبیر امام رازی پر ریویو" تھا۔ اس میں لکھتے ہیں:

"یہ تفسیر غالباً ۵۹۵ھ سے کچھ پہلے شروع ہوئی - امام رازی نے سورہ آل عمران کی تفسیر جہاں ختم کی ہے، خاتمہ میں لکھتے ہیں کہ میں نے سورت کی تفسیر جمعرات کے دن ربیع الثانی ۵۹۵ھ میں ختم کی۔"

امام رازی اس کتاب کو پوری نہ کر سکے ان کے بعد ایک اور فاضل نے بقیہ جلدیں تمام کیں۔ لیکن پوری تفسیر امام صاحب ہی کے نام سے مشہور ہے، یہاں تک کہ اکثر لوگوں کو اس واقعہ کا سرے سے علم ہی نہیں ہے اور ہے تو یہ معلوم نہیں کہ تکملہ لکھنے والے کون بزرگ تھے۔ ابن خلکان نے اس قدر لکھ کر چھوڑ دیا کہ امام نے یہ کتاب پوری نہیں کی۔ کشف الظنون میں لکھا ہے کہ شیخ نجم الدین احمد بن القمولی المتوفی ۷۲۷ھ نے تکملہ لکھا اور قاضی القضاۃ شہاب الدین بن خلیل الخولی الدمشقی المتوفی ۶۳۹ھ نے بھی تکملہ لکھا اور اس کا نام واضح رکھا۔ اس التباس اور شدگی کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ تکملہ لکھنے والوں نے امام رازی کے طرز کو اس قدر محفوظ رکھا کہ

ذرہ برابر فرق نہیں نظر آتا۔ امام رازی کا یہ مخصوص وصف ہے کہ وہ مشکل سے مشکل مطلب کو اس قدر آسان اور سہل کر کے لکھتے ہیں کہ بچہ تک سمجھ سکتا ہے اور اس خصوصیت میں تمام علمائے اسلام میں کوئی شخص ان کا ہمسر نہیں ہو سکتا۔ لیکن تفسیر کبیر کے تکملہ نگاروں نے اس طرز کو اس کمال تک پہنچا دیا کہ خود گم ہو گئے اور آج دنیا ان کی تحریر کو بھی امام رازی کی تحریر سمجھ رہی ہے (۵۳)۔

مولانا راجپوت کانفرنس میں شرکت کے لیے پٹیالہ گئے تھے اور آریوں کی سرگرمیوں سے بخوبی واقف تھے، لہٰذا انھوں نے اپریل میں ایک مضمون "نو مسلم راجپوت اور حفاظتِ اسلام" لکھا۔ اس میں لکھتے ہیں:

"آریوں کی مذہبی دست درازیوں نے جس قدر ضرر پہنچایا اس سے زیادہ فائدہ حاصل ہوا۔ بے شبہ ان کے اغوا اور فریب کاری سے چند بچے نو مسلم، مرتد ہو کر اسلام کے دائرے سے نکل گئے، لیکن اس واقعے نے ہندوستان میں اس سرے سے اس سرے تک ایک آگ سی لگا دی اور ہر طبقے اور ہر درجے کے مسلمان دفعتہً چونک پڑے۔ مسلمانوں کا وہ گروہ جو دنیوی تعلیم کی مصروفیت کی وجہ سے مذہبی تعلیم سے بالکل غافل ہو گیا تھا یہاں تک کہ بعض بعض علانیہ مذہب کی توہین کرنے لگے تھے، وہ بھی گھبرا اٹھے اور بدحواس ہیں کہ مذہب ایک طرف مسلمانوں کی مردم شماری جس پر ملکی حقوق کی بنیاد ہے، گھٹتی جاتی ہے۔ اس کا کیا علاج ہو گا؟

بے شبہ قوم کا یہ مذہبی احساس ہماری خوش نصیبی کی فال ہے، لیکن اس واقعے کی تہہ میں جو نہایت اہم نتائج پوشیدہ ہیں، ہم کو ان پر نظر ڈالنی چاہیے۔

سب سے پہلے ہم کو اس پر غور کرنا چاہیے کہ ان نو مسلموں کے مرتد ہو جانے کا سبب کیا ہوا؟ اس کا جواب صرف ایک ہے، وہ یہ کہ یہ لوگ اسلامی عقائد، اسلامی احکام، اسلامی تاریخ سے بالکل ناواقف تھے۔ (ان کا اسلام صرف نام کا اسلام تھا) اس لیے ذرا سی فریب کاری اور دھوکے سے یہ عارضی رنگ اڑ گیا۔ یہ جواب بے شبہ صحیح اور سرتاپا صحیح ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ ہماری موجودہ دنیوی تعلیم سے کیا اس پیشین گوئی کی مخفی آواز نہیں آ رہی ہے؟

کیا ہماری دنیوی تعلیم (انگریزی تعلیم) میں عقائد اسلام کے استحفاظ کا کوئی بندوبست ہے؟ کیا اس میں تاریخ اسلام کا کوئی معتد بہ حصہ شامل ہے؟ کیا وہ مذہبی زندگی کی ذمہ دار ہے؟

بے شبہ ابھی تک موجودہ نسلوں میں اسلام کے آثارات نظر آتے ہیں،

لیکن یہ پچھلے اور موجودہ سوسائٹی کی بقیہ یادگار ہیں" (۵۴)۔

مولانا نے اگست ۱۹۰۸ء میں ایک مضمون "ندوہ کی نئی زندگی کا آغاز" لکھا، جس میں ندوے کی شاندار ابتدا اور اس کے بعد اس میں کمزوری کا ذکر کیا پھر ندوے کی نئی زندگی کو بیان کرتے ہوئے لکھا:

"ندوے کی اس نئی زندگی میں جن جن کاموں کا آغاز ہوا، یعنی نصاب تعلیم کا تغیر، طریقہ تعلیم کی اصلاح، بورڈروں کی تربیت، طلبہ کی قابلیتِ علمی کا ظہور، مالی حالت کی ترقی، سرمایہ، تعمیر کی بنیاد، گو یہ سب چیزیں ندوے کے عمدہ مظاہر زندگی ہیں، لیکن سب سے بڑی اور سب سے مقدم کامیابی جو حاصل ہوئی وہ ندوے کے سلسلے میں عمارت کے لیے زمین کا ملنا ہے۔"

لکھنو میں (جو ندوے کا صدر مقام ہے) ایک ایسے وسیع اور خوش منظر قطعہ، زمین کا ہاتھ آنا، جیسا کہ ندوے کی وسیع کارروائیوں کے لیے درکار تھا، قریباً ناممکن تھا۔ اس زمین کے لیے جو خصوصیتیں درکار تھیں حسبِ ذیل تھیں:

۱۔ کم از کم اس کا رقبہ ۳۰۔۴۰ بیگھہ پختہ ہو اور ایسے موقعے پر ہو کہ آئندہ اضافہ کی گنجائش ہو۔

۲۔ نہایت خوش منظر اور خوش فضا ہو۔

۳۔ شہر سے نہ دور ہو نہ قریب، یعنی باہمہ اور بے ہمہ ہو۔

۴۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مفت ہاتھ آئے (یہ شرط تم سمجھ سکتے ہو کہ سب سے بڑھ کر مشکل تھی)۔

دس برس ہو چکے کہ اس قسم کی زمین کی تلاش میں ہر قسم کی کوششیں صرف ہوئیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ ہم کیمیا ڈھونڈتے تھے، جو پہلے زمانے میں تو ملتی تھی لیکن اب تو یورپ والوں نے اس کو دنیا سے گم کر دیا ہے۔

مشکل اور سخت مشکل یہ تھی کہ اس کیمیا کے بغیر کسی قسم کا کوئی کام انجام نہیں پا سکتا تھا ندوے کے قدردان اور خاص خاص احباب اپنی فیاضیوں کے امتحان دینے کے لیے مستعد تھے، لیکن ہمارے پاس ان کی زرفشانیوں کے سمیٹنے کے لیے دامن نہ تھا۔

دور دور سے طلبہ آنے کے لیے درخواست کرتے تھے، لیکن ہم ان مہمانوں کو کہاں ٹھہراتے۔ کتب خانہ روز بروز وسیع ہوتا جاتا تھا، لیکن ان علمی ممبروں کو بیٹھنے کی جگہ نہیں ملتی تھی۔

تعلیم کی متعدد ضروری شاخیں اس لیے نہیں کھولی جا سکتی تھیں کہ عمارت کا لبریز پیالہ

ایک قطرہ پڑنے سے بھی چھلک جاتا تھا۔

خدا کا شکر اور ہزار شکر ہے کہ ان تمام مشکلات کو گورنمنٹ کی ایک نظر عنایت نے دفعۃً حل کر دیا۔ گورنمنٹ نے (محض برائے نام لگان پر) ۳۲ بیگھ کا ایک وسیع قطعہ، زمین عنایت کیا، جو لکھنو میں سب سے بڑھ کر خوش منظر اور خوش فضا مقام تھا۔

سامنے دریا، چاروں طرف کھلا ہوا میدان، عقب میں کیننگ کالج کا خوشنما بورڈنگ، چاروں طرف کی زمین سے زیادہ بلند و ہموار اور سطح غرض ایک ایسا قطعہ ہے کہ اگر ہم اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کے موافق کوئی زمین تصنیف بھی کرتے تو یہی ہوتی (۵۵)۔

اسی مہینے (اگست ۱۹۰۸ء) میں مولانا نے ندوے کی مالی اعانت کے لیے خاتونان اسلام سے بڑی پر زور اپیل کی جس کا عنوان "خاتونان قوم کی عزت اور یادگار" تھا۔ اس میں لکھتے ہیں:

"مذہبی شعائر اور مذہبی اصطلاحات میں عورتوں کا خاص حصہ ہے جو مردوں کو نصیب نہیں۔ حج کا ایک بہت بڑا رکن صفا اور مروہ میں دوڑنا حضرت ہاجرہ کی تقلید ہے۔ مکہ اسلام کی جڑ ہے، اس کو خدا نے قرآن مجید میں ام القریٰ کہا ہے، اسی طرح قرآن مجید میں جو آیات محکمات ہیں ان کو خدا نے ام الکتاب فرمایا ہے۔ کعبہ کو حرم کہتے ہیں اور خواتین کا بھی یہی لقب قرار پایا ہے۔ قرآن مجید میں ایک مستقل سورۃ النساء عورتوں کے احکام میں اور ان کے نام سے اتری، مردوں کے نام پر کوئی سورت نہیں ہے۔ کیا ان امور سے صاف یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ مذہب اور شعار مذہب میں عورتوں کو ایک مخصوص اور ممتاز درجہ حاصل ہے۔ اسی کا اثر ہے کہ مذہبی احساس، مذہبی خلوص، مذہبی شیفتگی جس قدر عورتوں میں پائی جاتی ہے مردوں میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں اور یہ کہنا بالکل سچ ہے کہ گو آج ہم میں شبلی اور جنید نہیں، لیکن رابعہ اور مریم اب بھی موجود ہیں۔"

ان وجوہ کی بنا پر یہ نہایت مناسب ہے بلکہ نہایت ضروری ہے کہ آج ہندوستان میں، جہاں بہت سے بڑے بڑے قومی اور ملکی کام چھڑے ہوئے ہیں، ایک خالص مذہبی کام صرف خواتین کے ہاتھوں سے انجام پائے۔ اس کا ایک اتفاقی موقع خود بخود غیب سے پیدا ہو گیا ہے، جس میں تھوڑی سی ہی کوشش کی اور ضرورت رہ گئی ہے۔ ندوۃ العلماء کا دار العلوم جس کا مقصد قرآن مجید، حدیث اور اسلامی علوم کو زندہ رکھنا ہے، بالکل خاص مذہبی کام ہے۔ اس کے وجود اور بقا میں بڑا حصہ مستورات کا ہے۔ سب سے پہلے اس کے مصارف کے لیے جو جائدادیں وقف کی گئیں وہ معزز خاتونان قوم نے کیں، پھر حضور سرکار عالیہ ریاست بھوپال خلد اللہ تعالیٰ نے چھ سو

روپے سالانہ کی رقم مقرر فرمائی، لیکن دارالعلوم کی عمارت کا اب تک کوئی سامان نہ تھا اور موجودہ عمارت بالکل ناکافی اور ناموزوں تھی - محض تائید غیبی تھی کہ حضور ہزہائنس جناب نواب صاحب ریاست بھوپال کی جدہ، ماجدہ خلد اللہ تعالیٰ نے خاص عمارت دارالعلوم کے لیے پچاس ہزار کی رقم عنایت فرمائی -

درس گاہ کے علاوہ باقی عمارت یعنی دارالاقامہ اور کتب خانہ وغیرہ کے لیے ایک لاکھ اور درکار ہے - ہماری خواہش ہے کہ عمارت کا یہ حصہ بھی تمام تر صرف خواتین کے زر عطیہ سے انجام پائے، تاکہ تمام دنیا میں بلکہ تمام تاریخ اسلام میں یہ نئی نظیر ہو کہ ایک مذہبی کام اور مذہبی تعمیر سرتاسر صرف خواتین کی فیاضی سے انجام پائی - اگر یہ تجویز وقوع میں آئی تو خواتین کی ابدی عزت، ابدی عظمت، ابدی شہرت کی یہ وہ یادگار ہوگی جس کی نظیر سے تمام دنیا کی تاریخ خالی ہے -

"اے خاتونان اسلام! اے معزز ماؤ! اے محترم بہنو! اے عزیز لڑکیو! کیا اس خفیف رقم کے بدلے میں تم خدا کی خوشی، رسول عربی کی رضامندی، قیامت کی نجات اور قوم کی دعائیں نہیں خریدنا چاہتی ہو (حاشا تمھاری نسبت کون یہ بدگمانی کرسکتا ہے) -"

یارب ایں آرزوے من چہ خوش است   تو بدیں آرزو مرا برساں " (۵۶)

مولانا نے اسی پر بس نہیں کیا کہ نواب بھاول پور کی دادی صاحبہ کے عطیے کا ضمنی ذکر کر دیا جائے، بلکہ انھوں نے ایک الگ مضمون "زندہ زبیدہ خاتون" لکھا، جس میں لکھتے ہیں:

"جناب معلیٰ القاب رکن الدولہ نصرت جنگ حافظ الملک مخلص الدولہ ہزہائنس نواب حاجی صادق محمد خان صاحب، جانشین خامس دام اقبالہ کی جدہ، مکرمہ فلک احتجاب، عصمت مآب، خلدہا اللہ تعالیٰ نے اپنی جیب خاص سے مبلغ پچاس ہزار روپے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی عمارت کی تعمیر کے لیے عطا فرمائے -

ہندوستان میں ہر طرف اور بھی بہت سے علمی اور قومی کام ہیں، لیکن ان کے ارکان صاحب اثر، صاحب اقتدار، صاحب وجاہت ہیں اور اس وجہ سے ان کی کامیابی محل تعجب نہیں، لیکن یہ عطیہ ایک ایسا عطیہ ہے جس کے وجود میں خالص اسلامی ہمدردی، خالص فیاضی، خالص دریادلی کے سوا کوئی چیز شریک نہیں - ندوے کی جماعت گوشہ نشینوں اور پاشکستہ لوگوں کی جماعت ہے - اس کا دست طلب کسی دامن پر بے کانہ اور مدعیانہ نہیں پڑسکتا - اس حالت میں جو دریادل اس طرف متوجہ ہو محض اس کی بے لاگ فیاضی اور خدا پرستی ہے" (۵۷) -

اس زمانے میں مولانا، بیگم صاحبہ بھوپال اور نواب بھاول پور کی دادی صاحبہ اور دیگر

عورتوں کی ندوے کے لیے امداد سے بہت متاثر تھے۔ اس لیے جب بلاغات النساء پر تبصرہ کرنے بیٹھتے تو ان کا قلم مسلمان عورتوں کی تعریف و توصیف میں رواں دواں نظر آتا ہے۔ ان کا یہ مضمون الندوہ کے ستمبر کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس کو اس طرح شروع کرتے ہیں:

بلاغات النساء

تیسری صدی ہجری کی ایک تصنیف ہے، جس میں عورتوں کی تقریریں اور خطبے جمع کیے ہیں۔ قدماء کی تصنیفات کی گمشدگی کی وجہ سے اسلامی تمدن، اسلامی اخلاق، بلکہ خود شریعت اسلام کی، جو تصویر ہمارے پیش نظر ہے، اس قدر اصلیت سے دور ہے کہ صحیح خد و خال کا تصور کرنا بھی آج مشکل ہے۔ فرض کرو جو کتابیں ہمارے پیش نظر ہیں، جو روایتیں تم سنتے آئے ہو، جو حالات آنکھوں کے سامنے ہیں ان سے یہ پتا لگاؤ کہ اسلام میں جنس اناث کا کیا درجہ تھا؟ تو یہ جواب نظر آئے گا کہ ملکی معاملات میں، نظم و نسق میں، شاہی درباروں میں، مناظرہ کے معرکوں میں اس جنس لطیفہ کا گزر تک نہیں۔ اگر تم سے یہ کہا جائے کہ حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ میں جو قیامت انگیز معرکے ہوئے، ان میں خاندانی عورتیں اونٹوں پر سوار میدان جنگ میں پر جوش لیکچر دیتی تھیں اور ان کی پر اثر تقریریں دلوں میں آگ لگا دیتی تھیں، تو کس کو یقین آئے گا؟ لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس معرکے میں متعدد عورتیں تھیں جو رجز خوانوں اور مقرروں کا کام دیتی تھیں اور جن کی وجہ سے معرکہ جنگ سرد ہو ہو کر گرم ہو ہو جاتا تھا (۵۸)۔

الندوہ کے ستمبر کے شمارے میں مولانا نے فرید وجدی بک پر ایک مضمون لکھا، جس میں لکھتے ہیں:

> "ہندوستان اور مصر کے مسلمانوں کی حالت اگرچہ اکثر باتوں میں ملتی جلتی ہے، لیکن بعض حالات میں تعجب انگیز اختلاف ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہندوستان میں اب تک ہر قسم کے علمی، سیاسی اور تمدنی کام جو انجام پائے ہیں وہ قدیم تعلیم یافتہ بزرگوں کے ہاتھ سے انجام پائے ہیں۔ سرسید، نواب محسن الملک، نواب انتصار جنگ، آزاد، نذیر احمد، حالی، قدیم طریقے کے تعلیم یافتہ ہیں۔ بخلاف اس کے مصر میں جو کچھ ہوا ہے یا ہو رہا ہے، سب جدید تعلیم یافتہ لوگوں کا زور دست و بازو ہے۔ مصطفےٰ کامل پاشا جو سیاست مصر کا علم بردار ہے، قاسم بک امین جس نے سب سے پہلے جنس لطیف کی آزادانہ حمایت کی، فرید وجدی بک جس نے فلسفہ، حال

اور اسلام کی تطبیق پر ایک وسیع لٹریچر پیدا کر دیا، سب کے سب جدید تعلیم کی پیداوار ہیں۔

فرید وجدی بک کی تصنیفات کا چوں کہ ہم نے بھی اپنی تصنیفات میں جا بجا ذکر کیا ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس کے مختصر حالات ناظرین کو پیشکش کریں (۵۹)۔"

اکتوبر کے الندوہ میں مولانا نے سنگ بنیاد کے اور جلسہ سالانہ ندوۃ العلماء میں لوگوں کی شرکت کے لیے ایک اپیل شائع کی، جس کا عنوان ایک مذہبی یونیورسٹی یعنی دار العلوم ندوۃ العلماء کے سنگ بنیاد کا جلسہ اور جلسہ سالانہ ندوۃ العلماء تھا۔ اس میں لکھتے ہیں:

"ندوۃ العلماء کے ہوا خواہ خصوصاً اور بہی خواہان اسلام عموماً ایک مدت سے جس چیز کا انتظار کر رہے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب اس کے سامان مہیا ہونے کے دن آئے۔ ندوۃ العلماء کے مقاصد اور اغراض کے انجام دینے کے لیے ان علما کی ضرورت ہے جو موجودہ زمانے کی ضرورتوں اور خیالات سے واقف ہوں، جو یورپ کی کسی زبان سے آشنا ہوں، جو غنی النفس ہوں، جن میں ایثار نفس کا مادہ ہو۔ یہ اوصاف اس وقت پیدا ہو سکتے ہیں جب طلبہ کو ایک خاص طریقے پر تعلیم اور تعلم کے ساتھ خاص طرح کی تربیت دی جائے۔ ندوے کے دار العلوم نے اس کام کو شروع کیا، لیکن عمارت کے ناکافی اور ناموزوں ہونے سے نہ طلبہ کے قیام کا انتظام ہو سکتا تھا، نہ تعلیم و تربیت کی دقتیں حل ہوتی تھیں۔

اس بنا پر اس سال ایک نہایت خوش منظر قطعہ زمین انتخاب کیا گیا جس کو گورنمنٹ نے نہایت فیاضی سے (برائے نام لگان پر) اس غرض کے لیے عنایت کیا۔ ۲۸۔ نومبر ۱۹۰۸ء کو سنگ بنیاد رکھے جانے کی رسم قرار پائی اور نہایت خوشی اور مسرت کا مقام ہے کہ جناب لفٹنٹ گورنر بہادر ممالک متحدہ نے اپنے ہاتھ سے سنگ بنیاد کا رکھنا منظور کیا۔ یہ بھی قرار پایا کہ ان ہی تاریخوں میں یعنی (۲۹-۳۰ نومبر ۱۹۰۸ء) ندوے کا سالانہ جلسہ بھی کیا جائے ---------- اس بنا پر آپ ضرور تکلیف فرمائیں اور غور کریں کہ ہم کو مذہب اسلام اور علوم اسلام کی بقا اور حفاظت اور اشاعت کے لیے کیا کیا تدبیریں کرنی چاہییں۔ وقف اولاد کا مسئلہ جو چھوکر چند روز کے لیے ملتوی ہو گیا تھا، اس کی کارروائی کے مستحکم طریقے سے جاری کرنے کا اس سے عمدہ موقع نہیں مل سکتا (۶۰)۔"

۲۸۔ نومبر ۱۹۰۸ء کو سنگ بنیاد کا جلسہ ہوا تو اس جلسے کی روئداد مولانا نے دسمبر کے

الندوہ کے شمارے میں شائع کی۔ مولانا لکھتے ہیں:

بگذر زیر ف ، مرر مپرس — خواب خوشی دیدم و دیگر مپرس
تندے بو، خرابم ہنوز — دیدہ، من باز و بخوابم ہنوز

ہماری آنکھوں نے حیرت فزا تماشا گاہوں کی دلفریبیاں بارہا دیکھی ہیں، جاہ و جلال کا منظر بھی اکثر نظر سے گزرا ہے، کانفرنسوں اور انجمنوں کا جوش و خروش بھی ہم دیکھ چکے ہیں، وعظ و پند کے پر اثر جلسے بھی ہم کو متاثر کر چکے ہیں، لیکن اس موقع پر جو کچھ آنکھوں نے دیکھا وہ ان سب سے بالا تر، ان سب سے عجیب تر، ان سے سب حیرت انگیز تھا۔

یہ پہلا ہی موقع تھا کہ ترکی ٹوپیاں اور عمامے دوش بدوش نظر آتے تھے، یہ پہلا ہی موقع تھا کہ مقدس علما عیسائی فرمانروا کے سامنے دلی شکر گذاری کے ساتھ ادب سے خم تھے، یہ پہلا ہی موقع تھا کہ شیعہ و سنی ایک مذہبی تعلیم گاہ کی رسم ادا کرنے میں برابر کے شریک تھے، یہ پہلا ہی موقع تھا کہ ایک مذہبی درس گاہ کا سنگِ بنیاد ایک غیر مذہب کے ہاتھ سے رکھا جارہا تھا (مسجد نبوی کا منبر بھی ایک نصرانی نے بنایا تھا)۔ غرض یہ پہلا ہی موقع تھا کہ ایک مذہبی سقف کے نیچے نصرانی، مسلمان، شیعہ، سنی، حنفی، وہابی، رند، زاہد، صوفی، واعظ، خرقہ پوش اور کجکلاہ سب جمع تھے۔

مصرع — آباد ایک گھر ہے جہان خراب میں

ہز آنر لفٹنٹ گورنر بہادر ممالک متحدہ نے منظور فرمایا تھا کہ وہ دار العلوم ندوۃ العلما۔ کا سنگِ بنیاد اپنے ہاتھ سے رکھیں گے۔ یہ تقریب ۲۸-نومبر ۱۹۰۸ء کو عمل میں آئی۔ چوں کہ ندوے کا سالانہ جلسہ بھی ان ہی تاریخوں میں ہونے والا تھا۔ اس لیے دو طرفہ کشش کی وجہ سے گویا تمام ہندوستان امنڈ آیا(۶۱)

۲۴۔ دسمبر ۱۹۰۸ء کو مولانا نے ایک مضمون "وقف اولاد کے مسئلے کے متعلق ایک نہایت ضروری تحریک" لکھا۔ مگر یہ مضمون الندوہ کے جنوری ۱۹۰۹ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ مولانا اس مضمون میں پریوی کونسل کے فیصلے یعنی وقف اولاد کو ناجائز قرار دینے کے متعلق بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "لیکن چوں کہ یہ مسئلہ فقہ اسلامی کا ایک مسلّم مسئلہ ہے اور پوری کونسل نے جو فیصلہ کیا ہے وہ صرف غلط فہمی کی بنا پر ہے اسی لیے یہ یقین ہے کہ اگر گورنمنٹ اور پریوی کونسل کو یقین دلایا جائے کہ یہ ایک مذہبی مسئلہ ہے اور اس میں مداخلت کرنا مذہبی احکام میں مداخلت کرنا ہے تو یہ قطعی ہے کہ پریوی کونسل اپنے فیصلے کو مسترد کرے گی۔ اس بنا پر تمام مسلمانوں کو اس امر کے متعلق ایک متفقہ کوشش کرنی چاہیے، جس کا طریقہ حسب ذیل ہے؛

۱- ایک رسالہ اردو زبان میں نہایت تفصیل اور تحقیق کے ساتھ فقہ کی مستند کتابوں سے تیار کیا جائے، جس میں ثابت کیا جائے کہ وقف اولاد فقہ اسلامی کا ایک مسلّم اور قطعی مسئلہ ہے۔

۲- اس رسالے پر تمام علمائے ہندوستان سے دستخط کرائے جائیں۔

۳- اس رسالے کا انگریزی زبان میں ترجمہ کرایا جائے۔

۴- ہندوستان کے ہائیکورٹوں اور پریوی کونسل نے جس بنا پر وقفِ اولاد کو ناجائز قرار دیا ہے، ان دلائل سے تعرض کیا جائے اور ان کی غلطی دکھائی جائے۔

۵- ایک محضر اس مضمون کا تیار کیا جائے کہ چوں کہ وقف اولاد کا مسئلہ مسلمانوں کا ایک مذہبی مسئلہ ہے، اس لیے پریوی کونسل نے اس کے متعلق جو غلط فہمی پیدا کی ہے اس کی اصلاح قانون کے ذریعے سے کر دی جائے۔

۶- اس محضر پر تمام اسلامی انجمنوں اور عام مسلمانوں کے دستخط کرا کے گورنمنٹ کے پاس بھیجا جائے۔

ان تمام امور کے انجام دینے کے لیے ایک رقم کی ضرورت ہے جس کی تعداد تخمیناً دو تین ہزار ہو گی، جس سے رسالے کی تیاری، انگریزی ترجمہ اور خط و کتابت کے مصارف ادا ہو سکیں۔ اس بنا پر ہم تمام مسلمانان ہندوستان سے التجا کرتے ہیں کہ اگر وہ اس تدبیر کو ضروری سمجھتے ہیں تو خاکسار کو مطلع فرمائیں اور یہ بھی ظاہر کریں کہ وہ وجوہ مفصلہ ذیل میں سے کس قسم کی شرکت کر سکتے ہیں: ۱- مشورہ اور رائے میں شرکت ۲- چندے میں شرکت ۳- رسالے کی ترتیب اور تیاری اور قانونی مشورے اور انگریزی ترجمہ کرنے میں شرکت" (۹۲)۔

مولانا نے ۲۷- مارچ ۱۹۰۸ء کو ایک غزل لکھی، جس کا مطلع یہ ہے:

عمری ست عشق ورزم و کارم تمام نیست این بادہ پختہ نیز نشہ گرچہ خام نیست

اور مقطع یہ ہے:

در بزم گاہ ناز تو شبلی ہنوز ہم جاداشتہ ست لیک بہ آں احترام نیست (۹۳)

اور ۱۹- اپریل ۱۹۰۸ء کو ایک غزل لکھی، جس کا مطلع یہ ہے:

برقِ عشقی کہ مرا، بر دل و بر تن زدہ بود این ہمان است کہ بر وادی ایمن زدہ بود

اور مقطع یہ ہے:

شبلی امروز بہ سجادہ، تقویٰ بنشست آں کہ صد سال رہ شیخ و برہمن زدہ بود (۹۳)

۱۸- دسمبر ۱۹۰۷ء کو مولانا نے ایک فارسی غزل لکھی تھی، مگر ۱۹۰۸ء کے خطوط میں

لوگوں کو اطلاع دی، اس وجہ سے وہ ۱۹۰۸ء کے ضمن میں اوپر لکھی گئی ہے۔ اس کا مطلع یہ ہے:

ساقی مست چو سوی من مدہوش آید — ساغر از کف بنہد میکدہ بردوش آید (۶۵)

اکتوبر ۱۹۰۸ء میں مولانا نے کئی فارسی غزلیں لکھیں۔ ایک غزل کا مطلع یہ ہے:

بہ یاراں آشکارا گفتہ ام ایں حرف و پنہاں ہم — کہ شوخے نکتہ دانی برد از من عقل و ایماں ہم

مقطع:

مدہ از دست خود رنگیں نوای ہچو شبلی را — تو شاہ حسنی و در کار داری یک غزلخواں ہم (۶۶)

۱۴۔ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو ایک اور غزل لکھی، اس کا مطلع یہ ہے:

پیک فرخندہ قدم مژدہ سرا می آید — کز سفر یار سفر کردہ ما می آید

مقطع:

شبلی غمزدہ آورد دل و دیں بہ نثار — غیر ازیں چیست کہ از دست گدا می آید (۶۷)

اور ۱۵۔ اکتوبر کی غزل کا مطلع یہ ہے:

ہرچہ ہست از لب گلفام خوش است — نہ ہمیں بوسہ کہ دشنام خوش است

مقطع:

بگذر از بادہ بہ پیری شبلی — زانکہ ہر کار بہ ہنگام خوش است (۶۸)

۱۶۔ اکتوبر کو جو غزل لکھی اس کا مطلع یہ ہے:

اک شوخ بس کہ پایہ حسنش بلند بود — ہر شیوہ اش بلای دل درد مند بود

مقطع:

شبلی زہجر اوست کہ ذوق سخن نماند — شکر فشانیم ہمہ زاں نوشخند بود (۶۹)

۱۷۔ اکتوبر کی غزل کا مطلع یہ ہے:

نسیم صبح بیا رلحتے بہ جاں برساں — پیام بندہ بہ آں خاک آستاں برساں

مقطع:

سلام شوق و تمنا زبندہ نعمانی — بہ ساکنان در او یگان یگاں برساں (۷۰)

۱۷۔ اکتوبر کو ایک غزل اور لکھی جس کا مطلع یہ ہے:

دل و دیں باختم زیں پیش و اکنوں جاں فدا کردم — محبت راہمیں یک وہم بر من بود وا کردم

مقطع:

دل افسردہ را آئین عشق آمو ختم شبلی　　　مے میداشتم باخویش رفتم کیمیاگردم (۷۱)

۱۸۔اکتوبر کو یہ غزل لکھی۔ مطلع یہ ہے:

زجاں گذشتم و بازم بہ بر نمی آید　　　کہ نیست زورم وآں بت بہ زر نمی آید (*)

مقطع:

بہ خوارے کہ زکوی تو رفت نعمانی　　　گماں برم کہ ازیں پس دگر نمی آید (۷۲)

۲۰۔اکتوبر کو ایک غزل لکھی، جس کا مطلع یہ ہے:

بہ حال خستہ اش رحمی تواں کرد　　　کہ مرگم عشق را بے خان ومان کرد

مقطع:

بہاں کرد از سخن درہند شبلی　　　کہ صائب درسواد اصفہان کرد (۷۳)

اور ۲۱۔اکتوبر کی غزل کا مطلع یہ ہے:

من اگر پیروی شیوہ مستاں کردم　　　کسبِ ایں فن ہمہ زاں نرگس فتاں کردم

مقطع:

شبلی ایں فن نہ بہ ایں شیوہ وآئین بودست　　　پیش ازیں کالبدے بود کہ من جاں کردم (۷۴)

۲۲۔اکتوبر ۱۹۰۹ء کی غزل کا پہلا شعر یہ ہے:

حکایت من و او گرچہ راز پنہاں بود　　　بے نماند کہ ایں حرف داستاں گردد

مقطع:

بھبنیۂ گوہر فطرت کہ نام او شبلی است　　　چناں مکن کہ زدست تو رایگاں گردد (۷۵)

۲۲۔اکتوبر کی ایک اور غزل کا پہلا شعر یہ ہے:

چشمش بہ سوے ما نگہ ناتمام کرد　　　ساقی بہ جام ریخت مے نارسیدہ را

مقطع:

شبلی اگر حریف و نظر باز بودہ است　　　عیبش مکن کہ درنتواں بست دیدہ را

۲۲۔اکتوبر کو ایک غزل لکھی، جس کا پہلا شعر یہ ہے:

روزگاری ست کہ فرزانہ ودانا بودم　　　حالیا مصلحت آں است کہ ناداں باشم

آخری شعر:

ہندوی زلف توچوں کفر فروشی بکند　　ننگ من باشد اگر زاں کہ مسلماں باشم

۲۳۔اکتوبر کی غزل کا مطلع یہ ہے:

من نہ از اربابِ تقویٰ بودہ ام　　بامی و نے بودہ ام تا بودہ ام

مقطع:

ہم زفیض شبلی نعمانی است　　ایں کہ در ہر شیوہ یکتا بودہ ام (۷۶)

۲۴۔اکتوبر کی غزل کا مطلع یہ ہے:

ایں چنیں گردن دعویٰ نہ فراز دچکند　　ہمئی گرہمہ برخویش ننازد چکند

مقطع:

شبلی دل زدہ ، دروادی غم دیر رسید　　گرم اگر دررہ عشق تو نہ تازد چکند (۷۷)

۲۴۔اکتوبر کو ایک اور غزل کہی، جس کا مطلع یہ ہے:

آں شوخ را بہ من سرآں پرس وجو نماند　　یعنی گل مراد مرا رنگ وبو نماند

مقطع:

شبلی ہر آنچہ داشت بہ دل برزباں فگند　　گویا کہ کار باصنم تند خو نماند (۷۸)

۲۵۔اکتوبر کو ایک غزل کہی، جس کا مطلع یہ ہے:

دل نثار غمزہ، غماز می بائسیت کرد　　آنچہ آخر کردم از آغاز می بائسیت کرد

مقطع:

مابہ ایں قدر ، از توراضی نیستم اندر سخن　　شبلیا سحر است ایں اعجاز می بائسیت کرد (۷۹)

۲۵۔اکتوبر کی ایک اور غزل اسی زمین میں ہے، جس کا پہلا شعر یہ ہے:

شاہدان باغ درہجر تو زار افتادہ اند　　ایں قیاس از نرگس بیمار می بائسیت کرد

مقطع:

گرچہ شبلی درجہاں جز عاشقی کارے نکرد　　من برانم کیں چنیں ، صد کاری بائسیت کرد (۸۰)

۲۵۔اکتوبر ہی کو تین شعر اور کہے، ان کا پہلا شعر یہ ہے:

ہر ذرہ زمشت غبارم ، ہماں بجاست　　گویا نسیم دوست بہ خاکم گذر نکرد

مقطع:

دشمن بہ حال شبلی دل خستہ خوں گریست — واں دوست بیں کہ خود مژہ، نیز تر نکرد (۸۱)

۲۷۔ اکتوبر کو ایک غزل کا کہی، جس کا مطلع یہ ہے:

بارہا گفتہ ام و حاجت تکرار نماند — کہ مرا جز بہ می و بادہ سروکار نماند

مقطع:

گرچہ شبلی بہ من آں لطف عیانش برخاست — التفاتے کہ نہاں بود زاغیار نماند (۸۲)

۲۷۔ اکتوبر کو ایک اور غزل کہی، مطلع یہ ہے:

بسکہ رنجوری ایں خستہ زتیمار گذشت — عیسیٰ آخر زعلاج دل بیمار گذشت

مقطع:

بسکہ سود از دہ، رندی روز افزونم — شبلیا مستی امسال من از پار گذشت (۸۳)

۲۸۔ اکتوبر کا ایک شعر یہ ہے:

مرا کہ در رہ عشق تو اولیں گام است — امید بوسہ، اگر ہست، نہم بہ پیغام است (۸۴)

اور ۲۸۔ اکتوبر کی غزل یہ ہے:

مطلع:

شیخم شریک بادہ، وساغر نہ گشتہ است — یعنی کہ از طریق ریا بر نگشتہ است

مقطع:

شبلی طمع مدار کہ از عشق وا شوم — زیں راہ ہر کہ رفت دگر بر نگشتہ است (۸۵)

۲۹۔ اکتوبر کو ایک غزل کہی، جس کا مطلع یہ ہے:

باما بہ ہر معاملہ، بدگماں نبود — خوش بود آنکہ راز محبت عیاں نبود

مقطع:

در حیرتم کہ پاکی گفتارش از کجاست — شبلی مگر زمردم ہندوستاں نبود (۸۶)

۲۹۔ اکتوبر کی ایک اور غزل ہے، جس کا مطلع ہے:

گرچہ از دل طمعم بود کہ شیدا نہ شود — لیک چوں شد، نتواں گفت کہ رسوا نشود

مقطع:

شبلیا مصلحت آں است کہ سازی باہجر — گرچہ ایں زہر بہ کام تو گوارا نشود (۸۷)

۳۰۔ اکتوبر کی غزل کا مطلع یہ ہے:

در کودکی نہ چہرہ من می شناختند | سوز عیاں نگشتہ وعشق نبودہ را
مقطع:

شبلی زجہل بود کہ در شیوہ ہائے عشق | ما آزمودہ ایم دل آزمودہ را (۸۸)

۳۱۔ اکتوبر ۱۹۰۸ء کی غزل کا مطلع یہ ہے:

یک سروصد گونہ سودائے بہانے داشتم | یاد آں روزے کہ من باخود جہانے داشتم
مقطع:

شبلیا آں جلوہ، نیر نگ ہائے بمبئی | بود تا وقتے کہ من خواب گرانے داشتم (۸۹)

مخزن لاہور اکتوبر ۱۹۰۸ء میں "تازہ غزلیں" کے ضمن میں ایک غزل شائع ہوئی تھی۔ چوں کہ یہ کلیاتِ شبلی فارسی میں موجود نہیں ہے اس لیے پوری غزل پیش کی جاتی ہے۔

اے آنکہ پیچ روئے دریا ہم نمیکنی | در حیر تم کہ کار بجاہم نمیکنی
عمر عزیز بود و بے حاصلی گذشت | واں را بہ جام و بادہ قضاہم نمیکنی
دل را بہ ارمغاں نہ بری پیش دلبرے | در کس نخواہد از تو بہا ہم نمیکنی
دستت اگر بہ بند قبائے نمی رسد | بازی چرا بہ زلف رساہم نمیکنی
نتواں نخست بوسہ بہ لعل بتاں زدن | آغاز کار از کف پا ہم نمیکنی
باشوخ چشمے کہ بہ طبع لطیف تست | گستاخی بہ بند قبا ہم نمیکنی
مستانہ جوشی تو بہ او خود صواب نیست | بے حاصلی نگر کہ خطا ہم نمیکنی

شبلی بہ دام زلف، رسایت، فتادہ است
باخود نمی بری ورہا ہم نمیکنی (۹۰)

یکم نومبر ۱۹۰۸ء کو دو غزلیں لکھیں۔ ایک غزل کا مطلع یہ ہے:

نہ ہمیں عاشق از جہاں برخاست | کہ ہم از نام وہم نشاں برخاست
مقطع:

شبلی خستہ دل مگر جان داد | شورے از کوچہ، نالاں برخاست (۹۱)

دوسری غزل کا مطلع یہ ہے:

دوسری غزل کا مطلع یہ ہے:

از بسکہ طفل بودہ وکار آشنانہ بود
جورے کہ کردہ است بہ طور جفانہ بود

مقطع:

داغم کہ شبلی ازے دنے بی نصیب ماند
باآں کہ ایں عزیز زاصل ریا نبود (۹۲)

۳۔نومبر کو بھی دو غزلیں لکھیں۔ایک غزل کا مطلع یہ ہے:

آنچہ خوشتر زانگبیں باشد
بوسہ لعل شکّریں باشد

مقطع:

زاہد و رند ہر دو درکار اند
شبلی آں بودہ است وایں باشد (۹۳)

دوسری غزل کا مطلع یہ ہے:

تجش زحال خستہ دلاں تاخبر گرفت
بارِ سرے کہ برتن ما بود، برگرفت

مقطع:

شبلی فسانہ، غم الفت تمام گفت
مجنوں تمام کردہ، او راز سرگرفت (۹۴)

۴۔نومبر کو غزل لکھی، جس کا مطلع ہے:

ایمن زبازی فلک کج نہاد نیست
در وصل نیز عاشق غم دیدہ شاد نیست

مقطع:

شبلی اگر زاہل صفانیست گو مباش
ایں بسکہ آشنائے نفاق و عناد نیست (۹۵)

۵۔نومبر کو ایک غزل لکھی، جس کا مطلع یہ ہے:

دلبراں جوربور زند و جفا نیز کنند
ویں جز افسانہ نباشد کہ وفا نیز کنند

اور مقطع یہ ہے:

شبلیا نابلد کوچۂ عشقیم ولے
دوستاں تہمت ایں شیوہ بما نیز کنند (۹۶)

دسمبر ۱۹۰۸ء میں مولانا نے دو فارسی غزلیں لکھیں۔ایک غزل کا مطلع یہ ہے:

وقت سحر کہ عارض او بے نقاب بود
در بزمش اول آں کہ رسید آفتاب بود

مقطع:

شبلی خراب کردہ، چشم خراب اوست
تو درگماں کہ مستی او از شراب بود (۹۷)

دوسری غزل کا مطلع یہ ہے

مطلع

رفتیم بہر سود و زیاں کردہ ایم ما در کعبہ نیز یاد بتاں کردہ ایم ما

مقطع

شبلی اگرچہ زراہ فسانہ بود تحقے زراہ نیز بیاں کردہ ایم ما (۹۸)

حواشی

۱.... مکاتیب اول، صفحہ ۲۱۳ تا ۲۱۴، ۷- جنوری ۱۹۰۸۔

۲.... مکاتیب اول، صفحہ ۱۶۵ تا ۱۶۶، ۹- جنوری ۱۹۰۸۔

۳.... مکاتیب اول، صفحہ ۱۶۶- ۲۱، جنوری ۱۹۰۸۔

۴.... بٹلر لکھنو کے مسلمانوں میں بہت مقبول تھے چناں چہ تعلقہ داران اودھ نے ان کے نام سے لکھنو میں ایک پارک بٹلر پارک کے نام سے منسوب کیا۔ جس کے وسط میں بٹلر کا گھوڑے پر سوار مجسمہ نصب کیا گیا۔ چڑیا تحصیل لکھنو کے پل سے کلانڈ روڈ کے بائیں طرف بندھ کو جانے والی کئی میل لمبی سڑک بھی ان کے نام سے منسوب ہے۔ جس کا نام بٹلر روڈ ہے۔ لیکن یہ ٹبلر گورنر نہیں بلکہ ڈپٹی کمشنر تھے۔

۵.... مکاتیب اول، صفحہ ۲۱۱ تا ۲۱۲، ۲۹- جنوری ۱۹۰۸۔

۶.... مکاتیب اول، صفحہ ۱۶۷، ۳۰- جنوری ۱۹۰۸۔

۷.... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۸، ۳- فروری ۱۹۰۸۔

۸.... مکاتیب دوم، صفحہ ۶۸ تا ۶۹، ۳- فروری ۱۹۰۸۔

۹.... مکاتیب اول، صفحہ ۱۶۷، ۳- فروری ۱۹۰۸۔

۱۰.... مکاتیب اول، صفحہ ۱۶۸، ۳- فروری ۱۹۰۸۔

۱۱.... مکاتیب اول، صفحہ ۱۶۸ تا ۱۶۹، ۶- فروری ۱۹۰۸۔

۱۲.... عطیہ بیگم فیضی اور زہرہ بیگم فیضی کی بڑی ہمشیر نازلی بیگم نواب جنجیرہ سے منسوب تھیں (نواب صاحب مولانا کی علمی شہرت سے متاثر تھے۔ انھوں نے مولانا کے ذریعے ہی ندوہ کی مالی اعانت کی تھی)

۱۳.... شاہنامہ کے طرز پر رستم کے لڑکے کی منظوم داستان فرامرز نامہ کے نام سے تھی۔

۱۴.... مکاتیب اول، صفحہ ۲۱۴ تا ۲۱۵، ۱۰- فروری ۱۹۰۸۔

۱۵.... مکاتیب اول، صفحہ ۱۷۰، ۱۸- فروری ۱۹۰۸۔

۱۶.... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۷ تا ۲۸، ۲۳- فروری ۱۹۰۸۔

۱۷.... مکاتیب اول، صفحہ ۱۷۰، ۲۶- فروری ۱۹۰۸۔

۱۸..... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۹، ۲۶-فروری ۱۹۰۸ء۔

۱۹..... لیکن اس کا جواب سننے کو مولانا زندہ نہ رہے اور ۱۹۱۴ء میں انتقال ہوگیا۔

۲۰..... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۱۵، ۲-مارچ ۱۹۰۸ء۔

۲۱..... افسوس مولانا محمد علی اپنی سیاسی زندگی کی وجہ سے کوئی علمی کام نہ کرسکے۔ چناں چہ یہ ترجمہ بھی مکمل نہ کرسکے۔ اگر یہ ترجمہ ہوجاتا تو مولانا کی ایک علمی یادگار ہوتا۔

۲۲..... انھیں عورتوں میں عطیہ بیگم فیضی اور زہرہ بیگم فیضی بھی تھیں اور ان لوگوں سے مولانا کی ابتدائی ملاقاتیں تھیں۔ ان لوگوں کے ذریعے ندوے کا عورتوں میں خاصا پروپیگنڈہ ہونے کی امید تھی۔ اس لیے مولانا نے ان لوگوں سے خاصا ربط، ضبط بڑھایا لیکن بہرحال اتنی آزادی وہ دل سے ناپسند کرتے تھے جس کا اظہار بھی متن میں کیا ہے۔

۲۳..... مکاتیب اول، صفحہ ۱۷۱ تا ۱۷۲، ۵-مارچ ۱۹۰۸ء۔

۲۴..... مکاتیب اول، صفحہ ۱۷۲، ۵-مارچ ۱۹۰۸ء۔

۲۵..... مکاتیب دوم، صفحہ ۷۰، ۹-مارچ ۱۹۰۸ء۔

۲۶..... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۱۵، ۱۰-مارچ ۱۹۰۸ء۔

۲۷..... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۸۷ تا ۱۸۸، ۱۱-مارچ ۱۹۰۸ء۔

۲۸..... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۸، ۱۲-مارچ ۱۹۰۸ء۔

۲۹..... مکاتیب اول، صفحہ ۱۷۲ تا ۱۷۳، ۲۵-مارچ ۱۹۰۸ء۔

۳۰..... مکاتیب دوم، صفحہ ۷۰ تا ۷۱، ۳۱-مارچ ۱۹۰۸ء۔

۳۱..... مکاتیب اول، صفحہ ۲۱۵ تا ۲۱۶، ۳-اپریل ۱۹۰۸ء۔

۳۲..... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۸۸، ۱۲-اپریل ۱۹۰۸ء۔

۳۳..... مکاتیب اول، صفحہ ۲۱۶ تا ۲۱۷، ۵-مئی ۱۹۰۸ء۔

۳۴..... مکاتیب اول، صفحہ ۲۱۷، ۱۹-مئی ۱۹۰۸ء۔

۳۵..... مکاتیب اول، صفحہ ۲۳۴، یکم جون ۱۹۰۸ء۔

۳۶..... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۱۵ تا ۲۱۶، ۳-جولائی ۱۹۰۸ء۔

۳۷..... مکاتیب دوم، صفحہ ۷۱، ۶-جولائی ۱۹۰۸ء۔

۳۸..... ۱۹۱۷ء میں جب حیدرآباد میں عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہوئی تو قاضی تلمذ حسین کا انتخاب عمل میں آیا۔

۳۹..... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۱۶ تا ۲۱۷، ۹-اگست ۱۹۰۸ء۔

۴۰..... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۸ تا ۲۹، ۲۷-اگست ۱۹۰۸ء۔

۴۱..... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۱۷ تا ۲۱۸، ۲۸-اگست ۱۹۰۸ء۔

۴۲..... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۹، یکم ستمبر ۱۹۰۸ء۔

۴۳.... مکاتیب دوم، صفحہ ۷۱ تا ۷۲، ۲۶- ستمبر ۱۹۰۸ء۔

۴۴.... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۱۸ تا ۲۱۹، ۱۱- اکتوبر ۱۹۰۸ء۔

۴۵.... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۱۹، ۱۱- اکتوبر ۱۹۰۸ء۔

۴۶.... کلیاتِ شبلی، صفحہ ۱۰۰ پر یہ مصرع اس طرح ہے: خواہید اگر کہ عیش و نشاط فزوں کنید

۴۷.... مکاتیب دوم، صفحہ ۳۰، ۱۳- نومبر ۱۹۰۸ء۔

۴۸.... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۱۹ تا ۲۲۰، ۲۳- نومبر ۱۹۰۸ء۔

۴۹.... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۲۰ تا ۲۲۱، ۱۲- دسمبر ۱۹۰۸ء۔

۵۰.... عربی شاعری سے مراد اسلام کے ماقبل کی شاعری ہے یا زیادہ سے زیادہ بنو امیہ کے عہد تک۔ اس کے بعد کی شاعری عربی نہیں بلکہ عجمی ہے، صرف زبان کا فرق ہے۔

۵۱.... مقالاتِ شبلی جلد دوم، طبع دوم، ۱۹۵۰ء، صفحہ ۴۹ تا ۵۰

۵۲.... مقالاتِ شبلی، جلد چہارم، صفحہ ۵۵ تا ۵۶ (طبع سوم ۱۹۵۶ء)

۵۳.... مقالاتِ شبلی جلد چہارم، صفحہ ۴۳

۵۴.... مقالاتِ شبلی جلد ہشتم، صفحہ ۳-۴

۵۵.... مقالاتِ شبلی جلد ہشتم، صفحہ ۷۷ تا ۷۹

۵۶.... مقالاتِ شبلی جلد ہشتم، صفحہ ۸۰ تا ۸۲

۵۷.... مقالاتِ شبلی جلد ہشتم، صفحہ ۸۳-۸۴

۵۸.... مقالاتِ شبلی جلد چہارم، صفحہ ۱۳

۵۹.... مقالاتِ شبلی جلد پنجم، صفحہ ۱۲۹

۶۰.... مقالاتِ شبلی جلد ہشتم، صفحہ ۸۶-۸۷

۶۱.... مقالاتِ شبلی جلد ہشتم، صفحہ ۸۸-۸۹

۶۲.... مقالاتِ شبلی جلد ہشتم، صفحہ ۲۸-۲۸

۶۳.... کلیاتِ شبلی فارسی، صفحہ ۷۵

۶۴.... کلیاتِ شبلی فارسی، صفحہ ۷۶

۶۵.... کلیاتِ شبلی فارسی، صفحہ ۷۷

۶۶.... کلیاتِ شبلی فارسی، صفحہ ۸۷-۸۸

۶۷.... کلیاتِ شبلی فارسی، صفحہ ۸۸-۸۹

۶۸.... کلیاتِ شبلی فارسی، صفحہ ۸۹

۶۹.... کلیاتِ شبلی فارسی، صفحہ ۸۹-۹۰

۷۰.... کلیاتِ شبلی فارسی، صفحہ ۹۰

۷۱.... کلیاتِ شبلی فارسی، صفحہ ۹۰-۹۱

*.... فارسی کا ایک مشہور شعر ہے جو زیب النسا سے منسوب کیا جاتا ہے:

سرخ پوشے بہ لب بام نظر می آید   نہ بہ زور و نہ بہ زاری نہ بہ زری آید

محققین کا خیال ہے کہ یہ زیب النسا کا شعر نہیں ہے۔

۷۲.... کلیاتِ شبلی فارسی، صفحہ ۹۱

۷۳.... کلیاتِ شبلی فارسی، صفحہ ۹۱-۹۲

۷۴.... کلیاتِ شبلی فارسی، صفحہ ۹۲-۹۳

۷۵.... کلیاتِ شبلی فارسی، صفحہ ۹۳ تا ۹۵

۷۶.... کلیاتِ شبلی فارسی، صفحہ ۹۵

۷۷.... کلیاتِ شبلی فارسی، صفحہ ۹۵ تا ۹۶

۷۸.... کلیاتِ شبلی فارسی، صفحہ ۹۶ تا ۹۷

۷۹.... کلیاتِ شبلی فارسی، صفحہ ۹۷

۸۰.... کلیاتِ شبلی فارسی، صفحہ ۹۷ تا ۹۸

۸۱.... کلیاتِ شبلی فارسی، صفحہ ۹۸

۸۲ .... کلیاتِ شبلی فارسی، صفحہ ۹۹

۸۳ .... کلیاتِ شبلی فارسی، صفحہ ۹۹

۸۴ .... کلیاتِ شبلی فارسی، صفحہ ۹۹

۸۵ .... کلیاتِ شبلی فارسی، صفحہ ۹۹ تا ۱۰۰

۸۶ .... کلیاتِ شبلی فارسی، صفحہ ۱۰۱

۸۷ .... کلیاتِ شبلی فارسی، صفحہ ۱۰۲

۸۸ .... کلیاتِ شبلی فارسی، صفحہ ۱۰۲

۸۹ .... مخزن - اکتوبر ۱۹۰۸ء، صفحہ ۶۸ تا ۶۹

۹۰ .... کلیاتِ شبلی فارسی، صفحہ ۱۰۳

۹۱ .... کلیاتِ شبلی فارسی، صفحہ ۱۰۳

۹۲ .... کلیاتِ شبلی فارسی، صفحہ ۱۰۳ تا ۱۰۴

۹۳ .... کلیاتِ شبلی فارسی، صفحہ ۱۰۴ تا ۱۰۵

۹۴ .... کلیاتِ شبلی فارسی، صفحہ ۱۰۵ تا ۱۰۶

۹۵ .... کلیاتِ شبلی فارسی، صفحہ ۱۰۶

۹۶ .... کلیاتِ شبلی فارسی، صفحہ ۸۷ تا ۹۷

۹۷ .... کلیاتِ شبلی فارسی، صفحہ ۹۷

مولانا نے ۱۹۰۸ء میں متعدد غزلیں لکھیں لیکن صرف ان غزلوں کو پیش کیا گیا ہے جن کی تاریخ کا تعین کیا جاسکا - جن غزلوں کا تعین نہیں کیا جاسکا، ان کو چھوڑ دیا گیا ہے، اس لیے کہ وہ کلیات میں موجود ہیں اور یہاں مقصد کو پورا نہیں کرتیں -

۱۹۰۹ء

مولانا ۱۲۔ جنوری ۱۹۰۹ء کو بمبئی میں تھے۔ ویسے ان کی منزل مقصود تو حیدر آباد (دکن) تھی، مگر چلتے وقت شعرالعجم کے اجزا ساتھ لیتے گئے تاکہ بمبئی کے پر سکون ماحول میں قیام کر کے دوسرا حصہ مرتب کر لیں۔ بمبئی جانے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وقف اولاد کی کارروائی کے لیے لوگوں کو آمادہ کریں۔ کیوں کہ ان زمانے میں امیر خسروؔ کے متعلق لکھ رہے تھے، اس لیے مولانا شروانی سے دریافت کیا کہ امیر خسرو کی ولادت پٹیالی میں ہوئی تھی تو وہ کس ضلع میں واقع ہے اور یہ موضع شہر سے کتنا دور واقع ہے۔

ندوے میں مولانا کی کوششیں بار آور ہو رہی تھیں اور اس کے ہر شعبے میں ترقی ہو رہی تھی۔ اس پر ایک صاحب نے کوشش شروع کی کہ وہ ناظم بن جائیں۔ امرتسر میں ان کے صاحبزادے نے پچاس روپے سالانہ دینے کا اعلان کیا اور نام کے ساتھ پسر ناظم ندوۃ العلماء لکھوایا گیا۔ اخبارات میں بھی مضمون چھپے۔ بھوپال سے ماہانہ رقم جو مقرر تھی اس میں مولانا شبلی کا نام سند کے طور پر تھا۔ جنوری میں انھوں نے وہ رقم اپنے نام سے منگوائی۔ ندوے کے قریب مکان لے کر رہنے کا ارادہ تھا، لیکن مولانا ان کوششوں کی تہ کو پہنچ گئے، وہ یہ کہ نظامت کے عہدے کے ساتھ ساتھ یہ لالچ تھا کہ ندوے کی عمارت کی تعمیر میں لکڑی ان کے کارخانے سے خریدی جائے (۱)

مولانا چاہتے تھے کہ الندوہ میں علمی خبریں پابندی سے شائع ہوا کریں، لیکن اب کی غلطی سے نہیں شائع ہو سکی تھیں۔ اس پر مولانا نے سید سلیمان ندوی کو تنبیہ کی اور لکھا کہ علمی خبریں شائع نہ ہونے کی وجہ سے بیس پچیس روپے کا نقصان ہوا۔ اسی زمانے میں مصر میں جامعہ مصریہ کا خاص پرچہ نکلا۔ اس پر مولانا نے سید سلیمان ندوی کو ہدایت کی کہ ان کو اپنا پرچہ بھیجا جائے اور اس کے بدلے میں ان کا پرچہ طلب کیا جائے۔ مولانا یہ بھی چاہتے تھے کہ ندوے کی خبریں اور حالات مصر کے عربی اخبارات میں شائع ہوتے رہیں، تاکہ وہاں کے لوگ بھی دل چسپی لیں۔ چناں چہ سید سلیمان ندوی کو لکھا کہ ندوے کے سالانہ جلسے کے مختصر حالات اور ایڈریس عربی میں لکھ کر المؤید کو بھیجیں تاکہ وہاں چھپ جائیں۔ چناں چہ سید سلیمان ندوی نے لکھ کر بھیجا تو اس کے دو

نمبروں میں شائع ہوا۔ الندوہ کے لیے مولانا ایک مختصر مضمون بھیجنے والے تھے(۲)۔

مولانا اب حیدر آباد آگئے تھے، وہاں پروفیسر عبد القادر نے بڑی آؤ بھگت کی۔ پروفیسر صاحب نے مولانا کو عالمگیری امیر کی وہ سند بھیجی جو مولانا کو مضامین عالمگیر کے سلسلے میں مطلوب تھی۔ اس سند کے متعلق مولانا کا خیال تھا کہ وہ سند لگان تھی اور اسی کو قول نامہ کہا جاتا تھا۔ یہ پونا کے قریب مندر کے گوسائن کو دی گئی تھی(۳)۔

چوں کہ مولانا ہر چیز کو بغور پڑھتے تھے اس لیے سند کے مطالعے کے بعد پروفیسر صاحب کو لکھا کہ عالمگیری سند میں صرف اتنا تھا کہ موضع چنچوڑ فلاں گوسائن کا مسکن ہے، کوئی اس کو نہ ستائے۔ لہٰذا اس سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ کوئی زمین بھی اس کو عطا ہوئی تھی۔ اس لیے مولانا نے دریافت کیا کہ اس موضع میں اب بھی کوئی دیول ہے اور اس کا پجاری اسی گوسائن کے خاندان کا ہے؟(۴)

اسی زمانے میں انھوں نے ندوے کے لیے شرح نہج البلاغہ از ابن ابی الحدید المعتزلی خریدی۔ اس کو لکھنو ساتھ لے جانے کا ارادہ تھا۔ اس سے قبل بمبئی میں بھی کچھ کتابیں خرید کر ندوے کے لیے بھیجی تھیں، لہٰذا ان کی رسید طلب کی۔ کچھ روپے بچ گئے تھے وہ واپس کرتے ہوئے لکھا کہ ایک نسخہ اعجاز خسروی کا نولکشور سے خرید لیا جائے۔ الہلال مصر کا چندہ بھیجا جائے اور بقیہ رقم جدید مصری مطبوعات کے لیے رکھ لی جائے۔ حیدر آباد میں بیٹھ کر الندوہ کے لیے کوئی مضمون نہ لکھ سکتے تھے۔ ویسے جلد واپسی کا ارادہ تھا۔ لکھنو پہنچتے ہی دار العلوم ندوہ کے لیے اساتذہ کا انتخاب کرنا تھا(۵)۔

پروفیسر عبد القادر نے رسالہ جزیہ طلب کیا تو انھیں لکھا کہ میر ولایت حسین سیکنڈ ماسٹر علی گڑھ کالج سے منگوائیں۔ مولانا اشاعرہ کو سنی فرقہ کی ایک شاخ قرار دیتے تھے، گو وہ خود ماتریدیت کو ترجیح دیتے تھے۔ شعر العجم سب سے پہلے پروفیسر صاحب کو بھیجنا چاہتے تھے(۶)۔ مولانا چاہتے تھے کہ الندوہ میں شذرات ضرور ہونا چاہیے۔ الندوہ کی جلد ۵ کے نمبر ۱۱۔۱۲ میں سید سلیمان ندوی کے مضامین ایمان بالغیب اور مکررات قرآن کو پڑھ کر مولانا بہت خوش ہوئے اور ان کو لکھا کہ تصنیفی سلیقہ آچلا ہے، البتہ عبارت کمزور ہوتی ہے، وہ بھی جاتی رہے گی۔ ان کو اس زمانے میں خیال ہوا کہ سید سلیمان ندوی کو مزید تعلیم کے لیے مصر بھیجیں، اس لیے چاہا کہ وہ کسی قدر انگریزی پڑھ لیں تو ان کو سب پر ترجیح دی جائے(۷)۔

مارچ ۱۹۰۹ء میں مہتمم دار الاخبار انجمن اسلامیہ مظفر نگر نے مولانا سے ان کی کتابیں انجمن کے لیے طلب کیں تو انھوں نے علم الکلام، موازنہ انیس و دبیر اور سوانح مولانا روم ان کو بھیجنے کا بندوبست کیا اور یہ بھی لکھا کہ مفت کتابیں طلب کرنے کا اصول صحیح نہیں اس لیے کہ مصنف تو ایک ہوتا ہے اور انجمنیں ملک میں کثیر تعداد میں ہیں اور اگر سب مفت طلب کرنے لگیں تو مصنف کے پاس کچھ نہ رہے گا۔ جب انجمن اشخاص قائم کرتے ہیں تو وہی کتابوں کی خرید کا بھی بندوبست کریں، اور چوں کہ مولانا کی معاش کتابوں پر نہ تھی، اس لیے جو کتابیں ان کے پاس تھیں وہ بغیر پس و پیش کے بھیجنے پر تیار ہوگئے (۸)۔

پروفیسر عبد القادر نے تزکِ تیموری کے متعلق دریافت کیا تو ان کو لکھا کہ وہ فارسی میں مشہور اور متداول کتاب ہے اور انھوں نے اس کا قلمی نسخہ علی گڑھ کالج میں دیکھا تھا، اس وقت تک غالباً چھپ چکی تھی اور بمبئی کے کتب فروشوں سے دریافت پر مل سکتی تھی۔

انھوں نے بو علی شاہ قلندر کے متعلق بھی دریافت کیا تھا۔ اس کے جواب میں لکھا کہ ان کا تذکرہ عموماً فارسی تذکروں اور تذکرہ اولیا میں ملتا ہے۔ اس وقت چوں کہ شاہجہان پور میں تھے، اس لیے کتاب کا حوالہ نہ لکھ سکے۔

شعر العجم کا پہلا حصہ دو تین ہفتے میں شائع ہونے کی امید تھی۔ عالمگیری مضامین کے انگریزی ترجمے کے متعلق دریافت کیا کہ اس کا کیا بندوست ہوا (۹)۔

فارسی غزلوں کا دوسرا مجموعہ بوے گل کے نام سے تیار ہو گیا تھا۔ مسٹر مہدی حسن کو جلد بھیجنے کا ارادہ تھا۔ شعر العجم کا ابھی غلط نامہ اور فہرست مضامین باقی تھے اور دیگر کاموں کی وجہ سے مزید دیر ہونے کا امکان تھا (۱۰)۔

اب مولانا اعظم گڑھ میں تھے۔ بوے گل پر لوگوں کی رائیں آنے لگی تھیں چناں چہ اکثر لوگوں کی رائے تھی کہ دستہ گل اور بوے گل میں جذب و سلوک کا فرق ہے اور مولانا کا بھی خیال تھا کہ دونوں کے شان نزول اسی قدر مختلف تھے جس قدر دونوں کے جوش و سرمستی میں فرق تھا۔ ایک شعر تو اس بات کا پورا آئینہ دار ہے:

یا جگر کاوی آں نشتر مژگاں کم شد   یا کہ خود زخم مرا لذت آزار نماند

اور مولانا حالی کا خیال تھا کہ بوے گل حال اور دستہ گل قال تھا۔

ندوے میں مولانا کی مخالفت سر اٹھانے لگی تھی اور اس کا سبب مولویوں کا تعصب تھا،

چناں چہ جلسہ، انتظار میں مولانا کو ان مولویوں سے پالی لڑنی پڑی (۱۱) - نائب سیکرٹری جو اپنے کو سیکرٹری کہتے اور لکھتے تھے، انھوں نے جلسہ، انتظامیہ میں تحریک پیش کی کہ مولانا کو الگ کر دیا جائے، یعنی سیکرٹری کا عہدہ ہی توڑ دیا جائے (۱۲) - وہ تحریک منظور نہیں ہو سکی - علی گڑھ کالج کے دوستوں نے مولانا کو طعنہ دیا کہ "اور مولویوں میں گھسو"، مگر مولانا کا کہنا تھا کہ وہ جان بوجھ کر ...... ندوے میں شامل ہوئے تھے - قاضی تلمذ حسین اب ندوے کے دارالعلوم میں ہیڈ ماسٹر ہو کر آگئے تھے - مولانا سوچ رہے تھے کہ وہ مولانا کے ہم خیال ہوتے ہیں یا اپنا ہم خیال بناتے ہیں - آج کل مولانا اعظم گڑھ میں تھے - دو چار روز میں لکھنو جانے والے تھے (۱۳) -

۳- جون کو مولانا کلکتہ میں تھے - مولانا کے نام عطیہ فیضی نے اپنے خط میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور مسلم لیگ کو ڈھکوسلا قرار دیا اور اس میں انگریزوں کا اشارہ بتلایا۔ مولانا کا کہنا تھا کہ جب ترکی کے خلیفہ عبدالحمید کی سیاست اور ینگ ترکی کے متعلق عطیہ فیضی کی رائے صحیح ہے تو پھر مسلم لیگ کے متعلق رائے کیوں غلط ہو - اسی زمانے میں عطیہ فیضی ایک نئے گرلز اسکول اور اس کے بورڈنگ کی سیکرٹری اور منیجر ہو گئی تھیں - اس کی اطلاع مسٹر مہدی حسن کو دی (۱۴) -

اب مولانا لکھنو آگئے تھے - یہاں سے پروفیسر عبدالقادر کو لکھا کہ جب کسی یورپ کی کتاب کے متعلق ان کو لکھیں تو قیمت ضرور لکھا کریں تاکہ وہ منگوا سکیں -

لغت فرس کے متعلق پروفیسر صاحب سے دریافت کیا کہ اسدی کا کیا طرز ہے - وہ صرف معنی پر اکتفا کرتا ہے یا سند بھی دیتا ہے - برہان قاطع کے مقابلے میں تفصیل یا جدت ہے (۱۵) -

مولوی ضیاء الحسن صاحب ندوی کاکوروی میٹرک (انگریزی) میں کامیاب ہوئے تو مولانا کو بڑی خوشی ہوئی اور مبارک باد کا خط لکھا - یہ بھی دریافت کیا کہ اب تو وہ کالج میں ضرور پڑھیں گے - مولانا کا یہ بھی ارادہ ہوا کہ الندوہ میں ان پر ایک نوٹ شائع کریں -

مولوی صاحب نے مولانا سے فراید کے متعلق دریافت کیا تھا تو لکھا کہ وہ معانی و بیان میں ہے اور مطول کے مقابلے میں اس میں جدت ہے - اس کا ایک حصہ کلکتہ میں چھپا ہے - گورکھ پور میں مولوی فاروق صاحب کے ایک عزیز کے پاس اس کا جدید الخط نسخہ مولانا نے دیکھا تھا (۱۶)

مولانا پھر حیدر آباد (دکن) گئے اور وہاں کاموں میں پھنس گئے۔ ویسے جلد روانہ ہونا چاہتے تھے۔ پروفیسر عبدالقادر نے مولانا سے دریافت کیا تھا کہ گون کو انگریزوں نے مسلمانوں کے جبہ سے تو نہیں لیا ہے؟ اس پر مولانا نے لکھا کہ ایسا نہیں ہے۔ پروفیسر صاحب سید سلیمان ندوی کو پونہ کالج میں لینا چاہتے تھے، اس پر مولانا نے لکھا کہ آپ کو ان سے بہتر کوئی آدمی نہ ملے گا، بشرطیکہ وہ راضی ہوں۔ ان کے مضامین الندوہ میں چھپتے رہتے تھے۔ پروفیسر صاحب اردو میں اکثر غلطی کر جاتے تھے، مولانا اس کی اصلاح کر دیا کرتے تھے (۱۷)۔

مولانا کی طبیعت خراب تھی، اس لیے بیمار لڑکی (فاطمہ) کو دیکھنے نہ جا سکے۔ مولانا چاہتے تھے کہ ان کا باقاعدہ علاج ہو، لیکن وہ خود وطن جانا چاہتی تھی، اس لیے اجازت دے دی تھی۔ ویسے اس کا اظہار کر دیا تھا کہ علاج کی خاطر وہ ٹھہرتیں تو بہتر تھا (۱۸)۔

اسی زمانے میں اڈیٹر الناظر لکھنو نے مولانا کو خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی کا شاگرد لکھ دیا۔ اس پر مولانا نے ان کو لکھا کہ خواجہ صاحب ان کے مخدوم تھے لیکن وہ (مولانا) ان کے (خواجہ صاحب) شاگرد نہ تھے۔ اسی میں مولانا نے اپنے شاعر ہونے سے بھی انکار کیا ہے اور نہ کسی شاعر کو اپنا شاگرد کہا ہے۔ اپنی شاعری کو انھوں نے تفریح طبع کہا ہے (۱۹)۔ مولانا اپنی صاحبزادی کی بیماری کی وجہ سے بہت پریشان تھے۔ خود مریضہ کو بھی احساس تھا، اس لیے مولانا نے ان کو تسلی دیتے ہوئے لکھا کہ بیماری تکلیف دہ ضروری ہے، مگر مہلک نہیں، اس لیے گھبرانے کی بات نہیں۔ رہ گیا مولانا پر ان کی بیماری کا اثر ہونا، وہ قدرتی بات تھی (۲۰)۔

۱۲۔ اگست ۱۹۰۹ء تک شعرالعجم کے حصہ دوم کے ۱۴۰ صفحے چھپ چکے تھے اور سو مزید چھپنے والے تھے۔ مولانا نے مسٹر مہدی حسن کو اطلاع دی کہ خیام کا جبر و مقابلہ یورپ نے پچاس برس پہلے چھاپا تھا۔ مولانا کو ۱۹۰۹ء میں ملا اور مولانا کا خیال تھا کہ مولویوں کو شاید قیامت تک بھی پتا نہ چل سکے، کیوں کہ ان کو تحقیق سے دلچسپی نہ رہی تھی۔ حالاں کہ اصل کام ان کا علمی اور تحقیقی ہی تھا۔ مولانا کا خیال تھا کہ خیام اس فن میں رؤس مسائل کا موجد تھا۔ اس کتاب کا ترجمہ اور تقریظ فرانسیسی زبان میں تھی (۲۱)۔

مولانا کا جلد ہی سفر میں جانے کا خیال تھا۔ پہلی منزل حیدر آباد (دکن) تھی اور اس کے بعد عرب جانے کا خیال تھا۔ عرصے سے مولوی حمید الدین فراہی کا وظیفہ نہیں آیا تھا، اس کی مولانا نے یاد دہانی کی۔ شعرالعجم میں صرف خواجہ حافظ کا حال چھپنے کو رہ گیا تھا، وہ بھی جلد چھپنے

والا تھا (۲۲)۔

۱۲۔ ستمبر کو شعر العجم حصہ دوم کے صرف پچاس صفحے چھپنے کو باقی تھے۔ ان صفحات کے چھپنے میں کتنا وقت لگتا یہ معلوم نہ تھا، کیوں کہ غیر معمولی دیر ہوتی جارہی تھی۔

صلائے عام، دہلی سے ایک رسالہ نکلتا تھا، مولانا نے اس پر ان الفاظ میں تنقید کی "اس کے سوا کوئی بات نہیں کہ ایک ہی بات کو سو سو دفعہ لکھ سکتا ہے سرمایہ کچھ نہیں۔ خالی باتوں سے کیا ہوتا ہے۔"

اسی زمانے میں (۲۳) مسٹر مہدی حسن نے دوسری بیوی (امین النساء (۲۴)) کی موجودگی میں ایک اور شادی عزیز النساء (۲۵) (مہدی بیگم) سے کی۔ اس کو مولانا نے اعرام جدید (۲۶) قرار دیا اور لکھا کہ اس کی داد دی جائے یا اس پر شک کیا جائے۔ قاضی تلمذ حسین کے متعلق لکھا کہ وہ بڑے کام کے آدمی ہیں۔ اونچا سنتے ہیں اور مولانا کا اس بڑھاپے میں چیخ کر ان سے باتیں کرنا ممکن نہیں۔ قاضی صاحب ایک سیاسی ماہنامہ نکالنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ خیام کے جبر و مقابلہ پر الندوہ میں ایک مختصر نوٹ لکھنے کا ارادہ تھا۔ زیادہ لکھنا چاہتے تھے، مگر ہاتھ میں لغزش تھی اس لیے مجبور تھے۔ یکم ستمبر سے مولانا شدید زکام میں مبتلا تھے۔ (۲۷)

مولانا حیدر آباد گئے تھے، وہاں سے بمبئی پہنچے۔ وہیں ان کو اپنی صاحبزادی کے خط سے معلوم ہوا کہ ان کو اب تک افاقہ نہیں ہوا، جس سے وہ بہت متفکر ہوئے اور لکھا کہ لکھنو سے بہت دور تھے ورنہ جلد پہنچتے۔ بہر حال لکھنو آتے ہی وہ سیدھے ان کو دیکھنے آئیں گے۔ ابھی چند روز اور سفر میں رہنے کا خیال تھا۔ بیٹی کے لیے صحت کی دعا کی (۲۸)۔

اسی زمانے میں مولوی عزیز مرزا پر حیدر آباد (دکن) میں عتاب ہوا اور وہ ریاست سے علیحدہ کر دیے گئے۔ ان کے ساتھ ان کے مقربین بھی زد میں آگئے، ان میں مولوی عبدالحلیم شرر بھی تھے۔ مولانا اس خبر سے بہت متاثر ہوئے اور امین زبیری صاحب کو توجہ دلائی کہ وہ عربی کے ماہر اور انگریزی داں ہیں، ان کو ریاست بھوپال کے محکمہ تعلیم میں لے لیا جائے تو بہت بہتر ہے۔ حیدر آباد (دکن) میں علوم مشرقیہ کی یونیورسٹی کے انگریزی نصاب اور اسکیم کی تیاری میں ان کا عملی حصہ ہے اور کئی برس کا عملی تجربہ بھی۔ انشا پردازی اور تصنیف کے کاموں میں ان سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ اگر ان کو ریاست بھوپال میں نہ لیا گیا تو وہ ریاست رام پور چلے جائیں گے۔ اصل میں مولانا یہ خط منشی منصب علی کو لکھنا چاہتے تھے، مگر ان کی عدم الفرصتی اور جواب میں دیر

کی وجہ سے مولانا نے امین زبیری کو سفارشی خط لکھا(۲۹)۔

مولانا کو معجم الادباء مصنفہ یاقوت رومی کی عربی زبان میں چھپی ہوئی جلدوں کی ضرورت تھی، اس کو بذریعہ ڈاک طلب کیا۔ مولوی ضیاء الحسن علوی ندوی کاکوروی نے مولانا سے اورنگ زیب پر مولانا کے مضامین کے پرچے مانگے تو انھیں لکھا کہ وکیل امرتسر نے ان کو مجموعی طور پر کتابچے کی شکل میں شائع کر دیا تھا۔ قیمت ۸ آنے تھی۔ وہاں سے منگوالیا جائے۔

مولوی صاحب کو موسیٰ بن عقبی کے حالات کی تلاش تھی۔ لہٰذا ان کو لکھا کہ وہ مشہور مورخ تھا، اس کے مختصر حالات تمام رجال کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ ارادہ تھا کہ اگر فرصت ملی تو اس کے حالات اور ارنیقی کی مدینۃ العلوم جو کشف الظنون کا ماخذ تھی دونوں کو نقل کرا کے بھیجتے۔

۱۹۔ نومبر ۱۹۰۹ء کو بیگم صاحبہ بھوپال کے ماہانہ عطیے کے سلسلے میں جلسہ تھا۔ مولانا اس میں ایک نظم پڑھنے والے تھے، اس کے بعد ہردوئی اور بنارس جانے والے تھے۔

مولانا نے علوم القرآن لکھنا شروع کر دیا تھا۔ جس کی ایک ہی فصل لکھ سکے۔ تہذیب الاخلاق امرتسر میں یہ فصل شائع ہوئی۔ ڈاکٹر بارویز جو جرمن یہودی مستشرق تھے اور علی گڑھ کالج میں عربی کے پروفیسر تھے، ان سے مولانا ندوے کے درجہ تکمیل ادب کے نصاب کے سلسلے میں خط وکتابت کرنے کا ارادہ کر رہے تھے(۳۰)۔

مولانا ۲۶۔ نومبر کو بنارس سے واپس آگئے تھے۔ زکام کی بہت تکلیف تھی۔ انھیں تجارت الامم مصنفہ ابن مسکویہ مطبوعہ یورپ کی ضرورت تھی، اس لیے ضیاء الحسن صاحب کو لکھا کہ بھیج دیں۔ ڈاکٹر بارویز کو اب تک خط نہ لکھ سکے تھے، مگر جلد لکھنے کا ارادہ تھا۔ رجال پر کتابیں مولانا کے پاس نہ تھیں۔ تہذیب التہذیب کی آخری جلدیں جس میں موسیٰ بن عقبی کا حال تھا وہ مولانا کے پاس اب تک نہیں آئی تھیں(۳۱)۔

بمبئی کی شاعری کے سلسلے میں مولانا نے ایک شعر لکھا، وہ یہ ہے:

داغم کہ بہوائے چمن بمبئی امسال سرمایہ یک تازہ غزل نیز نبودہ است

مولانا اب دارالعلوم کی تعلیمی حالت سے خوش تھے، اس لیے کہ اب ماہرین فن دستیاب ہوگئے تھے۔ انھوں نے حیدرآباد (دکن) سے مولوی شیر علی صاحب کو زبردستی بلایا تھا۔ ان کی تعلیم وفن سے واقفیت کی بنا پر طلبہ پر بڑا اچھا اثر پڑا۔ پھر شیخ محمد صاحب یمنی خزرجی خلف محدث شیخ حسین (استاد نواب صدیق حسن خان) بھی ایک حد تک غنیمت تھے، مگر مشکل یہ تھی کہ کوئی

مولوی فاروق صاحب کا بدل نہیں مل رہا تھا۔ مولوی سید محمد صاحب کان پوری جو مولانا کے رفیق تعلیم اور مولانا فاروق کے شاگرد تھے وہ ندوے میں قیام نہ کرسکے۔ اس لیے ایک ادیب کی ضرورت تھی۔

وقف علی الاولاد کے میموریل پر دستخط کرانے کے لیے ایک گشت کرنے والے کی مولانا کو ضرورت ہوئی تو مولانا شروانی کو لکھا کہ اگر کوئی مناسب آدمی ہو تو ۲۵ روپے ماہوار علاوہ سفر خرچ پر رکھنے کو تیار تھے۔

شعر العجم کا دوسرا حصہ چھپ گیا تھا۔ مگر اب تک مولانا کے پاس اس کے نسخے نہیں پہنچے تھے(۳۲)۔

اس زمانے میں مولوی سید امیر علی کوئی تحریک چلا رہے تھے، جس کو مولانا نے پسند کیا اور چاہا کہ ارکان ندوہ کو بھی توجہ دلائی جائے، مگر ارکان ندوہ اور دیگر عمائدین شہر ممبری کے چکر میں پڑے ہوئے تھے اور ۱۶۔ دسمبر تک یہی چکر تھا۔ مولانا کی شعر العجم کا پہلا حصہ علی گڑھ میں چھپا تھا، مگر بلٹی کا وزن ۵ من کے بجاے دو من سے بھی کم تھا، اس لیے اسٹیشن ماسٹر سے دریافت کرنے کی ضرورت پیش آئی کہ جب بلٹی پر ۵ من وزن لکھا تھا تو پھر وزن کم کیوں تھا۔ بقیہ نسخوں کو لانے کے لیے کسی آدمی کو علی گڑھ بھیجنے والے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ پہلی جلد کے بغیر دوسری جلد مولانا ابو الکلام آزاد کو نہیں بھیجی۔

گب سیریز کی کتابوں میں سے مولانا کو نوادر الحکایات از عوفی کی ضرورت تھی۔ اس کو وی پی کے ذریعے مولانا ابو الکلام کے توسط سے طلب کیا۔ چوں کہ سب کتابیں لینے کے قابل نہ تھیں، اس لیے گب سیریز کی فہرست کتب کی ضرورت تھی۔ ان کا ارادہ تھا کہ لکھنو میں دو مہینے مستقل قیام کریں تاکہ ندوے کی تعلیمی حالت اور انتظامی امور درست کرسکیں۔ اس درمیان میں علوم القران بھی کچھ لکھ لینے کا ارادہ تھا۔ فروری اور مارچ ۱۹۱۰ء میں سفر کا ارادہ کر رہے تھے اور اس کے بعد کشمیر جانے کا ارادہ تھا(۳۳)۔

نفح الطیب میں کہیں مصاحف عثمانی اور اس مصحت عثمانی کا ذکر تھا، جو اندلس (اسپین) بھیجا گیا تھا اور اس کا استقبال بڑی دھوم سے ہوا تھا۔ مولانا کو وہ مقام یاد نہیں رہا تھا، اس لیے سید سلیمان ندوی سے دریافت کیا، کیوں کہ علوم القران (۳۴) کے سلسلے میں اس کی ضرورت تھی (۳۵)۔

چوں کہ اب کی بمبئی کے سفر میں ایک غزل بھی نہ لکھ سکے تھے، اس لیے اس شکایت میں وہاں سے واپس آکر ایک غزل لکھی، جس کا مطلع یہ ہے:

ہر چند غلط نیست کہ شبلی دل و دیں باخت ۔۔۔ ایں حرف و لے مصلحت آمیز نہ بودہ است

اب مولانا کو ندوے کی تعلیمی حالت کی طرف سے اطمینان ہوا تھا، اس لیے ایک آدھ مہینہ لکھنو سے باہر رہنے کو تیار تھے اور مسٹر مہدی حسن کے الٰہ آباد بلانے پر جانے کو تیار ہو سکتے تھے۔ اب شعر العجم کے دونوں حصے شائع ہو گئے تھے، مگر مالک مطبع کتابیں نہیں بھیج رہے تھے، اس لیے ۳۔ دسمبر کو ایک خاص آدمی کتابیں لانے کو بھیجا کہ جتنی بھی ہاتھ لگ جائیں غنیمت سمجھا جائے۔

صلاے عام، دہلی کے متعلق مولانا کی رائے اچھی نہ تھی اور مسٹر مہدی حسن اس کے بڑے مداح تھے تو مولانا نے لکھا کہ ان کی (مہدی حسن) تنقید کا ہندوستان میں جواب نہ تھا، لیکن صلاے عام، دہلی کے متعلق ان کی رائے سے مولانا کو ان کی تنقید پر شبہ ہونے لگا (۳۶)۔

امیہ بن اصلت کے متعلق مولوی ضیاء الحسن کو حالات کی ضرورت تھی۔ مولانا نے ان کے لیے اس کا ترجمہ کرانا شروع کیا۔ نیکولسن کی کتاب لٹریری ہسٹری آف عربیا کو مولانا نے دیکھا ضرور تھا، مگر اس کو پڑھوا کر یا ترجمہ کرا کے نہیں سنا تھا۔

مولانا یہ طے نہیں کر سکے تھے کہ محرم (جنوری ۱۹۱۰ء) میں کہاں رہیں گے۔ لیکن یہ طے کر لیا تھا کہ خود علی گڑھ جا کر ڈاکٹر ہارویز سے ملاقات کریں گے۔

منصور احمد ایم اے علی گڑھ سے عربی کی تعلیم کے لیے یورپ جانا چاہتے تھے اور سرکاری وظیفے کے لیے سند کی ضرورت تھی۔ مولوی ضیاء الحسن نے ان کے لیے مولانا سے سفارش کی کہ وہ ان کی قابلیت اور اہلیت کا ایک سرٹیفکیٹ دے دیں۔ مولانا اس معاملے میں بڑے محتاط تھے، لہٰذا مولوی ضیاء الحسن کی بات رد نہ کی مگر یہ چاہا کہ وہ ان سے عربی عبارت لکھ کر بھجوائیں، تاکہ اس کو پڑھ کر مولانا ان کی استعداد کے متعلق رائے لکھ دیں (۳۷)۔

مولوی ابو الکلام آزاد نے مولانا کو کلکتہ بلایا اور لکھا کہ دسمبر کا آخری ہفتہ (کرسمس) بڑا دلچسپ ہوتا ہے۔ مولانا نے اس کو عمومیت کے لحاظ سے مناسب نہ سمجھا۔ ویسے مولانا چاہتے تھے کہ کچھ دن ہنگاموں سے دور سکون میں گزارتے اور اسی دوران کوئی کتاب لکھ ڈالتے۔ خیال تھا کہ اوائل جنوری ۱۹۱۰ء میں کلکتہ جاتے اور کچھ قیام کرتے، لیکن بمبئی کی طرح مولانا شاندار مہمان

نوازی اور لوگوں سے زیادہ متعارف ہونے اور ہنگاموں سے گھبرا رہتے تھے۔

مولانا چاہتے تھے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے ذریعے اگر سہروردی صاحب رسالہ وقف کا انگریزی ترجمہ کر دیتے تو بہت بہتر ہوتا (۳۸)۔

مولانا ۱۹۔ دسمبر ۱۹۰۹ء تک لکھنو میں قیام ضروری سمجھتے تھے، کیوں کہ اس روز دارالعلوم کا جلسہ انتظامیہ ہونے والا تھا اور اس میں شرکت ضروری تھی۔ اس کے بعد وہ کلکتہ وغیرہ جا سکتے تھے۔ مولوی ابوالکلام آزاد شعرالعجم پر ریویو کرنا چاہتے تھے اور مولانا ٹال رہے تھے۔ اس پر مولوی صاحب کو برا معلوم ہوا تو مولانا نے لکھا کہ انھوں نے مولانا کی عبارت کا غلط مطلب سمجھا۔ مولانا کا مطلب یہ تھا کہ وہ وعدہ کیوں کرتے ہیں جس کو وہ اپنی مصروفیت کی وجہ سے پورا نہیں کر سکتے۔ پورا نہ کر سکنے کی صورت میں مولانا کو ملال ہوتا۔

کلکتہ جانے میں مولانا کو ایک لالچ یہ بھی تھا کہ وقف علی الاولاد کے مسئلے میں وہاں کے لوگوں سے مدد ملے گی۔ علی گڑھ کے مطبع والوں کا کہنا تھا کہ وہ کتابیں (شعرالعجم) بلٹی کے ذریعے بھیج چکے۔ اسٹیشن پر بکس کہیں ادھر ادھر ہو گئے ہوں گے۔ مولانا اس گڑبڑ کی وجہ سے بہت پریشان رہے (۳۹)۔

مولوی ضیاء الحسن صاحب نے منصور احمد صاحب کی عربی عبارت مولانا کو بھیج دی تھی۔ مولانا کو بہت معمولی معلوم ہوئی، اس لیے مولانا اپنے سرٹیفکیٹ میں یہ لکھنے کو تیار تھے کہ عربی عبارت معمولی لکھ سکتے ہیں اور سرٹیفکیٹ کام نہ آتا۔ چوں کہ ڈاکٹر باروویز بھی سرٹیفکیٹ دینے والے تھے، اس لیے ان کے سرٹیفکیٹ کی موجودگی میں مولانا کے سرٹیفکیٹ کی ضرورت نہ تھی اور لندن میں اسی کی وقعت بھی زیادہ ہوتی۔ پھر بھی مولانا، مولوی ضیاء الحسن کی خواہش کے مطابق سرٹیفکیٹ دینے کو تیار تھے، مگر الفاظ کمزور ہوتے۔

مولانا نے اس کے ساتھ ہی دارالعلوم ندوۃ العلماء کا نصاب بھی مولوی صاحب کو ڈاکٹر باروویز کے لیے بھیجا (۴۰)۔ کتابوں کا ۱۰۔ دسمبر تک پتا نہ چلا تھا۔ مولانا ان کے لیے بہت فکرمند تھے۔ دو سو کتابوں کا بنڈل ریلوے میں کہیں ادھر ادھر ہو گیا تھا۔ باقی کتابیں محفوظ تھیں، لیکن وہ بھی ابھی تک مل نہ سکی تھیں۔ ابوالکلام آزاد کا ارادہ جنوری ۱۹۱۰ء میں کلکتہ سے باہر جانے کا تھا اور مولانا دسمبر کے آخری ہفتے میں جا کر دو چار روز کے لیے وہیں رہنا چاہتے تھے۔ اس لیے کہ انحطاط کے زمانے میں جانا اور آنا تکان کا سبب ہوتا، اس لیے چاہتے تھے کہ اگر جائیں تو ایک آدھ

پہنیے تو ضرور قیام کریں۔

رسالہ۔ وقف کا انگریزی ترجمہ لکھنو میں شروع ہو گیا تھا، مگر اس پر نظر ثانی کی ضرورت تھی۔ دار العلوم ندوۃ العلماء میں طلبہ بکثرت آگئے تھے اور گنجائش کی کمی تھی، چناں چہ مولانا نے اپنے چند کمرے بھی طلبہ کے لیے خالی کر دیے تھے، پھر بھی بعض طلبہ کرایے کے مکانوں میں قیام پذیر ہوئے۔

اسی زمانے میں مولوی عبد الحلیم شرر مولانا کے مضامین کے کچھ اجزا شائع کرنے کے لیے لے گئے، لیکن اب تک شائع نہ ہو سکتے تھے اور خود مولوی صاحب بھی اپنی مصروفیات کی وجہ سے دوبارہ ان سے نہ مل سکے (۴۱)۔

عطا محمد کا ریویو مولانا نے الندوہ میں اشاعت کے لیے دے دیا۔ دلی سے ندوہ کی نیم سرکاری دعوت آئی تو مولانا نے ارادہ کیا کہ اگر وہ دعوت پختہ ہو گئی تو فروری ۱۹۱۰ء میں وہ دلی کے اطراف کا دورہ کریں گے۔ شعرالعجم کی گم شدہ جلدیں اب مل گئی تھیں۔ الندوہ میں جہانگیر پر مولانا کا ایک بسیط مضمون جلد ہی نکلنے والا تھا (۴۲)۔

اسی زمانے میں مولوی رفیع الدین صاحب پونہ کونسل کی ممبری میں کامیاب ہوئے تو مولانا کو بڑی مسرت ہوئی اور انھوں نے خیال ظاہر کیا کہ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں تو وہ بہتر کام کریں گے۔ لکھنو کے الیکشن کا نتیجہ ۲۱۔ دسمبر کو نکلنے والا تھا۔ مولانا کو اس کا بھی بے چینی سے انتظار تھا (۴۳)۔

مولوی ضیاء الحسن صاحب نے الندوہ کے لیے مضمون بھیجنے کو لکھا تو مولانا نے لکھا کہ ضرور بھیجیں، کیوں کہ الندوہ کا انتظام اب مستقل اور مستحکم ہو گیا تھا اور مولوی عبد السلام ندوی نے اس کی مستقل ادارت قبول کر لی تھی۔

مولانا نے اسی زمانے میں کتاب العمدہ از ابن رشیق القیروانی مطبوعہ مصر پر ریویو لکھا جو الندوہ کے آئندہ شمارے میں شائع ہونے والا تھا۔ لیکن اس ریویو کو تفصیل سے نہ لکھ سکے تھے، اس کا افسوس تھا۔

مولوی ضیاء الحسن صاحب نے مولانا کو علوم القرآن کے مضمون کے سلسلے میں توجہ دلائی کہ اورینٹل کانفرنس کا مضمون قرآن پر نکلا تھا تو مولانا نے لکھا کہ وہ مضمون انھوں نے عربی میں نہیں دیکھا، اس لیے پتا لکھیں تاکہ مہیا کرنے کی کوشش کی جائے۔

اب ندوے کی جدید عمارت زمین سے اوپر آگئی تھی اور مولانا کو امید ہو چلی تھی کہ جلد بن جائے گی۔ مولانا اس کو بنتے دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے تھے (۴۴)۔

پروفیسر مولوی نجیب الشرف صاحب ندوی سابق استاد اندھیری کالج بمبئی کی ایک روایت ہے کہ ندوے کی تعمیر کے زمانے میں تمام طلبہ کو ساتھ لیا اور تعمیر کی جگہ پہنچ کر تمام طلبہ کے ساتھ مزدوروں کا کام کیا، اس کے بعد ایک بڑی پر اثر تقریر کی اور ندوے کی اہمیت بتلائی (۴۵)۔

یہ سال اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ مولانا نے اس سال سے اپنا روزنامچہ لکھنا شروع کیا تھا جو ۱۹۰۹ء میں تو پابندی سے جاری رہا مگر اس کے بعد کبھی کبھی کچھ لکھا اور ۱۹۱۲ء کے بعد تو پھر بالکل نہ لکھ سکے۔ سید سلیمان ندوی ان کے روزنامچے کے متعلق اس طرح لکھتے ہیں:

"مولانا مرحوم کبھی روزنامچہ لکھنے کے عادی نہ تھے اور نہ کبھی وہ اپنے خرچ کے آمد و صرف کا کوئی حساب کتاب رکھتے تھے۔ نہایت بے پروائی کے ساتھ ادھر ادھر ان کے روپے پڑے رہتے تھے، لیکن ندوہ آنے کے بعد ان کو ایک دو واقعے کے سبب سے یادداشت رکھنی پڑی ہم ان اتفاقی واقعات کے ممنون ہیں جن کی بدولت ان کے وقائع زندگی کے چند اوراق ہاتھ آگئے (۴۶)۔"

۱۹۰۹ء کا روزنامچہ یہ ہے:

۲۰۔ مئی ۱۹۰۹ء: میں اعظم گڑھ سے واپس آیا۔ حیدرآباد سے مصارف سفر وغیرہ وصول ہوئے، جس کی تعداد ۳۳ روپے دس آنے ہے۔

۲۱۔ مئی ۱۹۰۹ء: پانچ سو روپیہ بینک بنگال، الہ آباد میں اور ۲۰۰ سیونگ بینک لکھنو میں جمع ہوئے۔

۲۲۔ مئی ۱۹۰۹ء: چوں کہ دارالعلوم میں ایک لڑکا ہیضے میں مبتلا ہوا، اس لیے بہ مشورہ معتمدین دارالعلوم معمولی تعطیل کے علاوہ دو ہفتے کے لیے اور بند کر دیا اور مدرسین اور طلبہ کو اطلاع دے دی گئی۔

۲۳۔ مئی ۱۹۰۹ء: دو سو روپے کا چیک جو پشاور سے بمد تعمیر کمرہ دارالعلوم موصول ہوا تھا۔ بعد دستخط معتمد صاحب مال کے پاس بھیجا گیا۔ معرفت منشی محمد علی۔

۲۴۔ مئی ۱۹۰۹ء: آج شعر العجم کے تیسرے حصے کی ترتیب سے فراغت حاصل ہوئی والحمد للہ علیٰ ذالک

۲۵۔ مئی ۱۹۰۹ء: آج ایشیاٹک سوسائٹی نے میرے چندہ سہ ماہی کی رسید بھیجی اور

واقعات عالمگیری کا تقاضا بھیجا۔

۲۷۔ مئی ۱۹۰۹ء: آج سو روپیہ بابت شعر العجم فیض عام کو بھیجے گئے۔ اب تک ۲۰۰ روپے ان کو پہنچے۔ آج میں کلکتہ روانہ ہوا۔

۲۸۔ مئی ۱۹۰۹ء: آج میں کلکتہ پہنچا اور مولوی شرف الدین صاحب کے ہاں ٹھہرا۔

یکم ۱۹۰۹ء آج شعر العجم حصہ اول کے لوح کی کلپیاں آئیں اور بعد تصحیح بصیغہ، بیرنگ واپس گئیں۔

۲۔جون ۱۹۰۹ء: آج لاہور سے بی۔او۔ایل کے امتحان کی فیس کا دو سو چالیس روپے کا چیک آیا اور آج تجارت الامم کا ریویو مطبع آسی میں الندوہ کے لیے بھیجا گیا۔

۴۔جون ۱۹۰۹ء: آج میں کلکتہ سے بہ ہمراہی مولوی شرف الدین صاحب جج معاملہ مقصود کی غرض سے گیا آیا اور وہاں موسیٰ متولی وقف صغریٰ بی بی سے ملا۔

۸۔جون ۱۹۰۹ء: گیا سے روانہ ہو کر لکھنو آیا۔

۱۰۔جون ۱۹۰۹ء: آج دو سو چالیس روپے کی رسید پنجاب یونیورسٹی کے رجسٹرار کو بھیجی گئی۔ یہ رقم بی۔او۔ایل کے پرچے کے متعلق وصول ہوئی تھی۔

۱۱۔جون ۱۹۰۹ء: دو سو چالیس روپے کا چیک جو پنجاب سے آیا تھا، بینک سے وصول کیا گیا آج حیدر آباد کا وظیفہ بھی آیا۔

۱۲۔جون ۱۹۰۹ء: آج حسب ذیل رقمیں صرف ہوئیں۔ پندرہ روپے برائے مصارف سفر صغریٰ، گیارہ روپے حسب معمول مطاہرات اعظم گڑھ مشاہرہ۔ کاتب دس روپے، بیس روپے شاہرہ گاؤر

۱۵۔جون ۱۹۰۹ء: آج تین سو پچاس روپے معرفت کلن منشی محمد علی کو بھیجے کہ بینک آف بنگال الہ آباد کو بھیج دیں۔ ان میں دو سو چالیس روپے تو پنجاب کے فیس بی۔او۔ ایل کے ہیں اور باقی اور مدات سے۔

۱۶۔جون ۱۹۰۹ء: آج منشی محمد علی نے بجملہ تین سو پچاس روپے مذکورہ کے ۳۰۰ بینک آف بنگال الہ آباد میں بھیجے۔

۱۸۔جون ۱۹۰۹ء: آج الہ آباد سے بینک آف بنگال نے بذریعہ خط نمبر ۷۔۴۔۳۶۴۲ مورخہ ۱۷۔جون ۱۹۰۹ء تین سو کی رسید بھیجی اور لکھا کہ پانچ سو روپیہ جو تم نے پہلی جون ۱۹۰۸ء میں بھیجے تھے اس کی میعاد ۱۳۔جون ۱۹۰۹ء کو ختم ہو گئی اس لیے رسید نمبر ۲۶-۲۰۶ بھیج دو تو دونوں رقمیں یک جا کر کے جمع کر دی جائیں۔

۳۰۔جون ۱۹۰۹ء: آج سرکار بھوپال دفتر فنانس سے سرکاری مراسلہ آیا کہ ماہوار مقررہ دار العلوم میں دو سو روپے سالانہ کا اضافہ کیا گیا۔ میں نے شکریہ کا تار بھجوایا اور خط

بھی۔ آج ہی شعرالعجم کی کاپیاں حالات سعدی اور لوح دوم اور تصحیح واپس بھیجی گئی۔
۱۷۔ جولائی ۱۹۰۹ء: آج شملوی صاحب نے دو سو بیس روپے کشمیر سے بھیجے جو منشی محمد علی کے حوالے کیے گئے کہ تا دریافت مد صرف محفوظ رکھے جائیں اور آج انسپکٹر صاحب کا خط آیا کہ درباب روانگی مصر گورنمنٹ کا کوئی خط نہیں آیا۔
۱۹۔ جولائی ۱۹۰۹ء: آج فتح الباری مولوی عزیز مرزا کو رجسٹرڈ بھیجی۔
۲۲۔ جولائی ۱۹۰۹ء: آج جنجیرہ سے بیگم صاحبہ کے بقیہ آدھے نوٹ ہزار روپے کے ایک کمرے کی تعمیر کے لیے آئے اور میں نے معتمد صاحب مال کے پاس بھیجے کہ بینک آف بنگال میں بھیج دیے جائیں۔
۱۵۔ اگست ۱۹۰۹ء: آج انسپکٹر صاحب کے ہاں سے اجازت وصول یابی ایڈ کا کاغذ آیا۔
۱۶۔ اگست ۱۹۰۹ء: آج حیدر آباد کا وظیفہ آیا۔
۲۷۔ اگست ۱۹۰۹ء: آج دو سو چھیاسٹھ روپے حیدر آباد سے معرفت شرر کے حساب بقیہ معاوضہ ترتیب نصاب دارالعلوم حیدر آباد وصول ہوئے۔ جس میں سے دو سو روپے منشی محمد علی کے پاس جمع کر دیے گئے کہ سفر کے وقت ان سے لیے جائیں گے۔
۱۴۔ ستمبر ۱۹۰۹ء: چوں کہ حیدر آباد کا وظیفہ نہیں آیا، اس لیے زر مجتمعہ نج سے روپیہ منگوا کر حسب ذیل خرچ کیا گیا۔ حساب خوراک بابت اگست ۱۹۰۹ء ......
حوالہ، منیر الدین ایشیاٹک سوسائٹی چھ روپے اور معمولی مشاہرات اعظم گڑھ وغیرہ۔
۱۷۔ ستمبر ۱۹۰۹ء: تا ۲۷۔ ستمبر ۱۹۰۹ء، آج بغرض سفر بمبئی لکھنو سے دہلی آیا یہاں دو تین لکچر ہوئے۔ ریاست بھوپال نے دو سو روپے ماہوار کا جو اضافہ ۲۸۔ ستمبر ۱۹۰۹ء سے ندوے کی ماہوار میں کیا اس کی اطلاع یہیں ۲۷۔ ستمبر ۱۹۰۹ء کو ملی۔ وقف اولاد کی کارروائی کی تحریک ہوئی یہاں جوگ بشت کا نسخہ اصلی عہد اکبر جس پر شاہجہاں کے خاص دستخط ثبت ہیں، نظر سے گزرا۔ اس میں اس قدر عمدہ تصویریں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت یہ فن کچھ کم نہ تھا۔
۳۔ اکتوبر ۱۹۰۹ء: آج بمبئی پہنچا۔
۶۔ اکتوبر ۱۹۰۹ء: آج شعرالعجم حصہ دوم کی آخیر کاپیاں بعد تصحیح مطبع علی گڑھ کو بھیجی گئیں اور آج ہی بینک آف بنگال کی رسید متعلق رقم نو سو نوے روپے پندرہ آنے آئی۔ آج حیدر آباد سے مراسلہ متعلق دریافت کتب آیا۔ آج اسلام کلب میں سیٹھ جمال کا ڈنر اور میرا لکچر ہے۔
۷۔ اکتوبر ۱۹۰۹ء: آج میں جنجیرہ آیا اور نواب صاحب کا مہمان ہوا۔
۱۴۔ اکتوبر ۱۹۰۹ء: آج حیدر آباد سے منی آرڈر بقیہ رقم معاوضہ تیاری نصاب اٹھارہ

روپے دس آنے وصول ہوئے جس کی رسید بھیجنی ہے اور کل یہاں سے چلنے کا ارادہ ہے۔

۱۶-اکتوبر ۱۹۰۹ء: آج میں بمبئی واپس آیا۔

۲-نومبر ۱۹۰۹ء: آج میں بمبئی سے لکھنو روانہ ہوا۔

۳-نومبر ۱۹۰۹ء: آج لکھنو پہنچا۔

۴-نومبر ۱۹۰۹ء: آج حیدر آباد سے دو مہینہ کا وظیفہ آیا یعنی آذر تک کا اور دو سو روپے منشی محمد علی کے پاس بطور امانت رکھوا دیے گئے۔ آج بیس روپے چندہ عطیہ فاطمہ بی بی مرحوم منشی محمد علی کے پاس بہ مد امانت بہ اشتہال زیورات رکھوا دیا گیا۔

۴-دسمبر ۱۹۰۹ء: آج مولوی عبد الحلیم شرر کو مضامین کے طبع کے متعلق چالیس روپے بھیجے گئے اور یہ اس روپے میں سے دیے گئے جو منجملہ ایک سو چون روپے کے بچے تھے اور جن میں سے چون روپے کلن کے پاس جمع تھے۔

۹-دسمبر ۱۹۰۹ء: آج حیدر آباد کا وظیفہ آیا۔ تنخواہیں اور اعظم گڑھ میں اسکول اور کمیر کا روزینہ بھیجا گیا اور انیس روپے کرایہ مکان ادا کیا گیا (۷۴)۔

روزنامچے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نے روزنامچہ لکھا تو مگر پابندی سے نہیں لکھا اور مولانا جیسا مصروف انسان اس سے زیادہ اور کیا لکھ سکتا تھا اور اس سے زیادہ کہاں وقت بھی نکال سکتا تھا۔ مولانا نے مارچ ۱۹۰۹ء کے الندوہ کے شمارے میں ایک مضمون "ریاست حیدر آباد کی مشرقی یونیورسٹی" لکھا جس میں اس طرح لکھتے ہیں:

"حیدر آباد میں عنان تعلیم انھی لوگوں کے ہاتھ میں رہی ہے جو ہندوستانی یونیورسٹی بنانے کے محرک اور جان دادہ ہیں۔ یونیورسٹی کے لیے دس لاکھ روپیہ مانگا جارہا ہے۔ حیدر آباد میں ایک منٹ میں یہ رقم مل سکتی ہے۔ حیدر آباد میں صرف ایک کالج پر ڈیڑھ لاکھ روپیہ صرف ہو رہا ہے۔ حیدر آباد کو اس بات کی کچھ پروا نہیں ہو سکتی کہ اگر وہ اپنی یونیورسٹی بنائے تو اس کے تعلیم یافتہ انگریزی گورنمنٹ میں نوکریاں نہ پائیں گے، کیوں کہ خود حیدر آباد ایسی وسیع ریاست ہے کہ وہاں کے تعلیم یافتہ دوسری جگہ نوکری کرنے کے محتاج نہیں۔ لیکن تقلید پرستی کی یہ حالت ہے کہ انگریزی تعلیم میں کسی قسم کی اصلاح و ترمیم ایک طرف، خاص مشرقی تعلیم میں بھی جس کے لیے وہاں ایک دار العلوم ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے مشرقی امتحانات کے بیہودہ نصاب کی آج تک تقلید کی گئی۔ پنجاب نے مولوی فاضل اور مولوی عالم وغیرہ کے جو امتحانات مقرر کیے ہیں وہ دنیا کے کام کے ہیں نہ دین کے، تاہم آج تک اسی کی

محکومی کی گئی اور اس وقت تک آزادی کا خیال نہ آیا جب تک خود یونیورسٹی نے یہ قاعدہ نہیں بنایا کہ ہم دوسرے ممالک کے لوگوں کو اپنے امتحانات میں شریک نہیں کر سکتے (۴۸)۔"

اس مضمون کے آخر میں اس طرح لکھتے ہیں:

"نواب عماد الملک بہادر کی رائے تھی کہ علوم عربیہ کے ساتھ انگریزی کی تعلیم نہیں ہو سکتی اس لیے اس کو نصاب سے خارج کر دینا چاہیے۔ لیکن جب یہ ظاہر کیا گیا کہ علوم عربیہ میں بہت سی فضول کتابیں جو منطق و فلسفہ کی شامل تھیں خارج کر دی گئی ہیں، اس لیے کافی گنجائش ہے تو نواب صاحب موصوف نے بھی اتفاق ظاہر کیا۔"

ہم کو اس پر کسی قدر تعجب ہوا کہ اس کمیٹی میں نہایت متقشف اور پرانے خیال کے علما بھی شریک تھے۔ تاہم انگریزی کے داخل کرنے سے کسی نے انکار نہیں کیا، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حیدرآباد میں ہندوستان (۴۹) کی بہ نسبت روشن خیالی کا اثر زیادہ ہے۔

نصاب کے طے پانے کے بعد اسی کے موافق دارالعلوم میں جدید اسٹاف قائم ہو گا۔ اس کے ساتھ ایک مجلس بطور سینٹ کے قائم ہو گی اور اسی کے لیے فیلوز منتخب ہوں گے۔ اس طرح ایک مشرقی یونیورسٹی کی بنیاد قائم کی جائے گی۔

نہایت مسرت کی بات ہے کہ اس وقت افسران تعلیم نواب فخر الملک بہادر وزیر عدالت اور مولوی عزیز مرزا صاحب معتمد عدالت اور سید سراج الحسن صاحب ناظم تعلیمات ہیں، اس لیے ہر طرح پر امید ہے کہ یونیورسٹی عمدہ اور مستحکم اصول پر قائم ہو گی۔

یہ ہم نے بار بار کہا ہے اور اب پھر کہتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کے لیے نہ صرف انگریزی مدرسوں کی تعلیم کافی ہے نہ قدیم عربی مدرسوں کی۔ ہمارے درد کا علاج ایک معجون مرکب ہے، جس کا ایک جز مشرقی اور دوسرا مغربی ہے۔

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق ہر ہوسناکے نہ داند جام و سنداں باختن" (۵۰)

مولانا نے مارچ ۱۹۰۹ء میں اضلاع سرحدی کا مختصر دورہ کیا تھا۔ اس کی روداد انھوں نے اپریل کے الندوہ کے شمارے میں شائع کی۔ اس میں اس طرح لکھتے ہیں:

"مولوی غلام محمد صاحب شملوی وکیل ندوہ پشاور میں مقاصد ندوہ کی اشاعت کے لیے گئے تھے۔ وہاں کے لوگوں نے خواہش کی کہ خاکسار اور مولانا شاہ سلیمان صاحب کی زبان سے یہ مقاصد زیادہ دلنشیں ہوں گے۔ اس تحریک پر ۲۲-

مارچ ۱۹۰۹ء کو ہم لوگ لکھنؤ سے روانہ ہوئے اور ۲۴- کی صبح کو پشاور پہنچے - اگرچہ ٹرین وہاں کچھ رات گئے پہنچتی ہے، تاہم اکثر لوگ (معززین) اسٹیشن پر موجود تھے (۵۱)-"

پشاور میں وعظ اور تقاریر کے متعلق اس طرح لکھتے ہیں:

"محمڈن کلب ہال میں وعظ اور لکچروں کے متعدد جلسے ہوئے اور نہایت کثرت سے لوگوں کا مجمع ہوتا تھا - وداعی جلسے میں میں نے صرف ندوے کے مقاصد پر تقریر کی اور لوگوں پر خاص اثر ہوا (۵۲) -"

اتفاق کی بات مولانا حالی کے صاحبزادے خواجہ سجاد حسین صاحب بھی اس زمانے میں پشاور میں تھے - مولانا ان سے مل کر بہت خوش ہوئے اور انھوں نے مولانا کی مولانا حالی سے دوستی کا بڑا پاس ولحاظ کیا - چنانچہ لکھتے ہیں:

"حسن اتفاق یہ کہ ہمارے عزیز دوست خواجہ سجاد حسین صاحب بی - اے (فرزند مولانا حالی) صوبہ سرحدی کے افسر تعلیمات ہیں - انھوں نے پچاس روپے میری دعوت خشک کی مد میں پیش کیے مہماں عبدالرشید صاحب نے بھی پچاس روپے دعوت کے دیے - یہ سب رقمیں ندوے بھیج دی گئیں (۵۳) -"

آگے چل کر لکھتے ہیں:

"پشاور سے شاہ سلیمان صاحب حیدر آباد چلے گئے اور میں راولپنڈی آیا - یہاں بھی ایک اسلامیہ اسکول ہے اور بہ نسبت پشاور کے اچھی حالت میں ہے - اس کے ہال میں میں نے ندوے کے مقاصد پر لکچر دیا خواص وعوام ہر قسم کے لوگ نہایت کثرت سے تھے (۵۴) -"

آگے چل کر اسی مضمون میں کوہاٹ کے سفر کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

"میں راولپنڈی میں تھا کہ مولوی محمد اشرف صاحب وکیل کوہاٹ یہاں آئے اور کہا، مسلمانان کوہاٹ نے مجھ کو آپ کے بلانے کے لیے بھیجا ہے - میں مولوی غلام محمد صاحب شملوی کے ساتھ - اپریل ۱۹۰۹ء کو صبح کے وقت کوہاٹ پہنچا - اسٹیشن پر تمام اکابر کوہاٹ تشریف لائے تھے (۵۵) -"

کوہاٹ کے جلسے کا ذکر مولانا اسی مضمون میں اس طرح کرتے ہیں:

"سید سکندر شاہ صاحب کے اہتمام سے لکچر کا جلسہ منعقد ہوا - پہلے دن مولوی غلام محمد صاحب شملوی نے تقریر کی اور کوہاٹ کو مسخر کر لیا - دوسرے روز

زیادہ اہتمام ہوا اور کئی کئی میل سے لوگ آئے - شاید کوہاٹ میں آج تک اس جمعیت اور اقتدار کا کوئی جلسہ نہ ہوا ہوگا - میں نے اسلام کی جامعیت اور ندوے کے مقاصد پر تقریر کی - اکثر ہندو اور آریہ صاحب بھی تشریف لائے تھے - وداعی جلسہ انجمن کے ہال میں منعقد ہوا، جس میں میں نے معین الندوہ کے قائم کرنے کی (تحریک کی) انجمن کے تمام ارکان نے جن کی تعداد اکاون تھی، ممبری قبول کر لی (۵۶) -"

مولانا نے ۲۶ - مئی ۱۹۰۹ء کو ایک مضمون کارروائی انجمن وقف علی الاولاد (زیر حمایت ندوۃ العلماء) لکھا جو الندوہ جلد ۶ نمبر ۴ میں شائع ہوا - اس میں مولانا لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کی فقہ کا یہ ایک مسلم مسئلہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی جائداد کو اپنی اولاد پر وقف کر دے جس کی غرض یہ ہو کہ اصل جائداد ہمیشہ محفوظ رہے اور اس کے منافع سے اولاد ہمیشہ متمتع ہوتی رہے تو یہ وقف شرعاً جائز اور صحیح ہو گا، یعنی اس جائداد کو کبھی کوئی شخص فروخت، منتقل اور ضائع نہیں کر سکے گا اور اس کے منافع سے اس شخص کی اولاد کا سلسلہ، جب تک دنیا قائم رہے، متمتع ہوتا رہے گا -

یہ طریقہ اسلام میں ہمیشہ جاری رہا اور تمام بلاد اسلامیہ میں اب تک جاری ہے اور ہندوستان میں بھی ایک مدت تک جاری رہا - لیکن بعض خاندانوں میں نزاع پیدا ہونے پر اس کے متعلق سرکاری عدالتوں میں مقدمات دائر ہوئے اور پریوی کونسل سے یہ فیصلہ ہو گیا کہ ایسا وقف ناجائز ہے - پریوی کونسل کا استدلال یہ ہے کہ وقف خیرات کرنے کا نام ہے اور اپنی اولاد کو دینا خیرات میں داخل نہیں ہو سکتا (حالاں کہ شریعت اسلام میں سب سے بہتر خیرات یہی ہے کہ اپنے عزیز و اقارب کو دیا جائے) (۵۷) -"

اسی مضمون میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

"اب چند امر قابل غور پیدا ہوئے:

۱- آیا یہ مسئلہ حقیقت میں مسلمانوں کا مذہبی مسلمہ مسئلہ ہے یا نہیں؟
۲- اگر ہے تو گورنمنٹ کو کیوں کر اس کا یقین دلایا جا سکتا ہے؟
۳- گورنمنٹ پریوی کونسل کے فیصلے میں مداخلت کر سکتی ہے یا نہیں؟

چوں کہ دفعہ اول میں کچھ شبہ نہ تھا اس لیے دفعہ دوم و سوم کے متعلق میں نے قوم کے ان اکابر سے جو امور قانونی اور ملکی معاملات میں سب سے بہتر رائے دے سکتے ہیں خط و کتابت کی متفقاً سب نے کامیابی کی امید ظاہر کی اور خواہش کی کہ صحیح طریقے سے اس تحریک کو جاری کیا جائے (۵۸) -"

مولانا نے الندوہ کے جون کے شمارے میں کئی مضامین لکھے جن میں سے ایک دارالاقامہ کے کمروں کی تیاری بھی تھا۔ اس میں لکھتے ہیں:

"دارالعلوم کی عمارت بننی شروع ہو گئی۔ اس کے آس پاس جو تعلیمی عمارتیں گورنمنٹ اور تعلقہ داران اودھ کی طرف سے بن رہی ہیں، یعنی صنعتی کالج اور کیننگ کالج کا بورڈنگ، ان عمارتوں نے دارالعلوم کے منظر کو اور خوبصورت بنا دیا۔ حسن اتفاق سے چوں کہ دارالعلوم کی زمین بلند اور نمایاں واقع ہوئی ہے، اس لیے اس کے پہلو کی عمارتیں جلوب کی عمارتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ہندوستان میں یہ پہلا موقع ہے کہ جدید علوم اور قدیم علوم کی درسگاہیں پہلو بہ پہلو بن رہی ہیں اور ندوے کا مقصد بھی یہی ہے۔

ڈانڈا ملا دیا ہے ارم سے تتار کا

لیکن دارالعلوم کی عمارت اس وقت تک معطل پڑی رہے گی، جب تک اس کے ساتھ کا بورڈنگ (دارالاقامہ) بھی نہ بن جائے۔ سید جعفر حسین صاحب نے دارالاقامہ کے کمروں کا خاکہ اور صحیح تخمینہ موقع زمین دیکھ کر قائم کیا ہے۔ فی کمرہ سات سو روپے لاگت آئے گی اور ہر کمرے میں تین طالب العلم رہ سکیں گے۔ ان کمروں کی تیاری کے لیے مختلف تجویزیں قرار دی گئی ہیں (۵۹)۔"

الندوہ کے جون کے شمارہ میں ایک مضمون "علمی گروہ" لکھا جس میں لکھتے ہیں:

صوفیاں مستند زاہد بے خبر   از کہ پرسم من رہ میخانہ را

ہمارے رفارمروں نے جب جدید تعلیم کی بنیاد رکھنی چاہی تو ضروری سمجھا کہ پہلے قدیم عمارت ڈھا کر سطح ہموار اور درست کر لی جائے۔ ہم نے اس کو منظور کیا۔ پرانی تعلیم (جس قدر ہم سے ہو سکا) عملاً مٹا دی گئی اور چوں کہ خطرہ تھا کہ قدامت پرست لوگ منہدم شدہ عمارت نئے سرے سے نہ اٹھائیں، اس لیے ضرور ٹھہرا کہ دلوں سے بھی اس کی عظمت کا نقش مٹا دیا جائے۔ اس بنا پر ہم نے اس کو افسانہ، پارین، تقویم کہن، عضو شل، آب جامد وغیرہ وغیرہ مختلف خطابات دیے اور اس طرح بار بار دہرایا کہ قدیم تعلیم بھی بول اٹھی کہ:

بہ من چنداں گنہ از بدگمانی میکنند نسبت   کہ من ہم در گماں افتادہ پندارم گنہگارم

تیس برس کا زمانہ گزر گیا، قدیم تعلیم مر چلی نئی نسلیں تیار ہوئیں، ہزاروں بی۔اے نکلے، سیکڑوں نے ایم اے کی ڈگریاں لیں۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن نتیجہ؟

کیا کوئی علمی جماعت پیدا ہوئی؟ کوئی مسئلہ حل ہوا؟ کسی نے کچھ اجتہاد کیا؟ کوئی مصنف پیدا ہوا؟ قومی منبر پر کوئی خطیب نظر آیا؟ کسی کے قلم نے انشاپردازی کے معرکے فتح کیے؟

تم کہو گے کہ یہ ہماری ناانصافی ہے، ایک نوعمر گروہ سے ایسے فتوحات عظیمہ کی توقع خود ہماری

خام خیالی ہے - بے شبہ تم سچ کہتے ہو - سوالات مذکورہ کو یوں بدل دینا چاہیے -

کیا علمی مذاق کا کوئی گروہ پیدا ہوا؟ یورپ کی کسی فلسفیانہ کتاب کا ترجمہ ہوا؟ علوم جدیدہ کے کچھ مسائل قوم کی زبان میں شائع ہوئے؟ کوئی علمی پرچہ نکلا؟ اسلام پر یورپ نے جو سیکڑوں نادر تصنیفات و مضامین لکھے اس میں سے کچھ اردو زبان میں آیا؟ تم کہو گے کہ سوالات مذکورہ کا معیار اور گھٹانا چاہیے - ہم اس کو بھی تسلیم کر لیتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ یورپ نے مذہب اسلام اور اسلامی لٹریچر پر، عربی اور فارسی پر، عرب کے جغرافیہ پر، فلسفہ اسلام پر، مسلمانوں کی تاریخ پر سیکڑوں نادر کتابیں اور رسالے لکھے، نئے گروہ کو ان میں سے کس قدر معلوم ہے؟ مسلمانوں کی سیکڑوں عجیب و غریب نادر تصنیفات کو یورپ نے شائع کیا ہے، اس کی ان لوگوں کو خبر ہے؟ جرمنی میں مسلمانوں کے خاص علوم و فنون پر جو انسائیکلوپیڈیا لکھی جا رہی ہے کیا اس سے ان کو واقفیت ہے؟ پروفیسر ڈوزی نے دو ضخیم جلدوں میں تمام عربی مولد الفاظ کی ڈکشنری پچاس برس کی محنت میں لکھی، کیا ان لوگوں نے اس کو دیکھا ہے؟ گب میموریل سیریز، جن کے ذریعے سے خاص عربی اور فارسی کی قدیم نادر کتابیں شائع کی جا رہی ہیں، اس سے ان کو واقفیت ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اپنے علوم، اپنے فنون، اپنی تاریخ، اپنا تمدن، سب کچھ فدیہ دے کر ایک نوکری پیشہ گروہ پیدا کیا ہے اور نازاں ہیں کہ:

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

لیکن ان سب حالات کے ساتھ سوال یہ ہے کہ چارہ کار کیا ہے؟ کیا ہم کو اس درد کا علاج پرانے طریقے کے مدارس میں ڈھونڈھنا چاہیے؟ کیا وہاں کچھ تحقیق کا پرتو نظر آئے گا؟ کوئی مشکل حل ہوگی؟ لفظوں کے گورکھ دھندوں کے سوا اور کچھ ہاتھ آئے گا؟ قدما کی تحقیقات کا نشان ملے گا؟ ابن ہیثم نے فن مناظرہ پر جو اضافہ کیا، فارابی نے فن موسیقی میں جو ترقیاں کیں، خیام نے جبر و مقابلہ پر جو کچھ لکھا، ابن مسکویہ نے جو تاریخی تحقیقاتیں کیں، ان میں سے کسی چیز کا پتا لگے گا؟ کچھ بھی نہیں - ہمارے مولویوں کے تو کان بھی ان سوالوں سے آشنا نہ ہوں گے -

غرض موجودہ حالات کے لحاظ سے تو ان دونوں گروہوں میں سے کوئی گروہ ہمارے کام کا نہیں" (۶۰)-

اسی مضمون کے آخر میں لکھتے ہیں:

"مسلمانوں میں علمی گروہ وہی بن سکتا ہے جو اسلامی علوم کے ساتھ تحقیقات حال سے بھی ناآشنا نہ ہو - چناں چہ بلاد اسلامیہ نے مدت کے تجربے کے بعد اس نکتے کو سمجھا اور اسی بنا پر قاہرہ میں ایک یونیورسٹی قائم کی گئی جس کا نام جامعہ مصریہ ہے - تاہم اس یونیورسٹی میں یہ کمی ہے کہ اس میں خالص مذہبی علوم یعنی تفسیر و حدیث نہیں پڑھائے جاتے - اس جبر کی تلافی کی اگر امید ہو سکتی ہے تو حیدر آباد سے ہو سکتی ہے، جس نے دار العلوم کو وسیع پیمانے پر قائم کرنا چاہا ہے - ندوے کے تہی مایہ دار العلوم نے اس مقصد کو پیش نظر رکھا ہے اور اب اس کی کامیابی کے نہایت ابتدائی آثار نظر آنے لگے ہیں (۶۱)-"

قوم کی اصلاح کے لیے مولانا کی اس اصلاحی مگر کڑوی تنقید کی برداشت انگریزی داں طبقہ کر سکا اور نہ علما کا گروہ ہی تاب لا سکا۔ جدید طبقے نے اس کو علی گڑھ کالج پر اعتراض سمجھا اور قدیم طبقے نے دینی تعلیم پر حملہ۔ جدید طبقے کو غلط فہمی یہ ہوئی کہ مولانا قدیم طرز کی تعلیم حاصل کیے ہوئے ہیں، اسی کے دلداہ اور ہمنوا ہیں، علی گڑھ کالج میں باوجود پروفیسر رہنے کے اس پر اعتراضات کی بوچھار کرتے رہتے ہیں اور اس کے وجود کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور علما کو غلط فہمی یہ ہوئی کہ یہ علی گڑھ کالج میں رہ چکے ہیں۔ علی گڑھ اور اس کے بانی کی ہمنوائی کی ہے اور وقتاً فوقتاً اس کی تعریف کرتے رہتے ہیں، اس لیے اپنے نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ تھی کہ علی گڑھ کے لوگ مولانا کے خلاف ہو گئے اور علما بھی مولانا سے بھڑکنے لگے اور مولانا کا وجود ندوے کے لیے نقصان دہ سمجھنے لگے، ان کی اصلاحی اسکیموں میں روڑے اٹکانے لگے اور رخنے ڈالنے لگے، ان کے خلاف مختلف پروپیگنڈے ہونے لگے مگر کوئی گروہ بھی سامنے نہیں آتا تھا کیوں کہ مولانا دونوں گروہوں کی دکھتی رگ سے واقف تھے۔ مولانا کی علمی خدمت، سوجھ بوجھ، قابلیت، جدید و قدیم تعلیم سے واقفیت اور عام شہرت کی وجہ سے مانگ ہر جگہ انھیں کی تھی۔ مولانا کی اسکیمیں سکہ رائج الوقت کا کام دے رہی تھیں، گو جدید و قدیم گروہ اس کی قدر و قیمت سے واقف نہ تھے۔ بعض قدیم بزرگوں کو ان کی اسکیم سے واسطہ نہ تھا، مگر رشک تھا ان کی قابلیت پر اور حسد تھا ان کی شہرت اور عزت پر، اس لیے ندوے ہی سے ان کے اکھاڑنے کی فکر تھی اور آخر ان کی کوشش کامیاب ہوئی اور ندوہ سے ۱۹۱۳ء میں ان کو ہٹنا پڑا۔ مسلمانوں کی تاریخ میں بہت سے واقعات ہیں جن میں قوم نے اپنے اکابر کی قدر نہ کی اور جب وہ نعمت ان سے چھن گئی تو پھر قدر ہوئی۔ مولانا کے لیے ایک ہی مثال خاصی وزنی ہے کہ ان کی سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کو علما پڑھنے کو بھی آمادہ نہیں ہوئے اور آج اسی کی قدر علما کرتے ہیں (۶۲)۔ لیکن مولانا کا جدید قدیم تعلیم کے متعلق جو نظریہ ۱۸۹۲ء (مصر و روم و شام کے سفر کا زمانہ) میں قائم ہوا تھا اور جس کا اظہار انھوں نے سفرنامے میں اور ۱۸۹۴ء میں ندوے کے جلسے میں کیا، اس کی ترویج اور تائید اور عملی شکل دینے میں ۱۹۰۹ء میں بھی لگے ہوئے تھے۔ چناں چہ مندرجہ بالا اقتباس میں بھی بڑے زور و شور سے اس کا اظہار ہے، جو ان کے اپنے ذہن کی پیداوار ہے۔ ان جملوں کو دوبارہ پیش کیا جاتا ہے۔

"مسلمانوں میں علمی گروہ وہی بن سکتا ہے جو اسلامی علوم کے ساتھ تحقیقات حال سے بھی ناآشنا نہ ہو۔"

مولانا نے الندوہ کے جون کے شمارہ میں ایک مضمون (مصر کی یونیورسٹی) لکھا۔ اس میں بھی علما اعتراضات کا نشانہ ہیں لکھتے ہیں:

"یونیورسٹی کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ اپنے یہاں کے طلبہ کو خاص خاص علوم و فنون کی تکمیل کے لیے یورپ کی یونیورسٹیوں میں بھیجتے رہیں۔ اس سے پہلے ایک جماعت جا چکی ہے اور اب دوسری جماعت عن قریب روانہ ہوگی۔ قاعدہ یہ ہے کہ جو طلبہ اس غرض کے لیے تیار ہوتے ہیں ان کا مختلف علوم و فنون میں ایک خاص امتحان لیا جاتا ہے۔ چناں چہ علم و ادب کے چند سوالات ہم اس غرض سے المؤید سے نقل کرتے ہیں کہ ہمارے یہاں کے علما اندازہ کر سکیں کہ اب علم ادب پر کن حیثیتوں سے نگاہ ڈالی جاتی ہے اور فن ادب کے کمال کے لیے کس قسم کے معلومات ضروری ہیں (۲۳)۔"

الندوہ کے جون کے شمارے میں ایک مضمون اور لکھا جس کا عنوان "تجارب الامم ابن مسکویہ، گب میموریل سیریز" تھا۔ اس میں لکھتے ہیں:

"اس کتاب کا مصنف علامہ ابن مسکویہ ہے جو مشہور حکیم اور فلاسفر تھا۔ اس کی کتاب الطہارۃ ہیں سے امام غزالی نے احیاء العلوم میں اکثر موقعوں پر فائدہ اٹھایا ہے، چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔ الٰہیات میں اس کی کتاب فوز الاصغر نہایت اعلیٰ درجے کی تصنیف ہے اور جس قدر اسلامی تصنیفات اس موضوع پر ہماری نظر سے گزر چکی ہیں ان میں سے ایک بھی اس کی ہم سری کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ ابن مسکویہ عضد الدولہ اور اس کے جانشینوں کے دربار میں نہایت معزز منصب پر ممتاز تھا۔ اس نے ۴۲۱ھ میں وفات پائی (۲۴)۔"

الندوہ کے اگست یا ستمبر ۱۹۰۹ء کے شمارے میں مولانا نے ایک مضمون یورپ کا ایک اور علمی احسان، عمر خیام کا جبر و مقابلہ لکھا، جس میں وہ لکھتے ہیں:

"عمر خیام کو ہم جس حیثیت سے جانتے اور پہچانتے تھے وہ یہ تھی کہ وہ شاعر ہے، رباعی گو ہے اور زیادہ سے زیادہ یہ کہ آج کل کے مذاق کے موافق آزاد خیال ہے تاریخوں اور تذکروں میں اس کی ریاضی دانی کا ذکر ضرور ہے، لیکن ہمارے خیال میں وہ اسی قسم کی بات تھی کہ علامہ ابن الہمام شارح ہدایہ موسیقی بھی جانتے تھے لیکن یورپ کے بدولت آج ہم کو عمر خیام کی وہ کتاب ہاتھ آئی جس سے اس کے ریاضی دان اعظم ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

مسلمانوں نے خود کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ وہ علم جبر و مقابلہ کے موجد ہیں،

لیکن اس فن میں ان کے اس قدر انکشافات (ڈسکوریز) ہیں کہ اس نام سے ان کی عام شہرت ہو گئی ہے۔ اس فن میں سب سے پہلے ابو موسیٰ خوارزمی نے ایک کتاب لکھی۔ عربی داں تو اس سے آج بھی ناواقف ہیں، لیکن انگریزی میں مدت ہوئی اس کا ترجمہ ہو گیا اور اصل عربی کے ساتھ چھپ کر شائع ہوا، چناں چہ ہماری نظر سے بھی گزرا ہے۔ ابو موسیٰ کے بعد اور لوگوں نے بھی اس فن میں کتابیں لکھیں اور غالباً سب سے اخیر مجتہدانہ کتاب عمر خیام کا جبر و مقابلہ ہے جو اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ عمر خیام کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ قدما کی تصنیف اس کو نہیں ملی تھی۔ ہندوستان کے ریاضی دانوں نے البتہ کچھ قاعدے لکھے تھے، لیکن وہ محض ابتدائی باتیں تھیں" (۶۵)۔

مولانا نے ستمبر ۱۹۰۹ء میں ایک مضمون جذب یا کشش پر لکھا اس میں وہ لکھتے ہیں:

"سر آئزک نیوٹن یورپ کا مشہور فلاسفر ہے، جو ۱۶۴۲ء میں پیدا ہوا اور ۱۷۲۷ء میں وفات پائی۔ یورپ کا خیال ہے کہ مسئلہ، کشش، یعنی یہ کہ ہر جسم دوسرے جسم کو اپنی طرف کھینچتا ہے، اسی فلسفی کی ایجاد ہے اور سیکڑوں فلسفیانہ مسائل اسی مسئلے پر مبنی ہیں۔"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسئلہ، کشش مختلف صورتوں میں مدت دراز سے تسلیم ہوتا چلا آتا ہے۔ یہ نہایت قدیم خیال ہے کہ ہر شے اپنے مرکز کی طرف کھنچتی ہے اسی بنا پر یونانی یہ خیال کرتے تھے کہ ڈھیلا جب اوپر پھینکنے کے بعد زمین پر گرتا ہے تو اس وجہ سے گرتا ہے کہ اس کا مرکز یا جز طبعی زمین ہے۔ اس لیے زمین اس کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اس مسئلے کو غلطی سے یونانیوں نے بے موقع بھی وسعت دی، مثلاً یہ کہ آگ کا شعلہ اس لیے اوپر اٹھتا ہے کہ آگ کا مرکز زمین سے اوپر ہے اور اسی لیے شعلہ اپنے مرکز کی طرف جانا چاہتا ہے۔ حالاں کہ اس کی وجہ یہ نہیں بلکہ یہ وجہ ہے کہ ہلکی چیز بھاری چیز کے اوپر رہتی ہے (۶۶)۔

الندوہ کے ستمبر کے شمارے میں مولانا نے ایک مضمون "وقف اولاد کی کارروائی کہاں تک پہنچی" لکھا، جس میں لکھتے ہیں:

"خدا کا شکر ہے کہ اس تحریک کی طرف قوم نے امید سے زیادہ توجہ کی۔ اس قدر لوگوں کو معلوم ہو گا کہ اس وقت تک تحریک کے متعلق کاغذات ذیل شائع ہو چکے اور ہو رہے ہیں۔

۱۔ فتاویٰ علمائے ہندوستان کے متعلق صحت مسئلہ وقف اولاد (اس مسئلے میں سنی و شیعہ فریق کے علما نے اتفاق کیا)۔

۲- رسالہ وقف اولاد جس میں پریوی کونسل کی غلط فہمی کے وجوہ ظاہر کیے گئے ہیں اور اصل مسئلہ قرآن مجید اور حدیث اور فقہ سے ثابت کیا گیا ہے (یہ رسالہ ۸ آنے قیمت پر ملتا ہے)۔

۳- مختصر کارروائی جس میں ملک کے قابل اور لائق قانون دانوں اور مدبروں کی رائیں اس تحریک کی کامیابی کے متعلق درج کی گئی ہیں۔

۴- فارم جس پر ہندوستان کے مسلمانوں سے دستخط کرانے ہیں۔

ان کاغذات کے شائع کرنے پر تمام اطراف سے ہمدردی اور اظہار اعانت کے خطوط آئے۔ نہایت کثرت سے لوگوں نے فارم طلب کیے اور ان پر دستخط کرا کر بھیجتے جاتے ہیں (۶۷)۔

مضمون کے آخر میں اس طرح لکھتے ہیں:

"اب حسب ذیل کارروائیوں کی ضرورت ہے:

۱- تمام بڑے بڑے شہروں میں انجمن وقف کی شاخیں قائم ہو جائیں۔

۲- فارموں پر کم از کم ایک لاکھ دستخط حاصل کیے جائیں۔

۳- نہایت ضروری اور مقدم امر یہ ہے کہ علما کے فتاوے اور رسالہ وقف کا انگریزی میں ترجمہ کیا جائے۔ ابھی تک اس کا معقول انتظام نہیں ہوا کیوں کہ ایسے لوگ جو عمدہ انگریزی لکھ سکتے ہوں اور فقہی اصطلاحات سے واقف ہوں کم ہیں اور جو ہیں ان کو اپنے اشتغال سے فرصت نہیں۔ ناظرین سے ہم درخواست کرتے ہیں کہ ایسے لائق اشخاص کے نام سے ہم کو مطلع کریں کہ ان کی خدمت میں درخواست کی جائے۔ ترجے کا معقول معاوضہ دیا جائے گا (اگر وہ معاوضہ لینا منظور کریں گے)۔

۴- تمام کارروائی کے انجام دینے کے لیے کم از کم چار ہزار روپے کی ضرور ہو گی اس لیے اس قدر سرمایہ بہم پہنچانے کی کوشش کی جائے گی (۶۸)۔"

اکتوبر ۱۹۰۹ء میں مولانا محمد فاروق چریاکوٹی نے انتقال کیا۔ چوں کہ وہ مولانا کے استاد تھے، اس لیے مولانا نے اکتوبر ہی میں ایک تعزیتی مضمون لکھا جو نومبر کے الندوہ کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس میں لکھتے ہیں:

"اساتذہ قدیم میں سے صرف دو شخص باقی رہ گئے تھے، مولانا لطف اللہ صاحب اور مولانا محمد فاروقی صاحب چریاکوٹی، اور افسوس ہے کہ ان دو میں سے بھی ایک نے اپنی جگہ خالی کر دی، یعنی مولانا محمد فاروق صاحب نے ۲۸- اکتوبر ۱۹۰۹ء کو انتقال کیا انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانائے موصوف چریاکوٹ کے رہنے والے تھے جو اعظم گڑھ کے ضلع میں ایک مردم خیز قصبہ ہے۔ انھوں نے اپنے بڑے بھائی مولوی عنایت رسول صاحب اور مولانا محمد یوسف صاحب فرنگی محلی اور مولوی نعمت اللہ صاحب فرنگی محلی سے تمام علوم کی تکمیل کی تھی۔ علم و ادب اگرچہ بطور خود حاصل کیا تھا تاہم بہت بڑے ادیب اور ناظم و ناثر تھے (۶۹)۔"

مضمون کے آخر میں لکھتے ہیں:

"میں نے معقولات کی تمام کتابیں مثلاً میر زاہد، ملا جلال مع میر زاہد، حمد اللہ، شرح مطالع، صدرا، شمس بازغہ ان ہی سے پڑھیں اور میری تمام کائنات ان ہی کے افادات ہیں۔ فارسی کا مذاق بھی ان ہی کا فیض ہے۔ اکثر اساتذہ کے اشعار پڑھتے اور ان کے سخن میں شاعری کے نکتے بتاتے (۷۰)۔"

مولانا نے اکتوبر ۱۹۰۹ء میں زیب النساء پر ایک مضمون لکھا، جو الندوہ میں شائع ہوا۔ اس مضمون کے لکھنے کا سبب مولانا خود اس طرح لکھتے ہیں:

"بمبئی کے سفر میں ایک عزیز دوست نے جو انگریزی تصنیفات پر زیادہ اعتماد رکھتے ہیں، انڈین میگزین اینڈ ریویو کا ایک آرٹیکل دکھلایا جو زیب النساء کی سوانح عمری کے متعلق تھا۔ مجھ کو افسوس ہوا کہ ایک ایسے معزز پرچے کا سرمایہ معلومات تمام تر بازاری قصے تھے، جس میں ایک شرمناک قصہ عاقل خان رازی کا بھی ہے۔ اس سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ خود مسلمانوں میں بازاری اہل قلم نے زیب النساء کے جو حالات تجارتی غرض سے قلم بند کیے وہ بالکل بے سروپا ہیں۔ اسی بنا پر خیال ہوا کہ زیب النساء کے متعلق صحیح معلومات یک جا کر دیے جائیں۔ موصوف الذکر دوست نے وعدہ کیا ہے کہ اس کو انگریزی میں منتقل کر دیں گے، جس سے فائدہ ہو گا کہ غلط معلومات کی اصلاح ہو جائے گی۔

انگریزی مصنفوں کی غلطیاں جو عالمگیر ہو جاتی ہیں اس کی یہی وجہ ہے کہ کوئی شخص اس کی پردہ دری نہیں کرتا اور کرتا ہے تو ایسی زبان میں جس کی ان کو خبر تک نہیں ہوتی۔ اس لیے سلسلہ بہ سلسلہ وہ غلطیاں پھیلتی جاتی ہیں اور ان سے مسلمانوں کے اخلاق اور عادات کی نسبت نہایت برے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔

ایک عزیز دوست کی خاطر سے مجھ کو اپنے دائرہ تحریر سے ہٹنا پڑا ہے، لیکن میں اس بے اصولی سے شرمندہ نہیں ہوں (۷۱)۔"

زیب النساء کے متعلق اپنے مضمون میں اس طرح لکھتے ہیں:

"عالمگیر زیب النساء کی نہایت عزت کیا کرتا تھا - جب وہ کہیں باہر سے آتی تھی تو اس کے استقبال کے لیے شہزادوں کو بھیجتا تھا - سفر و حضر میں اس کو ساتھ رکھتا تھا - کشمیر کے دشوار سفر میں بھی وہ ساتھ تھی - لیکن جب عالمگیر دکن گیا تو اس نے غالباً اپنی بڑھاپے کی وجہ سے پائے تخت کو چھوڑنا مناسب نہ سمجھا - اس کی چھوٹی بہن زینت النساء عالمگیر کے ساتھ گئی، چناں چہ اس کا نام بار بار واقعات میں آتا ہے - زیب النساء نے دلی میں قیام کیا اور وہیں پیوند زمین ہو گئی - زیب النساء نے ۱۱۱۳ھ میں، جو عالمگیر کی حکومت کا اڑتالیسواں سال تھا، دلی میں انتقال کیا - "او مخلی جنتی" مادہ تاریخ ہے (۷۲) -"

مولانا کی ایک فارسی غزل مخزن (لاہور)، جنوری ۱۹۰۹ء میں تازہ غزل کے عنوان سے شائع ہوئی - اس غزل کے چند اشعار مولانا کی فارسی غزل مطبوعہ کلیاتِ شبلی فارسی (۷۳) میں بھی شامل ہیں، مگر چوں کہ پوری غزل کلیاتِ شبلی میں نہیں ہے اس لیے مخزن (لاہور) کی پوری غزل نقل کی جاتی ہے -

من کہ دربند غم دشوار وآساں نیستم   ہیچ باک از خصمی گردون گرداں نیستم
شیوۂ کفر ارچہ حدے چوں منے بنود ولے   من بایں شادم کہ آخر خود مسلماں نیستم
گر لب جاں بخش جاناں چارہ فرمائی کند   من بروں آیم ازیں دعویٰ کہ درماں نیستم
فرصتم بادا کہ باِرندی و مستی خو کنم   چوں رہ و رسم ریارا مرد میداں نیستم
گرچہ خود دانم کہ چنداں عاقل و دانا نیم   بازہم چوں ناصح کم مایہ ناداں نیستم
آسمان طرفے نہ خواہد بست درسودائے دامن   زاں کہ اودوں طبع ومن ایں مایہ ارزاں نیستم
شاعری ازمن مجو دور از سواد بمبئی   حالیا شبلی شدم رند غزل خواں نیستم (۷۴)

اور کلیاتِ شبلی فارسی میں چند اشعار کی شمولیت کے ساتھ یہ غزل اس طرح ہے:

ایں قدر (۷۵) دانم کہ گبرم یا مسلماں نیستم   ایں قدر دانم کہ زاہد آنچہ ہست آں نیستم
آسماں طرفے نہ خواہد بست در سودرے من   زاں کہ اودوں طبع ومن ایں مایہ ارزاں نیستم
پایۂ کفر ارچہ حدے چوں منے بنود ولے   من بہ ایں شادم کہ آخر ہم مسلماں نیستم
لعل جاں بخش توام گر چارہ فرمائی کند   من ازیں دعوی بروں آیم کہ درماں نیستم
گرچہ خود دانم کہ چنداں عاقل و دانا نیم   بازہم چوں ناصح بے مایہ ناداں نیستم
ہندوی زلفش چرا دامن ہمی چیند زمن   اندکے ہم کافرم چنداں مسلماں نیستم

فرصتم بادا کہ مستی و رندی خو کنم | چوں رہ و رسم ریا را مرد میداں نیستم
شاعری از من مجو دور از سواد بمبئی | حالیا شبلی شدم رند غزل خواں نیستم (۷۶)

مارچ ۱۹۰۹ء کے مخزن (لاہور) میں مولانا کی فارسی نظم مندرجہ ذیل عبارت کے ساتھ شائع ہوئی۔

"خط منظوم"

شمس العلماء مولانا شبلی اپنے ایک غیر زباں داں دوست کے خط کی داد، جس کی اردو صحیح اور بامحاورہ تھی، ذیل کی نظم میں دیتے ہیں:

دی یکے گفت کہ در ریختہ انشائے سخن | شیوہء ہست کہ مخصوص زباندان باشد
گفتم البتہ چنیں ایست کہ گفتی، اما | نیست کارے کہ بروں از حد امکاں باشد
مرد دانا بتواند کہ بہ تحصیل و بہ سعی | با عرب حرف زند، گرچہ زایراں باشد
مادریں حرف، کہ پیکے برسانید بہ من | نامہء راکہ گراں مایہ تراز جاں باشد
نامہ وا کردم و بازش بسپردم کہ بہ بیں | ایں چنیں حرف دل آویز نہ آساں باشد
نامہ را خواند و بفرمود کہ شک نیست دریں | کایں چنیں حرف زدن کار زباندان باشد
کہ بود؟ صاحب ایں نامہ و اصلش ز کجاست | اعتبار گہر از فرخی کاں باشد
گفتمش ریختہء خامہ .... ہست ایں | کز دکن ہست و مرا بچو عزیزاں باشد
یارب آں دست و قلم در کنف حفظ تو باد | تاجہاں باشد و تاگنبد گرداں باشد (۷۷)

مخزن کے نومبر ۱۹۰۹ء کے شمارہ میں ایک اور غزل شائع ہوئی، جس کا مطلع یہ ہے:

تا نرگس تو عربدہ انگیز بودہ است | ایں مملکت حسن بلا خیز بودہ است

مقطع:

ہر چند غلط نیست کہ شبلی دل و دیں باخت | ایں حرف ولے مصلحت آمیز بودہ است (۷۸)

شعرالعجم کا دوسرا حصہ اسی سال شائع ہوا۔ اس کے شروع میں مولانا اس طرح لکھتے ہیں:

"شاعری بلکہ تمام اسلامی علوم و فنون کا جوش شباب تھا کہ دفعتہً تاتار کی طرف سے اس زور کا طوفان اٹھا کہ دنیا کا شیرازہ بکھر گیا۔ یعنی ۶۱۷ھ میں چنگیز خان نے تاتار سے نکل کر خراسان سے شام تک کا علاقہ بے چراغ کر دیا۔ کم و بیش چالیس

لاکھ آدمیوں کا خون بہہ گیا۔ سیکڑوں ہزاروں شہر خاک کا ڈھیر بن گئے۔ مدرسوں اور خانقاہوں کی اینٹ سے اینٹ بج گئی، علمی خزانوں کا ایک ایک ورق اڑ گیا، لیکن اسلام کچھ ایسا سخت جان تھا کہ ان ہنگاموں میں بھی زندہ بچ گیا، بلکہ جوں ہی یہ طوفان تھمنا شروع ہوا، دبی ہوئی چنگاریاں پھر چمکیں اور چمک کر اس طرح مشتعل ہوئیں کہ ایک دفعہ پھر:

عالم تمام مطلع انوار ہو گیا

چنگیز خاں ایک غارت گر کی شان سے اٹھا تھا اور اپنے فوری اور سرسری انتظامات کے لیے اس نے کچھ قاعدے بھی بنا لیے تھے جو تورہ، چنگیز خانی کے نام سے مشہور ہیں۔ لیکن جب سلطنت کو استقلال ہوا تو شاہانہ نظم و نسق کی ضرورت پڑی۔ تاتاری لوٹ مار کے سوا اور کچھ جانتے نہ تھے، اس لیے مسلمانوں سے اعانت لینے کے سوا چارہ نہ تھا۔ چنگیز خان کے بعد اس کا بیٹا اوکتائی قاآن اور اس کے بعد چنگیز خان کا پوتا ہلاکو بن تولی بن چنگیز خان تخت نشین ہوا۔ ہلاکو نے محقق طوسی کو وزارت کا منصب دیا رفتہ رفتہ مسلمانوں نے دربار پر قبضہ کر لیا یہاں تک کہ اس کا بیٹا تکودار دار خواجہ شمس الدین محمد وزیر سلطنت کی ترغیب سے مسلمان ہو گیا اور اپنا نام احمد رکھا۔ ترک اس پر بگڑ گئے اور ارغون خان (ہلاکو خان کا دوسرا پوتا) کی افسری میں احمد خان کو گرفتار کر کے ۶۸۰ھ میں قتل کر دیا، لیکن جب ارغون خان کا بیٹا غازان خان ۶۹۴ھ تخت حکومت پر بیٹھا تو وہ بھی مسلمان ہو گیا اور اس کے ساتھ ساٹھ ہزار ترک مسلمان ہو گئے۔ غازان ۷۰۳ھ میں مر گیا۔ اس کے بعد اس کا بھائی خدا بندہ، اس کے بعد اس کا بیٹا سلطان ابو سعید بادشاہ ہوا۔ یہ تمام سلاطین نہایت عادل، انصاف پسند، اور دبدبہ دار تھے، بالخصوص سلطان ابو سعید کے عدل و انصاف اور نظم و نسق کے قواعد اور آئین، مساجد اور مدارس پراگندہ ہو کر مدتوں قائم رہے یہاں تک کہ اوحدی کرمانی نے، جو مشہور صوفی گزرے ہیں، اپنی مثنوی بنام جم میں ابو سعید کی اس طرح مدح سرائی کی ہے:

دو جہاں را صلائے عید زدند سکہ بر نام بو سعید زدند
در چمن گفت بلبل و قمری مدح ایں گلبن و نوا لا مری" (۷۹)

آگے چل کر اس طرح لکھتے ہیں:

"مذکورہ بالا واقعات میں ہمارے کام کی جو باتیں ہیں حسب ذیل ہیں:

۱۔ تاتار کے قتل عام میں جو بے شمار جانیں ضائع ہوئیں، اس نے مسلمانوں کے شجاعانہ جذبات کو فنا کر دیا۔ اس کا شاعری پر یہ اثر ہوا کہ رزمیہ نظمیں ہمیشہ کے لیے

معدوم ہو گئیں - شاعری کے فرائض پورے کرنے کے لیے متعدد رزمیہ مثنویاں لکھی گئیں - مثلاً ہمای ہمایوں خواجوی کرمانی، آئینہ، سکندری امیر خسرو، سکندرنامہ جامی، تیمور نامہ ہاتفی، شاہنامہ قاسم گونابادی، اکبرنامہ فیضی، لیکن صاف نظر آتا ہے کہ کہنے والے منہ چڑھاتے ہیں - دل میں کچھ نہیں - قوم اس قدر افسردہ ہو گئی تھی کہ ان کتابوں کے دو شعر بھی زبان پر نہ رہ سکے -

۲- عام قاعدہ ہے کہ مصیبت میں خدا زیادہ یاد آتا ہے، اس لیے اس عہد میں تصوف کا زیادہ زور ہوا - عطار، مولانا روم، اوحدی، عراقی، سعدی، مغربی، انہی اسباب کے نتائج ہیں -

۳- جنگی جذبات کے فنا ہونے نے طبیعتوں میں انفعالی اثر زیادہ پیدا کیا جو تصوف کے سوا ایک اور رنگ میں ظاہر ہوا، یعنی غزل گوئی - یہ مسلم ہے کہ غزل جس چیز کا نام ہے اس کی ابتدا شیخ سعدی اور ان کے معاصرین سے ہوئی، یہ اسی کا اثر ہے -

تاتار اور تیمور کی عام سفاکی نے قوموں کی قومیں غارت کر دیں - بڑے بڑے کج کلاہوں اور اورنگ نشینوں کا تاج و تخت خاک میں ملا دیا، خراسان سے لے کر شام تک زمین و آسمان میں سناٹا ہو گیا، ام الدنیا بغداد کی اینٹ سے اینٹ بج گئی، تمام بڑے بڑے پائے تختوں میں خاک اڑنے لگی، کم از کم چالیس ساٹھ لاکھ آدمی ایک دم سے فنا ہو گئے - ان امور نے دنیا کی بے ثباتی اور انقلابات کا ایسا نقشہ کھینچ دیا تھا جو مدت تک آنکھوں کے سامنے پھرتا رہا - اس بنا پر دنیا کی بے ثباتی کے مضامین زیادہ تر اشعار میں آنے لگے - شیخ سعدی، ابن یمین، خواجہ حافظ کے ہاں ان مضامین کی بہتات اسی بنا پر ہے - ان لوگوں نے یہ سماں خود آنکھوں سے دیکھا تھا، وہی زبان پر آیا اور پھر ایک روش قائم ہو گئی اور سب اسی انداز میں کہنے لگے -

۴- [illegible] اور مغل بادشاہ اگرچہ اکثر نہایت مدبر اور عادل تھے اور اس لیے ان کے عہد میں عام امن و امان رہا - لیکن جو مشہور شعرا ہیں، مثلاً سعدی، خواجہ حافظ، مولانا روم، اوحدی، ابن یمین کسی دربار سے خاص تعلق نہ رکھتے تھے، نہ سلطنت سے ان کو کوئی خطاب حاصل تھا -

۵- اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری میں فی الجملہ آزادی کی روح آئی - سعدی اور ابن یمین کے قصائد اور قطعات میں جو خوشامدانہ اور بے ہودہ مداحی کی جابجا عیب گیری پائی جاتی ہے، وہ اسی کا اثر ہے -

۶- تیموریہ خاندان جو ایران میں قائم ہوا، اس کا خاتمہ سلطان حسین مرزا پر ہوا - وہ عادل اور ہنرپرور ہونے کے ساتھ شعر و شاعری کا نہایت فریفتہ اور قدرداں تھا -

اس لیے اس کے عہد میں شاعری اس کثرت سے پھیلی کہ بچہ بچہ شاعر بن گیا(۸۰)۔
اس دور کی شاعری کے متعلق مولانا اس طرح رقم طراز ہیں:
"اس دور میں شاعری میں اصنافِ ذیل کو ترقی ہوئی:

تصوف: عطار، مولانا روم، اوحدی، عراقی و مغربی
غزل: مولانا روم، شیخ سعدی، امیر خسرو، حسن، خواجہ حافظ
اخلاق و موعظت: شیخ سعدی، ابن یمین
قصیدہ گوئی: کمال اسمٰعیل، ساوجی (۸۱)

حواشی:

۱۔۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۱۷۳ تا ۱۷۳، ۱۲ جنوری ۱۹۰۹ء۔
۲۔۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۷۲، ۲۳-جنوری ۱۹۰۹ء۔
۳۔۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۲۱۸، ۲۵-جنوری ۱۹۰۹ء۔
۴۔۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۲۱۹، حیدر آباد سے
۵۔۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۷۲ تا ۷۳، ۶-فروری ۱۹۰۹ء۔
۶۔۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۲۱۹، ۷-فروری ۱۹۰۹ء۔
۷۔۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۷۳، ۱۳-فروری ۱۹۰۹ء۔
۸۔۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۲۲۰، ۲۱-مارچ ۱۹۰۹ء۔
۹۔۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۲۲۰، ۲۳-اپریل ۱۹۰۹ء۔
۱۰۔۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۲۲۱، ۲۸-اپریل ۱۹۰۹ء۔
۱۱۔۔۔۔ بٹیروں کی لڑائی کو پالی کہتے ہیں۔
۱۲۔۔۔۔ جلسہ انتظامیہ ندوۃ العلماء منعقدہ ۱۶- ربیع الثانی ۲۰ھ مطابق ۲۳-جولائی ۱۹۰۲ء کو مولوی خلیل الرحمن سہارنپوری کی صدارت میں جلسہ ہوا۔ منشی اطہر علی صاحب خان بہادر نے تحریک کی کہ مولوی شبلی صاحب نعمانی کو ندوۃ العلماء کے جلسوں میں تقریر کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ کثرت رائے سے طے ہوا کہ ان کو تقریر کی اجازت دی جائے (رجسٹر نمبر ۲- قلمی صفحہ ۱۸ دفتر ندوۃ العلماء)۔ اس قسم کی تحریکیں ان کے خلاف اٹھتی رہتی تھی۔
۱۳۔۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۲۲۱ تا ۲۲۲، ۸-مئی ۱۹۰۹ء۔
۱۴۔۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۲۲۲، ۳-جون ۱۹۰۹ء۔
۱۵۔۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۲۲، ۱۸-جون ۱۹۰۹ء۔
۱۶۔۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۱۳۳، ۲۵-جون ۱۹۰۹ء۔

۱۷ .... مکاتیب اول، صفحہ ۲۲۱، ۱۸-جولائی ۱۹۰۹ء۔
۱۸ .... مکاتیب اول، صفحہ ۳۴۴، ۲۹-جولائی ۱۹۰۹ء۔
۱۹ .... مکاتیب اول، صفحہ ۳۴۱، ۲-اگست ۱۹۰۹ء۔
۲۰ .... مکاتیب اول، صفحہ ۳۴۴، ۴-اگست ۱۹۰۹ء۔
۲۱ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۲۳، ۱۲-اگست ۱۹۰۹ء۔
۲۲ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۳۱، ۲۷-اگست ۱۹۰۹ء۔
۲۳ .... صحیفۂ محبت یعنی مہدی افادی کے خطوط اپنی بیگم کے نام کے مقدمے میں محمود الٰہی صدر شعبہ، اردو گورکھپور یونیورسٹی صفحہ ۱۲ پر اس طرح لکھتے ہیں: "اکتوبر ۱۹۰۹ء میں انھوں نے دوسری بیوی کی موجودگی میں ایک اور شادی کی" حالاں کہ مولانا نے احرام جدید کی داد ۱۲- ستمبر ۱۹۰۹ء کے خط میں دی ہے - احتمال یہ ہے کہ محمود الٰہی صاحب کو مہدی بیگم اپنی شادی کا مہینہ اپنی کبر سنی، بھول اور بدحواسی (عمر کی زیادتی) کی وجہ سے صحیح نہ بتا سکی ہوں گی، اندازے سے مہینہ بتادیا ہو گا- گمان غالب یہی ہے کہ ستمبر میں شادی ہوئی-
۲۴ .... مہدی حسن کی دوسری بیوی (پہلی بیوی کے انتقال کے بعد یہ شادی کی تھی)-
۲۵ .... مہدی حسن کی تیسری بیوی جو مہدی بیگم کے نام سے مشہور ہوئیں اور جن کا ابھی چند ماہ قبل انتقال ہوا یہ شادی محبت کی شادی تھی جس کو Love Marriage کہتے ہیں صحیفہ اسی محبت کی یادگار ہے

۲۶ .... مہدی حسن نے بھی اپنے دوست شیخ محمد کو ایک خط میں اس شادی کو احرام جدید قرار دیا تھا (مقدمہ صحیفہ، محبت، صفحہ ۲۳)-
۲۷ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۲۳ تا ۲۲۴، ۱۲- ستمبر ۱۹۰۹ء۔
۲۸ .... مکاتیب اول، صفحہ ۳۴۴ تا ۳۴۵، ۱۰-اکتوبر ۱۹۰۹ء۔
۲۹ .... مکاتیب اول، صفحہ ۲۳۵ تا ۲۳۶، ۱۹-اکتوبر ۱۹۰۹ء۔
۳۰ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۴۴، ۱۹-نومبر ۱۹۰۹ء۔
۳۱ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۴۴ تا ۱۵۴، ۲۷-نومبر ۱۹۰۹ء۔
۳۲ .... مکاتیب اول، صفحہ ۱۷۴ تا ۱۷۵، ۲۹-نومبر ۱۹۰۹ء۔
۳۳ .... مکاتیب اول، صفحہ ۲۶۵، یکم دسمبر ۱۹۰۹ء۔
۳۴ .... یہ مقالہ تہذیب الاخلاق، امرتسر جلد اول نمبر ۲ میں شائع ہوا-
۳۵ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۷۳ تا ۷۴، یکم دسمبر ۱۹۰۹ء۔
۳۶ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۲۴ تا ۲۲۵، ۳-دسمبر ۱۹۰۹ء۔
۳۷ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۳۵، ۵-دسمبر ۱۹۰۹ء۔

۳۸.... مکاتیب اول، صفحہ ۲۶۶، ۵- دسمبر ۱۹۰۹ء۔

۳۹.... مکاتیب اول، صفحہ ۲۶۷، ۷- دسمبر ۱۹۰۹ء۔

۴۰.... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۳۵ تا ۱۳۶، ۹- دسمبر ۱۹۰۹ء۔ (مکاتیب میں اس مکتوب کی تاریخ ۹- دسمبر غلط شائع ہوگئی ہے۔ اس لیے کہ سرٹیفکیٹ کے بارے میں دسمبر میں خط و کتابت ہوئی تھی)۔

۴۱.... مکاتیب اول، صفحہ ۲۶۷ تا ۲۶۸، ۱۰- دسمبر ۱۹۰۹ء۔

۴۲.... مکاتیب اول، صفحہ ۲۶۸، ۱۴- دسمبر ۱۹۰۹ء۔

۴۳.... مکاتیب اول، صفحہ ۲۶۹، ۲۰- دسمبر ۱۹۰۹ء۔

۴۴.... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۳۶، ۲۲- دسمبر ۱۹۰۹ء۔

۴۵.... میرے نام پروفیسر صاحب کا ذاتی خط۔

۴۶.... معارف مجلہ سوم ماہ ذی الحجہ ۱۳۳۶ھ مطابق ۱۹۱۸ء، عدد سوم، صفحہ ۱۳۳

۴۷.... معارف اعظم گڑھ مجلہ سوم ماہ ذی الحجہ ۱۳۳۶ھ مطابق ستمبر ۱۹۱۸ء، عدد سوم، صفحہ ۱۳۳ تا ۱۳۶

۴۸.... مقالاتِ شبلی جلد سوم، صفحہ ۱۵۲ تا ۱۵۳

۴۹.... شمالی ہند داد

۵۰.... مقالاتِ شبلی، جلد سوم، صفحہ ۱۶۲ تا ۱۶۳

۵۱.... مقالاتِ شبلی، جلد ہشتم، صفحہ ۱۹۴

۵۲.... مقالاتِ شبلی، جلد ہشتم، صفحہ ۱۹۱

۵۳.... مقالاتِ شبلی، جلد ہشتم، صفحہ ۱۹۳

۵۴.... مقالاتِ شبلی، جلد ہشتم، صفحہ ۱۹۴

۵۵.... ایضاً

۵۶.... مقالاتِ شبلی، جلد ہشتم، صفحہ ۱۹۵

۵۷.... مقالاتِ شبلی، جلد ہشتم، صفحہ ۱۶

۵۸.... مقالاتِ شبلی، جلد ہشتم، صفحہ ۱۷

۵۹.... مقالاتِ شبلی، جلد ہشتم، صفحہ ۱۰۱

۶۰.... مقالاتِ شبلی، جلد ہشتم، صفحہ ۱۳۳ تا ۱۳۵

۶۱.... مقالاتِ شبلی، جلد ہشتم، صفحہ ۱۳۶ تا ۱۴۷

۶۲.... مولوی محمد اسباط صاحب سابق استاد مدرسہ فرقانیہ لکھنو، جو آج کل ندوے میں استاد ہیں، انھوں نے مولانا شبلی سے بد گمانی کی بنا پر اُن کی کتابیں نہیں پڑھی تھیں۔ جب پڑھیں تو اندازہ ہوا کہ مولانا نے وہ کام کیا جو علما سے نہ ہو سکا۔ اب وہ خودداری کے ساتھ ساتھ معترف بھی ہیں (مجھ سے زبانی گفتگو)۔ میں نے مولوی عبد الشکور صاحب فاروقی کاکوروی مرحوم سے مولانا شبلی کا ذکر کیا اور عرض کیا کہ آپ تو ندوے کے ابتدائی مدرسین میں سے ہیں، کچھ اس دور کے متعلق بتلائیں تو وہ خاموش رہے اور ٹال گئے۔ اندازہ ہوا کہ مولانا کی سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جوں کہ انھوں نے اعتراضات کیے تھے، اس لیے وہ اس ذکر کو ہی مناسب نہیں سمجھتے۔

۶۳.... مقالاتِ شبلی، جلد ہشتم، صفحہ ۱۰۳

۶۴.... مقالاتِ شبلی، جلد چہارم، صفحہ ۲۱

۶۵.... مقالاتِ شبلی، جلد چہارم، صفحہ ۱۶

۶۶.... مقالاتِ شبلی، جلد ہفتم، صفحہ ۴۷

۶۷.... مقالاتِ شبلی، جلد ہشتم، صفحہ ۲۲

۶۸.... مقالاتِ شبلی، جلد ہشتم، صفحہ ۲۳

۶۹.... مقالاتِ شبلی، جلد ہشتم، صفحہ ۳۷

۷۰.... مقالاتِ شبلی، جلد ہشتم، صفحہ ۳۸

۷۱ .... مقالاتِ شبلی، جلد پنجم، صفحہ ۱۰۰

۷۲ .... مقالاتِ شبلی، جلد پنجم، صفحہ ۱۰۲

۷۳ .... کلیاتِ شبلی فارسی، صفحہ ۱۰۶ تا ۱۰۷

۷۴ .... مخزن لاہور، جنوری ۱۹۰۹ء، صفحہ ۷۱

۷۵ .... ایں غزل خلافِ ترتیب نوشتہ شد و ذالک لان المقطع کان نیاسب الخاتمہ (برحاشیہ، صفحہ ۱۰۶، کلیاتِ شبلی فارسی)۔

۷۶ .... کلیاتِ شبلی فارسی، صفحہ ۱۰۶ تا ۱۰۷

۷۷ .... مخزن، لاہور، مارچ ۱۹۰۹ء، صفحہ ۷۰ (کلیاتِ شبلی فارسی، صفحہ ۱۱۲/۱)

۷۸ .... مخزن، لاہور، نومبر ۱۹۰۹ء، صفحہ ۷۲ (کلیاتِ شبلی، صفحہ ۱۰۷)

۷۹ .... شعر العجم حصہ دوم، مطبوعہ معارف، اعظم گڑھ، صفحہ ۱ و ۲

۸۰ .... شعر العجم حصہ دوم، صفحہ ۳ و ۴

۸۱ .... شعر العجم حصہ دوم، صفحہ ۵

۱۹۱۰ء

مولوی ضیاء الحسن ندوی کا کوروی کو مولانا کی کتابوں کی ضرورت ہوئی تو مولانا نے لکھا کہ مطبع کو انھوں نے لکھ دیا ہے لہٰذا وہیں سے کتابیں لے لی جائیں۔ آخر ۱۹۰۹ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس رنگون میں ہوا تھا اس کے متعلق مولوی صاحب نے ان سے دریافت کیا کہ کیا وہ گئے تھے چوں کہ مولانا اپنی مصروفیت کی وجہ سے نہ جا سکے تھے۔ اس لیے لکھا کہ وہ نہیں جا سکے۔

اسی زمانے میں علمی اصطلاحات کی اردو ڈکشنری تیار کرنے کے لیے کانفرنس کو تین ہزار روپے ملے تھے۔ مولانا کو امید نہ تھی کہ اس رقم کا صحیح مصرف ہوگا اور کوئی ایسی ڈکشنری تیار ہو سکے گی۔ اس لیے ان کو خیال ہوا کہ یہ رقم کالج میں میں صرف ہو جائے گی۔ اب کی ندوے کا سالانہ جلسہ دلی میں ہونے کی تجویز تھی۔ اس پیشکش کو قبول کرنے کے لیے ۱۹ جنوری کو ندوہ لکھنو میں جلسہ ہونے والا تھا۔ جس میں آخری فیصلہ کیا جاتا کہ دلی میں سالانہ جلسہ ہو یا نہ ہو؟ مولانا کا ارادہ تھا کہ اگر جلسہ دلی میں ہوا تو کچھ نئے کام کیے جائیں(۱)۔

ندوے کے جلسہ انتظامیہ میں کچھ اہم معاملات پیش تھے اور چوں کہ یہ جلسہ تعطیل کے زمانے میں ہو رہا تھا اور اس تعطیل میں وکلا ممبر کے لکھنو سے باہر جانے کا امکان تھا۔ اس لیے مولانا کو خیال ہوا کہ شاید کورم پورا نہ ہو سکے اور کورم پورا نہ ہونے کی صورت میں معاملات طے نہ ہو پاتے۔ اس لیے مولوی حمید الدین کو جلسے میں شرکت کی دعوت دی کہ اگر وہ آسکیں تو ضرور شرکت کریں تاکہ کورم پورا ہو جائے اور معاملات طے ہو جائیں۔

ندوے کی عمارت کی دیواریں اگرچہ ابھی کمر کمر تک اٹھی تھیں، مگر مولانا اس کو دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے تھے اور اپنی کوششوں کو پورا ہوتے دیکھ کر پھولے نہیں سماتے تھے اور اپنی خوشی کا اظہار اپنے احباب اور اعزا کو اطلاع دے کر کرتے رہتے تھے۔ خوشی کا یہ عالم تھا کہ اس نامکمل عمارت ہی میں رہنے پر تیار تھے۔ مولوی حمید الدین سے خواہش کی کہ شوکت کو بھی (۲) اپنے ساتھ لیتے آئیں۔ ان کو (شوکت کو) کلکتہ جاتے ہوئے الہ آباد پہنچا دینے کا ارادہ تھا۔

مولانا کو اس زمانے میں انجیل اور توریت میں اخلاقی احکام کی ضرورت تھی۔ اس لیے

مولوی حمید الدین سے دریافت کیا اس قسم کے احکام کس باب اور فصل میں ملیں گے (۳)۔

میر ولایت حسین صاحب منیجر بک ڈپو علی گڑھ۔ مولانا کی کتابیں (شعر العجم) مطبع سے منگوانا چاہتے تھے اور ان کتابوں کو ڈیوٹی شاپ میں فروخت کرنے کے بعد ان کی قیمت دینا چاہتے تھے۔ اس کو مولانا نے پسند نہیں کیا۔ مولانا کا خیال تھا کہ قیمت کی ادائگی کے بعد مطبع سے کتابیں حاصل کی جائیں۔

۱۶ جنوری کو یہ طے ہو گیا تھا کہ ندوے کا سالانہ جلسہ دلی ہی میں ہو۔ لہذا مولانا نے چاہا کہ علی گڑھ کے لوگ کثیر تعداد میں اس جلسے میں شرکت کریں (۴)۔

ندوے کا سالانہ جلسہ مارچ ۱۹۱۰ء میں ہونا طے ہوا تھا۔ لیکن دشواری یہ تھی کہ میزبان (دلی والے) اخراجات برداشت کرنے پر تیار نہ تھے۔ اس لیے ندوے والوں نے طے کیا کہ چندہ ممبری ۵ روپے کر دیا جائے اور ہر رکن انتظامی سے درخواست کی جائے کہ وہ پانچ ممبر بہم پہنچا کر ان کا چندہ ندوے کو بھیج دے۔ لہذا مولانا نے مولوی حمید الدین کو لکھا کہ وہ بھی ایسا کریں اور یہ کوئی بڑی بات نہ تھی۔ اس لیے کہ مولوی اسحق (مولانا کے چھوٹے بھائی) ان کے (مولوی حمید الدین) پاس تھے اور یہ کوئی بڑی رقم بھی نہ تھی۔

مولانا امید کر رہے تھے کہ اب کی جلسے میں ایسے امور طے کراتے جو ندوے کی نئی زندگی اور ندوے کے اصل مقاصد کا ذریعہ بنتے۔ شعر العجم کی جلد اچھی نہیں بندھی تھی۔ اس لیے مولانا نے اب نہایت خوبصورت انگریزی وضع کی جلدیں تیار کرائی تھیں۔ لیکن ان کی مانگ پھر بھی کم تھی۔ مولانا کو افسوس تھا کہ فارسی سے لوگوں کی رغبت میں بڑی کمی آگئی تھی (۵)۔

دلی میں چند ہی دنوں قبل مسلم لیگ کے جلسے کے لیے چھ ہزار روپے چندہ ہو چکا تھا۔ اس لیے دلی والوں نے ندوے کے جلسے کے لیے چندہ کرنے سے پرہیز کیا اور یہی وجہ تھی کہ وہ لوگ اس جلسے کے اخراجات برداشت کرنے میں دقت محسوس کر رہے تھے۔ پھر بھی داعیوں نے پانچ سو کی رقم دینا منظور کی تھی۔ جلسے کے مصارف کا تخمینہ ڈھائی ہزار سے کم نہ تھا۔

مولانا نے مولانا شیروانی سے خواہش کی کہ پانچ ممبروں کے مہیا کرنے کے علاوہ یک مشت عطیہ بھی دیں۔ لیکن رقم کے متعلق مطالبہ تو مولوی عبدالحئی صاحب نائب ناظم ندوۃ العلما کو کرنا تھا۔ مولانا تو شیروانی صاحب سے یہ چاہتے تھے کہ جلسے میں کسی علمی مضمون پر لکچر دیں اور اخبارات اور رسائل میں ندوے کے اغراض پر مضامین کا سلسلہ شروع کر دیں اور حسب سابق

رؤسا سے خط و کتابت کا کام بھی اپنے ذمہ لیں۔

چوں کہ جلد ہی ندوے کے بورڈنگ کی عمارت کا کام شروع کرنا تھا۔ لہذا مولانا شیروانی سے خواہش کی گئی تھی کہ ان کی طرف سے ان کے کمروں کی رقم جلسے کے وقت پیش ہو جائے تو دوسرے لوگوں کو بھی ترغیب ہو۔

مولانا کی خواہش تھی کہ شیروانی صاحب شعر العجم پر ریویو کریں (۶)۔

مولوی امین زبیری نے بھوپال سرکار کے لیے ایک استانی کو طلب کیا تھا۔ اس پر مولانا نے ان کو اطلاع دی کہ استانی بھوپال جانا نہیں چاہتی تھیں اور ان کو اپنی لیاقت پر اعتماد نہ تھا، نہ ان کے اعزا ہی ان کو دور بھیجنے پر راضی تھے۔ اس لیے مولانا مجبور تھے اور ان کو شرمندگی بھی تھی کہ وہ اس کام کو نہ کر سکے تھے۔

مولانا چاہتے تھے کہ ندوے کے سالانہ جلسہ دہلی میں مولوی صاحب ریاست بھوپال کے نمائندے کی حیثیت سے شرکت کریں۔ ریاست حیدر آباد سے بھی نمائندے آئے تھے اگرچہ ہندو وزارت کے عہد میں یہ سلسلہ بند ہو گیا تھا۔ مگر دوسری ریاستوں کے نمائندے پھر بھی آتے رہے۔ سرکار بھوپال نے جو ندوے کی مزید امداد فرمائی تھی اس کے شکریے کا رزولیشن بھی اس سالانہ جلسے میں پیش ہونے والا تھا (۷)۔

مولوی امین زبیری نے استانی کے لیے پھر یاد دہانی کی تو ان کو لکھا کہ سرکار بھوپال کی خواہش کا بڑا احترام تھا لیکن مجبوری یہ تھی کہ استانی بھوپال جانے پر کسی طرح راضی نہ ہوتی تھیں اور نہ کبھی ملازمت کی تھی پھر بھی آخری کوشش کرنے کو تیار تھے۔ جلسہ۔ دہلی میں مولوی صاحب کی شرکت پر مولانا نے بڑا زور دیا (۸)۔

مولانا جلد ہی دلی جانے والے تھے۔ اس وجہ سے ضروری کاموں کو نپٹانا چاہتے تھے۔ لہذا بہت مصروف تھے۔ مولانا سے اور مسٹر مہدی حسن سے صلائے عام کے بارے میں بحث چل رہی تھی۔ مسٹر مہدی حسن اس کے مداح تھے اور مولانا اس کو زیادہ وقعت نہ دیتے تھے۔ اس لیے مولانا نے لکھا کہ عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اگر پیغمبر مانتے تو ان سے مسلمان اختلاف نہ کرتے لیکن وہ تو خدا مانتے ہیں۔ بالکل یہی چیز صلائے عام کے لیے تھی کہ مسٹر مہدی حسن اس کو بہترین رسالہ سمجھتے تھے۔ مولانا کو اس میں کلام تھا۔ وہ ایک رسالہ تو بیشک ماننے پر تیار تھے لیکن بہترین نہیں اور دل کی بات انھوں نے لکھ دی تھی۔ یہ نہ کہا کہ دل میں تو اس کی طرف سے اچھا

خیال نہ تھا اور زبان سے یا قلم سے تعریف کر دی۔

شیروانی صاحب شعر العجم پر ریویو کرنے والے تھے۔ لیکن مولانا مسٹر مہدی حسن کے ریویو کے بھی خواہاں تھے کیوں کہ ان کا انداز شوخ تھا اور مولانا کو شوخی پسند تھی (۹)۔

مولانا شعر العجم کی غیر مقبولیت پر پریشان نہ تھے کیوں کہ ان کو معلوم تھا کہ عام دلچسپی کی کتاب نہ تھی اور علمی کتاب ناول نہیں ہو سکتی تھی۔ لاگت بھی وصول ہونے کی امید نہ تھی اور مولانا اس کو پسند نہ کرتے تھے کہ مقدرت رکھنے والوں کو کتاب مفت دی جائے یہی اصول یورپ کا بھی تھا۔

سید سلیمان ندوی چوں کہ مولانا کے خطوط جمع کر رہے تھے۔ اس لیے مولانا نے مولوی سمیع کو لکھا کہ جو بالکل نجی خطوط ہوں ان کو نہ بھیجا جائے۔ فرصت کے وقت خود ہی پڑھ کر فیصلہ کرنے کا ارادہ تھا۔

چوں کہ دلی میں مسلم لیگ کا جلسہ ہونے والا تھا اور مولانا کو دعوت آئی تھی۔ لہٰذا اس جلسے میں جانے کا ارادہ تھا اور وہاں سے واپسی کے بعد مولوی سمیع کی دعوت پر جونپور جانے کا خیال تھا۔ مولانا کا خیال تھا کہ شعر العجم کے دوسرے حصے دلچسپ ہوں گے (۱۰)۔

مولانا شیروانی نے شعر العجم کے ریویو میں بڑی تعریف کی تو مولانا نے اس کا دوبارہ جائزہ لیا کہ وہ واقعی اتنی تعریف کے قابل ہے یا محض محبت کی بنا پر تعریف کی گئی۔ مولانا کو افسوس تھا کہ شیروانی صاحب زمینداری کے کاموں میں الجھے رہتے تھے، ورنہ ان کو تو علمی اور ادبی کام کرنا چاہیے تھا۔

تاریخ سے واقفیت رکھنے والے لوگ یا تو اکبر کے طرف دار تھے یا اورنگ زیب کے۔ مولانا ان دونوں گروہوں سے الگ جہانگیر کے طرف دار تھے۔ چناں چہ الندوہ کے آیندہ شمارہ میں جہانگیر پر مقالہ پیش کرنے والے تھے۔

مولانا جلسہ، دہلی کی وجہ سے پریشان تھے کیوں کہ دہلی والے جلسہ تو کر رہے تھے مگر انتظامات نہیں کر پا رہے تھے۔ اس لیے مولانا سے تقاضا تھا کہ وہ جا کر انتظامی کام میں مدد کریں۔ لہٰذا انھوں نے ارادہ کر لیا تھا کہ دو تین دن میں دہلی روانہ ہوں۔ راستے میں علی گڑھ تھا مگر شیروانی صاحب کا قیام حبیب گنج میں تھا وہ علی گڑھ کم آتے تھے اور مولانا کی وہاں جانے کی ہمت نہ تھی۔

حرمین کے حالات میں مثنوی فتوح الحرمین کے مصنف محی کی مولانا کو تلاش تھی۔ کشف

الظنون کے علاوہ اور کسی تذکرے میں مصنف کا پتا نہیں چلا تو مولانا نے شیروانی صاحب سے دریافت کیا کہ شاید ان کی کتابوں میں سے کسی میں تذکرہ ہو (۱۱)۔

مولانا دلی جاتے ہوئے علی گڑھ ٹھہر کر ڈاکٹر بارویز سے ملنا چاہتے تھے۔ اس لیے مولوی ضیاء الحسن کو لکھا کہ پروفیسر ابوالحسن سے کہہ دیں کہ وہ مولانا کے قیام کا گیسٹ ہاؤس میں انتظام کریں۔

ندوے کا آخری اجلاس ۲۸ مارچ کو تھا اور ندوے کے طلبہ عربی تقریر کی مشق کر رہے تھے ان میں خواجہ عبدالواجد (۱۲) ادیبانہ عربی بولتے تھے۔ شمس العلما سید علی بلگرامی ان لڑکوں کی تقریر سن کر بہت محظوظ ہوئے۔

ندوے کی عمارت بہت تیزی سے بن رہی تھی۔ آس پاس کے سرکاری کالج اور بورڈنگ ابھی سے اس کے سامنے ہیچ معلوم ہونے لگے تھے۔

مولوی ضیاء الحسن کو فمن الناس کے سلسلے میں کچھ شبہ ہوا تو مولانا نے لکھا کہ تفسیر اور کشاف میں کوئی قرأت کا اختلاف نہ تھا (۱۳)۔

مولانا نے ندوے کے بورڈنگ کا ایک کمرہ مولوی اسحق کے نام ان کی اہلیہ مرحومہ کی یاد میں لکھ دیا تھا۔ اس لیے اس کی رقم جلسے میں پیش کرنے کی مولوی اسحق کو ہدایت کی۔ استانی کے متعلق دریافت کیا کہ وہ بھوپال گئیں یا نہیں۔ مولوی اسحق سے یہ بھی دریافت کیا کہ انھوں نے الہ آباد میں کون سا قومی کام شروع کیا ہے جس کا ذکر انھوں نے کسی خط میں کیا تھا؟

اسی زمانے میں کونسل کی ممبری کے الیکشن ہوئے اور مسلمان بہت خوش تھے کہ ان کو مردم شماری کی بنا پر زیادہ حق دیا گیا تھا۔ مگر مولانا یہ سوچتے تھے کہ منتخب شدہ ممبر کر کیا سکیں گے؟ اس لیے کہ تنہا کھلے، علی محمد، نوشاد بلکہ عزیز مرزا اور آفتاب احمد خان پر بھاری تھے (۱۴)۔

۱۰۔ مارچ کو مولانا دلی جاتے ہوئے مراد آباد میں تھے۔ وہاں ایک قضیاۃ کا ایک قدیم خاندان تھا۔ جن کے پاس شاہی کتب خانہ کی متعدد کتابیں تھیں۔ انھیں میں مصنفین کا مسودہ ایک جلد عالمگیری بھی تھی۔ اس کو اب تک مولانا نے نہیں دیکھا تھا اس کو منگوا کر دیکھنے کا ارادہ تھا۔

سالانہ جلسے کے سلسلے میں مولانا نے بعض امور اخبارات میں شائع کیے تھے۔ لیکن سب کا پیش کرنا کم وقت میں ممکن نہ تھا۔ اس لیے شیروانی صاحب سے مشورہ کیا کہ اپنی اہمیت کے لحاظ

سے کون سے امور پیش کیے جائیں اور ان کی کارروائی کا کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟ انگریزی مدارس میں دینیات کا بندوبست اور آریوں کے فتنے کے سدباب کے متعلق بھی کچھ کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ ۱۲۔مارچ کو دلی روانہ ہونے کا ارادہ تھا اس لیے مولانا شیروانی سے خواہش کی کہ وہ بھی دو چار روز کے بعد پہنچ جائیں (۱۵)۔

۱۱۔مارچ کو مولانا کا مراد آباد میں لکچر تھا۔ دوسرے دن دلی جا رہے تھے اور وہاں جلسے تک قیام کا ارادہ تھا۔ اسی زمانے میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے مولانا کی کتاب الکلام پر اور اس کے ضمن میں مسلمانوں کے علم کلام بلکہ اسلام پر الناظر، لکھنو میں کڑی تنقید کی مگر اس مضمون میں اپنا نام نہیں دیا اور ایک طالب علم (۱۶) لکھا۔ مولانا شبلی کا خیال بابائے اردو مولوی عبدالحق کی طرف گیا۔ چناں چہ انھوں نے مسٹر مہدی حسن کو لکھا کہ وہ (مولوی عبدالحق) کالج کے بی۔اے اور مولانا کے شاگرد ہیں۔ شاگردی کے لحاظ سے اپنا نام نہیں دیا۔ پہلے نقاد تھے اور اب طالب علم کی حیثیت سے تنقید کی ہے۔

شعرالعجم کے تیسرے حصے کے بھی آخر ماہ مارچ تک چھپنے کی امید تھی۔ مولانا کا خیال تھا کہ شاید یہ حصہ قبل کے دونوں حصوں سے دلچسپ ہو، گو ان کو دلچسپی کی پروانہ تھی (۱۷)۔

الندوہ کے مارچ کے شمارے میں مولوی عبدالسلام ندوی سب ایڈیٹر نے اڈیٹوریل میں رسالہ ادیب، الہ آباد کی ان الفاظ میں تعریف کی تھی۔ "حال میں الہ آباد سے ادیب ظاہری شکل وصورت میں اس آب و رنگ سے نکلا کہ تمام لوگ پکار اٹھے،

اس طرح کا جمال ہو ایسا شباب ہو (۱۸)

اس پر مولانا نے مولوی صاحب کی خبر لی اور لکھا کہ "چوں کہ اڈیٹوریل میں لکھا ہے اس لیے لوگوں کو خیال ہوا ہوگا کہ میرا لکھا ہوا ہے۔ لہذا آیندہ ایسے مبتذل اور عامیانہ فقروں سے پرہیز کیا جائے (۱۹)۔"

ندوے کا سالانہ جلسہ ۱۴۔۱۵۔۱۶ ربیع الاول ۱۳۲۸ھ مطابق ۲۶۔۲۷۔۲۸ مارچ ۱۹۱۰ء روز شنبہ، یکشنبہ دو شنبہ کو دہلی میں ہوا۔ اس کی روداد میں دہلی میں جلسہ کیے جانے کا سبب اس طرح تحریر ہے:

"اوائل جنوری ۱۹۱۰ء میں مولانا شبلی نعمانی مسئلہ وقف علی الاولاد اور مقاصد ندوۃ العلماء کی اشاعت کی غرض سے دہلی تشریف لے گئے اور جلسہ سالانہ کے

تحریک کی، ابتدا اگرچہ ایک محدود حلقے میں ہوئی، تاہم مقاصد ندوۃ العلماء کے لحاظ سے دہلی کی موزونیت، اس قدر بدیہی اور عام طور پر مسلم تھی کہ تمام قومی اخباروں نے اراکین ندوۃ العلماء کے اس حسن انتخاب کی داد دی (۲۰)۔"

آگے چل کر اسی روداد میں اس طرح ہے:

"مولوی سید عبدالسلام صاحب مالک مطبع فاروقی کی کوششوں سے جو تحریک جلسہ کے ابتدائی معاونین میں سے تھے۔ دعوت نامہ جس پر اکثر تجار، اعیان، علما و مشائخ کے دستخط ثبت تھے۔ مرتب کر کے دفتر ندوۃ العلماء میں روانہ کیا گیا اور اراکین نے جلسہ انتظامیہ میں بالاتفاق دعوت قبول کرنے کی منظوری دی (۲۱)۔

خان بہادر مولوی عبدالحامد صاحب پریسیڈنٹ استقبالی کمیٹی، دہلی نے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا:

"حضرات اراکین ندوۃ العلماء آپ کی خدمات کے سلسلے میں وہ موثر اور مفید تحریک سزاوار تحسین ہے جو مسئلہ وقف علی الاولاد کا صحیح منشا ظاہر کرنے کو آپ نے اختیار کی ہے۔ شاہی کونسل کے اجلاس منعقدہ مارچ ۱۹۱۰ء میں آنریبل مسٹر محمد علی جینا (۲۲) (قائم مقام مسلمانان بمبئی) نے وقف علی الاولاد کی نسبت سوال پیش کیا ہے اور گورنمنٹ نے اس سوال کے جواب میں غائت لطف و کرم سے وعدہ کیا ہے کہ وہ اس تجویز پر جو تمام مسلمانوں کے اتفاق رائے سے وقف علی الاولاد کی نسبت قرار دی جائے غور کرے گی (۲۳)۔

حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب بالاتفاق ۲۶۔مارچ جلسے کے صدر منتخب ہوئے (۲۴)۔ تو انھوں نے اپنی تقریر میں مولانا کی خدمات کو اس طرح سراہا:

"حضرات! قبل اس کے کہ میں اپنے بیان کو ختم کروں، میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنے محترم دوست علامہ شبلی کے ان احسانات کا شکریہ قوم کی طرف سے ادا کروں، جو انھوں نے اس پیرانہ سالی اور معذور ہونے کی حالت میں قوم پر کیے ہیں۔ وہ ایک قابل اور روشن خیال عالم ہونے کے علاوہ بڑے بلاہمت بزرگ ہیں۔ جو ترقیاں ہم ندوے کی دیکھ رہے ہیں۔ وہ اسی ذات کی ان تھک کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ اگر میں انھیں اس عمر میں اتنا کام کرتا ہوا خود نہ دیکھتا تو معتبر شہادت کو بھی الخبر یحتمل الصدق والکذب کہ کر تسلیم کرنے میں تامل کرتا۔ ایسے شخص کے احسان کا اعتراف کرنا ہمارا سب کا فرض ہے۔ ہمیں دعا کرنی چاہیے کہ خداوند تعالیٰ ان کی عمر، صحت اور ہمت میں برکت عطا فرمائے (۲۵)۔"

اس جلسے میں شرکت کی دعوت کے لیے مختلف سربرآوردہ حضرات کو خطوط لکھے گئے تھے ان میں سے بعض لوگ اپنی مصروفیت کی وجہ سے شرکت نہ کر سکے تھے اور معذرت لکھی۔ یہاں صرف آغا خان کے خط کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے:

"مائی ڈیر مولوی شبلی صاحب!

مجھ کو نہایت ہی قلق ہے کہ ندوے کا جو اجلاس اس سال مارچ میں ہو گا، اس کی شرکت سے قاصر رہوں گا۔ اس کے ساتھ میں آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ میری خیراندیشی کا ارکان ندوہ کی خدمت میں اظہار فرمادیجیے۔ میں امید کرتا ہوں کہ جلسہ خوب کامیاب ہو گا(۲۶)۔"

روداد میں ایک اور موقع پر اس طرح ہے:

"مولانا سید عبدالحی صاحب کے بعد اگرچہ پروگرام کی ترتیب کے لحاظ سے شمس العلماء مولانا شبلی صاحب نعمانی دارالعلوم کی رپورٹ پیش کرنے والے تھے۔ لیکن بعض مصالح کے لحاظ سے جناب صدر انجمن صاحب نے تحریک کی کہ رپورٹ کے پیش کرنے سے پہلے جناب شمس العلماء مولانا شبلی صاحب نعمانی مقاصد ندوۃالعلماء پر تقریر کریں۔ چناں چہ مولانا موصوف کھڑے ہوئے اور تقریباً ایک گھنٹہ تک حسب ذیل تقریر کی:"

حضرات! میں اس وقت جس عنوان پر تقریر کرنے کے لیے کھڑا ہوا ہوں وہ اس سوال کے طے کرنا ہے کہ قوم کو ندوۃ العلماء ...... ایک مجمع علماء کی ضرورت ہے یا نہیں؟

اس مسئلے کے طے کرنے کے لیے پہلے یہ طے کرنا چاہیے کہ قوم کی کچھ مذہبی ضرورتیں ہیں یا نہیں؟ مذہبی ضرورت اور مذہبی ترقی کا لفظ، گو آج کل جدید گروہ میں چنداں گوش آشنا نہیں ہے۔ لیکن قومی ضرورت اور قومی ترقی، کے جملے اس قدر اور اس بلند آہنگی سے بار بار دہرائے گئے ہیں کہ تمام ملک اس صدا سے گونج اٹھا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کی قومیت کیا ہے؟ دنیا کی تمام قوموں کی قومیت، ملک یا نسل، یا خاندان کی بنا پر ہوتی ہے۔ مثلاً یہودی وہ قوم ہے جو بنی اسرائیل کے خاندان سے ہو۔ اگر اور کوئی شخص یہودیوں کے تمام معتقدات پر ایمان نہ لائے تو وہ یہودی نہیں ہو سکتا اور اس کو یہودیوں کے مذہبی اور ملکی حقوق نہیں حاصل ہو سکتے۔ یورپین قوموں کی قومیت ملک کی بنا پر ہے۔ کسی اور ملک کا آدمی اگر عیسائی ہو جائے تو اس کو وہ ملکی حقوق نہیں حاصل ہو سکتے، جو یورپ کو حاصل ہیں ایک یورپین پادری جب افریقہ یا ایشیا میں عیسائیت کا وعظ کہتا ہے تو لوگوں سے کہتا ہے کہ اگر تم عیسائی ہو جاؤ تو گو تم اس ذلیل دنیا میں یورپین حقوق میں ہم

سرنہ ہوگے، لیکن قیامت میں تم کو اور یورپین کو ایک ہی مرتبہ حاصل ہوگا۔ یعنی یسوع کے دائیں پہلو میں جگہ ملے گی۔

لیکن مسلمانوں کی قومیت نہ ملک پر ہے، نہ خاندان پر، نہ رنگ پر، بلکہ جو شخص لا الہ الا اللہ کہ دے وہ دفعۃً مسلمان ہو کر تمام مذہبی اور ملکی حقوق میں کل مسلمانوں کا ہم سر ہو جاتا ہے۔ اگر ایک بھنگی یا چمار، کلمہ، توحید پڑھ کر قسطنطنیہ کی جامع مسجد میں چلا جائے اور سلطان کے پہلو میں کھڑا ہو جائے تو سلطان کو اس سے یہ کہنے کی جرأت نہیں ہو سکتی کہ "ہٹ جا، ایک چمار، شاہنشاہ ٹرکی کے پہلو میں کھڑا نہیں ہو سکتا۔" کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ اس سے بالاتر عدالت سے چمار نے یہ حکم صادر کرالیا ہے کہ انما المومنون اخوۃ مسلمان سب بھائی بھائی ہیں۔

یہ صرف قول نہیں ہے بلکہ اسلام کی ابتداے تاریخ سے آج تک علانیہ اس پر عمل رہا ہے اسی اصول کی بنا پر دنیاے اسلام کے سب سے بڑے تاجدار (عمر فاروقؓ) نے ایک حبشی غلام کے مرنے کے وقت کہا تھا: الیوم مات سیدنا۔ آج ہمارا آقا مر گیا۔ اسی اصول نے ایک خواجہ سرا غلام (کافور) کو مصر و شام کا حکمران بنا دیا تھا اور حرمین میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا اور یہی اصول تھا۔ جس نے عرب و عجم، غلام اور آقا، شریف اور رذیل، امیر اور غریب کا تفرقہ بالکل مٹا دیا تھا (۲۷)۔

کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

اس بنا پر مسلمانوں کی "قومی ترقی" اور قومی ضرورت کا مسئلہ دراصل "مذہبی ترقی" اور "مذہبی ضرورت" کا مسئلہ ہے۔ قوم کا لفظ جو نہایت بلند آہنگی سے ہزاروں دفعہ دہرایا گیا اور اس نے کوئی زندگی نہیں پیدا کی، اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظ خود غلط تھا۔ اس لفظ کو بدل کر اسلام کا لفظ اختیار کرنا چاہیے۔ ہماری قومیت ہمارا مذہب ہے اور ہم میں یہی لفظ اور صرف یہی لفظ زندگی پیدا کر سکتا ہے، قوم کے غلط لفظ کے استعمال سے صرف یہی نقصان نہیں ہوا کہ وہ کوئی زندگی میں مذہبی پابندی اور مذہبی شعائر کا احساس نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ قومی ترقی کا سب سے زیادہ غل مچانے والے مذہب میں سب سے زیادہ بے پروا ہیں۔

اس امر کے تسلیم کر لینے کے بعد کہ قومی ضرورت کا مسئلہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ آج مسلمانوں کی کچھ مذہبی ضروریات ہیں یا نہیں؟ اور زمانے کی نئی حالت نے کچھ نئی ضرورتیں پیدا کر دی ہیں یا نہیں؟

حضرات میں نے تمام ہندوستان کا دورہ کیا ہے۔ (سندھ کے سوا) اور تمام مسلمانان ہندوستان کے حالات آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔ مجھ کو ہر جگہ جو چیز سب سے زیادہ پر خطر نظر آئی وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا مذہبی احساس روز بروز کم ہوتا جاتا ہے۔ ان کو خبر نہیں ہوتی کہ کیا چیز ہاتھ سے نکلتی جاتی ہے۔ ہر جگہ آزادانہ بلکہ ملحدانہ خیالات پھیلتے جاتے ہیں۔ آریہ ہر طرف چھائے جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی تاریخ کے متعلق نہایت غلط واقعات، انگریزی لٹریچر کے ذریعے سے پھیل رہے ہیں۔ انگریزی تاریخوں میں اسلام کو بزور شمشیر پھیلنے والا مذہب لکھا ہے۔ یہ سب ہو رہا ہے، لیکن قوم کو احساس تک نہیں۔ انصاف کرو! جدید تعلیم پھیلانے کے لیے کس قدر شور و غل برپا ہے، کس طرح تمام ملک میں ہنگامہ مچ رہا ہے۔ کس طرح ملک کے ایک ایک کونے میں اس کی منادی ہو رہی ہے۔ بے شبہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے، بجا اور بالکل بجا ہے اور ابھی اس سے بڑھ کر ہونا چاہیے لیکن سوال یہ ہے کہ ان باتوں کے ساتھ ہم مذہبی حفاظت کے لیے بھی کیا کر رہے ہیں؟

اس موقع پر مجھے تفصیل سے بتانا چاہیے کہ اس وقت کیا کیا مذہبی خطرات درپیش ہیں جس کے روک تھام کے لیے ہم کو تیار ہونا چاہیے۔ اور وہی جوش، وہی سرگرمی، وہی جاں نثاری ظاہر کرنی چاہیے جو دنیوی مقاصد کے لیے ہم کر رہے ہیں۔

۱۔ سب سے پہلا اور سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ یورپ کے افق سے ملحدانہ خیالات کی گھٹائیں اٹھ کر ہمارے ملک کی فضا میں چھائی جاتی ہیں۔ ان خیالات سے نہ صرف وہ لوگ متاثر ہوتے ہیں جو انگریزی پڑھتے ہیں، بلکہ واسطہ در واسطہ چپکے چپکے تمام قوم میں ان کا زہر سرایت کرتا جاتا ہے۔ سیکڑوں ہزاروں دل ہیں جس میں مذہب کی طرف سے شکوک پیدا ہو گئے ہیں۔ ہزاروں اشخاص کا خیال ہے کہ موجودہ علمی تحقیقات نے مذہب کے بڑے بڑے مسائل باطل کر دیے۔ بہت سے لوگ جرأت سے کام لے کر علانیہ کہنے لگے ہیں کہ مذہب اور سائنس ایک جگہ نہیں رہ سکتے۔ بہتوں کا خیال ہے کہ مذہب ایک اخلاقی قانون ہے، اس کے لیے وحی یا الہام کی ضرورت نہیں۔

۲۔ ایک دوسرا خطرہ یہ ہے کہ اسلامی احکام مثلاً تعدد ازدواج، جواز غلامی، تعزیرات، جرائم وغیرہ کی نسبت یورپ نے غلط تعبیری سے خیالات پھیلا دیے ہیں کہ وہ تمدن اور انصاف کے خلاف ہیں اور چوں کہ یہ احکام خود قرآن مجید میں مذکور ہیں اس لیے قرآن خدا کا کلام نہیں ہو سکتا۔

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی تاریخ جس طرح یورپ نے لکھی ہے۔ اس سے تقدس اور پاک باطنی کا خیال نہیں پیدا ہونا بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی، ایک فاتح، ایک جابر، ایک انتقام گیر، ایک دنیا طلب کی زندگی نظر آتی ہے اور چوں کہ انگریزی خوانوں کا سرمایہ معلومات بھی کتابیں ہیں، اس لیے صرف دو صورتیں ہیں یا وہ ان کتابوں کے دیکھنے سے باز رکھے جائیں (لیکن ناممکن ہے) یا دیکھیں تو خواہ مخواہ ان خیالات سے آلودہ ہو جائیں۔

۴۔ عدالتوں میں بعض فقہی مقدمات اس وجہ سے شریعت اسلام کے خلاف فیصل ہو جاتے ہیں (مثلاً وقف اولاد) کہ حکام، قرآن اور حدیث سے واقف نہیں اور مسلمان بیرسٹر اور وکلا کا سرمایہ معلومات بھی یہی انگریزی کتابیں ہیں۔

۵۔ سیکڑوں ہزاروں قصبات اور دیہات کے مسلمان، مذہبی احکام سے اس قدر ناواقف ہیں کہ نماز، روزہ تک نہیں جانتے بلکہ بہت سے دیہات میں مسلمانوں کے نام رام بخش، پچھمن سنگھ ہوتے ہیں۔

یہ اور اسی قسم کی بہت سی مذہبی ضرورتیں ہیں، جن سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ یہ ظاہر ہے کہ ان ضرورتوں کے انجام دینے کے لیے کسی مجمع، انجمن کسی دارالمشورہ کی ضرورت ہے۔ اسی مجمع یا انجمن کا نام ندوۃ العلماء ہے۔ ندوۃ العلماء کسی خاص مدرسہ، کسی خاص تعلیم گاہ کسی خاص فرقہ کا نام نہیں بلکہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک مشترکہ مذہبی انجمن ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کی جس قدر مشترکہ مذہبی ضروریات ہیں، ان کے انجام کی تدبیروں پر مشورہ اور غور و فکر کی جائے اور تمام ہندوستان کے علما، پیشوایان مذہب اور عام مسلمان ایک جگہ بیٹھ کر ان امور کا فیصلہ کریں۔

حضرات! ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنی اور ہر قسم کی ضرورتوں کے لیے عام اسلامی انجمنوں کی بنیاد ڈالی ہے۔ ایجوکیشنل کانفرنس تمام مسلمانان ہندوستان کی تعلیمی انجمن ہے۔ مسلم لیگ تمام مسلمانان ہندوستان کی پولٹیکل انجمن ہے۔ لیکن کیا تمام ہندوستان کی کوئی مذہبی انجمن بھی ہے؟ کیا مسلمانوں کی مذہبی ضرورتیں نہیں ہیں؟ کیا یہ ضرورتیں مقدم اور مہتم بالشان نہیں ہیں؟ کیا یہ ضرورتیں کسی اور طریقے سے رفع ہو سکتی ہیں؟ اگر ان سوالوں کا جواب اثباتی ہے تو ندوۃ العلماء کی ضرورت ان سوالات کا لازمی نتیجہ ہے۔

ایک نہایت ضروری امر قابل لحاظ کے یہ ہے کہ مسلمانوں کو جو دنیوی اور مذہبی ضرورتیں درپیش ہیں وہ اس طرح ایک دوسرے سے وابستہ ہیں کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتیں مثلاً دنیوی تعلیم جو آج سب سے اہم الامور ہے۔ اس کی نسبت سب نے طے کر دیا ہے کہ اس کے ساتھ مذہبی تعلیم بھی لازمی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ علی گڑھ کالج، حمایت الاسلام کالج، بمبئی اسلامیہ اسکول وغیرہ وغیرہ تمام اسلامی تعلیم گاہوں میں ایک حد تک مذہبی تعلیم لازمی ہے۔ اسی طرح مذہبی تعلیم کے ساتھ انگریزی تعلیم کی ضرورت ہے۔ موجودہ فلسفے کا مقابلہ علوم جدیدہ کی واقفیت کے بغیر کیوں کر ہو سکتا ہے؟ یورپ میں اسلام کی اشاعت انگریزی دان کے بغیر کیوں کر ہو سکتی ہے؟

اس حالت کے ساتھ یہ کس قدر تعجب خیز اور افسوس ناک بات ہے کہ تمام ہندوستان میں ایک بھی ایسی اسلامی انجمن نہیں ہے جس میں دونوں قسم کے لوگ موجود ہوں۔

حضرات! آپ جو یہ دیکھ رہے ہیں کہ باوجود اس قدر جد و جہد اس قدر شور و غل اس قدر تگ و دو کے قوم کی تعلیمی حالت اب تک نہیں سنبھلی اس کی یہی وجہ ہے کہ دونوں فریق الگ الگ ہیں اور دونوں کوششیں نہ صرف ایک دوسرے سے الگ، بلکہ ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ مذہبی علما انگریزی تعلیم سے الگ ہیں اور اس کو استحسان کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ جو لوگ علما کے زیر اثر ہیں مثلاً تاجر، صنعت پیشہ، عام رؤسا اور وہ اب تک انگریزی تعلیم سے الگ ہیں۔ صرف نوکری پیشہ گروہ جن کو دنیاوی ضرورتوں نے مجبور کر دیا ہے اور جو علما کے اثر سے آزاد ہیں۔ وہ انگریزی تعلیم میں مصروف ہیں۔ دوسری طرف سے جدید گروہ قدیم عربی تعلیم کو بیکار اور غیر مفید سمجھتا ہے۔ اس کا یہ نتیجہ ہے کہ مذہبی مدارس مالی حالت کے اعتبار سے نہایت پست ہیں اور کوئی بڑا کام انجام نہیں دے سکتے۔

ندوۃ العلماء نے اس ضرورت کا احساس کیا اور اسی لیے اس نے اپنے ارکان انتظامیہ میں دونوں قسم کے ممتاز لوگ داخل کیے۔ ایک طرف اس کے ممبر اگر مسجد کے امام اور ممبروں کے خطیب ہیں تو دوسری طرف اس کے ارکان ہائی کورٹ کے جج (مولوی شرف الدین) اور بہت سے گریجویٹ اور بیرسٹر ہیں۔

اگر مسلمانوں کی ترقی کے لیے قدیم اور جدید دونوں گروہ کی شرکت اور اعانت کی ضرورت ہے تو ندوۃ العلماء کی ضرورت سے کون انکار کر سکتا ہے؟

حضرات! تقریر مذکورہ بالا سے اس قدر بداہتاً ثابت ہو گیا کہ مسلمانوں کو ایک ایسی انجمن کی ضرورت ہے جس میں دونوں قسم کے لوگ شامل ہوں، لیکن مجھ کو اب تفصیل سے بتانا چاہیے کہ ندوے نے عملی صورت میں جس کو سب سے پہلے شروع کیا اور جس پر اب تک اس کی تمام قوت صرف ہوتی رہی ہے، یعنی ایک عربی مدرسہ (دار العلوم)، اس کی کیا ضرورت ہے؟

مسلمانوں کی جو ضرورتیں میں نے پہلے بیان کیں، ان میں سب سے پہلی چیز فلسفہ اور علوم جدیدہ کے اثر کا رد کرنا ہے۔ اس وقت تمام ہندوستان میں جس قدر اسلامی مدارس موجود ہیں دو قسم کے ہیں۔ انگریزی مدرسوں میں مذہبی تعلیم کے لیے، بہت سے بہت صرف اس قدر وقت مل سکتا ہے کہ نماز، روزہ وغیرہ کے ضروری احکام اور سادہ عقائد بتا دیے جائیں۔ اس قسم کے تعلیم یافتہ مذہبی تحقیقات اور مذہبی مباحثے اور مناظرے کا کام کیوں کر دے سکتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آج تک کوئی انگریزی تعلیم یافتہ اس قسم کی مذہبی خدمات میں مصروف نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا ہے۔

عربی قدیم مدارس کا یہ حال ہے کہ ان میں انگریزی زبان کی تعلیم ہوتی ہے، نہ جدید علوم و فنون پڑھائے جاتے ہیں، نہ نئے خیالات سے ان کو واقف کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ خود اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کی کوئی کتاب نہیں پڑھائی جاتی۔ یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کے تعلیم یافتہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے خیالات پر کیا اثر ڈال سکتے ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے دونوں گروہ ایک دوسرے کے خیالات کچھ بھی نہیں سکتے۔

اس سے میرا مقصد خدانخواستہ عربی قدیم مدارس کی تنقیص اور تحقیر نہیں ہے۔ وہ مدارس ایک بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ عام لوگوں میں نماز، روزے کا جو چرچا ہے، مساجد میں جو رونق نظر آتی ہے، دیہات اور قصبات میں جس قدر لوگ اسلام سے آشنا ہیں، سب انھیں مدارس کا فیض ہے۔ بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ ان قدیم مدارس نے جن مدارس کو لے رکھا ہے ان کے سوا اور جدید ضروریات پیدا ہو گئی ہیں اور چوں کہ ایک ہی جماعت ہر کام کو انجام نہیں دے سکتی، اس لیے ایک ایسے گروہ کی ضرورت ہے جو ان نئی ضرورتوں کو انجام دے۔

اسی بنا پر ندوے نے قدیم نصاب تعلیم کو بدل دیا، یعنی قرآن مجید، حدیث، فقہ، اصول فقہ، کے سوا باقی تمام نصاب میں ترمیم اور اضافہ کیا، بہت سی غیر ضروری کتابیں نکال دیں، قدیم فلسفے کو بہت کچھ گھٹا دیا۔ اس سے اتنا وقت نکل آیا کہ جدید ضرورت کی چیزیں اضافہ کی جا سکیں۔

جس میں علم ادب کا نصاب بہت بڑھا دیا گیا، انگریزی زبان لازمی کر دی گئی، علوم جدیدہ درس میں داخل کیے گئے۔ علم کلام کی کتابوں میں اضافہ کیا گیا اور ایک خاص درجہ علم کلام کی تکمیل کا کھولا گیا، جس میں مولویت کی سند حاصل کرنے کے بعد داخل کیا جاتا ہے اور جس میں قدیم اور جدید علم کلام اور انگریزی کی تعلیم ہوتی ہے۔

ابھی تک یہ صیغہ مکمل نہیں ہے لیکن رفتہ رفتہ اس کی تکمیل ہوتی جائے گی اور اسی شاخ سے اس قسم کے علما پیدا ہوں گے جن کی زمانہ حال کو ضرورت ہے۔

ندوۃ العلماء کا یہ دارالعلوم درحقیقت ایک جامعہ دینیہ یعنی ایک مذہبی یونیورسٹی کا سنگ بنیاد ہے اور درحقیقت ندوے کا سب سے بڑا نصب العین یہی کام ہے۔ آج مسلمانوں کو سب سے زیادہ ایک ایسی مذہبی یونیورسٹی کی ضرورت ہے، جس میں اسلامی علوم نہایت اعلیٰ درجے تک پڑھائے جائیں، جس میں خاص خاص علوم و فنون کے ماہر (اسپیشلسٹ) تیار ہوں، جس سے اسلامی مصنف اور مؤلف پیدا ہو سکیں، جس میں یورپین علوم و فنون کی تعلیم کا کافی بندوبست کیا جائے، جو جدید علم کلام پیدا کر سکے، جس کے تعلیم یافتہ انگریزی زبان میں وعظ اور مذہبی لیکچر دے سکیں۔ اس قسم کی یونیورسٹی کی ضرورت اور اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے؟

ندوے کا ایک دوسرا فرض اشاعتِ اسلام ہے۔ یہ مقصد اگرچہ مدت سے ندوے کے مقاصد میں شامل کیا گیا تھا اور اس کا انتہائی دستورالعمل مرتب ہو گیا تھا، لیکن ندوے نے قصداً اس کام کو شروع نہیں کیا اور مجھ کو تفصیل سے بتانا چاہیے کہ اس کے اسباب کیا تھے۔

اشاعتِ اسلام کی ضرورت آج کل درحقیقت اس وجہ سے بڑھ گئی ہے کہ آریوں نے تمام ملک میں اپنے سفیر اور واعظ پھیلا دیے ہیں اور انھوں نے جاہل اور نومسلم مسلمانوں پر مختلف تدبیروں سے اپنا اثر پھیلانا شروع کر دیا ہے۔ یہ حالت نہایت اندیشہ ناک ہے اور خوشی کی بات ہے کہ مسلمانوں کو ہر جگہ اس خطرے کا احساس ہو گیا ہے اور جابجا اس کے مدافعت کے لیے انجمنیں اور مجلسیں قائم ہو گئی ہیں اور ہوتی جاتی ہیں، لیکن ہم کو نہایت غور و فکر سے دیکھنا چاہیے کہ جو کوششیں کی جارہی ہیں یہ کافی ہیں یا نہیں؟ آریوں نے جن اسباب سے اپنی تحریک میں کامیابی حاصل کی ہے اور کرتے جاتے ہیں وہ دو چیزیں ہیں؛

۱..... ایثارِ نفس، یعنی ان کے واعظ نہایت ایثار نفسی، نہایت جاں نثاری، نہایت جفاکشی کے ساتھ اس کام میں مصروف ہیں۔ ان کا واعظ جو اچھے سے اچھا تعلیم یافتہ ہوتا ہے، نہایت فقیرانہ

زندگی کے ساتھ ایک ایک گاؤں میں پھرتا ہے، چھپ چھپا کر بسر کرتا ہے، راتوں کو درخت کے نیچے سو رہتا ہے، لوؤں کی لپٹ میں سفر کرتا ہے۔

۲۔۔۔ دیہات اور قصبات میں پیہم اور لگاتار کوشش جاری رکھنا۔

اس کے مقابلے میں ہمارے علما صرف شہروں پر اکتفا کرتے ہیں اور دیہات میں جاتے بھی ہیں تو ایک آدھ دن سے زیادہ قیام نہیں کر سکتے، اس لیے وہ کوئی پائدار اثر نہیں قائم کر سکتے۔

۳۔۔۔ آریہ واعظ اکثر انگریزی تعلیم یافتہ اور جدید علوم و فنون سے واقف ہوتے ہیں اور ہمارے واعظ اکثر ان علوم سے واقف نہیں ہوتے۔

۴۔۔۔ آریوں نے اپنے مذہب کا مدار صرف وید پر رکھا ہے اور کہتے ہیں وید کے معنی جو عام پنڈت بیان کرتے ہیں، وہ صحیح نہیں بلکہ وہ صحیح ہیں، جو سوامی دیانند نے بیان کیے اور چوں کہ مسلمان (ایک آدھ کے سوا) سنسکرت سے واقف نہیں، اس لیے وید کی صحت و غلطی کا کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر سکتے۔

اسبابِ مذکورہ بالا کے لحاظ سے آریوں کے مقابلے کے لیے اسبابِ ذیل کی ضرورت ہے:

۱۔۔۔ ایسے لوگ پیدا کیے جائیں جن میں ایثارِ نفسی، سادگی، جفا کشی اور جاں نثاری کے اوصاف ہوں۔

۲۔۔۔ اشاعتِ اسلام کا مستقل صیغہ قائم کیا جائے، تمام اضلاع میں اس کی شاخیں قائم کی جائیں، مستقل واعظ مقرر کیے جائیں، جو نو مسلم دیہات میں جا کر ایک ایک دو دو مہینے رہ کر اسلامی احکام اور عقائد کی تعلیم دیں۔

۳۔۔۔ عربی خوانوں کو سنسکرت اور انگریزی کی اعلیٰ درجے تک تعلیم دی جائے۔

اسی بنا پر ندوے نے دار العلوم میں انگریزی اور سنسکرت کی شاخیں کھولیں اور اشاعتِ اسلام کے مستقل صیغے کے قائم کرنے کا انتظام کیا، جس کی عملی صورت چند دنوں کے بعد نمایاں ہو گی۔

ندوے کا کام یہ ہے کہ دار العلوم میں خاص مذہبی خدمات انجام دینے والوں کی ایک جماعت موسوم کرے، ان کو مذہبی وظائف دے، ان کو وقتاً فوقتاً ان اوصاف کے پیدا کرنے کی ترغیب دلائے، تحصیل علم سے فارغ ہونے کے بعد ان کو ان کاموں میں لگائیں۔ یہ تدبیریں ندوے نے پیش نظر رکھ لی ہیں اور ان کو عمل میں لانا شروع کر دیا ہے۔ خدا ان کوششوں میں

کامیابی دے۔

آخر میں لیکن سب سے مقدم ضرورت ندوے کی یہ ہے کہ تمام مسلمانوں کا ایک مذہبی مرکز ہو، یعنی تمام مسلمانوں کے مختلف فرقے جن مذہبی کاموں میں اتفاق رکھتے ہوں، مثلاً آریوں اور عیسائیوں کی مدافعت، فلسفہ و الحاد کا رد، اشاعتِ اسلام وغیرہ وغیرہ، سب اس مذہبی مرکز سے مربوط ہوں اور ایک متفقہ قوت کے ساتھ اس کو انجام دیں۔ ہندوستان میں سیکڑوں مذہبی کام چھڑے ہوئے ہیں، لیکن چوں کہ پراگندہ منتشر اور ایک دوسرے سے بے تعلق ہیں، اس لیے کوئی بڑا کام انجام نہیں پاتا، نہ عام ملک پر اس کا کوئی اثر ہوتا۔

ایک مذہبی مرکز کی سخت ضرورت اس وجہ سے بھی ہے کہ گورنمنٹ کو اگر تمام مسلمانوں کی مشترکہ مذہبی رائے کا اندازہ کرنا ہوتا ہے تو اس کا کوئی ذریعہ نہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہماری بہت سی ضروری مذہبی تحریکیں بے اثر رہ جاتی ہیں۔ مثلاً وقف اولاد کا مسئلہ جو شیعہ سنی، مقلد غیر مقلد تمام فرقوں میں مسلم ہے باوجود اس کے پریوی کونسل نے فیصلہ کر دیا کہ وقف اولاد صحیح نہیں ہے اور شارع اسلام کا یہ منشا نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر مسلمانوں کا ایک مذہبی مرکز ہوتا اور وہ گورنمنٹ کے سامنے ظاہر کرتا کہ یہ ہمارا متفق علیہ مسئلہ ہے تو گورنمنٹ کو اس کے قبول کرنے میں کیا انکار ہو سکتا تھا؟

ان تمام واقعات کے بیان کرنے کے بعد غالباً اب کوئی مسلمان اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں کو ندوۃ العلماء کی یا ایک ایسی انجمن کی ضرورت ہے، جس کے مقاصد وہ ہوں جو ابھی ظاہر کیے گئے ہیں اور ہم اسی کو ندوۃ العلماء کہتے ہیں (۲۸)۔"

مندرجہ بالا تقریر کے بعد جلسہ نماز ظہر کے لیے برخاست ہوا اور دوسرے اجلاس میں مولانا نے یہ رزولیشن پیش کیا:

"یہ جلسہ ندوۃ العلماء کا جس میں ہندوستان کے مشہور علما اور دوسرے مسلمانوں کے سرکردہ بھی کثرت سے موجود ہیں، یہ تجویز کرتا ہے کہ وقف علی الاولاد کے مسئلے کے متعلق جو مسلمانوں کا متفق علیہ مسئلہ ہے اور جس پر ان کے خاندان کی فلاح کا مدار ہے، گورنمنٹ سے بہ ادب درخواست کی جائے کہ وہ اس مسئلے کے لیے خاص قانون موافق شرع محمدیؐ بنا کر مسلمانان ہندوستان کو شکر گزاری کا موقع عطا کرے (۲۹)۔"

آگے چل کر روداد میں اس طرح ہے:

"اخیر جنوری ۱۹۱۰ء میں مسلم لیگ کا جو جلسہ دہلی میں ہوا تھا، اس میں بھی یہ مسئلہ پیش کیا گیا اور یہ طے ہوا کہ چوں کہ اس مسئلے میں ملکی اور مذہبی دونوں حیثیتیں جمع ہو گئی ہیں، اس لیے گورنمنٹ کی خدمت میں ایک ایسا ڈپوٹیشن روانہ کیا جائے، جو علما اور انگریزی داں اصحاب دونوں سے مرکب ہو۔ چناں چہ مولانا شبلی نعمانی نے اس رزولیشن کے پیش کرتے وقت اس مسئلے کی اصل حقیقت اور اس کے علل و اسباب پر ایک مفصل تقریر کی اور اس کے ضمن میں ان تمام کوششوں کا ذکر کیا جو اس زمانے میں اس مسئلے کے متعلق ہو چکی تھیں (۳۰)۔"

مولانا نے اپنے سفر ۱۸۹۲ء کے بعد جو تعلیم کا خاکہ بنایا تھا اور جس کا اظہار انھوں نے ندوۃ العلماء کے پہلے جلسے منعقدہ ۱۸۹۴ء میں کیا تھا اس پر وہ اب بھی قائم تھے، جس کا ثبوت ان کی دہلی کے جلسے میں اوپر دی ہوئی تقریر ہے۔ مولانا نے سر سید کے جذبات سے بھی فائدہ اٹھایا تھا، مگر ان کا نظریہ سر سید کے نظریے سے ذرا مختلف تھا۔ سر سید مغربی تعلیم کو اولیت کا درجہ دیتے تھے اور دینی و مذہبی تعلیم کو ان کے کالج میں ثانوی حیثیت حاصل تھی۔ مولانا کا خیال اس کے برعکس تھا۔ وہ دینی و مذہبی تعلیم کو اولیت کا درجہ دیتے تھے اور مغربی تعلیم کو ثانوی حیثیت سے رکھنا چاہتے تھے اور اسی کو ندوۃ العلماء کی بنیاد بنائی تھی اور اسی کو ندوے کا مقصد بتاتے تھے۔ ندوے کے ہر جلسے کی تقریر میں انھوں نے اسی پر زور دیا اور یہاں تک کہا کہ اگر صرف قدیم تعلیم ہونی ہے تو پھر ندوے کی کیا ضرورت ہے، اس لیے کہ دیوبند وغیرہ کے مدرسے موجود ہیں اور اگر صرف مغربی تعلیم دی جاتی ہے تو اس کے لیے علی گڑھ کالج موجود ہے۔ وہ قدیم و جدید کے ڈانڈوں کو ملانا چاہتے تھے اور بار بار اس پر زور دیتے تھے۔ اس بات کو منوانے کے بعد ان کا زور درس نظامی میں تبدیلی کرنے پر تھا جس کو انھوں نے اپنی مدلل تقریروں سے ندوہ والوں سے بھی منوالیا تھا اور نصاب بھی تیار کر لیا تھا، مگر اس کے نفاذ پر ندوے والے تیار نہ تھے، جس کو انھوں نے ندوے میں قیام کر کے بحیثیت معتمد تعلیم رائج بھی کر دیا۔ چناں چہ ان کی ۱۹۱۰ء (دہلی کے جلسے) کی تقریر گویا ۱۸۹۴ء کی تقریر کا اعادہ ہے، مگر انداز بدل گیا ہے اور عملی طور پر جو اب تک نتائج نکلے ہیں اس نے ان کو بہت کچھ مطمئن کر دیا ہے اور آئندہ کی اسکیموں کے لیے ان کو امید اور ہمت دلائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تقریروں میں اب اعتماد پیدا ہو گیا ہے اور وہ تنقید کی پروا کیے بغیر اپنے خیالات کو پیش کرتے ہیں اور ہر تنقید کا جواب ان کی عملی کوشش کی کامیابی اور طلبہ کا عام جلسوں میں امتحان دینا ہے جس میں وہ بڑی حد تک پورے اترتے ہیں۔ مولانا کی اس تقریر کے

بعد سامعین ندوے سے خاصے متاثر ہوئے جس کے متعلق روداد میں اس طرح ہے:

"ارباب دہلی اور دیگر شرکا کو اگرچہ ندوۃ العلماء کے مقاصد و اغراض کی اہمیت اور عظمت کا پہلے ہی سے اعتراف تھا لیکن ان میں زیادہ تر ایسے اصحاب تھے جن کو یہ مقصد محض اجمالی طور پر معلوم تھے اور عملی تجربہ تو بالکل نہ تھا، لیکن پہلے دن کے جلسے میں صدر انجمن صاحب کی تقریر اور مولانا شبلی نعمانی کے لکچر نے ان مقاصد کی تشریح اس وضاحت اور تفصیل کے ساتھ کر دی کہ ان کا حسن ظن اور بھی زیادہ ہو گیا (۳۱)۔"

۲۷۔ مارچ کو پہلے اجلاس میں مولانا نے ایک اور تقریر کی، چناں چہ روداد میں اس طرح ہے:

"اس کے بعد ایک ایسی اہم اور ضروری تجویز پیش ہوئی جس پر تمام ملک کا امن و انتظام موقوف ہے، یعنی ان باغیانہ افعال سے اظہار نفرت کا رزولیشن پیش ہوا جن کے آثار جابجا ملک میں پائے جاتے ہیں۔ چناں چہ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی نے اس تجویز کی تحریک کرتے وقت ایک پر مغز تقریر فرمائی (۳۲)۔"

مولانا کی تقریر حسب ذیل ہے:

"حضرات! یہ رزولیشن ایک پولیٹکل حیثیت رکھتا ہے اور اس حیثیت سے وہ ندوے کے دائرے سے الگ ہے، کیوں کہ ندوے کا اول اصول یہ ہے کہ وہ کسی سیاسی معاملے سے کچھ تعلق نہیں رکھتا، لیکن اس کا ایک پہلو بھی ہے یعنی مذہبی، اور میں اسی پہلو سے اس کو آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

حضرات آپ کو معلوم ہے کہ مسلمانوں کا ہمیشہ سے یہ شعار رہا ہے کہ وہ اپنے فرماں روائے وقت کے، گو وہ کسی مذہب کا ہو، مطیع اور مخلص رہے ہیں اور چوں کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل سے اس کی شہادت ملتی ہے، اس لیے وہ درحقیقت ایک مذہبی مسئلہ کہا جا سکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی بعثت میں جب کہ مکہ کے لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں کا رہنا مکہ میں مشکل کر دیا تھا اور طرح طرح سے ان کو تکلیفیں دیتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جاں نثاروں کو ہدایت فرمائی کہ وہ حبشہ چلے جائیں، جہاں کا بادشاہ ایک عادل نصرانی تھا۔ اس ہدایت کے موافق صحابہؓ کا ایک گروہ کثیر حبشہ کو چلا گیا اور بادشاہ حبش نے ان کو اپنے سایہ عاطفت میں رہنے کی اجازت دی۔ اتفاق یہ کہ اسی زمانے میں حبش پر کسی دشمن نے چڑھائی کی اور بادشاہ

کو ان کے مقابلے کے لیے فوجیں بھیجنی پڑیں۔ صحابہؓ نے یہ خبر سن کر خاص اپنا ایک قاصد بھیجا اور کہا کہ ہم کو وہاں سے جا کر اطلاع دو۔ اگر اعانت اور مدد کی ضرورت ہو تو ہم بھی آکر بادشاہ کی طرف سے دشمنوں سے لڑیں گے۔

صحابہؓ ہر نماز کے بعد بادشاہ حبش کی فتح کی بھی دعا مانگتے تھے۔

تاتاریوں کے زمانے میں ایک ملک کا بڑا حصہ تاتاریوں کے قبضے میں آگیا۔ اس وقت مسلمانوں نے ان کی زیر حکومت نہایت وفاداری ظاہر کی۔ یہاں تک کہ پایہ تخت کے بڑے بڑے عہدے مسلمانوں ہی کو ملتے تھے۔ چناں چہ محقق طوسی ہلاکو کے وزیر اعظم تھے اور خواجہ شمس الدین کو تاتاریوں کے دربار میں وہ رسوخ حاصل تھا کہ سیاہ و سفید انھی کے ہاتھ میں تھا۔

سسلی کا جزیرہ جب راجر نے فتح کر لیا تو اس وقت بھی مسلمان اسی اصول پر قائم رہے اور اس کا یہ نتیجہ تھا کہ جب علامہ ابن جبیر نے سسلی کا سفر کیا تو دیکھا کہ یہ عیسائی بادشاہ سب سے زیادہ مسلمانوں ہی پر اعتماد رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے کھانے کے مہتمم اور میر خوان مسلمان ہی تھے۔

ان واقعات سے آپ کو معلوم ہو گا کہ بادشاہِ وقت کا وفادار ہونا مسلمانوں کا ایک مذہبی شعار ہے، جس پر ابتدا سے آج تک عمل ہوتا آیا ہے۔ اس لیے میں تحریک کرتا ہوں کہ یہ رزولیشن منظور کیا جائے (۳۳)۔"

اس رزولیشن کے پیش کرنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ حکومت کو اطمینان دلایا جائے کہ ندوے سے اس کو خطرہ محسوس نہیں کرنا چاہیے۔ اس سے قبل مولانا سے حکومت چوکنا رہتی تھی اور علی گڑھ کالج سے استعفا دینے کا ایک سبب یہ بھی تھا، مولانا سے بدگمانی کی وجہ سے ندوے سے بھی بدگمانی تھی، جس کو پٹیالہ کے وزیر اعظم محسن الملک نے دور کرنے کی کوشش کی تھی اور حکیم اجمل خان نے تو غلط فہمی دور کر کے ہی دم لیا۔ اب اگرچہ وہ نگاہِ غضب تو نہ رہی تھی، مگر مولانا اور ندوے والوں کے جذبہ اسلامی سے حکومت کا خائف رہنا قدرتی بات تھی۔ حکومت کی اس قسم کی غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے اس قسم کے رزولیشن بھی ندوے میں پاس کیے جاتے تھے۔ تقریر کی ابتدا میں ندوے کا سیاست سے علاحدہ رہنے پر اظہار حکومت کی تسلی کے لیے ہے، دوسرے یہ کہ گورنمنٹ سے اب ندوے کو انگریزی تعلیم کے سلسلے میں امداد بھی مل رہی تھی، اس لیے بھی قابل اعتراض باتوں سے پرہیز لازمی تھا۔ مولانا نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مفصل رپورٹ پیش کرتے ہوئے، مختصر تقریر کی جس کے متعلق روداد میں اس طرح ہے:

"دارالعلوم کے متعلق سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ملک میں عربی اور انگریزی دونوں قسم کی تعلیم کے سیکڑوں مدرسے موجود ہیں، ان کے ہوتے ہوئے کسی جدید مدرسے کے لیے اس قدر اہتمام اور جد و جہد کی کیا ضرورت ہے؟

اس سوال کے جواب کے لیے ہم کو قوم کی موجودہ حالت پر نظر ڈالنی چاہیے۔ یہ مسلم ہے کہ مسلمانوں کی قومیت، نسل یا ملک کی بنا پر نہیں ہے بلکہ ان کی قومیت صرف مذہب ہے۔ کوئی شخص گو وہ کسی نسل، کسی خاندان، کسی ملک کا ہو، جب اسلام قبول کر لیتا ہے تو فوراً مسلمانوں کی قوم میں شامل ہو جاتا ہے اور اس کو تمام وہ حقوق حاصل ہو جاتے ہیں، جو خلیفہ، اسلام یا امیر المومنین کو حاصل ہیں۔ اس بنا پر اگر ہم کو مسلمانوں کی بقا کی کوشش کرنا ہے، تو سب سے پہلے اس کی کوشش کرنی چاہیے کہ ان کا مذہب قائم رہے۔

مذہبی حالت، مذہبی احکام، مذہبی تاریخ کے قائم رکھنے کے لیے تقسیم عمل کے اصول کے موافق ابتدا ہی سے ایک گروہ مخصوص ہو گیا تھا، جس کے متعلق خاص یہ خدمت تھی اور وہ علما کے نام سے موسوم تھا، لیکن چوں کہ اختلاف حالات کے لحاظ سے ملک اور قوم کی حالت میں تغیر ہوتا رہتا تھا، ایسے علما کے فرائض اور ان کی تلقین اور رہنمائی کے طریقے بھی بدلتے رہتے تھے۔ مثلاً پہلی صدی میں علما کے لیے صرف تفسیر، حدیث، فقہ سے واقف ہونا ضروری تھا لیکن دوسری صدی میں جب یونانی علوم و فنون کا ترجمہ ہوا اور فلسفے کے اثر سے عقائد میں تزلزل آنے لگا تو فلسفے کو سیکھنا اور اس کے غلط مسائل کا باطل کرنا، صحیح مسائل کا شریعت سے تطبیق دینا، یہ باتیں بھی علما کے فرائض میں داخل ہو گئیں اور اسی بنا پر متکلمین کا گروہ پیدا ہو گیا۔

یہ ظاہر اور بدیہی ہے کہ آج ہندوستان میں موجودہ سلطنت اور موجودہ یورپین علوم و فنون کے اثر سے قوم کے خیالات میں، معلومات میں، مذاق میں، میلان طبع میں عظیم الشان انقلاب پیدا ہو گیا ہے۔ ایسی حالت میں کیا وہ علما قوم کی رہبری اور پر مذہبی حکومت کر سکتے ہیں جو آج کل کے علوم کی تحقیقات اور آج کل کے حالات سے محض ناآشنا ہوں۔ آج تمام ہندوستان میں جو عربی مدارس قائم ہیں، کیا ان میں موجودہ حالات اور موجودہ ضرورتوں کا ذرہ بھر بھی لحاظ رکھا گیا ہے؟ قوم وہ تیار ہو رہی ہے جو کالجوں میں اپنی آنکھ سے پانی کو دو جزوں میں تحلیل ہوتے دیکھتی ہے، یعنی پانی کے دو جز الگ کر دیے جاتے ہیں، جو لطیف گیس بن جاتے ہیں اور پھر دونوں کے ملا دینے سے پانی بن جاتا ہے اور ہمارے مدرسوں میں اب تک یہی پڑھایا جاتا ہے کہ پانی بسیط ہے اس میں کسی طرح اجزا کی تحلیل نہیں ہو سکتی۔ اس کا نتیجہ

یہ ہے کہ جدید تعلیم یافتہ گروہ سے (اور یہی گروہ روز بروز بڑھتا جائے گا) علما کا اثر بالکل جاتا رہا اور محض ناممکن ہو گیا ہے کہ قدیم علما ان نئے پڑھے ہوئے جتوں کو قابو میں لا سکیں۔

ان حالات کی بنا پر چند روشن ضمیر علما نے ایک مجلس قائم کی، جس کا نام ندوہ رکھا اور جس کا اصلی مقصد اسی مشکل کا حل کرنا تھا۔ رفتہ رفتہ اس مجلس نے اپنے مقاصد میں توسیع کی، یعنی دار الافتاء اور اشاعت اسلام وغیرہ بھی اس میں داخل کر لیے۔ تین برس تک ندوے کے اجلاس بڑے زور شور سے ہوتے رہے، لیکن اصل مقصد کا ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا اور نہ بڑھ سکتا تھا۔ اصل مسئلہ نصاب تعلیم کی اصلاح کا تھا، یعنی عربی کا جو نصاب زیر درس ہے، اس میں ضروریات حال کے لحاظ سے ترمیم و اضافہ کیا جائے۔ یہ مسئلہ جب اجلاسوں میں پیش ہوتا تھا تو جدید الخیال علما اس کی ضرورت پر پرزور تقریریں کرتے تھے، لیکن عملی کام جن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے یعنی مدارس عربیہ کے منتظمین اور مدرسین، وہ تغیر و تبدل کو گوارا نہیں کرتے تھے۔ ندوے کا ایک اور مقصد رفع نزاع تھا یعنی مسلمانوں کے مختلف فرقوں مثلاً شیعہ، سنی، مقلدین و غیر مقلدین وغیرہ وغیرہ میں جو رات دن جنگ و جدل رہتی ہے اور عدالت فوجداری تک نوبت آتی ہے، اس کی اصلاح کی تدبیر کی جائے، جس کا یہ طریقہ ہے کہ عقائد اور مسائل کے اظہار اور مناظروں کی کتابوں میں لعن طعن، سب و شتم، تکفیر و تفسیق سے کام نہ لیا جائے بلکہ وجادلھم بالتی ھی احسن کا لحاظ رکھا جائے، لیکن اس مقصد میں بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ ارکان ندوہ نے جب اس پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ جو لوگ قدیم طریقے کے موافق تعلیم پا چکے ہیں، وہ کبھی جدید نصاب پر راضی نہیں ہو سکتے، اسی طرح جن لوگوں نے قدیم طریقے پر تربیت پائی ہے وہ مذہبی جھگڑوں اور نزاعوں سے باز نہیں آ سکتے۔ ان کے نزدیک اپنے مخالف کی تکفیر اور تفسیق کرنا مذہبی حرارت اور مذہبی جوش کی ضروری شرط ہے۔

اس بنا پر ارکان ندوہ نے خیال کیا کہ جب تک ندوہ اپنا خود ایک دار العلوم نہ قائم کرے، جس میں اس کا مجوزہ نظام تعلیم پڑھایا جائے اور جس میں خاص طریقے پر تربیت ہو اس وقت تک کسی مقصد میں کامیابی نہیں ہو سکتی۔ اس خیال کے موافق ۱۳۱۳ھ (۱۸۹۵ء) میں مجوزہ دار العلوم کا خاکہ (پراسپیکٹس) تیار کر کے ملک میں شائع کیا گیا اور علما و فضلا سے رائیں طلب کی گئیں۔ تمام علما نے اس سے اتفاق کیا اور تحریری رائیں بھیجیں۔ چناں چہ وہ سب رائیں ایک رسالے کی صورت میں شائع ہو چکی ہیں۔ شوال ۱۳۱۳ھ میں جس کو آج چودھواں سال ہے، یہ

سب رائیں ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس بمقام بریلی میں پیش کی گئیں اور علما کی زبانی تقریروں کے بعد مولانا مفتی لطف اللہ صاحب نے اس کی منظوری کا اعلان عام کر دیا۔

۱۳۱۵ھ (۱۸۹۸ء) میں بمقام کانپور ندوہ کے اجلاس پنجم میں یہ تجویز منظور ہوئی کہ بالفعل دارالعلوم کی ابتدائی شاخ بمقام لکھنو کھول دی جائے۔ خان بہادر منشی اطہر علی صاحب مرحوم اور منشی احتشام علی صاحب نے فیاض دلی سے نو ہزار دو سو روپیہ پر ایک (۳۴) مکان خرید کر کے اس شرط پر ندوہ کو دیا کہ دارالعلوم اس میں کھولا جائے اور جب ندوہ یہ رقم ادا کر دے تو مکان اس کی ملکیت ہو جائے گا۔ چناں چہ کئی سال کے بعد ندوے کے سرمایے سے وہ رقم ادا کر دی گئی اور اب یہ مکان ندوے کی ملک ہے۔

جلسہ انتظامیہ مورخہ ۹ جمادی الاول ۱۳۱۶ھ مطابق ۶- ستمبر ۱۸۹۸ء میں دارالعلوم کا ابتدائی درجہ اس مکان میں کھولا گیا۔ افتتاح رسم بڑے سروسامان سے عمل میں آئی۔ ہندوستانی اکابر کے علاوہ مسٹر ہارڈی صاحب کمشنر اور مسٹر گرے صاحب ڈپٹی کمشنر بھی شریک جلسہ تھے (۳۵)۔"

اسی روداد میں آگے چل کر اس طرح ہے:

"ندوے کے اہم المقاصد ایسے علما کا تیار کرنا ہے جو عربی اور انگریزی دونوں زبانوں کے ماہر ہوں۔ اس بنا پر شوال ۱۳۱۸ھ (۱۹۰۰ء) کے جلسہ انتظامیہ میں یہ رزولیشن منظور ہوا کہ انگریزی زبان بطور زبان ثانی کے درس میں داخل کی جائے۔ یہ رزولیشن اگرچہ چند ارکان کی موجودگی میں منظور ہو گیا، لیکن بعض معزز ارکان نے سخت مخالفت کی یہاں تک کہ اگر انگریزی جاری کی گئی تو وہ دارالعلوم کو توڑ دیں گے۔ تاہم استقلال کے ساتھ اس مخالفت کا مقابلہ کیا گیا اور ربیع الاول ۱۳۱۹ھ (۱۹۰۱ء) میں انگریزی زبان جاری کر دی گئی، لیکن اب ایک مدت تک محض برائے نام رہی۔ پندرہ روپے ماہوار کا ایک ماسٹر تھا اور سیکڑوں لوگوں میں سے چار پانچ وہ بھی ذرا دیر کے لیے انگریزی پڑھ لیتے تھے۔ سیکریٹری (۳۶) دارالعلوم نے جب ندوے میں آکر قیام کیا تو اس طرف خاص توجہ کی جلسہ انتظامیہ میں یہ تجویز منظور کرائی کہ انگریزی زبان ہر لڑکے کے لیے لازمی قرار دی جائے (۳۷)۔"

مندرجہ بالا اقتباس سے پتا چلتا ہے کہ انگریزی کی مخالفت کا مولانا ہی نے مقابلہ کیا اور انگریزی جاری کر کے دم لیا۔ جلسہ انتظامیہ پر بھی دلائل کے زور سے ان کا اتنا اثر تھا۔ اس میں

بھی ہر لڑکے کے لیے انگریزی لازمی قرار دے دی گئی۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی گورنمنٹ کی امداد کے بارے میں اس طرح روداد میں ہے:

"دارالعلوم میں چوں کہ مذہبی تعلیم کے ساتھ دنیوی تعلیم بھی داخل ہے، اس لیے خاص اس شاخ کی وسعت اور ترقی کے لیے یہ مناسب سمجھا گیا کہ گورنمنٹ کے اس عطیے کو قبول کیا جائے جو گورنمنٹ عموماً دنیوی تعلیم کے متعلق اور مدارس اور مکاتب کو دیتی ہے۔ چناں چہ ۱۹۰۸ء میں اس کے متعلق افسران سررشتہ تعلیم سے خط و کتابت شروع ہوئی اور انھوں نے مدد دینے کا ارادہ ظاہر کیا۔ ارکان ندوہ نے مراسلات میں یہ ظاہر کر دیا کہ ہم کو یہ اعانت اس شرط پر منظور ہے کہ ہماری طرز تعلیم اور اصول اور نصاب تعلیم میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کی خواہش نہ ظاہر کی جائے۔ چناں چہ اس اصول کے موافق ۱۹۰۸ء میں پانچ سو روپے ماہوار کا عطیہ گورنمنٹ نے منظور کیا۔ چوں کہ بعض مخالفوں نے عوام میں یہ مشہور کرنا چاہا ہے کہ اس اعانت کے بدلے ہماری آزادی جاتی رہے گی اور ہم اس طرز تعلیم کے پابند ہو جائیں گے جو اور انگریزی مدارس میں جاری ہے، اس لیے ہم ڈائرکٹر صاحب تعلیمات کے مراسلے کا ترجمہ بعینہٖ اس مقام پر درج کرتے ہیں۔

نقل حکم گورنمنٹ نمبر ۹۷۷ / ۲۹-۱۵، مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۹۰۸ء، از طرف سی ایس بی کینڈال اسکوائر آئی سی ایس انڈر سکریٹری گورنمنٹ ممالک متحدہ (ایجوکیشنل ڈیپارٹمنٹ)

بنام ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن ممالک متحدہ الہ آباد ۱

بحوالہ آپ کے مراسلہ نمبر جی (۳۳۸) ۲-۱۷ مورخہ ۲۸-۱ اکتوبر ۱۹۰۸ء کے مجھ کو ہدایت کی گئی ہے کہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کو بطور گرانٹ ان ایڈ کے ۵۰۰ روپے ماہوار کے دیے جانے کی اطلاع دوں۔ یہ رقم اس غرض سے دی جاتی ہے کہ کمیٹی انتظامیہ انگریزی اور ریاضی کی تعلیم کا مناسب انتظام کر سکے اور جدید عربی کے لیے ایک لائق پروفیسر اور ایک موزوں پرنسپل کی خدمات حاصل کر سکے۔ کمیٹی کو یہ امر اچھی طرح سمجھا دینا چاہیے کہ یہ مدد محض دنیاوی تعلیم کے لیے دی جاتی ہے اور یہ کہ مذہبی اور دنیوی تعلیم میں ایک حد فاصل کر دینی چاہیے اور نیز دنیاوی تعلیم کا محکمہ تعلیم کی جانب سے معائنہ ہو سکے گا۔ اس مدد کے اخراجات مالی سال رواں کے اس بجٹ سے دیے جائیں جو محکمہ کے بجٹ میں ہو۔

دفتر انسپکٹر اسکول حلقہ لکھنؤ

نمبر ۲۹۸ / ۱۱۳ بابت ۰۹-۱۹۰۸ء

(دستخط) ہیڈ کلرک

نقل سکریٹری دارالعلوم اسکول لکھنؤ کے پاس بغرض اطلاع بھیجی گئی۔

از جانب اے ای رچرڈسن ایم اے

انسپکٹر اسکول حلقہ لکھنؤ

اس تحریر سے صاف ظاہر ہے کہ گورنمنٹ نے ہماری مذہبی تعلیم میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی ہے اور اپنی مدد انگریزی اور ریاضی پر محدود رکھی ہے اور صاف بتا دیا ہے کہ اس عطیے کے استعمال کے لیے دنیوی اور دینی تعلیم میں حد فاصل قائم کی جائے۔

گورنمنٹ کے اس عطیے سے دنیوی تعلیم کی شاخ مستحکم اور مضبوط ہو گئی۔ دو جدید انگریزی کے ماسٹر مقرر کیے گئے جن میں قاضی تلمذ حسین ایم اے جو لندن ایشیاٹک سوسائٹی کے ممبر ہیں اور سید باقر حسین جو سیکنڈ ماسٹر ہیں ایک قابل بی اے ہیں ان دونوں صاحبوں کے علاوہ دو اور ماسٹر ہیں جو انٹرنس کی لیاقت رکھتے ہیں۔ جدید انتظام سے اس بات کا اطمینان ہو گیا کہ جو لڑکے دارالعلوم میں ابتدا سے تعلیم پائیں گے وہ آٹھ برس میں درجہ مولویت کے ساتھ انگریزی میں انٹرنس کی لیاقت حاصل کریں گے اور جب وہ درجہ تکمیل میں دو برس تک اور صرف انگریزی پڑھیں گے تو زبان دانی میں قابل گریجویٹوں کی برابری کر سکیں گے اور اس وقت انگریزی زبان میں تبلیغ اسلام کی خدمت بخوبی انجام دے سکیں گے (۳۸)۔"

مولانا کے ذہن میں دارالمصنفین کا تخیل عرصے سے تھا اور وہ ندوے کے درجہ تکمیل کے طلبہ کی تربیت کر کے ان کو اس قابل بنانا چاہتے تھے کہ ان کو تصنیفی سلیقہ آجائے اور وہ مصنف بن سکیں، لہٰذا اس پر وہ پوری توجہ دے رہے تھے اور ندوے کے سالانہ اجلاس میں اس پر لوگوں کو توجہ دلاتے رہتے تھے۔ چناں چہ اس جلسے میں بھی درجہ تکمیل کے متعلق اس طرح اظہار خیال کیا:

"یہ درجہ حقیقت میں ندوے کا حاصل زندگی ہے۔ اس وقت تک تمام ہندوستان میں طریقہ تعلیم یہ ہے کہ ایک نصاب معین، جس میں تمام علوم و فنون اوسط درجے تک پڑھائے جاتے ہیں، سب پڑھتے ہیں اور مولوی کی سند حاصل کر لیتے ہیں، لیکن اس کے بعد کوئی شخص کسی ایک خاص فن کو لے کر اس کی تحصیل اس طرح نہیں کرتا کہ اس فن کا کامل بن جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تمام ہندوستان میں ایک شخص بھی کسی ایک فن کا کامل نہیں۔ اتفاق سے مدت کے درس و تدریس

> کے بعد کوئی کسی فن میں ممتاز ہو جائے تو یہ شاذ و نادر واقعہ ہے۔ اس بنا پر دارالعلوم ندوہ کی تجویز میں ابتدا ہی سے تکمیل کا درجہ رکھا گیا تھا، لیکن آمدنی کی کمی سے اس کا انتظام نہیں ہو سکا تھا۔
>
> جلسہ انتظامیہ مورخہ یکم مئی ۱۹۰۹ء میں یہ طے پایا کہ سردست علم کلام اور علم ادب کا درجہ تکمیل کھول دیا جائے اور ایک کمیٹی منتخب ہوئی جو اس درجے کا نصاب تعلیم مقرر کر دے، چناں چہ کمیٹی مذکورہ نے نصاب تجویز کر کے تمام ہندوستان کے علما کے پاس بھیجا، اکثر علما نے رائیں بھیجیں۔ مجلس دارالعلوم منعقدہ ۳۰۔ جون ۱۹۰۹ء میں ان تمام آرا کے اشتمال اور اقتباس سے حسب ذیل نصاب مقرر کیا گیا (۳۹)۔"

اس کے بعد نصاب کی تفصیل دیتے ہوئے مولانا نے علما کے اختلافات کا بھی ذکر کیا اور حریت کی خرابی کو اس کا ذمے دار قرار دیا اور اس خرابی کو دور کرنے والا ندوے کو قرار دیا۔ اس کی مثال میں ندوے کے مستطیع اور غیر مستطیع طلبہ کے ساتھ یکسانیت کا برتاؤ اور کھانے میں کسی ترجیح کا نہ ہونا اور ایک ہی قسم کا دونوں قسم کے طلبہ کو کھانا دیا جانا ایک ایسی مثال قرار دی جو خود داری، عزت نفس، بلند خیالی، حمیت اور غیرت پیدا کرتی ہے۔

ندوے کی جدید عمارت کے سنگ بنیاد رکھنے کے متعلق روداد میں اس طرح ہے:

> "۲۸۔ نومبر ۱۹۰۹ء میں عمارت کے سنگ بنیاد رکھنے کی تاریخ قرار پائی اور جناب ہز آنر (۴۰) موصوف سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنے ہاتھ سے عمارت کا پتھر نصب فرمائیں۔"

عجیب حسن اتفاق ہے ہندوستان کا سب سے بڑا دارالعلوم، لکھنؤ کا فرنگی محل تھا جو درس نظامیہ کا بانی ہے اور جس کے دامن فیض سے مولانا بحرالعلوم، ملا حمد اللہ اور ملا حسن وغیرہ تعلیم پا کر نکلے۔ یہ محلہ فرنگی محل اس لیے کہلاتا تھا کہ ایک فرنگی اس میں آکر رہا تھا اور اس لیے محلہ اس کی طرف منسوب ہو گیا تھا۔ اس جدید دارالعلوم کی بنیاد ہز آنر لفٹنٹ گورنر نے رکھی کہ وہ بھی اہل فرنگ میں ہمارے معزز دوست ہیں۔ میر اکبر حسین صاحب نے اس موقع پر حسن اتفاق سے شاعرانہ کام لیا چناں چہ کہتے ہیں:

رکھی بنائے ندوہ ہز آنر نے آ کے خود — سچ پوچھیے اگر تو فرنگی محل یہ ہے (۴۱)

دارالعلوم کے طلبہ کی استعداد بتلانے کی خاطر سالانہ جلسے میں ان کا امتحان لیا جاتا تھا، چناں چہ اس جلسے میں بھی امتحان لیا گیا۔ اس کے متعلق روداد میں اس طرح ہے:

"مولانا شبلی صاحب نے رپورٹ پیش کرنے کے بعد تحریک کی کہ جو طلبہ اس موقع پر موجود ہیں، ادب اور انشا پردازی میں ان کا مکمل امتحان لے لیا جائے، تاکہ اس امتحان کے ذریعے سے رپورٹ کی عملی تصدیق ہو جائے۔ چناں چہ پہلے چند طلبہ کا تحریری امتحان ہوا (۴۲)۔"

اس کے بعد سید امداد حسین نے بھاشا زبان میں برجستگی سے تقریر کی، جس کے متعلق روداد میں اس طرح ہے:

"سید امداد حسین نے جس برجستگی کے ساتھ بھاشا میں تقریر کی، اس کے صلے میں اگرچہ متعدد رقمیں نقد روپے کی صورت میں پیش کی گئیں، لیکن اس کے علاوہ جوش کی حالت میں چند بزرگوں نے دوسرے طریقے سے بھی اس تقریر کی خوبی کا اعتراف کیا۔ اعیان بھاول پور میں سے متعدد اصحاب نے جیب سے نکال کر اپنی گھڑیاں اس کی جیب میں ڈال دیں، خواجہ عبدالصمد صاحب ککڑو رئیس کشمیر نے ایک نقرئی تمغہ اس کے سینے پر آویزاں کیا اور اس سلسلے میں جو چیز اس طالب علم کے لیے سب سے زیادہ قابل فخر ہو سکتی ہے، وہ مولانا شبلی نعمانی کی وہ عبا ہے جو انھوں نے اپنے بدن سے اتار کر خود اپنے ہاتھ سے اس کو پہنایا تھا (۴۳)۔"

مولوی مرغوب احمد صاحب دہلوی نے ندوے کی تعریف میں ایک عربی قصیدہ پڑھا، جس میں مولانا شبلی کا ذکر خاص طور پر کیا گیا ہے۔ چند اشعار یہ ہیں:

والندوة العلما على ندوات غيرهم ۔ ولو فوت الباء والمقنى
فاقت علوا مثل مافاقت ذكا ۔ ءعلى النجوم ومطلعاً حلز العر به
بركاتها انتشرف حوالى مصرنا ۔ ففدت مفتحه الابواب العمى
وقوامها الشبلى ذالبحر العلو ۔ م البارع اطبر النبيل المقتدے
فبعيه جات كروض باسم الا ۔ زهار فى حسن المناظر والشذا
فسعود هالا زوال وادلو محياها ۔ حيا وجودها رى الصدے (۴۴)

اور مولوی عبدالحی صاحب ماتریدی رئیس سہارن پور نے اپنے عربی قصیدے میں اس طرح مولانا شبلی کا ذکر کیا تھا۔

وسيدنا شبلى عين اوانه ۔ وخير ذكى ناصح القوم قاصر
اخوالفصل شمس العلم ان له ۔ مصنفات كبارا ضمنا الدفاتر
فتى عيش فى اصلاح قوم وما حلا ۔ له العيش فيما شانهم والذخائر

مولانا ایک عرصے سے دار المصنفین کا تخیل رکھتے تھے اور ندوے کے درجہ تکمیل کے طلبہ کو ایک خاص فن میں تربیت دے کر تالیف و تصنیف کے قابل بنانا چاہتے تھے۔ اس خیال کا بار بار اظہار کر چکے تھے۔ ندوے میں وہ صیغہ تالیف و تصنیف کے کھولنے پر زور دیتے رہتے تھے چناں چہ ۱۹۱۰ء کی روداد میں بھی اس پر زور دیا گیا ہے۔ روداد میں اس طرح ہے:

"ندوۃ العلماء جس قسم کے طلبہ اپنے مدرسے میں تیار کرنا چاہتا ہے، وہ اس اسکیم سے ظاہر ہے کہ یہاں کے طلبہ درجہ عالیت یا درجہ تکمیل کے بعد تالیف و تصنیف میں مشغول ہوں اور ایک بڑے پیمانے پر صیغہ تالیف و تصنیف قائم کیا جائے۔ جس سے علوم و تاریخ اسلام کا احیاء ہو۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ کام اسی وقت پورا ہو سکتا ہے، جب ندوۃ العلماء کے احاطے میں ایک عظیم الشان کتب خانہ ہو، جس میں تمام نادر تصنیفات موجود ہوں۔ اردو زبان کی بہترین مذہبی لائف الفاروق ہے لیکن حضرات آپ کو معلوم ہے کہ یہ پانچ سو صفحات کی کتاب ہندوستان، مصر، قسطنطنیہ کے تمام کتب خانوں کو کھنگال کر لکھی گئی ہے۔ لیکن یہ امر بدیہی ہے کہ ہر مصنف کو یہ فرصت و وسعت نہیں مل سکتی ہے کہ وہ ایک ایک تصنیف کی خاطر تمام روئے زمین کا سفر کرے، یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں عمدہ تصنیفات شاذ و نادر طبع ہوتی ہیں۔ اگر قوم ندوۃ العلماء کے اقتدار میں ایک ایسا کتب خانہ تیار کر دے جو تمام ضروری اسلامی تالیفات کو محیط ہو تو یقیناً یہ کہا جا سکتا ہے کہ مفید تالیفات کا ذخیرہ اردو زبان میں نہایت آسانی سے جمع ہو جائے اور خصوصاً اس اسکیم کی قوت سے فعل میں آنے کی صورت پیدا ہو گی کہ ممتاز طلبائے دار العلوم کا ایک حصہ صیغہ تالیف و تصنیف کے لیے وقف کیا جائے جس کی قوم کو اس وقت نہایت ضرورت ہے (۴۵)۔"

انگریزی مدارس میں جو تاریخی کتب رائج تھیں ان کی غلطیوں پر بھی مولانا کی نظر تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ان اغلاط کو تاریخ کی کتابوں سے دور کیا جائے۔ اس لیے انگریزی خواں طبقہ ان کو پڑھ کر اپنے اسلاف کے متعلق غلط فہمی اور بدگمانی میں مبتلا ہو رہا تھا۔ اس کے لیے مولانا نے اس جلسے میں تحریک کی جس کے متعلق روداد میں اس طرح ہے۔

دوسرا ریزولیشن جو مولانا شبلی صاحب نعمانی کی تحریک اور مولوی عبدالوہاب صاحب بہاری کی تائید سے پیش ہوا اس کے الفاظ یہ ہیں: "یہ جلسہ تجویز کرتا ہے کہ تاریخی کتب مروجہ مدارس انگریزی میں جو غلطیاں پائی جاتی ہیں اور جن کا تعلق اسلام کے ساتھ ہے ان کی اصلاح کا کام مناسب ذرائع کے ساتھ ندوۃ العلماء انجام دے"۔

انگریزی خواں طلبہ کو اسلام اور تاریخ اسلام کے ساتھ جو بے پروائی اور بے اعتنائی اور بد گمانی پیدا ہوتی جاتی ہے، اس کا سب سے بڑا سبب بھی تعصب آمیز کتابیں ہیں، جن میں نہایت بے دردی کے ساتھ فرماں روایان اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ اور تمدن پر حملے کیے گئے ہیں۔ اس بنا پر مدت سے ان کتابوں کی اصلاح محسوس ہو رہی تھی، اس بنا پر یہ تجویز بہ اتفاق منظور ہوئی اور مولوی سید سلیمان صاحب اسسٹنٹ پروفیسر ادب دار العلوم جن کو تاریخ و ادب کے ساتھ خاص مناسبت ہے اس صیغے کے سیکریٹری مقرر ہوئے (۴۹)۔

مولانا نے سالانہ جلسے سے پہلے اپنے خطوں میں جن اسکیموں کی طرف اشارہ کیا تھا ان کو جلسے میں پیش کرنے اور قوم سے اس کی تائید حاصل کرنے میں انھوں نے بڑی کامیابی حاصل کی اور ان کی قومی خدمات کو بہت سراہا گیا۔ حکیم اجمل خاں مرحوم نے تو صاف الفاظ میں مولانا کی خدمات کا نہ صرف اعتراف کیا بلکہ بے حد سراہا۔ مولانا کا جلسے میں چھایا رہنا، نیک نامی اور شہرت ہی آگے چل کر مولانا کی ندوے سے علاحدگی کا سبب بنی۔ اس لیے کہ ندوہ والوں کے ذہن میں یہ بیٹھ گیا تھا کہ مولانا ندوے کو اپنے ڈھرے پر چلانا چاہتے ہیں۔ انگریزی کو نصاب میں داخل کر کے مولانا نے وہ جرم کیا تھا جو کبھی معاف نہیں ہو سکتا تھا۔ بات اصل یہ ہے کہ اراکین ندوہ میں اکثر ایسے حضرات تھے، جن کے ذہنوں میں ایسے عربی مدرسوں کا تصور تھا۔ جہاں علما گروہ بندی اور تفرقہ پردازی سکھائی جاتی اور اس کی مشق کرائی جاتی تھی۔ دوسری چیز یہ تھی کہ وہ درس نظامی میں ذرا سی بھی تبدیلی گوارا نہ کرتے تھے۔ مولانا وقت کی ضرورت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس میں تبدیلی پر مصر تھے اور چوں کہ ان کے ذہن میں بکثرت متبادل کتابیں تھیں۔ اس لیے وہ ان کو بڑے شد و مد سے پیش کرتے تھے۔ ارکان ندوۃ العلماء جن کی تعلیم و تربیت ایک خاص انداز پر ہوئی تھی ان کے لیے یہ ایک نئی چیز تھی اور وہ اپنی ناواقفیت کی بنا پر اپنے کو عاجز پا کر مولانا کی مخالفت کرتے تھے مولانا مقابلہ کرتے تھے اور دلائل سے ثابت کر کے اپنی بات منوا کر دم لیتے تھے۔ لیکن کب تک آخر کار ۱۹۱۳ء میں وہ وقت آیا کہ خود مولانا نے مخالفت سے عاجز آ کر استعفا دے دیا۔ لوگ تو منتظر ہی تھے، تُمت سے استعفا منظور کر لیا۔ ان کی زندگی میں ندوے سے علاحدگی شاید سب سے بڑا سانحہ تھا۔ اس لیے کہ وہ ندوے کو جیسا مثالی بنانا چاہتے تھے وہ پورا نہ ہوا، پھر بھی بنیاد ایسی مستحکم کر دی کہ انھیں بنیادوں پر آج ندوے میں تعلیم ہو رہی ہے۔

اسی جلسے میں افغانستان کے سفیر سردار اسمٰعیل خان نے قرآن مجید کے انگریزی ترجمہ

کے لیے پانچ ہزار روپے کی رقم پیش کی اور وعدہ کیا کہ مزید مصارف بھی ادا کریں گے۔ مولانا نے مولوی حمید الدین سے خواہش کی کہ وہ مدد دیں اور وہ مدد یہ ہوگی کہ ان لوگوں کے نام بتائیں جو اس کام کو معاوضہ لے کر کریں اور اس وقت قرآن مجید کے انگریزی ترجمہ کرنے والوں کے نام اور پتے لکھیں۔ مولانا کا اس کام کو بڑی وسعت سے کرنے کا ارادہ تھا (۴۷)۔

سید سلیمان ندوی کو صیغہ تصحیح اغلاط تاریخی کے لیے روپیہ کی ضرورت ہوئی تو مولانا نے مولوی عبدالحی صاحب کو روپیہ کی ادائیگی کے لیے لکھا۔ مولانا کا خیال تھا اور دیگر اکابر ندوہ کی رائے تھی کہ سید سلیمان ندوی مزید تعلیم کے لیے مصر جائیں، اس سلسلے میں گورنمنٹ کو بار بار لکھا گیا مگر کوئی جواب نہ آیا، جس سے مولانا نے اندازہ لگایا کہ گورنمنٹ کی مرضی نہ تھی اور دارالعلوم کی طرف سے بھیجنے میں گورنمنٹ کی مخالفت کا امکان تھا، اس لیے اس معاملے میں خاموشی ہی مناسب تھی۔ سید سلیمان ندوی کا خیال تھا کہ ۶ ماہ کی رخصت لے کر اپنے اخراجات پر چلے جائیں، اس پر مولانا نے لکھا کہ اگر روپیہ ہو تو اپنے اخراجات پر چلے جائیں، مگر صرف ۶ ماہ میں کیا پڑھ سکیں گے، یہ ضرور ہے کہ واپسی پر کوئی اچھی ملازمت ضرور مل جائے گی (۴۸)۔

مولانا آج کل الہ آباد میں محلہ پتھر گلی میں مقیم تھے۔ پروفیسر عبدالقادر کا لکھنو آنے کا ارادہ تھا۔ اس پر مولانا نے لکھا کہ ان کے لکھنو پہنچنے کے بعد پروفیسر صاحب کو اطلاع دی جائے گی تب آئیں۔ پروفیسر صاحب مذکور نے اسی زمانے میں گارسن ڈی تاسی کے اس مختصر مضمون کا ترجمہ کر کے مولانا کو بھیجا جو اس نے شیخ فرید الدین عطار کے لوح مزار کے متعلق منطق الطیر کے دیباچہ میں لکھا تھا۔ مولانا نے شکریہ کے ساتھ الندوہ میں شائع کرنے کی اطلاع دی اور ساتھ ہی یہ بھی چاہا کہ گارسن ڈی تاسی کے اس مضمون کا بھی پتا لگایا جائے جو اس نے مذہبی اور فلسفی فارسی شاعری (۴۹) پر لکھا تھا (۵۰)۔

مولانا کے ایما پر (۵۱) سرائے میر والوں نے ایک جدید عربی مدرسہ کھولا تھا۔ مولانا اس کو گروکل کے طرز پر خالص مذہبی مدرسہ بنانا چاہتے تھے اور چاہتے تھے کہ وہاں کے طلبہ کی زندگی بالکل سادہ ہو، طبیعت قناعت پسند ہو اور مذہب کی خدمت ان کا مقصد ہو۔ اس کے لیے وہ خود بھی نگرانی کرنا چاہتے تھے اور مولوی حمید الدین سے بھی خواہش کی کہ اپنی تعطیل میں آکر مدرسے میں قیام کریں اور اس کے نظم و نسق کو درست کریں۔ ۲۹۔ اپریل کو مولانا لکھنو آچکے تھے (۵۲)

مولانا چاہتے تھے کہ سرکار عالیہ بھوپال ندوے کے بورڈنگ کی بنیاد رکھیں۔ اس کو سرکار عالیہ نے پسند نہیں فرمایا، اس پر مولانا نے زبیری صاحب کو لکھا کہ خواہ وہ منظور کریں یا نہ کریں ندوے والوں کا فرض ہے کہ وہ درخواست کریں کہ سرکار عالیہ بھوپال لکھنو آکر بنیاد رکھیں چنانچہ یہ طے پایا کہ اس قسم کی درخواست کی جائے۔ اسی زمانے میں ایک مدرسے کے منتظمین نے ریاست بھاول پور کے لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا کردیا کہ نواب صاحب کی والدی نے جو روپیہ ندوہ کی عمارت کے لیے عنایت کیا وہ مناسب نہ تھا اس غلط فہمی کو حکیم اجمل خاں صاحب نے ایک جلسہ کرکے دور کردیا۔

دلی میں ندوے کے سالانہ جلسے میں آفتاب احمد خاں نے درخواست کی کہ دیوبند کے طلبہ ان کو ملیں اور ان کو انگریزی پڑھادیں لیکن دیوبند والوں نے انکار کیا اور چند علما تو اس بات پر ناراض ہو کر جلسے سے چلے آئے کہ ریش تراشیدہ اور نیچری کو جلسے میں بولنے کیوں دیا گیا۔ اس سب کے باوجود مولانا کا عزم یہی تھا کہ کام جاری رکھا جائے، مخالفت تو ہمیشہ سے ہوتی آئی ہے (۵۳)۔

رائے بریلی کے ایک جلسے میں مولانا کو بلایا گیا تھا مگر وہ نواب وقار الملک کی آمد وار گورنر کی مشایعت کی وجہ سے نہ جاسکے۔ لیکن ایک دن بعد گئے اور وہاں اشاعت اسلام کی شاخ قائم کرنے کا انتظام کیا۔ مولانا کا کلکتہ جانے کا ارادہ تھا اس لیے مولوی ابوالکلام آزاد سے دریافت کیا کہ وہ کلکتہ میں کب تک قیام کریں گے؟

ابھی تک اس مدرسے کے منتظمین کی ندوے سے مخالفت جاری تھی۔ حکیم اجمل خان کی کوشش کے باوجود انھوں نے ڈھاکہ کے نواب صاحب کو بھی غلط فہمی میں مبتلا کرنے کی کوشش کی اور اپنی تائید میں مولوی حفیظ اللہ صاحب سابق پرنسپل ندوہ کو بھی لے لیا۔

اسی زمانے میں حکیم عبدالقوی صاحب نے اپنی اہلیہ مرحومہ کی یاد میں ندوے کے بورڈنگ کے لیے ایک کمرہ کے لیے سات سو روپے عنایت کیے (۵۴)۔

قرآن مجید کے انگریزی ترجمے کے لیے مولانا نے متعدد اشخاص کو لکھا مگر سوائے عماد الملک سید حسن بلگرامی کے اور کسی نے تسلی بخش جواب نہ دیا۔ بلگرامی صاحب نے بڑی مستعدی سے کام شروع بھی کردیا تھا۔ مولانا اس زمانے میں تقریباً ایک ماہ (۵۔ اپریل ۱۹۱۰ء) سے قبض میں مبتلا تھے۔ علاج کی غرض سے الہ آباد چلے گئے تھے، مگر نواب وقار الملک ندوے میں اپنے

لڑکے کے داخلہ کے لیے آئے اور مولانا کو بھلا بھیجا۔ اس لیے لکھنؤ گئے، پھر طبیعت کی خرابی کے باوجود رائے بریلی گئے۔ اب بارش کے منتظر تھے کہ گرمی کچھ ہلکی ہو تو اشاعت اسلام کے لیے عام دورہ کریں۔ انھیں دنوں محمد ظہور صاحب کو وقف کے میموریل پر لوگوں سے دستخط کرانے کے لیے مختلف جگہوں پر بھیجا اور ساتھ ہی اشاعت اسلام کے متعلق لوگوں کے نام خطوط دیے اب لوگوں کے جواب کے منتظر تھے اس زمانے میں مولانا کو بڑی فکر رہی کہ وقف میموریل کو کوئی انگریزی میں لکھ کر دے، مگر کوئی مسلمان نہ ملا مجبوراً تیج بہادر سپرو وکیل الہ آباد سے مولانا نے خواہش کی وہ اس زمانہ میں ہندوستان ریویو نکالتے تھے۔ فارسی سے دلچسپی کی وجہ سے شعر العجم کے مداح تھے اور مولانا سے واقف تھے، خود مولانا سے ملنے آئے اور تمام کاغذات لے گئے اور پڑھ کر جواب دینے کو کہا۔

سید سلیمان ندوی سے تصحیح اغلاط تاریخی کے سلسلے میں مولانا نے خط شائع کرا دیا۔ لوگوں نے اس پر توجہ کی اور مفید مشورہ دیئے۔ چناں چہ سید سلیمان ندوی نے کام شروع بھی کر دیا۔

مولانا اس زمانے میں اشاعت اسلام کے کام کو پھیلانے کے لیے بے چین تھے، مگر اصل کام دیہاتوں میں جا کر اسلام کی تلقین کرنا تھا۔ جس کے لیے واعظ نہیں مل رہے تھے اور اسی پر اشاعت اسلام کا انحصار تھا۔ اس کے لیے کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

اسی زمانے میں سید سلیمان ندوی نے مولانا کے خطوط جمع کرنے کا کام بھی شروع کر دیا تھا۔ اس لیے مولانا نے مولانا شیروانی سے بھی دریافت کیا کہ اگر وہ چاہیں ان کے خطوط محفوظ رہ گئے ہوں تو بھیج دیں۔

ان دنوں مولانا نے مشہور یونانی شاعر ہومر کی نظم الیڈ کا عربی ترجمہ منگوایا تھا اور مولانا شیروانی سے بھی دریافت کیا کہ اگر وہ چاہیں تو ایک نسخہ ان کے لیے بھی منگوا دیا جائے یہ ترجمہ بیروت کے عیسائی عالم سلیمان بستانی نے کیا تھا۔ جس نے دائرۃ المعارف یعنی عربی انسائیکلوپیڈیا کی آخری جلدیں بھی لکھی تھیں۔ اس عربی ترجمہ میں دو سو صفحات کا دیباچہ بھی تھی۔ اس کی اس علمی خدمت کے اعتراف میں مصر کے سو فضلا نے اس کو ڈنر (رات کا کھانا) دیا اور بڑی قدر کی (۵۵)۔

مولانا کا اس سال بھی کشمیر جانے کا ارادہ تھا۔ مگر وہاں سے تار آگیا کہ بارش شروع ہو گئی تو مولانا نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ ندوے سے عربوں کو بھی دلچسپی ہو گئی تھی چناں چہ عماں اور

کویت سے دو عرب کم سن لڑکے ندوے میں تعلیم کے لیے آئے ایک کو تو اس کے والد لے کر آئے لڑکے ہونہار تھے اور خود مشغل تھے۔ مولانا پر امید تھے کہ اگر نتیجہ اچھا رہا اور ان کی تعلیم و تربیت اچھی ہوئی تو عرب طلبہ بھی تعلیم کی غرض سے ندوہ سے آنے لگیں گے۔ بمبئی کے عرب تاجروں نے بھی مولانا سے خط و کتابت شروع کر رکھی تھی اور ان کا اصرار تھا کہ بمبئی جانے پر مولانا انھیں کے یہاں قیام کریں (۵۶)۔

مولانا لکھنؤ کی گرمی سے پریشان ہو کر کلکتہ چلے گئے، وہاں سید سلیمان ندوی کا خط نہ گیا تو دریافت کیا کہ ناراض تو نہیں؟ ساتھ ہی ہدایت کی کہ بلاغتہ العرب کو جلد منگوالیں اور الندوہ کی مد سے روپیہ لے لیں، کیوں کہ مولانا کو اس کی بڑی ضرورت تھی بلاغتہ العرب فرنچ لٹریچر کے عمدہ نمونوں کا عربی ترجمہ تھا۔ جس کو ایک مصری نے ترجمہ کر کے شائع کیا تھا۔ کلکتہ میں کوئی عملی کام نہیں کر پا رہے تھے، مگر گرمی کی شدت سے محفوظ رہنے کی وجہ سے مطمئن تھے۔ مولانا کو شیروانی صاحب نے لکھا تھا کہ ان کے (مولانا) خطوط ان کے (شیروانی صاحب) کے پاس محفوظ تھے، لہذا سید سلیمان ندوی کو اس کی اطلاع دی (۵۷)۔

سید سلیمان ندوی اس زمانے میں جغرافیہ اور مسلمان پر عربی میں ایک مضمون لکھ رہے تھے اس سلسلے میں ان کو معلوم ہوا کہ یاقوت رومی نے معجم البلدان میں آسیا یورپ اور خاکی اصلاح لکھی ہے۔ اس تعجب کا اظہار مولانا سے کیا تو انھوں نے لکھا مسعودی نے التنبیہ والاشراف میں جہاں حصہ ہائے زمین کا نام لیا ہے، وہاں آسیا، فا اور افریقہ لکھا ہے اور شاید مروج الذہب میں بھی یہ الفاظ ہوں۔

سید سلیمان ندوی نے تصحیح اغلاط تاریخی کا کام چھوڑ دیا تھا۔ اس پر مولانا نے گرفت کی اور ہمت دلائی اور یہ لکھا کہ انھوں نے (سید سلیمان) اس عذر کی بنا پر کہ مولوی عبدالحی صاحب روپیہ نہیں دیتے، کام چھوڑ دیا۔ حالانکہ ان خفیف رکاوٹوں کی وجہ سے کام نہیں رکنا چاہیے کلکتہ میں مولانا کو کھل کر بھوک لگنے لگی تھی، مگر ندوہ کے کاموں کا تقاضا تھا کہ جلد لکھنؤ واپس ہوں۔ لہذا واپسی کا ارادہ تھا اگرچہ لکھنؤ کا پانی مولانا کے موافق نہ آتا تھا (۵۸)۔

مولانا ۸۔ جون ۱۹۱۰ء کو لکھنؤ واپس آگئے مگر لکھنؤ کی گرمی سے بہت پریشان تھے۔ ندوے کی حالت اچھی نہ تھی اس لیے کہ شاہ جہان پور کی وقف جائداد پر عدالت قبضہ دلا چکی تھی۔ لیکن ندوے والے اس کی خبر نہ لیتے تھے۔ مولانا اور مولوی عبدالحی صاحب معتمد مال کو توجہ دلاتے تھے

مگر بے سود، اس کا سبب یہ تھا کہ وہ ایک تو کام کے عادی نہ تھے اور اگر کچھ کرتے بھی تھے تو ان کو اپنے کاموں ہی سے فرصت نہ تھی۔ للت پور (۵۹) میں بھی ایک شخص نے دو سال قبل ایک مکان وقف کیا تھا۔ اس نے خط میں لکھا کہ ندوے والوں نے خبر نہ لی۔ مولانا اس بے توجہی پر کس کو کس کو ٹوکتے؟ پھر یہ کہ اشاعت اسلام، تصحیح اغلاط تاریخی وغیرہ کے اخراجات بھی ادا نہیں کیے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ اس سلسلے کی خط و کتابت کے بارے میں معتمد صاحب کا کہنا تھا کہ جلسہ انتظامیہ کی منظوری ضروری ہے اور جلسہ۔ انتظامیہ کا حال یہ تھا کہ ضروری معاملات کے طے کرنے کے بجائے لوگ نظامت کے امیدوار بن کر آتے اور پورا جلسہ مہابھارت کا نقشہ پیش کرتا جس کا نتیجہ الحرب سجال ہوتا ان حالات کے تحت مولانا کی خواہش تھی کہ شیروانی صاحب آتے اور مولوی خلیل الرحمن سہارن پوری کو بلا کر پہلے آپس میں صلح اور نیک نیتی سے معاملات طے کر لیتے جو یقیناً طے ہو سکتے تھے، پھر تمام امور کو باقاعدہ جلسے میں طے کر لیتے۔ جب مولانا شبلی اور مولوی خلیل الرحمن کے درمیان معاملات طے ہو جاتے تو پھر کسی کو اختلاف نہ ہوتا، کیوں کہ انھیں لوگوں میں اختلاف کی خلیج حائل تھی اور اگر معاملات طے نہیں ہوتے تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ انجمن حمایت اسلام لاہور کی طرح مالی کارروائیاں بھی اخبارات میں شائع ہونے لگتیں اور اعتراضات بھی۔ جس سے قومی مفاد کو خطرہ تھا چار سال سے ندوے کا حساب بھی مرتب نہ ہوا تھا۔ اس لیے شائع بھی نہیں کیا گیا اور لوگ یہ چاہتے تھے کہ ہر ماہ الندوہ میں آمد و خرچ شائع ہو۔ مد تعمیر کی مجلس کا بھی ایک ہی اجلاس ہو کر رہ گیا۔ خرچ محض ایک کی رائے سے ہو رہا تھا۔ اسی زمانے میں شیروانی صاحب نے مولانا کو بلایا تو مولانا نے سفر سے معذوری کا اظہار کیا (۶۰)۔

مولانا کو کلکتہ سے واپسی میں مغل سرائے اسٹیشن پر گاڑی بدلنی پڑی تھا۔ سب سے بڑھ کر پریشانی یہ ہوئی تھی کہ دوسرے پلیٹ فارم پر آنے کے لیے پل پر چڑھنا پڑا تھا اور پیر کے لنگ کی وجہ سے تکلیف ہوئی تھی۔ لہٰذا اس پر چڑھنے کو پل صراط کی مصیبت سے تشبیہ دی۔

مولوی ابوالکلام آزاد کو الیڈ کا ترجمہ درکار تھا۔ اس لیے مولانا نے اس کی قیمت لکھی اور یہ بھی لکھا کہ رقم جرجی زیدان اڈیٹر الہلال (مصر) کو بھیج دی جائے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ اگر اس کتاب کو مولانا کی خاطر منگوا رہے ہیں تو ہرگز اپنے سر بارنہ لیں اور اگر پھر بھی منگوائیں تو ان کو (مولانا) کو بھیج دیں وہ لے لیں گے یا نواب علی حسن خان خرید لیں گے جو کتابوں کے شائق ہیں۔

مضامین اورنگ زیب کا انگریزی ترجمہ سید محمود بہاری (۶۱) نے کیا تھا اور جلد ہی لندن

سے شائع ہونے والا تھا۔ اس کی اطلاع مولانا نے مولوی ابوالکلام کو دی (۶۲)۔

مولانا نے شیروانی صاحب سے خواہش کی کہ وہ دو باتوں پر غور کر کے اپنی رائے قلم بند کریں ایک یہ کہ اشاعت اسلام کے لیے واعظوں کس اتقرر، دوسرے واعظوں کے مشاہرہ کے لیے آمدنی، واعظ اگرچہ مرضی کے مطابق نہیں ملتے تھے اور اگر ملتے تو کئی سو ماہانہ آمدنی ہوتی تو خرچ کی جا سکتی تھی۔ اس لیے سوچتا یہ تھا کہ کیوں کر اور کس طریقے سے یہ دونوں باتیں حاصل کی جائیں (۶۳)۔

مولوی ابوالکلام آزاد ایک (۶۴) اخبار نکلنے والے تھے۔ اس کے دو نام لکھ کر مولانا کی رائے دریافت کی تو مولانا نے لکھا کہ دونوں میں سے کوئی بھی موزوں نہیں "ملک و ملت" بڑا اور "وقت" بہت مختصر ہے۔ اس لیے صرف آزاد نام ہونا چاہیے کیوں کہ یہ عام حسب حال، حسب ضرورت اور آئیڈل ہے۔ یہ ضرور ہے کہ لوگ نام کی مناسبت سے خود نمائی کا شبہ کریں گے۔

مولوی ابوالکلام کی ندوے کے سالانہ جلسہ کی رپورٹ پر البشیر نے بہت سخت مضمون لکھا اور اس کی سرخی علی گڑھ کالج پر ایک اور حملہ رکھی۔ اس مضمون کے آخر میں یہ بھی لکھا کہ اگر یہ رپورٹ صحیح ہے تو ارکان کالج کو اپنا کام بالکل بند کر دینا چاہیے اور ندوہ سے علاحدگی اختیار کر لینا چاہیے۔ مولانا کا ارادہ تھا کہ وہ پرچہ مولانا ابوالکلام آزاد کو بھیجیں مولانا نے مولوی ابوالکلام کو مشورہ دیا کہ ان کو زیادہ مولویت (۶۵) کی صورت میں رہنا چاہیے، کیوں کہ اس سے فائدہ پہنچے گا (۶۶)۔

مسٹر مہدی حسن نے مولانا کو مشورہ دیا کہ شعرالعجم کی جلد گلابی ہو تو مولانا نے لکھا کہ یہ رنگ چوتھے حصہ کے لیے موزوں ہو گا۔ اس زمانے میں مولانا ہومر کی الیڈ پڑھ رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اتنا تو نہ تھا جتنا یورپ نے داد دی۔ اس میں مترجم نے اکثر جگہ عربی اشعار سے موازنہ بھی کیا تھا۔ مولانا اب شعرالعجم کا چوتھا حصہ لکھ رہے تھے اور اس سلسلے میں مہدی حسن کو یاد دہانی کی کہ انگریزی میں شاعری پر کسی کتاب یا مضمون کا پتا دیں۔ کیوں کہ ان سے پہلے خواہش کی جا چکی تھی۔ مولانا ۱۵۔ جون ۱۹۱۰ء کو الہ آباد میں تھے (۶۷)۔

مسٹر صلاح الدین خدابخش کی معجم فی اشعار العجم مولانا کے پاس تھی۔ اس کو انھوں نے واپس منگالیا، چوں کہ مولانا کو شعرالعجم کے سلسلے میں اس کی بڑی ضرورت تھی۔ اس لیے مولوی ابوالکلام کو لکھا کہ ٹھیکر کے یہاں سے جلد منگوائیں، ورنہ بڑا ہرج ہو گا اور یہ بھی لکھا کہ البشیر کے

مضمون کا جواب مولوی عبدالسلام ندوی نے لکھ کر وکیل امرتسر میں چھپنے کو بھیج دیا، مولوی ابوالکلام کا اعظم گڑھ جانے کا ارادہ تھا اس لیے دریافت کیا کہ کب جائیں گے اور بڑے لطیف پیرائے میں لکھنو کے قیام کی دعوت دی کہ اتنا تو جغرافیہ معلوم ہوگا کہ لکھنو بھی راہ میں ہے (۶۸)۔

مولوی ابوالکلام مصر سے الیادہ (۶۹) منگوانا چاہتے تھے تو مولانا نے لکھا کہ الہلال مصر کے اڈیٹر کو رقم بھیج دیں، چناں چہ خود مولانا کا یہی طریقہ رہا کہ بغیر تاخیر رقم بھیج دی گئی۔ مولوی ابوالکلام سے پریس کے متعلق دریافت کیا کہ کیا قیمت ہے اور ایک گھنٹہ میں کتنی فردیں اور کتنے پیمانہ کی چھپ سکتی ہیں (۷۰)۔

مولوی ابوالکلام نے دریافت کیا کہ الیادہ کس طرح پڑھی جائے تو ان کو لکھا کہ فہرست مضامین میں شواہد شعریہ کا ایک عنوان ہے، اس کے تحت شعراء عرب کے نام اور مختصات ہیں اس حوالے سے پھر اصل کتاب پڑھنی چاہیے (۷۱)۔

چوں کہ مولانا نے پریس کی قیمت وغیرہ دریافت کی تھی اس لیے مولوی ابوالکلام آزاد کو خیال ہوا کہ شاید مولانا خود پریس قائم کرنا چاہتے ہیں تو مولانا نے لکھا کہ وہ پریس کے جھگڑوں کے قابل نہیں۔ قاری عبدالولی کا خیال تھا، اس لیے دریافت کیا گیا، مگر پیسے کی کمی کی وجہ سے وہ بھی مجبور رہیں (۷۲)۔

۱۶۔ اگست ۱۹۱۰ء کو مولانا اعظم گڑھ میں تھے لیکن طبیعت خراب تھی اور یہ سلسلہ کچھ دنوں سے چل رہا تھا۔ ندوے میں سید سلیمان ندوی نے تصحیح اغلاط تاریخی کا کام شروع کیا تو علی گڑھ والوں کو بھی خیال ہوا اور انھوں نے ایک کمیٹی قائم کی اور مختلف نصاب کی جانچ کے لیے مختلف کمیٹیاں قائم کی گئیں۔ ندوے کی کوششوں اور سید سلیمان ندوی کی محنت کا ذکر نہ کیا گیا، اس پر مولانا کو افسوس ہوا پھر بھی مولانا اس سے مطمئن تھے کہ علی گڑھ والے گورنمنٹ کو اغلاط کی طرف توجہ دلائیں گے اور سید سلیمان ندوی ان غلطیوں کی اصلاح سے کام رکھیں گے۔ اس لیے دونوں کے کام کا دائرہ مختلف تھا۔ علی گڑھ والوں کا کہنا تھا کہ یہ کام وہاں پہلے سے ہو رہا تھا اور مولانا کا یہ خیال تھا کہ کام ہونا چاہیے خواہ کوئی کرے۔

مولانا کے اعظم گڑھ کے قیام میں مولوی خلیل الرحمن سہارن پوری نے سید سلیمان ندوی کی طنزاً شکایت لکھی کہ سید سلیمان ندوی ان کی (مولانا) تعلیم و تربیت کا اصلی نمونہ ہیں۔ اس لیے نماز نہیں پڑھتے مولانا کے لیے یہ تعجب کی بات تھی، لیکن پھر بھی خیال ہوا کہ شاید فجر کی

جماعت میں دیر ہو جانے کی وجہ سے شرکت نہ کرتے ہوں، اس لیے مولانا نے ہدایت کی کہ لوگوں کو شکایت کا موقع نہ دیں۔ یہ بھی ہدایت کی کہ تصحیح اغلاط تاریخی کے لیے سید سلیمان چندے کی اپیل کریں تو لوگ ضرور چندہ دیں گے (۷۳)۔

اس خط سے یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ مولانا نماز کے پابند نہ تھے اور سید سلیمان ندوی بھی نماز کی پابندی نہ کرتے تھے۔ بات اصل یہ ہے کہ مولانا خونی بواسیر کے مریض تھے اور اس وجہ سے بیت الخلاء میں گھنٹوں بیٹھتے تھے۔ جب ہی وہ کہیں جانے سے قبل اپنے لیے الگ بیت الخلاء کا انتظام چاہتے تھے تاکہ دوسروں کو اور خود ان کو تکلیف نہ ہو، چوں کہ خونی بواسیر میں طہارت وغیرہ کی دشواری تھی اور وقت لگتا تھا اس لیے جماعت کا اہتمام نہ کر پاتے تھے۔ لوگوں نے اس کو شہرت دی اور ان پر الزامات میں ایک یہ بھی لگایا کہ نماز باجماعت کی پابندی نہیں۔ اس طرح طلبہ پر برا اثر پڑتا ہے۔ دوسری رکاوٹ ان کے پیر کا لنگ تھی کہ وہ پھرتی سے چل کر جلدی تک نہ پہنچ پاتے تھے۔ اس لیے بھی جماعت سے رہ جاتے تھے۔ رہ گیا سید سلیمان ندوی پر الزام اس کا جواب خود سید سلیمان ندوی نے اسی خط کے حاشیہ میں "سبحانک ھذا بہتان عظیم" کہہ کر دیا ہے گویا اس الزام کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ بات اصل یہ ہے کہ مخالفت میں مخالف کی خوبیاں بھی خامیاں نظر آتی ہیں اور تعلقات میں خامیاں بھی خوبیاں معلوم ہوتی ہیں۔ چوں کہ مولوی خلیل الرحمن صاحب کی مولانا سے مخالفت چل رہی تھی۔ لہٰذا مخالف کی ہر چیز میں خامی معلوم ہوتی تھی اور ایسے موقع پر بڑے بڑے انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتے ہیں۔ اگر انصاف کو نہ چھوڑیں تو جھگڑا نہ بڑھے، مگر مخالفت میں بھی اعتدال اور عدل و انصاف ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔

ندوے کے پرنسپل کی نرمی کی وجہ سے طلبہ مذہبی پابندی میں تساہلی برتنے لگے تھے۔ لہٰذا جلسہ، انتظامیہ میں یہ سوال اٹھایا گیا۔ مولانا اس جلسے میں خاموش رہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکالا گیا کہ گویا ان کے اثرات ہیں۔ اصل میں مواد پہلے سے تیار کیا جا رہا تھا۔ مولانا اور سید سلیمان ندوی پر پہلے ہی الزامات لگانا، گویا تمہید تھی اس کے بعد طلبہ پر الزام لگا کر اور مولانا کے اثرات دکھلا کر ان کو راستہ سے ہٹانا مقصود تھا۔ مولانا کا خیال تھا طلبہ کی عدم مذہبی پابندی کی تحقیقات کرنا چاہیے تھی اور لڑکوں کو مدعا علیہ بنانا چاہیے تھا، نہ کہ مولانا کے سر الزام تھوپ دیا گیا۔ تحقیقات کے ضمن میں البتہ یہ ہو سکتا تھا کہ مولانا کے قول و فعل سے لڑکوں کی عدم پابندی کی ترغیب ہوتی تھی یا نہیں اور خود مولانا نے لڑکوں کو عدم پابندی پر گرفت کی یا نہیں، یہ تو کہا نہیں گیا۔ مولانا کو

اس کا ذمہ دار ٹھہرا گیا تاکہ مولانا کو ندوے سے الگ کرنے میں سہولت ہو اور پھر غیر آئینی اور من مانی کرنے میں آسانی ہو۔ مولانا کا یہ خیال تھا کہ پرنسپل کے تحت ہونے کی ضرورت ہے کیوں کہ طلبہ کی ذمہ داری اسی کی ہے۔ دوسری خرابی یہ تھی کہ ناظم ندوۃ العلماء میں صلاحیت نہ تھی اور ذمہ داری عائد کی جاتی تھی، معتمدین پر اور معتمدین کے لیے تحقیقاتی کمیشن بٹھانے کے مشورے ہو رہے تھے۔ اس کو مولانا ہرگز گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ وہ مدعی علیہ یا مجرم کی حیثیت سے کمیشن کے سامنے پیش ہوں اور اگر یہی کرنا تھا تو وہ استعفاء دینے کو تیار تھے۔ رہ گیا ندوے کا معاملہ تو نائب ناظم اور دیگر معتمدین موجود ہی تھے۔ وہ کام چلا سکتے تھے (۷۴)۔

"ندوہ جسم تھا، نائب ناظم و دیگر معتمدین اس کے اعضا اور روح مولانا شبلی تھے اور روح ہی کو نکالنے کی فکر تھی۔

حکیم غلام غوث بھاول پوری طبیب سرکاری (سپرنٹنڈنٹ آبکاری) ریاست خیر پور (سندھ) نے اپنے بچے کی ولادت کی اطلاع دیتے ہوئے اس کا نام محمد عبدہ رکھا اور یہ بھی چاہا کہ قطعہ، تاریخ یا دعائیہ قصیدہ بھی مولانا لکھ دیں۔ چوں کہ مولانا فرمائشی شاعری نہیں کرتے تھے۔ لہٰذا بچے کے نام کو سعید بتلاتے ہوئے ان کی فرمائش سے معذرت کی اور معافی طلب کی (۷۵)۔

سید احمد مرتضےٰ سررشتہ دار ریاست ٹونک نے شعرالعجم میں ایک غلطی کی طرف توجہ دلائی تو مولانا نے اس کو تسلیم کرتے ہوئے لکھا کہ رباعی میں غلطی ہو گئی۔ اس لیے کہ دولت شاہ اور چہار مقالہ میں اختلاف تھا اور انھوں نے غلطی سے ایک جگہ ایک کی اور دوسری جگہ دوسرے کی روایت لے لی۔ اسی میں انھوں نے وہ اصول لکھا ہے جس اصول پر انھوں نے شعرالعجم لکھی، چناں چہ انھوں نے لکھا کہ فردوسی کے زمانے سے آخر تک انھیں شعرا کو لیا۔ جن کا خاص طرز تھا جامی کا کوئی خاص طرز نہ تھا، اگرچہ خاقانی کا انداز الگ تھا مگر مولانا اس کو شاعری نہیں سمجھتے تھے بلکہ لفاظی اور تلمیحات کی بھرمار سمجھتے تھے، قاآنی کو اس لیے چھوڑ دیا تھا کہ دو سو برس ادھر کا زمانہ ہی نظر انداز کر دیا تھا۔ چوتھی جلد کے بعد بھی مولانا ایک اور جلد کی ضرورت محسوس کر رہے تھے اور وہ دوسروں کے لیے چھوڑ دی تھی کہ وہ کریں۔ چوتھا حصہ مولانا نے ریویو اور شاعری کی حقیقت ہاتی کی تفصیل کے لیے وقف کر دیا تھا اور اسی پر زیادہ وقت لگانا تھا اور اس زمانے میں اسی میں مصروف تھے اور چاہتے تھے کہ اس سے جلد فرصت ملے۔ اس لیے کہ اب وہ اپنا سارا وقت علوم القرآن اور سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر لگانا چاہتے تھے۔ چوں کہ عمر ۵۵ سال ہو گئی تھی

اور قوی خاصے کمزور ہو گئے تھے۔ غذا صرف ایک چپاتی رہ گئی تھی۔ اس لیے چاہتے تھے کہ جلد ان دونوں کاموں کو شروع کر دیں۔ اپنی عمر اور قویٰ کے پیش نظر مولانا نے حسب حال ایک شعر بھی کہا، وہ یہ ہے:

صریر خامہ، شبلی کی آتش افشانی   یہ مان لیجے کہ ہے بھی پر اس میں دم کیا ہے

بالکل آخر میں لکھتے ہیں: اللہ بس باقی ہوس (۷۶)۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کو اب اپنی صحت کی طرف سے بڑی مایوسی تھی۔ اسی خط میں یعنی ۶۔ ستمبر ۱۹۱۰ء کو پہلے پہل سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم لکھنے کا اظہار ہے۔ ایسا اندازہ ہے کہ یہ خیال ان کے ذہن میں برسوں (بدء الاسلام لکھنے کے وقت) سے چکر لگا رہا تھا، مگر اب مصمم ارادہ کر چکے تھے۔ اس لیے اب اظہار کیا تھا اگرچہ اس اظہار کے بعد بھی شروع کرنے میں خاصا وقت لگ گیا اور ۱۹۱۲ء میں لکھنا شروع کیا۔

۶۔ ستمبر کو مولانا الہ آباد سے لکھنو آگئے تھے اور یہیں سے شعر العجم کے متعلق اظہار خیال کیا ہے۔ سید احمد مرتضےٰ صاحب ٹونکی نے مولانا کو لکھا کہ صلاح الدین ایوبی کی سوانح عمری لکھیں اس پر مولانا نے ان کو لکھا کہ اردو میں ان کی کئی سوانح عمریاں موجود ہیں۔ لیکن کوئی مستند نہیں، لیکن اب وہ اپنی عمر، صحت کی خرابی اور کام کی زیادتی کی وجہ سے وقت نہ نکال سکتے تھے۔ ویسے وہ صلاح الدین ایوبی کے کارناموں کی قدر کرتے تھے اور اس سے بھی واقف تھے کہ لوگ اس مجاہد کے کارناموں سے ناواقف ہیں۔

موازنہ انیس و دبیر کی جلد بندی کی نوبت ستمبر ۱۹۱۰ء میں آئی (۷۷)۔

مولوی ابو الکلام آزاد نے تجویز پیش کی تھی کہ ان کے پاس جن کتابوں کے دو نسخے ہیں ان کا ایک نسخہ دے کر اس کے بدلہ میں ندوے سے کتابیں لے لیں۔ اس طرح ندوے میں کئی کتابوں کا اضافہ ہو جائے گا اور ان کے پاس بھی نئی کتابیں آجائیں گی۔ مولانا نے اس تجویز کو پسند کیا۔ مولوی ابو الکلام آزاد نے اپنی کتابوں کے نام تو لکھے مگر ان کے بدلے میں جو کتابیں ندوے سے مطلوب تھیں وہ نہیں لکھیں تو مولانا نے لکھا کہ جو کتابیں ندوے میں مکرر آتی ہیں، ان میں سے اکثر ابو الکلام کے پاس موجود ہیں اس لیے کن کتابوں سے مبادلہ ہوگا۔ تفسیر کبیر البتہ ندوہ میں موجود تھی۔

اسی زمانے میں مولوی عزیز مرزا مسلم لیگ کو مستحکم کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ لہٰذا

مسلم لیگ کی طرف سے انھوں نے ایک کتابچہ شائع کیا، جس کی داد وائسرائے نے دی اور اس کا اعلان اخبارات میں ہوا۔ مولوی عزیز مرزا کو شکایت تھی کہ لوگ مسلم لیگ کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ مولانا نے اپنا خیال طنزیہ انداز میں ظاہر کیا چوں کہ حکومت نے تائید کی ہے تو اب سب متوجہ ہو جائیں گے۔ مولوی ابو الکلام کو لکھا کہ وہ مولوی عزیز مرزا کی اس کامیابی پر مبارک باد دیں (۷۸)۔

اب ندوے میں ندوے کے لوگوں کی مخالفت زور پکڑتی جارہی تھی اور اس کی حالت بد سے بدتر ہوتی جارہی تھی اور سارا الزام مولانا کے سر تھوپا جارہا تھا۔ اس لیے مولانا چاہتے تھے کہ شیروانی صاحب بحیثیت رکن ندوہ ان خرابیوں کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں۔ لہٰذا مولانا نے ان کو تفصیل لکھ کر توجہ دلائی اور لکھا کہ کمیشن کا معاملہ غور طلب ہے۔ اس لیے مفصل لکھنے کی ضرورت ہے چوں کہ اس کے دو پہلو ہیں ایک واقعی اصلاح اور انتظام اور دوسرا کسی شخص کی مخالفت اور عداوت۔

مولانا کا خیال تھا کہ پہلی صورت کے لیے یہ مناسب تھا کہ شیروانی صاحب آتے تو تمام ارکان سے ملاقات ہوتی اور طلبہ کو دیکھتے ان کی مذہبی پابندی میں جو کمی ہوئی تھی، اس کو نوٹ کر لیتے اور طریقہ، انتظام و اصلاح کے متعلق سوچتے کہ کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟ اور اس کو تحریری صورت میں پیش کرتے۔ مگر یہ ساری کارروائی بغیر اطلاع کے کرتے۔ اس لیے کہ جو چیز بھی شہرت پاتی تھی، مخالفین اس کا رد کرتے تھے اور پروپگنڈا کرکے لوگوں کو اکسا کر مولانا کے خلاف اس کو اس انداز میں پیش کرتے تھے، جس سے مولانا پر الزام آتا تھا۔ خاموشی سے کام کرنے میں اصلیت سامنے آجاتی۔ مولوی ضیاء الحسن علوی علی گڑھ سے آئے تو ان سے بھی کہا گیا کہ ان سے بھی اظہار لیا جائے گا، گویا مولانا پر الزام کو پختہ شکل دینے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا تھا۔

مولانا کا یہ کہنا تھا کہ وہ اس کے لیے بھی تیار تھے کہ تحقیقاتی کمیشن ان سے سوال و جواب کرے، مگر ساتھ ہی دوسرے معتمدین سے بھی سوال و جواب ہوں اور اس وقت مولانا بھی ثابت کریں کہ فلاں شخص صبح کی نماز نہیں پڑھتا اور فلاں شخص نے اپنی غفلت سے ہزاروں روپیہ ضائع کیا، یعنی جو روپیہ کمروں کی تعمیر کی مد میں تھا اس کو تعلیم پر خرچ کیا اور فلاں صاحب نے اپنی جائداد وقف کرنے کے باوجود دار العلوم کو نہ دی اور اس کے باوجود ندوے کے رکن ہیں۔ دار العلوم کے مکان کا روپیہ ندوہ ادا کر چکا تھا اس کے باوجود اس مکان کی دستاویز واپس نہیں کی اور چوں کہ

دستاویز واپس نہیں کی، اس لیے ندوئے کا مکان فروخت نہ ہو سکا، اگر وہ فروخت ہو جاتا تو رقم جدید عمارت کے کام آتی۔ مکان کا فروخت کرنا جلسہ، انتظامیہ میں دو مرتبہ پاس بھی ہو چکا تھا۔ لہذا اسی صورت میں ایک آدمی کو ساری خرابیوں کا ذمہ دار نہیں قرار دیا جا سکتا۔ جب کہ دوسرے ذمہ دار حضرات ندوے کی خرابیوں میں زیادہ ملوث ہیں۔

مولانا کا کہنا تھا کہ ضابطہ کی بات یہ تھی کہ کمیشن کا رزولیشن ایجنڈے میں درج نہ تھا منشی احتشام علی صاحب کی یادداشت اس لیے نہیں پیش ہو سکی کہ پندرہ دن پہلے ارکان کے پاس نہیں پہنچی تھی، جب یہ صورت ہے تو پھر جدید رزولیشن فوراً کیسے پیش ہو سکتا تھا اور دیگر غیر حاضر ارکان کی منظوری کے بغیر کیسے پاس ہو سکتا تھا۔ پھر لطف یہ کہ یہ پاس ہوا کہ ایک مہینے کے اندر کمیشن اپنی رپورٹ پیش کر دے۔ چوں کہ ایک ماہ کی مدت گزر گئی اور رپورٹ پیش نہیں ہوئی تو اب ارکان کمیشن کو رپورٹ پیش کرنے کا حق ختم ہو گیا۔ لہذا جلسہ، انتظامیہ کی دوبارہ منظوری ہونا چاہیے۔ بہرحال مولانا کا مقصد یہ تھا کہ اگر خرابیوں کا اصل سبب معلوم کرنا ہے، تو خاموشی سے اس کے اسباب و علل معلوم کر کے اس کے دفعیہ کی کوشش کرنا چاہیے اور اگر مقصد کسی پر اتہام اور الزام لگانا ہو تو اس طرح تو اصلاح نہیں ہو سکتی۔ ایسی صورت میں دو نتیجے ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ مولانا استعفا دے کر الگ ہو جائیں، پھر جو چاہیں لوگ کریں۔ دوسری صورت یہ تھی کہ وہ کمیشن کی تعمیل سے صاف انکار کر دیں، کیوں کہ ضابطہ سے کمیشن کا قیام ہی غلط ہے اور جو دائرہ عمل مقرر کیا گیا تھا وہ تو اور بھی غلط تھا کیوں کہ وہ محض ایک شخص کے خلاف کام کرتا۔

اب رہ گیا طلبہ کی مذہبی پابندی میں کمی تو اس کے متعلق یہ تھا کہ خود شیروانی صاحب نے مولانا سے بیان کیا تھا کہ دارالعلوم ندوہ کے طلبہ ان کے یہاں (بھیکن پور) ایک وفد میں گئے تو ان کی وضع قطع سے شیروانی صاحب علی گڑھ کے طلبہ سمجھے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ زمانہ مولانا کی معتمدی سے قبل کا زمانہ تھا اس لیے مولانا کے اثر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن مولانا کے خیال میں اصل وجہ یہ تھی کہ ابتدا سے کوئی پرنسپل مقدس اور بااثر ملا ہی نہیں۔ مولوی فاروق صاحب مرحوم خود بے پروا تھے۔ اس لیے طلبہ سے پابندی کرانے میں بھی بے پروا تھے، ایک اور صاحب تھے وہ خود تو پابند تھے، مگر ان کا اثر اپنی ہی اولاد پر نہ تھا، اس لیے کہ ان کا لڑکا داڑھی ترشواتا تھا اور وہ کچھ نہ کہتے تھے، پھر وہ نماز فجر نہیں پڑھتا تھا، جب ان سے شکایت کی گئی تو کہا کہ رات کو مطالعہ زیادہ کرتا ہے اس لیے صبح کو سو جاتا ہے۔

مولانا نے جب حیدر آباد سے آکر قیام کیا تو دیکھا کہ دار المطالعے میں طلبہ نے تصویریں لگا رکھی تھیں ۔ نماز نہ پڑھنے پر گوشت کا پیالہ بند کر کے سزا دی جاتی تھی، مگر اس کا بھی اثر نہ ہوتا تھا صرف اس کا ایک ہی علاج تھا اور وہ یہ کہ کوئی مقدس اور باثر شخص ندوے کا پرنسپل مقرر ہو جو اپنے قول و فعل سے طلبہ کو ترغیب بھی دے اور عمل نہ کرنے پر موثر سزا بھی ۔ مولوی سیف الرحمن صاحب کی مولوی مسیح الزماں نے تعریف کی تھی ۔ چناں چہ مولانا نے ان کو لکھا مگر وہ پچاس روپے تنخواہ پر تیار نہیں ہوئے ۔ بہر حال یہ معمولی معاملہ نہ تھا اس لیے مولانا کی خواہش تھی کہ طریقہ تحقیقات سے ان کو اطلاع دی جائے ۔ رزولیشن میں مولانا ہی کے زمانہ کا ذکر تھا، اس سے یہ بھی اندیشہ تھا کہ ان کے خلاف مخالفین کو مزید مخالفت کا موقع ملے گا اور اس سے وہ بے جا فائدہ اٹھائیں گے ۔ مولانا کا رام پور جانے کا ارادہ تھا، مگر چوں کہ نواب رام پور نینی تال گئے ہوئے تھے اور کتب خانہ بند تھا اس لیے انھوں نے روانگی ملتوی کر دی ۔

مولانا نے اکبر بادشاہ کے چچا مرزا کامران کے فارسی دیوان کا سرورق کا جس پر جہانگیر اور شاہجہاں کے دستخط تھے، الندوہ میں فوٹو شائع کیا تھا ۔ مگر اس کی کوئی کاپی محفوظ نہیں رہ گئی ۔ لہذا مولانا نے شیروانی صاحب کو لکھا کہ اگر ان کے پاس فوٹو ہو تو بھیج دیں کیوں کہ اس کے مزید فوٹو لینا تھے (۷۹) ۔

مولانا کا یہ بھی خیال تھا کہ ان سے (مولانا سے) رنجش کی بنا پر بعض منتظمین نے یہ سمجھ لیا تھا کہ وہ ان کے (منتظمین کے) اختیارات میں دست اندازی کرتے ہیں اور جو کام ان کو کرنا چاہیے وہ مولانا کرتے ہیں ۔ اس بات سے ہر کامیابی کا سہرا مولانا کے سر ہوتا ہے ۔ اس لیے اس سلسلے میں مولانا کی تجویز تھی کہ شیروانی صاحب پر مولانا کو اور دیگر منتظمین کو اعتماد تھا، لہذا وہ اگر تحقیقات کریں اور اگر یہ بات ثابت ہو تو مولانا معافی مانگ لیں ۔ ورنہ منتظمین اپنی غلط فہمی دور کریں (۸۰) ۔

اسی زمانے میں مولانا شعر العجم حصہ سوم کی تمہید کا مسودہ اور فغانی، فیضی، عرفی، نظیری، طالب آملی کلیم اور صائب کی سوانح عمریاں وغیرہ مطبع فیض عام، علی گڑھ کو شائع کرنے کے لیے بھیجنا چاہتے تھے ۔ لہذا سید سلیمان ندوی کو ہدایت کی کہ وہ بیمہ کر کے منشی محمد علی کو علی گڑھ بھیج دیں (۸۱) ۔

مولانا کا ارادہ تھا کہ اگر مولوی ابو الکلام آزاد حیدر آباد جائیں تو مولانا بھی جانے کو تیار

تھے ۔ اگرچہ اب مولانا کے احباب میں وہاں کوئی نہ رہا تھا ۔ اس لیے خانہ بدوشوں جیسا قیام ہوتا ۔ پھر بھی حیدر آباد میں فلک نما جیسی عمارت اور دولت آباد جیسا شہر دیکھنے کے قابل تھے اور عماد الملک سید حسن بلگرامی کی موجودگی بڑی غنیمت تھی ۔ جیزہ جانے کا ارادہ بالکل نہ تھا ۔ لیکن حیدر آباد جاکر بغیر بمبئی گئے ہوئے واپس آنا، گویا جنت میں نہ جانے کے برابر تھا، لہٰذا وہاں تو ضرور ہی جاتے (۸۲) ۔

مولانا کو اسی زمانے میں تذکرہ خطاطان اور کنزاللغتہ کی ضرورت تھی، جن کو مولوی ابوالکلام آزاد سے طلب کیا تھا، مگر اب تک نہ آئی تھیں، اس لیے ان کو پھر یاددہانی کی (۸۳) ۔

شیروانی صاحب نے مولانا کو اپنی علی گڑھ میں آمد سے اطلاع دی تو مولانا نے لکھا کہ جس طرح منیٰ اور عرفات میں حج کے زمانے میں چہل پہل ہوتی ہے ۔ اسی طرح اعظم گڑھ میں کچہری کھلے ہونے کے زمانے میں چہل پہل رہتی ہے ۔ کیوں کہ وہاں کا خاص باشندہ کوئی ممتاز آدمی نہیں، سب دیہاتی ہیں اور مولانا وغیرہ تو تعطیلات میں بھی باہر ہی رہتے تھے ۔ لہٰذا مولانا نے شیروانی صاحب کی آمد کی یقینی تاریخ دریافت کی ۔ اسی زمانے میں نواب وقار الملک مولانا کو منصوری بلا رہے تھے اور سید حسن بلگرامی بھی بلا رہے تھے کہ خود مولانا جائیں تو وہ وقف کا مسودہ لکھ دیں ۔ ادھر مدرسہ کھلنے کے وقت بعض جدید ضروری انتظامات کی وجہ سے مولانا کا وہاں موجود ہونا ضروری تھا ۔ غرض ابھی طے نہیں کر پائے تھے کہ کیا کریں؟

اسی دوران میں مولانا کے مخالفین نے یہ پروپگنڈا کیا کہ مولانا دارالعلوم سے الگ ہو گئے عمارت تعمیر کا چندہ بالکل بند ہو گیا ۔ مولانا کو مخالفین اس کے حصول کے لیے کوشش نہیں کرنے دیتے تھے اور نہ خود کرتے تھے ۔ باہر سے لوگوں کے پاس اور خود مولانا کے پاس استفسار کے خطوط آرہے تھے ۔ جس میں ان کی ندوہ سے علاحدگی کے متعلق دریافت کیا گیا تھا ۔ چناں چہ قاری عبدالولی مطیع آسی کے پاس بھی یورپ سے ایک خط آیا تھا جس میں دریافت کیا گیا تھا ۔ مولانا ان باتوں اور مخالفتوں سے افسردہ تھے ہی، بیماری نے اور دل توڑ دیا اس لیے انھوں نے تقریباً کام چھوڑ دیا تھا اور چاہتے تھے کہ دوسرے لوگ اب کام سنبھال لیں ۔ پچاس ہزار خرچ ہونے کے بعد بھی عمارت ناتمام رہی ۔ بیس ہزار کی لاگت کے بعد مکمل ہوتی ۔ اس کے علاوہ بورڈنگ کا سامان اضافہ، ماہوار ترقی تعلیم یہ سب کام کرنے تھے ۔ انھوں نے تو اب ارادہ کر لیا تھا کہ کسی اور صوبے میں قیام کریں اور کوئی مشغلہ ڈھونڈیں ۔ مولانا نے مولوی سیف الرحمن کے بلاکر پرنسپل مقرر

کرنے پر زور دیا۔ شیروانی صاحب کو یہ بھی اطلاع دی کہ مصر سے عربی میں نقشہ مل سکتا ہے (۸۴)

شیروانی صاحب کو ہومر کی الیڈ کی ضرورت ہوئی تو مولانا نے لکھا کہ ایک نسخہ انھوں نے علی گڑھ اور ایک مصر سے منگوایا تھا۔ لہٰذا علی گڑھ سے ہی لے لیں اور علی گڑھ والے ہی حقی بغدادی سے عرب کا نقشہ بھی منگوا دیں گے اور چوں کہ وہ کتابیں منگواتے رہتے ہیں۔ اس لیے ان کے ذریعے ارزاں ملنے کی امید بھی تھی۔

اسی زمانے میں مولانا کو اعجاز خسروی کا ایک عجیب و غریب نسخہ ہاتھ آیا جو امیر خسرو کی وفات کے دس برس کا لکھا ہوا تھا اور نہایت صحیح اور سرتاپا محشی تھا اور کمال یہ کہ لفظی رعایت میں ایک لفظ کے کسی ٹکڑے میں بھی رعایت تھی وہ ٹکڑا سرخ لکھا ہوا تھا مثلاً باغ کی رعایت میں بو کا لفظ آگیا تھا تو بو کو سرخ لکھا تھا بڑی دیدہ ریزی کی گئی تھی۔

چوں کہ شیروانی صاحب ندوے نہ آسکے تھے، اس لیے مولانا کے خلاف مخالفین کی تیاریاں بیکار گئیں۔ لیکن آئندہ کے لیے اور زیادہ تیاریاں ہونے لگیں (۸۵)۔

اب مولانا کے خلاف مخالفین آپس میں متحد ہو گئے تھے۔ رپورٹیں تیار کی جارہی تھیں۔ مضامین لکھے جارہے تھے مولانا کے جرائم کی فہرست تیار ہو گئی تھی اور اقرار نامہ، عقائد تیار کیا گیا تھا، جس کا مولانا سے اعتراف کرایا جانا تھا اور یہ سارے کاغذات اراکین ندوہ کے پاس بھیجے جانے والے تھے اور اسی کی بنیاد پر مولانا کے نکلنے کی تحریک کی جانے والی تھی۔

فرد جرم کی فہرست تو خاصی طویل تھی جس میں خاص خاص باتیں یہ تھیں (۸۶) خورد برد کا الزام، بھاول پور کے عطیہ کا اشتہار، سب سے بڑا الزام گورنمنٹ سے ایڈ کے متعلق خط و کتابت تھا اور اس سے بڑھ کر الحاد اور زندقہ کا الزام تھا۔ مولانا سے جن عقائد کا اقرار لیا جانا تھا۔ ان میں امات الاولیاء حق تھے۔ مولانا نے اس پر جواب دیا کہ وہ تو کرامات الشیاطین حق کے بھی قائل تھے۔ مولانا کو ان شرارتوں پر رہ رہ کر غصہ آتا تھا اور بار بار ان کے خلاف قلم اٹھا اٹھا کر رہ جاتے تھے۔ طلبہ بھی قابو سے باہر ہورہے تھے، لیکن مولانا ان کو روکے ہوئے تھے کہ فساد سے کچھ حاصل نہ تھا۔ پھر بھی ان شرارتوں کے نتیجے کی فکر تھی کہ کیا ہوتا ہے (۸۷)؟

شعر العجم کے چوتھے حصہ کے صرف سو صفحے اب تک چھپ سکے تھے اور اب تک تین سو باقی تھے اب تک مولانا نے صرف شاعری کی حقیقت سے بحث کی تھی۔ چھپنے کی دقت کی وجہ سے

مقالات میں بہت اختصار کر دیا تھا۔ اب مولانا جرجی زیدان کی کتاب پر تنقید کر چکے تھے۔ لیکن اردو میں اتنی اچھی نہ تھی جتنی عربی میں تھی۔ وجہ یہ تھی کہ عرب مخاطب تھے اس لیے عربی زبان میں سارا زور صرف کیا گیا۔ سو صفحات کی کتاب تیار ہو گئی تھی اور عربی ایسی لکھی تھی کہ مصر والے بھی ہندوستان کی عربی دانی کی داد دے کر رہیں۔ وہاں کے اخبارات میں ریویو نکلنے پر مسٹر مہدی حسن کو اطلاع دینے کا ارادہ تھا۔ مولانا کا ارادہ نہ ہونے کے باوجود ایک خاص وجہ سے دلی جانے کا خیال تھا۔

بمبئی میں اب کی جو غزلیں کہیں تھیں، ان کے متعلق مولانا کا خیال تھا کہ وہ پھیکی رہیں۔ اسی زمانے میں ترکوں نے جو غیر معمولی شجاعت دکھائی، اس سے مولانا بہت مسرور تھے۔ وہاں خبریں مولانا کو عربی اخبارات کے ذریعہ مل رہی تھیں، جن کو مولانا پڑھ پڑھ کر خوش ہوتے تھے اور دوستوں کو اطلاع دیتے تھے۔ اسی سلسلے میں ترکوں کے متعلق ایک شعر بھی کہا اور ہزار کی رعایت کو بھی واضح کیا کہ ہزار بلبل کو بھی کہتے ہیں، وہ شعر یہ ہے:

نالوں سے عندلیب کو میں نے دبا لیا　　بھاری ہوں لاغری میں بھی تنہا ہزار پر (۸۸)

اسی زمانے میں مولانا کے دوست مسٹر مہدی حسن تحصیلدار ہوئے تو مولانا نے لکھا کہ تحصیلداری کی مبارک باد بالمشافہ دینا چاہتا ہوں (۸۹)۔

کسی شخص نے مولانا کی شعر العجم کی تنقیص لکھی تو مسٹر مہدی حسن نے اس کا ادیبانہ جواب مشرق گورکھپور میں شائع کرایا۔ وہ شمارہ جیسے ہی مولانا کو ملا انھوں نے اس کو پڑھا اور اس کی بے حد تعریف کی، حتی کہ انھوں نے لکھا کہ کاش خود ان کو دو فقرے بھی ایسے لکھنے نصیب ہوں، (۹۰) ایسی پیاری زبان لکھنے والا اور مولانا شبلی کا معتقد ہو یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں (۹۱)۔

مولوی ابو الکلام آزاد کا لکھنو آنے کا ارادہ تھا پھر انھوں نے ملتوی کر دیا تو مولانا نے لکھا کہ آپ اگر اس موقع (۹۲) پر نہ آئے تو وہ قیامت تک بلکہ قیامت کے بعد بھی کلکتہ جانے پر تیار نہیں۔ مولوی صاحب کے لیے اپنے برابر کا کمرہ محفوظ کر دیا تھا۔ دوسرے احباب آچکے تھے اور اکثر احباب آرہے تھے (۹۳)۔ خط کے آخر میں ایک شعر بھی لکھا جو یہ ہے۔

دیر ویراں بھی کعبہ مرا آباد رہے　　یعنی مومن ہوں چلا جاؤں گا یاد رہے

مولانا کو حکیم اجمل خاں کے کتب خانے میں ایک کتاب عربی زبان میں ملی جو آنکھ کی

تشریح اور آنکھ کے تمام امراض کے متعلق تھی اور ان آلات کے نام ان کی شکلیں بھی تھیں، جو اس زمانے میں ایجاد ہو چکے تھے۔ لہذا مولانا نے اس کتاب پر ایک مضمون الندوہ جنوری ۱۹۱۰ء میں لکھا اس کا عنوان "یادگار سلف ... کتاب الکافی فی الکحل" تھا۔ اس میں وہ اس طرح لکھتے ہیں:

"اس کتاب کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آنکھ بنانے کا فن اس وقت کس قدر ترقی کر چکا تھا۔ کاش ہمارے ملک کے امرا کو خیال ہوتا اور ایسی نادر اور مفید کتاب کے شائع کرنے پر آمادہ ہوتے (۹۴)۔"

الندوہ کے جنوری کے شمارے میں مولانا نے ایک مقالہ "مجددان اسلام" کے سلسلے میں علامہ ابن تیمیہ حرانی پر لکھا، جس میں وہ لکھتے ہیں:

"اسلام میں سیکڑوں ہزاروں بلکہ لاکھوں علما، فضلا، مجتہدین، آئمہ فن، مدبرین ملک گزرے، لیکن مجدد یعنی ریفارمر بہت کم پیدا ہوئے۔ ایک حدیث ہے کہ "ہر صدی میں ایک مجدد پیدا ہو گا" اگر یہ مقتبہ حدیث مان لی جائے تو آج تک کم از کم تیرہ مجدد پیدا ہونے چاہییں، لیکن اس حدیث کے صادق آنے کے لیے جن لوگوں کو مجددین کا لقب دیا گیا۔ ان میں سے اکثر معمولی درجے کے لوگ ہیں یہاں تک کہ علامہ سیوطی بھی اس منصب کے امیدوار ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے مجدد کے رتبے کا اندازہ نہیں کیا۔ مجدد یا رفارمر کے لیے تین شرطیں ضروری ہیں:

۱- مذہب یا علم یا سیاست (پالیٹکس) میں کوئی مفید انقلاب پیدا کر دے۔
۲- جو خیال اس کے دل میں آیا ہو کسی کی تقلید سے نہ آیا ہو بلکہ اجتہاد ہو۔
۳- جسمانی مصیبتیں اٹھائی ہوں، جان پر کھیلا ہو، سرفروشی کی ہو۔

یہ شرائط قدما میں بھی بہت کم پائے جاتے ہیں اور ہمارے زمانے میں تو رفارمر ہونے کے لیے صرف یورپ کی تقلید کافی ہے۔ تیسری شرط اگر ضروری قرار نہ دی جائے تو امام ابو حنیفہ، امام غزالی، شاہ ولی اللہ صاحب اس دائرے میں آسکتے ہیں لیکن جو شخص رفارمر کا اصلی مصداق ہو سکتا ہے وہ علامہ ابن تیمیہ ہے ہم اس بات سے واقف ہیں کہ بہت سے امور میں امام غزالی وغیرہ کو ابن تیمیہ پر ترجیح ہے۔ لیکن وہ امور مجددیت کے دائرے سے باہر ہیں۔ مجددیت کی اصلی خصوصیتیں جس قدر علامہ کی ذات میں پائی جاتی ہیں۔ اس کی نظیر بہت کم مل سکتی ہے۔ اس لیے ہم اس عنوان کے ذیل میں علامہ موصوف کے حالات اور ان کی مجددیت کی خصوصیات لکھنا چاہتے ہیں (۹۵)"۔

مولانا نے فروری ۱۹۱۰ء کے الندوہ میں "جہانگیر اور تزک جہانگیری" کے عنوان پر ایک

مقالہ لکھا، جس کے خاتمے پر نظیری کا یہ شعر لکھا ہے:

داستانِ عہدِ گل را از نظیری می شنو — عندلیب آشفتہ تر گفت ست ایں افسانہ را

اس سے اندازہ ہوتا ہے مولانا اس زمانے میں شعرالعجم میں نظیری کے متعلق لکھ رہے تھے۔ چوں کہ فیضی کے متعلق اس سے قبل لکھا تھا۔ اس لیے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ جہانگیر کی یاد ان دونوں شاعروں پر لکھتے لکھتے آئی ہو اور یہ مقالہ تیار ہو گیا ویسے مولانا کو جہانگیر پر خاصا مواد ہاتھ آگیا تھا جس کی وجہ سے انھوں نے یہ مقالہ جی لگا کر لکھا ہے۔ اس مقالہ میں مولانا لکھتے ہیں:

بہ من چنداں گنہ از بدگمانی میکنند نسبت — کہ من ہم در گماں افتادہ پندارم گنہگارم

یورپ کے بے درد واقعہ نگاروں نے سلاطین اسلام کی غفلت شعاری، عیش پرستی، سیہ کاری کے واقعات کو اس بلند آہنگی سے تمام عالم میں مشہور کیا کہ خود ہمیں کو یقین آچلا اور تقلید پرست تو بالکل یورپ کے ہم آہنگ بن گئے۔

ہندوستان کے سب سے بڑے انشا پرداز نے نیرنگ خیال میں جہانگیر کی یہ تصویر کھینچی ہے۔ "اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا جو اپنی وضع سے ہندو راجہ معلوم ہوتا تھا وہ خود مخمور نشہ میں چور تھا ایک عورت صاحب جمال (نور جہاں) اس کا ہاتھ پکڑے آتی تھی اور جدھر چاہتی تھی، پھراتی تھی، وہ جو کچھ دیکھتا تھا اس کے نور جمال سے دیکھتا تھا اور جو کچھ کہتا تھا اسی کی زبان سے کہتا تھا اس پر بھی ہاتھ میں ایک جزو کاغذوں کا تھا اور کان پر قلم دھرا تھا یہ سوانگ دیکھ کر سب مسکرائے، مگر چوں کہ دولت اس کے ساتھ ساتھ تھی اور اقبال آگے آگے اہتمام کرتا آتا تھا۔ اس لیے بدمست بھی نہ ہوتا تھا، جب نشے سے آنکھیں کھلتی تھیں تو کچھ لکھ بھی لیتا تھا"۔

لیکن آؤ دیکھیں اس جھوٹ میں کچھ سچ بھی ہے؟ ہمارے انشا پرداز نے جہانگیر کے کبھی کبھی ہوش میں آجانے کا جو کارنامہ بتایا ہے وہ اس کی کتاب تزک جہانگیری ہے اور سچ یہ ہے کہ جہانگیر کے طرز عمل اور ہر قسم کے خیالات کے دریافت کرنے کا اس سے زیادہ صحیح ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ہم اس مضمون میں اسی کتاب پر مختلف حیثیتوں سے نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت (جس کو سب سے پہلے بیان کرنا چاہیے) یہ ہے کہ وہ واقعات کا نہایت صحیح اور سچا مرقع ہے۔ اس کا ہر ہر لفظ شہادت دیتا ہے کہ کتاب کا لکھنے والا کسی واقعے میں کسی قسم کی رنگ آمیزی نہیں کرنا چاہتا، وہ حکمت عملی اور پالیٹکس کے فلسفے سے بالکل ناواقف ہے۔ وہ بدنما واقعات پر ملمع سازی کا روغن نہیں چڑھا سکتا، وہ عیب بھی کرتا ہے تو ڈنکے کی چوٹ کہہ دیتا ہے اور

ہنر کا کوئی کام اس کے ہاتھ سے بن آتا ہے تو داد طلب خاموشی نہیں اختیار کرتا، بلکہ علانیہ فخر کا اظہار کرتا ہے (۹۶)"۔

۱۹۱۰ء میں سر آغا خان دار العلوم ندوہ تشریف لائے تو ان کی خدمت میں دار العلوم ندوہ کی طرف سے سپاسنامہ پیش کیا گیا، جو مولانا نے فارسی میں لکھا تھا اور اس کو الندوہ مارچ ۱۹۱۰ء میں شائع کیا اس کا عنوان "پیش گاہ خرام عالی مقام جناب مستطاب حضور ہزہائنس سر آغا خان بہادر دام عزہ و مجدہ" اس میں لکھتے ہیں:

"باجملہ ارکان دار العلوم ندوہ باکمال خلوص و نہایت صمیم قلب التفات و توجہ سامی را سپاس گزار ہستیم زحمتی کہ بندگان عالی بہ تشریف آوردن دریں درسگاہ بر خود روا داشتند باجملہ ارکان دار العلوم و اسلامیان ایں شہر بکمال خلوص و نہایت امتنان بہ سپاس گزاری و منت پذیری آں تر زبان ہستیم (۹۷)"۔

الندوہ جولائی ۱۹۱۰ء میں مولانا نے ایک مضمون "حقائق اشیاء اور معشوق حقیقی" لکھا اس میں لکھتے ہیں۔

"غرض تمام اشیاء میں جو اوصاف ہیں، عارضی ہیں اصل کوئی اور چیز ہے جہاں سے ان اوصاف کا فیضان ہوتا ہے یا جو ان اوصاف کے ساتھ حقیقۃً متصف ہے جب یہ مقدمات اور یہ سلسلہ ذہن نشین ہو جاتا ہے تو حضرات صوفیہ کی اصلی تلقین شروع ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ تم جن چیزوں کو اپنا مطلوب اپنا حاصل زندگی قرار دیتے ہو، غور سے دیکھو وہ تمہارا حقیقی مقصد زندگی ہونے کے قابل ہیں یا نہیں ؟ جس چیز کو تم نے حسین سمجھا تھا وہ خود حسین نہ تھی بلکہ حسن حقیقی کا اس پر پرتو پڑ گیا تھا۔ جو بہت جلد جاتا رہا، اس لیے تمہارا منتہائے خیال اور منتہائے خواہش حسن حقیقی، جمال حقیقی اور معشوق حقیقی ہونا چاہیے اور یہی تصوف کی جان اور اس کا دین و ایمان ہے (۹۸)"۔

مولانا نے جولائی میں الندوہ کے شمارے میں صیغہ اشاعت اسلام پر ایک مضمون لکھا، جس میں وہ لکھتے ہیں:

"اشاعت اسلام کی اہمیت کا احساس تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو ہو گیا ہے، لیکن چوں کہ اس کی وجوہ ضرورت اور تدابیر کا پورا خاکہ مرتب نہیں کیا گیا۔ اس لیے اس کے متعلق جو کوششیں ہو رہی ہیں صاف نظر آتا ہے کہ ناتمام اور ناکافی ہیں ہم کو اس مسئلے کے طے کرنے کے لیے امور ذیل کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

۱۔اشاعت اسلام کی ضرورت ۲۔کامیابی کی تدبیریں

اشاعت اسلام کے لفظ سے اگرچہ غیر مذہب والوں کا اسلام میں لانا متبادر ہوتا ہے لیکن اس وقت ہماری مراد اس سے حفاظت اسلام ہے - یعنی مسلمانوں کا اسلام اور احکام اسلام پر قائم رکھنا - یہ ظاہر ہے کہ ہزاروں لاکھوں مسلمان جو دیہات میں رہتے ہیں - احکام اسلام سے ناواقف ہوتے ہیں - اس لیے آریہ وغیرہ ان کے مرتد کرنے کی کوشش کرتے ہیں - نئی نسلیں جو بچپن ہی سے انگریزی تعلیم میں مصروف ہو جاتی ہیں، وہ بھی اکثر اسلام سے ناواقف ہوتی ہیں - اس لیے انگریزی تعلیم ان کے عقائد کو متزلزل کر دیتی ہے - انہی دونوں گروہوں کے اسلام کی حفاظت کرنا اشاعتِ اسلام کا اصلی کام ہے (۹۹) -"

جولائی ہی میں مولانا نے ہومر کے الیڈ کا عربی ترجمہ پر الندوہ میں مضمون لکھا جس میں لکھتے ہیں:

"لیکن سب سے بڑی بات جو اس ترجمہ میں ہے، یہ ہے کہ مترجم نے ہر جگہ حاشیہ میں ہومر کے کلام کی بلاغت کا ایک ایک اسلوب بتایا ہے اور پھر اکثر جگہ عرب کے اشعار نقل کر کے دونوں کا مقابلہ کیا ہے - حیرت ہوتی [illegible] شعرائے جاہلیت جن کو یونان کا نام تک معلوم نہ تھا - ان کے مضامین ہومر سے کس قدر لڑ جاتے ہیں - یہاں تک کہ بعض جگہ سرقہ کا گمان ہوتا ہے اور عنترہ کا کلام پڑھ کر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہومر کو سامنے رکھ کر کہتا تھا، چناں چہ مترجم نے اس پر ایک خاص مضمون لکھا ہے اور دونوں کے بہت سے اشعار نقل کیے ہیں -

آج اگر کوئی شخص یونانی اور عربی شاعری کا مقابلہ کرنا چاہے تو اس کو تفحص اور استقرا کی کوئی ضرورت نہ ہوگی، صرف یہ کتاب اس کے لیے کافی ہے (۱۰۰) " -

الندوہ کے اگست کے شمارے میں مولانا نے معرکہ، مذہب و سائنس مصنفہ ڈریپر کے ترجمہ پر ریویو کیا اور اس کا عنوان "معرکہ، مذہب و سائنس (مصنفہ ڈریپر) مترجمہ مسٹر ظفر علی خان بی اے پر ریویو" رکھا اس میں لکھتے ہیں:

"مترجم کا یہ خاص احسان ہے کہ مصنف نے جہاں کوئی بات اسلام کے خلاف لکھی ہے، انھوں نے نوٹ میں اچھی طرح اس کی پردہ دری کی ہے اور اس وقت وہ مترجم نہیں بلکہ اچھے خاصے تند مزاج مولوی ہیں -"

کتاب کا موضوع نہایت دلچسپ اور نتیجہ خیز ہے - یعنی یہ کہ دنیا میں مذہب اور تحقیقات علمی کا باہمی تعلق کیا رہا ہے کیوں کہ یہ دونوں معرکہ آرا رہے ہیں - مذہب نے کس طرح علم پر بے انتہا جور و ظلم کیے ہیں اور بالآخر کس طرح ہر معرکے

میں شکست فاش کھائی ہے۔ لیکن اس کتاب کے متعلق سب باتوں سے پہلے یہ کہنا پڑتا ہے کہ مصنف نے یہ سخت غلطی کی ہے کہ کتاب کا موضوع عام رکھا ہے اور بحث صرف عیسوی مذہب سے کی ہے۔ اس لیے اگر عیسوی مذہب نے علم پر زیادتیاں کیں اور بالآخر شکست کھائی تو اس سے عام مذہب کے نسبت کوئی نتیجہ کیوں کر پیدا ہو سکتا ہے۔ اس امر پر ہم آئندہ مفصل گفتگو کریں گے (۱۰۱)"۔

الندوہ کے ستمبر کے شمارے میں مولانا نے ایک مضمون "تعلیم قدیم و جدید" پر لکھا اس میں انھوں نے دونوں گروہ (قدیم و جدید) کو پھر مخاطب کیا جیسا کہ وہ ۱۸۹۴ء سے کرتے چلے آرہے تھے اور اصلاحی خاکہ پیش کیا۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:

"تعلیم قدیم و جدید: کیا ان میں سے کوئی غیر ضروری ہے، کیا ان دونوں میں تعارض ہے، کیا ان میں کسی اصلاح کی ضرورت ہے، دونوں مل کر کیوں کر کام کر سکتے ہیں؟"

اگرچہ یہ سوالات قومی مسئلے کے متعلق اہم اور ضروری سوالات ہیں۔ لیکن قوم نے کبھی ان سوالات پر مستقل حیثیت سے بحث نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت جو دنیوی اور دینی درسگاہیں یا انجمنیں ملک میں قائم ہیں، ان کو جو کامیابی اس وقت حاصل ہے وہ اس پر قانع تھیں۔ اس لیے ان مسائل کے حل کرنے کی ان کو ضرورت معلوم نہیں ہوئی۔ مثلاً اسلامی کالجوں میں سیکڑوں ہزاروں بچے تعلیم پاتے ہیں۔ ہر سال سیکڑوں ایم اے اور بی اے ہو کر نکلتے ہیں۔ سیکڑوں فارغ شدہ طلبہ نے معقول نوکریاں حاصل کیں۔ سیکڑوں وکالت کر رہے ہیں۔ سیکڑوں اپرنٹس اور امیدوار ہیں، ان باتوں کے ہوتے ان کو اس بات کی کیا ضرورت ہے کہ وہ قدیم تعلیم کی ضرورت اور اس کے نتائج اور ترمیم و اصلاح کا سودا مول لیں۔

کار دنیا کسے تمام نہ کرد   ہرچہ گیرید مختصر گیرید

اس کے مقابلہ میں عربی مدارس دیکھ رہے ہیں کہ ان کے تعلیم یافتہ مساجد میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ہزاروں مولوی تیار ہو گئے ہیں، ہر ہر ضلع میں عربی کے چھوٹے چھوٹے مدرسے قائم ہوتے جاتے ہیں، ہر جگہ واعظوں کی مانگ ہے، ان باتوں کے ساتھ ان کو کیا غرض ہے کہ وہ جدید تعلیم کی ضرورت اور نتائج پر غور کرنے کی زحمت اٹھائیں (۱۰۲)۔

ستمبر ۱۹۱۰ء کے الندوہ کے شمارے میں مولانا نے ایک مضمون اثبات واجب الوجود مصنفہ مولوی مفتی انوار الحق صاحب سیکرٹری صیغہ۔ تعلیمات ریاست بھوپال پر ایک نوٹ لکھا۔

اس میں وہ لکھتے ہیں:

"اردو زبان میں تصنیفات کے انبار کی کیا کمی ہے، جس کثرت سے دواؤں کے اشتہارات شائع ہوتے ہیں اسی کے قریب قریب تالیفات اور تصنیفات کا شمار بھی پہنچ جاتا ہے، لیکن ان میں سے ہاتھ کے چھونے کے قابل کتنی ہیں؟ اس کا جواب ایک صحیح مذاق سے مانگنا چاہیے جس میں اخلاقی دلیری بھی ہو، اس عالم میں سالوں کے بعد کچھ اوراق پڑھنے کے قابل ہاتھ آجاتے ہیں تو آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ کس قدر خوشی ہوتی ہے، ان ہی اتفاقیہ اور شاذ مثالوں کی مختصر فہرست میں یہ رسالہ بھی ہے (۱۰۳)۔

مولانا نے الندوہ کے دسمبر کے شمارے میں ایک مقالہ درس نظامیہ۔ فرنگی محل یا نظامیہ، بغداد یا ہندوستان کا کیمبرج لکھا۔ اس میں لکھتے ہیں:

"درس نظامیہ ہندوستان کی علمی تاریخ اور علمی زبان کا سب سے زیادہ نمایاں لفظ ہے۔ ہندوستان میں آج کلکتہ سے پشاور تک جس قدر تعلیمی سلسلے پھیلے ہوئے ہیں، سب اسی درس کی شاخیں ہیں۔ کوئی عالم عالم نہیں مانا جاسکتا، جب تک ثابت نہ ہو کہ اس نے اسی طریقہ۔ درس کے موافق تعلیم حاصل کی ہے۔ جس طرح کھوٹا سکہ ٹکسال باہر کہلاتا ہے، اسی طرح کسی کتاب کا درس نظامیہ سے خارج ہونا اس بات کی شہادت ہے کہ وہ نصاب تعلیم میں داخل ہونے کی قابلیت کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ درس نظامیہ اگرچہ خاص ہندوستان کا کارنامہ، فخر ہے۔ لیکن نظام الملک نے بغداد میں جو مدرسہ۔ اعظم نظامیہ کے نام سے قائم کیا تھا۔ اس کی عالمگیر شہرت نے اس قدر دست درازی کی کہ اس سلسلے کو بھی اس کے فہرست اعمال میں داخل کرنا چاہا۔ چناں چہ ہمارے زمانے کے اکثر ناواقفوں کو دھوکا ہو گیا یہاں تک کہ ایک اردو تصنیف میں صراحتہً یہ دعویٰ کیا گیا (۱۰۴)۔"

شعرالعجم کا تیسرا حصہ اسی سال شائع ہوا، مولانا اس کی تمہید میں اس طرح لکھتے ہیں:

"اس دور کا بڑا امتیازی وصف استعارات کی نزاکت اور جدت تشبیہ ہے۔ تمدن کی ترقی میں جس طرح تمام اسباب معاشرت و تمدن میں تکلفات پیدا ہو جاتے ہیں، اسی طرح زبان اور خیالات میں بھی نزاکت اور تکلفات پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً آنکھیں فرش راہ ہیں، گو بجائے خود اچھا استعارہ ہے لیکن نظیری کہتا ہے۔

می خواست بوسہ رخت اقامت بگسترد   از فرش جبہ را برآں خاک کو نہ بود

بوسہ چاہتا تھا کہ بستر ڈالے لیکن اس کی گلی میں اس قدر پریشانیوں کا فرش بچھا ہوا تھا کہ جگہ نہ تھی (۱۰۵)۔"

حواشی:

۱۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۱۳۷، ۴-جنوری ۱۹۱۰ء

۲۔۔۔ مولانا کا نواسہ

۳۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۳۱، ۹-جنوری ۱۹۱۰ء

۴۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۱۳۷، ۱۷-جنوری ۱۹۱۰ء

۵۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۳۲، ۱۸-جنوری ۱۹۱۰ء۔ شعر العجم کی تمام جلدیں ۱۹۱۳ء تک ختم ہو گئیں تھیں۔

۶۔۔۔ مکاتیب اوّل، صفحہ ۱۷۵ تا ۱۷۶، ۱۸-جنوری ۱۹۱۰ء

۷۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۲۳۶ تا ۲۳۷، ۱۹-جنوری ۱۹۱۰ء

۸۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۲۳۷، ۲۳-جنوری ۱۹۱۰ء

۹۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۲۲۵، ۲۶-جنوری ۱۹۱۰ء

۱۰۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۱۰۷ تا ۱۰۸، ۲۷-جنوری ۱۹۱۰ء

۱۱۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۱۷۶ تا ۱۷۷، ۸-فروری ۱۹۱۰ء۔ مثنوی فتوح الحرمین از محی لاری پر مولانا شیروانی نے معارف، اعظم گڑھ نومبر ۱۹۳۲ء میں ریویو کیا (مقالات شیروانی، صفحہ ۳۰۵

۱۲۔۔۔ خواجہ عبد الواجد صاحب مالک نظامی پریس - کانپور - اب ان کی آنکھیں بہت کمزور ہو گئیں ہیں اور گراں گوش بھی ہو گئے ہیں - ان سے ۱۹۶۳ء میں ملا ہوں (ہاشمی)

۱۳۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۱۳۷ تا ۱۳۸، ۱۲-فروری ۱۹۱۰ء

۱۴۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۴۰ تا ۴۱، ۱۴-فروری ۱۹۱۰ء

۱۵۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۱۷۷ تا ۱۷۸، ۱۰-مارچ ۱۹۱۰ء

۱۶۔۔۔ مولانا دریابادی کا یہ الحادی دور تھا۔

۱۷۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۲۲۵ تا ۲۲۶، ۱۱-مارچ ۱۹۱۰ء

۱۸۔۔۔ حاشیہ، صفحہ ۱۳۹، ۲۶-مارچ ۱۹۱۰ء

۱۹۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۱۳۹، ۲۶-مارچ ۱۹۱۰ء

۲۰۔۔۔ روداد اجلاس دوازدہم ندوۃ العلماء، منعقدہ ۱۴ تا ۱۶-ربیع الاول ۱۳۲۸ھ مطابق ۲۶ تا ۲۸-مارچ ۱۹۱۰ء، مطبع احمدی - علی گڑھ، صفحہ ۲-

۲۱۔۔۔ روداد ۱۹۱۰ء، صفحہ ۲-

۲۲۔۔۔ مسٹر محمد علی جناح

۲۳۔۔۔ روداد ۱۹۱۰ء، صفحہ ۲۰

۲۴۔۔۔ روداد ۱۹۱۰ء، صفحہ ۲۴

۲۵۔۔۔ روداد ۱۹۱۰ء، صفحہ ۲۸

۲۶۔۔۔ روداد ۱۹۱۰ء، صفحہ ۴۰

۲۷۔۔۔ روداد ۱۹۱۰ء، صفحہ ۶۳

۲۸۔۔۔ روداد ندوہ-۱۹۱۰ء، صفحہ ۳۷ تا ۴۳

۲۹۔۔۔ روداد ۱۹۱۰ء، صفحہ ۴۷

۳۰۔۔۔ روداد ۱۹۱۰ء، صفحہ ۶۷

۳۱۔۔۔ روداد ۱۹۱۰ء، صفحہ ۷۸

۳۲۔۔۔ روداد ۱۹۱۰ء، صفحہ ۸۰

۳۳۔۔۔ روداد ۱۹۱۰ء، صفحہ ۸۱ تا ۸۲

۳۴۔۔۔ موجودہ خاتون منزل، لکھنو

۳۵ .... روداد ۱۹۱۰ء، صفحہ ۸۱ تا ۸۶
۳۶ .... مولانا شبلی
۳۷ .... روداد ۱۹۱۰ء، صفحہ ۹۰ تا ۹۱
۳۸ .... روداد ۱۹۱۰ء، صفحہ ۹۲ تا ۹۳
۳۹ .... روداد ۱۹۱۰ء، صفحہ ۹۴
۴۰ .... ہز آنر ہیوٹ لفٹنٹ گورنر
۴۱ .... روداد ۱۹۱۰ء، صفحہ ۱۰۸
۴۲ .... روداد ۱۹۱۰ء، صفحہ ۱۴۳
۴۳ .... روداد ۱۹۱۰ء، صفحہ ۱۵۴
۴۴ .... روداد ۱۹۱۰ء، صفحہ ۱۶۳
۴۵ .... روداد ۱۹۱۰ء، صفحہ ۱۹۸
۴۶ .... روداد ۱۹۱۰ء، صفحہ ۲۰۶
۴۷ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۳۲ تا ۳۳، ۱۱-اپریل ۱۹۱۰ء
۴۸ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۷۴، ۲۰-اپریل ۱۹۱۰ء
۴۹ .... اس مضمون کا پتا لگا کر اور اس کا ایک نسخہ پیرس سے منگوا کر مولانا کو پیش کیا گیا۔
۵۰ .... مکاتیب اول، صفحہ ۲۲۱ تا ۲۲۲، ۲۳-اپریل-۱۹۱۰ء
۵۱ .... لکھنو کلکتہ لائن (براہ فیض آباد) پر شاہ گنج جنکشن سے اوٹی آر ریلوے اعظم گڑھ کو جاتی ہے۔ اعظم گڑھ سے چند اسٹیشن سے سرائے میر اسٹیشن ہے۔ اسٹیشن سے مدرسۃ الاصلاح کی عمارت نظر آتی ہے۔ یہ مدرسہ مولانا کی بدولت پر اعظم گڑھ والوں نے قائم کیا تھا۔ بشیر احمد صدیقی صاحب وائس پرنسپل رضا کالج، کراچی اس کالج کے سابق پرنسپل اور مولوی شبلی متکلم اس کے موجودہ پرنسپل ہیں۔ ڈاکٹر شرف الدین صاحب ریسرچ فیلو شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی اس کے سابق طالب علم ہیں یہاں کے بعض سابق طلبہ نے اعظم گڑھ میں بھی سرائے میر کے طرز پر ایک مدرسہ قائم کیا ہے اور جس غربت اور عسرت میں وہ مذہبی خدمت کر رہے ہیں، اس سے میں اعظم گڑھ کے دوران قیام میں بہت متاثر ہوا (ہاشمی)۔
۵۲ .... مکاتیب شبلی دوم، صفحہ ۳۳، ۲۹-اپریل ۱۹۱۰ء
۵۳ .... مکاتیب اول، صفحہ ۲۳۸ تا ۲۳۹، ۲-مئی ۱۹۱۰ء
۵۴ .... مکاتیب اول، صفحہ ۲۶۹ تا ۲۷۰، ۲-مئی ۱۹۱۰ء
۵۵ .... مکاتیب اول، صفحہ ۱۷۸ تا ۱۷۹، ۵-مئی ۱۹۱۰ء
۵۶ .... مکاتیب شبلی اول، صفحہ ۱۷۹ تا ۱۸۰، ۲۵-مئی ۱۹۱۰ء
۵۷ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۷۴ تا ۷۵، ۳۰-مئی ۱۹۱۰ء
۵۸ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۷۵، ۳-جون ۱۹۱۰ء
۵۹ .... ضلع جھانسی میں واقعہ ہے ایک کہاوت اس طرح مشہور ہے۔ جھانسی گلے کی پھانسی دتیا گلے کا ہار۔ جب تک رہے للت پور میں جب تک ملے ادھار (ہاشمی)
۶۰ .... مکاتیب اول، صفحہ ۱۷۸ تا ۱۷۹، ۹-جون ۱۹۱۰ء
۶۱ .... ڈاکٹر سید محمود جو تقسیم ہند کے بعد بھارت میں وزیر ہوئے۔
۶۲ .... مکاتیب اول، صفحہ ۲۷۰، ۹-جون ۱۹۱۰ء

۶۳ ..... مکاتیب اول، صفحہ ۱۸۱، ۱۲-جون ۱۹۱۰ء

۶۴ ..... بعد کو اخبار کا نام الہلال رکھا۔

۶۵ ..... مولانا شبلی جانتے تھے کہ مولوی ابوالکلام کے والد مولوی خیرالدین کی کلکتہ میں بڑی عزت اور وقعت تھی اور ان کے وعظ کی بڑی دھوم تھی۔ لہٰذا خاندانی عزت کو برقرار رکھنے کے لیے مولانا نے یہ مشورہ دیا تھا۔ مولوی ابوالکلام اپنے والد کے وعظ کے متعلق بیان کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کو ایک خاص معاملے میں حد درجے قلبی استغراق تھا۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق و محبت میں اور یہی وہ ذوق تھا جو ان کے تمام علمی و عملی ذوقوں کا مرکز و محور تھا اور ان کے تمام مباحث کا اصلی عنصر اور ان کے تمام افکار و تخیلات کی روح تھا اور اسی لیے ان کے وعظ میں بھی یہی قلبی ذوق روح رواں کا کام دیتا تھا۔ جو ان کے لفظوں میں پنہاں تھی اور باوجود انتہا درجے کی سادگی، بیان کے سامعین کے دلوں پر جا کر تیر و نشتر کا کام دیتی تھی۔ (آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی بہ روایت ملیح آبادی، حالی پبلشنگ ہاؤس - دہلی، صفحہ ۱۲۲ تا ۱۲۳)

۶۶ ..... مکاتیب اول، صفحہ ۱۷۰ تا ۱۷۱، ۱۲-جون ۱۹۱۰ء

۶۷ ..... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۲۶

۶۸ ..... مکاتیب اول، صفحہ ۱۷۱ تا ۱۷۲، ۲۲-جون ۱۹۱۰ء

۶۹ ..... کتاب کا نام

۷۰ ..... مکاتیب اول، صفحہ ۲۷۲، ۲۴-جون ۱۹۱۰ء

۷۱ ..... مکاتیب اول، صفحہ ۲۷۲، ۲۵-جون ۱۹۱۰ء

۷۲ ..... مکاتیب اول، صفحہ ۲۷۲-۲۷۳، ۸-جولائی ۱۹۱۰ء

۷۳ ..... مکاتیب دوم، صفحہ ۷۶، ۱۶-اگست ۱۹۱۰ء

۷۴ ..... مکاتیب اول، صفحہ ۱۸۲، ۳۱-اگست ۱۹۱۰ء

۷۵ ..... مکاتیب اول، صفحہ ۳۲۵، ۱۹۱۰ء

۷۶ ..... مکاتیب اول، صفحہ ۳۳۲ تا ۳۳۳، ۶-ستمبر ۱۹۱۰ء

۷۷ ..... مکاتیب اول، صفحہ ۳۳۳، ۱۵-ستمبر ۱۹۱۰ء

۷۸ ..... مکاتیب اول، صفحہ ۲۷۳، ۲۸-ستمبر ۱۹۱۰ء

۷۹ ..... مکاتیب اول، صفحہ ۱۸۳ تا ۱۸۶، ۲۹-ستمبر ۱۹۱۰ء

۸۰ ..... مکاتیب اول، صفحہ ۱۸۶ تا ۱۸۷، ۳۰-ستمبر ۱۹۱۰ء

۸۱ ..... مکاتیب دوم، صفحہ ۷۶، ۵-اکتوبر ۱۹۱۰ء (مکاتیب میں بجائے ۱۹۱۰ء کے ۱۹۰۹ء شائع ہو گیا ہے، جو غلط ہے)

۸۲ ..... مکاتیب اول، صفحہ ۲۷۳ تا ۲۷۴، ۸-اکتوبر ۱۹۱۰ء

۸۳ ـــ مکاتیب اول، صفحہ ۴۳ ۲، ۱۵-۱ اکتوبر ۱۹۱۰ء
۸۴ ـــ مکاتیب اول، صفحہ ۱۸۷ تا ۱۸۸، ۲۷-۲ اکتوبر ۱۹۱۰ء
۸۵ ـــ مکاتیب اول، صفحہ ۱۸۸ تا ۱۸۹، ۱۵-نومبر ۱۹۱۰ء
۸۶ ـــ غلط یا صحیح یہ الزام مسلمانوں کے اختلاف میں عام ہوتا ہے اور کفر کا فتویٰ بھی (ہاشمی)
۸۷ ـــ مکاتیب اول، صفحہ ۲۴۳ تا ۲۴۵، ۱۷-نومبر ۱۹۱۰ء
۸۸ ـــ مکاتیب دوم، صفحہ ۲۲۶ تا ۲۲۷، ۲۲-نومبر ۱۹۱۰ء
۸۹ ـــ مکاتیب دوم، صفحہ ۲۲۷، ۱۱-دسمبر ۱۹۱۰ء
۹۰ ـــ اس جملہ کو مسٹر مہدی حسن کے صاحبزادے جو گورکھپور یونیورسٹی میں انگریزی کے استاد ہیں طرہ امتیاز سمجھتے ہیں۔(پروفیسر صاحب کا انگریزی خط میرے نام)۔
۹۱ ـــ مکاتیب دوم، صفحہ ۲۲۷ تا ۲۲۸، ۱۳-دسمبر ۱۹۱۰ء
۹۲ ـــ ندوے کی چپقلش اور اس میں مصالحتی تجاویز کی خاطر مولانا کے ہمدردوں اور مخالفین کا اجتماع۔
۹۳ ـــ مکاتیب دوم، صفحہ ۲۲۵، ۲۱-دسمبر ۱۹۱۰ء ۹۴ ـــ مقالاتِ شبلی، جلد چہارم، صفحہ ۵۱
۹۵ ـــ ۹۶ ـــ مقالاتِ شبلی، جلد چہارم، صفحہ ۸۲ تا ۸۳
۹۷ ـــ مقالاتِ شبلی، جلد ہشتم، صفحہ ۹۸ ۹۸ ـــ مقالاتِ شبلی، جلد ہفتم، صفحہ ۹۰
۹۹ ـــ مقالاتِ شبلی، جلد ہفتم، صفحہ ۹۰ ۱۰۰ ـــ مقالاتِ شبلی، جلد ہشتم، صفحہ ۱۱
۱۰۱ ـــ مقالاتِ شبلی، جلد چہارم، صفحہ ۱۹۰ تا ۱۹۱ ۱۰۲ ـــ مقالاتِ شبلی، جلد سوم، صفحہ ۱۳۸ تا ۱۳۹
۱۰۳ ـــ مقالاتِ شبلی، جلد ہشتم، صفحہ ۵۸ تا ۵۹ ۱۰۴ ـــ مقالاتِ شبلی، جلد سوم، صفحہ ۱۰۴ تا ۱۰۵
۱۰۵ ـــ شعر العجم حصہ سوم، طبع چہارم، مطبع اعظم گڑھ، ۱۹۴۵ء، صفحہ ۲۲

۱۹۱۱ء

شاہ سلیمان پھلواروی نے مولانا کے خلاف کچھ اس انداز میں معاملہ پیش کیا ہے کہ مولوی ابوالکلام آزاد جو مولانا سے خاص تعلق رکھتے تھے وہ بھی متاثر ہوئے اور انھوں نے کچھ سوالات قائم کر کے مولانا سے جواب مانگا۔ اس پر مولانا کو تعجب کے ساتھ قلق بھی ہوا کہ وہ مولانا سے خاصے واقف اور ندوے کے سلسلے میں ان کی کوششوں کو جانتے تھے۔ اس کے جواب میں مولانا نے لکھا "ان ھذا الشیء عجاب" اور پھر یہ بھی لکھا کہ اگر جواب ہی دینا پڑا تو قلم اس کے لیے کافی نہیں، مراد یہ کہ زبان سے بھی جواب دیا جائے گا اور بخیے ادھیڑ کر رکھ دیں گے۔ مولانا کا آئندہ چند مہینوں تک کہیں باہر جانے کا ارادہ نہ تھا(۱)۔

مولانا نے پروفیسر عبدالقادر کو خط لکھا تھا۔ وہ جواب نہ دے سکے تو مولانا نے لکھا کہ جواب کے لیے مدت تک منتظر کیا، خط کی رسید ہی بھیج دی ہوتی۔ چوں کہ خط بہت اہم تھا، اس لیے اس کے جواب کے بے حد منتظر رہے۔ اس خط میں پروفیسر صاحب سے شعرالعجم کے حصہ چہارم کے لیے مدد چاہی، یعنی اگر کسی نے انگریزی میں صوفیانہ، رزمیہ یا اخلاقی شاعری پر ریویو کیا ہو تو اس کے ترجمے کی ضرورت تھی۔

اسی زمانے میں مولانا کو اسدی کی کتاب الغتہ کی بڑی ضرورت تھی، اس کو پروفیسر صاحب کے ذریعے خریدنا چاہا۔ اب مولانا نے مہینوں تک سفر کرنے کا ارادہ بدل دیا تھا اور اب ارادہ تھا کہ فروری اور مارچ میں مختلف جگہوں کا سفر کریں اور اپریل ۱۹۱۱ء میں بمبئی پہنچیں (۲)۔

پروفیسر حامد حسین قادری کو کہیں سے ہمایوں کے چند اشعار مل گئے تھے۔ اس پر انھوں نے دریافت کیا تو مولانا نے لکھا کہ ہمایوں شاعر تھا، لہٰذا ممکن ہے کہ یہ اس کے اشعار ہوں، مگر جب تک ایک دو غزل پوری نہ بھیجی جائیں تب تک قطعی فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ ریاضی شاعر کے متعلق بھی پروفیسر صاحب نے معلومات کی تھیں۔ اس پر انھوں نے لکھا کہ یہ سمرقند کا رہنے والا تھا، جامی کے زمانے کا تھا۔ اس کا ذکر میر علی شیر نے اپنے تذکرے میں کیا ہے (۳)۔

اسی زمانے میں زمانہ، کان پور کے ایڈیٹر نے اس عہد کے مشہور مصنفین سے چند سوالات کیے، چناں چہ وہ سوالنامہ مولانا کو بھی بھیجا۔ یہ جوابات جنوری ۱۹۱۱ء میں زمانہ، کان پور

میں شائع ہوئے۔ مولانا نے اسی طرح جواب دیا کہ ان کی پسندیدہ کتابیں فارسی نثر و نظم میں بے شمار ہیں، کہاں تک تمام گنائے جاسکتے ہیں۔ پھر بھی مختلف مضامین کی جو کتابیں بہترین تصانیف کہی جاسکتی ہیں، ان میں سے بعض کتابیں یہ ہیں؛ شاہنامہ، یہ ایشیا کا الیڈ ہے، الیڈ کا عربی ترجمہ جس میں بلاغت و نکات کو حواشی میں تفصیل سے پیش کیا گیا ہے، اسی کو پڑھ کر اگر رائے قائم کی جاسکتی ہے تو شاہنامہ اس سے بڑھ کر ہے۔ غزل میں حافظ کا جواب نہیں، نثر میں گلستان اور فلسفیانہ شاعری میں مولانا روم اور سحبانی سب سے زیادہ پسند ہیں۔

اردو میں حیاتِ سعدی، آبِ حیات، بعض تصانیت (۴) سرسید توبۃ النصوح، دیوان غالب، دیوان میردل سے پسند ہیں۔

تصانیف کے شوق کی ابتدا کے متعلق مولانا لکھتے ہیں کہ ان کو یہ شوق تاریخی تصانیف دیکھنے سے ہوا تھا، جو یورپ میں چھپی تھی اور ایک موقع (۵) پر ان کو یکجا مل گئیں تھی، جن کو انھوں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔

اپنی سب سے پہلی تصنیف عربی زبان میں چھوٹا سا رسالہ اسکات المعتدی بتلایا اس کے بعد سب سے پہلی تصنیف مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم بتلائی جو بار بار چھپی۔

اپنی تصنیف میں خود سب سے زیادہ الفاروق کو پسند کرتے تھے (۶)۔ شیروانی صاحب الہ آباد سے گزرے تو مولانا نے لکھا کہ ایک دن کے لیے لکھنو آجاتے۔ ندوے کے دونوں گروہوں کی مصالحت کے لیے ۲۷۔ فروری ۱۹۱۱ء مقرر ہوئی تھی، مگر اب اس کے بدلنے کا امکان تھا، اس لیے کہ قواعد انتخاب کے مطلب کی تعبیر کے سلسلے میں منتظمین کے گروہ ہی میں اختلاف تھا۔ وکلاء اور قانون دانوں سے کئی روز کے مشورے کے بعد بھی کسی نتیجے پر نہ پہنچا جاسکا۔ مولانا کی رائے تھی کہ ارکان خود مل کر پہلے طے کر لیتے تو بہتر تھا، ورنہ جلسے میں پہلے قواعد ہی پر بحث ہوتی اور جلسہ اسی بحث میں ختم ہو جاتا۔

جنوری ۱۹۱۱ء کے الندوہ کا آغاز یونیورسٹی (۷) کے مسئلہ سے تھا اور جلی عبارت میں لکھا گیا تھا کہ لوگ متوجہ ہوں اور یہ کام شیروانی صاحب کے خط آنے سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ یہ اصل میں مضمون نہ تھا بلکہ ایک نوٹ تھا، لیکن مولانا چاہتے تھے کہ شیروانی صاحب سے مل کر پہلے مسئلہ کو خوب سمجھ لیتے، تب ایک باقاعدہ مضمون لکھتے۔

مولانا کا علی گڑھ جانے کا ارادہ تھا، لہٰذا شیروانی صاحب سے دریافت کیا کہ گیسٹ ہاؤس

میں ٹھہریں یا ان کے یہاں، مگر خود شیروانی صاحب تو علی گڑھ کی نمائش میں خیمے میں قیام فرما ہوں گے۔

ان دنوں مولانا کے پاس مصر سے بعض مفید کتابیں آئیں تو مولانا نے شیروانی صاحب سے دریافت کیا کہ ان کو بھی بھجوا دی جائیں۔ ان میں دو مشہور کتابیں ثمار القلوب للثعلبی اور روح الاجتماع تھیں۔

چوں کہ مولانا کے مخالفین سے شیروانی صاحب کی خط و کتابت ہوئی تھی، اس لیے مولانا جاننا چاہتے تھے کہ وہ کیا انتظامات چاہتے تھے، تاکہ مولانا ویسا انتظام کرتے (۸)۔

سید محمد محسن بلگرامی ساکن قصبہ کوات ضلع آرہ نے مولانا سے دریافت کیا کہ وقت کا معاملہ کس حد تک پہنچا، تو ان کو جواب دیا کہ مسلمانوں کی ناقابلیت سے کوئی کام انجام نہیں پاتا۔ اب اتنا باقی تھا کہ ایک انگریزی میں میموریل تیار ہو جاتا۔ مگر کوئی لکھنے والا نہیں ملتا تھا۔ محنت کے صلے میں (۳۰۰) تین سو روپے تک پیش کرنے کو تیار تھے۔ جب کوئی نہیں ملا تو مجبوراً امیر علی صاحب کو لندن لکھا۔ میموریل بھی مولانا زوردار اور مدلل چاہتے تھے۔ مسٹر جینا (۹) کے متعلق خیال تھا کہ شرع کے مطابق قانون بنائیں گے، مگر انھوں نے مولانا کو نہیں لکھا تھا بلکہ مظہر الحق صاحب بیرسٹر پٹنہ سے اس سلسلے میں خط و کتابت ہوئی تھی، اس لیے مولانا چاہتے تھے کہ خود بمبئی جا کر ان سے ملیں (۱۰)۔

اب مولانا کو لغت اسدی پروفیسر عبدالقادر کے ذریعے مل گئی تھی۔ اس سے مولانا بے حد خوش ہوئے اور پروفیسر صاحب کو لکھا کہ انھوں نے اتنا کبھی خوش نہیں کیا اور نہ کر سکیں گے، جتنا اس کتاب کو بھیجنے سے کیا۔ لیکن قیمت ضرور لکھیں ورنہ مسرت میں کمی ہو جائے گی۔ کتاب کا پتہ چلا کر بھیجنے کا ہی احسان کیا کم ہے۔

مولانا کا بمبئی جانے کا خیال تھا مگر چاہتے تھے کہ مرضی کے مطابق ۳۰ روپے کرائے کا کمرہ مل جاتا جس میں بیت الخلاء علحدہ ہوتا اور ٹراموے کا غل نہ ہوتا (۱۱)۔

البشیر میں یہ پڑھ کر کہ مسٹر مہدی حسن کو انعام میں میڈل ملا ہے، مولانا کو بڑی خوشی ہوئی اور لکھا کہ البشیر نے پوری عمر میں پہلی دفعہ اپنے نام کو اسم بامسمی ثابت کیا، یعنی میڈل پانے کی بشارت دی (۱۲)۔

مولانا نے پروفیسر عبدالقادر سے دریافت کیا کہ وہ شعرالعجم کے متعلق اگر کچھ باتیں

پائیں تو ان کو اطلاع دیں تاکہ شعرالعجم میں اضافہ کیا جائے۔ مولانا چاہتے تھے کہ (۱۳) رزمیہ یا اخلاقی شاعری انگریزی کا نمونہ مل جاتا تو اس کو اپنی شاعری سے تقابل کرتے۔ اسی زمانے میں مولانا کو شاہنامہ کے فرنچ ترجمہ از موہل کی ضرورت تھی جو سات جلدوں میں شائع ہوا تھا۔ حمید اللہ مستوفی قزوینی کی تاریخ گزیدہ کے متعلق ان کا خیال تھا کہ معمولی تاریخ ہے (۱۴)۔

مولانا کے دوست حقی صاحب ۱۷۔ اپریل ۱۹۱۱ء کو بغداد جانے والے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ مولانا بھی ان کے ساتھ سفر میں چلیں تو ہر طرح آرام پہنچائیں گے۔ مولانا نے چاہا کہ ابوالکلام آزاد بھی ساتھ جائیں لیکن وعدہ پختہ ہونا چاہیے۔ مصارف سفر بھی زیادہ نہیں ہیں (۱۵)۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے مولانا سے ندوے میں ہونے والے انتخاب فہرست امیدواران رکنیت منگوائی تو ان کو لکھا کہ ان کے پاس نہیں تھی، مولوی عبدالحی صاحب کے پاس تھی، لہٰذا وہ بھیجیں گے۔ رکنیت کے امیدواروں کے سلسلے میں لکھا کہ فریق مخالفت نے اپنی مرضی کے مطابق فہرست پیش کی تھی کہ جس میں انھیں اکثریت حاصل ہو جائے، مگر اس میں دو باتوں کا خاص خیال رکھا تھا کہ جو فہرست مولانا نے پیش کی تھی ایک تو یہ کہ ہر صوبے کے معزز اور صائب رائے رکھنے والے حضرات تھے، دوسری بات یہ تھی کہ وہ لوگ مخلص اور ندوے کے خیر خواہ تھے۔ مثلاً کلکتہ سے شمس الہدیٰ، مولوی یوسف اور مولوی ابوالکلام آزاد، پنجاب سے شفیع (۱۶) اور ڈاکٹر اقبال (۱۷) وغیرہ۔ اسی زمانے میں نواب عماد الملک بلگرامی نے اپنا ذاتی کتب خانہ (جس میں عربی و انگریزی کتابیں تھیں) ندوے کو عنایت کیا تو سید سلیمان ندوی صاحب کو مولانا نے حیدرآباد بھیجا کہ وہ اپنی نگرانی میں کتابیں لے آئیں (۱۸)۔

مولانا کا اپریل کے مہینے میں کلکتہ جانے کا ارادہ تھا مگر ابوالکلام آزاد نے لکھا کہ وہاں طاعون پھیلا ہوا ہے، اس لیے وہ نہیں چاہتے تھے کہ مولانا کلکتہ جائیں۔ مولانا لکھنو کی گرمی سے پریشان تھے، اس لیے مئی شروع ہونے سے قبل ہی کہیں چلے جانے چاہتے تھے۔ سوچ رہے تھے کہ اگر کہیں جانے کے لیے نہ ہوا تو کشمیر چلے جائیں گے، ورنہ پھر بمبئی تو تھا ہی۔ اب شعرالعجم کا چوتھا حصہ بھی تقریباً تیار تھا۔ مولانا چاہتے تھے کہ اگر اس کا انگریزی ترجمہ ہو جاتا تو یورپ کو نظر آتا کہ مشرقی ادب میں بھی کیسے کیسے جواہر پارے ہیں (۱۹)۔ اب بغداد کے سفر کے متعلق مولوی ابوالکلام آزاد کا خط آچکا تھا۔ ان کو غلط فہمی ہوئی کہ مولانا نے ان کو اس لیے ساتھ لے جانے پر زور دیا کہ ان کی پیری مریدی کو ترقی ہوگی اور اس لالچ میں وہ بغداد جانے پر تیار ہو جائیں گے۔ مولانا

نے ان کی غلط فہمی دور کی۔ چوں کہ ندوے میں سازشیں زوروں پر تھیں، اس لیے مو نا اب کہیں نہیں جا سکتے تھے اور چاہتے تھے کہ معاملہ یکسو ہو جائے۔ ۷۔ اپریل ۱۹۱۱ء (۲۰) ، جلسہ تھا جس میں امید تھی کہ اس سرے یا اس سرے معاملہ طے ہو جائے گا۔ علی گڑھ کالج کو یونی د سٹی بنانے کی جو کوشش ہو رہی تھیں، اس کے متعلق مولانا کا خیال تھا کہ یونی ورسٹی تو ضرور ۔ جائے گی، یہ دوسری بات ہے کہ کس انداز پر ہوگی۔ یہ علی گڑھ والے ہی جان سکتے ہیں، لیکن بہ ہر حال نہ ہونے سے بہتر ہے۔ مولانا ابو الکلام کے استفسار پر مولانا نے لکھا کہ انھوں نے تہذیب الاخلاق کے لیے خاص طور سے مضمون نہیں لکھا، بلکہ مولانا عبد اللہ عمادی کی طلب پر ایک مضمون کا پرانا مسودہ بھیج دیا تھا۔

وقف اولاد کے متعلق اب کامیابی کی بڑی امید ہو گئی تھی، اس لیے کہ سنہا صاحب نے مسلمانوں سے بڑھ کر اس کی موافقت میں مجلس قانون ساز میں تقریر کی تھی اور دوست دشمن سب متفق تھے۔ اب عام کوشش کی ضرورت تھی اور گورنمنٹ بھی یہی چاہتی تھی کہ عام مطالبہ ہو۔ (۲۱)

مولانا نے ابو الکلام آزاد کو اس بات پر ٹوکا کہ دوسروں کی بلا اپنے سر لیتے ہیں، یعنی مصر سے کتابیں دوسروں کے لیے منگوانا اور ان کی خبر نہ لینے پر خود قیمت ادا کرنے پر مجبور ہو جانا ظلمت بعضہا فوق بعض کے مصداق ہے۔ چاہتے تھے کہ الہلال مصر سے ساتھ قائم رکھنے کی ضرورت تھی، یعنی اس کو پہلے ہی قیمت بھیج دینا چاہیے تھی اور اس کی بھیجی ہوئی کتابوں کی قیمت کی ادائیگی میں دیر نہ کرنا چاہیے۔

اب وقف کے مسودے کا ترجمہ کرالیا تھا مگر ترجمہ کرنے والے نے کوئی بات غلط نہ لکھی تھی۔ مطلب یہ کہ اس میں کوئی خاص بات تھی ہی نہیں جو غلط ہوتی۔ ان کو ترجمہ سے بڑی مایوسی ہوئی۔ وقف کے سلسلے میں اب ہر جگہ جلسے کرانے کا خیال تھا۔

مولانا کی کتاب جہاں آرا۔ بیگم کی تصنیف اسی زمانے میں ولایت کی نمائش کے لیے طلب کی گئی، مگر مولانا نے اس شرط پر بھیجنا منظور کیا کہ واپس ضرور ملے گی۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی مصوری کا ایک خاص شعبہ قائم ہو گیا تھا اور اس کی تصویریں تیار ہو رہی تھیں اور ان پر مضامین بھی لکھے جا رہے تھے اور ان تصویروں کو یورپ والے بھی قدر کی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے۔ مولانا کا ارادہ تھا کہ وقف کا رسالہ مولوی ابو الکلام اور

سید عسکری کو بھیجیں (۲۲)۔

اسی زمانے میں ڈاکٹر ڈاکٹر بارویز نے شعرالعجم کے لیے علی گڑھ کالج میں سفارش کی جو منظور نہیں ہوئی، لیکن رجسٹرار نے مولانا کو اطلاع دی کہ شعرالعجم کسی امتحان میں نہیں رکھی گئی، بلکہ ایک ممتاز تصنیف کی حیثیت سے کالج اور اسکولوں کے کتب خانوں کے لیے اس کی سفارش کی گئی۔ مولانا نے حمید الدین سے دریافت کیا کہ کیا ڈاکٹر بارویز نصاب میں رکھنا چاہتے تھے، لیکن یہ کیوں کر ممکن تھا کہ اردو میں لکھی ہوئی کتاب فارسی کے نصاب میں شامل ہوتی۔

اسی زمانے میں پنجاب یونی ورسٹی نے شعرالعجم کے لیے بی۔ اے اور ایم۔ اے کے طلبہ کو مطالعے کی ہدایت کی۔ انھیں دنوں مولانا نے مارسڈن کی کتاب تاریخ ہند دیکھ کر علی گڑھ کالج کے رجسٹرار کو توجہ دلائی کہ وہ دل آزاد ہے۔ جب مسٹر مارسڈن کو اطلاع ہوئی تو وہ خود مولانا سے ملنے آئے اور کہا کہ انھوں نے قابل اعتراض فقرے نکال دیے ہیں اور مولانا کی نشان دہی پر مزید فقرے نکالنے پر تیار ہیں۔ اس پر مولانا نے خیال کیا کہ لوگ کچھ کرتے نہیں ورنہ شکایت سنی جاتی ہے اور بے اثر نہیں ہوتی۔

مولانا چاہتے تھے کہ ندوے کے جلسے میں مولوی حمید الدین آئیں اور رخصت زیادہ لے کر آئیں، تاکہ وقف کے جلسے میں بھی شرکت کر سکیں (۲۳)۔

اب مولانا کا بمبئی میں گرمیاں گزارنے کا ارادہ نہ تھا، بلکہ کلکتہ یا کشمیر کا خیال تھا۔

اسی زمانے میں ڈاکٹر کمار سوامی ایک مشہور ہندو آرٹسٹ تھے۔ وہ ہندوستان کے قدیم ہندی اور اسلامی فن تصویر کے ماہر تھے۔ انھوں نے پروفیسر عبد القادر سے بعض باتیں دریافت کیں تو پروفیسر صاحب نے ان کے حوالے سے پوچھا تو مولانا نے لکھا کہ وہ ان کو جانتے ہیں، اس لیے کہ وہ تصاویر کا بڑا ذخیرہ لکھنؤ سے لے جایا کرتے ہیں اور مولانا کے دوست سے بھی اکثر تصاویر لے گئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس تیمور کی ایک تصویر تھیں جس میں اس کو شکنجہ میں کسا ہوا دکھلایا گیا تھا۔ مولانا نے اس کے متعلق لکھا کہ وہ تصویر تیمور کے دشمنوں نے بنائی ہے، اس لیے کہ اس کی کوئی تاریخی شہادت نہیں۔ باز بہادر کے متعلق بھی دریافت کیا گیا تھا، کیوں کہ ڈاکٹر کمار کے پاس اس کی بھی ایک تصویر تھی۔ وہ مالوہ کا راجہ تھا اور اس کی رانی روپ متی اور وہ خود فن موسیقی کے ماہر اور قدر دان تھے۔ مغلوں سے اور زمانے کے حالات سے تنگ آکر دونوں نے مالوہ کو خیر باد کہا اور ایک شب دونوں گھوڑے پر سوار ہو کر شہر سے روانہ ہو کر دامن کوہ سے

گزر رہے تھے۔ نصف شب کا وقت، دامن کوہ کی خموشی، اندھیری رات میں مشعل کی ہلکی روشنی، شاہانہ لباس کی چمک دمک کو چار چاند لگا رہی تھی۔ اس وقت کی تصویر مغلیہ دور کے ایک مصور نے کھینچی تھی جو لندن میں تھی۔ ڈاکٹر کمار نے اس کا فوٹو لیا تھا اور شائع کرنا چاہتے تھے، لیکن ساتھ ہی باز بہادر کا مفصل حال بھی شائع کرنا چاہتے تھے، لہٰذا مولانا نے لکھا کہ باز بہادر کا قصہ منظوم ہے۔ اس وقت مصنف کا نام یاد نہیں، لیکن تلاش کے بعد لکھیں گے۔ آج کل ندوے کے جلسہ انتظامیہ کی وجہ سے بالکل فرصت نہیں تھی۔

مولانا نے بنارس کے قیام میں (۱۹۰۶ء) بنارس کے ایک کائستھ خاندان کے پاس وہ خطوط اور ان کے جوابات دیکھے تھے جو سیواجی مرہٹہ نے مرزا راجہ جے سنگھ کو لکھے تھے۔ انھوں نے مضامین عالمگیر میں ان خطوط سے استفادہ کیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اگر وہ مل جائے تو شائع کر دیتے۔ مگر اب وہ ٹال مٹول کر رہے تھے اور دینے پر تیار نہ تھے (۲۴)۔

مولانا خلیل الرحمن سہارن پوری نے مولانا سے آمد و خرچ کے رجسٹر کے متعلق دریافت کیا تو مولانا نے لکھا کہ رجسٹر اب مرتب ہو گئے ہیں اور وہ ہر ماہ اس کی جانچ بھی کریں گے اور اب تک مرتب نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ مولوی حفیظ اللہ صاحب قاعدے کی پابندی نہ کر پاتے تھے۔ مولوی شیر علی صاحب فلسفی تھے، وہ ان جھگڑوں میں کہاں پڑتے۔ اب مولوی سید علی صاحب ہدایتوں پر عمل کر رہے تھے اور ایک محرر روزانہ رجسٹر وغیرہ درست کرتا ہے، لیکن وہ پورا دن وقف کے کام میں صرف کر رہے تھے۔ بعض لوگوں کی رائے مخالف بھی ہو رہی ہیں، اس لیے کام بگڑنے کا بھی اندیشہ ہے، اس لیے مولانا کی کوشش ہے کہ سب کو ایک مرکز پر جمع کر دیں۔ ان کا خیال تھا کہ وقف کے وفد کا سالار کوئی عالم ہو جس کو سب لوگ خوشی سے منظور کریں۔ لیکن افسوس ہے کہ نہ کوئی باا ثر اور نہ متفق علیہ ہے اور علماء کسی دنیادار پر متفق ہو جائیں، مگر اپنے گروہ میں کسی پر متفق ہونا مشکل ہے۔

اسی زمانے میں حیدر صاحب (۲۵) حیدر آباد میں ہوم سیکریٹری اور افسر تعلیمات ہوئے۔ ان سے اور مولانا سے تعلقات تھے۔ اس لیے مولانا کو خیال ہوا کہ عبدالحی صاحب کے لیے تحریک کریں۔ ندوے میں فقیہ رکھنے کی تجویز تھی، اس لیے خلیل الرحمن صاحب کو مولانا نے مشورہ دیا کہ منشی احتشام علی صاحب معتمد مال سے دریافت کیا جائے کہ بجٹ میں گنجائش ہے یا نہیں۔ ویسے امید نہ تھی کہ گنجائش ہو، اس لیے کہ اب تک ندوے کے لیے آغا خاں اور رام پور کا روپیہ

نہیں آیا ہے اور عام چندہ بھی گویا کہ نہیں ہوا۔

ندوے کے سفیر کے مصارف بھی ادا نہ ہو سکے تھے۔ دارالعلوم کی موجودہ تنخواہوں کا پورا ہونا بھی مشکل تھا بلکہ تخفیت کا اندیشہ ہے۔

دارالعلوم کی جدید عمارت بھی ناتمام رہی۔ منشی احتشام علی صاحب اگر راضی ہوتے تو دارالعلوم کی قدیم عمارت فروخت کر کے جدید عمارت میں روپیہ لگا دیا جاتا اور وہ مکمل ہو جاتی۔ اس میں طلبہ بھی تنگی سے رہ سکتے تھے۔ بعد میں بورڈنگ کے لیے گورنمنٹ سے قرض لیا جا سکتا تھا وقف کا معاملہ چل رہا تھا اور اس سلسلے میں مولانا عبداللہ المامون السہروردی کو کاغذات بھیج دیے مولوی ابوالکلام آزاد کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے لیے گورنمنٹ سے منظور شدہ مفتی مقرر ہونا چاہیے۔ اس تجویز کو مولانا نے معقول قرار دیا مگر اس مسئلے کے اس وقت چھیڑنے کے حق میں نہ تھے، پھر گورنمنٹ پر بھی اچھا اثر نہ ہوتا۔ پھر مولانا بیک وقت دو بڑے کام نہیں چھیڑنا چاہتے تھے۔

مولانا لکھنو سے پہلے جزیرہ گئے اور کچھ قیام کے بعد تبدیلی آب وہوا اور وقف کے سلسلے میں ۱۸۔ مئی کو بمبئی کے لیے روانہ ہوئے۔ جزیرے میں عطیہ فیضی بھی اپنے بہنوئی نواب جنجرہ کے یہاں موجود تھیں۔ یہاں کی آب وہوا مولانا کو پسند آئی اور اسی عالم میں ایک غزل کہی، جس سے دو شعر یہ ہیں:

ہوائے روح پرور بھی یہاں کی نشہ آور ہے
یہاں فکر مئے و جام و سبو ہو گی تو کیوں ہو گی
کہاں یہ لطف ؟ یہ منظر، یہ سبزہ، یہ بہار ستاں
عطیہ (۲۶) ! تم کو یاد لکھنو (۲۷) ہو گی تو کیوں ہو گی

اگرچہ شعرالعجم کا چوتھا حصہ ابھی زیر تصنیف تھا، مگر جو کچھ تیار ہو گیا تھا وہ مطبع بھیج دیا گیا مسودہ وقف میں مولانا کو کئی غلطیاں معلوم ہو رہی تھیں (۲۸)۔

کہاں لکھنو کی شدید گرم ہوا اور کہاں بمبئی کی سمندری ہوا (Sea Breeze)، جس کو مولانا نے بہشت کی ہوا سے تشبیہ دی تھی۔ بمبئی میں مولانا کو گرمی سے نجات تھی اور اب کی یہاں زیادہ رہنے کا ارادہ تھا۔ اب الندوہ کے انتظامی معاملات میں دشواریاں پیش آ رہی تھیں، اس لیے مولانا نے چاہا کہ سید سلیمان ندوی الندوہ کو اپنی نگرانی میں دوبارہ لے لیں اور اس کے لیے سید سلیمان ندوی کی ہر شرط منظور کرنے کو تیار تھے اور اس کو اس لیے جاری رکھنا چاہتے تھے کہ

وہ ندوے کا نقیب تھا۔

بمبئی میں مولانا کو حماسہ، بحتری گراں قیمت پر ملا۔ انتخاب بھی اچھا نہ تھا لیکن نایاب تھا، اس لیے انھوں نے خرید لیا۔ وقف کا معاملہ طول پکڑ رہا تھا، اس لیے پوری قوت صرف کر رہے تھے۔ ایک گروہ مخالف بھی تھا، مگر علما نے کہیں اختلاف نہیں کیا۔ پشاور اور رام پور سے قانون کے متعلق رائیں بھی آگئیں۔ بمبئی کی فضا ایسی تھی کہ غزلیں ہونے لگیں، مگر اب کی پھیکی تھیں اور اس کی وجہ ان کے نزدیک عمر اور سن کا تقاضہ تھا (۲۹)۔

مسٹر مہدی حسن نے کچھ اشعار مولانا کو لکھ کر بھیجے تھے تو مولانا نے لکھا کہ جو ترکیب انھوں نے استعمال کی تھی وہ فارسی میں مناسب نہ تھی، اس لیے اس میں تبدیلی کر دی۔

اسی زمانے میں پنجاب یونی ورسٹی نے مولانا کو ڈیڑھ ہزار (۱۵۰۰) روپیہ انعام کے طور پر بھیجا۔ یہ انعام مولانا کو شعر العجم پر ۱۹۱۰ء کی بہترین تصنیف قرار دیے جانے پر ملا تھا۔

بمبئی میں جو مولانا کی غزلیں ہو رہی تھیں ان کو رسالوں میں بھیجنے کا ارادہ تھا۔ شاہنامہ کا فرنچ ترجمہ، جس کی مولانا کو تلاش تھی، پانچ سو روپے میں ملا۔

تازہ غزلوں میں سے ایک غزل کا شعر یہ بھی تھا:

در کار عشق دیدہ وری شرط بودہ است   ہر کس نظر کشود و تماشہ بہ مارسید

مولانا کا قیام گلبر روڈ پالن جی ہوٹل۔ بمبئی (۳۰) میں تھا۔ ندوے کے پرنسپل کا معاملہ ابھی کھٹائی میں پڑا ہوا تھا، کیوں کہ علم و فن کے ماہر، بقول مولانا کے بازار میں نہیں ملتے تھے کہ جب چاہا حاصل کر لیا، بلکہ خاص تعلیمات اور اعتماد پر آسکتے تھے۔ مولوی حفیظ اللہ صاحب کے جانے کے بعد تمام منتظمین نے اتفاق رائے سے تین اشخاص کے بلانے کی آرزو کی تھی۔ شمس العلماء مفتی عبد اللہ ٹونکی، پروفیسر اورینٹل کالج۔ لاہور، مولوی شیر علی حیدر آبادی اور مولوی ماجد علی صاحب، مولوی خلیل الرحمن صاحب کا کہنا تھا کہ ان میں سے کسی کے آنے کی امید نہ تھی، اگرچہ ان میں سے ہر ایک مرضی کے مطابق تھا۔

مولوی ماجد علی مولانا کے ادب میں شاگرد تھے، مفتی عبد اللہ ٹونکی ہم سبق تھے اور مولوی شیر علی دوست۔ مولانا نے مولوی ماجد علی کو بلایا، مگر لوگوں نے ان کو پسند نہیں کیا۔ مولوی شیر علی صاحب جس طرح گئے اس کا علم شیروانی صاحب کو بھی تھا۔ مفتی عبد اللہ ٹونکی سرکاری ملازمت میں تھے، اس لیے ان کا آنا مشکل تھا، لیکن مولانا اپنے تعلقات کی بنا پر بلا سکتے تھے۔ مگر

لوگوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ سیکریٹری دارالعلوم کی ذمہ داری کوئی چیز نہیں۔ جب یہ صورت تھی تو کوئی کس برتے پر آتا۔ آخر مولوی فضل حق کے متعلق لوگوں کی راے ہوئی ان کو لکھا گیا تو وہ راضی بھی ہو گئے۔ مگر ندوے سے ایک گمنام خط گیا کہ نہ آئیے، کیوں کہ منتظمین ندوہ میں اختلافات ہیں، اس لیے وہ بھی نہ آئے۔ جب یہ غیر اطمینانی حالت تھی تو کوئی دارالعلوم کی ذمہ داری قبول کر کے ذمہ دار جگہ کیسے لے سکتا تھا۔ مولانا کا خیال تھا کہ جب تک کوئی ماہر فن ندوے کے پرنسپل کے عہدہ پر متمکن نہیں ہوگا، طلبہ میں علمی و دینی مذاق پیدا نہیں ہو سکتا(۳۱)۔

مولانا کے ذہن میں سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم لکھنے کا خیال تو آہی چکا تھا لیکن اب اس کی ابتدائی تیاریاں بھی شروع کر دی تھیں اور مواد جمع کرنے لگے تھے۔ اگرچہ ابھی شعرالعجم حصہ چہارم کے آخری اجزا بھی لکھ رہے تھے۔ مولانا نے پروفیسر عبدالقادر کو لکھا کہ وہ چاہتے ہیں کہ یورپ کے مصنفین نے جو کچھ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لکھا ہے اس سے پوری واقفیت حاصل کی جائے، تاکہ ان کے تائیدی بیان حسبِ موقعہ حجت اسلامی کے طور پر پیش کیے جائیں اور جہاں انھوں نے غلطیاں اور بددیانتیاں کی ہیں ان پر پوری تیاری سے تنقید کی جائے۔ اس بنا پر انگریزی تصانیف کثرت سے مہیا کر لی گئی تھیں۔ چوں کہ ان سب کا ترجمہ ناممکن تھا، اس لیے یہ طے پایا کہ صاحبِ ذوق حضرات کو ایک کتاب بھیج دی جائے۔ وہ مطالعہ کر کے قابل ترجمہ مقامات پر نشانات لگا دیں اور پھر کتاب واپس بھیج دیں تاکہ دفتر کے مترجمین سے ترجمہ کرایا جائے۔ لہٰذا پروفیسر صاحب سے بھی مولانا نے دریافت کیا کہ کیا وہ بھی اس کام میں حصہ لیں گے (۳۲)۔

مسٹر بوا (۳۳) فرنچ مستشرق زیب النساء کے متعلق ایک مضمون لکھنا چاہتے۔ اسی درمیان ان کو ایک ہندوستانی مسلمان خاتون سے معلوم ہوا کہ مولانا نے زیب النساء کے صحیح حالات لکھے ہیں، تو موسیو بوا نے فوراً ایک عربی خط مولانا کو لکھا اور مولانا سے دریافت کیا اور ان حالات کو طلب کیا۔ چوں کہ یہ اردو میں تھے اور رسالہ الندوہ میں شائع ہو چکے تھے، اس لیے مولانا چاہتے تھے کہ اس کا انتخاب انگریزی میں روانہ کیا جائے اور اس کے لیے پروفیسر عبدالقادر کو مقرر کیا کہ وہ ترجمہ کر کے بھیج دیں۔ مولوی سید علی کے مضمون کلیلہ ودمنہ کی پروفیسر صاحب کو ضرورت تھی تو مولانا نے لکھا کہ کالج بک ڈپو، علی گڑھ سے مل سکے گا۔ مولانا کو شاہنامہ کے متعلق پروفیسر صاحب کی بھیجی ہوئی کتاب اب تک نہیں ملی تھی، جس کا انھیں بے چینی سے انتظار تھا۔

جولائی میں مولانا لکھنو آگئے تھے اور ۱۰۔ جولائی کو اور نیشنلسٹ کانفرنس شملہ میں شرکت کے لیے جا رہے تھے۔ مسٹر شاکر اڈیٹر ادیب، الہ آباد نے مولانا کو لکھا کہ وہ اپنے حالات لکھیں۔ اس پر مولانا نے لکھا کہ یہ بالکل ناممکن ہے کہ وہ خود اپنے حالات لکھیں۔ مسلم ریویو، الہ آباد میں البتہ ایک صاحب (۳۴) نے حالات لکھے تھے، اس سے استفادہ کیا جاسکتا ہے اور سید سلیمان ندوی کو اگر لکھا جائے تو وہ بہت کچھ لکھ سکتے ہیں (۳۵)۔

مولانا ندوے کی خرابیوں کی طرف شیروانی صاحب کو برابر توجہ دلاتے رہے، مگر جب کوئی اثر نہ ہوا تو جھلا کر لکھا کہ عہد کر لیا ہے کہ آپ کو کچھ نہ لکھوں گا سوائے اس کے کہ پرنسپلی کا معاملہ طے نہیں ہوا ہے۔ مولوی عبدالحی صاحب کا کہنا تھا کہ لوگوں کو خطوط لکھے گئے اور لوگوں کا کہنا تھا کہ ان کو نہیں پہنچے۔ مفتی عبداللہ ٹونکی کو مولانا نے بڑے اصرار سے بلایا۔ وہ آئے بھی مگر بلافیصلہ واپس گئے، کیوں کہ منتخب کرنے والوں میں کوئی بھی نہیں تھا۔ بہرحال مولانا نے ندوے میں قیام کے لیے ان کو راضی کر لیا تھا۔ لیکن سوال منتخب کرنے والوں کا تھا کہ وہ کب اکٹھا ہوں اور انتخاب کریں۔

وقف کے سلسلے میں عمدہ کاغذ پر میموریل اصلاحات قانون وقف چھپوا کر اور ملک والوں سے دستخط کرا کے وائسرائے کی خدمت میں بھیجنا باقی تھا اور اس کے لیے مزید چندہ کی ضرورت تھی۔ لیکن عام چندہ کا خیال نہ تھا، اس لیے صرف احباب ہی سے طلب کیا، چناں چہ شیروانی صاحب کو بھی لکھا۔

علوم مشرقی کی کانفرنس شملہ سے واپس آچکے تھے اور اس سے بڑی امیدیں وابستہ سمجھتے تھے۔ مولانا نے اس میں بھی ندوے کو روشناس کرایا اور بعض کارروائیوں میں اس کو شامل بھی کر لیا گیا۔ وقف کے سلسلے میں مولانا کا ارادہ دورہ کرنے کا تھا (۳۶)۔

مولانا پہلے ہفتہ، اگست میں سفر میں تھے، پھر بھی حامد حسن قادری کے خط کا مختصر جواب دیا۔ انھوں نے بعض کتابوں کے ترجمے کے متعلق دریافت کیا تھا۔ انھوں نے لکھا کہ تذکرۃ الواقعات از جوہر آفتابچی (۳۷) کا ترجمہ ضرور کیں۔ کتاب الفہرست لابن ندیم بغدادی ترجمے کے بعد دلچسپ نہ رہے گی اور گزیدہ معمولی درجے کی کتاب ہے، اس لیے قابل ترجمہ نہیں (۳۸)۔

علی گڑھ کالج کو یونی ورسٹی بنانے کے سلسلے میں جلسے ہو رہے تھے۔ اکثر معزز حضرات شریک ہو رہے تھے۔ مولانا نے بھی ممبر کی حیثیت سے شرکت کی۔ اس کے بعد وفد کے ساتھ شملہ

بھی جانے کا ارادہ تھا (۳۹)۔

پروفیسر عبدالقادر نے مولانا کو نایاب کہانیوں کی فہرست لکھی اور دستیاب ہونے کے امکان کا بھی اظہار کیا۔ اس سے مولانا بہت خوش ہوئے اور لکھا کہ جب کتابیں آئیں گی تب کی بات الگ ہے۔ علمی ذخیروں کا پتہ معلوم ہونے سے ہی خوشی ہوئی۔ موسیو بوا کو مولانا نے بمبئی سے خط لکھ دیا تھا، مگر اس کی رسید سے محروم رہے۔ پروفیسر صاحب کے لڑکے کے انتقال پر مولانا نے تعزیت کی۔ اب شعرالعجم تقریباً ختم کرلائے تھے (۴۰)۔

تمدن اسلام مصنفہ، جرجی زیدان مصری کی ڈاکٹر باروپز نے یونی ورسٹی سے تحریری سفارش کی کہ وہ عالم اور فاضل کے امتحانات میں شامل کی جائے۔ مولانا پر اس کا بڑا اثر ہوا اور سارے کام چھوڑ کر اس کی دروغ بیانیوں پر ایک مضمون لکھنا شروع کیا۔ اس وقت تک بیس صفحات لکھ چکے تھے۔ عربی میں بھی لکھنے کا ارادہ تھا اور اس کو عربی اخبارات ہی میں طبع کرانے کا خیال تھا۔ مولانا کے پاس تمدن اسلام کا تیسرا حصہ نہ تھا، جس کی ان کو فکر تھی۔ اس لیے ابوالکلام آزاد کو لکھا کہ اگر ان کے پاس ہو تو بھیج دیں، کام ختم ہونے کے بعد واپس کر دیتے۔ ابوالکلام آزاد کو مولانا کی کوئی بات گراں گزری تھی تو مولانا نے اس سلسلے میں ایک شعر لکھا:

بخت بد بیں کہ بہ شبلی نہ کند غیر جفا　　نیک خوئے کہ وفا را ز جفا فشناسد (۴۱)

پروفیسر عبدالقادر کے پاس شاہنامہ (۴۲) کا نقشہ تھا جو ترکی میں تھا۔ مولانا نے دریافت کیا کہ پروفیسر صاحب کیسے کام چلاتے ہیں جبکہ ترکی نہیں جانتے۔ مولانا کو سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر انگریزی کتاب کے سلسلے میں پروفیسر صاحب نے لکھا تو مولانا نے دریافت کیا کہ جس کتاب کے متعلق انھوں نے لکھا وہ کیا پروفیسر مارگولیتھ کی کتاب محمد ازم کے علاوہ ہے یا وہی ہے (۴۳)؟

شیروانی صاحب نے ندوے کا نصاب مانگا تھا، جو مولانا بھیج چکے تھے۔ شیروانی صاحب کا اعظم گڑھ جانے کا ارادہ تھا اس لیے مولانا کو بڑی خوشی ہوئی اور انھوں نے اعظم گڑھ کا ارادہ کیا اور اس کے متعلق خطوط لکھے، لیکن اس سے قبل ان کا رام پور جانے کا ارادہ تھا۔

الٰہ آباد کی نمائش نے مولانا کا ایک لکچر قدیم تحریروں اور کتابوں پر مقرر کیا تھا۔ مولانا کو اس کے مواد کی تلاش تھی۔ شیروانی صاحب سے بھی مواد کے متعلق دریافت کیا۔

چوں کہ یہ شہرت ہو گئی تھی کہ ندوے میں تحقیقاتی کمیشن بیٹھے گا، اس لیے تمام شہر میں

مولانا کے متعلق مشہور ہو گیا تھا کہ ندوے سے مولانا الگ ہو گئے۔ لوگوں کو اس خبر میں اضافے کا موقع ملا اور مولانا کی بد عقیدگی اور الحاد کو شہرت دینے لگے اور یہ بھی کہ ایسے شخص سے ندوے کو نقصان پہنچے گا۔ مآثر رحیمی کا پہلا حصہ بازار میں آ گیا تھا اور کلکتہ میں ملتا تھا۔

مولوی سید حسین بلگرامی بڑی مستعدی سے کام میں لگے ہوئے تھے۔ چناں چہ سورہ بقرہ کا ترجمہ چھپوا کر مسودے کی شکل میں ندوے بھیج دیا۔ اب وقف اولاد کا میموریل لکھ لیا گیا تھا اور مولانا کو اس پر اطمینان تھا (۴۴)۔ اردو اور ہندی کی کشمکش کو حکومت کی طرف سے پھر ہوا دی جارہی تھی، چناں چہ مولانا نے اردو کی حمایت میں جدوجہد کے لیے کمیٹی بنائی تو میر اکبر حسین صاحب اکبر الہ آبادی نے ممبر بننے سے انکار کر دیا، لہٰذا مولوی عزیز مرزا کا نام شامل کر لیا گیا۔ زیادہ ممبروں کی ضرورت نہ تھی۔ اردو سے متعلق ایک استفساری خط لکھوالیا تھا اور چیف سکریٹری یو پی گورنمنٹ مسٹر برن کو بھیجنے والے تھے۔ اس خط کا جواب آنے پر یادداشت لکھوانے کا ارادہ تھا مولانا نے مولوی حمید الدین کو لکھا کہ وہ بھی اپنے خیالات قلم بند کر رکھیں۔ مولانا نے جنرل ریڈر اردو منگوا کر دیکھی۔ اردو اور ہندی دونوں میں ایک ہی عبارت چھپی تھی۔ حکومت کا منشا تھا کہ زبان اور عبارت ایک ہو، صرف دو مختلف لکھاوٹوں (اردو و ہندی) میں شائع کی جائیں، تاکہ صرف لکھاوٹ ہی کا فرق رہے۔ مولانا اس کو ابتدائی درجوں تک تو انگیز کر سکتے تھے، اونچے درجوں کے لیے پسند نہ کرتے تھے (۴۵)۔

وقف کی کارروائیوں کا گورنمنٹ پر یہ اثر ہوا کہ ممبر نے اپنی تقریر میں یہ کہا کہ گورنمنٹ اس بڑے میموریل کا انتظار کرے گی جو مسلمانوں کی طرف سے آنے والا ہے۔ (یعنی انجمن وقف کی طرف سے) میموریل کے پہنچنے کے بعد مسودہ، قانون وقف اولاد کونسل میں پیش ہونے والا تھا، لہٰذا مولانا نے الہ آباد اور بمبئی وغیرہ کا دورہ کر کے تمام متفقین کی رائیں حاصل کیں اور مسودے کے نقص کو ایک الگ یادداشت میں شائع کیا۔ اصل مسودہ انگریزی مختلف حضرات کو ان کی واقفیت کے لیے مولانا نے بھیجا۔ میموریل جلد ہی تیار کر کے اس مسودے کے ساتھ لوگوں کے دستخط لینے کے لیے بھیجا جانے والا تھا۔ اس کے بعد مسودہ انگریزی اور میموریل لے کر ایک وفد صوبے کی حکومت کے ذریعے وائسرائے کی خدمت میں بھیجا جانے والا تھا (۴۶)۔

مولانا نے جرجی زیدان کا تمدن اسلام پر رد لکھ کر مولوی ابو الکلام آزاد کو بھیجا اور لکھا کہ ان کو حیرت ہوگی اور خود مولانا بھی پہلے قیاس نہیں کر سکتے تھے کہ جرجی یا کوئی اور شخص اس قدر

جھوٹ بول سکتا ہے۔ مولانا نے ان کو یہ بھی لکھا کہ خوب روشن چھپنا چاہیے، خواہ لاگت زیادہ آئے مولانا کا یہ بھی خیال تھا کہ المنار مصر میں وہ رد بھیج دیں تو وہ فوراً شائع کر دیں گے، مگر اس میں دیر ہو گی اور مولانا کو ذرا سی دیر بھی بہت گراں گزر رہی تھی۔

۱۲۔ نومبر کو طبیہ دہلی کا عظیم الشان جلسہ لکھنو میں ہو رہا تھا۔ اس میں حکیم عبدالعزیز مرحوم کے خاندان اور حکیم اجمل خاں کا زبردست معرکہ تھا، جس میں مار پیٹ کا بھی اندیشہ تھا۔ نواب صاحب رام پور جلسے کے صدر تھے۔

۲۰۔ نومبر کو الہ آباد میں یونی ورسٹی کے اردو نصاب کا جلسہ تھا۔ چوں کہ مولانا اس کے ممبر تھے، اس لیے ان کو بھی اس میں شرکت کے لیے جانا تھا اور سخت مقابلہ کرنا تھا، کیوں کہ اردو کو مٹانے کی تیاریاں تھیں (۴۷)۔ مولوی عبداللہ ٹونکی کو ندوے کے لیے بلایا گیا تھا۔ رسالہ رد کا مسودہ صاف ہو رہا تھا اور جلد مولوی ابوالکلام کو مع پیشگی اجرت کے بھیجا جانے والا تھا کہ وہ اپنی نگرانی میں شائع کرا دیں۔

تمدن اسلامی مصنفہ جرجی زیدان کا رد لکھنے میں مولانا کو اتنا انہماک رہا کہ ایک آنکھ میں پانی اترتا (موتیا بند) معلوم ہوا اور اس سے صاف حرف نظر نہیں آتے تھے۔ دوسری آنکھ پر بھی بار معلوم ہوتا تھا، اس وجہ سے لکھنا پڑھنا بالکل کم ہو گیا تھا، اس لیے کل ساٹھ صفحے ہو پائے اور اس پر بس کیا اور کتاب ختم کر دی۔ بینائی کی کمزوری کی وجہ سے مولانا بہت رنجیدہ تھے اور اس کو ایسا سمجھتے تھے جیسے کہ سپاہی کا ہتھیار چھن جائے تو وہ کیا لڑے۔ جب لکھنے پڑھنے کا کام نہ کر سکیں تو پھر ایسی زندگی سے کیا حاصل (۴۸)۔

۱۴۔ نومبر کو مولانا کان پور میں تھے۔ مسٹر مہدی حسن نے مقالات اور مضامین عالمگیر منگوائے تو لکھا کہ جلد بھیجیں گے (۴۹)۔ مولانا کا خیال تھا کہ جرجی زیدان کا جو رد الندوہ میں نکلا وہ کمزور تھا، کیوں کہ طبیعت کا زور عربی میں صرف ہوا تھا، اس لیے کہ عرب و شام خاص مخاطب تھے یہی وجہ ہے کہ عربی رسالہ بہت بڑا ہو گیا جس کے مصارف طبع دو سو پچیس روپے سے کچھ زیادہ ہی تھے اور فروخت کی توقع نہ تھی۔ مصر و شام و یورپ میں رسالہ مفت بھیجنے کا ارادہ تھا، اس لیے یہ طے ہوا تھا کہ مصارف کا بار دوست اٹھائیں۔

مصارف کی فکر میں تھے کہ حکیم نور الدین (۵۰) نے اطلاع دی کہ عربی رسالہ الانتقاد کے لیے ۵۰ روپے بھیج رہے ہیں۔ بقیہ کے لیے شیروانی صاحب، نواب مزمل اللہ خان، مولوی حمید

الدین، نواب علی حسن خاں اور خود مولانا شبلی بار اٹھانے والے تھے (۵۱)۔

۲۷۔ نومبر کے بعد سے مولانا کی طبیعت خراب رہی۔ ۲۳۔ دسمبر سے طبیعت کو سکون ہوا تو پھر لکھنے پڑھنے کا مشغلہ شروع ہوا اور انتقاد کے چند صفحات لکھے۔ مولانا کو ایک پریشانی یہ تھی کہ جرجی زیدان ابن الاثیر مطبوعہ یورپ کے حوالے دیتا تھا اور وہ مولانا کو دستیاب نہ ہو سکی اس وجہ سے اس کی بددیانتی اور اکثر چوریوں پر تنقید نہ ہو سکی۔ مولانا کا خیال تھا کہ اس نے ایک واقعہ بھی صحیح طور سے نقل نہیں کیا۔

مولانا نے ہوم ممبر جن سے تمام قوانین کا تعلق ہے ان کو لکھا تھا کہ وہ ایک وفد کی باریابی کی اجازت دیں تاکہ وہ مل کر تمام کاغذات سمجھائے۔ انھوں نے بخوشی منظور کیا اور ۲۷۔ تاریخ مقرر کی، مگر اس تاریخ کے ٹلنے کا امکان قوی تھا۔ مولانا کا خیال تھا کہ وقف کا کام ہو جائے تو ایک بڑا بار اتر جائے (۵۲)۔

حواشی:

۱۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۲۷۹، ۱۱۔ جنوری ۱۹۱۱ء

۲۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۲۴۴، ۳۱۔ جنوری ۱۹۱۱ء

۳۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۳۳۷، ۳۱۔ جنوری ۱۹۱۱ء

۴۔۔۔ تصانیف کا نام ہوتا بہتر تھا۔

۵۔۔۔ سرسید کے ذاتی کتب خانہ میں

۶۔۔۔

۷۔۔۔ علی گڑھ کالج کے یونیورسٹی بنائے جانے کا مسئلہ

۸۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۱۹۰، ۶۔ فروری ۱۹۱۱ء

۹۔۔۔ مسٹر محمد علی جناح

۱۰۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۳۳۱، ۶۔ فروری ۱۹۱۱ء

۱۱۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۲۲۲۔۲۲۳، ۱۳۔ فروری ۱۹۱۱ء

۱۲۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۲۲۸، ۱۹۔ فروری ۱۹۱۱ء

۱۳۔۔۔ اس سے قبل مولانا نے پروفیسر صاحب سے رزمیہ شاعری وغیرہ کے ریویو کے متعلق دریافت کیا تھا اور اب اس قسم کی شاعری کے لیے دریافت کیا، تاکہ مشرقی شاعری سے اس کا تقابل کیا جاسکے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انگریزی ریویو کو مدنظر رکھ کر تقابل کرنا چاہتے تھے۔

۱۴ .... مکاتیب اول، صفحہ ۲۲۲-۲۲۳، ۱۴- فروری ۱۹۱۱ء۔

۱۵ .... مکاتیب اول، صفحہ ۲۷۶، ۸- مارچ ۱۹۱۱ء۔

۱۶ .... غالباً پرنسپل مولوی محمد شفیع صاحب

۱۷ .... علامہ اقبال

۱۸ .... مکاتیب اول، صفحہ ۲۷۶-۲۷۷، ۱۸- مارچ ۱۹۱۱ء۔

۱۹ .... مکاتیب اول، صفحہ ۲۲۳-۲۲۴، ۱۹- مارچ ۱۹۱۱ء۔

۲۰ .... مکتوب میں سال ۱۹۱۰ء چھپ گیا ہے جو غلط ہے۔

۲۱ .... مکاتیب اول، صفحہ ۲۷۸، ۲۵- مارچ ۱۹۱۱ء۔

۲۲ .... مکاتیب اول، صفحہ ۲۷۸، ۱۴- اپریل ۱۹۱۱ء۔

۲۳ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۳۳-۳۴، ۱۲- اپریل ۱۹۱۱ء۔

۲۴ .... مکاتیب اول، صفحہ ۲۲۴-۲۲۵، ۱۳- اپریل- ۱۹۱۱ء۔

۲۵ .... غالباً اکبر حیدری

۲۶ .... مکاتیب اول، صفحہ ۳۳۷-۳۳۸، ۱۰- مئی ۱۹۱۱ء۔

۲۷ .... عطیہ فیضی لکھنؤ آئی تھیں۔

۲۸ .... اودھ اپنی آب و ہوا اور باغات کے لحاظ سے شمالی ہند کا باغ کہا جاتا ہے۔ (Oudhe is a garden of Northen India) اور لکھنؤ اس کا دارالسلطنت ہے اور اپنی تہذیب کے لیے دور دور مشہور ہے۔

۲۹ .... مکاتیب شبلی، صفحہ ۲۷۹، ۱۸، مئی ۱۹۱۱ء۔

۳۰ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۷۶-۷۷، ۲۹- مئی ۱۹۱۱ء۔

۳۱ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۲۸-۲۲۹، ۶- جون ۱۹۱۱ء۔

۳۲ .... مکاتیب اول، صفحہ ۱۹۰-۱۹۱، ۱۴- جون ۱۹۱۱ء۔

۳۳ .... مکاتیب اول، صفحہ ۲۲۵-۲۲۶، جون ۱۹۱۱ء۔

۳۴ .... مسٹر بوا اسلامک ورلڈ نکالتے تھے اور اس کا مقصد تمام اسلامی دنیا کا ریویو تھا۔ انھوں نے اس میں بڑے اچھے مضامین لکھے تھے۔

۳۵ .... شاہ نذیر عالم جونپوری نے (مسلم ریویو) انگریزی میں مولانا کے حالات لکھے تھے۔

۳۶ .... مکاتیب اول، صفحہ ۳۴۱، ۱۰- جولائی ۱۹۱۱ء۔

۳۷ .... مکاتیب اول، صفحہ ۱۹۱-۱۹۲، ۲۷- جولائی ۱۹۱۱ء۔

۳۸ .... ہمایوں کا ملازم جوہر آفتاب چی

۳۹ .... مکاتیب اول، صفحہ ۳۴۸-۳۴۹، ۷- اگست ۱۹۱۱ء۔

۴۰۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۲۸۰، ۱۸-اگست ۱۹۱۱ء
۴۱۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۲۲۶-۲۲۷، ۲۲-اگست ۱۹۱۱ء
۴۲۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۲۸۰-۲۸۱، ۲۹-اگست ۱۹۱۱ء
۴۳۔۔۔ مصنفہ شیخ عبد القادر بغدادی جس کو سالمین نے یورپ میں شائع کیا۔
۴۴۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۲۲۷، ۱۱- ستمبر ۱۹۱۱ء
۴۵۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۱۹۲- ۱۹۳، ۱۳- ستمبر ۱۹۱۱ء
۴۶۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۳۳، ۲۸- ستمبر ۱۹۱۱ء
۴۷۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۱۹۳- ۱۹۴
۴۸۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۲۸۲، ۲۶-اکتوبر ۱۹۱۱ء
۴۹۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۲۲۹، ۱۳-دسمبر ۱۹۱۱ء
۵۰۔۔۔ حکیم نور الدین بھیروی، غلام احمد قادیانی کے خلیفہ، اول
۵۱۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۱۹۴- ۱۹۵، ۲۷-نومبر ۱۹۱۱ء
۵۲۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۳۵، ۲۳-دسمبر ۱۹۱۱ء

۱۹۱۲ء

مولانا کا ارادہ تھا کہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کام شروع سال سے کریں، لیکن اس کام کے لیے پچاس ہزار روپے کی ضرورت تھی، اس لیے سوچ رہے تھے کہ کیا قوم یہ سرمایہ مہیا کر سکے گی(۱)؟

مولوی سید ابو ظفر ندوی سے ایک عیسائی نے سور (خنزیر) کے حلال و حرام کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے مولانا سے دریافت کیا۔ مولانا نے لکھا کہ سور کے چند خصائل بد ہیں۔ قرآن مجید میں حرمت کی تصریح صاف ہے: "حرمت علیکم المیتۃ والدم ولحم الخنزیر"

○ توریت (۲) وانجیل کے احکامات کا مولانا کو اس وقت تک علم نہ تھا۔

مولانا کا خیال تھا کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیح اخلاق، تواضع، فیاضی، عفو وغیرہ موثر طریقے سے پیش کی جائیں تو لوگوں پر بڑا اچھا اثر ہوتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے ساتھ ساتھ پیروی اور عمل صالح کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

وقف اولاد کے سلسلے میں ایک وفد جلد ہی کلکتہ جانے والا تھا۔

مولانا دارالعلوم ندوہ میں سنسکرت بھی پڑھانا چاہتے تھے، مگر کوئی پڑھنے والا نہ تھا۔ مولانا چاہتے تھے کہ اس طرح وہ رد آریہ کے لیے سنسکرت کے طلبہ کو تیار کر سکیں گے(۳)۔

آج کل مولانا بہت مصروف تھے پھر بھی سید ابو ظفر ندوی کے استفسار پر لکھا کہ ابن خلدون کے مقابلے میں ابن خلکان زیادہ معتبر ہے۔ گو ابن خلدون فلاسفر ہے اور خطیب بغدادی کے متعلق لکھا کہ وہ چوتھی صدی ہجری میں تھا۔

مولانا نے الانتقاد میں ایک جگہ حمل کا صلہ علی استعمال کیا تھا جس پر مولوی حمید الدین کو شبہ ہوا تھا۔ اس پر مولانا نے جاحظ کی کتاب الحیوان سے عبارت نقل کر کے بھیجی کہ اس نے بھی اسی طرح استعمال کیا تھا(۵)۔

اب مولانا نے شعر العجم کا چوتھا حصہ مکمل کر لیا تھا پھر بھی میدان اتنا وسیع تھا کہ مزید حصوں کی ضرورت تھی۔ چوتھا حصہ ۲۴۰ صفحات پر ختم کر دیا۔ اب کچھ آرام کے بعد سیرت النبی

صلی اللہ علیہ وسلم کا کام شروع کرنے والے تھے، جس کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس کام کے لیے پچاس ہزار روپے کے خرچ کا تخمینہ تھا، جو مولانا کے نزدیک مسلمانوں کی پانچ کروڑ آبادی کے لحاظ سے زیادہ نہ تھا اور ان کو امید تھی کہ اس نیک کام میں مسلمان دل کھول کر حصہ لیں گے۔

مولانا وقف اولاد کا وفد لے کر کلکتہ جانے والے تھے کہ ہوم ممبر کہیں چلے گئے، لہذا وفد کی پیشی کی تاریخ بدلنے کا امکان تھا۔ ندوے کا سالانہ جلسہ اپریل ۱۹۱۲ء میں طے ہو گیا تھا اور قابل لوگوں کو مدعو کیا جا رہا تھا۔ علامہ اقبال کی شرکت کا امکان تھا۔ ایک ہندو ایم۔ اے مسلمانوں کے انسائیکلوپیڈیا پر مضمون پڑھنے والے تھے۔

اردو کا مسئلہ فروری میں طے ہونے کا امکان تھا۔ پنڈت سندر لال سے مقابلہ تھا اور مسٹر برن چیف سیکریٹری، یوپی گورنمنٹ بھی ان کے ہمنوا تھے۔ مولانا کی یادداشت پر جلسہ ملتوی ہو گیا تھا۔ وہ یادداشت مولانا اب لکھ کر بھیج چکے تھے۔ "اردو کو ہندی بنانے کا منصوبہ تھا اور مولانا مقابلے پر ڈٹے ہوئے تھے" (۶)۔

ابو ظفر ندوی نے مولانا سے نعمت خان عالی کے متعلق معلومات کی تو مولانا نے لکھا کہ وہ عالمگیر کے باورچی خانے کا مہتمم تھا اور بڑا متعصب تھا۔ اب تک ندوے کا کوئی ناظم مقرر نہیں ہوا تھا۔ نائب ناظم یعنی مولوی خلیل الرحمن ہی کام چلا رہے تھے۔ اب مولانا نے سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ بدر تک لکھ لی تھی (۷)۔

ابو ظفر ندوی کے استفسار کے جواب میں مولانا نے پھر لکھا کہ سور (خنزیر) کے نجس ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی جنس کا خیال نہیں کرتا اور یہ احترام ہر جانور میں ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ فضلہ کھاتا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے شادی نہ کرنے کے بارے میں مولانا نے لکھا کہ یہ ان کا ذاتی معاملہ تھا، ویسے شادی نہ کرنا تمدن کے خلاف ہے، لہذا کسی خاص شخص کے لیے جائز ہو سکتا ہے، لیکن سوسائٹی کے لیے بہر حال مضر ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق مولانا نے لکھا کہ آپ کا کئی شادیاں کرنا سیاسی مصلحتوں اور قبائل میں اتحاد پیدا کرنے اور اسلام کی اشاعت کی غرض سے تھا۔ اگر شباب کی خاطر ہوتا تو ۵۳ سال کی عمر تک کئی شادیاں کر سکتے تھے۔ پہلی شادی بھی آپ نے ۲۵ سال کی عمر میں کی اور زوجہ مطہرہؓ کی اس وقت عمر ۴۰ سال تھی۔ ان سب باتوں سے ثابت ہے کہ نفس کو ان

معاملات میں بالکل دخل نہ تھا۔ ازواج مطہراتؓ کے تفصیلی حالات میں سرسید اور امیر علی نے اچھی بحث کی تھی اور مولانا اس کو پسند کرتے تھے، بلکہ ان کا خیال تھا کہ ہر ایک کو سرسید اور امیر علی کی تصنیفات کو پڑھنا چاہیے (۸)۔

مولانا چاہتے تھے کہ تمدن اسلامی پر "رد الانتقاد" عربی رسالہ جلد چھپ جائے، اس لیے سید سلیمان ندوی کو ہدایت کی کہ جلد شائع ہو اور پروف کی تصحیح مولوی شیخ محمد صاحب کے ذمے کی۔ یہ بھی ہدایت کی کہ شعر العجم کے چار صفحوں کی ترمیم افضل صاحب کاتب کے پاس رہ گئی تھی لہٰذا اس کو منگوا کر مفید عام پریس آگرہ کو بھجوا دیں۔

مولانا نے آریوں کی شورش کے مقابلے میں "مجلس حفاظت و اشاعت اسلام" قائم کی تھی، اس لیے اس کی خاطر دورہ کرتے تھے اور دور کے مقامات پر واعظ بھیجتے تھے۔ سید سلیمان ندوی اس کے جوائنٹ سیکریٹری تھے۔ مولانا چاہتے تھے کہ نومسلم آبادیوں کا نقشہ زمیندار لاہور، میں ضرور بھیجا جائے اور دوسرے اخبارات میں تو شائع ہو گیا تھا، تاکہ لوگوں کو کام کرنے میں سہولت ہو (۹)۔

مولانا اشاعتِ اسلام کی خاطر دورے پر ۳۔ فروری کی صبح بانکی پور پہنچے۔ ان کے خیر مقدم میں عمائد شہر اور کالج کے طلبہ موجود تھے اور طلبہ نے بڑے اصرار سے مولانا کی گاڑی خود کھینچی۔ مولانا نے اس کو کانٹوں میں گھسٹنے سے تشبیہ دی ہے اور ان لوگوں کو خوش اعتقاد بلکہ ضعیف الاعتقاد کہا ہے۔ یہاں آتو گئے تھے لیکن ندوے کے سالانہ جلسے کی تیاری میں دشواری ہونے کا خیال چین نہیں لینے دے رہا تھا۔

۴۔ فروری کو بانکی پور (پٹنہ) میں بڑا عظیم الشان جلسہ ہوا۔ مولانا نے اس جلسے میں بھی ندوے کو روشناس کرایا۔

مولانا ندوے کے سالانہ جلسے کے لیے رام پور کے نواب صاحب کو صدر بنانے کے خواہاں تھے مگر مولانا ہی ان کو رام پور جا کر راضی کر سکتے تھے۔ لہٰذا ان کا ارادہ تھا کہ جلد ہی رام پور جا کر ان کو رام کریں۔ ۵۔ فروری کو بانکی پور سے لکھنو کے لیے روانہ ہوئے تاکہ ندوے کے سالانہ جلسے کی تیاری کریں (۱۰)۔

مولانا کی خواہش تھی کہ ندوے کے طلبہ کی ایک جماعت دینی خدمت کے لیے مخصوص کر دیں، جن کو مشقت کی زندگی بسر کرنے کی عادت دلائی جائے، تاکہ مصائب و شدائد برداشت کر

کے دیہاتوں اور گاؤں میں تلقین اسلام کر سکیں ۔ اس لیے مولانا نے اللہ کا نام لے کر "خدام الدین" کے نام سے ندوے میں ایک جماعت قائم کر دی ۔ اس جماعت کو انھوں نے جنوری میں قائم کیا ۔ الگ مکان لے کر اس میں اس جماعت کے طلبہ کو رکھا گیا اور تربیت شروع کر دی گئی ۔ اپنی مرضی سے اس میں سات لڑکے شریک ہوئے اور احکام اسلام کی پابندی اور مشکلات میں کام کرنے کا جذبہ ان میں پیدا ہو گیا، لہذا توقع تھی کہ دیہاتوں میں اشاعتِ اسلام کا کام بھی کریں گے اور دین سے متعلق دیگر کام بھی انجام دے سکیں گے ۔

الانتقاد علی تمدن اسلام مصنفہ جرجی زیدان کے جو اجزا تیار تھے، مولانا نے ان کو المنار (۱۱) مصر میں شائع کرنے کے لیے بھیج دیا ۔ علامہ رشید رضا ان کو پاکر بہت خوش ہوئے اور مولانا کا شکریہ ادا کیا اور لکھا کہ انھوں نے مصر کے علما کو رد لکھنے پر توجہ دلائی تھی، مگر کوئی تیار نہ ہوا ۔

اسی زمانے میں خواجہ عبدالواجد (۱۲) نے ادب میں درجہ تکمیل کا امتحان دیا اور زبانی امتحان (وائیوا Viva-voce) ڈاکٹر ہارویز، پروفیسر علی گڑھ کالج نے لیا اور ان کی قابلیت سے متاثر ہو کر مولانا کو ان کی غیر معمولی قابلیت کی تعریف لکھ کر بھیجی ۔ خواجہ صاحب پہلے سے انگریزی پڑھ رہے تھے، لیکن اب ان کا ارادہ باقاعدہ انگریزی پڑھنے کا تھا تاکہ اشاعتِ اسلام میں مدد ملے ۔ اس لیے مولانا نے مولوی حمید الدین سے خواہش کی کہ وہ اپنا وظیفہ خواجہ عبدالواجد کے نام مخصوص کر دیں اور اس کی اطلاع معتمد مال کو کر دیں اور ساتھ ہی یہ بھی لکھیں کہ یہ وظیفہ لیاقت ہے اور اس وظیفے کے علاوہ ہے جو خوراک کے لیے ملتا ہے ۔ خوراک کے وظیفے میں سب برابر تھے، اس لیے وظیفہ لیاقت جاری کرنے کی ضرورت تھی، تاکہ طلبہ میں تحریک ہو اور وہ اپنی لیاقت بڑھانے اور محنت کرنے میں کوشش کریں (۱۳) ۔

اسی مہینے (فروری) میں شعر العجم حصہ چہارم کے پریس سے چھپ کر آنے کا امکان تھا اور صوفی قادر علی خاں آگرہ پریس کے مالک کی یقین دہانی کی وجہ سے یہ امکان تھا ۔ جلسہ سالانہ ندوہ کی وجہ سے مولانا اس زمانے میں بہت مصروف رہے، لیکن الہ آباد جانے کا ارادہ بھی تھا، اگر مسٹر مہدی حسن الہ آباد آکر اپنی آمد کی یا ارادہ کی اطلاع دیتے (۱۴) ۔

اسی زمانے میں مولوی حکیم رکن الدین دانا ندوی نے تجویز پیش کی کہ الندوہ کے دو صفحے طلبہ قدیم ندوہ کے لیے مخصوص کر دیے جائیں اور اس کی سرخی طلبہ قدیم دارالعلوم ہو اور اس سرخی کے ماتحت طلبہ کے بھیجے ہوئے حالات یا خیالات ہوں تاکہ طلبہ میں یک جہتی اور اتحاد خیالات

اور ندوے کی ہمدردی پیدا ہو۔ مولانا نے اس تجویز کو پسند کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی کو ہدایت کی کہ شذرات میں اظہار مسرت کے ساتھ اعلان کر دیں (۱۵)۔

مولوی ابو ظفر ندوی نے مولانا سے دریافت کیا کہ ہندوستان دار الحرب ہے یا دار الاسلام اور غیر مسلم کے مال پر قبضہ جائز ہے یا نہیں۔ مولانا نے لکھا کہ ہندوستان نہ دار الحرب ہے نہ دار الاسلام بلکہ دار الامن ہے، اس لیے کسی کا مال غصب کرنا کسی حالت میں جائز نہیں۔

بینک کے سود کے متعلق مولانا نے لکھا کہ ان کے (مولانا) کے نزدیک جائز ہے، ویسے شاہ عبد العزیز صاحب کا فتویٰ بھی اس کے متعلق چھپ گیا ہے۔

وقف کی کارروائی کا سلسلہ اب بھی جاری تھا لیکن وفد ابھی تک پیش نہ ہو سکا تھا (۱۶)۔

اسی زمانے میں مولانا نے چند غزلیں کہیں مگر ان کے نزدیک پھیکی تھیں۔ ایک غزل کا مطلع یہ ہے:

تو بہ از بادہ، نہ کار من ناکس باشد	این قدر ہم اگرم عقل بود بس باشد

دوسری غزل کے چند اشعار یہ ہیں:

چہ عجب گر نگہ مست تو افتد برما	بادہ بیرون فتد از جام چو سرشار افتاد
شیوہ مہر ز خوباں نتواں داشت طمع	کہ مرا کار بہ ایں طائفہ بسیار افتاد
محتسب از پے و جمع ز حریفاں بہ کمیں	شبلیا رندی پنہان تو دشوار افتاد (۱۷)

مولوی ریاض حسن خاں نے مولانا سے شکایت کی کہ وہ بانکی پور گئے اور ان کے یہاں رسول پور نہ گئے اور نہ اپنی آمد کی اطلاع دی۔ اس پر مولانا نے لکھا کہ وہ عجلت میں گئے تھے اور دوسرے دن واپس ہو گئے۔ ان کے پاس رسول پور جانے کے لیے بالکل وقت نہ تھا۔ مولوی ریاض حسن خاں چاہتے تھے کہ مولانا کے رسالے الانتقاد کا انگریزی ترجمہ ہو۔ اس کے جواب میں لکھا کہ ایک تو مسلمان انگریزی میں اتنے قابل نہیں اور اگر کوئی ملے بھی تو بغیر اجرت ممکن نہیں اور اجرت کہاں سے دی جائے۔ مصر والوں نے رسالے کی عربی اور مولانا کی دیدہ ریزی، نکتہ سنجی اور تنقید کی بڑی قدر کی۔

مولانا نے مولوی صاحب کو ندوے کے سالانہ جلسے میں شرکت کی دعوت دی اور اپنے بھائی اعجاز حسن خاں کو بھی ساتھ لانے کو لکھا اور لکھا کہ اب کی جلسے میں نہایت اہم امور طے کریں گے۔ خصوصاً نو مسلموں کی حفاظت اسلام کا مسئلہ ہے، جس کو بڑے پیمانے پر شروع کرنا چاہتے

تھے۔ ندوے کی جدید عمارت بھی دیکھنے کے قابل تھی۔

مولانا کے تمدن اسلام کا رد لکھنے کی وجہ یہ لکھی کہ تمدن اسلام کے صرف ایک حصے کا انگریزی ترجمہ مار گولوس نے کیا تھا، جو نہایت متعصب اور اسلام دشمن تھا۔ اسی ترجمے نے مولانا کو رد لکھنے پر آمادہ کیا تھا (۱۸)۔

اب مولانا کو خیام کا جبر و مقابلہ مل گیا تھا، اس لیے پروفیسر عبد القادر سے مستعار لیا ہوا نسخہ واپس کرنے والے تھے۔ لیکن لغات اسدی اس وقت تک واپس کرنے کو تیار نہ تھے، جب تک کہ وہ (پروفیسر صاحب) ان کے لیے دوسرا نسخہ منگوانہ دیں (۱۹)۔

ڈاکٹر باقر نے نظامی کے متعلق مونوگراف تیار کیا تھا۔ مولانا کو اس کی ضرورت تھی۔ اس لیے انھوں نے پروفیسر عبد القادر سے اس کا ترجمہ طلب کیا اور لکھا کہ اس سے شعرالعجم میں مدد ملے گی۔ چوں کہ شعرالعجم کے چوتھے حصے کی ضخامت بھی خاصی ہو گئی تھی، اس لیے اس کے بھی دو حصے کر دیے۔ جلد چہارم کا پہلا حصہ ایک دو ہفتہ میں پریس سے آنے والا تھا۔ مولانا چاہتے تھے کہ اگر اس حصے کا انگریزی ترجمہ ہو جاتا تو یورپ والے بڑی قدر کرتے (۲۰)۔

مولانا نے علامہ سید رشید رضا ایڈیٹر المنار مصر کو ندوے کے سالانہ جلسے کی صدارت کے لیے آمادہ کیا اور انھوں نے منظور کر لیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہندوستان کے کسی جلسے کی صدارت کوئی غیر ملکی کرنے والا تھا اور یہ مولانا کی کوششوں کا نتیجہ تھا اور اس کے لیے مولانا کی علمی شہرت اور مصر میں ان کی عربی کی دھاک (۲۱) کام آئی تھی۔

مولانا نے شروانی صاحب سے ندوے کے سالانہ جلسے کے متعلق ان کی تیاریوں کی بابت دریافت کیا۔

اسی زمانے میں مولانا کو اطلاع ملی کہ نومسلم اکثر جگہ مسجدوں کو گوبر سے لیپتے ہیں، لہذا مولانا نے تحقیق کے لیے ایک انسپکٹر روانہ کیا اور شروانی صاحب سے دریافت کیا کہ اگر اس کام سے یا سالانہ جلسے کے لیے وہ دورے کا ارادہ کریں تو مولانا بھی ساتھ چلیں۔

نواب علی حسن خان صاحب نے اپنا ذاتی کتب خانہ ندوے کو دینے کا ارادہ کیا، تو مولانا نے سالانہ جلسے میں اس کے اعلان کا ارادہ کیا، تاکہ دوسروں کو بھی ترغیب ہو۔

مولانا نے شروانی صاحب سے دریافت کیا کہ ناصر علی کی مثنوی کی اگر ضرورت ہو تو فروخت کے لیے بڑا اچھا نسخہ موجود ہے۔ خیام کا جبر و مقابلہ جس کا نام "رسالہ فی براہین جبر و مقابلہ

تھا اور پیرس میں ۱۸۵۱ء میں چھوٹی تقطیع پر طبع ہوا تھا اور اس کے آخر میں فرنچ ترجمہ تھا وہ مولانا کو دس روپے میں مل گیا تھا۔ اس کو حاصل کر کے ان کو بڑی مسرت ہوئی (۲۲)۔

مولانا اب الہ آباد میں تھے اور یکم مارچ ۱۹۱۲ء کو کلکتہ جانے والے تھے، لہذا سید سلیمان ندوی کو ہدایت کی کہ انھوں نے (مولانا نے) نومسلموں کی ایک مسل (فائل) بنوائی ہے، جو کاتب کے پاس ہے۔ اس کو لے کر ان لوگوں کے نام، پتے اور کام لکھ لیں جن لوگوں نے نومسلموں کے بارے میں خطوط لکھے ہیں، تاکہ ان کو ان لوگوں (نومسلموں) میں کام کرنے کی ترغیب دی جائے اور وہ کافرانہ اور مشرکانہ طریقوں کو چھوڑ دیں۔ نومسلموں کے بارے میں ایک اپیل بھی جلی خط میں عبدالولی صاحب کے پریس میں چھپوائی تھی اور ایک خط کا مسودہ کاتب کو دیا، لہذا وہ چاہتے تھے کہ جن لوگوں نے نومسلموں کے بارے میں خطوط لکھے تھے ان کو اپیل کے دو دو پرچے اور اس کے ساتھ مولانا کا وہ خط بھیج دیں۔ اپیل کے سو نسخے کلکتہ میکلوڈ اسٹریٹ نمبر ۱۳ کے پتے پر خود بھی طلب کیے۔ اپنی ڈاک محفوظ رکھنے اور کلکتہ بھیجنے کی ہدایت بھی کی۔ طلبہ کے متعلق ہدایت کی کہ ان کا جو وفد باہر جائے، ان کو خوب سمجھا دیا جائے کہ ہر جگہ سالانہ جلسے کے لیے نمائندوں کے انتخاب کا جلسہ کرائے، خواہ دو ہی چار آدمی جمع ہوں اور انگریزی و اردو اخبارات میں اس کے متعلق بار بار چھپے۔

مولانا کا خیال تھا کہ امام مالک کی مدونہ کے ساتھ ابن رشد کی کتاب فقہ میں چھپی ہوئی نہایت عمدہ ترتیب تھی اور فقہ کی تمام کتابوں میں افضل تھی (۲۳)۔

۲۔ مارچ کو مولانا کلکتہ پہنچے اور دو تین روز قیام کا ارادہ تھا۔ اشاعتِ اسلام کا کام اپنے سامنے شروع کرا دینا چاہتے تھے۔ مولانا نے اپنے الہ آباد کے قیام میں ورناکیولر اسکیم کے جلسے میں شرکت کی اور جو یادداشت پیش کی اس سے انگریز اور ہندو ممبروں نے پورا اتفاق کیا، اس طرح اردو ناگری ہونے سے بچ گئی۔ ۱۵۔ مارچ کو ورناکیولر اسکیم کا پھر جلسہ ہونے والا تھا، جس میں آخری طور پر معاملات طے ہوتے (۲۴)۔

۱۰۔ مارچ کو مولانا لکھنو میں تھے اور نمبر ۴۸، امین آباد پارک میں قیام تھا۔ یہاں سے مولانا نے شروانی صاحب کو ورناکیولر اسکیم کے جلسے کی کارروائی کی اطلاع دی کہ الہ آباد جس جلسے کی شرکت میں گئے تھے، اس میں چند مضر تجاویز اردو کے خلاف پیش ہوئی تھیں، جس میں ایک یہ بھی تھی کہ رامائن بھاشا انٹرنس (میٹرک) کے امتحان میں لازمی کر دی جائے اور اردو جو مدارس

میں رائج تھی اس کو ہندی کر دیا جائے اور اس کے لیے عجیب منطق سے کام لیا گیا تھا۔ یہ سب مسٹر برن چیف سیکریٹری یوپی گورنمنٹ کے ایما پر ہو رہا تھا۔ پنڈت سندر لال وغیرہ اس کے ممبر تھے۔ تیسرے اجلاس میں مولانا کے دلائل نے سب کو زچ کر دیا، مگر مولانا کو اس کا افسوس تھا کہ مسلمان ممبروں نے مولانا کی کوئی مدد نہ کی اور وہ مدد کرنے کے قابل بھی نہ تھے۔

الہ آباد سے کلکتہ گئے اور وہاں کی کارگزاری کے متعلق شروانی صاحب کو لکھا کہ وہاں وائسرائے کی کونسل کو جمع کر کے ایک جلسے میں وقف کے سلسلے میں تمام مرحلے طے کر لیے اور اسی مہینے میں بل حسبِ مراد پیش کرنے کا انتظام کر کے اور ایک سب کمیٹی کے قیام کو طے کرا کے واپس ہوئے۔

سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق مولانا کو اندازہ تھا کہ یہ کام بڑے پھیلاؤ کا ہے

اشاعتِ اسلام کے سلسلے میں بکثرت خطوط اور رپورٹیں آرہی تھیں کہ نو مسلموں کے ارتداد کا خطرہ ہے، اس لیے کہ آریہ لوگ مختلف دیہاتوں میں مقامی کمیٹیاں قائم کر رہے تھے اور منظم طریقے پر کام کر رہے تھے اور مولانا تنہا کام کرنے والے تھے۔ لوگ بجائے مدد دینے کے رخنہ ڈال رہے تھے۔ اس سے مولانا پریشان تھے کہ کہاں کہاں واعظ بھیجیں اور مکتب قائم کریں۔ مولانا کی اپیل اب چھپ کر تیار ہو گئی تھی اور انھوں نے مختلف لوگوں کو بھیجنا شروع کر دیا تھا۔ بقیہ متعلقہ کاغذات ندوے کے سالانہ جلسے میں پیش کرنے والے تھے۔ مولانا نے کلکتہ میں ایک انجمن سے اشاعتِ اسلام کا کام لیا اور نواب ڈھاکہ کو راضی کر کے اشاعتِ اسلام کا صدر بنایا۔ چوں کہ ندوے میں مولانا کی مخالفت جاری تھی اور کام میں رکاوٹیں ڈالی جارہی تھیں، اس لیے ان کا (مولانا) کا خیال تھا کہ ندوے کے دائرے سے نکل کر کام کریں۔

۱۵۔ مارچ کو ورناکیولر اسکیم کے جلسے میں پھر شرکت کرنے الہ آباد جانے والے تھے۔ اسی زمانے میں گورنمنٹ نے ایک کمیٹی قائم کی تھی جو سرکاری اسکولوں میں مذہبی تعلیم کے اجرا کے متعلق اپنی تجاویز پیش کرتی۔ مولانا کو بھی اس کمیٹی کا ممبر مقرر کیا گیا تھا۔ اس کا جلسہ ۶۔ اپریل کو ہونے والا تھا (۲۵)۔

ہندوستان کے دار الحرب یا دار الامن کے متعلق ابھی مولوی ابو ظفر ندوی سے خط و کتابت چل رہی تھی، لہٰذا مولانا نے لکھا کہ دار الامن کے احکام میں تنوع ہے، یعنی وہاں سے ہجرت

واجب ہے اور نہ جہاد جائز، لیکن ربا جائز ہے جس کی لا ربا بین الحربی والمسلم مولانا نے فقہ حنفی کی رو سے ہندوستان کے دار الحرب اور بینک کے منافع کو سود شمار نہ کرنے کے بارے میں ایک رسالہ بھی لکھا تھا، جس کو سید سلیمان ندوی ۱۹۲۸ء میں شائع کرانے والے تھے۔

مذہبی تعلیم کے سلسلے میں ۶۔اپریل کو جو جلسہ ہونے والا تھا اس کے متعلق مولانا چاہتے تھے کہ ۵۔اپریل کو ہو، اس لیے شروانی صاحب کو لکھا کہ انڈر سکریٹری کو اپنی طرف سے لکھیں اور مولانا کا بھی حوالہ دیں کہ وہ بھی چاہتے ہیں۔

سید رشید رضا صاحب مصر سے لارڈ کچنر کی منظوری لے کر ہندوستان کے لیے روانہ ہو گئے تھے اور ۲۲۔مارچ کو بمبئی پہنچ والے تھے۔ مولانا چاہتے تھے کہ انکی پیشوائی کے لیے بمبئی جائیں، لیکن سالانہ جلسے کا کام اور پروگرام ابھی نہ بن سکا تھا اس لیے اس انتظام کی وجہ سے جانا مشکل تھا (۲۶)۔

سالانہ جلسے میں بہت سی تجاویز کو پیش کرنا تھا، مگر اشاعتِ اسلام کا کام سب پر مقدم تھا، اس لیے کہ مولانا کو جو خبریں مل رہی تھیں، ان سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ نومسلم راجپوت خاندان مرتد ہو رہے تھے اور آریوں کی مقامی انجمنیں چپکے چپکے اپنے کام میں لگی ہوئی تھیں۔ مولانا چاہتے تھے کہ سالانہ جلسے کے بعد ہی دورہ شروع کرتے مگر موسم میں شدت ہونے کی وجہ سے دو ماہ تک ہمت نہیں پڑ رہی تھی اور دورے میں دو ماہ کی دیر غیر معمولی مضر ہوتی (۲۷)۔

مولانا نے پروفیسر عبد القادر صاحب کو لکھا کہ علامہ سید رشید رضا کے استقبال کے لیے اگر وہ بمبئی پہنچ سکیں تو بہتر ہو۔

اپریل میں گرمی کی شدت کی وجہ سے مولانا لکھنو میں نہ رہنا چاہتے تھے اور بمبئی یا کلکتہ میں قیام کا ارادہ تھا، مگر ۸۔اپریل تک سالانہ جلسے کی وجہ سے لکھنو میں قیام ضروری تھا۔

سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں ماہانہ رقم کے متعلق پروفیسر صاحب کو لکھا کہ ابھی نہ بھیجیں اس لیے کہ ابھی اس کی باقاعدہ مد نہیں قائم کر سکے تھے اور حساب کتاب ابھی شروع نہیں کیا تھا۔ یہ ضرور چاہتے تھے کہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں انگریزی میں جو کچھ ہے اس کے جمع کرنے کا کام جاری رکھیں۔

اب شعر العجم جلد چہارم شائع ہو گئی تھی، مگر بہت غلط چھپی تھی۔ صرف فہرستِ مضامین شامل کرنا باقی تھی (۲۸)۔

مولانا نے ریاض حسن خاں صاحب کو سالانہ جلسے میں شرکت کی دعوت دی اور لکھا کہ ۶۔ اپریل سے ۸۔ اپریل تک جلسہ ہوگا، جس میں نہایت اہم مذہبی اور قومی مسائل پیش ہوں گے اور طریقہ، کار کا آغاز کیا جائے گا اور اس میں سید رشید رضا صاحب مصر سے شرکت کے لیے آرہے ہیں۔ وہ بڑے رتبے کے آدمی ہیں کہ جب ترکی جاتے ہیں تو سرکاری استقبال ہوتا ہے (۲۹)۔

مولانا نے سالانہ جلسے کے لیے شروانی صاحب کو بھی دعوت دی اور لکھا کہ وہ کم از کم تین روز قبل آئیں، تاکہ مہمات امور کے اجرا میں ان کی مدد سے آسانی ہو اور سید رشید رضا کی آمد اور جلسے میں ان کی صدارت کی وجہ سے فائدہ اٹھایا جائے، کیوں کہ غیر ملکی مسلمان کے آنے کی وجہ سے لوگ اس جلسے میں شرکت کے لیے بہ کثرت آرہے تھے (۳۰)۔

ندوے کا سالانہ جلسہ ۶ تا ۸۔ اپریل ۱۹۱۲ء کو ہوا۔ اس کی تیاریوں کے متعلق روداد ندوہ میں اس طرح ہے:

"اخباروں کے ذریعے سے عام اعلان تمام ملک میں کر دیا گیا تھا اور آخر فروری سے طلبہ کے وفود اکثر مقامات پر روانہ کیے گئے تھے، جنھوں نے بارہ بنکی، فیض آباد، ردولی، دریاباد، کان پور، اناؤ، رائے بریلی، پرتاب گڑھ، سلطان پور، رام پور، مراد آباد، بستی، خیر آباد، گورکھ پور، علی گڑھ، آگرہ، گیا اور پٹنہ تک دورے کیے اور بزرگان قوم کو ندوے کے مقاصد اور دارالعلوم کی تعلیم و تربیت سے واقف ہونے کا موقع دیا۔ نیز شمس العلما مولوی شبلی صاحب نعمانی اور مولانا سید عبدالحی صاحب نے بنفس نفیس بعض مقامات پر جاکر ندوۃ العلماء کے مقاصد و اغراض لوگوں کے ذہن نشین کیے اور ندوۃ العلماء کے سرگرم وکلا مولوی غلام محمد صاحب شملوی اور مولوی غلام محمد صاحب فاضل ہوشیارپوری نے بے حد تن دہی اور جاں فشانی کے ساتھ ملک میں دورے کیے اور شریک جلسہ ہونے کے لیے لوگوں کو دعوت دی (۳۱)۔"

اس کے بعد روداد میں دہلی کے جلسے (۱۹۱۰ء) کی پاس کی ہوئی تجاویز کو عملی صورت میں دکھانے کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے اور اس جلسے میں ان تجاویز پر جو کارروائی ہوئی اس کو پیش کیا گیا ہے (۳۲)۔

علامہ سید رشید رضا صاحب کا ذکر خیر روداد میں ان الفاظ میں ہے:

"سب سے زیادہ قابل فخر و مباہات ممالک اسلامی کے عظیم الشان مصلح اور مفتی محمد عبدہ مرحوم کے تلمیذ رشید علامہ سید رشید رضا اڈیٹر المنار کی شرکت تھی، جو باوجود انتہائی موانع کے، باوجود اس کے کہ ان کے بھائی قریب تر زمانے میں شہید کر

دیے گئے تھے اور مقدمے کی کارروائی جاری تھی، باوجود اس کے کہ مدرسۃ الدعوۃ و الارشاد کا کام جس کو علامہ ممدوح نے ندوے ہی کے انداز پر قائم کیا ہے، ابتدائی حالت میں تھا۔ ۲۱ دن کی بحری مسافت طے کر کے اور شدائد سفر اور اخراجات کا بار برداشت کر کے صرف ندوے کی شرکت کی غرض سے ہندوستان تشریف لائے۔

ان کو جس چیز نے ہندوستان کے دور دراز سفر پر مجبور کیا، وہ ایک دعوت نامہ تھا جو جلسہ لانہ کے موقع پر انھیں بھیجا گیا تھا۔ اس زمانے میں انجمنوں کے جلسے اور ان کے دعوت نامے ایک رسمی چیز ہو گئے تھے، اس لیے ان میں اس قدر کشش نہیں ہو سکتی کہ مصر سے ایک ایسے کثیر الاشغال بزرگ کو کھینچ لائے۔ ان کو جو چیز ہندوستان لائی وہ نہ ندوۃ العلماء کے مقاصد کی عظمت تھی جس کو خود انھوں نے اپنے مدرسہ دعوۃ و ارشاد کا سنگ بنیاد قرار دیا ہے۔ ان مقاصد نے ان کو مجبور کیا اور وہ ہندوستان کے سفر کے لیے آمادہ ہوئے۔"

"۲۲۔ مارچ کو بمبئی تشریف لائے اور وہاں کے بڑے بڑے معززین، روسا اور اہل عرب نے آپ کا خیر مقدم کیا۔ چند روز کے قیام کے بعد وہ بمبئی سے دہلی کو روانہ ہوئے۔ دہلی سے لاہور تشریف لے گئے اور ۴۔ اپریل کو ندوۃ العلماء کی شرکت کے لیے لکھنؤ کو سرفراز کیا۔ اسٹیشن پر خاص طور سے استقبال کے لیے تیاریاں کی گئی تھیں۔ تمام شہر میں ان کے استقبال کے لیے جلی حرفوں میں اشتہارات چسپاں کیے گئے تھے۔ معززین و اکابرین کی خدمت میں خطوط روانہ کیے گئے تھے۔ اس بنا پر اسٹیشن پر نہایت کثرت سے لوگ جمع ہو گئے تھے اور علماء، طلبہ، روسا، غرض ہر طبقے کے اصحاب استقبال کے لیے تشریف لائے تھے، جن میں سے بعض اصحاب باہر سے صرف اسی غرض سے آئے تھے۔ آنریبل سر راجہ محمد علی محمد خان صاحب بہادر والی محمود آباد نے ان کی دشواری کے لیے خاص طور پر اپنی سواری گاڑی بھیجی تھی۔

اسٹیشن پر ۸ بجے سے لوگ جمع ہونے شروع ہوئے۔ علامہ رشید رضا ۹ بجے پنجاب میل سے مع مولوی عبد الحق حقی بغدادی کے تشریف لائے۔ سید صاحب ممدوح کے گاڑی سے اترتے ہی معانقہ و مصافحہ کے لیے پرجوش مسلمانوں کا وہ ہجوم ہوا کہ بمشکل لوگ ان تک پہنچ سکتے تھے۔ درمیان سے گزرتے ہوئے وہ باہر تشریف لائے اور راجہ صاحب موصوف کی پر تکلف فٹن پر بیٹھ گئے۔ گاڑی نصف راہ تک آہستہ آہستہ چلی، پیچھے پیچھے روسا کی گاڑیاں تھیں، ساتھ ساتھ دارالعلوم کے طلبہ اور پرجوش مسلمانوں کی ایک جماعت تھی۔ یہ سب ٹھہر ٹھہر کر "اھلاً و سہلاً مرحبا" کے نعرے بلند کرتے تھے اور سید صاحب کا متانت آمیز تبسم اس کا جواب دیتا تھا۔ لیکن نصف راہ سے

مسلمانوں نے جوش مسرت سے گاڑی کے گھوڑے کھول دیے اور مسٹر ممتاز حسین بیرسٹر کے مکان تک (جہاں آپ فرد کش ہونے والے تھے) خود گاڑی کھینچ لائے۔

راستے میں عام لوگ اور دکان دار مسلمانوں کے اس مذہبی جوش و ولولے اور اخوت اسلامی کی زندہ تصویر کو دیکھنے کے لیے اپنے اپنے گھروں سے نکل آئے۔ راستے میں ہر جگہ غیر اسلامی افراد اس اسلامی منظر کو تعجب و حیرت کے ساتھ دیکھتے تھے۔ مسلمان ہر جگہ جوش کے ساتھ سلام کے لیے ہاتھ اٹھاتے جاتے تھے اور سید صاحب اسی متانت آمیز تبسم کے ساتھ ہاتھ اٹھا اٹھا کر اسلامی بھائیوں کے سلام کا جواب دیتے جاتے تھے۔

طلبہ کا جوش و خلوص کے ساتھ گاڑی کھینچنا، راستے بھر "اھلاً و سہلاً مرحبا" کے نعرے بلند کرنا اور جناب ممدوح کا متانت آمیز تبسم کے ساتھ جواب دینا اسلامی شوکت کا زمانہ گذشتہ یاد دلانے اور اسلامی شان کے دو بالا کرنے کے علاوہ ایسا منظر تھا جو کبھی چشم دل سے اوجھل نہیں ہو سکتا تھا اور آنکھوں ہی کے ذریعے اس منظر کا لطف اٹھایا جا سکتا تھا۔ کانوں کی راہ سے اس کا ادھورا سا خاکہ بھی ذہن میں نہیں آسکتا(۳۳)۔"

کارروائی جلسہ ۶۔ اپریل ۱۹۱۲ء کا ذکر روداد میں اس طرح ہے:

"۸ بجے علامہ سید رشید رضا موٹر پر تشریف لائے اور تمام لوگ تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے اور جوش کے ساتھ اہلاً و سہلاً مرحبا کی آواز بلند ہوئی، ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے جلسے کا افتتاح ہوا، جیسا کہ ندوۃ العلماء کے اجلاسوں کا عام قاعدہ ہے۔ پہلے مولوی عبدالحق صاحب حقی بغدادی اسسٹنٹ پروفیسر محمڈن کالج علی گڑھ نے نہایت خوش الحانی کے ساتھ عربی لہجے میں چند آیتیں قرآن مجید کی تلاوت کیں۔

صدارت کے لیے جن بزرگوں پر نظر پڑتی ہے ان کے لیے صرف یہی ضروری نہیں ہے کہ ملک میں عام اثر رکھتے ہوں، ذی وجاہت ہوں، روشن خیال ہوں، بلکہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی شرط ہے کہ وہ اسلام و علوم اسلام کے بہت بڑے حامی ہوں، کسی معزز و قدیم خاندان سے تعلق رکھتے ہوں۔ جلسے میں اگرچہ ان صفات کے بزرگ بفضل خدا اور بھی تھے، لیکن اوصاف و حیثیتوں میں جو درجہ علامہ سید رشید رضا اڈیٹر المنار کا تھا وہ بالاتر تھا، اس لیے ندوۃ العلماء کی صدارت کے لیے آپ سے بڑھ کر کوئی موزوں نہیں ہو سکتا تھا۔ چناں چہ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی نے آپ کا تعارف کراتے ہوئے آپ کی صدارت کی تحریک کی اور اس کے ساتھ ایک مختصر تقریر کی، جس میں آپ نے افسوس کے ساتھ کہا کہ اگرچہ علامہ ممدوح ہندوستان میں ناواقفیت

کے ساتھ دیکھے جاتے ہیں لیکن ان کی عام وجاہت و ہر دل عزیزی معلوم کرنی ہو تو آپ انھیں عرب، شام، مصر، قسطنطنیہ، طرابلس الغرب، تیونس، الجزائر، روس اور ممالک یورپ میں پوچھ لیجیے - روشن خیالی کی نسبت اتنا کہنا کافی ہے کہ آپ نے مفتی محمد عبدہ جیسے عظیم الشان مصلح کے شاگرد رشید ہونے کے علاوہ خود بھی باوجود انتہائی صعوبتوں کے عرصے سے اصلاح کا کام نہایت سرگرمی و ایثار کے ساتھ جاری کر رکھا ہے اور اسی غرض سے چودہ سال سے "المنار" نہایت آب و تاب و آزادی کے ساتھ نکال رہے ہیں، جس کے پاکیزہ مضامین کی اسلامی ملکوں میں دھوم ہے - اسلام و علوم اسلام کی حمایت کا شغف اس درجے بڑھا ہوا ہے کہ آپ نے مصائب سفر برداشت کیے، تمام ٹرکی کا سفر کیا اور مصر میں ایک کالج دینی تعلیم کے لیے جس کا نام مدرسہ دعوت و الارشاد ہے، قائم کر لیا ہے، جس کے لیے ایک لاکھ روپے کا گراں قدر عطیہ شیخ الاسلام کی جانب سے ملتا تھا، مگر آپ نے صرف اس بنا پر لینے سے انکار کر دیا کہ آزادی میں خلل آئے گا- لیکن جو صفت ندوے میں اور آپ میں مشترک ہے وہ یہ ہے کہ آپ بھی پالیٹکس سے علاحدہ رہتے ہیں -آپ نے مصر والوں کو اس بات پر متوجہ کیا ہے کہ اگر تمھیں ترقی کرنا ہے تو پالیٹکس سے علاحدہ رہو-

اس کے بعد جناب منشی محمد احتشام علی صاحب رئیس کاکوری نے تائید کی اور آپ بالاتفاق رئیس مجلس منتخب ہوے اور کرسی، صدارت پر جلوہ افروز ہو کر آپ نے نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ ایک مبسوط ، پر مغز تقریر فرمائی جو فی الحقیقت سوق عکاظ کے خطبوں کی یاد دلاتی تھی اور عرب کی قادر الکلامی، زور کلام، گرمی، بیان اور قوتِ تاثیر کی زندہ شہادت تھی -اگرچہ آپ نے تقریر عربی زبان میں کی، اس وجہ سے اس تقریر کو جلسے کا ایک نہایت مختصر گروہ سمجھ سکتا تھا، لیکن سید صاحب کا لب و لہجہ، جوش، حرکات و سکنات، روانی، بیان اور جا بجا قرآن مجید کی آیتوں کا اقتباس اور ان سے استدلال، یہ تمام چیزیں ایسی تھیں جنھوں نے ہر شخص کو محوِ حیرت بنا دیا تھا اور اسلام کی پاک مذہبی زبان کی عظمت در و دیوار سے نمایاں ہو رہی تھیں (۳۴)-"

اس کے بعد روداد میں علامہ سید رشید رضا صاحب کی عربی تقریر صفحہ ۱۸ سے ۳۹ تک ہے اس کے اردو ترجمہ کے متعلق اس طرح درج ہے:

"چوں کہ اجلاس اول کی بعض ضروری کارروائیاں قلتِ وقت کی وجہ سے رہ گئی تھیں، اس لیے انھیں سے ابتدا کی گئی -سب سے پہلے جناب مولانا شبلی صاحب نعمانی شمس العلماء نے افتتاحی تقریر کا ترجمہ سنایا (۳۵)-"

والیان ریاست سے مولانا کے تعلقات کا اندازہ اس خط سے ہوتا ہے:

"نقل خط چیف سیکریٹری ہزہائنس نواب صاحب بہادر والی رام پور بنام مولانا شبلی نعمانی۔

جناب من! قبل ازیں آپ نے تحریک فرمائی تھی کہ اعلیٰ حضرت حضور پر نور دام اقبالہم آغاز ماہ اپریل میں بمقام لکھنؤ مجلس ندوۃ العلماء کی صدر نشینی قبول فرمائیں۔ ہزہائینس بالقابہ کو عموماً تمام علمی مذہبی تحریکوں اور خصوصاً ندوۃ العلماء سے بے حد ہمدردی ہے اور حضور پرنور نہایت مسرت کے ساتھ آپ کی یہ خواہش منظور فرماتے، مگر ۶ تا ۸۔اپریل کو یہاں چند ضروری کام ایسے درپیش ہیں کہ ہزہائینس کو ان تاریخوں میں فرصت نہیں ہو سکتی، اس لیے افسوس ہے کہ حضور محتشم اجلاس ندوہ میں بہ نفس نفیس شریک نہیں ہو سکتے۔ تاہم حضور پرنور نے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ ایک افتتاحی تقریر وہ مرحمت فرمائیں گے کہ اجلاس میں پڑھی جائے۔ حضور پرنور دام ملکہم کی دلی خواہش ہے کہ ندوۃ العلماء کا علمی مرکز سلطنت برطانیہ اور ملک اور قوم کے لیے بابرکت ثابت ہو (۳۶)۔"

تجویز سوم میں نظام دکن کی ناگہانی وفات پر مولانا نے بڑی رقت انگیز تحریک پیش کی جو منشی احتشام علی صاحب کی تائید سے منظور ہوئی (۳۷)۔

تجویز ہشتم میں اس طرح ہے:

"مجلس ندوۃ العلماء گورنمنٹ کی خدمت میں یہ درخواست کرتی ہے کہ تمام دفاتر سرکاری میں نماز جمعہ کے لیے بارہ بجے سے دو بجے تک کے لیے تعطیل قرار دی جائے، جس کے نہ ہونے سے تمام مسلمان ایک بہت بڑے مذہبی فرض کی بجا آوری سے محروم رہ جاتے ہیں۔"

یہ آخری تجویز سب سے زیادہ ضروری اور اہم تھی جسے مذہبی لحاظ سے ایک ممتاز درجہ اور بلند مرتبہ حاصل تھا۔

مولانا شبلی نعمانی نے ایک مختصر اور پردلائل تقریر کے ساتھ اس کی تحریک کی جس میں آپ نے بیان کیا کہ اب تک تعطیل نہ ہونے کے یہ معنی نہیں کہ گورنمنٹ کا یہ منشا ہے کہ مسلمانوں کے مذہب میں دست اندازی کریں، بلکہ اصل بات یہ تھی کہ جس وقت تعطیلیں معین کی گئی تھیں اس وقت خود گورنمنٹ نے مسلمانوں اور ہندوؤں سے ان کے مذہبی دن دریافت کیے تھے۔ ہندو دور اندیش تھے، انھوں نے پہلے ہی سے تمام تیوہار بتا دیے اور پوری تعطیلیں حاصل کر لیں۔ مسلمانوں نے بے جا قناعت سے کام لے کر معلوم نہیں کیوں عید وغیرہ تو بتا دیے، لیکن

ان سے زیادہ مؤکد فرض چھوٹ گئے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک بہت بڑے فرض کی بجاآوری سے، جس سے زیادہ مؤکد کوئی فرض نہیں، محروم ہیں۔ اول تو نماز ہی تمام فرائض میں سب سے زیادہ مؤکد ہے اور پھر نمازوں میں سب سے زیادہ جمعہ کی تاکید ہے۔ لیکن گورنمنٹ اب بھی تیار ہے کہ ان تمام غلطیوں کو، جو لاعلمی سے پیدا ہو گئیں ہیں، مٹا دے۔ اس لیے جو استحقاق ہم اس کے سامنے ظاہر کریں گے وہ قطعاً پورا کیا جائے گا (۳۸)۔"

صیغہ ترجمۃ القرآن کی رپورٹ مولانا نے اس طرح پیش کی:

"ان تجاویز کے پاس ہونے کے بعد سب سے زیادہ ضروری اور اہم بات جو واقعی رہ گئی تھی وہ یہ تھی کہ صیغہ ترجمۃ القرآن کی کارروائی قوم کے سامنے پیش کی جائے اور اس نے گزشتہ سال سے اس وقت تک جو کچھ کیا ہے وہ پبلک کے سامنے ظاہر کیا جائے اور جہاں تک ترجمہ ہو چکا ہے وہ اسٹیج پر دکھایا جائے، تاکہ قوم کو اس کا صحیح اندازہ ہو سکے اور معلوم ہو سکے کہ مجموعی طور پر اب تک کیا کام ہوا؟ کیوں کر ہوا؟ کیسا ہوا؟ اس بنا پر مولانا شبلی صاحب نعمانی شمس العلماء نے اس کی رپورٹ پیش کی، ہم اسے یہاں درج کرتے ہیں۔

رپورٹ صیغہ ترجمۃ القرآن

رپورٹ

ترجمہ قرآن مجید بہ زبان انگریزی

دلی کے اجلاس سالانہ ندوہ میں یہ تجویز منظور ہوئی تھی کہ ندوے کے اہتمام سے قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ کرایا جائے۔ اس کے مصارف کے لیے جناب حکیم اجمل خاں صاحب کی کوشش سے کرنل اسمٰعیل خاں صاحب سفیر افغانستان نے پانچ ہزار کی رقم دینی منظور کی تھی۔

جلسے کے بعد میں نے متعدد حضرات سے اس بارے میں خط و کتابت کی۔ اسی سلسلے میں نواب عماد الملک بلگرامی کو بھی خط لکھا۔ انھوں نے جواب لکھا کہ میں نے قرآن مجید کا ترجمہ شروع کر دیا ہے اور دو برس میں پورا کر دوں گا۔

تمام ہندوستان میں نواب صاحب موصوف کے سوا اس وقت کوئی ایسا مسلمان موجود

نہیں جو عربی داں بھی ہو اور ایسی اعلیٰ درجے کی انگریزی لکھ سکتا ہو کہ اہل زبان اس کا اعتراف کریں۔ اس بنا پر لوگوں نے اس خبر کو بڑی مسرت سے سنا اور نواب صاحب موصوف سے برابر اس کے متعلق خط و کتابت کرتا رہا، لیکن چوں کہ مقصود یہ تھا کہ ترجمہ شخصی حیثیت سے نہ ہو بلکہ قابل اور زبان داں اشخاص کی ایک کمیٹی قائم کی جائے اور وہ لوگ ترجمے کو غور اور فکر سے پڑھ کر تنقید کریں اور یہ تنقیدات نواب صاحب کے پاس بھیج دی جایا کریں، اس غرض سے میں نے ایک کمیٹی قائم کی، جس میں مولوی حمید الدین صاحب بی۔ اے، مولوی محمد صالح صاحب ایم۔ اے بھی شامل تھے۔ مولوی حمید الدین صاحب کی عربی زبان دانی کو اہل مصر نے بھی تسلیم کیا ہے اور ان کی تفسیر عربی کے جس قدر اجزا شائع ہو چکے ہیں وہ خود ان کے کمال ادب کے شاہد ہیں۔

نواب صاحب موصوف نہایت انصاف پرست اور متواضع شخص ہیں۔ وہ اس کے لیے آمادہ ہیں کہ جو رائیں پیش کی جائیں گی ان پر وہ کافی لحاظ کریں گے۔ چناں چہ جو سورہ۔ فاتحہ کے ترجمے کے متعلق مولوی حمید الدین صاحب کی مفصل تنقیدی یادداشت ان کے پاس پہنچی تو انھوں نے مجھ کو یہ الفاظ لکھے: "مولوی حمید الدین صاحب کا نوٹ سورہ۔ الحمد پر ملا۔ میں ان کے نکات کی جہاں تک ممکن ہو گا پابندی کروں (۳۹)۔"

اس کے بعد ترجمے کے متعلق پوری تفصیل روداد میں دی گئی ہے۔ آخر میں مولانا نے اس طرح کہا کہ اب تک جس قدر ترجمہ ہو چکا ہے وہ ملک کے قابل اور ذی علم انگریزی دانوں میں تقسیم کر دیا ہے، تاکہ اس بات کا صحیح اندازہ ہو سکے کہ ترجمہ کہاں تک قابل اطمینان حالت میں ہے (۴۰)۔

مولانا نے اسی جلسے میں ایک تقریر کی جس کے متعلق روداد میں اس طرح ہے:

> "سید سلیمان ندوی صاحب کی تاریخ اغلاط کے صیغے کی رپورٹ کے بعد شمس العلما۔ مولانا شبلی صاحب نعمانی کی وہ بیش بہا تقریر شروع ہوئی جو دارالعلوم کی ضرورت پر آپ نے کی تھی اور جس میں آپ نے کافی طور پر دارالعلوم کے مقاصد و اغراض پر روشنی ڈالی اور اس کی ضرورت کو بہت خوبی سے ظاہر فرمایا تھا۔ اس موقعے پر ہم وہ تقریر درج کرتے ہیں"۔

تقریر شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی

ندانم ایں کہ سررشتہ در کجا بندست — کہ آہ من بکشیدن نمی شود آمر

حضرات میں اس موضوع پر صرف آج ہی نہیں کھڑا ہوا ہوں بلکہ کہنے کو کئی بار کہہ چکا ہوں، لیکن یا تو لوگوں کا دل نہیں تھا یا میرے زبان نہیں تھی، اس لیے مجھے غالب کا یہ شعر کہنا پڑتا ہے:

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات — دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زبان اور

حضرات مسئلہ، اولین یہ ہے کہ بلکہ مقدم مسئلہ یہ ہے کہ آپ لتنے دور دراز مقامات سے بلائے گئے ہیں۔ آپ کو جو یہ تکلیف دی گئی ہے، آیا کسی ضروری کام کے لیے یا حقیقت میں کوئی ضروری چیز ہے یا جس طرح ایک شخص کے گھر پر تقریب ہوتی ہے یا شادی ہوتی ہے تو وہ اس کی ضرورت خاص ہے، اگر وہ اپنے احباب اور دوستوں کو بلاتا ہے اور لوگ اس کی خاطر سے چلے آتے ہیں۔ لیکن یہ مسلمہ ہے کہ وہ کوئی ضرورت عام نہیں ہے، کیا اس حیثیت سے آپ صاحبان تشریف لائے ہیں۔

حضرات اس وقت قوم کو اتنی ضرورتیں پیش ہیں، اس قدر قوم مختلف مصائب میں گرفتار ہو رہی ہے کہ اگر وہ اپنا وقت، اپنا مال، اپنا روپیہ اس طرح سے ہر ایک کام پر ضائع کیا کرے تو قوم بالکل برباد ہو جائے گی اور اس میں اتنی قابلیت نہیں ہے کہ وہ لتنے مصارف کثیر کے لیے روپیہ لائے، نہ اس کا وقت اتنا ارزاں ہے کہ جسے وہ ضائع کر سکے۔ ہمارے ایک شاعر نے کہا ہے:

فکر معاش، ذکر بتاں، یاد رفتگاں — دو دن کی زندگی میں بھلا کیا کرے کوئی

اس لیے سب سے پہلے ہمارے حاضرین آڈینس (Audience) کا یہ کام ہونا چاہیے کہ خود کل مسلمان مطالبہ کریں کہ تم جو اتراتے ہو اور تمام دنیا کے لوگوں کے سامنے اعلان کرتے ہو کہ ندوہ ایک ضروری شے ہے، ندوہ حقیقت میں ایک ضروری شے ہے یا نہیں؟

اے حضرات! اس بات کا زمانہ نہیں رہا کہ لیڈر لوگ آپ کو احمق بنالیں اور جو کچھ وہ کہہ دیں آپ اس کو تسلیم کر لیا کریں۔ وہ زمانہ نہیں رہا ہے کہ چند سربرآوردگان قوم (خواہ کسی

حیثیت سے وہ ممتاز ہو گئے ہوں) علانیہ تمام لوگوں سے کہتے ہیں کہ آؤ آؤ، یہ ایک بہت ضروری چیز ہے، اور غریب آنکھیں بند کیے ہوئے ان کے پیچھے پیچھے چلے آتے ہیں۔ اب زمانہ یہ ہے کہ خود جو لوگ کسی قوم کے ہیں اور جو عام پبلک ہے وہ خود تصفیہ اسی بات کا کریں کہ ہم سے لوگ کیا کہتے ہیں اور ہمیں کس راستے پر لیے آتے ہیں۔ اس سے بہتر کون سا زمانہ پیدا ہو سکے گا، عمر فاروقؓ کے زمانے سے بہتر کون سا زمانہ ہو سکتا ہے، جب کہ انھوں نے ایک موقعے پر کہا کہ اگر میں خلافِ شریعت کہوں گا تو تم میرا کیا کرو گے، تو ایک بدو کھڑے ہو کر کہتا ہے کہ میں تجھے سیدھا کروں گا۔ یہ کوئی وجہ نہیں ہے کہ آپ خود اس بات کا فیصلہ نہیں کرتے۔ آپ کو خود فیصلہ کرنا چاہیے کہ ندوہ حقیقت میں ضروری شے ہے یا نہیں ہے۔ اگر نہیں ہے تو یہاں اتنے احباب ہیں، اتنے بزرگ ہیں، اتنے اہل رائے ہیں، آپ کو قطعی فیصلہ کرنا چاہیے۔ حقیقت میں اس سے زیادہ افسوسناک اور کوئی بات نہیں۔ ہم کو مسلم لیگ کا کام ہے، ہم کو یونی ورسٹی کا کام ہے، ہم کو علی گڑھ کالج کا کام ہے اور ہم کو پچاسوں کام ہیں، اس لیے پہلے سب سے زیادہ مقدم کام یہ ہے کہ آپ ٹھنڈے دل سے نہایت صحیح منطق سے اور نہایت صحیح فیصلہ اور نہایت صحیح فیلنگ سے اس بات کا فیصلہ کریں کہ ندوہ حقیقت میں کوئی چیز قوم کے لیے ضروری ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے تو صاف علاحدہ ہو جانا چاہیے، کسی کی پروا نہیں کرنا چاہیے، کسی کا اجارہ نہیں ہے، کوئی دوستانہ رشتہ نہیں ہے، یہ قومی معاملہ ہے اور اگر حقیقت میں ضروری چیز ہے تو زیادہ توجہ اور زیادہ لطافت کے ساتھ آپ کا عمل ہونا چاہیے، نہ اس طرح کہ آپ بذریعہ دعوت اور باصرار اور بجبر بلائے جائیں۔ اس فیصلے کے لیے کہ ندوہ کوئی ضروری شے ہے یا نہیں؟ سب سے پہلے ہم کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہماری تمام نوعیت کا، ہماری تمام ضرورتوں کا، ہماری تمام زندگی کا اور ہمارے تمام خیالات کا محور اصل کیا ہے؟ کیا محور ہے کہ جس کے گرد ہم گردش کر رہے ہیں؟ جب تک ایک مرکز یا مقصد نہ قائم کر لیا جاوے کسی چیز کے ضروری یا غیر ضروری ہونے کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ ہر ایک قوم نے دنیا میں اپنا ایک محور قرار دیا ہے اور ایک منصوبہ قرار دیا ہے۔ جس طرح نظام شمسی میں آفتاب ہے اس کے گرد تمھارے سیارے حرکت کرتے ہیں اور اس کی طرف جذب ہوتے رہتے ہیں اور اس کی طرف مائل ہیں، اسی طرح انسان کی حرکات، ارادت، جذبات اور تمام اغراض کا ہمیشہ ہر شخص میں ایک نظام ہوا کرتا ہے، ایک محور ہوا کرتا ہے جس کے گرد اس کی تمام خواہشات اور جذبات پھرا کرتے ہیں۔ اس وقت ہمارا محور کیا ہے؟ ہمارے تمام افعال اور ارادے کیا ہیں؟

مثلاً یورپ ہے، اس نے اپنا محور قومیت قرار دیا ہے، نیشن کو یعنی یورپین ہونے کو۔ جو شخص یورپین ہے ان کے نزدیک اس کے حقوق دفعتاً بالاتر ہو جاتے ہیں، بہ نسبت ان تمام لوگوں کے جو یوروپین نہیں ہیں۔ یورپ کا ایک جاہل گورا ایک اجڑ ایک بدتر سے بدتر فرد ان کے نزدیک ہم تمام شریف سے شریف شخصوں سے اور ذات والے انسانوں سے اور اعلیٰ نسب والوں سے زیادہ رتبہ اور حق رکھتا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ ان کا محور، ان کا مرکز خیال قومیت ہے۔ اس لیے جہاں یہ قومیت پائی جائے گی وہاں ان کی تمام محبت، ہمدردی، جوش اور سب چیزیں اس کے گرد پیدا ہو جائیں گی اور اگر یہ محور نہیں ہے تو تمام چیزیں اس سے ہٹ جائیں گی۔ لیکن اب سوال یہ ہے کہ ہمارا محور اب کیا ہے، آیا جس طرح سے یورپ کا محور قومیت ہے؟ یا جس طرح سے پارسیوں کا محور ان کی نسل اور ان کا مجوسی ہونا ہے؟ اور کسی اور قوم نے جس نے کہ جغرافیہ اور زمین کی رو سے اپنا محور قرار دیا ہے جو کسی خاص ملک کے رہنے والے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ جو اس زمین سے پیدا ہوا ہے وہ ہمارا ہے اور ہم اس کے ہیں اور ہمارے عام جذبات اس سے متعلق ہیں۔ آیا یہی ہمارا محور ہے؟ آپ فیصلہ کریں گے کہ ہماری قومیت، ہماری نیشن، ہمارا وجود نہ نسل ہے، نہ ملک ہے، نہ زمین ہے، ہماری ہستی ہمارا وجود کل کا کل مذہب اور فقط مذہب ہے (چیرز)۔ آپ اس بات کا خیال فرما سکتے ہیں اور آپ جان سکتے ہیں کہ ایک شخص جو کہ آج اس وقت چمار ہے اور جو بدترین فرد ہے ہندوستان میں خود ہمارے نزدیک نہیں، خود ان کی قوم کے نزدیک یعنی ہندو لوگوں کے نزدیک وہ اچھوت ہے شودر ہے، اس کو مطلقاً اجازت نہیں ہے اعلیٰ سوسائٹی میں بیٹھنے کی، اگر اس کے کان میں علم کی آواز پہنچے تو اس کے کان میں سیسہ پلا دینا چاہیے، اگر وہ چمار وہ ارذل ترین خلق آپ لوگوں کے سامنے یہ کہہ دے کہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ تو کچھ فرق باقی نہیں رہتا ہے، ہم میں اور اس میں (چیرز)۔ اگر مسجد میں نماز کی جماعت ہو اور وہ چمار صف میں جا کر کھڑا ہو تو کوئی حق نہیں پہنچ سکتا ہے اس صدر کو یا کسی سلطان کو کہ وہ کہے کہ وہ تو چمار ہے اور میں سلطان (چیرز)۔ تو جب ہماری قومیت، ہمارا وجود، ہماری نیشن کل کی کل مذہب ہے تو ہمارا محور، ہمارا مرکز گردش فقط مذہب ہے، فقط دین ہے اور کوئی چیز نہیں (مرحبا)۔ جو شخص اس سے زیادہ کوئی چیز پیدا کرنا چاہتا ہے وہ جاہل ہے۔ اس بات کے تسلیم کرنے کے بعد کہ ہمارا مرکز خیال ہمارا مذہب ہے، اب ہم کو یہ غور کرنا ہے کہ اس وقت ہم مذہب کے لیے ہندوستان میں کیا کر رہے ہیں؟ جس چیز پر ہماری تمام زندگی موقوف ہے اس کے لیے ہم کیا کر رہے ہیں؟

حضرات غور کیجیے، یہ خیال کرنے کی بات ہے - یہ معترضہ جملہ عرض کرتا ہوں - ہمیشہ کام لینے والوں کو دنیا کی اس بات کو ٹالنا چاہیے کہ خود ایسی اشیاء میں کہاں تک مادہ اور گرمی اور قوت فاعلیہ موجود ہے، اس چیز کے متحرکات کو اور اس کے جوش کو دیکھ لینا چاہیے کہ وہ چیز فوراً ابل پڑے گی اور فوراً مشتعل ہو جائے گی - تمام چیزوں میں ایک مخفی جوہر ہوتا ہے، لیکن ابھرا ہوا نہیں ہوتا - اس کو اگر ابھار دو گے تو ابھر جائے گا، لیکن اگر جوہر نہیں ہے تو کتنی ہی تدبیریں کی جائیں، کتنا ہی زور ڈالا جائے، وہ مشتعل نہیں ہو گا اور نہ ابھرے گا - مسلمانوں میں غور کر کے دیکھ لو - ان میں بہت قومیت کے جذبات کو پیدا کیا گیا، تعلیم کے بہت کچھ جذبات پیدا کیے گئے، تمام چیزوں کی طرف ان کو مائل کیا گیا، ان کے جذبات کو منعطف کیا گیا، بلکہ بہت جگہ ہمارے مسلمان خود مصر میں جہاں سے ہمارے صدر صاحب تشریف لائے ہیں وہاں وطنیت کی فیلنگ کو پیدا کرنا چاہتے ہیں، ایک گروہ یعنی نیشن پارٹی پیدا ہوا ہے - آیا یہ جذبات ہم میں آسانی سے مشتعل ہو سکتے ہیں، سخت ناکامی اس میں ہوئی ہے اور ہو گی - ہماری جو نیشن ہے، ہمارا جو وجود ہے، اسی جذبہ کو حرکت میں لانے سے کام نکلے گا - اسی جذبہ سے کام لینا ہے، اسی کو گرمانے سے، ہم کام دے سکیں گے اور ہمارے پرزے متحرک ہو جائیں گے -

اب یہ غور کرنا ہے کہ بقائے مذہب کے متعلق ہم مسلمان اس موجودہ حالت میں کیا کر رہے ہیں -

حضرات اسلام میں ایک مدت مدید گزری ہے - اسلام نے ہر قسم کا زمانہ پایا ہے اور ہر قسم کے دور اس پر گزرے ہیں - ہماری پچھلی تاریخ ہمارے لیے ایک ایسا نمونہ ہے کہ فقر و دولت میں افلاس اور غنا کی حالت میں، حکومت اور محکومیت بھی، ہر قسم کے تجربے ہمارے اسلاف کے موجود ہیں - ہم کسی حالت میں ہوں ہمارے لیے ایک شمع ہدایت موجود ہے - اگر ہم اس کو اختیار کریں تو ہم بے شبہ تمام کاموں میں کامیاب رہیں گے - ہمارے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دور نہیں گزرا ہے جو فقط محکومیت اور مغلوبیت کا دور ہے - جس کا کچھ مقتضیٰ تھا - عیسیٰ علیہ السلام نے اس کی تلقین فرمائی، وہ ایسے گروہ کے لیے مناسب ہے جو انھیں حالات میں ہو، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے وہ زمانہ نہیں پایا جب کہ وہ خود بادشاہ ہوتے اور ان کی کوئی رعایا ہوتی - اس لیے انجیل کے احکام اس قسم کی ضروریات سے خالی ہیں - اب میں اصل مسئلے کو چھیڑتا ہوں، عملاً دیکھتا ہوں کہ گذشتہ زمانے میں دو قسم کا دور اسلام پر گزر چکا ہے -

ایک وہ زمانہ ہے کہ تیرہ برس تک جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ میں تشریف رکھتے ہیں، ایسی مظلومیت کی حالت میں کہ نماز پڑھنا ممکن نہیں، گھر سے نکلنا ممکن نہیں، وعظ کے لیے کھڑے ہوتے تو کافر پتھر مارتے، ان کو زخمی کر دیتے ہیں۔ جس جگہ آپؐ وعظ دیتے ہیں ایک شخص کھڑے ہو کر کہتا ہے کہ جھوٹ کہہ رہا ہے، جو لوگ آپؐ پر ایمان لانا چاہتے ہیں ان کو گرم بالو پر لٹایا جاتا ہے، ان پر گرم پتھر رکھا جاتا ہے اور سنگ سار کیا جاتا ہے اور ان سے فرمائش کی جاتی ہے کہو "لات، عزا"، وہ کہتا ہے "احد ا، احد ا، احدا" (خدا، خدا، خدا)۔

اور ایک وہ زمانہ گزرا ہے کہ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایتیں ہمارے لیے اس دور کے مناسب موجود ہیں اور ہم ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، مگر اس کے ساتھ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ سکھلایا تھا، فقط تھیوری میں (تخیلات میں) نہ تھے، بلکہ عملاً دنیا کو ایک نمونہ دکھلا دینا تھا۔ خود اسلام پر ایک زمانہ ایسا بھی خدا نے گزارا جو دوسرا پہلو ہے زندگی کا، یعنی حاکم ہو کر رہنا، غالب ہو کر، بادشاہ بن کر مدینہ منورہ میں واپس آئے، فتح مکہ نصیب ہوئی، وہ سرکش جنھوں نے کیا کیا ستایا تھا، مغلوب ہوگئے، دب گئے۔ وہ دور پیش آیا کہ یا تو انھوں نے سختی سے مجبور کیا تھا کہ آپ مکہ معظمہ سے تشریف لے جائیں، مدینہ منورہ کو، یا وہ زمانہ آیا کہ دس ہزار صحابہ آپؐ کے ساتھ ہیں، شان و شوکت سے مکہ معظمہ میں داخل ہوتے ہیں۔ اس وقت خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھیں آبدیدہ ہو جاتی ہیں کہ میں کس حالت سے نکلا تھا اور کس حالت میں واپس آیا۔ اس وقت آپؐ حرم محترم کے چوکھٹ پر کھڑے ہیں اور انھیں کافروں کو جنھوں نے جسم نبوی کو آزار پہنچایا تھا اور ستایا تھا، آں حضرت ان مخاطب ہو کر فرماتے ہیں: "اے لوگو، تم جانتے ہو کہ میں آج تم سے کیا برتاؤ کروں گا اور ابھی تم سے کیا کرنے والا ہوں؟ اب ان سے استفسار ہے کہ کچھ خبر ہے کہ آج میں تم سے کس طرح پیش آؤں گا۔ وہ لوگ بھی فیاض تھے، سمجھتے تھے، رسول اللہ کے اخلاق و عادات سب پر ظاہر ہو چکے تھے۔ کسی نے کہا اے محمد! تو شریف اور ہمارا بھائی، اور شریف بھتیجا ہے۔ جن کو رسول اللہ کے بھتیجے ہونے کا رشتہ تھا انھوں نے کہا کہ اے محمد! تو شریف بھتیجا ہے، کسی نے کہا کہ تو شریف بھائی ہے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ تم سب جاؤ۔ سب کو چھوڑا، کسی قسم کا مواخذہ نہیں"۔

ایک یہ دور پیش آیا۔ ہم کو اسلام نے ہر دور کے موافق نمونے اور مثالیں بتا دی ہیں اور ہم عمل کر سکتے ہیں۔ ہم ایسی تقلید جامد میں نہیں پڑ سکتے۔ ہم کو اگر آپ ایسی تقلید جامد میں رکھنا

چاہتے ہیں تو اب وہ زمانہ گزر گیا کہ خواہ آپ مذہبی لیڈر ہوں یا دنیاوی لیڈر ہوں، اب ہم ایسی تقلید جامد میں گرفتار نہیں ہو سکتے ہیں۔ ۷۰۰ برس کا جو دراز زمانہ پہلے تھا، اس کی جو ضروریات اور حالات تھے اس پر بھی ہم قائم رہے ہیں اور اسی طرح سے ہم تمام باتوں کو ایسی سختی کے ساتھ پکڑے رہیں اور ذرا بھی اپنے لیے تغیر اختیار نہ کریں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم فنا ہو جائیں گے۔ اس کشمکش کے زمانے میں ناممکن ہے کہ ہم کسی کا مقابلہ کر سکیں۔ اس وقت ہم کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ زمانہ کہاں نکل آیا ہے، ضروریات مذہب اب کیا پیدا ہو گئی ہیں، ان ضروریات مذہبی کے لیے ہمیں اب کیا سامان پیدا کرنے ہیں۔

حضرات! ناراض ہونے کی بات نہیں ہے۔ یہاں تو آپ کو یہ حق ہے کہ مجھے گردن پکڑوا کر نکلوا دیجیے، لیکن سچ کہنے پر مجھے سزا نہ دیجیے۔ میں کہتا ہوں کہ جب سو برس کے اندر کے زمانے کی ضرورتیں خود ہمارے مذہبی امور کے متعلق اس قدر بدل گئی ہیں کہ ایک قرن کثیر کا فرق پیدا ہو گیا ہے اور اگر ہم لوگوں کو، ہمارے تمام پیشوا ایسی حالت میں جکڑ کر رکھنا چاہتے ہیں کہ جس حالت میں ہم دو سو برس پہلے تھے۔ ہماری تعلیم، ہمار انصاب، ہماری تمام ترقیاں، ہماری تمام واقفیت السنہ اگر بالکل ابھی تک وہیں قائم رکھی جاتی ہیں جو آج سے دو سو برس قبل تھیں تو کیوں کر ہم مقابلہ کر سکتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ کیا ضروریات مذہب میں پیدا ہو گئی ہیں۔ امریکہ میں ایک ریلجس کانفرنس ہوتی ہے، وہ اعلان کرتی ہے کہ دنیا بھر میں جو مذہب حق ہو وہ آئے ایک میدان مقابلہ ہے، اگر وہ اپنے سچے مذہب کو پیش کرے، جس کے مذہب میں سچائی ہو گی، ہم اس کو تسلیم کریں گے۔

چند سال ہوئے ایک مذہبی کانفرنس امریکہ میں قائم ہوئی اس نے بہت بڑی فیاضانہ مہمانی گوارا کر کے تمام لوگوں کو جمع کیا۔ حضرات عبرت کی بات ہے کہ اس امتحان کے موقع پر اس گھوڑ دوڑ میں، اس میدان مناظرے میں پارسی گئے، حالاں کہ ان کا مذہب، مذہب دعوت نہیں ہے۔ انھوں نے اپنے مذہب کی حقانیت ثابت کی۔ ہندو گئے جو کہ دوسرے مذہب والوں کو اپنے مذہب میں نہیں بلا سکتے سوائے آریہ لوگوں کے، ان میں ایک شخص تھا اس نے تقریر کی۔ اس کا لیکچر میں نے اردو میں ترجمہ کرا کر چھپوا دیا ہے، وہ گئے، یہودی گئے، غرض دنیا کا کوئی مذہب اور دنیا کی کوئی قوم باقی نہیں رہی جو اس میدان مناظرہ میں نہیں گئی اور جس نے اعلان کے ساتھ اپنے مذہب کی آزادی اور اپنے مذہب کی خوبی نہیں بیان کی۔ لیکن اس کلیہ عام سے جو میں نے ابھی

بیان کیا ہے، اگر مستثنیٰ رہے تو صرف ہمارے مسلمان بھائی ۔ ایک داعی اور ایک واعظ اسلام کا امریکہ نہیں گیا، نہ صرف ہندوستان سے بلکہ ایران سے، مصر سے، افریقہ سے، قسطنطنیہ سے، کسی جگہ سے کوئی شخص ایک بھی مسلمان نہیں گیا۔

کیا فائدہ ہے اس تمام تعلیم سے جو تمام دنیا میں دی جارہی ہیں؟ کیا فخر کرسکتے ہیں ترکوں پر اس بات کا کہ وہ یورپ کے علوم و فنون جدیدہ سیکھ رہے ہیں؟ بھاڑ میں جائیں یہ علوم فنون جدیدہ، جب انھوں نے یہ قابلیت پیدا نہیں کی کہ وہ ایک ترک کو امریکہ بھیج سکتے جو امریکہ جاکر ان کی زبان میں مذہب اسلام کی تعلیم و تلقین کرسکتا۔ کیا ہمارے علماء سبکدوش ہوسکتے ہیں، اپنے اس فرض سے، اپنی منطق سے، اپنے حیلے سے، اپنی حجتوں سے، کیا ہم کو مجبور و زیر کرسکتے ہیں؟ گزر گیا وہ زمانہ اندھیر کھانے کا، اب ممکن نہیں کہ دنیا ان ضرورتوں کو محسوس نہ کرسکے۔ اگر ہمارے پیشوایان دین ان ضرورتوں کو رفع نہ کریں گے اور اب بھی یہ فتویٰ جدیدہ کو نہ سیکھیں گے اور اگر ان زبانوں کو نہ حاصل کریں گے اور اب بھی یہ فتویٰ جاری رکھیں گے کہ ان زبانوں کا سیکھنا ناجائز ہے، تو ان کو منصبِ مقتدائی چھوڑ دینا چاہیے اور علاحدہ ہوجانا چاہیے۔ میں نے ایک جزوی مثال اس بات کی پیش کی ہے کہ ہماری دنیوی ضرورتیں بدل گئی ہیں اور ہم کو کہاں تک زمانے کے ساتھ منقلب ہوجانا چاہیے؟ کیا پہلو بدلنا ہے، ہم کو دفعتاً زمانے کے ساتھ اور ان ضروریات کے ساتھ؟ اس لیے مختصراً مجھے بتانا ہے اور دکھانا ہے کہ کیوں کردو یا تین مذہبی ضرورتیں نئی پیدا ہوگئی ہیں۔ ایک یہ کہ اس بات پر تو ہم مجبور ہیں، گورنمنٹ موجودہ کے طریقہ نظام سے کہ عام تعلیم جو گورنمنٹ نے ملک میں پھیلائی ہے ہم اس کو حاصل کریں، اس سے گریز کرنا اپنے آپ کو برباد کرنا ہے۔ جن لوگوں نے ابھی تک اس سے گریز کیا وہ تمام میدانی مقابلے میں دوسرے لوگوں سے پیچھے رہ گئے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ وہ بنگال جہاں سرندرناتھ پیدا ہوتا ہے، جو ہندوستان کا سب سے بڑا اسپیکر ہے، وہیں کے کسی مسلمان صاحب کو دیکھیے کہ اس کے سامنے بات تک نہیں کرسکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ الگ رہے، تعلیم عامہ۔ ہمارا یہ ہے۔ جب ہم کو اس سے مفر اور گریز نہیں تو ہم کو اس کے مقابلے میں کیا کرنا چاہیے۔

اب ایک گروہ، ہم کو ایسا قائم اور زندہ رکھنا ملک میں ضروری ہے یا نہیں جو مجبور نہ ہو گورنمنٹ کی ملازمت پر، گورنمنٹ کی نوکریوں پر۔ گورنمنٹ کی ملازمت اور نوکری کی وجہ سے جس تعلیم پر وہ مجبور ہے وہ مجبور نہ ہو، بلکہ آزاد اور حر ہو اور وہ ایسی تعلیم حاصل کرے کہ جو

ایک طرف تو مذہب اور اس کے تمام معلومات سے پر ہو اور کامل ہو، دوسری طرف وہ انگریزی زبان اور یورپ کے علوم و فنون کو حاصل کر سکے۔ آپ جانتے ہیں کہ تقسیم عمل کی بنا پر تمام دنیا کام کرتی ہے۔ اللہ پاک نے تقسیم عمل کا اصول ہر شے میں جاری رکھا ہے۔ تمام انتظام عالم اس پر مبنی ہے۔ ہم خود ایک جسم واحد ہیں، لیکن سننے کا کام کان کے سپرد ہے، بولنے کا کام زبان سے متعلق ہے، سب کے کام بٹے ہوئے ہیں۔ اصول تقسیم عمل پر یہ کہنا حماقت ہے کہ مختلف لوگوں کو مختلف کام حوالے کر دینا قوتوں کو پراگندہ کرنا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ تمام چیز ایک میں جمع کرنا یہ سخت حماقت ہے۔ ہمارے جسم میں بھی یہ تقسیم عمل جاری ہے، ہاتھ اور کام کرتا ہے، دماغ اور کام کرتا ہے، زبان اور کام کرتی ہے، پاؤں اور کام کرتے ہیں، بلکہ سب علاحدہ علاحدہ کام کرتے ہیں۔ یہی تقسیم عمل اللہ پاک نے خود ہم لوگوں کو قرآن مجید میں سکھائی تھی۔ اللہ تعالیٰ عالم الست ہے، ہمیشہ کے حالات سے، جو کچھ ہیں اور جو آئندہ ہونے والے ہیں ان سب سے واقف ہے۔

آپ خیال فرمائیے کہ جب مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں ہمہ تن اسلام تھا، کوئی ضرورت صحابہ کو اور مسلمانوں کو نہ تھی۔ فقط دین و مذہب ہی ان کی دنیاوی ضرورتوں کے لیے کافی تھا، ان کو نہ نوکری کی حاجت تھی اور نہ ملازمت کی۔ اس سے فتوحات ہوتی تھیں۔ ایک طرف تو ثواب جہاد اور دوسری طرف مال غنیمت، ہم خرما و ہم ثواب، مگر اس وقت بھی ہماری شریعت نے، ہماری غیرت نے، ہمارے اللہ پاک نے یہ حکم نہیں دیا کہ تمام جہاں صحابہ ہو، سب فقیہ بن جائیں، سب مفسر بن جائیں، سب واعظ بن جائیں، سب مولوی ہو جائیں، یہ نہیں تھا۔ اللہ پاک نے فرمایا تھا گروہ میں سے ایک گروہ تجویز ہونا چاہیے کہ جس کا کام ہے تفقہ حاصل کرنا مذہب میں جس کی ضرورت، امر بالمعروف کرنا و نہی عن المنکر، جو تمام قوم کے لیے بمنزلہ دل و بمنزلہ دماغ ہے۔ یہ فرق کہیں ہے آج؟ کیا آپ اس دعوے کے پیش کرنے سے کہ آپ بہ وجہ دنیوی ضرورتوں کے اور بہ وجہ فکر معاش کے انگریزی تعلیم اور گورنمنٹ کی تعلیم پر مجبور ہیں، اس لحاظ سے آپ اس فرض سے بھی سبکدوش ہونا چاہتے ہیں کہ پانچ یا سات کروڑ سے زائد مسلمانوں کی آبادی ہو، اس میں وہ فرقہ جس کا اللہ پاک نے ذکر کیا، نہ موجود رہے اور اگر وہ باقی نہ رہا تو کیا ہمارا محور آئندہ باقی رہ سکتا ہے؟

حضرات جو لوگ جانتے ہیں وہ جانتے ہیں ان کو جاننا چاہیے کہ ہمارے یہاں فرض کی اللہ پاک نے دو قسمیں بیان کی ہیں۔ ہماری شریعت میں فرض کی دو قسمیں ہیں: فرض عین و فرض

کفایہ۔ فرض عین تو وہ ہے جو ہر شخص پر فرض ہے اور آپ کے ادا کرنے سے میرا فرض ادا نہیں ہوتا اور میرے ادا کرنے سے آپ کا فرض ادا نہیں ہو سکتا۔ ظہر کی نماز کے لیے یہ بات نہیں ہو سکتی کہ آپ میری طرف سے پڑھ لیں۔ لیکن ایک فرض کفایہ ہوتا ہے۔ کفایہ وہ ہے کہ اگر محلہ بھر میں ایک شخص نے اس فرض کو ادا کر دیا تو سب سبکدوش ہو سکتے ہیں۔ سبکدوشی میں تو یہ آسانی ہے لیکن مواخذے میں سب کے سب دھرے جاتے ہیں، وہ تنہا ہی گنہگار نہیں ہے، بلکہ شہر کا ایک ایک فرد گنہگار، بلکہ شہر کے دس ہزار کے دس ہزار گنہگار ہیں۔ ثواب پانے میں وہ ایک شخص اور عذاب کے پانے میں وہ سب کے سب گرفتار ہیں۔ اب ایک فرقہ ایسا پیدا ہونا چاہیے جس کا ذکر قرآن شریف میں ہے، جو ہادی، دین ہوتا۔ یہ ایک فرض عین نہیں ہے کہ ہر ایک پر فرض ہو، ہر مسلمان پر واجب آئے، چاہے عالم ہو یا محدث، بلکہ فرض کفایہ ہے، یعنی سات کروڑ مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ اپنی ہی قوت سے، اپنی ہی ہر قسم کی اعانت سے، اپنی ہی ہر قسم کی جدوجہد سے اس ایک فرقے کو ہندوستان میں اور جہاں جہاں مسلمان ہوں باقی رکھیں، جو اس خدمت کو انجام دیں۔ مجھے ہمیشہ یہ سوال کیا جاتا ہے کہ اور سب سے زیادہ مسئلہ لاینحل۔ طلبائے ندوہ کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ جو ندوہ سے پڑھ کر نکلتے ہیں کہاں جائیں گے اور کیا کریں گے اور کہاں سے کھائیں گے؟ معاف کیجیے یہ ان سے پوچھنے کی بات ہے یا تم کمبختوں کے پوچھنے کی بات ہے اب تم سے یہ سوال ہے کہ ایسے گروہ کا پیدا کرنا اس کی اعانت اور اس کا زندہ رکھنا تمہارا فرض ہے یا نہیں؟ کیا یہی اصول تمام یورپ میں جاری نہیں ہے اور فیلوشپ کے تمام اصول خود ان قوموں میں جاری نہیں ہیں جو بیدار ہیں، جو وعظ کہتے ہیں اور تمام دنیا میں تعلیم پھیلاتے ہیں، قوم خود ان کی مدد کرتی ہے۔ کیا وہ گورنمنٹ سے روپیہ یا تنخواہ مانگتے ہیں؟ نہیں ہرگز نہیں۔ کوئی شخص نہیں بتا سکتا کہ گورنمنٹ ان باتوں میں مدد دیتی ہو۔ آپ کو معلوم ہے کہ مذہب کا جو فنڈ انگلستان میں ہے اور جو مذہبی ضروریات میں خرچ کیا جاتا ہے، اس کی اقل سے اقل تعداد سالانہ دو کروڑ ہے، جس میں ایک پیسہ بھی گورنمنٹ کا نہیں ہے، بلکہ قوم کا ہے۔ کیا تم کو یہ دعویٰ ہے کہ تم دنیوی ترقی میں، آزادی، خیال میں اور وسعتِ مشرب میں جرمن اور انگلستان سے بڑھ گئے یا بڑھ جانا چاہتے ہو؟ اگر یہ نہیں ہے تو یہ سوال معناً خود آپ کی طرف الٹتا ہے کہ تم خود کتنے بخیل، کتنے، شقی اور کتنے کودن ہو۔ یہ ہم سے سوال کرنے کی بات ہے یا تم سے، اس لحاظ سے اس مسئلے کو بالکل پس انداز کرنا چاہیے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ ہر شخص جو عضو معطل ہو وہ اسی طرح فکر معاش کرے جیسا کہ

وہ گروہ جو کام کرنا چاہتا ہو۔ اس کو مطمئن کرنا اور اس کو اپنی ضروریات سے آزاد کرنا یہ تمھارا فرض ہے۔ ہندوؤں نے برہمنوں کے ساتھ کیا کیا۔ انھوں نے برہمنوں کا ایک فرقہ بنایا۔ برہمن کوئی ذات نہیں تھی۔ ہندوؤں نے اس قدر عمدہ تقسیم کی تھی کہ میں نثار ہو جاتا ہوں، ان کے اس مسلک پر۔ انھوں نے اپنے لیے ایک گروہ برہمنوں کا پیدا کیا، اسی اصول تقسیم عمل کی بنا پر۔ ایک گروہ قوم میں وہ ہے جو نہ زمینداری کرے، نہ جائیداد پیدا کرے، نہ تجارت کرے، نہ صنعت و حرفت پیدا کرے، بلکہ ایک عضو معطل جو تمام کاموں سے رہا ہو آزاد رہے۔ مگر وہ تمام علوم کی حفاظت کرے، تمام مراسم مذہبی کی حفاظت کرے، تمام اخلاق قوم کی حفاظت کرے، اس کا نام انھوں نے برہمن رکھا۔ مگر وہ اس بات کو جانتے تھے کہ ایسا گروہ یقیناً باقی نہیں رہ سکتا، جب تک کہ قوم کی طرف سے کوئی احترام نہ کیا جائے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ انھوں نے برہمنوں کا کہاں تک احترام کیا۔ ان کے یہاں حکم ہے کہ اگر برہمن کسی شخص سے کہہ دے کہ مجھے کھانا دو اور وہ نہ دے تو پھر اس کی نجات کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔ وہ پاپی ہے، وہ بخشا نہیں جا سکتا۔ ایک بڑے سے بڑا بادشاہ اور بڑے سے بڑا راجہ برہمن کے پاس آ کر اس کے پاؤں پر سر رکھتا ہے اور فخر کرتا ہے، اس بات پر کہ اس نے ایک برہمن کے پاؤں پر سر رکھا، کیوں کہ اس وقت وہ ایک ایسی خدمت انجام دے رہا ہے، جو محتاج ہے اس بات کی کہ وہ تمام افکار و مشاغل سے آزاد رہے۔ اسی بنا پر یہ کچھ بڑی بات نہیں ہے کہ ایک چھوٹا سا گروہ قوم میں ہو، یہ نہیں کہا جاتا کہ ہزار، دو ہزار، چار ہزار یا پچاس ہزار، ایک کنول کا پھول پوری گڑھیا روشن کر سکتا ہے، ایک شخص واحد تمام دنیا کو زندہ کر سکتا ہے۔ اگر قوم میں دو چار دس شخص ایسے عالم موجود ہوں یا بادیان دین، زمانے کی ٹھیک ضرورتوں کے موافق، جیسا کہ زمانے نے ہر زمانے میں پیدا کیے ہیں، جیسی ضرورت ہوئی۔ ایک زمانے میں حضرت عبداللہ ابن عباس اور عبداللہ ابن عمر پیدا ہوئے جب ضرورت ہوئی۔ ان کے قائم مقام امام غزالی اور شاہ ولی اللہ پیدا ہوئے۔ ان لوگوں کے معلومات بھی، ان کے علوم بھی، ان کے خیالات بھی اگر آپ دیکھیں گے تو بڑا فرق پائیں گے۔ امام رازی تمام فلسفہ چھانے بیٹھے ہیں، تمام فلاسفی کے نکات سے واقف ہیں۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ تابعین ہمارے حضرت امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ جو پیشوایان دین ہوئے ہیں وہ فلسفہ اور منطق ان سے بہتر جانتے تھے۔ نہیں، اس زمانے میں اس کی ضرورت نہ تھی، لیکن جب ضرورت پیش آئی تو انھیں پیشوایان دین کو فلاسفی پڑھنی پڑی اور محقق بننا پڑا۔ غرض اس سوال کو ہمیشہ کے لیے قلب سے مٹا دینا چاہیے۔

لیکن اب دوسری ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اس دوسرے گروہ پر۔ میں نے جی کھول کر آپ لوگوں کو گالیاں دی ہیں، لیکن مجھ کو اسی ٹالریشن اور فیاضی کے ساتھ اب خود بھی گالیاں کھانے کے لیے تیار ہونا چاہیے۔ سوال یہ ہے کہ ہمارا جو گروہ اس وقت ہادی دین ہے، جو پیشوا ہے تمام قوم کا اور لیڈر ہے ہمارے مذہب کا وہ اس وقت کی موجودہ دینی ضرورتوں کو کس قدر انجام دے رہا ہے؟

پہلا یہ سوال ہے کہ آیا یہ ضرورت ہے یا نہیں کہ اگر امریکہ ہم کو بلائے کہ آؤ ہماری زبان میں ہم کو ہدایت کرو تو آیا ہم کو ان کی زبان سیکھنا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے تو کیا وجہ ہے؟ اللہ پاک نے انبیاء کو بھیجا ہے تو کہتا ہے کہ میں نبیوں کو بھیجا کرتا ہوں اسی قوم کی زبان پر؟ کیا ضرورت ہے اس قوم کی زبان دانی کی پیغمبروں کو وہ کوئی اور زبان بولے اور وہ کوئی اور؟ بلسانہ وقومہ کی کیا ضرورت ہے؟ آیا اس بات کی ضرورت ہے یا نہیں کہ جاپان یہ کہے کہ میں تشنہ لب ہوں مذہب میں، میں سنتا ہوں کہ مذہب اسلام نہایت اچھی چیز ہے، مگر یہ بتلائیے کہ مذہب اسلام ہے کیا؟ تو کیا ہم ان سے فرمائش کریں گے کہ آپ پہلے اردو سیکھیں تب ہم بتائیں گے؟ حضرات! میرا ذاتی علم ہے۔ میں بمبئی میں ایک پارسی کو جانتا ہوں کہ جس سے سنی سنائی چند باتیں اسلام کی سنی تھیں، کچھ انگریزی ترجمہ قرآن مجید کا اس نے دیکھا تھا، اس نے مسلمانوں سے کہا کہ مجھے اچھی طرح سے سمجھاؤ اسلام کیا ہے؟ میں اردو نہیں جانتا، انگریزی زبان میں مجھ سے بولو تو میں سمجھ جاؤں گا۔ جب لوگ اس کو نہ سمجھا سکے تو اس نے قرآن مجید اپنے ہاتھ میں لیا اور کہا کہ اے خدا میں نہیں جانتا کہ اس میں تو نے کیا کہا ہے، مگر جو کچھ تو نے کہا ہے میں گول گول اس پر ایمان لاتا ہوں۔ اب کیا اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ ایسے عالم پیدا ہوں جو غیر زبانوں سے واقف ہوں؟ کیا ابھی تک یہ موقع باقی ہے کہ ہم نفرت کریں اور اپنے یہاں انگریزی نہ آنے دیں؟

دوسری ضرورت یہ ہے کہ ہمارے مذہب پر سیکڑوں، کروڑوں حملے ہو رہے ہیں، ہمارا مذہب برباد کیا جارہا ہے، کن کن طریقوں سے۔ براہِ راست نہیں (سامنے کا گھاؤ چنداں کاری نہیں ہوتا) پہلوؤں سے، کروٹوں سے۔ اگر کوئی عیسائی ایک کتاب مذہب کے رد میں لکھے تو مسلمان آسانی سے کہے گا کہ یہ مذہب کا رد ہے، اس کو عیسائی نے لکھا ہے میں اس کو نہیں پڑھوں گا، لیکن اگر وہ تاریخ لکھتا ہے تو کیا کوئی شخص اس بات پر بدگمانی کر سکتا ہے کہ وہ تاریخ ہے؟ تاریخ میں کوئی بات نہیں ہے، ہر زبان ہر قوم کی تاریخ پڑھنی چاہیے۔ اب وہ تاریخ اسلام کو پڑھتا ہے، وہ سر ولیم میور صاحب کی لائف آف محمدؐ پڑھتا ہے، اب اس کتاب میں اندر اندر جو زہر مخفی

ہے، جو سم قاتل سرایت کر رہا ہے، اس کے پڑھنے والے کو خبر نہیں ہوتی اور زہر اندر اندر دوڑ جاتا ہے۔ اس کا کیا علاج ہے؟ آیا ہمارے علما اس کو پڑھتے ہیں، اور اس سے واقف ہیں یا نہیں؟ اگر واقف ہیں تو کسی سے انھوں نے فرمائش کی ہے کہ خیر تم ترجمہ ہی کر کے دو، ہم اس کا جواب لکھیں گے۔ ایک عظیم الشان لٹریچر دوسری زبانوں میں پیدا ہو گیا ہے، اسلام کو تباہ کرنے والا برباد کرنے والا، کیا آپ اس کو اس طرح پر مٹا سکتے ہیں، یعنی تاریخ اسلام کا ہم نے کیا مقابلہ کیا ہے؟ حضرات مجھے حیرت ہوتی ہے اور عجیب طرح کا میرے دل میں فرحہ پیدا ہوتا ہے۔ آزردہ دہلوی کا شعر ہے، وہ کہتے ہیں:

کامل اس فرقۂ زہاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے گر تو یہی رند قدح باز ہوے

حضرات! اس وقت تک جو کچھ اسلام کی خدمت کی ہے غیر قوموں کے سامنے وہ ہمارے علمانے نہیں کی ہے، ہم نے نہیں کی ہے، مولویوں نے نہیں کی ہے، ہم دستار بندوں نے نہیں کی ہے، بلکہ ان لوگوں نے کی ہے جو داڑھی منڈواتے ہیں۔ امیر علی نے کی ہے جو بالکل داڑھی منڈاتا ہے، جس کو میں صورتاً عیسائی سمجھتا ہوں۔ اس نے ایک کتاب اسپرٹ آف اسلام لکھی ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر عیسائیوں اور ایرانیوں نے بھی اسلام کی وقعت اور تعریف کی ہے۔ سرسید احمد خاں نے خطباتِ احمدیہ، جو انھوں نے انگلستان میں رہ کر لکھی ہے، اس میں انھوں نے خاص خدمت انجام دی ہے۔ اس کا اثر جو کچھ انگریزوں میں پھیلا وہ کیا اثر ہے، اپ خود اس کو سمجھ سکتے ہیں۔ یہ کس قدر افسوس ناک بات ہے کہ وہ فرائض اور خدمات جو ہمارے ہیں ان کا ساغر، ہم سے چھین کر یہ رندان قدحہ خوار پی لیں۔ اس کے مقابلے میں میں آپ کو عملی باتیں دکھاؤں گا کہ یہ وہ ندوہ ہے کہ جس پر ہم فخر کرتے ہیں اور جس کی ہم عزت کرتے ہیں۔ ہر جگہ اس کے پھیلانے والے اس کے داعی اس کے مدد دینے والے چندہ کر کے درپے ترقی، تمام تحریکوں کو پیدا کرنے والے کون ہیں؟ یہی انگریزی خواں ہیں۔ ہم علما کیا کرتے ہیں؟ ہم کفر کا فتویٰ دے دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جو شخص ندوہ میں شریک ہوتا ہے وہ کافر ہے، ندوہ ایک لغو چیز ہے اس میں شامل ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کیا کوئی علما میں ایسا باہمت ہے جو ندوہ میں کام کرنے کے لیے معروف ہو؟ خدا سلامت رکھے ہمارے چند نفوس کو مثلاً مولانا عبدالحی صاحب، جو ندوہ میں خدمت مذہبی انجام دے رہے ہیں، مجھے بتاؤ کہ ہندوستان میں اور کون ایسے حضرات ہیں جو اس قسم کا کام کر رہے ہیں؟

عربی کے جو بیسیوں مدرسے کان پور میں قائم ہیں وہ کس نے قائم کیے ہیں؟ سوداگروں نے، دنیاداروں نے، سود خواروں نے، خیر سود کھاتے ہیں یا نہیں، انھوں نے قائم کیے ہیں۔ کسی عالم نے نہیں قائم کیے ہیں۔ سوائے مدرسہ دیوبند کے جس پر ہم فخر کرتے ہیں اور اس کو مولانا قاسم مرحوم نے قائم کیا تھا۔ علاوہ اس کے کوئی مدرسہ کسی عالم نے قائم نہیں کیا۔ انھیں دنیاداروں نے قائم کیا ہے۔ وہی کام کرتے ہیں اور کسی عالم کو بلا کر نوکر رکھ لیتے ہیں۔ خیر اب سوال یہ ہے کہ یہ خدمتیں اگر ضروری ہیں تو ہم ان کو کہاں تک انجام دے سکتے ہیں۔

اب اس پہلو کو چھوڑو۔ ایک دوسرا پہلو زبردست آپ کے لیے دیکھنے کا یہ ہے کہ ہماری گورنمنٹ انگریزی سے جو تعلقات مذہبی ہیں، جن مسائل کا گورنمنٹ سے تعلق ہے، ان کے متعلق نہایت اشد ضرورت ہے کہ قوم کو یہ تمنا ہونی چاہیے کہ ہمارے پیشوایان دین اس کام میں ہاتھ ڈالیں۔ سوال یہ ہے کہ فرض کیجیے ایک اجتماعی مسئلہ وقف علی الاولاد کا ہے۔ بہت سے مقدمات عدالت میں غلط فیصلہ ہو جاتے ہیں۔ ان کے متعلق نوٹس لینا ہمارے علما کا کام ہے۔ کیا کوئی عالم جانتا ہے کہ کیا کیا نظائر ہائی کورٹ میں ہوتے ہیں؟ ان کو کچھ علم ہے کہ دنیا میں کیا ہوتا ہے؟ جس زمانے میں کہ تعطیلیں مقرر ہوئی تھیں، وہ گورنمنٹ کے تمام احکامات سے ایسے بے خبر تھے، ایسی عدم واقفیت، ایسی عدم اطلاع، ایسی گوشہ نشینی۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم مذہبی خدمات انجام دے رہے ہیں جو اس فرقہ خاص کا کام ہے۔ اب ان حالات کے لحاظ سے فقط یہ سوال ہے کہ آیا مذہبی پہلو کے اعتبار سے قوم کو ایک مذہبی مرکز کی، ایک مذہبی سینٹر کی، ایک مذہبی مرجع عام کی ضرورت ہے یا نہیں؟ کوئی شخص اس سے انکار کر سکتا ہے؟ حضرات میں خود ہی اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ ندوے نے بھی ان فرائض کو انجام نہیں دیا ہے، اگر دیا ہے تو نہایت کم۔ لیکن میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر اس وقت کوئی چیز مرجع ہو سکتی ہے، جو سینٹر قرار دیا جا سکتا ہے تو وہ ندوہ ہے اس میں آپ جلدی نہ کیجیے، غور سے سن لیجیے۔ ہر کام میں دو عمل ہیں، دو ڈگریاں ہیں، دو درجے ہیں، تھیوری اور پریکٹس، خیال یا ارادہ اور عمل۔ اول ارادہ اس کے بعد عمل، یہ ایک مانی ہوئی اور بدیہی بات ہے کہ بجز جماعت علمائے ندوہ کے کسی جماعت نے یہ آواز دس یا سولہ برس پہلے نہیں بلند کی کہ ہم کو ایک جدید نصاب کی ضرورت ہے، ہم کو ایک نئے کورس کی ضرورت ہے، ہم کو اصلاح کی ضرورت ہے۔ ان تمام طرائق تعلیم میں ندوے کا جتنا لٹریچر ہے، ندوے کی جتنی روداد یں ہیں، آپ ان کو اٹھا کر پڑھ لیجیے۔ مولوی شاہ سلیمان صاحب پھلواروی اور مولوی

عبدالقادر صاحب دہلوی نے، کہ جو ہمارے علمائے ندوہ میں شریک ہیں، انھوں نے شروع سے برابر انھیں ضرورتوں کو تسلیم کیا ہے۔

حضرات آپ کو معلوم ہے کہ انھیں ضرورتوں کے احساس کی بنا پر انھوں نے انگریزی زبان کو نصاب تعلیم ندوہ میں داخل کیا، اگرچہ اس کی سخت ممانعت ہوئی۔ اتنی شدید مخالفت ہوئی کہ ایک بزرگ، جنھوں نے اپنی جائیداد ۵۰ ماہواری کی ندوہ پر وقف کی تھی، انھوں نے اسے دینے سے انکار کر دیا۔ جب میں نے خط لکھا تو انھوں نے جواب دیا کہ اس میں انگریزی داخل کی گئی ہے، اس واسطے میں اس میں مدد نہیں دے سکتا۔ چناں چہ انھوں نے اپنے زمانہ آخر تک نہیں دیا، لیکن اب مل رہا ہے۔ اس قدر مخالفتیں پیش آئیں، دنیادار لوگوں کی طرف سے نہیں بلکہ خود دین داروں ہی کی طرف سے، مگر باوجود اس کے ہمارے علمائے ندوہ نے برداشت کیا اور اس معاملے کو قبول کیا۔ ان کو تعجب ہوگا کہ ہمارے مولانا خلیل الرحمن صاحب جو یہاں بیٹھے ہوئے ہیں ایک متقشف زاہد ہیں، مگر جس وقت انگریزی داخل کرنے کا مسئلہ در پیش ہوا تو آپ بھی تشریف رکھتے تھے۔ اگر میرا حافظہ غلط نہیں ہوا ہے (۵۵ برس کی عمر کی وجہ سے) تو مجھے یاد ہے کہ آپ نے کاملاً اس سے اتفاق کیا تھا اور کہا تھا کہ بیشک انگریزی زبان داخل ہونی چاہیے، صرف یہی نہیں بلکہ جب دوبارہ دوسرے جلسے میں لکھنؤ میں یہ بات پیش ہوئی کہ بجائے غیر ضروری اور غیر لازمی ہونے کے انگریزی لازمی اور کمپلسری کر دینی چاہیے تو اس وقت بھی آپ نے شرکت کی اور تائید کی۔

اب آپ دیکھ سکتے ہیں کہ جو ارادہ اور خیال ہے وہ تو قطعاً ندوے میں پیدا ہو گیا۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ہمارے علما جو انگریزی زبانیں اور انگریزی علوم و فنون پر آمادہ ہیں، وہ بے تعصب ہیں، یعنی آپ کو معلوم ہے کہ دو سال قبل ہمارے ندوے میں یہ تجویز پیش ہوئی تھی کہ اس بات کا انتظام کیا جائے کہ علوم و فنون جدیدہ بھی داخل کیے جائیں اور ہمارے طلبہ خاص علوم و فنون کو سیکھیں۔

حضرات! آپ کو معلوم ہو کہ فزیکل سائنس جو ہے اس کی کئی ایک کتابیں مصر میں عربی میں ترجمہ ہوئی ہیں۔ اس میں ایک کتاب ہے "دروس الاولیہ"، وہ تصنیف ہے ایک عورت کی۔ وہ ہمارے ندوے کے نصاب میں داخل درس کر دی گئی ہے، مگر رونا یہ ہے کہ آج پانچ برس سے داخل نصاب ہے لیکن صاحبو ہم میں کوئی اس کا پڑھانے والا نہیں ہے۔ وہ عربی زبان میں ہے اور

عورت کی تصنیف ہے۔ مگر ہمارے رجال کبار اس کو پڑھا نہیں سکتے۔ اس بنا پر یہ رائے ہوئی کہ اب اس کو چھوڑ کر کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ دو سال ہوئے کہ ایک جلسہ قائم کیا گیا، اس میں بھی ہمارے بیشتر منتظمین شریک تھے اور موجود، انھوں نے یہ تجویز منظور کی کہ پندرہ پندرہ بیس بیس روپے ماہوار کے وظیفے دیے جائیں اور ہمارے یہاں کے طلبہ (یعنی ندوہ کے) علی گڑھ کالج میں جائیں اور وہاں قیام کر کے پروفیسر ضیاء الدین سے یا کسی اور شخص سے جو پڑھانے پر آمادہ ہو اس علم کو حاصل کریں۔ دیکھیے ہماری اس بے تعصبی کو اور داد دیجیے کہ کوئی گروہ، کوئی مدرسہ عربی کا اس بات پر راضی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے لڑکوں کو علی گڑھ بھیجتا اور اپنے پاس سے وظیفہ دے کر علوم پڑھاتا۔ تو، بہرحال، ہم نے یہ دورہ طے کر لیا۔ ہمارے علما خود مستعد اور آمادہ نہیں اس تجویز کے قبول کرنے پر، مگر بات یہ ہے کہ ہم نے یہ کام نہیں کیا، ہم لوگ طریقہ عمل سے واقف نہیں تھے اس لیے، ہم کامیابی کے ساتھ نہ کر سکے، مگر ہم ڈھونڈھ رہے ہیں اور زمانہ ہم کو لے جا رہا ہے۔

دوسری خدمت آپ دیکھتے ہیں ان باتوں سے جو گورنمنٹ سے متعلق ہیں۔ ان کے متعلق نوٹس لینا اور ان کی خبر رکھنا اور ان سے واقفیت پیدا کرنا، اس کو ندوہ کس حد تک کر رہا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ وقف علی الاولاد کا مسئلہ، اس کو آپ ایک معمولی چیز سمجھتے ہیں۔ آپ نے ایک اڑتی سی بات سن لی ہوگی کہ ایک فقہ کا مسئلہ پریوی کونسل نے خراب کر دیا تھا، اس کی اب اصلاح ہو جائے گی۔ میں کہتا ہوں کہ وقف علی الاولاد کا مسئلہ وہ ہے کہ مسلمانوں کے ہزاروں لاکھوں خاندانوں کی بربادی اس سے ٹل سکتی ہے اگر وہ کامیاب ہو جائے۔ ایک طرف سو کالجوں کا بنانا اور دوسری طرف وقف علی الاولاد کا مسئلہ۔ مسئلہ وقف علی الاولاد کے یہ معنی نہیں کہ اگر ایک شخص اپنی جائداد کی نسبت یہ کہلائے کہ یہ جائداد میرے ہی خاندان میں تاالقیامت باقی رہے، بجز اس کے جب کوئی نسل باقی نہ رہے تو اس وقت فقرا کو مل جائے، تو یہ وقف صحیح ہوگا، مثلاً وہ جائداد منتقل نہیں ہو سکتی، کوئی فروخت نہیں کر سکتا اور کوئی خاندان کا آدمی اس کو گروی نہیں رکھ سکتا، ہمیشہ کے لیے وہ جائداد محفوظ ہو جاتی ہے۔ ایسا عمدہ قانون ہے۔ ایسا مسئلہ ضروری ہے جس پر قوم کی بقا موقوف ہے۔ غلطی سے پریوی کونسل والوں نے نہیں سمجھا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ جیسا کہ ہمارے حضرت صدر نے فرمایا ہے کہ بہت سے مسئلوں پر یورپ کے لوگ اعتراض کرتے ہیں، وہ نیک نیتی سے کرتے ہیں، وہ بدنیتی سے نہیں کرتے۔ وقف ایک

خیراتی چیز ہے ۔ وقف کے معنی ہیں خیرات کرنے کے ۔ اس کے کیا معنی ہیں کہ ایک شخص اپنے بیٹے کو خیرات دیتا ہے، اپنی اولاد کو خیرات کرتا ہے ۔ پریوی کونسل نے اپنی نظیر میں یہ لکھا تھا کہ مقنن اعظم کی نسبت یہ قیاس کرنا بے جا ہوگا کہ وہ یہ حکم دیتے کہ ایک چیز ایک ہاتھ سے دے اور دوسرے ہاتھ سے لے لے ۔ وقف کے یہ معنی قرار دینا غلط ہے جو وہ دیتے ہیں کہ وقف گھری میں رہا، گھی کہاں گیا کھچڑی میں ۔ صدر صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ انگریزی قوم اس بات کے سمجھنے سے قاصر ہو کہ خیرات اپنی اولاد، اپنے خاندان، اپنی قوم کو دی جاسکتی ہے ۔ ابھی تک کوئی اس نکتے کو نہیں سمجھا کہ خیرات کے ہم سب مستحق ہیں، ہماری ذات بھی ہے اور ہماری اولاد بھی ۔ خیر یہ ایک مسئلہ دقیق ہے، لیکن عرض یہ ہے کہ اتنا بڑا عظیم الشان مسئلہ جس پر کسی جماعت نے، کسی سوسائٹی نے، کسی گروہ، علما نے توجہ نہیں کی ہمارے ندوے نے اس کام کو اٹھایا، اس طرح سے نہیں اٹھایا کہ جس طرح ہم دوسرے کاموں کو اٹھاتے ہیں کہ بس ایک ریزولیشن پاس کر دیا اور اس کو پیچ کر دیا اور چھو منتر کر کے مس کر دیا اور وہ اکسیر بن گیا ۔ اس طرح نہیں بلکہ ایک ایجیٹیشن پیدا کر دیا، کوئی انجمن ہندوستان کی باقی نہیں رہی جس میں ریزولیشن پاس نہیں ہوئے اس امر کے متعلق، اور صوبے کی گورنمنٹ وائسرے کی خدمت میں نہ بھیجے گئے ہوں اور اس رپورٹ کا انگریزی میں بھی ترجمہ کر دیا گیا تھا، ہر جگہ سے دستخط کرائے گئے اور میموریل بھجوائے گئے ۔ ایک عام شور مچا دیا تمام ہندوستان میں، جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایک قانون بنا اور مسٹر جینا نے اس کو پیش کیا ۔ تمام ممبران کونسل نے باوجود اس کے کہ ہندو ممبر بھی تھے، نہایت زور کے ساتھ اس کی موافقت کی اور مسٹر سنہا نے بھی اس کی تائید کی، یہ وقف کا مسئلہ ہے ۔ آپ نے ابھی میرے عزیز دوست سید سلیمان کو جس نے ابتدا سے آخر تک اسی ندوہ میں تعلیم پائی ہے دیکھا ہے (لوگ کہتے ہیں کہ ندوے نے کیا کیا؟ کچھ نہیں کیا ۔ ایک سلیمان کو پیدا کیا تو یہی کافی ہے) ۔ اس نے ابھی جو رپورٹ تصحیح اغلاط تاریخی پڑھی ہے اس کو آپ نے سنا ہے ۔ یہ ایک ضروری مسئلے کے متعلق ہے، جس کی لوگوں کو کچھ پروا نہ تھی ۔ حضرات کیا آپ نے اس بات پر غور کیا ہے کہ آپ کے ہزاروں لاکھوں بچے ان الفاظ کو مدرسوں میں پڑھتے ہیں جن کو آپ نے سنا اور جن کے سننے سے آپ کے دل لرز لرز گئے ہیں اور جس پر آپ نے نفرت کے نعرے بلند کیے ہیں (کبھی اس سے پہلے آپ نے نعرے بلند کیے تھے) ۔ سوال یہ ہے کہ جب آپ کا لڑکا پڑھ کر گھر میں آتا تھا تو کیا کبھی اس نے شکایت کی کہ آیا ایسے ناگوار اور لغو الفاظ ہم کو اسکول میں پڑھائے

جاتے ہیں ؟ آپ کا احساس مذہبی زائل ہو رہا ہے، آپ کو اس پر رونا چاہیے کہ آپ کی فیلنگ، آپ کے احساس مذہبی بالکل فنا ہوتے جاتے ہیں۔ اگر جو کچھ آجائے آپ اس کو قبول کرتے جائیں، تو نعوذ باللہ اسلام دنیا سے بالکل خارج ہو جائے گا۔ ندوہ کا یہی کام ہے کہ فیلنگ مذہبی کو زندہ کر دے۔ ندوے کے سوائے کون سی ایسی جگہ ہے جہاں آپ ایسے روشن خیال لوگ اور انگریزی دان جمع ہوتے ہیں ؟ مجھے یہ خوب معلوم ہے کہ آپ کا قصور نہیں، انگریزی دان تو ہر جگہ جانے کو تیار ہیں۔ میرے دوست آنریبل آفتاب احمد خان صاحب دیو بند گئے تھے، وہاں اس پر اعتراض ہوا کہ اس کو کیوں بولنے دیا۔ یہ خدمت کے لیے موجود ہیں، مگر آپ ان کو خدمت گار نہیں بناتے ہیں، اسی طرح آپس میں فیلنگ خراب ہوتی جاتی ہے اور تم مردہ ہوتے جاتے ہو۔ مذہبی فیلنگ کو زندہ رکھو، صرف ندوہ ہی اس فیلنگ کو زندہ رکھ سکتا ہے، کیوں کہ اس نے اس کام کو کسی حد تک کیا ہے۔ وہ آپ کو نہایت فیاضی کے ساتھ مدعو کرتا ہے اس اسٹیج پر جس پر علمائے کبار بیٹھے ہیں، ایسے لوگ بھی بیٹھے ہیں جو ایک حرف نہیں جانتے۔ اس بنا پر آپ لوگ دیکھتے ہیں کہ ہر سال ہم کو موقع ملتا ہے کہ ہم آپ کے ان احساساتِ مذہبی کو جو مر گئے ہیں اور مرتے جاتے ہیں ان پر جلا کر کے ان کو روشن کریں۔ حضرات یہ شاعری نہیں، میں بے شبہ شاعر ہوں، لیکن ہر شخص اس بات کو تسلیم کرے گا کہ میری کتابیں شاعری سے خالی ہیں۔ مجھ کو تمام عمر میں اگر کسی نے داد دی ہے اور کسی کی اصلاح پر اگر میں خوش ہوں اور کسی کی باتوں سے اگر میرے دل میں جگہ ہوئی تو صرف یہی ہے کہ ایک شخص نے کہا تھا کہ شبلی گو ایک شاعر طبع شخص ہے اور اس کی فیلنگ شاعرانہ ہے، مگر عالم تاریخ میں آن کر اس نے ایک شعر نہیں باندھا۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ سخن سازی نہیں ہے، لفاظی نہیں ہے، واقعات ہیں، حقیقت ہے۔ اس لیے میں آپ کے سامنے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں میں احساس مذہبی قائم رہے اور قوم کو جو مذہبی ضرورتیں پیش آتی ہیں ان کا کوئی پیش کرنے والا گروہ موجود رہے گورنمنٹ کے سامنے، رعایا کے لیے لڑنے والا اور گورنمنٹ کے ساتھ چلنے والا تو صرف یہی ندوہ ہو سکتا ہے۔ اگر آج نہیں ہے تو کل ہو گا، اگر قابلیت ہے تو اسی میں ہے۔ اس بنا پر میں آپ صاحبان کے سامنے جہاں یہ پیش کرتا ہوں کہ ندوہ ایک ضروری چیز ہے، قوم کے لیے ایک لازمی چیز ہے، اس کے ساتھ ہی یہ کہوں گا کہ اس بات کی سب سے زیادہ ضرورت ہے کہ ہمارا ایک مرکز ایسا ہو جس کی آواز تمام قوم کی آواز سمجھی جائے۔ جس طرح سے کہ مسلم لیگ نے ایک جلسہ بنایا کہ جس کا منشا یہ

ہے کہ پولٹیکل باتوں میں اس جلسے کی آواز تمام قوم کی آواز سمجھی جائے۔ اس طرح سے ہم کو ضرورت ہے کہ ہماری ایک مذہبی کانفرنس ہو جس کی آواز تمام مسلمانوں کی آواز سمجھی جائے۔ اگر یہ نہیں ہے تو مذہبی امور میں آپ گورنمنٹ کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہو سکتے، بلکہ وہی بات پیش آئے گی جو ہمارے دوست عزیز مرزا مرحوم کو پیش آئی تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ گورنمنٹ کو چاہیے کہ وقف کی نگرانی کرے، اس لیے کہ اکثر وہ بے جا طور پر خرچ ہوتا ہے۔ گورنمنٹ پوچھتی ہے کہ پہلے آپ ثابت کیجیے کہ یہ صرف آپ کا (مرزا صاحب کا) خیال ہے یا اور تمام مسلمانوں کا۔ حالاں کہ انھوں نے پرسنل حیثیت سے نہیں بھیجا تھا، مسلم لیگ کی طرف سے بھیجا تھا، مگر گورنمنٹ کو شبہ ہے کہ آیا مسلم لیگ بھی مسلمانوں کی آواز ہے یا نہیں۔ (بحث ہونے لگی اور سلسلہ تقریر منقطع ہو گیا۔) میری یہ عرض ہے کہ اس وقت تک اگرچہ ندوے نے کوئی ایسی قوت حاصل نہیں کی جیسا کہ میں نے آپ سے بیان کیا تھا اور جس کی خواہش ہے، لیکن پھر بھی اگر اس وقت گورنمنٹ یا گورنمنٹ کے افسران کسی جماعت کے مسلمانوں کی مذہبی آواز مانتے ہیں تو وہ یہی ندوہ ہے۔ اس وقت اس کی دو تین مثالیں پیش کرتا ہوں۔ اولاً تو آپ کو معلوم ہے کہ مسٹر جینا نے جب وقف علی الاولاد کا قانون پریوی کونسل میں پیش کیا تو انھوں نے نہایت تشریح کے ساتھ کہا (میں نے ان کی اسپیچ خود پڑھی) کہ ندوۃ العلماء جو ایک ایجوکیٹڈ مولویوں کا جلسہ ہے، ان کی انجمن متفق ہے اور اس نے اس مسئلے کو نہایت زور سے دکھایا ہے اور تمام مسلمانوں کو اس پر متفق کیا ہے۔

دوم میرے پاس ایک مجسٹریٹ صاحب کا سرکاری خط آیا کہ میرے یہاں ایک مقدمہ پیش ہے، جس میں عورت چاہتی ہے کہ لڑکی کو اپنے پاس رکھے اور شوہر چاہتا ہے کہ وہ اپنے پاس رکھے۔ شاید دونوں میں طلاق ہو گئی تھی۔ ندوہ بتائے کہ وہ کیا فیصلہ کرتا ہے۔ جو کچھ میں نے اپنے ندوے کے مولویوں سے لکھا کر بھیجا مجسٹریٹ نے اسی کے مطابق فیصلہ کیا۔ مجسٹریٹ نے شکریے کا خط مجھے لکھا کہ وہ دونوں اس فیصلہ پر راضی ہو گئے۔

سوم میرے ہاتھ میں ڈپٹی کمشنر کانڈو کا ایک لفافہ ہے۔ ان کی عدالت میں ایک بہت بڑا مہتم بالشان جھگڑا پیش تھا۔ کسی مذہبی مسئلے کے متعلق انھوں نے پوچھا اور یہاں سے جو جواب گیا اس کے موافق فیصلہ کیا اور لکھا کہ میں اس پر اعتماد کرتا ہوں۔

اگر آپ لوگ چاہتے ہیں کہ ہماری ایک مذہبی آواز ہو تو ایک چیز کو اختیار کیجیے۔ اگر ندوہ

ابھی تک آپ کی مذہبی آواز نہیں ہے تو اس کو بنائیے، آخر آپ کو یہی بنانا ہے۔ لیکن اگر اس سے بہتر کوئی چیز آپ کو مل جائے تو آپ اس کو اختیار کیجیے۔ لیکن اگر ایک چیز ایک حصے تک بن چکی ہے تو اس بنا پر اس کی قدر کیجیے اور اس کو قوم کی آواز سمجھیے۔ اس امر کے عرض کرنے کے بعد اب مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ ندوے نے اس اصول کی بنا پر ایک دارالعلوم قائم کیا اور جس کا وہ اصول اختیار کیا کہ جس کی میں نے آپ کے سامنے تشریح بیان کی ہے۔ میں اس بات کو مانتا ہوں کہ ندوہ اب تک اس طریقہ۔ تعلیم میں کامیاب نہیں ہوا، اس لیے کہ وہ مشکل طریقہ ہے۔ اگر ہم وہ طریقہ اختیار کرتے جو سرکاری اسکولوں میں جاری ہے اور اپنے لڑکوں کو وہاں پڑھنے کے لئے بھیجتے یا وہ طریقہ اختیار کرتے جو قدیم سے مدارس عربیہ میں تھا۔ یہ دونوں طریقے نہایت آسان ہیں، مگر مشکل یہ ہے، در کف جام شریعت .... وغیرہ۔

ایک طرف تو شریعت کا پیالہ ہے شیشہ سے نازک اور دوسری طرف جنت ہے۔ ندوہ اسی خیال میں گرفتار ہے (۴۱)، چار برس سے میں خود پڑا ہوا ہوں۔ سو سو طرح طرح سے غور کرتا ہوں کہ کیا کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔ جہاں تک بنا میں نے کوشش کی۔ یہ تو ممکن نہیں ہو سکتا کہ ایک برتن میں جس میں ایک سیر پانی رکھنے کی گنجائش ہو اس میں دو سیر پانی بھر دیا جائے، اس میں تو صرف ایک سیر آئے گا۔ ہماری جو قدیم علوم و فنون کی کتابیں ہیں وہ اور انگریزی علوم اور زبان بھی یہ دونوں ایک برتن میں کیوں کر سما سکتے ہیں؟ اس واسطے ہم کو یہ کرنا پڑا کہ ہم نے اپنے یہاں کی جو غیر ضروری چیزیں سمجھیں ان کو گھٹا دیا۔ بہت سی فلسفہ اور منطق کی کتابیں گھٹا دیں (جس پر ہمارے مولوی لطفی صاحب راضی ہوں یا نہ ہوں)، اس کی جگہ انگریزی داخل کی، ایم اے اور بی اے کی قابلیت کے اشخاص اپنے اسٹاف میں مقرر کیے، تقریباً تین سو چار سو روپے خاص انگریزی پڑھانے پر صرف کیے جا رہے ہیں۔ یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے، لیکن یہ ایسی چیز نہیں کہ اگر قوم پوچھے کہ ندوہ نے ۱۰ - ۱۵ برس میں کیا کیا تو اس کے نتائج آسانی سے دکھلائے جا سکتے ہوں۔ کام کیا جا رہا ہے اور قوم کے برتاؤ کی ہمارے ساتھ یہ حالت ہے۔ ہماری ایک اہم ضرورت اس وقت یہ ہے کہ ہم کو ایک عمارت بنانا چاہیے۔ ہم سے یہ خواہش ہے کہ لڑکے ایسے سلیقے والیسی پابندی سے والیے قاعدے سے رہیں جس طرح سے کہ اعلیٰ درجے کے بورڈنگوں میں رہتے ہیں۔ لیکن ہماری یہ حالت ہے کہ ہم کو ایک کوٹھری نصیب ہے، جس میں ہم پانچ پانچ لڑکوں کو بھرتے ہیں، جگہ نہیں ملتی۔ میرے پاس ہر روز نہیں تو ہفتے میں دو تین دفعہ خطوط آتے ہیں کہ میں اپنا لڑکا ندوے میں بھیجنا

چاہتا ہوں، مجھ کو لکھنا پڑتا ہے کہ جگہ نہیں ہے۔ میں نے جب سنا ہے کہ ہمارے حضرت صدر ندوے کی پرانی عمارت دیکھنے کے لیے جانے والے ہیں تو میں نے کہا کہ وہاں کہاں جاتے ہو۔ چند روز ہوئے ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن نے مجھ سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ میں ندوے میں آکر دیکھوں اور میں اگزامن کروں، کیوں کہ یہ میرا فرض ہے۔ میں نے کہا تھوڑے دن اور معاف کیجیے۔

حضرات! کیا یہ افسوس کی بات نہیں ہے، کیا اس کی شرم بانیان ندوہ اور قوم کو نہیں ہے؟ اور سات کروڑ مسلمانوں کی نہیں ہے؟ ایک حاتم دوراں یعنی بھاول پور کی رئیسہ نے اگر ہم کو پچاس ہزار روپیہ دیے، جس سے یہ عمارت کھولی ہے، تو کیا بس یہی فرض کفایہ ہے؟ کیا، کروڑ مسلمان سبکدوش ہو گئے؟ یہ مکان پچاس ہزار میں نہیں باسٹھ ہزار میں بنا، پھر بھی ناتمام ہے۔ اب ضرورت یہ ہے کہ اس کے لیے اپیل کرنا ہے ملک سے، قوم سے۔ اس وقت تک ہم اس لیے چپ رہے کیوں کہ ہم جانتے تھے کہ ایک نہایت اہم اور نہایت ضروری اور عالم گیر کام ہندوستان میں ہو رہا ہے، یعنی یونیورسٹی کا، اس کے لیے ہم نے زبان بلند نہیں کی۔ لیکن اب وقت آگیا ہے کہ قوم کو واقف ہونا چاہیے اور تقسیم عمل کی بنا پر کام ہونا چاہیے۔ تم ایسے مرے ہوئے نہیں ہو کہ یونیورسٹی کے بنانے کے بعد بس تم بالکل مر گئے اور تم میں کسی قسم کی حالت باقی نہیں رہی اور سیکڑوں برس تک تم کسی کام کے قابل نہیں رہے، یہ نہیں ہے۔

حضرات! ہمیں اس وقت صرف پندرہ بیس ہزار روپیہ اسکول رومز (کمروں) کے لیے اور تیس چالیس ہزار بورڈنگ کے لیے چاہیے۔ آپ تیس لاکھ چالیس لاکھ چاہتے ہیں تو ہم اتنا نہیں چاہتے۔ میں آپ صاحبان سے اپیل کرنا چاہتا ہوں کہ آپ دوسرے وقت بھی اس پر غور کریں کہ ان چند سکوں کے جمع کرنے کی کیا تدابیر اختیار کریں؟ اور ہم کو کیا کرنا چاہیے؟ میرے ذہن میں بہت سی تدبیریں آئیں ہیں، اجمالاً میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ جو حضرات یہاں بیٹھے ہیں اور یہاں کے رہنے والے ہیں اور جن کا اثر یہاں کے رئیسوں پر ہے، ان کا ایک ڈیپوٹیشن بنائیں اور ہمارے راجہ صاحب محمود آباد اور راجہ صاحب جہانگیر آباد کے پاس جائیں۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ ابھی وہ سخت زد و ضرب اٹھا چکے ہیں، یعنی ایک ایک لاکھ روپیہ یونیورسٹی میں دے چکے ہیں، مگر حضرات واضح رہے کہ ہم ان لوگوں کی نسل ہیں، مہلب کو قتل کرتے ہوئے ہادج نے یہ کہا کہ جس دن ایک ہزار روپیہ داخل کرے گا اس دن تو قید سے چھوڑ دیا جائے گا اور جس دن ایک

ہزار روپیہ نہ داخل کرے گا اس دن پھر قید میں ڈالا جائے گا۔ چناں چہ وہ غریب روزانہ ایک ہزار روپیہ کہیں سے بہم پہنچاتا تھا۔ جس دن نہیں بہم پہنچاتا تھا وہ قید میں رہتا تھا۔ ایک دن ایک شاعر عربی اس کے پاس گیا، اس وقت جبکہ اس نے ایک ہزار روپیہ مہیا کیا تھا اور جانتا تھا کہ ایک ہزار روپیہ دے کر چھوٹ جاؤں گا، شاعر نے بڑی ضرورت بیان کی۔ اس نے وہ ہزار روپیہ اس شاعر کے حوالہ کیا اور خود قید میں گیا۔

جبکہ ہمارے قدما نے ایسی مثالیں پیش کی ہیں کہ ایک شخص قید قبول کر لیتا ہے بمقابلہ اس کے کہ ایک شاعر کو ناکام واپس کرے، تو کیا ہمارے رئیس ایسے ہیں کہ اگرچہ وہ زد کھا چکے ہیں تو کیا وہ پانچ پانچ ہزار کی رقم نہیں دے سکتے ہیں۔ اس کے بعد میں یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ قوم کے سامنے، خود ارکان ندوہ کے سامنے، بغیر اس کے کہ مجھ کو کوئی ڈر ہو یا اس بات کا کچھ خوف ہو کہ میرے احباب مجھ سے روٹھ جائیں گے، میں کہوں گا کہ خود اراکین ندوہ میں ایسے شخص موجود ہیں جو کم سے کم پانچ پانچ سو روپیہ باآسانی دے سکتے ہیں۔ سب سے پہلے میں خود پانچ سو روپیہ کا چیک لکھتا ہوں، اس کے بعد میں یہ خواہش کرتا ہوں کہ دس دس روپے کے دینے والے پانچ ہزار مہیا کیے جائیں اور اس طرح پچاس ہزار جمع ہو جائیں گے۔ دس روپیہ دینا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ یہ چند تجاویز میں آپ صاحباں کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ اگر آپ صاحبان میں کوئی ہمدردی ہے، کوئی رحم ہے تو میرے بعد کوئی اور صاحب بھی اس کی تائید فرمائیں گے میں اب جس قدر بکنا تھا بک چکا اور جو کہنا تھا کہہ چکا"۔

مندرجہ بالا تقریر کے متعلق روداد میں اس طرح ہے:

"چوں کہ یہ تقریر مختصر نویسوں نے قلم بند کر کے دی ہے اور ابھی ان لوگوں نے اتنی مہارت اور مشق نہیں پیدا کی ہے کہ اصل تقریر لفظ بلفظ قلم بند کر سکیں اس لیے اس تقریر میں وہ زور نہیں ہے جو مولانا ممدوح کے بیان میں تھا (۴۳)۔"

اسی جلسے میں ندوہ کی عمارت کے لیے چندہ ہوا اس کے متعلق روداد میں اس طرح ہے:

"مولانا شبلی نعمانی کی تقریر میں عمارت کے لیے چندہ کی تحریک کی گئی تھی اور مولانا شبلی نے جو اپنی جانب سے پانچ سو روپیہ اور علامہ سید رشید رضا کی تشریف آوری کی مسرت میں سو روپیہ دینے کا اعلان فرمایا۔"

ان چندوں کے علاوہ بعض اور حضرات نے بھی چندے لکھائے اور بعض اصحاب نے نقد عنایت فرمائے لیکن سب سے زیادہ قابل فخر و مباہات ایک سو روپے کا وہ چندہ تھا جو معزز صدر

انجمن علامہ سید رشید رضا نے عطا فرمایا علامہ ممدوح کی یہی تکلیف کیا کم تھی جو انھوں نے ایسا دور دراز سفر کر کے گوارا فرمائی، لیکن مولانا کے خلوص و ایثار نے گوارا نہ کیا کہ اپنے احسانات میں بغیر اضافہ کیے رہ سکیں (۴۴)۔

اس کے بعد روداد کے مطابق مولانا شبلی نعمانی نے صیغہ۔ وقف علی الاولاد کی رپورٹ پڑھ کر سنائی جو بہت خوشی کے ساتھ سنی گئی۔ اس کے بعد پوری رپورٹ روداد میں درج کی گئی ہے۔

نواب عبدالمجید نے کونسل میں وقف علی الاولاد کے بل کی تائید کرتے ہوئے مولانا شبلی کی تعریف اس طرح کی ہے:

"ہم لوگ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی صاحب کی ان تکالیف اور مساعی کے بہت مشکور ہیں جو انھوں نے اس کی بابت کیں (۴۵)۔"

مسٹر جینا (قائد اعظم محمد علی جناح) وائسرے کی کونسل میں وقف علی الاولاد کا بل پیش کرتے ہوئے۔ انگریزی میں ایک زبردست تقریر کی تھی اور اس میں مولانا شبلی کی کوششوں کو بہت سراہا گیا تھا۔ (۴۶)۔

روداد میں آگے چل کر اس طرح ہے:

اشاعت اسلام ایسا ضروری صیغہ جو ندوۃ العلماء کے اہم مقاصد میں داخل بھی ہے، ایسے موقع پر کیوں کر فراموش کیا جاسکتا تھا چوں کہ وقت کافی بچ گیا تھا اس لیے شمس العلما مولانا شبلی نعمانی نے اس بحث پر ایک مبسوط و مؤثر تقریر فرمائی اور اس کے متعلق خاص خاص تجویزوں کو ذکر کیا اور اس کی مثالیں پیش کیں۔

مولانا ممدوح کی یہ تقریر جس کا لفظ لفظ اثر میں ڈوبا ہوا تھا حاضرین کے دل میں چٹکیاں لے رہی تھی اور ان کی اندرونی تاثیر کو امداد کی صورت میں ظاہر کر رہی تھی۔

یہ حالت دیکھ کر مولانا نے فرمایا کہ "صاحبو ظاہر ہے اور فوری اثر مسلمانوں کا خاصہ ہے میں اس کا قائل نہیں بلکہ آپ لوگ یہاں سے جانے کے بعد اس اثر اور تحریک کو جاری کریں تو وہ قابل قدر اور اسلام کی سچی خدمت ہے وہ تقریر حسب ذیل ہے:

نوٹ: چوں کہ مولانا ممدوح کی یہ تقریر بھی مختصر نویسوں کے ذریعہ سے ملی ہے، اس لیے اس میں وہ قوت اور زور نہیں ہے جو مولانا ممدوح کے بیان میں تھا (۴۷)۔

تقریر شمس العلما مولانا شبلی صاحب نعمانی

حضرات! میں نے اسلام کی تاریخ جہاں تک مجھ سے ہو سکا نہایت غور و فکر کے ساتھ پڑھی ہے، میں تیرہ سو برس کی وسیع مدت کا ایک حد تک واقف کار ہوں کہ تمام ممالک اسلامیہ میں مسلمانوں کی حالتیں مختلف زمانوں میں، مختلف سلطنتوں میں، مختلف دوروں میں کیا رہی ہیں۔ مگر میں آپ کو صحیح شہادت دیتا ہوں کہ مجھ کو نہیں معلوم ہے کہ مسلمانوں پر کوئی وقت اور کوئی زمانہ آج سے زیادہ مشکل، شاق اور آج سے زیادہ تباہ کنندہ گزرا ہے، مجھ کو معلوم ہے کہ ایک زمانہ ایسا مسلمانوں پر گزرا ہے چھٹی اور ساتویں صدی میں جبکہ تاتاری اٹھے اور وہ ایک طرف سے پائمال کرتے ہوئے شام تک پہنچ گئے۔ مورخوں کا یہ بیان ہے کہ نوے لاکھ مسلمان قتل کر دیے گئے اور پیوند خاک کر دیے گئے۔ ایسا سخت زمانہ بھی گزرا ہے۔ سیکڑوں سلطنتیں تباہ ہو گئیں، سیکڑوں خاندان برباد ہو گئے، بغداد جو کہ تمام دنیا کے مسلمان جس کو بیت العرب کہتے تھے اس کی یہ کیفیت ہوئی کہ جو لوگ سفر میں گئے ہوئے تھے جب وہ واپس آئے تو ان کو اپنا محلہ نہیں ملتا تھا، تو گھروں کا کیا ذکر ہے یہ حالت گزری ہے ایسا زمانہ تھا جب کہ شیخ سعدی کو یہ کہنا پڑا۔

ای محمد گر قیامت سر بروں آری زخاک   سر بروں آرو قیامت درمیان خلق بیں

خون فرزندان احمد مطصفےٰ شد ریختہ

ایک یہ حالت گزری ہے مگر میں اس حالت کو بھی آج کی قیامت سے آسان تر اور سہل تر سمجھتا ہوں، اس لیے کہ ان پر تو فقط ایک ملکی مصیبت تھی، مذہب پر، اخلاق پر، قوم کی معاشرت پر کوئی حملہ نہیں تھا، کوئی صدمہ نہیں تھا تاتاری کسی مسلمان سے یہ نہیں کہتے تھے کہ تم اپنے عقائد اسلام سے برگشتہ ہو جاؤ اور کوئی ایسی ترغیبیں تاتاری نہیں دیتے تھے کہ جس سے مسلمانوں کے مذہبی اعتقادات و مذہبی خیالات میں کسی قسم کی کمزوری پیدا ہو، چناں چہ اس کا یہ اثر پیدا ہوا کہ خود وہی ہلاکو خان کو جو برباد کنندہ دین اسلام تھا اس کا پوتا مسلمان ہو گیا اور اسلام لایا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بجز ملکی حالات کے مذہب سے ان کو کوئی غرض نہ تھی، مذہبی معاملات میں وہ نہایت فیاضی سے مسلمانوں کو دخل دیتے تھے یہاں تک کہ ان کے واعظ اور علما جو دربار میں داخل تھے ان سے وہ وعظ اور پند سنتے تھے۔ محقق طوسی جو باعث فخر ہے بالحاظ اپنے علم کے اور کمالات کے وہ وزیر تھا ہلاکو خان کا اس سے آپ قیاس کر سکتے ہیں کہ یہ مصیبت یک طرفہ تھی مگر آج کل مسلمانوں کی کیا حالت ہے، کون سا پہلو ہے جس طرف سے زد نہیں ہے، اور ان سب کی تفصیل

کرنے کا موقع نہیں ہے۔ مسلمانوں کی پولیٹیکل حالت کیا ہے؟ اس کو جانے دیجیے، مسلمانوں کی تعلیمی حالت کا تناسب کیا ہے جس کے لیے یونیورسٹی قائم ہو رہی ہے، یہ بھی ایک ضروری چیز ہے لیکن خیر سوال یہ ہے کہ یا تو یہ حالت تھی کہ ید خلون فی دین اللہ افواجاO اب اس کے مقابلے میں کیا لفظ سننے میں آتے ہیں کہ ہندوستان میں (آپ لوگوں کے کبھی کبھی بطور خفیف آواز کے جو کانوں میں بھنک کی طرح پڑ جاتی ہے) فلاں مقام پر تو مسلم مائل بہ ارتداد کر دیے گئے یا مرتد کر دیے گئے۔ آپ یہ کہہ کر اپنی تسلی کر لیتے ہیں کہ وہ پہلے ہی سے ایسے تھے، یہ اتفاق کی بات ہے کسی لالچ سے کسی طمع سے کسی حرص سے اس نے قبول کر لیا ہوگا۔

لیکن حضرات جیسا کچھ آج کل کئی مہینوں کی خط و کتابت سے معلوم ہوا ہے۔ اشتہارات دینے کے بعد جو تحریرات جابجا سے آئی ہیں اور جو کیفیتیں محقق طور صحیح معلوم ہوئیں اور جو ایجنٹ اور سفیروں کے بھیجنے سے دریافت کی گئیں، خاص ایک شخص حسن شاہ مقرر کر کے بھیجا گیا انھوں نے بہت سے مقامات میں جا کر خود دیکھا تو ایسی حیرت انگیز باتیں معلوم ہوئی ہیں کہ جس کی بنا پر میں نہیں سمجھا کہ اگر تمام مسلمان قوت متفقہ سے متحد نہ ہوں گے تو کیا ہونا ہے۔ حضرات اس بات کی شکایت کرنا نہایت عبث ہے میرے نزدیک یہ بالکل بدنصیبی کی بات ہے کہ ہم آپ یہ شکایت کریں کہ ہمارا فریق ثانی خواہ ہندو یا پارسی ہوں خواہ مجوسی یا کوئی ہوں کیوں ہم کو فریب دیتے ہیں۔ مگر دنیا میدان مسابقت اور کشمکش ہے، میدان رزم ہے، اس میں آپ کسی کو روک سکتے ہیں، فرض کیجیے کہ ایک خاندان کے دو لڑکے ہیں ان میں آپس میں رشتہ اتحاد وارتباط ہے، دونوں گریجویٹ ہیں، ایک عہدہ ڈپٹی کلکٹری کا خالی ہو تو کیا دونوں اس کے حاصل کرنے کی کوشش نہ کریں گے؟ کیا ایک یہ چاہے گا کہ میں فیل ہو جاؤں اور میرا بھائی پاس ہو جاوے اور نوکر ہو جاوے؟ نہیں، بلکہ دونوں برابر درجہ کی قوت صرف کریں گے اور کوشش کریں گے اور دونوں حقیقتاً یہ چاہیں گے کہ میرا بھائی کامیاب نہ ہو اور میں ہو جاؤں۔ کیا یہ قسم کی بدنفسی ہے، یہ دنیا کی حالت ہے، فطرت انسانی ہے کہ اپنے مقصد کے حاصل کرنے کے لیے جتنی تدبیریں ممکن ہوں وہ کرے، اس لیے ہمارے مخالف اور ہمارے فریق ثانی بہت کچھ کوشش کر رہے ہیں تو ہم کو یہ اعتراض نہ کرنا چاہیے کہ وہ کیوں کرتے ہیں ان کی شرارت ہے یا خدانخواستہ ان کی خباثت ہے۔ یہ نہیں ہے۔ بلکہ ہم کو خود یہ دیکھنا ہے کہ ہم بجائے خود بھی ایسی ہی کوشش کرتے ہیں یا نہیں اگر نہیں کریں گے تو یہ میدان مسابقت ہے اس میں ہم ہار جائیں گے۔ حضرات حالت یہ ہے کہ ہم تو

فخر و ناز کرتے ہیں علی گڑھ کالج پر، ہم فخر و ناز کرتے ہیں دیو بند پر، ہم فخر و ناز کرتے ہیں ندوۃ العلما پر، لیکن میں آپ کے سامنے ایک مختصر سی چیز کا جس نے کچھ اپنا نقارہ، فخر نہیں بجایا ہے اس کی حالت بیان کرتا ہوں کیا کوئی ایسی مثال تمام دنیا میں اس وقت موجود ہے، کوئی دکھا سکتا ہے میں آپ کے سامنے ایک خاص بات پیش کرتا ہوں، کہ ہمارے جتنے کام اس وقت ہندوستان میں ہیں۔ ان سب کے، ہم نقارہ نواز ہیں۔ "ثنای خود، بخود گفتن نمی زیبد" اگر ندوہ ہے تو مجھ کو اپنے ندوہ کے متعلق الندوہ میں لکھنا پڑتا ہے کہ یہ ایسی چیز ہے ویسی چیز ہے رپورٹیں ہیں روئدادیں ہیں۔ اگر علی گڑھ ہے تو اس کی ہر سال بھی نقارہ نوازی کی جاتی ہے۔ کانفرنس کے ذریعہ سے، لوگوں کے ذریعہ سے، مگر وہ لوگ بھی آج ہیں اس دنیا میں ان کی طرف کو دیکھنا چاہیے کہ سب کچھ کر رہے ہیں مگر ان کے حالات ان کی کوششیں ان کی جدوجہد ان کی زبان سے سننے میں نہیں آتی بلکہ زمین و آسمان بولتے ہیں، مجھ کو اگر گروکل کا قصیدہ اس وقت بیان کرنا ہے، کہنا پڑتا ہے کہ گروکل کے حالات کسی ہندو کے لکھے مجھے نہیں ملتے میں نے گروکل کے حالات اس کے بانیوں سے سنے ہیں نہ تحریروں سے اور نہ زبانی، بلکہ ان مسلمانوں سے جو وہاں گئے ہیں، ان انگریزوں سے جنھوں نے وہاں جاکر قیام کیا ہے، پانچ پانچ چھ چھ دن وہاں رہے ہیں۔ انھوں نے پانیر میں اس پر متعدد آرٹیکل لکھے ہیں، ان سے سنے ہیں اور معلوم کیے ہیں، وہ یہ حالات ہیں۔ یہاں تو یہ حالت ہے کہ اگر ہم کسی غریب آدمی کو عربی پڑھوانا چاہیں تو گو، ہم اس کی دنیاوی معاش کے لیے بندوبست کر رہے ہیں، لیکن ہم کو ضرورت ہے کہ ہم اس کو رشوتیں دیں، وظیفہ اور اسکالر شپ دیں۔ رشوتیں بھی چھوٹی نہیں دس، دس، بیس، بیس اور چالیس، چالیس روپیہ کی۔

برادران اسلام! سوال یہ ہے کہ اگر آپ میں سے کوئی ایسا مدرسہ قائم کرے جس کی میں ابھی اس وقت تشریح کرتا ہوں تو آپ مجھ کو بتایئے کہ تمام ہندوستان میں سے ایک شخص بھی ایسا ہے جو ایسی تعلیم کے لیے مستعد ہو اور ایسے مدرسے میں جانے کے لیے تیار ہو، یعنی گروکل جو چیز ہے اس نے اپنے مقاصد، اپنے اصول اور اپنے رول یہ قرار دیے ہیں کہ یہ ایک درس گاہ، ہم بناتے ہیں، جس میں وہ بچے لیے جائیں گے جن کی عمر شاید آٹھ برس کی ہو، ایسے بچے اس میں داخل کیے جائیں گے، شرط یہ ہوگی کہ چوبیس برس کی عمر تک وہ گھروں پر جانے نہ پائیں۔ فقط وہاں تعلیم پائیں اور وہ کسی مشغلے میں نہ پڑیں گے۔ ۲۴۔۲۵ برس تک کی عمر کا جو زمانہ ہے نوکری کرنے کا، جس کے بعد سرکاری نوکری نہیں ملتی۔ اس زمانے کو گویا وہ کھو دیں گے۔ مقصد یہ ہے کہ وہ

ناکارہ ہو جائیں اور سرکاری ملازمت کی ترغیب کا ذرا بھی موقعہ باقی نہ رہے۔ ان کو وہاں پر زندگی کیوں کر بسر کرنی ہوگی؟ یوں کہ ایک لکڑی کا تختہ سونے کو ملے گا، پلنگ نہیں، چارپائی نہیں، گدا نہیں، کمبل اوڑھنے کے لیے، پاؤں یا تو ننگے یا کھڑاؤ پہننے کے لیے ملیں گی۔ یہ تو ان کی حالت ہوگی، لذائذ اطعمہ جو ہمارے یہاں سب سے بڑی چیز کالج میں بھی اور ہمارے غریب جھونپڑے (یعنی ندوہ) میں بھی رات دن رہتی ہے وہ یہ ہے کہ آج قورمہ کا مزا ذرا اترا ہوا تھا، پلاؤ کا رنگ اچھا نہیں تھا، زعفران کم تھی۔ طلبہ کی شکایت ہے کہ آج قورمہ میں کساؤ کم تھا، مگر ان کو سیدھا سادا بالکل غریبانہ کھانے دیے جائیں گے۔ مگر یہ کن کے لڑکے ہیں؟ آپ کو یہ خیال ہوگا کہ سڑک پر پڑے ہوئے بچے چن لیے گئے ہوں گے، ان کو تو اتنا بھی غنیمت ہے، مگر یہ وہ لڑکے ہیں جن کے والدین مصارف کے لیے ۲۵ روپے ماہوار دیتے ہیں۔ ۲۵ روپیہ ماہوار فیس ہے ایسی سخت زندگی سے رہنے کے لیے، ایسی مصیبت سے بسر کرنے کے لیے ان کے والدین ۲۵ روپے ماہوار اپنے گھر بیٹھے بھیجتے ہیں۔ ۳۰۰ لڑکے تعلیم پارہے ہیں اور ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے کہ جو مفلس ہو، جس کو وہ اسکالر شپ دیتے ہوں یا رشوت دے کر پڑھاتے ہیں، پچیس روپیہ دیے جائیں، کمبل اوڑھنے کے لیے، فرش خاک سونے کو، کھانے کے لیے ایک سادی غذا جس پر ہم مسلمان مشکل سے راضی ہوں گے، کام ان کا کیا؟ تعلیم وہ کیا پاتے ہیں؟ ان کی تعلیم یہ ہے کہ ایک طرف تو نہایت اعلیٰ درجہ کی سنسکرت اور وید اور ان کے جو علوم دینی ہیں ان کی تکمیل، مگر معاف کیجیے گا ہم لوگوں کی طرح نہیں کہ اتنے بڑے محقق سے بیٹھے ہیں، پوچھو کہ حضرت ایک حرف انگریزی بھی پڑھ سکتے ہو تو جواب ندارد۔ جب میں ٹرکی سے واپس آرہا تھا اتفاق سے گھر میں علالت تھی، ایک رات کو بارہ بجے تار آیا۔ میں نے اس کو کھولا، دل میں دغدغا پیدا ہوا کہ کیا واقعہ ہے، خدا جانے کیا تار ہے۔ خیر میں دوڑا ہوا سر سید مرحوم کے نواسے کے پاس گیا۔ انھوں نے پڑھ کر سنایا کہ یہ تار نواب علی حسن خاں صاحب نے بھوپال سے بھیجا ہے وہ آپ کو ٹرکی سے بخیر واپس آنے پر مبارک باد دیتے ہیں۔ یہ حال ہم مولوی صاحبان کا ہے، اور ان کو دیکھیے کہ سنسکرت میں تو یہ کمال اور اپنے مذہب کی پوری واقفیت اس کے ساتھ بھی انگریزی میں نہایت اعلیٰ درجہ کی تکمیل، اس حد تک کہ فیلپ جس میں ایک بڑا آرٹیکل لکھا ہے کہتا ہے کہ میں نے وہاں کے لڑکوں کو جا کے دیکھا کہ انٹرنس کلاس میں جو لڑکے پڑھتے ہیں وہ انگریزی میں سرکاری کالجوں کے بی۔ اے کی برابری کرتے ہیں۔ آلاتِ سائنس تمام جمع کیے گئے ہیں، بڑے بڑے لائق اور اعلیٰ درجے کے

پروفیسر ان کو موجودہ علوم و فنون سکھاتے ہیں اور سائنس کی تعلیم دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ریاضت، محنت اور جفاکشی ان کو سکھلائی جاتی ہے، ان کو دو وقت تالاب میں نہلایا جاتا ہے اور ان کو میلوں دوڑایا جاتا ہے اور ان کو مجاہدین بنایا جاتا ہے۔ کام ان کا کیا ہوگا؟ کام ان کا یہ ہوگا کہ نہ وہ سول سروس میں جگہ تلاش کریں گے، نہ وہ ہائی کورٹ کی ججی کے متوقع ہوں گے، نہ وہ کچہریوں میں جاکے خاک چھانیں گے، نہ وہ بیٹھ کر ممبر پر وعظ کریں گے، بلکہ ان کا کام یہ ہوگا کہ گلے میں ایک تھیلا ڈالے ہوئے ادنیٰ درجہ کے دیہاتوں میں جاکر جہاں زندگی بسر کرنا سخت مشکل ہے وہاں چنے چبا چبا کر بسر کریں گے اور اپنے مذہب کو پھیلائیں گے اور نعوذ باللہ مسلمانوں کو ہندو بنائیں گے، یہ ان کا مقصد ہے۔ اس کے اوپر ایک طرف تو ہماری فیلنگ یہ پیدا ہوتی ہے کہ ہماری ترقی ہو، دوسری طرف جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص سرندر ناتھ، مدن موہن، اپنی قوم کے لیے کام کر رہا ہے تو ہم کو اس کی تحقیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ کیوں ایسا کر رہا ہے اور مسلمانوں کو نقصان پہنچا رہا ہے؟ بلکہ ہم کو داد دینی چاہیے کہ اس کا جو فرض تھا اپنی قوم کے لیے اس کو وہ ادا کر رہا ہے؟ اب اس کے مقابلے میں ہم کو کیا کرنا چاہیے؟ ان کی (ہندوؤں کی) تو مختلف شاخیں قائم ہو چکی ہیں۔ مختلف شدھی انجمنیں قائم ہو چکی ہیں۔ کیفیت یہ ہے کہ میں نے ابھی کسی اخبار میں یہ اشتہار جو چھپوایا ہے، نہیں بھیجا ہے لیکن بااین ہمہ مسلم گزٹ نے اس کے پروف کو غلطی سے چھاپ دیا۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ فوراً آریہ مسافر میں اور پرکاش میں اپیل کی گئی کہ اجون پر مسلمان غضب ڈھائے دیتے ہیں، ہماری شدھی کو روکے دیتے ہیں، ہم جو مسلموں کو شدھ کرنا چاہتے ہیں اس کو روکے دیتے ہیں، اس کو روکے دیتے ہیں، لہٰذا ہم کو فوراً قوت کے ساتھ آمادہ ہو جانا چاہیے اور اس مہینے میں ہم کو دس ہزار روپیہ جمع کر دینا چاہیے۔ جہاں ایک واعظ مسلمانوں کا جائے وہاں ہم کو دو بھیجنے چاہئیں۔ یہ اعلان چار اخباروں میں جو یہاں آئے ہیں۔ آریہ مسافر، ارجن، پرکاش اور لیڈر میں میں نے دیکھا تھا۔ یہاں تو کچھ بھی نہیں ہوا اور وہاں یہ تیاریاں ہو گئیں ہیں۔ اس کی ایک شاخ فرخ آباد میں قائم ہوئی ہے۔ مجھے خود وہاں کے تحصیل دار نے بیان کیا تھا کہ میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا کہ وہاں کے نصابِ تعلیم میں قرآن مجید کی تفسیر حسینی داخل ہے۔ کیا کسی نیک نیتی سے، کیا اس لیے کہ قرآن مجید سے کوئی فائدہ حاصل کریں، کیا اس لیے کہ ہدایت لینا چاہیے۔ کیا مقصد تفسیر حسینی کے رکھنے سے؟ مگر اس کے مقابلے میں مسلمانوں میں کیا ہے پورا سناٹا۔ اگر مقابلہ کیا جاتا تو اس طرح سے کہ توپ کے مقابلے میں مکھیاں، یا اگر مقابلے کے لیے آمادہ ہوتے

ہیں تو ایسی صورت سے اور ایسی بے ترتیبی سے کہ کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔ آج ہندوستان میں پانچ یا سات کروڑ مسلمان ہیں، مگر ان میں سے اہل عرب یا اہل عجم بہت کم ہیں۔ زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو کہ یہاں کے لوگ تھے اور وہ مسلمان ہو گئے یا کیے گئے، جیسا کہ لوگ کہتے ہیں کہ جبراً وہ مسلمان کیے گئے، خیر یہ ایک تاریخی مسئلہ ہے، لیکن جہاں تک میں نے تحقیق کی ہے کوئی شخص، یہاں تک کہ ایک متنفس بھی، جبراً مسلمان نہیں کیا گیا۔ سخت جاہل ہے، جس کا یہ دعویٰ ہے کہ لوگ جبراً مسلمان کیے گئے۔ عالمگیر سے زیادہ لوگ کس کو متعصب کہہ سکتے ہیں۔ مگر عالمگیر کے متعلق خود الفنسٹن نے یہ لکھا ہے کہ عالمگیر نے جتنا بھی ظلم کیا ہو، مگر یہ مطلقاً ثابت نہیں ہے کہ تمام عمر میں ایک ہندو بھی جبراً مسلمان کیا ہو۔

واقعات اور حالات ایسے تھے آج آپ اس زمانے میں خیال فرمائیں کہ ہماری گورنمنٹ انگریزی میں کس قدر ٹالریشن اور کس قدر بے تعصبی سے کام لیتی ہے۔ کس قدر ہماری مذہبی فیلنگ کا خیال کرتی ہے۔ جس طرح ایک مسلمان پادری ہو کر اسلام کے خلاف کہہ سکتا ہے۔ اسی طرح اس سے زیادہ سختی کے ساتھ ایک مسلمان پادری پر اعتراض کر سکتا ہے۔ لیکن گورنمنٹ کبھی دخل نہیں دیتی، باوجود اس بے تعصبی اور باوجود اس چشم پوشی اور باوجود اس فیاض دلی کے کیا نتیجہ ہے کہ اس وقت تیس لاکھ آدمی عیسائی ہو گئے، جو مسلمان تھے یا ہندو تھے۔ کیا یہ جبراً عیسائی بنائے گئے ہیں؟ یورپ کا اور انگریزی خوانوں کا مذاق یہ ہے کہ جہاں دو واقعات کو انھوں نے ساتھ دیکھا یہ منطق کی غلطی کرتے ہیں، ایک کو علت دوسرے کو معلول قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے دیکھا کہ مسلمان ہندوستان میں آئے یہ ایک بات، ہندو بہت سے مسلمان ہو گئے یہ دوسری بات۔ اب انھوں نے ایک کو علت اور دوسرے کو معلول قرار دے لیا اور یہ نتیجہ نکالا کہ مسلمانوں نے جبراً ہندوؤں کو مسلمان کیا، لیکن اگر یہ دلیل صحیح ہے تو کہنا چاہیے کہ خدانخواستہ انگریزی گورنمنٹ نے بھی لوگوں کو جبراً عیسائی بنایا۔ لیکن حضرات اگر انگریزوں نے لوگوں کو جبراً عیسائی نہیں بنایا ہے تو غیروں کو کیا حق ہے کہ وہ کہیں کہ ہندو جبراً مسلمان بنائے گئے، یہ ایک واقعہ ہے کہ جب حضرت معین الدین چشتی اجمیر شریف میں تشریف لائے تو راج پوتانہ بھر میں کہیں اسلامی سلطنت نہ تھی کون جبر کرنے والا تھا، خواجہ صاحب کوئی تلوار نہیں رکھتے تھے کوئی لاؤ لشکر نہیں رکھتے تھے، ایک فقیر مسکین گوشہ نشین وہ آکر زمین میں پہاڑ کی کھو میں بیٹھ گئے اور راج پوتانہ بھر کو روشن کر دیا (چیرز) آج کیا حالت ہے؟ میں اجمیر گیا ہوں (آج اتنا تعصب اور منافرت

ہندو مسلمانوں میں پیدا ہو گئی) مگر ابھی ہم میں نے سنا ہے کہ ایک ہندو آتا ہے، پہلے جناب حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے مقبرے کا درشن کرتا ہے اس کے بعد اپنے شوالہ میں جاتا ہے، ان لوگوں نے اسلام کو پھیلایا، تاآج ہزاروں لاکھوں ہندوؤں کو دیکھتے ہیں کہ ان کے مزار پر جاتے ہیں اور سجدہ کرتے ہیں، جس کو ہم بھی جائز نہیں رکھتے، وہ اتنا اعتقاد و محبت رکھتے ہیں۔ کیا اس پر بھی آپ یقین کر سکتے ہیں کہ اسلام جبراً پھیلادیا گیا۔ انھوں نے اسلام کا ایک ایسا نمونہ دکھلادیا کہ دل ان کی طرف کھنچا جاتا تھا جیسا کہ جناب صدر نے کل فرمایا تھا، کیا نکتہ نفیس فرمایا تھا، میں برابر تاریخیں دیکھتا رہا، ہمیشہ حالات پڑھتا رہا، کبھی اس نکتے کی طرف میری نظر بھی نہیں پڑی تھی جیسا کہ صدر محترم نے فرمایا۔ آپ نے فرمایا کہ صحابہ کرام جب ایران میں گئے تو زبان سے بالکل ناآشنا تھے۔ کوئی صاحب یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہاں فارسی زبان میں تقریریں کرتے تھے یا شام میں تو بالکل گونگے تھے۔ وہاں کی زبان کے لحاظ سے مترجم کے ذریعے سے بولتے تھے، زبان کی ضرورت نہ تھی، ان کا جسم، ان کی صورت، ان کے عادت، ان کے اخلاق، ان کے حالات، یہ چیزیں تھیں جو لوگوں کو موہ لیتی تھیں اور لوگ مسلمان ہو جاتے تھے۔

ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ سفیر روم آیا صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مجمع میں پیغام لے کر۔ وہ شام کو وہاں آکر ٹھہرا اور رات کا بڑا حصہ اس نے وہاں بسر کیا۔ دیکھتا ہے ایک عجیب محویت طاری ہے عجب لوگ ہیں جن کے چہرے سے، جن کی باتوں سے، جن کے نور سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمین منور ہوئی جاتی ہے۔ جہاں دیکھتا خاکساری پاتا ہے پوچھتا ہے کہ امیر المومنین کہاں ہے؟ رئیس عساکر کہاں ہے؟ لوگ کہتے ہیں کہ کہیں زمین پر بیٹھا ہو گا۔ ایک غریب آدمی فرش خاک پر بیٹھا ہوا ہے، نہ کوئی تعظیم ہے نہ تکریم، اس رنگ کو دیکھ کر اس کا یہ عالم ہوا کہ اس نے کہا کہ حضرت میں تو اب واپس نہیں جاؤں گا، یہیں رہوں گا۔ انھوں نے کہا کہ یہ نقض عہد ہو گا، سفیر جب کہیں جایا کرتا ہے تو یہ بات بھی داخل عہد سمجھی جاتی ہے کہ وہ اسی طرح سے بخیر و عافیت واپس بھیج دیا جاوے، تاکہ یہ شکایت نہ ہو کہ وہ جبراً روک لیا گیا۔ اس واسطے اگر اسلام لاتے بھی ہو تو ایک دفعہ جاؤ اور پھر واپس آؤ۔ ان چیزوں نے مسلمان بنا دیا، تمام دنیا کو۔ یہ چیز تھی مسلمان بنانے والی۔

حضرت ابن عباس اسکندریہ کو فتح کرتے ہیں، مصر و قاہرہ فتح ہو جانے کے بعد حضرت عیسیٰ کا اسٹیچو یا بت بنا ہوا تھا، اتفاقاً ایک تیر کسی نے مارا، وہ آنکھ میں لگ گیا اس تصویر کی آنکھ پھوٹ

گئی، اس واقعہ کو مسلمان تو الگ خود مصر اور یورپ کے ایک مورخ نے جو عیسائی اور بشپ تھا اس نے لکھا، میں نے اس کی کتاب میں جو آکسفورڈ میں چھپی ہے خود دیکھا کہ پروفیسر یقاق نے لکھا ہے کہ لوگوں نے جاکر عمرابن عباس سے شکایت کی کہ آپ کے ایک شخص نے ہماری بزرگ تصویر کو توڑ ڈالا اور بے حرمتی کی، آپ نے واقعہ پوچھا، اس نے بیان کیا، تب آپ نے پوچھا کہ معاوضہ کیا چاہتے ہو؟ اس کا کیا کفارہ ہے؟ انھوں نے کہا ہم بھی جو محمد تمھارا نبی ہے اس کا ایک بت بنا کر اس کی آنکھ پھوڑ دینا چاہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اس سے تو کچھ حاصل نہیں، ہم لوگ تو تصویر کی تعظیم نہیں کرتے، تصویر بنانا تو کبھی ہمارے نزدیک قابل تعظیم نہیں، کیا تم اس بات پر راضی ہو سکتے ہو کہ ہم میں سے جس شخص کو چاہو اس کی ایک آنکھ پھوڑ دو؟ انھوں نے کہا ہم آمادہ ہیں۔ لیکن عیسیٰ ہمارا خدا ہے سب سے بڑا شخص تھا اس واسطے ہمارا ایک فوجی ادنیٰ درجے کے شخص کے ساتھ یہ برتاؤ کرنا پورا انتقام نہیں ہے اگر تمھارا رئیس عسکر یعنی سپہ سالار فوج اس بات پر آمادہ ہو تو البتہ ہم راضی ہو سکتے ہیں۔ حضرت ابن عباس نے پوچھا کون سی آنکھ اس کی پھوٹی تھی؟ اس کے بعد تلوار لی اور اپنی آنکھ پیش کی اور کہا اس کو نکال لو۔ تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور اس نے کہا کہ حیف ہے تم لوگوں سے مقابلہ کرنا۔ غرض کہ ان باتوں نے مسلمان بنا دیا۔

بہرحال جو لوگ کہ برکات اولیا سے، اور جو حضرت صوفیہ کرام کی روشنی کے اثر سے مسلمان ہوئے تھے، آج ان کی کیا حالت ہے؟ ہم نے جو تحقیقاتیں کیں ہیں، ہم نے جو رپورٹیں حاصل کی ہیں، ہمارے پاس ایک پشتارہ ہے نہایت کثیر خطوط کا جس میں سے چند نام میں نے اس اشتہار میں شائع کر دے ہیں، ان سے معلوم ہوا کہ وہاں کے نو مسلموں کی کیا حالت ہے؟ ان کے نام تو ہیں لچھمن سنگھ، دیال سنگھ اگر ان سے پوچھا جائے کہ تم جانتے ہو کہ خدا ہے کوئی؟ رسول خدا کوئی شخص گزرا ہے؟ نہیں معلوم، صحابہ کرام کوئی چیز نہیں، نہیں معلوم، نماز، روزہ وغیرہ کبھی سنا ہے نہیں، کسی کسی گاؤں میں مسجد ہے مگر اس مسجد کو گوبر سے لیپتے ہیں، بعض مسجدوں میں بت رکھے ہوئے ہیں جن کو وہ جاکر پوجتے ہیں، یہ حالت ہے، اگر کسی کو شک ہو تو جاکر دیکھ آئے یہ کس کا قصور ہے۔ ان کا یا ہمارا، ہم مسلمانوں کا، ہم واعظین کا، ہم داعیان کا؟

حضرات! یہ بے شبہ نہایت آسان بات ہے کہ ہم وعظ کہنے کے لیے ایسے مقامات پر جائیں گے جہاں ہم آرام و آسائش سے کھا سکتے ہیں، پی سکتے ہیں، ہماری دعوت ہو سکتی ہے، ہمارا کھانا جو ہم گھر میں کھاتے ہیں وہ کم از کم ہم کو وہاں ضرور مل سکتا ہے۔ مگر ان مقامات میں جانے کی

ضرورت ہی نہیں، ان مقامات میں جانا تو "گفتن زلف تو تحصیل حاصل ست"، جانا تو وہاں ہے جو قصبات اور شہروں سے پندرہ پندرہ بیس بیس میل پر مقامات ہیں جہاں خود ہمارے ندوے کا ایک طالب علم عبدالودود گیا ہے۔ اس نے خود بیان کیا ہے کہ میں تین وقت وہاں رہا ہوں کوئی چیز کھانے کو نہیں ملی۔ وہاں نہ کوئی دوکان تھیں، نہ بازار، تین وقت متصل فاقہ کرنا پڑا، کسی نے مجھے روٹی نہیں دی۔ چوتھے وقت شہر میں آکر میں نے کھانا کھایا، اسی جگہ جانے والا تھا۔ تلاش کرنا چاہیے۔ وہاں جانے کے لیے لوگ تیار نہیں ہیں۔ خطوط جو میرے پاس آتے ہیں آپ ان کو پڑھیے اس میں یہ ہے کہ شہر میں تو آپ واعظ بھیجتے ہیں، شہروں میں آپ مناظرہ کرتے ہیں، آپ ان مقامات میں علاج کرتے ہیں جہاں مریض ہی نہیں، جہاں بیماری ہے، جہاں موت ہے، وہاں کیا ہو رہا ہے؟

حضرات! میرے اوپر ابتدا اس اثر کی یوں ہے کہ دو سال ہوئے کہ شاہجہان پور سے ایک خط میرے پاس سفیر خاں سوداگر کا آیا تھا کہ شاہجہان پور سے آٹھ کوس پر ایک گاؤں ہے جمال پور، وہاں کے رئیس راجپوت جو مسلمان ہیں وہ ہندو ہونا چاہتے ہیں۔ آریہ وہاں پہنچ گئے ہیں۔ ان کو ہندو کرنا چاہتے ہیں۔ آپ جلد آیئے اور مدد کیجیے۔ انھوں نے اس کے ساتھ ہی دہلی کی انجمن ہدایت الاسلام کے مولانا عبدالحق حقانی کو لکھا تھا۔ وہاں سے دو واعظ تشریف لائے تھے اور میں ندوہ سے گیا جس وقت میں یہاں سے چلا ہوں میری جو حالت تھی نہایت سخت، یہ طلبہ ندوہ کے جو یہاں بیٹھے ہیں وہ اس کے شاہد ہوں گے کہ میں نے اس وقت کوئی گالی، کوئی سب وشتم نہیں اٹھا رکھی تھی جو میں نے ان ندوہ والوں کو نہ سنائی ہو گی کہ اے بے حیاؤ اور اے کم بختو ڈوب مرو، یہ واقعات پیش آئے ہیں ندوہ کو آگ لگادو اور علی گڑھ کو پھونک دو ایسی الفاظ میں نے اس وقت کہے تھے جو آج کہتا ہوں، اس وقت نہایت افسوس میں میں یہاں سے گیا تھا۔ وہاں جاکر میں نے پوچھا کہ کیا واقعہ ہے۔ لوگوں نے یہ بیان کیا کہ آریہ اس گاؤں میں آئے ہوئے ہیں ان کو ہندو بنانا چاہتے ہیں مسلمان علماء کو بلوایا ہے۔ جمال پور سے ایک کوس پر خیمہ کھڑا کیا گیا ہے۔ تین سو روپے کھانے میں صرف ہوئے ہیں۔ چندا وغیرہ کیا گیا ہے وہ نومسلم بیچارے یہ کہتے تھے کہ مناظرہ، ہم جانتے نہیں، پڑھے لکھے نہیں، آپ ہمارے اس گاؤں میں آیئے اور یہاں آکر ہم کو سمجھایئے، جو باتیں ہمارے دل میں ہوں گی، ہم آپ سے کہیں آپ ان کا جواب دیجیے۔ پھر جو کچھ بھی ہو یہ واقعہ ہے اس میں ذرا بھی غلط نہیں کہتا ہوں، اس کے شاہد سید وزیر حسن صاحب وکیل شاہجہان پور ہیں، وہ اس

کی گواہی دے سکتے ہیں، اس پر ایک شخص راضی نہ ہوا، گاؤں میں جائے اس بات کا کوئی ڈر نہیں تھا کہ وہ لوگ خدانخواستہ فوجداری کریں گے یا ماریں گے، کیوں کہ پولیس اور تحصیل دار وہاں موجود تھے کہ امن وامان قائم رہے۔

میں نے بالآخر یہ کہا کہ بھائیو مجھے تو پالکی میں ڈال کر وہاں لے کر چلو میں چلتا ہوں لیکن کوئی شخص نہیں لے گیا، غرض تین دن تک میں وہاں پڑا رہا، بالآخر ان لوگوں نے اعلان کر دیا کہ ہم ہندو ہیں۔

کیا یہ واقعات آپ کے کانوں میں پڑتے ہیں اگر نہیں پڑتے تو آپ کی بے خبری کی داد دینی چاہیے اور اگر پڑتے ہیں تو آپ کا دل جل نہیں جاتا پھک نہیں جاتا، کڑھ نہیں جاتا۔ اس سے زیادہ کیا بے چینی ہوگی؟ کیا یہ باتیں ایسی ہیں کہ جس سے چشم پوشی کی جاوے؟ لیکن اصل میں غور یہ کرنا ہے کہ جب انسان کسی مشکل میں گرفتار ہو جائے تو اس کو کرنا کیا چاہیے؟ یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کو احساس نہیں ہوتا خدا کے فضل سے اب بھی اولاً مسلمانوں میں علماء و فضلا ہیں جو جا بجا جاتے ہیں، دوسرے انجمنیں قائم ہو گئی ہیں۔ مثلاً انجمن تبلیغ الاسلام اور انجمن ہدایت الاسلام دہلی اور انجمنیں ہیں واعظ ہیں، مگر ایک بات مجھے یہ کہنا ہے جس کے لیے میں نے یہ اشتہار دیا تھا اور آپ صاحبان سے خواہش کی تھی کہ ندوہ میں آیئے مجھے آپ سے مشورہ کرنا ہے اور باتیں پوچھنا ہے۔ بعض صاحبان نے اس میں بہت دلچسپی لی ہے، مثلاً مولوی علی احمد صاحب آگرہ۔

غور یہ کرنا ہے کہ آیا یہ تدبیریں کافی ہیں یا نہیں اور یہ پراگندہ کوششیں حقیقت میں قوت بخش ہیں یا نہیں؟ جو تدابیر اس وقت اختیار کی گئی ہیں ان کو آپ غور سے سنیے، آپ کا کھانے کا وقت آتا جاتا ہے خیر کچھ پروا نہیں، آپ کو زحمت ہوتی ہے، اس کو تھوڑی دیر کے لیے برداشت کر لیجیے، یہ مسئلہ، حیات و ممات اسلام کا ہے، فقط اس وقت ہی نہیں بلکہ گھروں میں جائیے اور ان تدبیروں کا جو یہاں پیش کی جائیں ان کا لحاظ کیجیے اور سوچیے کہ اب کیا کرنا ہے؟ ایک مرتبہ صحیح خاکہ بن جاتا ہے، تمام ملک میں اس کے لیے دورہ کرنا ہے، ایک تدبیر تو یہ کی گئی تھی کہ علماء واعظین رکھے گئے وہ شہروں میں بھیجے گئے اور انھوں نے مناظرے کیے، ایک لحاظ سے یہ تدبیر بہت مفید ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ان کے حملے ہر پہلو سے ہیں۔ ایک پہلوان کا یہ ہے کہ قرآن مجید پر اعتراض اور مسائل اسلام پر اعتراض، قرآن شریف کے احکام پر اعتراض، شہروں میں جو بڑی بڑی انجمنیں قائم ہیں اور مناظرے ہوتے ہیں ان کے لیے اکثر ایسے لوگ ہیں جیسے مولوی ثناء اللہ صاحب

پانی پتی اور اور لوگ ہیں جنھوں نے اس میں خاصی مہارت پیدا کی ہے وہ جانتے ہیں اور مناظرے کرتے ہیں - یہ تدبیر ایک حد تک مفید ہے اور ایک حد تک کام کر رہی ہے - لیکن وہ جو سوال ہے ان دیہات میں جانے کا اور وہاں کام کرنے کا اس کے متعلق میں نے جتنی رپورٹیں پڑھی تھیں وہ یہ ہیں کہ یا تو وہ ان ہی مقامات پر گئے ہیں جہاں کھانا آسانی سے مل سکتا ہے یا اگر ایسے مقام پر گزر ہو گیا جہاں زیادہ مشکلات و دشواریاں تھیں، انھوں نے جو خانہ پری کی ہے میں نے اس کو پڑھا تو اندازہ ہوا کہ کسی جگہ ایسے گاؤں میں دس دن بھی کام نہیں کیا، کیوں کہ ان تکلیفوں کو برداشت کرنے کی عادی نہیں ہیں، آپ لوگوں نے جو ہم لوگوں پر نوازشیں کیں ہیں - اب وہ ہمارے لیے ظلم ہو گئیں، آپ نے ہمارے علماء کی اب تک جو خاطرداریاں کی ہیں، پالا پوسا ہے اور تربیت دی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب تک نرم گدے نہ ہوں، پلنگ و چارپائی نہ ہوں اس وقت تک ہم سے رہا نہیں جاتا، اسی وجہ سے دیہاتوں میں جانا سخت مشکل ہے - اب صرف دو تدبیریں نظر آتی ہیں - ایک یہ کہ ایسے دیہات میں نو مسلموں کے لیے مسلمانوں کے لیے چھوٹے چھوٹے مکاتب قائم کیے جائیں - ۵ - ٦ - ۷ گاؤں کا ایک حلقہ قرار دے کر ایک صدر مقام جہاں سے آدھ آدھ کوس کے فاصلے پر دیہات ہوں وہاں ایک مکتب ہو، جس میں نہ آپ کا یہ فلسفہ یونانی اور نہ انگریزی کا ایک لفظ ہو بلکہ صرف قرآن شریف کا متن اور اردو اتنی کہ جس سے محض مسائل عبادت و نماز و روزہ اور وہ بھی نہایت آسان آسان، مشکل اور دشوار مسائل فقہ بھی نہیں، یہ ان کو پڑھائے جائیں، بلکہ حضرات میں زور کے ساتھ اس بات کو کہتا ہوں، چاہے حامیاں اردو بگڑیں یا نہیں، مگر ہم کو ناگری میں ان رسالوں شائع کرنا چاہیے، وجہ اس کی کیا ہے -

ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص مزدور اگر اردو پڑھنے بیٹھے تو اس کے چار برس صرف ہو جاتے ہیں، بیچارہ کب تک پڑھے گا، لیکن ہندی کے لیے کیا مشکل ہے اگر یہ ایک حرف بھی روز سیکھے تو اٹھائیس تیس دن میں سیکھ لے گا کیوں کہ اس میں مفرد حروف ہیں - اگر سورۃ قرآن شریف کے علاوہ جو اپنی عبارت میں مخصوص ہے بقیہ مسئلہ مسائل کو ہم ناگری میں کر دیں تو اس میں کیا دشواری ہے، کوئی ہرج نہیں - آپ جانتے ہیں کہ چین میں دو کروڑ مسلمان ہیں، ان کی تمام تصنیفات چینی زبان میں ہیں - قرآن شریف کا ترجمہ تک چینی زبان میں ہے - یا تو اس قسم کے مکاتب جابجا قائم کیے جائیں یا دوسری یہ تدبیر ہے کہ ایسے لوگ جو بڑے عالم نہ ہوں، جو فارغ التحصیل نہ ہوں، جو بہت جدید طالب علم نہ ہوں، اس واسطے کہ اگر ایسے ہوں گے تو پانچ دس

روپیہ میں وہ آپ کا کام نہیں کر سکتے، ان کی شان کے بھی خلاف ہے، بلکہ ایسے معمولی خواندہ آدمی ہوں کہ جو اردو فارسی معمولی پڑھ لکھ لیتے ہوں، ان کو ایک ٹریننگ کے طور پر ندوہ میں یا مدرسہ الٰہیات کانپور میں ایک سال بھر مزید تعلیم وظیفے دے کر دلائی جائے اس کے بعد دس دس بارہ بارہ روپیہ تنخواہیں مقرر کر کے ان کو دیہات میں بھی بھیجا جائے کہ دو دو تین تین مہینے قیام کریں اور وعظ کریں اور سمجھائیں، مل جل کر نصیحت کریں اور زبانی باتوں میں تعلیم دیں، جب ایک گاؤں درست ہو جائے گا تو دوسرے گاؤں پر اثر ہوگا۔

یہ کام تدریج کا ہے۔ صحیح خیالات اور تدبیروں سے کام کیجیے۔ ہزار نشانے ماریئے، اگر تیر نشانے پر نہیں پڑتا تو سارا زور آپ کا بے کار جاتا ہے، ساری تیراندازی فضول جاتی ہے۔ اگر آپ راستہ چلتے ہیں اور سیدھے راستے پر پڑ گئے تو چاہے آپ چیونٹی کی چال بھی چلیں گے تو توقع ہے کہ ایک دن آپ منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے۔ لیکن آپ ریل کی چال چلتے ہیں اور الٹے چلتے ہیں تو آپ کی تمام کوششیں قومی اور ملکی خواہ کیسی ہی زور کے ساتھ ہوں حقیقت میں اگر وہ راستہ سے ہٹی ہوئی ہیں تو آپ منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔

اب میں اس کے متعلق اس وقت آپ سے کچھ بھی تحریک نہیں کرتا مگر میں یہ کہتا ہوں کہ جتنے بزرگ یہاں بیٹھے ہوئے ہیں ان کو اپنی اپنی جگہوں پر جا کر ان باتوں پر غور کرنا چاہیے، سوچنا چاہیے، ہر شہر میں اس کے متعلق کمیٹیاں قائم کرنا چاہیے، شہر کے لوگوں کو ایسے کم درجہ کے واعظین اور مدرسین تلاش کرنا چاہیے۔

حضرات میں کہہ سکتا ہوں کہ گو میں ندوۃ العلماء کا فدائی ہوں، مگر اس کام کے لیے کاش میرے ایک پاؤں کے سوائے تمام جسم بھی کام آ سکتا تو میں اور زیادہ مشکور ہوتا کیوں کہ میں سب کام سے زیادہ اس تحریک کو مقدم سمجھتا ہوں اس میں کچھ چندہ جمع کرنا ہے بلکہ ایثار النفس والے آدمی پیدا کیے جائیں۔ شاید ایسا وقت آئے گا کہ ایسے لوگ پیدا ہو جائیں گے جو ماہوار کچھ رقم چار آنے، آٹھ آنہ، ایک روپیہ خاص اس کام کے لیے مقرر کر دیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں نے کوئی نوٹس چندہ کا نہیں دیا، لیکن محض ایک ذرا سا نوٹس دینے سے کہاں کہاں نومسلم پائے جاتے ہیں لوگوں نے میرے پاس خطوط بھیجنے شروع کر دیے۔ کسی نے لکھا کہ ایک روپیہ ماہوار لکھ لیجیے (ایک صاحب نے ایک روپیہ پیش کیا بطور چندہ کے)۔ میں جوش کا فوری اندازہ نہیں کیا کرتا، چندے دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک فوری جیسے کہ ندوہ کی عمارت کے لیے آج صبح دیا جا چکا ہے،

اس کو ہم نہایت غنیمت سمجھیں گے، اس وقت فوری جوش کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے بعد اگر آپ کا جوش ٹھنڈا ہو جائے تو کچھ پروا نہیں، لیکن ایک وہ ضرورتیں ہوتی ہیں جو مستمر ہیں یا پائدار ان کے لیے کوئی ٹیکس ہونا چاہیے آپ کے قلب پر اور دل پر ثبت ہونا چاہیے کہ وہ ٹیکس ہے۔ اس وقت میں دیکھتا ہوں کہ اتنے صاحب یہاں جو تشریف فرما ہیں پانچ چھ سو آدمی ہوں گے، اگر یہاں سے جانے کے بعد جو کچھ بھی تجویز ہو اس کے متعلق مجھے خط لکھیں، کسی قسم کے رائے مجھے اس کے متعلق دیں، کوئی تدبیر بتلائیں، کمیٹی قائم کریں اور مجھ کو اطلاع دیں، مجھ کو خود وہاں بلائیں خود ایک روپیہ ماہوار کے لیے مجھے وہاں سے خط لکھیں اور اپنے دوستوں کو اس کے لیے آمادہ کریں تب میں سمجھوں گا کہ آپ کے قلب پر صحیح اثر ہوا ہے۔ اس سے ہم کو کام لینا ہے، یہ ہے دلی جوش، ورنہ سخن سازی کا کوئی نتیجہ نہیں۔

ریاست بھوپال سے علی گڑھ کالج اور ندوہ کو جو فائدہ پہنچ رہا تھا وہ امین زبیری صاحب کی وجہ سے تھا لہٰذا مولانا نے ان کی خدمات کو بہت سراہا۔

مولانا نے سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) لکھنے کے سلسلہ میں ریاست سے عطیہ کی درخواست کی لیکن درخواست کرنے کے بعد ان کی خودداری جاگ اٹھی اور انھیں بار محسوس ہو۔

۱۷۔ اپریل کو مولانا کان پور جا رہے تھے کیوں کہ نومسلموں کو مرتد کرنے کے لیے آریہ بڑا زور صرف کر رہے تھے۔ مولانا کا ارادہ تھا کہ تمام اضلاع میں دفاعی انجمنیں قائم کریں اور دیہاتوں میں مکاتب قائم کریں جن میں دینی تعلیم ہو اور نومسلم اور ان کے بچے ان کے فتنے سے محفوظ رہیں۔ چوں کہ سخت گرمی شروع ہو گئی تھی اس لیے مولانا کا یہ دورہ مختصر تھا۔ کان پور ہی سے بھوپال جانے کا ارادہ تھا اور بھوپال سے بمبئی یا بنگلور جانے کا ارادہ تھا۔ چوں کہ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق کتابیں بہت تھیں۔ اس لیے ساتھ نہ لے جا سکتے تھے پھر اس کے لیے اسٹاف کی بھی ضرورت تھی۔ اس لیے سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا باقاعدہ کام بارش سے شروع کرنے کا ارادہ تھا۔ لیکن مولانا یہ سوچ رہے تھے کہ یہ کام دو سال میں کیسے ختم ہو گا گویا اپنی صحت کی خرابی کی وجہ سے ان کو دو سال سے زیادہ زندہ رہنے کی امید نہ تھی پھر ایک آنکھ میں پانی (موتیا بند) بھی اتر رہا تھا۔ اس لیے چاہتے تھے کہ کچھ کر لیں ورنہ جتنا وہ کر سکتے تھے (اپنے مطالعہ، وسعت معلومات، کتابوں کی فراہمی اور تلاش و تحقیق مستشرقین کے اعتراضات کے مدلل جوابات کی وجہ سے) آئندہ کوئی ایسا نہیں نظر آ رہا تھا جو اس کام کو کرتا۔ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق

کتابوں کی فہرست مولانا تیار کرا رہے تھے بہت سی کتابیں ندوہ میں موجود تھیں اور جو موجود نہیں تھیں ان کو منگوانے کا ارادہ تھا۔ سیرۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خود ہی چھپوانے کا خیال تھا (۴۸)۔

مولانا نے اسی زمانے میں ایک عام خط اپنے احباب کو لکھ کر بھیجا جس میں انھوں نے لکھا کہ سیرۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) جو زیر تصنیف ہے اس سلسلے میں یورپ کے مصنفین نے جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لکھا ہے اس سے پوری واقفیت حاصل کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ان کے تائیدی بیانات کو حجت الزامی کے طور پر پیش کیا جائے اور جہاں غلطیاں یا بددیانتیاں کی ہیں ان کی پوری قوت کے ساتھ پردہ دری کی جائے۔ اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق انگریزی تصانیف کثرت سے مہیا کی گئی ہیں۔ لیکن چوں کہ سب کا اردو ترجمہ ممکن نہیں اس لیے یہ طے پایا کہ دلچسپی رکھنے والے حضرات کو ایک ایک کتاب بھیج دی جائے تاکہ وہ قابل ترجمہ مقامات پر نشانات کر دیں اور پھر اس کو دفتر کے مترجمین ترجمہ کر لیں۔ یہ بھی دریافت کیا کہ کیا مکتوب الیہ اس نیک کام میں حصہ لینا پسند کریں گے (۴۹)۔

مولانا ابھی تک (۱۰۔ مئی ۱۹۱۲ء) بمبئی نہ جا سکے تھے۔ وہاں ندوہ کے سلسلے میں کوئی نہ کوئی بات ہوتی رہتی تھی جس سے سکون و اطمینان میں فرق پڑتا تھا۔ لہٰذا اسٹاف ساتھ لے کر بمبئی جانے کا ارادہ تھا۔ سید سلیمان ندوی، خوش نویس اور انگریزی مترجم بھی ساتھ جانے والے تھے۔

کرنل عبید اللہ خاں صاحب صاحبزادہ بھوپال نے مولانا کے ماہانہ وظیفہ (بسلسلہ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم) کے سلسلے میں بڑی کوشش کی تھی اس لیے مولانا نے بھوپال جا کر ان کا شکریہ ادا کرنے کا ارادہ کیا۔ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلے ایڈیشن کو مولانا اپنی ہی ملکیت رکھنا چاہتے تھے اور اس کے بعد کے ایڈیشن ندوہ یا اشاعت اسلام کے لیے وقف کرنے کے خواہاں تھے۔ اس کے علاوہ کسی صورت کو قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ بھوپال سے ماہانہ وظیفے کو قبول کر لیا تھا لیکن دوسرے حضرات نے جو ماہانہ وظیفے یا یک مشت رقمیں اس مد میں بھیجیں وہ مولانا نے واپس کر دیں اس پر لوگوں کو شکایت ہوئی کہ مولانا اس سعادت میں ان کو شریک نہیں کرتے (۵۰)۔

اب مولانا بمبئی آ گئے تھے اور ان کو سیرت کے سلسلے میں بھوپال سے ماہانہ رقم اب نہیں ملتی تھی۔ اس لیے پریشان تھے کتابوں کی خریداری کے سلسلے میں البتہ رقم آ گئی تھی، لیکن وہ بھی

آدھی آئی تھی، اس لیے اس کو بھی کام میں نہیں لائے۔ بغیر رقم دستیاب ہوئے انگریزی گریجویٹ کو اپنے پاس نہیں بلا سکتے تھے کیوں کہ سفر خرچ بھیجنا تھا۔

یہاں پہنچ کر سیرۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کام ابھی شروع نہیں کیا تھا، کیوں کہ رقم نہ آنے سے طبیعت مطمئن نہ تھی لیکن ۱۷۔ جون سے کام شروع کر دینے کا ارادہ تھا۔

اسی زمانے میں بغدادی پیر صاحب بمبئی آئے ہوئے تھے۔ ان کے جلوس اور روشنی پر ۷۵ ہزار روپے خرچ ہوئے تھے اور وہ ۱۷۔ جون کو اجمیر تشریف لے جانے والے تھے ریاست بھوپال نے بھی ان کی خدمت میں دو ہزار روپے بھیجے تھے۔ مولانا سے پیر صاحب نے خلوت میں پورے ایک گھنٹہ گفتگو کی اور اس درمیان کسی کو آنے نہیں دیا۔ مولانا نے ان کو بڑے مفید مشورے دیے اور انھوں نے قبول کیے اور خیال تھا کہ کوئی مفید نتیجہ نکلے گا۔

مولانا کو یہاں تفسیر فتح الباری مع تفسیر ابن کثیر کی ضرورت پڑی تو امین زبیری صاحب سے لانے کو لکھا کیوں کہ اپنے ساتھ بمبئی نہ لا سکے تھے (۵۱)۔

اب مولانا نے شعر العجم بالائے طاق رکھ دی تھی اور بمبئی میں قیام کی غرض سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یک سوئی سے بیٹھ کر لکھنا تھا۔ سید سلیمان ندوی اور اسٹاف کے دوسرے ممبروں کو جلد بلانے والے تھے جن میں ایک گریجویٹ بھی تھے۔ مولانا کی بڑی خواہش تھی کہ مسٹر مہدی حسن چھٹی لے کر بمبئی آجائیں۔ تمام مصارف سیرتؐ کے دفتر کے ذمہ ہوں اور اس کے متعلق انگریزی تصنیفات کے ترجمہ اور اقتباسات سیرت کے لیے دیں لیکن وہ جانتے تھے کہ ان کا آنا محال ہے۔ اس زمانے میں مولانا کا قیام پالن جی ہوٹل میں تھا (۵۲)۔

اب مولانا کی آنکھ کی کمزوری بہت بڑھ گئی تھی۔ لہٰذا خود نہیں لکھ پاتے تھے بلکہ لکھاتے تھے اور اس کی عادت نہ ہونے کی وجہ سے دشواری ہو رہی تھی۔ البتہ ابھی مطالعہ کر سکتے تھے۔ سیرت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق تمام انگریزی کتابیں خرید لی تھیں اور بعض کے ترجمے بھی کرا لیے تھے۔ یورپین مورخوں نے جو ہوائی قلعے بنائے تھے ان پر ہنسی آتی تھی۔ مولانا نے اب گریجویٹ جو ایم۔ اے کے طالب علم تھے۔ ان کے لیے سفر خرچ بھیجا دیا تھا۔

مولانا کو بڑی حیرت تھی کہ لوگوں نے بغدادی پیر صاحب (پیر ابراہیم سیف الدین) کے جلوس اور روشنی پر تو ایک رات میں پچھتر ہزار روپیہ صرف کیا اور عربی مدرسہ جو ان کی آمد کی یادگار کے طور پر کھلنے والا تھا اور جس کا تخمینہ پندرہ لاکھ روپیہ تھا اس کے لیے صرف سات ہزار

دریافت کیں تو مولانا نے پورا طریقہ کار لکھا۔ ان کا خیال تھا کہ کم از کم چار برس میں تیار ہو سکتی ہے اور شاید خود اپنے خرچ سے طبع کرائیں۔ کبھی کبھی اس کا نمونہ شائع کرانے کا ارادہ تھا کہ جس سے ملک کے لوگ کام کی اہمیت اور نوعیت سے واقف ہوں سکیں۔ بالکل جدید طرز پر لکھنے کا ارادہ تھا لیکن روایات کی تنقید محدثانہ اصول پر رجال وحدیث کی کتابوں سے کرنے کا ارادہ تھا اور اس طرز کی عربی میں بھی کوئی کتاب نہ تھی کہ جس میں صحیح روایتوں کا التزام کیا گیا ہو کیوں کہ اکثر مولانا کی پڑھی ہوئی تھیں۔

اب مولانا کی آنکھوں میں تیزی سے پانی اتر رہا تھا۔ ایک بیکار ہو چکی تھی۔ دوسری ابھی کچھ کام دے رہی تھی (۶۴)۔

مولانا کے سامنے سرائے میر کے مدرسۃ الاصلاح کا معاملہ مولوی حمید الدین فراہی نے پیش کیا تو مولانا نے لکھا کہ لوگوں نے نیشنل اسکول کے ساتھ باوجود قرب حقوق اور مولانا کی سختی کے، وعدے کے مطابق مدد نہ کی تو سرائے میر کے مدرسے کے لیے کیا کریں گے۔ چندہ لکھا دیں گے مگر دیں گے نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہو سکتا تھا کہ مولانا خود اعظم گڑھ جائیں اور سر پر سوار ہو کر کوشش کریں تو ممکن ہے کچھ اثر ہو۔

سیرت کے اسٹاف میں خوشنویس کی تنخواہ میں دوسری مدوں کی وجہ سے کمی کر دی گئی تھی جس کی وجہ سے صرف ۱۵ روپیہ رہ گئی تھی۔

مولانا نے مولوی حمید الدین کو طبقات ابن سعد کی طرف توجہ دلائی کہ اس میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نو میں سے پانچ ازواج کو الگ کر دیا تھا گو ان کو طلاق نہیں دی تھی حتیٰ کہ ان ازواج کے نام بھی لکھے ہیں۔ لیکن نزول آیت کے زمانے کا تعین نہیں ہوتا۔

اس زمانے میں مولانا نولدکی اور گولڈ زیہر کا ترجمہ دیکھ رہے تھے اور ان کی قیاس آرائیوں پر تعجب کر رہے تھے۔ مثلاً اس میں یہ بھی تھا کہ آپؐ نے صحابہؓ کو حبش اس لیے بھیجا تھا کہ ابرہہ نے کعبہ کو ڈھانا چاہا تھا تو سلطنت حبش سے سازش کر کے رؤسائے قریش کو نقصان پہنچایا جائے مگر پھر خیال ہوا کہ وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بے دخل کر دے گا۔

آج کل مولانا کا معدہ بہت خراب تھا اور بھی دوسرے وجوہ سے وہ علی گڑھ جا کر رہ سکتے تھے مگر کتابوں کا انبار لاد کر نہ لے جا سکتے تھے (۶۵)۔

مولوی امین زبیری نے مولانا سے کسی کتاب پر ریویو لکھوایا تھا۔ مولانا نے ناقدانہ لکھ

چندہ ہوا لیکن مزید چندے کا امکان تھا۔

اگر مولانا کو اپنی صحت کی خرابی سے اندیشہ تھا تو بیگم بھوپال کو بھی ان کے زندہ نہ رہنے کا خطرہ تھا۔ اس لیے اب کی بھوپال کے سفر میں انھوں نے مولانا سے خواہش کی کہ وہ اپنا جانشین بھی تیار کر لیں۔ مولانا کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ کارلائل کی کتاب (۵۳) کا عربی ترجمہ ہو گیا تھا۔ ترجمہ مولانا کو پسند آیا اور وہ سیرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں مولانا کے کام کی چیز تھی۔ اب مولانا کو کتابوں کی خریداری کے سلسلے میں دو ہزار روپے صاحبزادہ بھوپال نے بھیج دیے تھے (۵۴)۔

اب سید سلیمان ندوی بھی بمبئی آگئے تھے اور کام ہو رہا تھا۔ مولانا مدراس جانے والے تھے، مگر ڈھاکہ یونیورسٹی کی سب کمیٹی میں بنگال گورنمنٹ نے ان کو مدعو کیا اور وہاں کے لوگوں نے بھی لکھا کہ آکر مدرسہ عالیہ وغیرہ کی ابتری کی اصلاح کریں۔ اس لیے مجبور آجانے کا ارادہ کیا۔ اسی سلسلے میں چاہتے تھے کہ سیرت کے لیے ایشیاٹک سوسائٹی کی بعض کتابیں دیکھ لیں گے۔ اسی زمانے میں مارگولس پروفیسر آکسفورڈ کی لائف آف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب بھی مولانا نے پڑھی اور اس کی دروغ گوئی پر تعجب ہوا۔ سیرت کے سلسلے میں مولانا کے پیش نظر تین کتابیں اصل ماخذ تھیں، سیرت ابن ہشام، طبقات ابن سعد، تاریخ طبری۔ ان کی تمام روایتوں کا استقصا کر کے ان کے اسماء الرجال کو تہذیب سے مرتب کرا رہے تھے تاکہ روایتوں کے انتقاد میں سہولت ہو اور یہ کام سید سلیمان ندوی کے سپرد کیا تھا۔ خود مولانا سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) لکھنے میں مصروف تھے۔ انگریزی کتابوں کا ترجمہ بھی ہو رہا تھا (۵۵)

مولانا ۲۶۔ جولائی کو کلکتہ جارہے تھے وہاں سے ۵۔ اگست کو ڈھاکہ یونیورسٹی کے متعلق جلسے میں شرکت کرنا تھی جس کے لیے بنگال گورنمنٹ نے ان کو مدعو کیا تھا۔ سید سلیمان ندوی کو محمڈن کانفرنس منعقدہ مدراس میں شرکت کے لیے ۲۵۔ جولائی کو روانہ کیا۔ مولانا چاہتے تھے کہ پروفیسر عبدالقادر سیرتؐ کے سلسلے میں ان کی قلمی امداد کریں (۵۶)۔

مولانا نے حبیب الرحمن شروانی صاحب کو بھی لکھا کہ وہ سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سلسلے میں قابل ترجمہ حوالہ اور اقتباسات کو بھیجیں تاکہ اس سے سیرت کے لکھنے میں مدد ملے (۵۷)۔

اب مولانا بمبئی واپس آگئے تھے۔ مولانا کو یورپین مصنفین کی سیرت کے متعلق کتابوں

میں بیہودہ باتیں دیکھ کر بڑا تعجب ہوا اور ان کی دیانت داری کی قلعی کھل گئی۔ لیکن ان کا ارادہ ان باتوں کو چھیڑنے کا نہ تھا۔ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کو چار جلدوں میں لکھنے کا ارادہ تھا اور ایک جلد لوگوں کے لگائے ہوئے الزامات اور افترا کے لیے مخصوص کر دی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ہر قسم کے مطالب سیرتؐ میں آجائیں یعنی تمام مسائل مہمات پر ریویو ہو اور قرآن مجید پر پوری نظر رکھی جائے اور اس کتاب کا نام مولانا کے ذہن میں اس وقت دائرۃ المعارف النبویہ موزوں تھا کیوں کہ اس کو ایک قسم کی انسائیکلوپیڈیا بنانے کا ارادہ تھا۔ اگرچہ یہ لمبا نام تھا اور اس کے لیے ابھی قطعی فیصلہ نہیں کیا تھا۔

ندوہ والوں کو اب اصلاح کا خیال پیدا ہوا تھا اس کے لیے مولانا چاہتے تھے کہ شروانی صاحب پورے دو ہفتہ لکھنو میں قیام کریں اور ہر ایک مسئلہ طے ہوا (۵۸)۔

بیگم بھوپال چاہتی تھیں کہ عورتوں کے متعلق ایک کتاب تیار کی جائے اس کے لیے امین زبیری نے مولانا سے دریافت کیا تو مولانا نے لکھا کہ وہ اعانت کے لیے تیار ہیں اور اس کے لیے اصابہ جلد اخیر، ابن خلکان، نفح الطیب اور عقد الفرید بہت مفید اور کار آمد ہیں۔ ایک کتاب اسی زمانے میں مصر میں چھپی تھی جو بہت ضخیم اور اچھی تھی مگر اس کا نام اس وقت مولانا کو یاد نہ تھا لکھنو پہنچ کر اس کا نام لکھنے کا ارادہ تھا۔ ایک اور قدیم کتاب بلاغۃ النسا بھی تھی جس میں مشہور خاتونان عرب کے لکچر جمع کر دیے گئے تھے۔

عورتوں کے متعلق بڑی اچھی کتاب تیار ہو سکتی تھی۔ بشرطیکہ اس کی ترتیب کے لیے مولانا سے مشورہ کر لیا جاتا جس کے لیے مولانا ہر وقت تیار تھے۔ دوسرے اس کام کے سلسلے میں عربی داں کی بھی ضرورت تھی اور اس کے لیے مولوی عبد السلام ندوی نہایت موزوں تھے جو الندوے کے اڈیٹر رہ چکے تھے۔ وہ وسیع النظر تھے اور ان کو استخراج میں پورا ملکہ تھا اور وہ ۳۵ روپیہ ماہانہ پر بھوپال جانے کو تیار ہو سکتے تھے لیکن مکان مفت ہو اور کھانے کے لیے باورچی کی ضرورت نہ رکھنا پڑے (۵۹)۔

مولانا نے سید محمد محسن بلگرامی کو اطلاع دی کہ وقف علی الاولاد کا قانون حسب مراد پاس ہو گیا۔ اس سلسلے میں مولانا نے خود کلکتہ جا کر ہر پہلو سے حکام سے گفتگو کی اور تقریریں کیں۔ اس لیے امید تھی کہ موسم سرما میں وقف کا باقاعدہ قانون بنا کر منظور ہو جائے گا اور شائع کیا جائے گا (۶۰)۔

مولانا عبدالماجد دریا بادی نے مولوی عبدالباری ندوی کے علی گڑھ کالج میں آسان شرائط پر داخلہ کے لیے سفارشی خط لکھنے کو لکھا تو مولانا نے لکھا کہ ان کا کوئی علمی کام نہیں جس کی وجہ سے شہرت ہو اور سفارش میں آسانی ہو۔ سید سلیمان ندوی، عبدالسلام ندوی اور خواجہ عبدالواجد ندوی کان پوری کے لیے آسان تھا۔ اس لیے کہ ان کی علمی شہرت تھی اور لوگ ان کو جانتے تھے۔ مولوی حمید الدین کے لیے جب کالج میں کوشش کی تو دو سال تک ان کی قابلیت کا لوگوں کو یقین نہیں آیا اور ان کی ظاہری صورت سے اتنا معلوم ہوتا تھا کہ کسی اسکول کے نیم تعلیم یافتہ شخص ہیں، عربی دانی کا اثر ان کے چہرہ سے بھی نمایاں نہ تھا لیکن مولانا ان کی عربی سے بہت متاثر تھے اور ان کو ترقی کے قابل سمجھتے تھے۔

۱۵۔ ستمبر کو مولانا نے پولٹیکل کروٹ کا تیسرا نمبر لکھا اور اسی روز ختم کر دیا۔ مولوی ابوالکلام آزاد بھی اسی انداز پر برابر لکھ رہے تھے (۶۱)۔

اس زمانے میں حکومت سے درخواست کی جارہی تھی کہ جمعہ کو تعطیل دی جائے تاکہ مسلمان باآسانی نماز پڑھ سکیں۔ اس کے متعلق مولانا کا خیال تھا کہ مختلف جگہوں پر کارروائیوں کے اخبارات میں شائع ہونے سے کام نہیں چلے گا بلکہ اس کے لیے وقف اولاد کی طرح متحدہ اور پرزور اور وسیع طریقے سے باضابطہ کام کرنے کی ضرورت ہے انھوں نے انگریزی میں اس کے لیے میموریل لکھوا لیا تھا اور اس کو چھپوا کر دستخطوں کے بہم پہنچانے کی مہم کا آغاز کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اس معاملے کو انتہا تک پہنچانے کے لیے کم از کم پانچ سو روپے کی ضرورت تھی۔ لہٰذا شروانی صاحب سے خواہش کی وہ بھی اس سلسلے میں مالی اعانت فرمائیں (۶۲)۔

مولانا ایک ہفتہ بیمار رہے جب طبیعت ٹھیک ہوئی تو مولوی حمید الدین سے ان کی لکھی ہوئی سورہ تحریم کی تفسیر طلب کی اور سورہ احزاب میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کی اجازت اور عدل کی قید اڑا دینے کی وجہ دریافت کی۔ مولوی حمید الدین نے مولانا کو بلایا تو انھوں نے لکھا کہ وہاں آنے میں کتابوں کی دقت ہے، تمام کتابیں وہاں نہیں مل سکتیں اور نہ وہ ساتھ لا سکتے تھے۔

مولانا کو سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کام کے سلسلے میں کاپی نویس کی ضرورت نہیں تھی بلکہ خوشنویس کی ضرورت تھی (۶۳)۔

حکیم غلام غوث صاحب نے سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بعض باتیں

کر بھیج دیا۔ لہٰذا اندیشہ تھا کہ ناپسند نہ ہو مگر وہ پسند کیا گیا۔ مولانا اس زمانے میں یورپین مصنفوں کے سیکڑوں اوراق کی ورق گردانی کر رہے تھے اور اس مطالعے سے اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ وہ لکھتے تو جھوٹ ہیں لیکن بے سچ نہیں لکھتے۔ وہ تو خیر غیر تھے اپنوں ہی نے سیرتؐ میں بے احتیاطیاں کی تھیں۔

مولانا نے سیرتؐ کے کام کے پھیلاؤ سے اندازہ لگایا تھا کہ دو سال میں ہونا ممکن نہیں اور اس مدت کے بعد سرکار بھوپال رقم بند کر دیتی لیکن مولانا کو روپیہ کی نہیں بلکہ اپنی صحت کی خرابی کی وجہ سے جان کی فکر تھی۔ بہرحال انھوں نے طے کر لیا تھا کہ ہر حالت میں کام جاری رکھیں گے اور اگر مر نہ گئے اور ایک آنکھ بھی سلامت رہی تو دنیا کو ایسی کتاب دے جائیں گے جس کی توقع کئی سو برس تک نہیں ہو سکتی (۶۶)۔

مولانا کا خیال تھا کہ مارگولیوس (Margolioth) کا پایہ جرجی زیدان سے بہت بلند ہے اور اس کی وسعت نظر بے انتہا ہے، اگرچہ اسی کے ساتھ بددیانت اور غلط نتائج نکالنے والا ہے مولانا نے اس کا ترجمہ کرا لیا تھا۔ میور کے ماخذ کے متعلق مولانا کا خیال تھا کہ ضعیف اور قابل سند نہیں۔

مولانا نے اسی زمانے میں ایک مترجم کے لیے اشتہار دیا تھا جس کو مشاہرہ دینے کا ارادہ تھا متعدد گریجویٹ کی درخواستیں آئی تھیں جن میں ہاشمی صاحب بھی تھے جو کالج سے خارج کیے گئے تھے مولانا نے مولانا عبدالماجد دریابادی سے دریافت کیا کہ ان کی اسکیم کیا تھی یعنی وہ کیا کرنا چاہتے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا چاہتے تھے کہ مولانا دریابادی اگر مترجم کی حیثیت سے ان کے ساتھ کام کرتے تو بہتر تھا۔ انھوں نے مولانا دریابادی سے ولہاؤسن کا ترجمہ صرف وفات کا کرانا چاہا (۶۷)۔

اب مولانا بنارس میں تھے اور مسٹر مہدی حسن کو اطلاع دی کہ حیدر آباد (دکن) سے کتابوں کے سلسلے میں دیر میں تعمیل ہوتی ہے۔ لہٰذا مطلوبہ کتابوں کو ڈپوٹی شاب (علی گڑھ کالج) سے منگوالیں (۶۸)۔

مولوی حمید الدین نے ثابت کیا ہے کہ حضرت اسمٰعیل ذبیح تھے۔ اس کے متعلق مولانا نے ان سے چند سوالات دریافت کیے اور ان کا مدلل جواب چاہا، کیوں کہ مولانا اس بحث کو سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں دینا چاہتے تھے۔ چناں چہ انھوں نے سیرۃ کے دیباچے میں اس سے بحث

کی ہے (۶۹)۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ ترکی سے اور ریاستہائے بلقان (جزیرہ نما بلقان کے ممالک مثلاً البانیہ، بلغاریہ وغیرہ) سے جنگ شروع ہو چکی تھی۔ مولانا کو ترکوں سے ایک عرصہ سے ہمدردی تھی اسی زمانہ میں عید الضحیٰ (بقر عید) آگئی تو یہ تحریک ہوئی کہ قربانی کی قیمت ترکوں کے جہاد میں چندہ دے دی جائے۔ عام علما اس کو ناجائز کہتے تھے۔ مولانا نے شدید ضرورت اور بعض فقہی روایات کی سند سے اس کے جواز کا فتویٰ دیا۔ اس پر کھلبلی مچی حتیٰ کہ مولانا کے شاگرد ظفر علی خاں بھی مطمئن نہیں ہوئے اور انھوں اعتراض کیا تو مولانا نے ان کو جواب دیا کہ مولانا کے فتویٰ سے علمائے فرنگی محل بھی متفق ہیں اور اس وقت کے نامور فرنگی محلی عالم مولانا عبد الباری صاحب (۷۰) کا خط بھی ان کی (مولانا) کا تائید میں شائع ہو چکا ہے اور ہدایہ میں بھی یہ مسئلہ موجود ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس میں جواز ہے اور انھوں نے افضیلت کا فتویٰ دیا تھا اور یہ مولانا کا اجتہاد تھا۔

پھر ان کو فتویٰ سے ہٹ کر لکھتے ہیں کہ ترکوں کی اعانت اس وقت فرض عین ہے اور قربانی واجب ہے۔ ظفر علی خاں کا کہنا تھا کہ سنت ابراہیمی موقوف نہ ہو اور مولانا کا کہنا تھا کہ ہاں وہی سنت مقصود ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ مولانا ظفر علی خاں اس سنت کو لیتے ہیں۔ جس کا مینڈھے پر عمل ہوا اور مولانا اس کو پیش نظر رکھتے تھے جو اسمٰعیلؑ پر مقصود تھی تو کیا ظفر علی خاں کے نزدیک ترکوں کی جان مینڈھے سے کم ہے۔

مولانا نے اسی جنگ کے سلسلے میں اپنی مشہور نظم کہی اور مسلمانوں کے ایک جلسے منعقدہ رفاہ عام کلب لکھنو کی عمارت میں پڑھی (۷۱)۔ چند اشعار یہ ہیں:

مراکش جا چکا، فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض سخت جاں کب تک

بکھرتے جاتے ہیں شیرازہ اوراق اسلامی
چلیں گی تند باد کفر کی یہ آندھیاں کب تک

حریفوں کو گلہ ہے آسمان سے خشک سالی کا
ہم اپنے خون سے سینچیں گے ان کی کھیتیاں کب تک

حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں
تو پھر سمجھو کہ مرغان حرم کا آشیاں کب تک

جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں
کہ اب امن و امان شام و نجد و قیرواں کب تک (۷۲)

○ اسی زمانے میں راجہ ابو جعفر صاحب رئیس فیض آباد کونسل کی ممبری کے امیدوار ہوئے

تو مولانا نے اپنی رائے کے ساتھ مولانا شروانی کو ایک تائید نامہ بھیجا کہ اگر وہ بھی اس پر دستخط کر دیں تو بہتر ہے۔ ان کی رائے یہ تھی کہ ان معاملات میں رشتہ اور قرابت کا خیال نہ رکھنا چاہیے اور کام کرنے والے شخص کو ووٹ دینا چاہیے۔ مولانا کے خیال میں راجہ صاحب مناسب شخص تھے (۷۳)۔

قربانی کے مسئلہ اور ترکوں کی اعانت کے بارے میں مولانا نے اپنے خیالات کی وضاحت اخبارات کے ذریعے ان الفاظ میں کی لکھتے ہیں: "بعض صاحبوں کا خیال ہے کہ ترکوں کی ہمدردی میں اگر قربانی کے بجائے قیمت دی گئی تو اس سے احتمال ہو گا کہ قربانی خود غیر ضروری ہے۔

لیکن یہ صحیح نہیں، شریعت میں فرائض کے درجات میں بھی ترتیب ہے، اور وقتی ضرورتوں کا خیال رکھا گیا ہے، غزوہ خندق میں جہاد میں مصروف ہونے کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز عصر قضا ہوئی، تو کیا یہ حجت ہو سکتی ہے کہ نماز کا قضا کرنا جائز ہے؟

ترکوں کی اعانت اس وقت فرض عین ہے، اس لیے اس خاص موقع اور ضرورت کے وقت اگر یہ فرض مقدم رکھا گیا تو اس سے آئندہ کے لیے کیا حجت ہو سکتی ہے؟

قربانی شعائر اسلام ہے، مسلمان اس کو نہیں چھوڑ سکتے، نہ کوئی قوم ان کو اس پر مجبور سکتی ہے، نہ وہ اس کے مقابلے میں دنیا کی کسی قوم کی پروا کر سکتے ہیں (۷۴)۔

حکیم غلام غوث صاحب نے مولانا سے خواہش کی کہ سیرت کا نمونہ الندوہ (لکھنو) یا القاسم (دیوبند) میں شائع کیا جائے تو مولانا نے لکھا کہ الہلال (کلکتہ) میں شائع کیا جائے گا، الندوہ بند ہے اور القاسم کے نزدیک مولانا وغیرہ صحیح مسلک پر نہیں ہیں (۷۵)۔

مسٹر مہدی حسن خط میں خود اعلیٰ کاغذ کا استعمال کرتے تھے اور مولانا کو تحفہ میں بھیج کر اپنی خوش مذاقی اور خلوص کا ثبوت دیا کرتے تھے۔ اب کی جو کاغذ بھیجا تو مولانا نے لکھا کہ بیکار بھیجا اس لیے کہ آنکھوں کی کمزوری کی وجہ سے اب لکھا نہیں جاتا۔ سیرتؐ کے متعلق لکھا کہ چوں کہ نہایت تنقید (ذرا سی بھی خفیف روایت کو قبول نہیں کرتے تھے) اور جانفشانی سے کام لے رہے تھے۔ اس لیے ہفتوں میں دو تین صفحے لکھ پاتے تھے ویسے ہجرت کا سال اول لکھ چکے تھے پھر بھی نقش اول تھا اس لیے کہ نظر ثانی کرنا تھی اور اس میں بڑی تبدیلی کا امکان تھا۔ بعض ایسی مشکلات آپڑتی تھی کہ ان کی چھان بین میں بڑا وقت لگ جاتا تھا۔

شعرالعجم کے متعلق مسٹر مہدی حسن نے دریافت کیا تو لکھا کہ اب شعرالعجم کیسے لکھ سکتے

تھے۔ اس لیے کہ ایک آنکھ میں پانی اتر آیا اور دوسری بھی کمزور ہو گئی۔ اس لیے اگر سیرت کی تحریر میں خاتمہ ہو جائے تو یہ حسن خاتمہ ہے۔

مولانا نے عطیہ فیضی کی شادی کے متعلق بڑا دلچسپ مزاح پیدا کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قرآن مجید میں ہے کہ یہودی ذلیل و خوار بنا دیے گئے۔ لیکن ۵۔ دسمبر ۱۹۱۲ء (۷۶) کے بعد بھی وہ ذلیل رہے جب کہ عطیہ جیسی پڑھی لکھی معزز مسلمان خاتون کو بیوی بنانے کی عزت اس کو نصیب ہوئی۔ یہ کہا جاتا تھا کہ وہ مسلمان ہو گیا ہے تو مولانا نے اس پر بھی مزاح کا پہلو تلاش کر لیا اور لکھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ

سبحہ را زنار گر دست وکند

گویا

"میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلمان ہو گیا"

بڑے دن کی چھٹی میں مولانا نے مسٹر مہدی حسن کو لکھنؤ آنے کی دعوت دی اور لکھا کہ برابر کا کمرہ ان کے لیے خالی رہے گا اور قیام کی جگہ بڑی پر فضا ہے اور ایسی پر فضا کہ بمبئی میں بھی جواب نہیں اور مولانا ابو الکلام آزاد کا بھی آنے کا ارادہ تھا (۷۷)۔

حواشی

۱.... مکاتیب اول، صفحہ ۱۹۵، ۲۔جنوری ۱۹۱۲ء
۲.... توراۃ نے بھی سور کو حرام قرار دیا ہے اور انجیل کو حرام و حلال سے تعلق نہیں۔
۳.... مکاتیب، صفحہ ۱۶۳، ۶۔جنوری ۱۹۱۲ء ۴.... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۶۳، ۱۱۔جنوری ۱۹۱۲ء
۵.... مکاتیب دوم، صفحہ ۳۵، ۲۰۔جنوری ۱۹۱۲ء
۶.... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۲۹-۲۳۰، ۱۶۔جنوری ۱۹۱۲ء
۷.... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۶۴، ۲۰۔جنوری ۱۹۱۲ء
۸.... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۶۴-۱۶۵، ۲۳۔جنوری ۱۹۱۲ء
۹.... مکاتیب دوم، صفحہ ۷۷-۷۸، ۲۸۔جنوری ۱۹۱۲ء
۱۰.... مکاتیب شبلی اول، صفحہ ۲۸۲-۲۸۳، ۴۔فروری ۱۹۱۲ء
۱۱.... اس کے اڈیٹر علامہ سید رشید رضا تھے۔ یہ مصر کے مشہور مذہبی رہنما محمد عبدہ کے خاص شاگرد تھے۔
۱۲.... خواجہ عبد الواجد کان پوری، مالک نظامی پریس، محلہ پریڈ کان پور۔ (موصوف نے مجھے فرمایا کہ مولانا کا خیال تھا کہ خواجہ صاحب شعر العرب لکھیں مگر ندوہ سے فراغت کے بعد وہ خانگی الجھنوں میں ایسے پھنسے

کہ علمی کاموں سے دور ہوگئے۔ (ہاشمی)

۱۳ ... مکاتیب دوم، صفحہ ۳۶-۳۷، ۸-فروری ۱۹۱۲ء

۱۴ ... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۳۰، ۸-فروری ۱۹۱۲ء

۱۵ ... مکاتیب دوم، صفحہ ۷۸، ۹-فروری ۱۹۱۲ء ۱۶ ... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۶۵، ۱۲-فروری ۱۹۱۲ء

۱۷ ... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۸۹ ۱۸ ... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۸۹-۱۹۰، ۱۲-فروری ۱۹۱۲ء

۱۹ ... مکاتیب اول، صفحہ ۲۲-۲۷، ۱۳-فروری ۱۹۱۲ء ۲۰ ... مکاتیب اول، صفحہ ۲۲۸، ۲۶-فروری ۱۹۱۲ء

۲۱ ... الانتقاد کے ذریعہ مصر والے عموماً اور علامہ سید رشید رضا خصوصاً مولانا کی عربی سے واقف ہو چکے تھے۔

۲۲ ... مکاتیب اول، صفحہ ۱۹۵-۱۹۶، ۲۷-فروری ۱۹۱۲ء

۲۳ ... مکاتیب دوم، صفحہ ۷۸-۷۹، یکم-مارچ ۱۹۱۲ء ۲۴ ... مکاتیب دوم، صفحہ ۸۰، ۱۳-مارچ ۱۹۱۲ء

۲۵ ... مکاتیب اول، صفحہ ۱۹۶-۱۹۷، ۱۰-مارچ ۱۹۱۲ء ۲۶ ... مکاتیب اول، صفحہ ۱۹۸، ۲۳-مارچ ۱۹۱۲ء

۲۷ ... مکاتیب اول، صفحہ ۱۹۸، ۱۸-مارچ ۱۹۱۲ء ۲۸ ... مکاتیب اول، صفحہ ۲۲۸، ۱۸-مارچ ۱۹۱۲ء

۲۹ ... مکاتیب دوم، صفحہ ۹۰، مارچ ۱۹۱۲ء ۳۰ ... مکاتیب اول، صفحہ ۱۹۹، ۲۳-مارچ ۱۹۱۲ء

۳۱ ... روداد جلسہ سیزدہم ندوۃ العلماء منعقدہ ۱۷-۱۸-۱۹ ربیع الثانی ۱۳۳۰ھ مطابق ۶-۷-۸-اپریل ۱۹۱۲ء، روز شنبہ یکشنبہ و دوشنبہ تمام لکھنو حسب ایمائے مجلس انتظامیہ ندوۃ العلماء۔ قر طبع فی مسلم پرنٹنگ ہوس، امین آباد۔ لکھنو صفحہ ۴

۳۲ ... روداد ندوہ، صفحہ ۴ تا ۶ ۳۳ ... روداد ندوہ، صفحہ ۶ تا ۹

۳۴ ... روداد ندوہ، صفحہ ۱۵ تا ۱۸ ۳۵ ... روداد ندوہ، صفحہ ۴۰

۳۶ ... روداد ندوہ، صفحہ ۴۰ ۳۷ ... روداد ندوہ، صفحہ ۴۵

۳۸ ... روداد ندوہ، صفحہ ۴۹ تا ۵۱ ۳۹ ... روداد ندوہ، صفحہ ۵۱ تا ۵۲

۴۰ ... روداد ندوہ، صفحہ ۵۵

۴۱ ... اس کا مطلب یہ ہے کہ ۱۹۰۸ء میں مولانا شبلی پورے طور پر ندوہ آگئے تھے۔

۴۲ ... بلند چھپا ہے جو غلط ہے۔ ۴۳ ... روداد ندوہ، صفحہ ۱۲۲، ۱۹۱۲ء

۴۴ ... روداد ندوہ، صفحہ ۱۲۲ تا ۱۲۳، ۱۹۱۲ء ۴۵ ... روداد ۱۹۱۲ء، صفحہ ۱۲۶۔

۴۶ ... روداد ۱۹۱۲ء، صفحہ ۱۲۵ تا ۱۲۶ ۴۷ ... روداد ندوہ ۱۹۱۲ء، صفحہ ۱۵۱

۴۸ ... مکاتب شبلی اول، صفحہ ۲۳۷-۲۸۸، ۱۷-اپریل ۱۹۱۲ء

۴۹ ... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۳۰-۲۳۱ ۵۰ ... مکاتیب شبلی اول، صفحہ ۲۳۰، ۱۰-مئی ۱۹۱۲ء

۵۱ ... مکاتیب اول، صفحہ ۲۳۰-۲۳۱، ۱۶-جون-۱۹۱۲ء ۵۲ ... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۳۱

۵۳ ... ہیرو لینڈ ہیرو ورشپ۔ ۵۴ ... مکاتیب اول، صفحہ ۱۹۹-۲۰۰، ۲۳-جون ۱۹۱۲ء

۵۵ ... مکاتیب اول، صفحہ ۲۰۰-۲۰۱، ۲۱-جولائی ۱۹۱۲ء

۵۶ .... مکاتیب اول، صفحہ ۲۲۹، ۲۵-جولائی ۱۹۱۲ء
۵۷ .... مکاتب اول، صفحہ ۲۰۱-۲۰۲، ۱۳-اگست ۱۹۱۲ء
۵۸ .... مکاتیب اول، صفحہ ۲۰۲-۲۰۳-۶- ستمبر ۱۹۱۲ء
۵۹ .... مکاتیب اول، صفحہ ۲۳۱-۲۳۲، ۸- ستمبر ۱۹۱۲ء
۶۰ .... مکاتب اول، صفحہ ۳۳۱ ۶۱ .... مکاتیب اول، صفحہ ۲۹۰، ۱۵- ستمبر ۱۹۱۲ء
۶۲ .... مکاتیب اول، صفحہ ۳۰۳، ۱۵-اکتوبر ۱۹۱۲ء ۶۳ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۷، ۲۶-اکتوبر ۱۹۱۲ء
۶۴ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۷-۳-۸-۳، ۲-نومبر ۱۱۹۲ء
۶۵ .... مکاتیب اول، صفحہ ۲۴۲-۲۴۳، ۲-نومبر ۱۹۱۲ء
۶۶ .... غالباً ہاشمی فرید آبادی ۶۷ .... مکاتیب اول، صفحہ ۲۹۱
۶۸ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۳۱، یکم نومبر ۱۹۱۲ء ۶۹ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۳۸-۳۹، ۱۳-نومبر ۱۹۱۲ء
۷۰ .... علی برادران (مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی) کے شیخ-
۷۱ .... ڈپٹی عبد المجید صاحب مرحوم (مولانا عبد الماجد دریا بادی کے بڑے بھائی) کا بیان ہے کہ انگریز کمشنر کی صدارت میں یہ جلسہ ہوا تھا اور جب مولانا نے اپنی یہ نظم پڑھی تو لوگ چیخ کر رونے لگے اور انگریز کمشنر گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا تو اس کو بتلایا گیا کہ نظم بڑی پر اثر ہے اس لیے لوگ رو پڑے-
۷۲ .... مکاتیب اول، صفحہ ۳۴۲-۳۴۳، ۱۶-نومبر ۱۹۱۲ء
۷۳ .... مکاتیب اول، صفحہ ۲۰۳-۲۰۴، ۱۶-نومبر ۱۹۱۲ء
۷۴ .... مکاتیب اول، صفحہ ۳۴۳، ۱۷-نومبر ۱۹۱۲ء ۷۵ .... مکاتیب اول، صفحہ ۳۲۵، ۱۳-دسمبر ۱۹۱۲ء
۷۶ .... عطیہ فیضی کی شادی کی تاریخ- ۷۷ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۳۱-۲۳۲، ۱۳-دسمبر ۱۹۱۲ء

۱۹۱۳ء

ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ آگرہ میں دسمبر ۱۹۱۲ء میں تھا۔ اس کے لیے مولانا نے اپنا لکچر تیار کر لیا تھا اور کچھ اشعار بھی کہے تھے، مگر سخت بیمار ہو جانے کی وجہ سے نہ جا سکے۔ اسی زمانے میں مولانا کا اردو کلام "نالہ، شبلی" کے نام سے شائع ہوا اس میں اکثر اشعار غلط چھپے تھے۔ اسی اندیشے سے مولانا نے ہدایت کی تھی کہ پروف ان کو دکھلا لیا جائے تا کہ وہ تصحیح کر دیں، مگر اس پر کان نہ دھرا گیا۔

مولوی امین زبیری مولانا کی سیاسی نظمیں شائع کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے مولانا نے لکھا کہ اس میں ان کے پولیٹکل کروٹ کے تینوں (۱) مقالے بھی اس میں شامل کر لیے جائیں، اس لیے کہ وہ سیاسی نظموں کی نثر میں شرح تھی۔ اس کے لیے مولانا کا دیباچہ لکھنے کا بھی خیال تھا اور وہ لکھنے کو تیار تھے۔

اب ندوے میں مولانا کی مخالفتوں کی وجہ سے سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) لکھنے کی مشقت کی وجہ سے مولانا بددل ہو گئے تھے اور ندوے سے دلچسپی کم لے رہے تھے، اس لیے ندوے کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ لہذا گورنمنٹ نے اپنا انسپکٹر بھیجا اور اس نے بڑی سخت رپورٹ لکھی اور یہاں تک لکھ دیا کہ ایسی ردی حالت کی وجہ سے حکومت کی اعانت جاری رکھنا ممکن نہیں۔ لیکن اس پر بھی اربابِ اقتدار نہیں چونکے۔ انسپکٹر نے جواب جلد طلب کیا تھا مگر ایک مہینہ گزرنے کے باوجود جواب نہیں بھیجا گیا تھا۔

بورڈنگ کے متعلق اس نے اپنی رپورٹ میں خرگوش خانہ لکھا تھا اور اس کے بدلنے کے لیے پچاس ساٹھ ہزار روپے کی ضرورت تھی اور لوگ رقم دینے کو تیار نہ تھے۔ حد یہ کہ ندوے کے ناظم لکھ پتی تھے اور ندوے کو اب تک زندگی میں انھوں نے ایک پیسہ بھی نہ دیا تھا۔

اسی زمانے میں یورپ کی نادر عربی مطبوعات کا ایک عمدہ ذخیرہ فروخت ہو رہا تھا مولانا نے مولوی امین زبیری کے ذریعہ نواب حمید اللہ خاں صاحبزادہ بھوپال کو توجہ دلائی۔ مولانا ان کتابوں کی فہرست بھیج کر چاہتے تھے کہ ڈاکٹر ہارویز پروفیسر علی گڑھ کالج سے جانچ کرا لیں کہ گراں نہیں ہے (۲)۔

مولوی سمیع کو الغزالی کی ضرورت ہوئی تو مولانا نے لکھا کہ عبداللہ خاں کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد کے پتے سے منگوالیں۔ مولانا نے اپنے لیے بھی وہیں سے لی تھی۔ مولانا چاہتے تھے مولوی سمیع ان کے پاس لکھنو چلے آتے تو ان کو بڑا آرام ملتا۔ اب اس قدر کمزور ہو گئے تھے کہ معمولی کھانے پینے کا انتظام بھی بار معلوم ہوتا تھا اور نوکر کوئی معتبر نہیں مل رہا تھا۔

آج کل کام کا معمول یہ تھا کہ صرف ایک دو گھنٹے صبح کو کچھ لکھ لیتے تھے، باقی دن ذرا سا بھی لکھ لینا دشوار تھا۔ جن لوگوں نے نالہ شبلی شائع کیا تھا وہ اس کی قیمت کو کسی قومی کام میں لگانے کا ارادہ کر رہے تھے اور مولانا سے بغیر پوچھے یہ ارادہ تھا۔

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کچھ نہ کچھ روز لکھ لیتے تھے اور اس کو عمر بھر کا حاصل اور وسیلہ نجات سمجھتے تھے اور اسی زمانے میں سیرت سے متعلق اپنا مشہور قطعہ کہا تھا، جو یہ ہے۔

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی   مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم ؐ   خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا (۳)

۱۶۔ جنوری ۱۹۱۳ء کو مولانا الہ آباد میں تھے اور مسٹر مہدی حسن اس زمانے میں تحصیل ہنڈیہ میں تحصیلدار تھے۔ ان سے ملنے جانا چاہتے تھے، اس لیے ان سے خواہش کی اسٹیشن سے بستی تک مولانا کی وہ خود رہنمائی کریں (۴)۔

ابھی مولانا کا قیام الہ آباد ہی میں تھا۔ حفاظتِ اسلام کے سلسلے میں چند لوگوں نے بڑی خوشی سے ممبر بننا قبول کیا اور رقم ممبری بھیجنے پر آمادگی ظاہر کی، اس لیے مولانا نے چاہا کہ سید سلیمان ندوی لوگوں کے دیے ہوئے پتے پر پمفلٹ بھیج دیں۔

اسی زمانے میں مولانا کو پیچش ہو رہی تھی۔ اس سے تنگ ہو کر الہ آباد چلے گئے تھے۔ وہاں کی آب و ہوا موافق آرہی تھی، اس لیے مہینے کے آخر تک قیام کا ارادہ تھا۔ مکان بھی بڑا خوش منظر تھا۔

مولانا نے سید سلیمان ندوی کو ہدایت کی کہ دس روپیہ ماہانہ پر ابتدائی معلموں کے لیے مسلم گزٹ (۵) لکھنو میں اشتہار دے دیں، جو دیہات میں جا کر اردو کی ابتدائی کتابیں اور قرآن مجید پڑھا سکیں۔ مگر یہ کام مولانا علی الاعلان اور اشاعتِ اسلام کے نام سے نہیں کرنا چاہتے تھے کیوں کہ آریوں کے بھڑکنے کا اندیشہ تھا اور اس کام کو بڑے پیمانے پر مگر خاموشی سے کرنا چاہتے تھے تاکہ کسی کی مخالفت کا اندیشہ بھی نہ ہو اور اپنا کام چلے اور رہنے (۶)۔

ابھی تک ندوے کا کوئی ناظم مقرر نہیں ہوا تھا۔ نائب ناظم مولوی خلیل الرحمن سہارن پوری ہی اپنے کو ناظم کی حیثیت سے ہر جگہ پیش کرتے تھے۔ مولوی ابو ظفر ندوی کے ایک استفسار کے جواب میں لکھا کہ نعمت خان عالی متعصب شیعہ تھا اور عالمگیر کے باورچی خانہ کا مہتمم تھا(۷)۔

اشاعتِ اسلام کے سلسلے میں سید سلیمان ندوی نے ایک مفصل پروگرام بنا کر بھیجا تو مولانا نے اس کے ابتدائی حصہ سے اتفاق نہیں کیا اور پہلے پروگرام کو سید سلیمان ندوی کی رائے کو پیش نظر رکھتے ہوئے کچھ تبدیلیوں کے ساتھ واپس کیا اور وجہ یہ بتلائی کہ اگر دوسرے پروگرام کو پیش کیا جائے گا تو بڑے بڑے امرا اس سے بھڑکیں گے اور شرکت نہ کریں گے اور ناکام ہونے کی صورت میں دل شکستہ ہونے کا اندیشہ تھا، اس لیے ابھی بہت اونچا نہ دیکھنا چاہیے، ہاں یہ ضرور ہے کہ مارچ میں اس کا ابتدائی اجلاس کہیں ہو جائے تو کوئی صورت باقاعدہ کام کی نکلے۔

کلکتہ میں اس کام کے لیے غلام حسین عارف نہایت موزوں آدمی تھے۔ لہٰذا ان کو لکھنے کی ضرورت تھی۔ سید سلیمان ندوی نے کہیں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ ان کے (مولانا) نام کی تکرار سے لوگ گھبراتے ہیں تو مولانا نے لکھا کہ پھر کوئی کام کرنے والا بھی تو نہیں۔ اس لیے کہ کاغذات دو سال سے چھپے ہوئے رکھے ہیں۔ الہلال کلکتہ میں اس کے متعلق خط بھی شائع کرا دیا اس پر بھی کوئی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہیں ہوا۔ بیسیوں ضروری فرائض کو دیکھتے تھے اور افسوس کرتے تھے کہ کوئی کرنے والا نہیں اور جب کرتے تھے تو لوگ اعانت کرنا تو درکنار نکتہ چینی کرتے تھے، نہ خود کریں نہ کرنے دیں کا مصداق تھا۔ رہ گیا نموم و نمود کا معاملہ تو اس کی خواہش نہ تھی کوئی کرے۔ مولانا اس کی پیروی کو تیار تھے۔

سید سلیمان ندوی کو اشاعت کے لیے روپیوں کی ضرورت ہوئی تو لکھا کہ جمعہ کی تعطیل کے سلسلے میں جو روپیہ جمع ہے، اس میں مولوی فضل الرحمن سے قرض لے لیا جائے، لیکن باقاعدہ حساب رکھا جائے۔ لکھنؤ آکر اس کی ادائیگی کریں گے۔

الہ آباد میں مولانا کی صحت بہتر تھی، اس لیے قیام پذیر تھے۔ پھر بھی مولوی عبدالسلام ندوی اگر لکھنؤ آجاتے تو لکھنؤ جلد واپس آنے کو تیار تھے۔ مولوی عبدالسلام ندوی کا الہ آباد جانا مشکل تھا، ورنہ وہیں بلا لیتے۔

مولانا نے سید سلیمان ندوی سے دریافت کیا کہ کیا کلکتہ، پٹنہ، بھوپال، رام پور میں اشاعتِ اسلام کے کاغذات کم بھیجے گئے تھے؟ سید سلیمان ندوی کو ہدایت کی کہ پرنس آرکاٹ کو

ایک انگریزی خط کے ساتھ اشاعتِ اسلام کے کاغذات بھیج دیں اور غلام احمد خاں صاحب کلامی کو خاص طور پر مدراس لکھا جائے اور دستخط میں اپنا نام لکھیں اور جوائنٹ سیکریٹری اشاعتِ اسلام لکھا جائے۔

چوں کہ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ مولانا اپنا نام ہر جگہ لکھتے ہیں اس لیے سید سلیمان ندویؒ نے مشورہ دیا تھا کہ مشیر حسین (۸) یا نواب علی حسن خاں کے نام سے اشاعتِ اسلام کا کام ہونا چاہیے۔ لوگوں کے خیالات کو مولانا جانتے تھے اس لیے انھوں نے سید سلیمان کو لوگوں کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے تفصیل سے لکھا کہ شروع میں انھوں نے خود ہی وقفِ اولاد کے سلسلے میں اشتہار دیا تھا کہ چندہ منشی احتشام علی صاحب کو بھیجا جائے۔ لیکن لوگوں نے اس قدر کم توجہ کی کہ صرف آٹھ روپے ان کے پاس آئے۔ پھر اچھے صاحب کے نام سے انگریزی کاغذات بھیجے تو کسی نے پروانہ کی، پھر بھی سید سلیمان ندوی کو اختیار دیا کہ مشیر حسین قدوائی کا نام لکھ کر دیکھ لیں ایک درجن آدمی بھی جواب نہ دیں گے۔ انھیں تجربات کی بنا پر اپنے نام سے کام کرتے تھے۔ دارالعلوم ندوہ کے بارے میں بھی یہی تجربہ ہوا یعنی منشی احتشام علی صاحب ڈائریکٹر تعلیمات اور انسپکٹر تعلیمات کو بار بار لکھا، مگر جواب نہ آیا۔ جمعہ کی تعطیل کا رزولیشن نواب علی حسن کے نام سے گورنر کو بھیجا گیا اس کی بھی سنوائی نہ ہوئی۔ چوں کہ لوگوں کے ذہن میں ایک غلط خیال بیٹھ گیا تھا، اس لیے مولانا کو اتنا لکھنے کی ضرورت پیش آئی۔

سید سلیمان ندوی نے اشاعتِ اسلام کے سلسلے میں ایک مسودہ بھیجا تھا۔ مولانا نے اس کو پسند نہیں کیا، لیکن اس کی اصلاح کر دی اور لکھا کہ دو ہزار یا اس سے زیادہ چھپوا لیے جائیں اور خط بھی (۹)۔

مولانا کا اب ارادہ تھا کہ فروری کے آخر تک الہ آباد میں قیام کریں، پھر دورے پر روانہ ہوں۔ چوں کہ دورے کے دوران ہی گرمیاں شروع ہو جاتیں، اس لیے دورہ کرتے ہوئے بمبئی چلے جاتے۔ لکھنؤ میں چوں کہ کئی ماہ قیام کا ارادہ نہ تھا اس لیے رکشا پر جو نوکر تھا اس کو جتنے دن تک وہ رہا اس کی تنخواہ دے کر الگ کرنے کی سید سلیمان ندوی کو ہدایت کی۔

سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق یورپین تصنیفات کو مولانا نے خوب پڑھ لیا تھا، اس لیے اس نتیجہ پر پہنچے کہ ترجمے پر وقت اور روپیہ خرچ کرنا بے کار تھا۔ منشی انعام الرحمن صاحب سیرتؐ کے اسٹاف میں تھے۔ مولانا ان کی نیکی، وقت کی پابندی، ترجمہ کی لیاقت

سے بہت خوش تھے، لیکن ان کا کوئی کام نہیں رہ گیا تھا، اس لیے ۱۵۔ فروری ۱۹۱۳ء سے ان کی علٰحدگی کی اطلاع دینے کی ہدایت کی اور یہ بھی کہ مولوی عبدالسلام ندوی کو لکھا جائے کہ وہ الہلال کلکتہ سے چھ ماہ کی مزید رخصت لے لیں اور موجودہ رخصت کو وطن میں ختم کر کے مولانا کے پاس چلے آئیں تاکہ سیرتؐ کے کام میں مدد ملے۔ ان کو سفر میں بھی ساتھ رکھنے کا ارادہ تھا۔

مولانا کو تاریخ خمیس کی دوسری جلد کی ضرورت تھی، لہٰذا طلب کی، ساتھ ہی دریافت کیا کہ سید سلیمانؒ اس وقت کیا کر رہے ہیں۔ اگر کوئی کام نہ ہو تو سیرت النبیؐ کے دوسرے اجزا لے لیں۔

اسی زمانے میں مولوی عبدالکریم صاحب مدرس دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو نے جہاد کے متعلق سخت مضمون لکھا، جو حکومت کی نگاہ میں قابل اعتراض ٹھہرا اور ندوے کے لیے نقصان کا سبب بن رہا تھا کہ مولانا نے جلسہ، انتظامیہ کر کے اس میں ان کی معطلی کا فیصلہ کرا دیا، تاکہ حکومت مطمئن ہو جائے کہ ندوے نے ان کے خلاف کارروائی کی اور بعد کو ان کی معطلی ختم کر دی جائے، تاکہ ان کو نقصان بھی نہ پہنچے۔ مخالفین کو موقع ملا اور انھوں نے معطلی کی ساری ذمہ داری مولانا کے سر عائد کر کے پروپیگنڈا شروع کر دیا اور ثابت کیا کہ وہ حکومت کے آلہ کار ہیں اور قوم کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ حالاں کہ اس جلسے میں مخالفین بھی شریک تھے، لیکن انھوں اپنی برأت ظاہر کی اور دوسرا جلسہ کر کے فیصلہ برقرار رکھا، لیکن شہرت اسی کو دی کہ سب کچھ کیا دھرا مولانا کا ہے۔ مولانا ایک خط لکھ کر ارکان ندوہ کو پوری اطلاع دینا چاہتے تھے۔ اس کے متعلق سید سلیمان ندوی سے دریافت کیا کہ ارکان ندوہ کو خط کی نقلیں بھیجی گئیں یا نہیں (۱۰)۔

سید سلیمان ندوی نے اشاعتِ اسلام کے سلسلے میں پانچ سو اشتہارات بھجوائے تھے جواب کل ۲۰ تا ۲۵ کا ملا۔ اس پر مولانا نے لکھا کہ انھوں نے (سید سلیمان ندویؒ) خود تجربہ کر لیا۔ لیکن اس کے باوجود دل شکستہ ہونے کی ضرورت نہ تھی، اس لیے کہ جب ایک کام شروع کر دیا تو پیچھے ہٹنا کیسا۔ شاہ سلیمان پھلواروی نے اشاعتِ اسلام کے سلسلے میں رسیدیں چھپوائی تھیں۔ سید سلیمان ندوی ان کو استعمال کرنا چاہتے تھے۔ مولانا نے اُن کو ہدایت کی کہ وہ استعمال نہ کریں ورنہ بعد کو مخالفین کا دخل ہو جائے گا اور کوئی کام نہ کرنے دیں گے اور خود تو کریں گے ہی نہیں لہٰذا ندوے کا دخل نہ ہو وہی بہتر ہے۔

اسی زمانے میں "موتمر دینی عمومی" کا مسودہ لکھ کر چھپنے کو دے دیا تھا اور اصل اسکیم جس

کے تحت کام کرنا تھا، اسی مسودہ میں تھی۔ ابھی چھپ کر نہیں آسکا تھا اس لیے ارادہ تھا کہ چھپ کر آجائے تو سید سلیمان ندوی کو بھیج دیں۔

لکھنو میں ایک آنہ فنڈ (۱۱) کے نام سے ایک مجلس تھی جو لکھنو کی مساجد کا اہتمام کرتی تھی اور سالانہ سفیدی وغیرہ کراتی تھی۔ اس وقت کے سیکریٹری نے مولانا سے کہا تھا کہ ۱۲۔ فروری ۱۹۱۳ء تک شہر لکھنو کی تمام مساجد میں مکتب قائم ہو جائیں گے اور یہ جنوری میں کہا تھا، اس لیے سید سلیمان ندوی کی شہر میں مکاتب کھولنے کی تجویز بے کار تھی۔

ناصر الملت مولوی ناصر حسین صاحب لکھنو کے مشہور شیعہ مجتہد تھے۔ ان کا ذاتی کتب خانہ اپنی نادر و نایاب کتابوں کے لیے دور دور مشہور تھا۔ مولانا نے ان سے ایک کتاب لی تھی لہٰذا اس کی ضرورت پیش آئی تو اس کو الہ آباد طلب کیا (۱۲)۔

مولانا کی صحت بد سے بدتر ہوتی جارہی تھی۔ بقول ان کے "اب میں اپنا سایہ رہ گیا ہوں۔ لیکن یہ حیرت انگیز بات تھی بھوک میں کمی نہ تھی، پھر بھی اگر دونوں وقت کھالیتے تو کئی دن تک کھانے کے قابل نہ رہتے تھے۔

آخر مارچ میں جموں (کشمیر) ایک انجمن کا جلسہ تھا، وہاں سے مولانا کو بلایا جارہا تھا۔ مولانا کو اس لیے دلچسپی تھی کہ حکومت کے ارکان ان کے دوست تھے اور بعض شاگرد بھی، لیکن ایک مرتبہ کشمیر جاکر سیکھ چکے تھے، یعنی سخت بیمار ہوگئے تھے اور اسی وقت سے بیماری کا سلسلہ چل رہا تھا، اس لیے جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ سیرتؐ کے کام میں اس وقت بھی لگے ہوئے تھے اور محسوس کر رہے تھے کہ واقعی ایک ایسی تصنیف کی سخت ضرورت ہے، یہ دوسری بات ہے کہ صحت کی خرابی سے ان کو اندیشہ تھا کہ وہ پوری کر سکیں یا نہ کر سکیں۔

اسی زمانے میں مولانا نے اخلاقی اور تاریخی نظمیں لکھیں جو الہلال کلکتہ کی زینت بنیں ان کا خیال تھا کہ قرن اول کے اخلاقی واقعات نظم کر دیے جائیں تو اچھا ہے۔ ان کی اخلاقی اور تاریخی نظمیں ان کے نام سے چھپ رہی تھیں اور ان پر حکومت کے اعتراض کا اندیشہ تھا۔ وہ کشاف، وصاف اور نقاد کے نام سے چھپتی تھیں۔

راجہ محمود آباد کو ندوے سے ہمدردی تھی اور اس کی اعانت کرنا چاہتے تھے، مگر ان کا مطالبہ تھا کہ (۱۳) شیعہ ممبر بھی بنائے جائیں اور اس پر منشی احتشام علی وغیرہ تیار نہ تھے کہ ان کی نمود میں فرق آجائے گا۔ اس زمانے میں مسلم لیگ کو آغا خاں کی تائید حاصل تھی اور ان کی مسلم

لیگ کے لیڈر کی حیثیت تھی۔ اس پر مولانا کا خیال تھا

خوش در خشید و لے دولت مستعجل بود۔

اب مسلم لیگ کے صدر میاں شفیع تھے جو ہمیشہ سے گورنمنٹ کے آدمی تھے۔ مولانا مسلم لیگ سے اس کی بے عملی اور ایک خاص طبقہ کی جماعت ہونے کی وجہ سے خوش نہ تھے۔ اس وجہ سے میاں شفیع کی صدارت کو انھوں نے اچھی نظر سے نہ دیکھا اور اپنے خیال کا اظہار اس طرح کیا کہ اس گنہگار (۱۴) کو درکار تھا ایسا شفیع اور لوگوں کا خیال تھا کہ روح اور فرشتہ کا تناسب ہے (۱۵)۔

مولوی ریاض حسن خاں نے وقف کی بابت دریافت کیا تو ان کو لکھا کہ اس میں پوری کامیابی ہوئی۔ اس لیے کہ جو انھوں نے دفعات نکالنی چاہیں اور جس کے لیے الگ تحریر بھی شائع کی تھی اور ان کے نکالنے کا وعدہ بھی مسٹر جینا (۱۶) سے لیا تھا اور وہ نکال دی گئیں۔

مولانا نے اشاعتِ اسلام کی بھی وضاحت کی کہ یہ ہلکا سا خاکہ ہے، اصل میں تو پیش نظر مذہبی عام انجمن ہے اور یہ کام ندوہ سے لیا جاتا ہے، مگر وہاں کام نہیں کرنے دیا گیا، حالاں کہ اس کام کے سلسلے میں کوئی اختلاف نہ ہونا چاہیے تھا۔ بہرحال ہر صوبے میں ایک مستقل انجمن ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں مولانا کا دورہ کرنے کا ارادہ تھا، مگر گرمی آگئی تھی جو ارادوں کو سرد کیے دیتی تھی، یعنی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ منصوری یا کشمیر میں گرمی گزارنے کا ارادہ تھا، مگر ابھی کوئی فیصلہ قطعی نہیں کیا گیا۔

اب وہ سیرتؐ پر فتح مکہ تک لکھ چکے تھے، مگر ابھی نظرِ ثانی و ثالث کی ضرورت تھی اور اسی حصے میں وقت بھی زیادہ تھی۔ اس کے بعد تو جلد جلد کام ہوتا۔ سارے مباحث اور ان کے خاکے مولانا کے ذہن میں تھے۔ یورپ کے خیالات کا بڑا حصہ سامنے تھا، جس میں سب تاروں کی ایک ہی صدا تھی، یعنی غلط فہمیاں، کچھ ناواقفیت، کچھ تعصب، اس لیے خیال تھا کہ ایک جلد یورپ کے اعتراضات کے جواب میں ہوگی۔ یورپ کے ذخیرہ، تاریخی پر ایک الگ دیباچہ سو صفحوں کا لکھنے کا ارادہ تھا اور تمام تصنیفات اور مصنفین کے نام اور حالات اور ریویو۔ یہ مباحث ان کے علاوہ لکھنے کا خیال تھا (۱۷)۔

مولوی ابو ظفر ندوی نے ندوے کی سند کے متعلق دریافت کیا تو ان کو لکھا کہ یہاں کی سند گورنمنٹ میں مسلم نہیں ہے۔

اسی زمانے میں المشیر مراد آباد میں غالباً مولانا کے خلاف کوئی مضمون نکلا۔ اس کا جواب لکھنے کو ابو ظفر ندوی نے دریافت کیا تو مولانا نے لکھا کہ وہ دیو بند کا نقیب ہے۔ اگر جی چاہتا ہے تو جواب لکھیں (۱۸)۔

وقف اولاد کی عرضداشت کے بارے میں مولانا شروانی نے دریافت کیا کہ اب کس منزل پر ہے تو ان کو لکھا کہ تین مہینے کی مستقل کوشش اور تقاضے پر تین لائق بیرسٹروں نے عرضداشت لکھی اور یہ بھی کمزور، تو اب اس کا کیا علاج، بہرحال مسٹر شفیع کا کہنا ہے کہ اب ضرورت نہیں، اس لیے گورنمنٹ نے غزنوی کو جواب دیا وہ کافی ہے اور مولانا کا خیال تھا کہ ضرورت قدیم ہے۔ لیکن اب جدید درخواست کی وجہ کیا بیان کی جائے اور مولانا کے نزدیک اصلی وجہ یہ تھی کہ لوگوں کو گورنمنٹ سے مطالبات کرنے کا حوصلہ ہی نہ تھا۔ لیکن یہ بات درخواست میں لکھنے کی نہ تھی۔ پھر اس بات کا جواب کیا دیا جائے کہ مسلمان اب تک کیوں چپ رہے۔ اس کا جواب سمجھ میں نہ آرہا تھا، جس کے لیے شروانی صاحب سے مشورہ کیا اور یہ بھی لکھا کہ خواجہ غلام الثقلین کا کہنا یہ ہے کہ کامیابی ناممکن ہے۔

ندوے کی قدیم عمارت (۱۹) فروخت ہو چکی تھی۔ مولانا کو اب دیکھنا یہ تھا کہ اس رقم سے جدید عمارت تیار بھی ہوتی ہے یا نہیں۔ اسی زمانہ، لکھنو میں نواب غلام احمد مدراس سے لکھنو آئے تو مولانا نے ندوے کی جدید عمارت دکھائی تو وہ بہت متاثر ہوئے۔

اب لکھنو میں خاصی گرمی پڑنے لگی تھی۔ اگرچہ شدت کو تین ہی دن ہوئے تھے مگر مولانا بولا گئے تھے اور سو نہ سکے۔ دیرہ دون جانے کا ارادہ کرلیا (۲۰)۔

مولوی عبد الباری ندوی نے مولانا آزاد کے لیے بھی خواہش کی کہ وہ بھی کشمیر آئیں۔ اس پر مولانا نے جواب دیا کہ اگر وہ کشمیر جائیں تو مستورات کو کیا کریں، رہ گیا مولانا کا معاملہ تو وہ ملیریا سے خوف زدہ تھے، کیوں کہ اس سے قبل جب کشمیر گئے تھے تو یہ بلا ان کے سر لگ گئی تھی اس لیے ہمت کرنے پھر رک جاتے تھے۔ اس لیے منصوری یا بمبئی جانے کے متعلق سوچ رہے تھے۔

سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اب فتح مکہ و حنین تک لکھی جا چکی تھی۔ لیکن اس کو اطمینان سے دوبارہ دیکھ کر چھپنے کے قابل بنانا چاہتے تھے۔ مولوی عبد السلام ندوی کو اسی لیے بلانا چاہتے تھے۔ مولانا نے اب مولوی عبد الباری ندوی سے دریافت کیا کہ سالانہ امتحان کے بعد

چھٹیوں میں دوبارہ اسکول کھلنے تک کہاں قیام کا ارادہ ہے۔

الہلال کلکتہ کی مہم کی وجہ سے ڈیپوٹیشن ٹوٹ گیا تھا۔ اس پر راجہ صاحب (غالباً راجہ محمود آباد) نے یہ سمجھا کہ یہ مولانا کی وجہ سے ہوا، حالاں کہ مولانا کا اس میں ہاتھ نہ تھا (۲۱)۔

اب سیرتؐ سال ۹ ہجری تک لکھ لی تھی۔ لیکن یہ محض خاکہ تھا۔ لہٰذا اب اس خاکے میں رنگ بھر رہے تھے۔ یعنی تفصیل سے لکھ رہے تھے۔ مولانا نے جو نظمیں کشاف کے نام سے لکھی تھیں، ان کی تعریف مسٹر مہدی حسن نے کی تو مولانا نے لکھا کہ یہ ہزلیات کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اگر واقعی ان کو حسن ظن ہے تو ان نظموں کا نام مطائبات زیادہ موزوں ہے۔ مسٹر مہدی حسن نے مشرق گورکھپور میں بھی ان نظموں کو خاصا سراہا تو مولانا نے لکھا کہ دو طرح کے لوگ ہیں، ایک ان کو فرشتہ بناتا ہے ایک دیو، لیکن ابھی تک تو مولانا انسان تھے۔ ترقی و تنزل کی منزلیں ابھی آگے تھیں۔ مولانا کا کہنا تھا کہ ان کی خاص نظمیں تو اب الہلال کلکتہ میں شائع ہوں گی۔ جن میں اخلاق عرب کو پیش کیا جائے گا۔ محض تاریخی واقعات ہوں گے، اپنی طرف سے اس میں اضافہ نہ کیا جائے گا (۲۲)۔

سید سلیمان ندوی سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پہلے حصے کے مقدمے میں عرب جاہلیت کی تاریخ پر روشنی ڈالنا چاہتے تھے۔ مگر مولانا کا خیال تھا کہ عرب بائدہ یعنی عرب کی ان مہذب سلطنتوں کے متعلق زیادہ معلومات کی ضرورت نہیں جو شام اور یمن میں تھیں، بلکہ ان کا چند صفحات میں اجمالی ذکر ہو۔ اصل کوشش نجد، حجاز، یثرب کے متعلق جمع کرنے میں ہونا چاہیے۔ لہٰذا انھیں کے متعلق معلومات بہم پہنچانی چاہیے۔ مثلاً کعبہ کی آبادی اور حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کے واقعات کی تحقیق شدہ تفصیل، تاکہ اس سے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی تاریخ اور ان دونوں کی اہمیت اور عرب میں ان دونوں شہروں کی عظمت کا اندازہ ہو۔

مولانا چاہتے تھے کہ عبدالوہاب نجدی کی کتاب الہدیٰ النبوی چند صفحات کی نقل سید سلیمان ندوی کو بھیج دیں تو مولانا ان کو پڑھ کر اندازہ کریں کہ وہ کتاب کام کی ہے یا نہیں، اس کو نقل کر دیا جائے۔

سید سلیمان ندوی نے تاریخ الاسلام لابراہیم بن عبد اللہ کی عبارت نقل کر کے بھیجی تو مولانا نے لکھا کہ اس میں کوئی خاص بات نہیں۔ جو باتیں اس میں ہیں وہ دوسری کتابوں میں بھی ہیں۔ ہاں اس میں صرف ایک نئی چیز ہے، یعنی یہود سے جزیہ لیا جانا، لیکن اس کا بھی کوئی ثبوت

نہیں، اس لیے غیر یقینی ہے۔

مولانا اب تک لکھنو سے باہر نہ جا سکے تھے اور وہاں کی گرمی برداشت کر رہے تھے (۲۳)۔

اب مولانا بمبئی آ گئے تھے لیکن مقصد تفریح کرنا اور غزلیں لکھنا نہ تھا، بلکہ بظاہر جو تھوڑی سی زندگی رہ گئی تھی اس کو سیرت النبی کی خدمت میں صرف کرنا تھا، اس لیے جتنا وقت بھی اس میں لگا سکتے تھے لگا رہے تھے۔

اسی زمانے میں مولانا نے انساب سمعانی کا عمدہ نسخہ خریدا، جس کی ضخامت کو دیکھتے ہوئے سترہ روپے قیمت کم تھی۔ اس کو یورپ نے فوٹو کے ذریعہ چھاپا تھا۔ مولوی ریاض حسن خان نے فتاویٰ ابن تیمیہ خریدنا چاہا تو لکھا کہ دریافت کرتا ہوں، اگر ملا تو بھجوا دیں گے۔

مولانا کو بمبئی میں ہر چیز مل جاتی تھی، مگر تازہ اور عمدہ گھی نہیں ملتا تھا۔ لہٰذا اپنے اعزا اور مولوی ریاض حسن خاں سے سیر بھر گھی کی فرمائش کی اور اس سے زیادہ ایک ماشہ بھی لینے کے روا دار نہ تھے۔ تازہ کے لیے شرط یہ تھی کہ بنے ہوئے دو تین دن سے زیادہ عرصہ نہ گزرا ہو (۲۴)۔

عبدالحکیم صاحب دیسنوی مولانا کے خلاف اخبارات میں مضامین اور ندوے میں ان کی مخالفت سے بہت فکر مند تھے، تو مولانا نے ان کو مفصل خط میں حالات لکھے۔

لکھنو میں مولانا کے خلاف ایک پارٹی تھی جو ندوے میں ان کے خلاف کمربستہ رہتی تھی۔ اس نے میر عبدالکریم صاحب مدرس ندوے کے مضمون جہاد کے سلسلے میں جو کارروائی ہوئی تھی یعنی ان کو معطل کر دیا گیا تھا۔ اس کا سارا الزام مولانا کے سر تھوپا اور پورا جتھا بنا کر مولانا کے خلاف اخباروں میں مضامین لکھے اور ندوے کی ردی حالت کو اس طرح چھپانے کی بھی کوشش کی۔

مولانا کا یہ کہنا تھا کہ انھوں نے اس مسئلے کو گورنمنٹ تک پہنچانے میں بالکل حصہ نہیں لیا، البتہ اتنا ضرور ہوا کہ جب جلسے میں سب نے کہا تو مولانا نے بھی تجویز سے اتفاق کیا۔ اس کے بعد مخالف پارٹی اپنے کو الگ بتلاتی تھی اور پبلک میں یہی پروپگنڈا کر رہی تھی کہ ان لوگوں کا ہاتھ نہ تھا، حالاں کہ گورنمنٹ کے افسروں سے مل کر تمام کام کیا اور اس بات کی خبر مولانا کو نہ ہونے دی۔ حکام سے ملنا، خط و کتابت کرنا، چھ مہینے کی معطلی کی ممبروں سے منظور کرانا، یہ سب کام مخالفین نے کیا، مولانا کا اس سے ذرہ بھر بھی تعلق نہ تھا۔

اسی زمانے میں مخالفین نے یہ خبر اڑائی کہ مولانا سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) تو لکھ رہے ہیں مگر یہ روحانیت سے خالی ہوگی۔ اس پر عبدالحکیم صاحب نے مولانا سے دریافت کیا تو

انھوں نے لکھا اگر روحانیت سے اخلاق اور تقدس نفس مراد ہے تو یہ لازمہ نبوت ہے، بلکہ نبوت نام ہی اس کا ہے اور اگر ذہن میں روحانیات سے متعلق کوئی اور تصور ہے تو اس کی وضاحت کرنا چاہیے۔

اسی الزام کے جواب میں یہ بھی لکھا کہ لوگوں نے بدنام کرنے کے لیے الزام تراشی کی ہے، جس میں یہ بھی ہے کہ فلاں شخص میں روحانیت نہیں ہے، فلاں شخص عالم ہے مگر دیندار نہیں، لیکن مولانا پر الزام لگانے والے ان کے جواب سے کب بچ سکتے تھے، اس لیے کہ مولانا کو ان لوگوں کا تجربہ تھا، لہٰذا انھوں نے (مولانا) یہ بھی لکھا کہ انھیں دینداروں کو جو الزام لگانے ہیں خود انھوں نے مہینوں دیکھا کہ نماز فجر کبھی نصیب نہیں ہوئی اور باوجود اس کے وہ دیندار اور روحانیت کے علم بردار بنے رہے۔

ان باتوں کو دیکھ کر مولانا اپنی زندگی کو وبال سمجھنے لگے تھے کہ خواص بھی عوام کی سطح پر آسکتے ہیں اور حق و باطل کی تمیز کا مادہ بھی باقی نہیں رہ گیا ہے۔

مدینہ یونیورسٹی کے نصاب پر بھی اعتراضات کی بوچھار کی وجہ یہ تھی کہ ان کا نام کیوں نہیں لیا گیا۔ اس کے بعد مولانا نے تاریخ سے چند مثالیں دیں کہ قرآن شریف پر نقطے حجاج بن یوسف نے لگائے اور کسی نے یہ نہ کہا کہ اس پر قوم کو بھروسہ نہیں، بلکہ وہی منقط قرآن مجید آج تمام دنیا میں پھیلا ہوا ہے اور کعبہ کی موجودہ عمارت بھی اسی نے بنوائی۔

بلاغت کا پورا فن جس سے قرآن مجید میں ہر جگہ کام لیا جاتا ہے جاحظ عبدالقاہر جرجانی سکاکی کا بنایا ہوا ہے۔ یہ سب معتزلی تھے۔ ان کے متعلق بھی کسی نے نہیں کہا کہ ان پر قوم کو اعتماد نہیں۔ تفسیر کشاف میں اعتزال بھرا ہوا ہے، مگر تمام محدثین پڑھتے تھے۔ بات اصل یہ ہے کہ قوم میں جب نیک و بد کی تمیز ہوتی ہے تو وہ کسی چیز سے نہیں ڈرتی، اس کو اپنے اوپر بھروسہ ہوتا ہے۔ لیکن جب علم نہیں رہتا اور حسد اور شک کے سوا کوئی جوہر موجود نہیں ہوتا تو لوگ اس قسم کی باتیں کرنے لگتے ہیں کہ قوم کو اعتماد نہیں اور لوگوں کو بدگمان بناتے ہیں۔ یہی حال مخالفین کا مولانا کے ساتھ تھا کہ ان کی ہر بات پر نکتہ چینی کرتے تھے اور ندوے سے نکلنے کے لیے ترکیبیں کرتے تھے۔ اس میں ایک یہ بھی تھی کہ قوم کو ان پر اعتماد نہیں۔ کام کی نوعیت اور اس کی اہمیت کو نظرانداز کر دیتے تھے اور خود کرنے کے اہل نہ تھے۔

مولانا کو ارباب دیوبند کے متعلق خیال تھا کہ وہ لوگ زاہد اور متقشف ہیں لیکن وسیع

النظر نہیں، تاہم مخلص ہونے کی وجہ سے شور و شر نہیں کرتے۔ اگر کوئی پوچھتا ہے تو جو جانتے ہیں وہ بتا دیتے ہیں (۲۵)۔ گویا جس میں جتنا ظرف ہے وہ اتنا ہی خاموش ہے۔

مولانا کی طبیعت خراب ہو گئی اور اتنی نقاہت بڑھی کہ اپنے قلم سے خط بھی لکھنا دشوار تھا۔ چناں چہ مولوی عبد السلام ندوی سے آج کل خط لکھا رہے تھے۔

سیرۃ شامی کا سید سلیمان ندوی نے ذکر کیا تو لکھا واقعی سب سے بڑی اور محققانہ کتاب ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ملتی نہیں۔ عماد بن کثیر کی تاریخ بھی محققانہ اور محدثانہ جانتے تھے، لہذا اس کی تلاش کی۔ سید سلیمان ندوی کو ہدایت کی عبد الوہاب نجدی کی سیرۃ کی نقل اب تک نہ آئی تھی۔ اس لیے یاددہانی کی اور دولابی کے دو چار صفحے کی نقل بھی طلب کی۔

چوں کہ مخالفین نے حکام میں سرخ روئی یہ کہہ کر حاصل کی تھی کہ انھوں نے مولوی عبد الکریم کی معطلی پر لوگوں کو آمادہ کیا اور اکثریت سے معطل کرایا۔ دوسری طرف قوم میں مولانا کو بدنام کر رہے تھے اور ہر جگہ اپنی برأت کا ڈھنڈورا پیٹ رہے تھے اور یقین دلا رہے تھے کہ انھوں نے جو کچھ کیا مولانا کی دھمکی سے کیا۔ اس لیے ان باتوں کی تردید لکھنے کی طرف سید سلیمان ندوی کو توجہ دلائی، تاکہ لوگوں کو صحیح حالات اور واقعات سے آگاہی ہو (۲۶)۔

مولوی امین زبیری صاحب بیگم بھوپال کی ایما پر عورتوں کے سلسلے میں ایک کتاب لکھنا چاہتے تھے۔ اس کے مواد کے لیے عورتوں پر جو کتابیں لکھی گئی تھیں ان کی تلاش تھی۔ چناں چہ مصر میں حال کی چھپی ہوئی ایک کتاب الدر المنثور فی ریات الخدور کی اطلاع مولانا نے دی جس میں تمام قوموں کی عورتوں کے حالات تھے اور یہ بھی لکھا کہ ہندوستان میں ملتی ہے۔ امین زبیری صاحب نے یہ بھی لکھا تھا کہ مولانا لکھ دیں، اس پر انھیں جواب دیا کہ وہ اپنی صحت کی خرابی اور کمزوری کی وجہ سے نہیں لکھ سکتے تھے۔ لیکن مولوی عبد السلام ندوی کو تاکید کی کہ وہ لکھ دیں۔ مولانا کی اپنی حالت یہ تھی کہ اب خط لکھنے کے قابل بھی نہیں رہے تھے۔ صرف صبح کو اپنے عزم و حوصلہ کی بنا پر جس طرح ہو سکتا تھا سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم لکھ لیتے تھے۔

امین زبیری صاحب کو یہ بھی لکھا کہ اگر مولوی عبد السلام ندوی سے لکھوانا ہے تو ان کو الدر المنثور مہیا کر دیں۔ اس زمانے میں مولانا کی ہدایت پر مولوی عبد السلام ندوی بیگم بھوپال کی کتاب پر ریویو لکھ رہے تھے اور ارادہ تھا کہ اس کو ظل السلطان بھوپال میں شائع کرا دیں (۲۷)۔

سید سلیمان ندوی اب الہلال کلکتہ کی ادارت میں شامل ہو گئے تھے۔ اس کے بعد مولانا

سے مشورہ کیا تو انھوں نے لکھا کہ شامل ہونے کے بعد مشورہ کیا، اگر مناسب ہے تو عارضی اور مستقل شمولیت دونوں ٹھیک ہیں اور مناسب نہیں تو دونوں قسم کی شمولیت غلط۔ مراد یہ تھی اگر سوچ سمجھ کر ہر لحاظ سے مناسب سمجھ کر شمولیت اختیار کی ہے تو خواہ عارضی شمولیت ہو یا مستقل، جائز ہے اور اگر ایسا نہیں کیا گیا تو غلط ہے۔ بہرحال اگر سید صاحب کو پسند ہے تو ان کی بھی پسند ہے۔

چوں کہ سید سلیمان ندوی کا الہلال کلکتہ سے تعلق ہو گیا تھا اس لیے مولانا نے چاہا کہ انھوں نے سیرتؐ سے متعلق تاریخ عرب اور پیغمبر اسلام اور یورپ پر جو کچھ لکھا تھا وہ رجسٹری سے مولانا کو بھیج دیں، تاکہ اس سے کام لیں۔

بمبئی میں مولانا کو صحت کے اعتبار سے صرف اتنا فائدہ ہوا تھا کہ غذا دونی ہو گئی تھی، مگر کمزوری میں ابھی کمی نہیں ہوئی تھی، اس کو بھی غنیمت سمجھ رہے تھے۔

اسی زمانے میں عبدالحکیم کندی کی معتبر اور قدیم تصنیف ولاۃ مصر جو حکام مصر کی ابتدا سے مصنف کے زمانے تک تاریخ تھی، مصر میں شائع ہوئی تو مولانا نے خرید لی اور اس کی اطلاع سید سلیمان ندوی کو دی (۲۸)۔

مولوی عبدالباری ندوی اب بھی مولانا کو کشمیر بلا رہے تھے۔ اس پر مولانا نے جواب دیا کہ اب تو بمبئی کے قابل بھی نہیں رہے، اس لیے کہ بمبئی میں دن بھر دروازہ بند رکھنے کے باوجود ہوا کی خنکی برداشت نہیں ہوتی۔ ایک مرتبہ بے احتیاطی ہو گئی تو بخار آگیا۔ یہ بھی لکھا کہ تیل تمام ہو گیا اور اب ان میں کچھ نہیں رہا تھا۔ چوبیس گھنٹے میں غذا صرف پاؤ بھر تھی، بات کرنا بھی گراں گزرتا تھا، حالاں کہ بخار وغیرہ اب نہ تھا۔ مولانا کے خلاف مخالفین نے اتنا طوفان اٹھایا مگر اپنی نقاہت کی وجہ سے مفصل نہ لکھ سکے۔ اصل میں مولوی عبدالکریم کے قصے کی ابتدا اس طرح ہوئی تھی کہ لوگوں نے ان کو یقین دلایا کہ جوشیلے مضمون علی الخصوص طرابلس کی جنگ پر لکھنے سے آزاد گوئی ظاہر ہوگی اور ان کی الندوہ کی ادارت چمکے گی۔ اس بھڑی میں مولوی صاحب آگئے اور لوگ پیٹھ ٹھونکتے رہے یا ممکن ہے کوئی اور بات ہو۔ مولانا کا خیال تو یہی تھا۔ مولانا عبدالباری کو اطلاع دی کہ جامع مسجد کے کتب خانے میں قفال کی کتاب محاسن الشرعیہ کا نایاب قلمی نسخہ موجود ہے۔

مولانا کو اپنی گرتی ہوئی حالت سے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب زیادہ زندہ نہیں رہنا ہے، اس

لیے مولوی صاحب کو لکھا کہ وہ خود تو چراغ سحری ہیں، اب وہ لوگ (مولانا کے شاگرد جن میں مولوی صاحب بھی تھے) اپنی ذمہ داریاں محسوس کریں۔ وہ خود اپنے عیوب کو بہتر جانتے تھے "المرء اعرف بنفسه" لیکن صحیح علمی مذاق پھیلانا اپنا کام سمجھتے رہے اور اس کے لیے کوشش کرتے رہے اگر اس میں ذرا بھی کامیابی ہوئی ہو تو مسلم گزٹ کے مصنوعی معائب بھی قبول کرنے پر تیار تھے۔ قوم نے جو مولانا کے ساتھ سلوک کیا اس سے بہت بددل تھے اور اس نے تو ایسا ہی سلوک اور لوگوں کے ساتھ بھی کیا تھا، اس لیے مطمئن بھی تھے۔ جن لوگوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک ہوا ان میں آغاخان، محمد علی خان (راجہ محمود آباد) (۲۹) محمد علی کو آسمان پر چڑھایا پھر دے پٹکا۔ عقل سے کام لینے کا مادہ نہیں۔ مسلم گزٹ کی ہر تحریر کو ایک لڑکا بھی سمجھ سکتا تھا کہ معاندانہ اور یک طرفہ تھی، لیکن لوگ اس کی حریت کے قائل تھے (۳۰)۔

اسی زمانے میں مولانا نے الہلال میں ایک پرجوش نظم اپنے نام سے بھیجی، اس لیے لوگوں کے برا ماننے کا اندیشہ تھا۔ مدینہ یونیورسٹی کی تجویز ہوئی تو قسطنطنیہ کو لکھنؤ سے توارد ہوا، مگر مولانا اس کو بہت ضروری سمجھتے تھے۔ لیکن مولانا میں اب ہمت نہ رہی تھی کہ اس کے لیے کچھ کرتے۔ اگر پہلی سی طاقت و قوت ہوتی تو مدینہ منورہ جاتے اور اس کے ضروری انتظام اور قیام میں مدد دیتے (۳۱)۔

مولوی امین زبیری کو جامعہ ازہر کے نصاب کی ضرورت ہوئی تو انھوں نے مولانا کو لکھا، کیوں کہ مولانا کو خاصی واقفیت تھی اور وہاں کے لوگوں سے خط و کتابت بھی تھی، تو مولانا نے لکھا کہ شیخ سلیم بشری شیخ الجامعہ ازہر قاہرہ سے خود ہی لکھ کر منگالیں، کیوں کہ ریاست کی تحریر کا خاص خیال رکھا جائے گا۔ ورنہ پھر مولانا خود ہی منگا دیں گے۔

ندوے میں ایسے مخالفین کی حرکتوں کی اطلاع دیتے ہوئے مولوی امین زبیری کو لکھا کہ مولانا نے دفع الوقتی کے لیے عبدالکریم صاحب کو چند روز کے لیے جس جلسے میں معطل کیا اس میں مخالفین شریک تھے اور رائے بھی موافقت میں دی، اس کے بعد سب نے مل کر اس فیصلے کو منسوخ کرا دیا۔ اس کے بعد خاموشی سے کمشنر سے اور دوسرے حکام سے مل کر گورنمنٹ کا پہلو ظاہر کر کے سرخ رو بنے اور ارکان ندوہ کو مخفی خطوط لکھ کر اور رائے لے کر مولوی صاحب کو معطل کر دیا اور قوم کو یہ بتلایا کہ جو کچھ کیا مولانا نے کیا۔ مولانا کے پاس ان سب باتوں کے ثبوت میں تمام اصلی اور مطبوعہ کاغذات موجود تھے، جن کو کوئی بھی دیکھ سکتا تھا۔

گورنر نے جو خط بھیجا تھا اس میں لکھا تھا کہ وہ الندوہ کے مضمون کو شرانگیز خیال کرتے ہیں اور یہ مولانا کو پہلے ہی سے معلوم تھا اور ندوے میں یہ کارروائی نہ کی جاتی تو گورنمنٹ خود مقدمہ قائم کرتی اور مولوی فضل الحسن حسرت موہانی بی اے کے باغیانہ مضمون کے مقدمے میں جس طرح نواب وقار الملک کو عدالت میں جاکر گواہی دینا پڑی تھی، ندوے والوں کو بھی جاکر عدالت میں گواہی دینا پڑتی۔

سید سلیمان ندوی کو مولانا کا وہ خط نہیں ملا، اس لیے پھر لکھا کہ مصنفین یورپ اور جاہلیتِ عرب پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے جلد بھیج دیں، کیوں کہ اب سیرت کو شروع سے مکمل کر دینا چاہتے تھے، تاکہ چھپنے کے قابل ہو جائے۔ اس زمانے میں غزوات پر مفصل ریویو لکھ رہے تھے

اب کی مولانا کو بمبئی کی آب و ہوا بھی راس نہ آئی اور ملیریا نے آدبایا اور برابر اس کی شکایت رہنے لگی (۳۲)۔

اس مرتبہ مولانا کے ساتھ کوئی خوشنویس نہیں آیا تھا، لہذا سخت ہرج ہو رہا تھا۔ خوشنویس کے لیے اشتہار بھی دیا، مگر کسی کی درخواست نہیں آئی۔ اس لیے مولوی امین زبیری کو لکھا کہ اگر ان کی نظر میں کوئی ہو تو اس کا نمونہ بھیج دیں۔ تنخواہ ۲۵ روپے ماہانہ اور مکان رہنے کو مفت دینے کو تیار تھے۔

مولانا کو عبدالکریم صاحب کے معاملے میں بدنامی سے بڑا دکھ ہوا، لیکن ان کو تسلی اور خوشی اس بات کی تھی کہ ندوہ حکومت کے عتاب سے بچ گیا، کیوں کہ ڈپٹی کمشنر نے صاف کہہ دیا تھا کہ یا تو عبدالکریم صاحب کو نہ رکھا جائے یا پانچ سو روپے کی ماہانہ امداد سے ہاتھ دھو لیا جائے۔ امداد کا بند ہونا برداشت نہ ہو سکتا تھا اس لیے پہلی بات کو تسلیم کرنا پڑا۔

جن ممبروں نے مولانا کی مخالفت کی تھی انھوں نے دولت مندی کے باوجود ندوے کی ایک پیسہ کی بھی مالی امداد نہ کی اور اس کے ثبوت میں مولانا کے پاس کاغذات موجود تھے، جن کو دیکھا جا سکتا تھا (۳۳)۔

سید سلیمان ندویؔ کو مولانا برابر لکھ رہے تھے، مگر ان کو خط نہیں ملتے تھے۔ اس سے مولانا پریشان تھے، کیوں کہ یورپین مصنفین اور عرب جاہلیت پر سید صاحب نے جو مواد اکٹھا کیا تھا وہ اب تک موصول نہیں ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے ہرج ہو رہا تھا۔ اس کے علاوہ بھی مولانا کو

کئی باتیں لکھنا تھیں، مگر سید صاحب کو خطوط ہی نہ ملتے تھے۔

جولائی ۱۹۱۳ء

مولانا کی طبیعت بہت خراب رہی اور مولانا شروانی نے ان کی عیادت نہ کی تو ان کو شکایت ہوئی اور اسی زمانے میں ندوہ میں ان کے خلاف مخالفین نے طوفان اٹھایا، اس کی بھی ان کو خبر ہوئی، اس کی بھی انھوں نے شکایت کی کہ انھوں نے خبر نہ لی۔۔ بہرحال اب مولانا نے ندوہ والوں کی مخالفتوں سے تنگ آکر استعفا دے دیا اور بعض اور معززین نے بھی استعفا دے دیا۔ اب نائب ناظم (۳۴) ہی ندوہ کے کرتا دھرتا تھا۔ آئینی مخالفت اور تنقید کا جن سے خطرہ تھا وہ تو استعفادے کر ندوہ سے الگ ہو گئے۔

سیرت کے متعلق مولانا چاہتے تھے مولانا شروانی اس کو ایک نظر دیکھ لیتے، لیکن کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اردو ٹائپ رائٹر نہ تھا ورنہ دو تین نقلیں ہو جاتیں اور ایک نقل ان کے ملاحظہ کے لیے بھیج دی جاتی۔

اب مولانا سیرت کی پہلی جلد کا نصف حصہ گویا تیار کر چکے تھے، مگر ہر ہفتہ میں دو تین دن طبیعت خراب رہتی تھی، اس لیے ہرج ہوتا تھا۔ ان کو خود خیال نہ تھا کہ کامیابی سے اس کام کو کر سکیں گے، لیکن بڑی مشکلات پر قابو پالیا، گویا سیرت کے فن کو نئے سرے سے مرتب کیا، لیکن قدر وہی کرے گا جس نے طبری اور ابن اثیر کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہو۔

اس زمانے میں مولانا کا بمبئی میں نیو ناگ پاڑہ روڈ پر قیام تھا۔ (۳۵)

مولانا شبلی کے ساتھ مولوی عبدالحی، منشی احتشام علی، راجہ تصدق رسول خاں (راجہ جہانگیر آباد)، نواب علی حسن خاں جیسی شخصیتیں بھی ندوہ سے مستعفی ہو گئیں اور سب کا استعفا منظور ہو گیا۔ مولانا نے پہلے ہی اپنے خیال کا اظہار مولانا شروانی سے کیا تھا کہ ندوہ میں شورشیں، درانداز یاں اور نزاعی امور کا بار بار پیش کرنا سب نظامت کے شوق میں ہے، لیکن شروانی صاحب کو یقین نہ تھا۔ اب مولانا نے اسی بات کی طرف توجہ دلائی کہ جب سب لوگوں نے استعفادے دیا اور تنہا نائب ناظم رہ گئے تو وہ بات ان کی ٹھیک ہوئی یا نہیں۔

اب مولانا سوچ رہے تھے کہ بمبئی سے واپس آکر کہاں قیام کریں۔ لکھنو کا قیام مطلق ترک بھی نہیں کیا جاسکتا تھا (۳۶)۔

مولانا کے استعفے سے طلبائے دار العلوم میں بڑی بے چینی پھیلی اور انھوں نے اپنے خطوط اور تاروں میں اپنی حمایت کا یقین دلایا اور استعفا واپس لینے کی درخواست کی۔ اس سے مولانا بہت متاثر ہوئے اور انھیں تسلی دیتے ہوئے لکھا کہ موجودہ حالت میں ان کا کام کرنا مشکل ہے اور وہ دار العلوم کو کسی قسم کا فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ ویسے انھیں اپنی کوششوں اور جاں فشانیوں کی داد مل گئی اور یہ ان کی محنت کا پورا صلہ تھا۔ جن (طلبہ) کی خاطر کام کیا گیا وہ قدر کرتے ہیں۔ طلبہ کو مایوسی کی کوئی وجہ نہ تھی، اس لیے کہ اسلامی جماعت بیدار ہو گئی تھی اور اس میں شعور پیدا ہو گیا تھا کہ وہ اپنے برے بھلے کو سمجھ سکے اور اس کی مخالفت کرے، لیکن جو کام شروع ہو چکا ہے وہ چلتا رہے گا۔

ندوہ کی تشریح مولانا نے یہ کی کہ ندوہ موجودہ زمانے کے مقابلے میں مذہب کی حمایت ہے اور یہ احساس عام ہو گیا ہے۔ معارف قرآنیہ دہلی اسی کی ایک کڑی ہے (۳۶ الف) اور ندوہ اس کا نقش اول ہے۔ آخر میں مولانا نے طلبہ کو یقین دلایا کہ باوجود استعفے کے ان کا زندگی کا مرکز ندوہ ہی ہے اور وہ طلبہ کی خدمت نہ صرف دل بلکہ ہاتھ سے بھی کرتے رہیں گے (۳۷)۔

مولانا منتظر تھے کہ سید سلیمان ندوی کعبہ کی تعمیر اور حضرت اسمعیلؑ یا حضرت اسحقؑ میں سے کون ذبیح تھے؟ اس کے متعلق تحقیق کر کے لکھیں گے۔ قرآن مجید میں فبشرناہ بغلام حلیم ہے۔ اس سے لوگوں نے حضرت اسحقؑ مراد لیا ہے، کیوں کہ بشارت کا لفظ انھیں کے متعلق دوسرے موقع پر آیا ہے اور اسی کے بعد یہ آیت فلما بلغ معه السعی ہے۔ اس سے بھی حضرت اسحقؑ مراد ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا مولانا نے دریافت کیا کہ اس کا کیا جواب ہے اور اس سے کیا واضح ہوتا ہے، اس کی تحقیق کرنی چاہیے۔

چوتھی صدی کے ابن المالک الہمدانی الحمیری کا جغرافیہ "عرب" صفۃ جزیرۃ العرب" کے متعلق مولانا نے دریافت کیا کہ سید سلیمان ندوی کو کہاں سے ملی۔ مولانا بھی خریدنا چاہتے تھے، اس لیے ان کو ہدایت کی کہ ایشیاٹک سوسائٹی میں دریافت کریں۔

مولانا نے کتاب کا نصف حصہ یعنی وفات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک تیار کر لیا تھا اور عرب جاہلیت کے حالات کی جلدی تھی۔ چاہتے تھے کہ وہ جز آ جائے تو اس کو ٹانک کر پہلا حصہ مکمل کر لیا جائے (۳۸)۔

پروفیسر سید نواب علی (۳۹) نے مولانا سے ایک انگریزی خواں جو فارسی داں بھی ہو،

کے متعلق دریافت کیا تو مولانا نے لکھا کہ کالجوں کی فارسی معمولی ہوتی ہے اور فارسی کا پرانا طریقہ تعلیم معدوم ہو چکا ہے، اس لیے کالج کے فارسی جاننے والوں پر اطمینان نہیں۔

پروفیسر صاحب نے مولانا کو مشورہ دیا تھا کہ ندوہ میں مخالفین کے جواب میں سکوت اختیار کریں، تو مولانا نے انھیں لکھا کہ انھوں نے ایسا کر دکھایا اور آخر کار استعفا بھیج دیا۔ اب ندوہ میں ذاتیت کا دور دورہ تھا اور اس سے نقصان پہنچ رہا تھا اور انھیں لوگوں کی دراندازی کی وجہ سے وہ دو تین برس سے ندوہ کو ترقی نہ دے سکے تھے۔

سیرت کے متعلق لکھا کہ جلد اول وفات تک تیار ہے، مگر یہ کتاب کا دسواں حصہ ہے۔ انگریزی مآخذ میں جرمن میں سے صرف نولدیک اور وہماوسن کا ترجمہ کرا لیا ہے اور یہی لوگ مستند کہے جاسکتے ہیں۔ یورپین مصنفین کے متعلق لکھا کہ ان کی غلط کاریوں پر تعجب نہ ہونا چاہیے، جب کہ خود اسلامی مورخین نے سیکڑوں غلطیاں کی ہیں۔ اس لیے انھوں نے تاریخ کے طور پر نہیں لکھی، بلکہ عدالت کے فیصلہ کے انداز پر لکھی۔ یہ اور بات ہے کہ انداز تاریخی اختیار کیا ہے تاکہ لطف باقی رہے۔ (۴۰)

اس زمانے میں مولوی عبداللہ صاحب دارالعلوم کے مہتمم تھے۔ انھوں نے اور اساتذہ نے مولانا کے استعفے پر افسوس کیا اور ان کو اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ اس پر مولانا نے ان کو تسلی دیتے ہوئے لکھا کہ مخالفت کی بنا پر وہ کوئی کام نہ کر سکتے تھے، لہذا بغیر استعفا دیے کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اب جو لوگ برسر اقتدار ہیں ممکن ہے کہ ان سے بہتر کام کریں۔ رہ گیا ندوہ اور ندوے کے طلبہ کی خدمت، اس کی وہ کرتے رہیں گے۔ اگر طبیعت ٹھیک ہوتی تو لکھنو چلے آتے مگر اندیشہ تھا کہ لکھنو پہنچتے ہی سخت بیمار ہو جائیں گے (۴۱)۔

سیرت کے سلسلے میں مولانا نے مارگیوس کی لائف آف محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور سر ولیم میور کی کتاب اور نولدیکی جرمنی کا مقالہ اور قرآن مجید مندرجہ انسائکلوپیڈیا اور باسورتھ اور میکڈانلڈ کے اقتباسات کا ترجمہ کرایا تھا، لیکن ڈاکٹر اسپرنگر جرمنی کی لکھی ہوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری، جو تین ضخیم جلدوں میں تھی، اس سے فائدہ اٹھانے کا کوئی سامان نہ ہو سکا۔

مولانا نے پروفیسر نواب علی سے دریافت کیا کہ وہ دریافت کر کے لکھیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر جرمن، فرنچ اور انگریزی کی کون کون سی کتابیں ہیں اور جرمنی سے ترجمے کا

بندوبست کیا ہوگا۔ ایسی کتابوں کی ضرورت تھی جن میں فلسفیانہ طور پر مذہب اور اصول مذہب سے بحث ہو اور یہ کہ مذہب کوئی ضروری چیز ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو صحیح مذہب کے اصول کیا ہو سکتے ہیں؟ جواب آنے پر ان کتابوں کی خاطر مولانا کا بڑودہ جانے کا ارادہ تھا۔

مولانا نے دوزی (فرنچ) کی عربی دانی کی تعریف کرتے ہوئے عربی لغت پر جو اضافہ کیا تھا اس کو بہت سراہا اور نواب علی صاحب کو مطلع کیا۔ یہ بھی لکھا کہ ان کو انگریزی معلومات میں مدد دینے والے احباب اور تلامذہ میں پروفیسر عباس اور مولوی محمد علی بی۔ اے اور شیخ عبد القادر پیش پیش ہیں (۴۲)۔

مولانا نے عبدالحکیم صاحب دیسنوی کو بھی استعفے کے معاملے میں اپنی مجبوری لکھی اور یہ بھی لکھا کہ دلی کا جلسہ، آغاخان کا ندوہ میں لانا اور ان سے سالانہ امداد مقرر کرانا، رام پور سے ندوہ سے تعلقات، گورنمنٹ سے صفائی کے وسائل، علامہ سید رشید رضا کی ندوہ میں آمد، یہ سارے کام وہ مخالفت کے باوجود کرتے رہے۔ آخر کہاں تک برداشت کرتے، لہٰذا استعفا دیا اور اچھا ہوا، کم از کم سکون سے چند سال دربار رسالت کے آستانے پر حاضری رہے گی (۴۳)۔

مولانا اب سیرت ابتدا سے اس طرح لکھ رہے تھے کہ مکمل ہوتی جاتی ہے اور مطبع میں دینے کے قابل ہوتی جاتی تھی، لیکن بعض جگہ اس ترتیب میں بھی ردوکاٹ ہو رہی تھی۔ بعض مباحث میں استفسار اور تحقیق کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس وقت مولانا کے سامنے دو تین باتیں تحقیق طلب تھیں، مثلاً یہ کہ توراۃ میں یہ تصریح تھی کہ حضرت اسمٰعیلؑ بیرسبع یا فاران میں آباد ہوئے اور کتاب پیدائش باب ۲۵ درس ۱۸ میں یہ الفاظ ہیں:

> "اور وہ حویلہ سے شور تک، جو مصر کے سامنے اس راہ میں ہے جس سے اسور کو جاتے ہیں، بستے تھے، ان کا قطعہ، زمین ان کے سب بھائیوں کے سامنے پڑا تھا۔"

ان عبارتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ و ہاجرہ عرب میں نہیں آئے۔ اس کے متعلق مولوی حمید الدین کی تحقیق دریافت کی اور یہ بھی دریافت کیا کہ توراۃ کو اس معاملے میں کیوں نظر انداز کر دیا جائے۔

دوسری بات کی بھی تحقیق کرنا تھی، وہ یہ کہ بخاری کتاب الانبیاء میں ایک حدیث ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ جب مکہ میں آئے تو شیر خوار تھے، لیکن توراۃ میں ختنہ

کے ذکر میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جب حضرت اسمٰعیلؑ کا ختنہ کیا تو ان کی عمر ۱۳ برس کی تھی۔ ان دونوں واقعات کی تطبیق کس طرح ہو سکتی ہے؟ (۴۴)

اب مولوی عبد السلام ندوی سابق اڈیٹر الندوہ سیرت میں مولانا کے مددگار کی حیثیت سے کام کر رہے تھے، اس لیے ضروری مباحث کی تحقیق کے لیے لوگوں کو عموماً وہی خط لکھتے تھے۔ مولانا آج کل توراۃ سے بھی کام لے رہے تھے۔ سیرت کے سلسلے میں مولانا کا الہ آباد میں چند روز مستقل قیام کا ارادہ تھا، کیوں کہ ان کی نظر میں وہاں کا مواد بھی تھا۔

مولانا اس زمانے میں وادی بکا کی تحقیق میں لگے ہوئے تھے، کیوں کہ یہ لفظ زبور ۸۴ آیت ۶ میں تھا اور بعض یورپین کی رائے تھی کہ یہ بکہ ہے جو مکہ کا نام تھا، لیکن موجودہ نسخوں میں وہ بکا تھا، اس لیے مولانا نے چاہا کہ مولوی حمید الدین اس کی تحقیق کر کے لکھیں کہ حقیقت کیا ہے (۴۵)؟

مولوی مسعود علی ندوی نے مولانا کے استعفے سے متاثر ہو کر خط لکھا تو مولانا نے ان کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ دار العلوم اور قوم کی خاطر ہی مناسب تھا اور کام کرنے والے کے لیے کام بہت ہیں۔ مولوی صاحب نے بمبئی آنے کے ارادے کا بھی اظہار کیا تھا، تو مولانا نے لکھا کہ بہتر ہے۔ موسم بھی اچھا ہے، گرمی نام کو نہیں، تفریح بھی ہو جائے گی۔ (۴۶)

اس زمانے میں مولوی حمید الدین کے ہاتھ پر ایک انگریز مسلمان ہوا۔ اس کے متعلق مولانا کو اطلاع ہوئی تو بہت خوش ہوئے اور مزید حالات دریافت کیے کہ نومسلم کی معاش کیا ہے اور کس مکان میں رہتے ہیں؟ مولانا کا ارادہ رمضان شریف میں بمبئی سے واپس آنے کا تھا، مگر چوں کہ مولوی حمید الدین سے رمضان میں ملاقات کم ہو پاتی اور افطار کے بعد وقت کم ہوتا ہے اس لیے عید کے بعد آنے کا ارادہ کیا۔

مولوی حمید الدین دلی گئے تھے اور وہاں زیادہ قیام کیا تو مولانا کو خیال ہوا کہ شاید مولانا عبید اللہ سندھی ناظم نظارۃ المعارف القرآنیہ دہلی کی وجہ سے ٹھہر گئے ہوں اور نظارۃ المعارف کے متعلق بھی معلومات حاصل کیں اور یہ بھی دریافت کیا کہ اتنے بڑے مدرسے کو کیا وہ تنہا چلا سکتے ہیں (۴۷)؟

اگست ۱۹۱۳ء

اب مولانا کا ارادہ ایک آدھ ہفتہ میں الہ آباد جانے کا تھا۔ سیرت کا پہلا حصہ گویا ختم کر چکے تھے، جس کے آخر میں غزوات پر ایک مستقل باب لکھا تھا اور تمام غزوات کو ایک سلسلے میں کر دیا تھا اور بہت سی باتیں اس میں نئی پیش کی تھیں۔

عرب کے متعلق سید سلیمان ندوی کا مضمون آچکا تھا اور اس سے استفادہ کر کے اب واپس کرنے کا ارادہ تھا۔ انگریزی مواد میں بعض چیزیں مولانا کو نئی ملی تھیں۔ مثلاً ایک انگریز نے ایک مستقل کتاب میں تمام مباحث پر فیصلہ لکھا تھا اور ثابت کیا تھا کہ حضرت اسمعیلؑ نہ ذبیح تھے اور نہ عرب کے مورث۔ ایک اور تصنیف قرآن مجید پر بھی دیکھنے میں آئی۔

اب مولانا نے ارادہ کر لیا تھا کہ دو تین مہینے میں سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ابتدائی اجزا مطبع میں بھیج دیں۔ سیرت کے متعلق مولانا چاہتے تھے کہ سید سلیمان ندوی کے ذہن میں جو امور آئیں، یعنی کن کن امور پر زیادہ توجہ دی جائے، ان کو یادداشت میں لکھتے ہیں۔ اور وقتاً فوقتاً مولانا کو لکھتے رہیں۔ ضروری ہو تو ان امور کو پیش نظر رکھ کر توجہ دی جائے۔ (۴۸)

مارگیولس نے لائف آف محمد میں اصابہ مطبوعہ کلکتہ کے حوالہ کی بنا پر مکہ کی قدامت سے انکار کیا تھا اور سیرت کے دفتر میں اصابہ مطبوعہ مصر نہ تھی۔ اس لیے مولانا نے شروانی صاحب سے دریافت کیا کہ اصابہ مطبوعہ کلکتہ صفحہ ۹۱۵ میں کیا یہ تصریح موجود تھی کہ مکہ میں پہلا مکان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف دو تین نسل پہلے تعمیر ہوا تھا۔ یہ یا اس سے ملتی جلتی عبارت کی نقل بھیجنے کی خواہش کی۔

مذہب حنفی جو مکہ میں اسلام سے پہلے خال خال پایا جاتا تھا، اس کے متعلق مولانا تحقیق کر چکے تھے، لیکن تسلی نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے مزید تحقیق کے خواہش مند تھے اور چاہتے تھے کہ اس سلسلے میں شروانی صاحب بھی مدد دیں، اس لیے یہ ضرورت اور پیش آئی کہ متعلقہ کتابیں مولانا کے پاس بمبئی میں موجود نہ تھی۔ بخاری شریف اور سیرت ابن ہشام میں جو کچھ تھا وہ مولانا کو معلوم ہی تھا۔ اس کے علاوہ معلوم کرنا چاہتے تھے (۴۹)۔

اب مولانا پھر علیل تھے، اس وجہ سے روز دو گھنٹے سے زیادہ کام نہیں کر سکتے تھے، اس لیے سید سلیمان ندوی کے الہلال کلکتہ میں چلے جانے کا افسوس تھا کہ اگر وہ موجود ہوتے تو سیرت

کے علاوہ اور حصے بھی ساتھ ہی تیار ہو جاتے اور ان حصوں کو وہ اچھی طرح لکھ سکتے تھے۔ غزوات کا مسودہ مرتب، مسلسل اور صاف ہو کر تیار ہو گیا تھا۔ یہ تحقیق ہو گیا تھا کہ سرایا چند خاص قبائل سے تعلق رکھتے تھے، جو قریش کے حلیف تھے یا جن کے غارت گری کے پیشے کو نقصان پہنچانا تھا اور دیگر مشکلات کا بھی حل نکل آیا تھا۔

مولانا کو مذہب کے اصول کے متعلق کتابوں کی ضرورت تھی، لہذا اس عنوان پر انگریزی تصنیفات مہیا ہو گئی تھیں۔ ایک کتاب صرف اصول الحاد پر تھی اور ایک اس کی رد میں ایک کتاب خاص انجیل کی رد میں تھی کہ اس کی تعلیمات غلط ہیں۔ عربی میں ایک کتاب مل گئی تھی جس میں اصول فقہ اسلام کا رومن لاء اور موجودہ قوانین سے مقابلہ کیا گیا تھا۔ بہر حال مواد تو خاصا اکٹھا ہو گیا تھا، صرف اس سے کام لینا باقی تھا۔ سید سلیمان ندوی کے پاس سیرتؐ پر جو کتابیں تھیں ان کو مولانا نے طلب کیا۔ خصوصاً الرحلۃ الحجازیہ کو طلب کیا۔ مولانا نے عرب کے متعلق سید سلیمان ندوی کا مضمون اس ہدایت کے ساتھ واپس کیا کہ اس میں اضافہ کریں، لیکن انداز تحریر نہ بدلنے پائے اور پیوند معلوم نہ ہو۔

مولانا ندوہ سے استعفا دے کر الگ تو ہو گئے تھے مگر ندوہ کی لگن جو ان کے دل میں لگی ہوئی تھی اور جس انداز پر وہ اس کو دیکھنا چاہتے تھے اس کا تقاضا تھا کہ وہ بحیثیت قوم کے ایک فرد کے اصلاحی اسکیم سوچتے رہتے اور اس کے لیے کوشش جاری رکھتے۔ چنانچہ اس سلسلے میں سید سلیمان ندوی کو ہدایت کی کہ ندوہ کے متعلق مضامین کا سلسلہ شروع کیا جائے اور امور ذیل پر توجہ کی جائے۔

۱۔ مختلف النوع مضامین ہوں، بعض ظرافت اور لطافت آمیز، بعض بالکل سنجیدہ، بعض کھلے خط جن میں بالکل سادہ اور بے غرضانہ انداز میں بتانا چاہیے کہ ندوہ کی ترقی کے لیے کیا چیزیں ضروری ہیں۔

مولانا محمد علی مونگیری کی خدمات میں ان کا دائرہ اثر، قوت تقریر، اطراف ملک کا دورہ، احباب پر اثر، ریاستوں سے تعلقات اور اس کی وجہ سے وحید الزماں کے ذریعہ وقار الامرا سے ندوہ کے لیے سو روپے مقرر کرانا اور پیری مریدی کی وجہ سے ان کا لوگوں پر اثر، یہ ساری باتیں ندوہ کی ترقی کا سبب بنیں۔ اس کے بعد مولانا شبلی کے اثرات کام آئے۔ انھوں نے بھوپال، رام پور اور آغا خان سے اپنے اثر سے ندوہ کے لیے امداد لی۔ لہذا موجودہ ناظم سے ان چیزوں کو پیش کر

کے سوال کیا جاسکتا تھا کہ ان میں مندرجہ بالا جیسی کون سی صلاحیت تھی کہ جس سے وہ کام لیتے اور کون سا طریقہ اختیار کرتے کہ ندوہ کی ترقی ہو اور یہ سوالات اس انداز میں کرنے کی ضرورت تھی، کنایہ یا تعریض بالکل نہ ہو اور بغیر جواب دیے بن نہ پڑے۔

اس کے بعد مولانا نے آئینی اور بنیادی غلطیوں کی طرف توجہ دلائی۔ مثلاً یہ کہ جلسہ انتظامیہ، جس نے ساری کارروائیاں کی تھیں، اس نے بے قاعدگیاں کیں اور وہ یہ کہ دستور العمل میں قاعدہ تھا کہ ہر فیصلہ طلب امر پندرہ دن پہلے ارکان کے پاس پہنچ جائے اور ان کی تحریری رائے منگوائی جائیں، مگر مولانا شبلی کے استعفے کے سلسلے میں ایسا نہیں ہوا، اس لیے کہ وہ جلسے سے صرف چند روز قبل بھیجا گیا۔ اس لیے وہ پندرہ دن قبل ارکان کے پاس کیسے پہنچا اور استعفا اسی جلسے میں منظور کیا گیا، جو چند ہی روز کے بعد ہوا۔

دستور العمل کے رو سے ناظم کا تقرر جلسہ عام کی منظوری کے بعد ہو سکتا تھا، مگر جلسہ انتظامیہ (۵۰) نے ان کو ناظم بنا دیا، لہٰذا جو اختیارات ان کو حاصل ہوئے وہ غلط ہوئے۔

نئے نظام کے تحت معتمدیاں (تین تھیں جس میں سے ایک معتمد مولانا شبلی تھے) توڑ دی گئی تھی۔ لیکن یہ تجویز ارکان کو نہیں بھیجی گئی، عین وقت پر پیش کی گئی اور منظور ہو گئی۔ دیگر امور بھی ارکان ندوہ کو نہیں بھیجے گئے اور جلسہ انتظامیہ نے طے کر دیے تو پھر دستور العمل بے کار اور محض دکھانے کے لیے تھا۔

لیکن ان سب خرابیوں کے باوجود مولانا کو چند باتیں مفید بھی معلوم ہوئیں۔ مثلاً ہیڈ ماسٹر کا دوسری جگہ تعلق ہو جانے اور چھ ماہ کی رخصت پر جانے اور بعد کو استعفا پیش کرنے کی وجہ سے جو انگریزی کا نقصان ہو رہا تھا وہ رفع ہو جانے کا احتمال تھا اور مولوی عبداللہ صاحب کے اختیارات بھی وسیع ہو گئے، جن سے اصلاح کی بڑی امیدیں تھیں۔ بعض مستعفی حضرات ہر ہر کام میں رکاوٹ ڈالتے تھے، وہ رکاوٹ دور ہو گئی۔

معتمدیوں کے ٹوٹنے سے یہ فائدہ ہوا کہ قوت ایک جگہ ہو گئی۔ یہ ضرور تھا کہ انجمن (ناظم) مناسب نہ تھا، لیکن ناظم بھی کب تک رہتے۔ اس کا امکان تھا کہ کوئی کام کا آدمی منتخب ہو جاتا اور یہ رکاوٹ بھی دور ہو جاتی اور اگر معتمد تین رہ جاتے تو ان کا ہٹانا مشکل ہوتا، اس لیے کہ ایک آدمی کا ہٹانا آسان ہوتا ہے اور تین آدمیوں کا ہٹانا بہت دشوار ہوتا ہے۔

کچھ ہی دن قبل کان پور کی مسجد کے غسل خانے کو گورنمنٹ نے سڑک نکالنے کے لیے توڑ

دیا، جس پر مسلمانوں میں ہیجان پیدا ہوا اور انھوں نے احتجاج کیا تو گورنمنٹ نے راج ہٹ سے کام لے کر گولی چلادی۔ اس واقعے سے پورے ہندوستان کے مسلمانوں میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی لکھنو میں بھی ہیجان تھا اور حساس طبیعتیں اس واقعے سے بہت متاثر ہوئیں۔ مولانا شبلی نے شہیدوں کا بڑا پردرد اور پراثر مرثیہ لکھا (۵۱)۔

سید سلیمان ندوی نے مولانا کو پہلے کبھی لکھا تھا کہ بطلیموس کا جغرافیہ، فارسٹر کا جغرافیہ اور سیاحت نامہ ہائے یمن، کلکتہ کی انگریزی دوکانوں میں مل سکتے ہیں اب مولانا کو ان کی ضرورت تھی، اس لیے لکھا کہ بطلیموس کے جغرافیہ کی قیمت دریافت کر کے لکھیں اور بقیہ کتابیں وی۔پی کے ذریعہ بھجوادیں۔

اسی زمانے میں ابوالکلام آزاد لکھنو گئے تو ندوہ کی ردی حالت دیکھ کر بہت افسوس ہوا اور مسٹر مظہر حق بیرسٹر، جو پہلے جا چکے تھے، وہ بھی بہت متاثر ہوئے۔ ان لوگوں نے طلبہ کو بھی افسردہ پایا (۵۲)۔

اسی زمانے میں مولوی مسعود علی ندوی نے ندوہ سے فراغت کی اور ان کا وداعی جلسہ ہوا یہ اطلاع اور مولوی مسعود علی کا خط ملا ضرور تھا لیکن سیرت کی پرکیف خدمت میں مصروف تھے، اس لیے جواب نہ لکھ سکے۔ جس قدر سیرت ختم کے قریب ہوتی جاتی تھی، مولانا کا ذوق بڑھتا جاتا تھا۔ اس لیے ارادہ تو یہی تھا کہ پہلی جلد ختم کر کے بمبئی سے ہٹیں، کیوں کہ لکھنو میں یکسوئی نہ تھی۔ لیکن ظاہراً حالات یہی تھے کہ پہلے آنا پڑتا، کیوں کہ بعض امور میں مولوی حمید الدین سے مشورہ کرنا تھا۔ مولوی مسعود علی نے اپنے بارے میں مشورہ لیا تھا کہ آئندہ کیا کریں، تو لکھا خط و کتابت کے ذریعہ فیصلہ ممکن نہیں، بالمشافہ تبادلہ خیال کے بعد مشورہ دیا جاسکتا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ عملی آدمی تھے، اس لیے اہل قلم کے مقابلے میں زیادہ کام کر سکتے تھے (۵۳)۔

مولانا کا خیال تھا کہ وقت کی پکار کان پور کا واقعہ ہے اور تمام چیزیں اس کے آگے ہیچ ہیں، لیکن گورنمنٹ بھی سختی پر آمادہ ہے۔ گورنر کے پاس جو سفارش گئی اس کو بھی سوکھا جواب مل گیا لکھنو میں کان پور کے واقعے کی ہمدردی اور اعانت میں جلسہ ہونے والا تھا۔ اس کو گورنمنٹ نے روک دیا۔ خواجہ حسن نظامی کو کلکٹر نے بلا کر ناراضی کا اظہار کیا، مگر اس سب کے باوجود مولانا کا جیسا حساس شخص کیسے خاموش تماشائی بن سکتا تھا۔ چناں چہ ایک مختصر نظم کان پور کے متعلق لکھ کر زمیندار لاہور بھیج ہی دی۔ نظم تھی تو مختصر، مگر اختصار کے باوجود پراثر تھی۔

مولانا کی کلکتہ جانے کو بار بار طبیعت چاہتی تھی، مگر سیرت کے لیے کتابوں کی کئی الماریاں ساتھ رکھنا پڑتی تھیں اور سب ساتھ جا نہیں سکتی تھیں۔ لکھنؤ سے کتابوں کا کافی ذخیرہ ساتھ لے گئے تھے۔ سورتی صاحب سے بھی مستعار مل جاتی تھیں، اس کے باوجود بہت سی خریدنی پڑتی تھیں۔ چوں کہ بہت کچھ کام ہو بھی چکا تھا اس لیے اب یہ فکر تھی کہ جلد سے جلد پریس میں بھیج دیا جائے۔

عماد الملک سید حسین بلگرامی بھی اس زمانے میں حیدر آباد (دکن) بلا رہے تھے، لیکن مولانا سیرت کے کام میں ہرج کی وجہ سے جانا نہ چاہتے تھے۔ وہ بھی نیک کام میں بہت مصروف تھے، یعنی قرآن مجید کا ترجمہ کر رہے تھے اور اب تک پندرہ پارے کر چکے تھے۔

مولانا ابو الکلام آزاد نے اپنا نصب العین بڑا اونچا رکھا تھا یعنی مسلمانوں کی اصلاح کر کے ان میں شعور پیدا کرنا کہ وہ اپنے برے بھلے کو سمجھ سکیں اور آپس کے اختلافات کو بھلا دیں اور ان کا نقیب الہلال کلکتہ تھا۔ مولانا اس چیز کو تحسین کی نظر سے دیکھتے تھے اور سوچتے تھے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کلکتہ چلے جائیں اور وہ اور مولانا ابو الکلام آزاد مل کر کام کریں، اس لیے کہ جنگ طرابلس، جنگ بلقان اور کان پور کی مسجد کے واقعے کی وجہ سے مسلمان ہر جگہ پریشان، پراگندہ خیال اور پریشان عمل ہو رہے تھے۔ ان کو کسی خاص مرکز پر لانا قوم کی سب سے بڑی خدمت تھی ورنہ ہر طرف بھٹکتے بھٹکتے بالکل برباد ہونے کا اندیشہ تھا۔

مولانا آزاد کی اہلیہ کی طبیعت ان دنوں خراب تھی۔ ان کی عیادت کرتے ہوئے مولانا نے خیریت دریافت کی۔

مولانا کی جدید نظمیں علی گڑھ والے شائع کر رہے تھے اور وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ وہ نظمیں بھی شائع کریں جو انھوں نے کشاف کے نام سے الہلال کلکتہ میں چھپوائی تھیں۔

عطیہ فیضی کے شوہر مسٹر رحمین فیضی (۵۴) اس زمانے میں مشہور مصور تھے۔ انھوں نے مولانا کی ہاتھ سے تصویر (۵۵) کشی کی تھی، لیکن ابھی پورے طور پر تیار نہیں تھی۔ مولانا کا ارادہ تھا کہ تصویر تیار ہونے کے بعد فوٹو لے کر مولانا آزاد کو بھی بھیجیں۔

اسی زمانے میں ترکی کے خوبصورت سفیر نے مولانا سے خواہش کی کہ وہ ان کے ساتھ اپنا فوٹو کھنچوائیں۔ چناں چہ ایک انگریز فوٹو گرافر نے فوٹو لیا۔ اس میں توفیق آفندی بھی شامل تھے (۵۶)۔

مولانا کے بعض سوالات کے جواب میں مولوی حمید الدین کا مفصل جواب آگیا۔ اس میں سیرتؐ کے متعلق جو ضروری مشورے دیے گئے تھے وہ مولانا کے پیش نظر پہلے سے تھے۔ بعض باتیں اب بھی تحقیق طلب تھیں، لہٰذا مولانا نے مولوی حمید الدین کو لکھا کہ وہ تحقیق کر کے لکھیں۔ مثلاً اکثر کتابوں میں دادی بکا کا املا بکاء بھی لکھا ہوا تھا۔ چناں چہ ایک نسخے میں یہی معنی لیے گئے تھے، اس لیے مولانا نے مولوی حمید الدین کو ہدایت کی کہ وہ عبرانی نسخہ دیکھ کر صحیح بات لکھیں دوسری بات یہ دریافت کی کہ ان آیتوں کا حوالہ لکھیں جس میں قربانی کے لیے بقر ضروری ہے۔ بعض باتیں مولوی حمید الدین نے لکھی ضرور تھیں، مگر بغیر حوالے کے لکھی تھیں اور چوں کہ بغیر حوالے کے کوئی چیز مستند نہیں سمجھی جاتی، لہٰذا اس پر اعتماد نہیں کیا اور لکھا کہ سند میں حوالہ پیش کریں۔

مولانا نے سورۃ کے معنی دریافت کیے، جس کو انگریزی میں تحریف کر دیا گیا ہے۔

مولانا کی علالت کا سلسلہ جاری تھا، اس کے باوجود کام کر رہے تھے، لیکن پہلی جلد کی تیاری کے لیے اب دو تین مہینے اور درکار تھے اور اس جلد کی ضخامت کا تخمینہ پانچ سو صفحات تھا۔

ڈاکٹر انصاری کا وفد، جو جنگ بلقان میں ترکوں کی طبی امداد کے لیے گیا تھا، وہ اب واپس آگیا تھا۔ مولانا نے اس کے خیر مقدم میں ایک نظم لکھی تھی اور وہ زمیندار لاہور اور وکیل امرتسر میں چھپی تھی۔ اس کو انھوں نے خیر مقدم کے جلسے میں پڑھی تھی۔ اس کو سن کر تمام لوگ بے اختیار رو پڑے تھے۔ خود مولانا پر بڑی رقت طاری ہوئی۔ اس کا پہلا شعر یہ ہے:

ادا کرتے ہیں ہم شکرِ جنابِ حضرت باری کہ آئے خیریت سے ممبران وفد انصاری

اس بند کا آخری شعر یہ ہے:

نہیں ہے سوز اسلامی کا گو نام و نشاں باقی تمہارے دل میں ہیں کچھ درد کی چنگاریاں باقی

دوسرے بند کا پہلا شعر یہ ہے:

مسلمانوں کے تم نے طالع واژوں بھی دیکھے ہیں نئے سب انقلابِ گردش گردوں بھی دیکھے ہیں

اور مقطع یہ ہے:

دعائے کہنہ سالاں ہے اگر مقبول یزدانی تو اب دستِ دعا ہے اور یہ شبلی نعمانی

اب مولانا کا جلد ہی بمبئی سے واپسی کا ارادہ تھا، لیکن راستہ میں بھوپال بھی کچھ دن ٹھہرنا چاہتے تھے۔

مولانا ظفر علی خاں بھی قسطنطنیہ سے واپس آئے تھے۔ انھوں نے مولانا سے ملاقات میں اصرار کیا کہ وہ (مولانا) اور مولوی حمید الدین مدینہ یونیورسٹی کے لیے ضرور جائیں۔ ان کا تو یہاں تک خیال تھا کہ خود وہاں سے طلبی ہوگی، مگر مولانا کا خیال تھا کہ وہ (ظفر علی خاں) غیر معتدل جوش اور خوش اعتقادی میں مبتلا ہیں۔

دین حنفی جو اسلام سے پہلے جاہلیتِ عرب میں تھا اور اس کے پیرو زید وغیرہ تھے، اس کے متعلق مولانا نے دریافت کیا کہ عرب جاہلیت کی شاعری یا اور کسی مستند کتاب میں اس کا ذکر ہے بخاری، اصابہ، ملل و نحل میں جتنا ذکر تھا وہ تو پیش نظر تھا (۵۷)۔

مولانا نے سیرت کی کتابوں کے سلسلے میں سید سلیمان ندوی کو یہ لکھ کر یاد دہانی کی کہ خود انھوں نے لکھا تھا کہ ان کے پاس کتابیں ہیں، مگر اب جب منگوائی جارہی ہیں تو جواب نہیں دیتے۔

سیرت اب اس قدر ہو گئی تھی کہ ابتدائی اجزا اب مطبع میں بھیجے جاسکتے تھے۔ مگر مولانا متردد تھے کہ چھاپہ خانے والے بے پروا تھے، اس لیے اعتماد نہ تھا۔ برسوں لگا دیتے اور ٹائپ کے متعلق ابھی تک تسلی نہیں ہوئی تھی کہ لوگ پسند کریں گے۔ اگر ٹائپ کی رائے قائم ہو جاتی تو کلکتہ میں قیام کا ارادہ تھا۔ شاید الہلال پریس میں ہی ٹائپ سے چھپوانا چاہتے تھے، کیوں کہ الہلال کلکتہ ٹائپ میں چھپتا تھا۔

ڈاکٹر اسپرنگر کی جرمنی کتاب لائف آف محمدؐ مولانا کے پاس ہی تھی اور ان کو ایک پارسی مل گیا تھا جو فرنچ، جرمن اور انگریزی کا ماہر تھا اور فارسی کا بڑا شائق تھا۔ اردو سے بھی بخوبی واقف تھا۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ مولانا کو کبھی کبھی سنادے گا۔ اس نے شعرالعجم بہت غور سے پڑھا تھا اور ایک حصے کا ترجمہ بھی کرنا چاہتا تھا، لیکن رنگون میں ملازم ہونے کی وجہ سے اکتوبر میں واپس جارہا تھا۔ اسی زمانے میں ایک یہودی بھی مل گیا تھا، اس لیے مولانا کو عبرانی توراۃ کی ضرورت تھی، تاکہ بکہ کی تحقیق کرلیں۔

اڈریانوپل کو ترکوں نے لڑکر واپس لے لیا تھا۔ اس پر مولانا نے مادہ، تاریخ قرآن مجید سے "قالوا تلک بضاعتنا" نکالا (پوری آیت یہ ہے: "قالو تلک بضاعتنا ردت الینا" جس کا ترجمہ ہے: ہمارا یہ سامان ہے، ہم کو پھیر دیا گیا۔ یہ سورہ یوسف کی آیت ہے: جب حضرت یوسفؑ کے بھائی مصر غلہ خریدنے گئے اور قیمت میں اپنا سامان دیا، حضرت یوسفؑ کے حکم سے ان کا سامان غلہ کی بوریوں میں چھپا کر واپس کر دیا۔ گھر آکر جب انھوں نے سامان کھولا تو ان کا اپنا سامان

بھی نکلا تو انھوں نے خوشی میں کہا کہ یہ ہمارا سامان ہے، ہم کو پھیر دیا گیا)۔ ترکی کے نائب سفیر جو قائم مقام سفیر تھے وہ مولانا سے بڑا خلوص رکھتے تھے، لیکن اردو، فارسی یا عربی نہیں جانتے تھے، پھر بھی مولانا ان سے مل کر خوش ہوتے تھے۔ اکثر وہ ملنے آتے تھے۔ اگر وہ نہیں آتے تھے تو مولانا ان سے ملنے جاتے تھے۔

اس زمانے میں اغانی فہرست جدید خرید لی تھی اور خصائص ابن جنی چھوانے کا انتظام کر رہے تھے، جس کا قلمی نسخہ مولانا نے مصر سے نقل کرا کے منگایا تھا۔ اس کتاب میں عربی زبان کا فلسفہ تھا(۵۸)۔

مولانا سیرتؐ کے متعلق کچھ ارادہ کرتے تھے اور حالات کچھ ہو جاتے تھے، جن کی وجہ سے رکاوٹ ہوتی تھی۔ سیرت چھپوانے کے لیے لکھنو جانا چاہتے تھے۔ ۲۵ سال کے تجربے سے ان کو معلوم ہوا تھا کہ کتاب کا چھپوانا تصنیف سے زیادہ مشکل تھا۔ لوگ ٹائپ کے عادی نہ تھے، ورنہ ٹائپ میں شائع کراتے تو تمام بکھیڑوں سے آزاد رہتے۔ عماد الملک بلگرامی نے بھی پندرہ پاروں کا ترجمہ کر لیا تھا اور چاہتے تھے کہ مشتبہ اور غیر فیصل شدہ الفاظ کے لیے کسی سے مشورہ کریں اور اس کے لیے مولانا ہی پر نگاہیں پڑ رہی تھیں۔ اس لیے وہ حیدر آباد (دکن) بلا رہے تھے۔ ابھی طے نہیں کر پائے تھے کہ کدھر جائیں۔ مولانا نے اصول الحاد ایک کتاب منگوائی تھی، مگر اس کا ترجمہ کرنے والا اب تک نہیں ملتا تھا۔ مولانا نے پروفیسر نواب علی سے خواہش کی کہ ملاحدہ کے قوی اعتراضات کا ملخص تیار کر کے بھیج دیں(۵۹)۔

مسلم گزٹ لکھنو عرصے سے مولوی وحید الدین سلیم کے اختیار میں تھا۔ مولانا کے خلاف اس نے مخالفین کا ساتھ دیا اور مولانا پر خوب خوب کیچڑ اچھالی۔ جو طریقہ کار اختیار کیا اس میں اکثر تیز مضامین تھے، جو حکومت کے خلاف پڑے اور حکومت کے حکم سے وہ اڈیٹری سے علیحدہ ہو کر لکھنو سے چلے گئے۔ مولانا نے اپنی یہ رائے دی کہ حریت اور آزادی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں، مگر سفاہت اور حریت مختلف چیزیں ہیں۔ اب مولانا نے بمبئی سے روانگی طے کر لی تھی، لیکن چوں کہ بھوپال وغیرہ کا بھی پروگرام تھا اس لیے ایک ماہ کے بعد لکھنو پہنچنے کا ارادہ تھا۔

سید سلیمان ندوی نے مولانا کو اطلاع دی کہ ان کے الگ ہونے سے مخالفین بھی ماتم کر رہے ہیں۔ اس پر مولانا نے لکھا مخالف اخبارات ان کے پاس نہیں آتے، اس لیے ان کے خیالات کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ ماتم کر رہے ہیں تو کس پہلو سے اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں۔

مولانا نے کان پور کے واقعہ کے سلسلے میں ایک فارسی قطعہ لکھا اور اس کی اطلاع سید سلیمان ندوی کو دی۔ وہ قطعہ یہ ہے:

گفتی کہ وضو خانہ بہ تعظیم نیرزد — زاں روے کہ آں خانہ نہ مسجد نہ کنشت است
مانبدہ، فرمان تو ہستیم ولیکن — معشوق من است آنکہ بہ نزدیک تو زشت است

(۶۰)

۳۱۔ اگست کو مولانا نے بمبئی سے روانگی طے کر لی تھی۔ کتابیں وغیرہ باندھ دی گئی تھیں۔ دوسری تیاریاں بھی ہو گئیں تھیں۔ پروفیسر نواب علی نے رسالہ الحادیہ کا نام دریافت کیا تو لکھا کہ یاد نہیں اور اب کتاب کا نکالنا دشوار ہے، لیکن اس کا مصنف کوئی حال ہی کا شخص ہے اور اس نے اسپنسر کے حوالے دیے ہیں۔ پروفیسر صاحب نے مولانا کو ایک نظم لکھ کر بھیجی تھی۔ اس کی مولانا نے بڑی تعریف کی، مگر ایک نقص یہ بتلایا کہ اس میں مولانا کی تعریف کی گئی تھی اور وہ بھی حد سے زیادہ۔

بمبئی سے وہ حیدر آباد جانے والے تھے اور وہاں سے الہ آباد اور وہیں سے سیرتؐ کے چھپنے کا بندوبست کرنے والے تھے۔ بمبئی میں بھی پتھر کے چند مطابع تھے اور بڑے پیمانہ پر کام ہوتا تھا۔ یہ چھاپے خانے انگریزوں اور ہندوؤں کے تھے اور انگریزی ملازم تھے۔ کام بھی عمدہ ہوتا تھا، مگر مجبوری یہ تھی کہ کاتب کا انتظام خود کرنا ہوتا تھا، جو بڑی دردِ سری تھی۔ ایک مطبع کا نام ہاے پریس تھا جو بھائی کلہ میں واقع تھا(۶۱)۔

سید سلیمان ندوی کی رائے تھی کہ سیرتؐ ٹائپ میں چھپے۔ مولانا اس رائے سے اتفاق کرتے تھے، مگر دشواری یہ تھی کہ لوگ ٹائپ سے آشنا نہ تھے۔ پھر بھی مولانا نے ان کو لکھا کہ مولوی ابوالکلام سے کہہ کر ٹائپ کی چھپائی کا بہتر سے بہتر نمونہ بہتر سے بہتر کاغذ پر ایک صفحہ چھپوا کر بھیج دیں، تاکہ یہ فیصلہ کیا جائے کہ ٹائپ بہتر ہو گا یا لیتھو۔

سید صاحب نے طبقات الامم کے متعلق مولانا کو لکھا تو انھوں نے لکھا کہ قلمی اور مطبوعہ دونوں دیکھ چکے ہیں۔ بڑی عمدہ کتاب ہے۔ یہ قاضی ساعد اندلسی المتوفی ۴۶۲ھ کی عربی زبان میں علوم کی تاریخ پر تصنیف تھی، جس میں شروع سے ہندوستان، ایران، بابل، یونان، روم، مصر، بنی اسرائیل کے علوم و تصنیفات کی الگ الگ تفصیل تھی۔

حضرت اسمٰعیلؑ پر انگریزی کتاب کے متعلق مولانا کی رائے تھی کہ مصنف معمولی

درجے کا ہے اور محقق نہیں، بلکہ پادری ہے اور اس نے خطباتِ احمدیہ سے بھی تعرض کیا ہے۔ البتہ بڑی کتاب ہے اس لیے اندازہ تھا کہ مواد بھی زیادہ ہو گا۔

سید سلیمان ندوی نے مولانا کے فوٹو کی کاپی طلب کی تو لکھا کہ صرف ایک ہے اور وہ بھی یادگار، کیوں کہ ترکی سفیر نے اپنے دستخط سے دی ہے (٦٢)۔

ستمبر ١٩١٣ء

٣١۔ اگست کو مولانا شبلی بمبئی سے روانہ نہ ہو سکے اور صحت کے خیال سے کچھ دن اور ٹھہرنے کا ارادہ کیا۔ سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے چھپنے کا بندوبست اب بمبئی ہی میں کرنے کا ارادہ تھا۔

مولوی سمیع صاحب کو تعطیل میں بھی بمبئی آنے کی دعوت دی، مگر شرط یہ تھی کہ ان کے (مولانا) دوست مولوی عمر صاحب کو بھی ساتھ لائیں۔ مولوی سمیع صاحب نے بمبئی دیکھی تھی، تب اور تھی اب کچھ اور ہو چکی تھی۔

الہلال میں مولانا نے جو تاریخی نظمیں لکھی تھیں، علی گڑھ والے ان کو مع فوٹو کے علٰحدہ شائع کر رہے تھے (٦٣)۔

مولانا کو اب یہ خیال ہوا کہ سیرتؐ کو بطور مسودہ کے پچاس صفحے نہایت عمدہ کاغذ پر ٹائپ میں چھپوالیں اور اس کو مجلد کرالیں اور اگر گراں قیمت پر فروخت ہو اور اندازہ ہو کہ ٹائپ بھی چل سکتا ہے تو دوسرا ایڈیشن بھی ٹائپ میں چھپوائیں، ورنہ پھر لیتھو میں چھپوائیں۔ سید سلیمان ندوی کی رائے دریافت کی اور مولوی ابوالکلام آزاد کی رائے بھی دریافت کی۔

اب حضرت اسمٰعیلؑ پر کتاب پڑھوا کر سن چکے تھے اور ان کی رائے تھی کہ نہایت عامیانہ لکھی ہے اور سرسید کے رد میں پندرہ صفحات صرف کیے ہیں، لیکن محض ایشیائی طریقے پر طعن و تشنیع ہے۔ قرآن مجید پر بھی اعتراضات سے پر کتاب ہے، لیکن یہ خوبی ہے کہ سب ایک ہی جگہ مل جاتا ہے (٦٤)۔

پروفیسر عبدالقادر نے بکہ کے متعلق تحقیق کر کے مولانا کو لکھا تو انھوں نے لکھا کہ اسی کتاب میں فاران کے متعلق جو تحقیق ہو وہ بھی لکھیں۔ اس کی مولانا کو اس زمانے میں بہت ضرورت تھی۔

مولانا کو پونا نہ جانے کا افسوس تھا مگر وہ چاہتے تھے کہ پروفیسر اکتوبر میں مولانا کے پاس رہیں، خواہ وہ خود اس زمانے میں کہیں رہیں (۶۵)۔

مولوی حمید الدین نے ایک خط میں حضرت اسمٰعیلؑ کے ذبح ہونے کی آٹھ نو تاویلیں لکھیں تو مولانا نے لکھا کہ اس میں توراۃ کے نصوص نہیں نقل کیے، ان کی ضرورت تھی۔ مثلاً یہ کہ قربانی سے مراد خدمتِ ہیکل ہے اور اولادِ اسمٰعیلؑ کا بڑے بال رکھنا وغیرہ۔ کتاب کے ابتدائی حصہ میں صرف یہی بحث ناتمام تھی، اس لیے کتاب مطبع میں جانے سے رکی ہوئی تھی۔ لہٰذا مولانا کو جلدی تھی۔ مولانا نے مولوی حمید الدین کو ہدایت کی کہ انسائکلوپیڈیا یا بائبل ڈکشنری کو بغور پڑھیں اور اگر کوئی پختہ بات ملے تو فوراً لکھ بھیجیں۔

مولانا مولوی حمید الدین کے پاس جلد پہنچنا چاہتے تھے، لیکن آب و ہوا میں اتنا فرق تھا کہ جانے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی اور بمبئی میں بلا مبالغہ ان کی غذا دونی تھی۔ دعوتوں میں ثقیل غذائیں بھی کھا لیتے تھے اور برداشت کر جاتے تھے، حالاں کہ اگر لکھنو میں ثقیل غذائیں کھا لیتے تو وہ مہینوں کی بیماری کے لیے کافی ہوتیں۔ یہاں مولانا کا جی گھبراتا تھا، ورنہ صحت کے لحاظ سے تو وہیں رہ جانا ہی مناسب تھا۔ (۶۶)

مولانا کو معلوم ہوا کہ مولوی مسعود علی ندوی پریس کھولنا چاہتے ہیں تو مولانا کو خوشی ہوئی اور انھوں نے ہمت افزائی کی اور چاہا کہ وہ (مولانا) سرمایہ میں بھی شریک کریں، گو ان کو نفع سے تعلق نہیں۔ اس لیے ان کا مقصد تو یہ تھا کہ ایک عمدہ پریس جس سے قدیم نادر تصنیفات شائع کی جائیں اور یورپ کی مطبوعات کو بھی دوبارہ شائع کیا جائے اور سیرتؐ بھی وہیں چھپ جائے۔ لیکن اس کا اطمینان ہونا ضروری تھا کہ کتاب تختہ مشق نہ بنے۔ لہٰذا ان کو (مولوی مسعود علی ندوی) پہلے چاہیے کہ وہ کمپنی بنالیں اور متعدد حصہ دار پیدا کرلیں۔

اسی زمانے میں ندوہ کے ناظم اور منشی احتشام علی ندوہ کی مالی امداد حاصل کرنے کی کوشش میں شملہ گئے اور مالی ترقی کے لیے کوشاں ہوئے۔ یہ معلوم کر کے مولانا کو بڑی مسرت ہوئی، اس لیے کہ ان کو اس کا بہت افسوس تھا کہ مولانا کے ہٹنے کے بعد ندوہ مالی اعتبار سے بے حد کمزور ہو جائے گا اور بدحالی میں اس کے دار العلوم کے بند ہونے کا اندیشہ ہوگا۔

مولانا کو یہ بھی معلوم ہوا کہ الہ آباد گورنمنٹ نے الہلال کلکتہ کا پرچہ، جس میں مشہد اکبر مضمون شائع ہوا تھا، اس کو ضبط کر لیا اور خواجہ حسن نظامی کا پمفلٹ بھی۔ (۶۷)

مولانا کا دو ایک روز میں حیدر آباد (دکن) جانے کا ارادہ تھا اور ایک دو ہفتہ قیام کا بھی سیرتؐ کے متعلق وہاں بھی چند اچھی کتابیں تھیں۔ ثعلبی کی کتاب ممر تاریخ الفرس مطبوعہ فرانس بھی یہاں موجود تھی۔ ثعلبی کی یہ تحقیق تھی کہ ہاماوران بادشاہ جس نے کیکاوس کو قید کیا تھا اور اس کی زوجہ سوداباماوران کی لڑکی تھی وہ اصل میں حمیر (ہاماوران) کا بگڑا ہوا نام تھا اور حمیری بادشاہ تھا اور اس کی لڑکی کا نام سعدیٰ تھا جو بگڑ کر سوداوہ گیا (۶۸)۔

مولانا نے مولوی عبدالسلام ندوی کو لکھا کہ نعیم سے دریافت کریں کہ اگر انھیں وقت ہو تو سیرتؐ کے لیے گھر بیٹھے ترجمہ کردیا کریں اور معاوضہ کیا لیں گے۔ قابل ترجمہ مضامین وہ بھیج دیا کریں۔ یہ بھی دریافت کیا کہ وحید الدین سلیم کے بعد مسلم گزٹ لکھنو کے اڈیٹر کون ہیں۔

مولوی عبدالسلام کو یہ بھی ہدایت کی کہ چند ممتاز یہودی یعنی کعب ابن اشرف وغیرہ جو ابتداے ہجرت میں قتل کرائے گئے، تہذیب التہذیب کی روایتوں کی اصول درایت کی روشنی میں تحقیق کرکے لکھیں۔ مولوی چراغ علی نے اس روایت پر ایک رسالہ لکھا تھا لیکن اس کی تنقید کی ضرورت تھی جو بمبئی میں ممکن نہ تھی۔ دوسرے یہ کہ انھوں نے بوجہ صحابہ صغیر سن قابل بتایا تھا جو کافی نہیں تھا۔

اسی زمانے میں مولوی حمید الدین کو حیدر آباد (دکن) کالج میں پرنسپل کی حیثیت سے پانچ سو روپے کے مشاہرے پر بلایا جارہا تھا، جس کو مولانا پسند نہیں کرتے تھے، لیکن مولوی حمید الدین کی راے دریافت کی تھی۔ اگر خود ان کی راے تھی تو مولانا تمام مراحل طے کرنے کو تیار تھے (۶۹)۔

سید عبدالحکیم دیسنوی کو معلوم ہوا کہ مولانا کی نظمیں کان پور کے واقعے کے سلسلے میں گورنمنٹ نے ضبط کرلیں تو انھوں نے مولانا سے دریافت کیا۔ مولانا نے لکھا کہ ایک پمفلٹ کلکتہ سے شائع ہوا تھا، جس میں اکثر لوگوں کی نظمیں تھیں اور مولانا کی صرف ایک نظم تھی۔ وہ گورنمنٹ نے ضبط کرلیا تھا۔

سیرت کے تین سو صفحات ہوگئے تھے، جو اصل کتاب کا پانچواں حصہ تھا۔ اس کے مواد کی تلاش میں حیدر آباد دکن آگئے تھے۔

عبدالحکیم صاحب نے مولانا سے اشعار لکھنے کی فرمائش کی تو ان کو لکھا کہ وہ باوجود ہزاروں شعر کہنے کے، کہنے پر بالکل قادر نہیں۔ یعنی بغیر کسی فوری تاثر کے ایک حرف بھی نہیں

لکھ سکتے تھے۔ بارہا احباب نے فرمائش کیں اور کئی کئی دن طبیعت پر زور ڈالا لیکن کہہ نہ سکے (۷۰)۔

عماد الملک بلگرامی نے مولوی حمید الدین کا نام دار العلوم حیدر آباد (دکن) کے پرنسپل کے عہدے کے لیے تجویز کیا۔ اس پر ناظم تعلیمات کی تائید کی بھی ضرورت تھی۔ اس کے بعد مسٹر اکبر حیدری تقرر کرتے۔ بعض لوگ مولانا سے اصرار کر رہے تھے کہ وہ اپنے اثر و رسوخ کی وجہ سے سارے مراحل طے کرا دیں۔ چوں کہ ان پر اہل وطن کا حق زیادہ تھا، اس لیے مولانا پس و پیش میں تھے۔ لیکن لوگوں کا کہنا تھا کہ اگر مولوی حمید الدین پرنسپل نہ ہوئے تو کوئی نااہل باہر سے آجائے گا، یا کسی انگریز کا تقرر ہو جائے گا، اس لیے ایک اسلامی درس گاہ کو نقصان پہنچے گا۔ اس دلیل کے سامنے مولانا بھی عاجز تھے، لہٰذا خود مولوی حمید الدین کا ایما دریافت کیا۔

مولانا کا خیال تھا کہ وہاں افادے کا موقع مل جائے گا۔ آمدنی خاصی ہوگی اور طلبہ کثیر ہوں گے اور نصف پس انداز کر سکیں گے۔ لہٰذا جلد خانہ نشیں ہو کر تصنیف و تالیف کا کام کر سکیں گے ابھی تک تو مولانا کا یہاں صرف ایک دو ہفتے ہی قیام کا ارادہ تھا (۷۱)۔

اکتوبر ۱۹۱۳ء

اب مولانا حیدر آباد (دکن) میں تھے اور سیرت کا پہلا حصہ، جس میں سادہ حالات زندگی ہیں، وہ تقریباً تیار ہو گیا تھا۔ اگرچہ اس میں بھی مولانا کو کد و کاوش کرنا پڑی تھی اور احادیث کی تمام کتب اور رجال کی چھان بین کرنی پڑی تھی، تاہم اصلی مرحلے اور تحقیق آگے کی جانے والی تھی جتنا حصہ تیار ہو گیا تھا اس کے ۵۰۰ صفحات تھے اور اس کا چوگنا کام باقی تھا۔ گویا پانچ جلدوں میں کتاب مکمل ہوتی۔

مولوی امین زبیری کا خیال تھا کہ سید سلیمان ندوی اور عبد السلام ندوی کو بھوپال بلالیں اس پر مولانا نے لکھا کہ ان لوگوں کے جانے سے ندوہ خالی ہو جائے گا، اس لیے کہ اس لیاقت کے لوگ ابھی ندوہ میں تیار نہیں اور اگر یہی ندوہ کے کارکن ہیں تو آئندہ بھی اس لیاقت کے لوگوں کے تیار ہونے کا جلد امکان نہیں۔

مولوی امین زبیری کا ارادہ تھا کہ وہ مولانا کی تمام اردو نظمیں شائع کرا دیں۔ اس پر ان کو لکھا کہ جتنی اردو نظمیں ہیں وہ سب لے لیں اس کے نفع سے ان کو غرض نہیں۔ تاہم یہ ضرور

چاہتے تھے کہ چھپائی اور کاغذ اعلیٰ درجے کا ہو، جیسے الغزالی اور الکلام وغیرہ کا۔ اپنی نظموں کو الہلال کلکتہ، زمیندار لاہور اور مولانا محمد علی کے ہمدرد سے مہیا کرنے کا وعدہ کیا، کیوں کہ خود مولانا کے پاس محفوظ نہ تھیں۔ جو نظمیں علی گڑھ میں شائع ہو رہی تھیں اس کے متعلق انوار احمد صاحب نے یقین دلایا تھا کہ جلد شائع ہوں گی، مگر ابھی تک ان کے شائع ہونے کی اطلاع نہ تھی۔

اس زمانے میں حیدر آباد (دکن) نے مولانا کے منصب میں دو سو کا اضافہ کر دیا تھا۔ اب گویا تین سو انگریزی سکہ ہو گیا تھا۔ سیرتؐ کے لیے بھی حیدر آباد (دکن) سے اعانت کا ارادہ تھا، مگر انھوں نے اس خیال سے پہلو بچایا کہ بھوپال نے اس سلسلے میں پہلے ہی اعانت کی تھی، لہٰذا اس کا تقدم اور یکتائی برقرار رکھنا تھی۔ یہ بھی پروگرام تھا کہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاے راشدینؓ وغیرہ کی بھی سیرت لکھی جائیں اور اس کام کی مستقل صورت ہو جائے تو اس صورت میں اوروں سے مدد لینے میں مضائقہ نہ سمجھتے تھے۔ لیکن سرپرستی بھوپال ہی کی رکھنا چاہتے تھے اور بیگم بھوپال ہی کو مربی رکھنا چاہتے تھے (۷۲)۔

سو روپے ماہوار کا پہلا وظیفہ جو حیدر آباد (دکن) سے جاری ہوا تھا، اس کی نقل یہ ہے:

وظیفہ، حیدر آباد

مراسلہ محکمہ، معتمد مدار المہام سرکار عالی علاقہ فنانس
نشان ۴۰۷۹

واقع ربیع الثانی ۱۳۱۴ھ (۷۳) ربان ماہ دہی ۱۳۰۵ف
نشان صیغہ، عطیات ۱۳۰۵ فصلی

مہر دفتر معتمدی
مدار المہام سرکار عالی علاقہ
پولیٹیکل و فنانس

حسب الحکم مدار المہام سرکار عالی
منجانب مولوی سید علی حسن منصرم
معتمد فنانس
بخدمت مہاراج آصف نواز وقت بہادر
صدر محاسب مدار المہام سرکار عالی

مقدمہ
اجراے ماہوار مولوی شبلی صاحب
شمس العلماء

مولوی شبلی صاحب جو اس وقت علی گڑھ کالج میں عربی و فارسی کے ہیڈ دفتر میں ہیں، چار

ہفتہ سے بلدہ میں مقیم ہیں۔ مولوی صاحب موصوف ایک نہایت قابل اور لائق شخص ہیں اور تصنیف میں ایک خاص مذاق رکھتے ہیں۔ ان کی قدر دانی گورنمنٹ انگریزی اور گورنمنٹ روم سے بھی بعطاے خطاب و تمغہ ہوئی ہے۔ اب ان کی تمنا یہ ہے کہ اپنے پورے وقت کو تصنیف کے کام میں صرف کریں اور معمولی درس و تدریس کو ترک کر دیں۔ مولوی صاحب موصوف کو تصنیف کے کام میں فارغ البالی کے ساتھ مصروف رکھنا ایک قومی کام ہے اور اس وقت کوئی عالم ہندوستان میں ایسا نہیں ہے جو پرانے ذخیروں سے اس طرح کام لے۔ چوں کہ سرکار سے ایسے شخص کی اعانت ضرور ہے، لہٰذا سرکار نے بالفعل سو روپے کلدار ماہوار جاری کرنے کے لیے منظوری صادر فرمائی ہے اور یہ بھی حکم دیا ہے کہ ان کی تصنیفات دیکھنے کے بعد اضافہ کیا جائے گا۔ جو کتابیں مولوی صاحب موصوف تصنیف کریں گے وہ سرکار آصفیہ کے نام سے مشتہر ہوں گی۔ پس حسب الحکم سرکار تاریخ حکم سے جو ۳۔ ربیع الثانی ۱۳۱۴ھ ہے۔ سو روپیہ کلدار ماہوار شمس العلماء مولوی شبلی صاحب کے نام جاری کی جاوے۔

ف۔ ایک مثنی اس کا وثیقتاً شمس العلما مولوی شبلی صاحب کو دیا جاتا ہے۔ فقط (۷۴)۔

علی حسن

معتمد فنانس

وظیفے میں دو سو روپے اضافے کا جو حکم نامہ جاری ہوا اس کی نقل یہ ہے:

نقل مراسلہ سرکار عالی صیغہ۔ فنانس واقع ۱۹۔ ذیقعدہ ۱۳۲۱ھ، آذر ۱۳۲۳ف

(۷۵)

نشان (۸۹) مجاریہ۔ صیغہ

نشان مثل محکمہ۔ ہذا ۲ صیغہ۔ عطیات شاخ

(.....) بابت ۱۳۲۳ف ۲ صیغہ

نشان مثل محکمہ مکتوب الیہ .... بابت ۱۳ف

صیغہ

۱۳۲۵

معتمد سرکار عالی صیغہ۔ فنانس

منجانب .... معتمد فنانس مقدمہ

بخدمت صدر محاسب صاحب سرکار عالی اضافہ ماہوار شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی

بشرف صدور منشور فیض گنجور مترشحہ ۱۳۔ ذی قعدہ ۱۳۳۱ھ نگارش ہے کہ شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی کے موجودہ ماہوار جو ایک سو روپیہ کلدار ہے اور دو سو روپیہ کا اضافہ کر کے آئندہ تین سو روپیہ کلدار ماہوار تاحیات مقرر کی جاتی ہے۔ حسب عمل ہو فقط۔

دستخط

مددگار فنانس

آصف جاہ نظام الملک

Finance Office Hyderabad Deceam

سرکاری (۱۲۰) مورخہ آذر ۱۳۲۳ف

بخدمت شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی صاحب

باتباع فرمان خداوندی مترشحہ ۱۳۔ ذی قعدہ ۱۳۳۱ھ آپ کے ماہوار میں اضافہ کے متعلق جو مراسلہ بنام صدر محاسب صاحب سرکار عالی نشان نمبر ۸۹ مورخہ ۱۵۔ آذر ۱۳۲۳ھ فصلی جاری ہوا ہے اس کی ایک باضابطہ نقل اطلاعاً مرسل ہے۔ فقط

دستخط انگریزی

مددگار فنانس

مولانا اب سوچ رہے تھے کہ مولوی ابوالکلام آزاد سے مل کر کوئی متفقہ پروگرام طے کریں اور اس پر عمل کریں اور اس طرح قوم کو بیدار کریں۔ حیدرآباد (دکن) میں مطبوعاتِ یورپ اکثر ملتی تھیں، مثلاً نفح الطیب، ابن الاثیر، جغرافیہ کا پورا سلسلہ وغیرہ۔ اس لیے ابوالکلام آزاد کو توجہ دلائی کہ اگر چاہیں تو خرید لیں۔ ویسے مولانا کو بھی سیرت کے سلسلے میں بعض اچھی کتابیں ہاتھ آگئی تھیں (۷۶)۔

مولوی مسعود علی ندوی نے مولانا کو کچھ تجاویز پیش کی تھیں۔ ان سے مولانا کو اتفاق تھا لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ لکھنؤ میں قیام کرتے۔ لیکن لکھنؤ کے قیام میں دشواری تھی کہ وہاں بار بار اسہال کبدی کے سخت دورے پڑتے تھے، اس لیے لکھنؤ کے قیام سے گھبراتے تھے۔ اس لیے الہ آباد میں مستقل قیام کا ارادہ کر رہے تھے اور لکھنؤ کے ماہانہ دورے کا ارادہ تھا۔

مولوی مسعود علی ندوی نے دو آدمیوں کے لیے سیرتؐ میں کام کرنے کی سفارش کی تو انھیں لکھا کہ صیغہ۔ عربی سے زیادہ کام انگریزی کا آپڑا ہے اور لائق مترجم سو روپے سے کم میں

نہیں ملتا۔ تاہم یہ مشکل بھی جلد حل ہو جانے والی تھی۔ ایک اور مشکل یہ بھی تھی سیرت کے اخراجات کی ادائیگی کا کام مئی ۱۹۱۴ء میں ختم ہونے والا تھا اور یہ بھی اندازہ نہ تھا کہ مدت میں توسیع ہو گی یا نہیں، لیکن پھر بھی یہ رکاوٹیں مولانا کے کام میں رخنہ نہیں ڈال سکتی تھیں۔ پھر بھی عزم و ثبات در کار تھا۔

اسی زمانے میں مولانا کو مولوی محمد ایوب ندوی وکیل حیدر آباد (دکن) سے معلوم ہوا کہ مولوی مسعود علی ندوی حیدر آباد آ کر وکالت کا امتحان دینا چاہتے ہیں۔ ایسی صورت میں ساری تجاویز بے کار ہو جاتیں (۷۷)۔

کان پور کی مسجد کے واقعے میں آخر مسلمانوں کا خون رنگ لایا اور حکومت کو جھکنا پڑا اور معاملات طے ہو گئے۔ اس پر مولانا نے بھی اطمینان کی سانس لی اور مولوی ابو الکلام آزاد کو لکھا کہ اب اس سے آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں۔

مولانا نے مولوی ابو الکلام آزاد کو توجہ دلائی کہ اب وہ ندوہ پر توجہ کریں اور قومی کام قوم کے ہاتھ میں آجائیں اور دو چار شخصیتوں کی خود اختیاری مٹ جائے۔ ندوہ میں سب سے بڑی چیز ممبری کا انتخاب تھا۔ پہلے تو یہ سب ایک ہی جلسے میں بغیر اطلاع سابق سب کچھ کر لیا کرتے تھے۔ مولانا نے مجبور کر کے کچھ قاعدے بنوائے لیکن اس کو خود غرضی سے برتا گیا، حالاں کہ دستور العمل موجود تھا۔ مگر ناقابل عمل قرار دے دیا گیا اس لیے مولانا کا خیال تھا کہ مولوی ابو الکلام آزاد اس مسئلے پر توجہ کریں اور حزب الاحرار کو توجہ دلائیں تو مولانا دستور العمل اور دیگر متعلقہ کاغذات ان کو دے دیں اور بتلائیں کہ کاغذات میں کیا تحریر ہے اور عمل کیا ہے۔ اب مولانا کی معتمدی کا سوال نہ تھا اس لیے کہ اب وہ خود اس کے لیے تیار نہ تھے۔ لیکن یہ ضرور چاہتے تھے کہ عام مسلمانوں کے ہاتھ میں انتظام آجائے۔ یعنی وہ جن لوگوں پر اعتماد کر کے انتخاب کریں وہی ندوہ کو چلائیں۔

اب مولوی مسعود علی ندوی کا ارادہ مسلم گزٹ کا جانشین نکلنے کا تھا، تاکہ ندوہ کے حالات لوگوں کو بتائے جاتے رہیں (۷۸)۔

مولانا کا کہنا تھا کہ آیت تخییرِ ازواج، اعتزال، مظاہرہ ازواج، یہ تین واقعے الگ الگ بیان کیے جاتے ہیں، لیکن خود ان کا خیال تھا کہ سب ایک ہی سلسلے کے اور ہم زماں ہیں اور ابن حجر نے بھی یہی روایت پیش کی تھی۔ لہٰذا مولوی حمید الدین اپنی تحقیق بتلائیں۔ لیکن مولانا سب سے

مقدم اس کو سمجھتے تھے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت حفصہؓ کا مظاہرہ ایسی کیا اہمیت رکھتا تھا جس کے لیے خدا، ملائکہ اور صالح المومنین کی اعانت کی ضرورت پڑی۔ اس کی تحقیق کے بارے میں مولوی حمید الدین سے دریافت کیا۔(۷۹)

مولوی حمید الدین نے اب حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبح ہونے اور قربانی کے بارے میں صحیح واقعات کی تحقیق کرکے مدلل مضمون مولانا کو بھیج دیا۔ مولانا نے ان کے دلائل کو تسلیم کیا اور اس سے استفادہ کرنے کا ارادہ کیا اسی زمانے میں انسپکٹروں کا تقرر ہونے والا تھا اور مولوی حمید الدین نے اس جگہ کے لیے مولانا سے مشورہ کیا تو انھوں نے لکھا کہ ضرور کوشش کریں اور ڈیلافوس سے ملیں۔ مولانا کی سفارش کی ضرورت نہ تھی۔ اس لیے کہ وہ مولوی حمید الدین سے بخوبی واقف تھے۔ پھر بھی اگر ضرورت ہو تو مولانا بخوشی سفارش کے لیے تیار تھے۔

نیشنل اسکول کی مزید تعمیر کے سلسلے میں دو ہزار روپیوں کی ضرورت تھی اور اعظم گڑھ والے اسی کو مہیا نہیں کر پارہے تھے، نہ کہ پھر مزید ۲۰ - ۲۵ ہزار کی رقم کیسے کر سکتے تھے۔ اس بارے میں مولوی حمید الدین کے خیال کی مولانا نے تردید کی۔

سورۂ تحریم کی تفسیر مولانا پڑھ چکے تھے، مگر اس وقت موجود نہ ہونے کی وجہ سے دوبارہ نہ پڑھ سکتے تھے، اس لیے مولوی حمید الدین سے طلب کی۔ اب روز بروز ضعف بڑھتا جارہا تھا۔ ایک گھنٹے سے زیادہ کام نہیں کر سکتے تھے اور مہینے میں پندرہ دن کے کام کا ناغہ ہوتا تھا۔ اس لیے بڑا صدمہ تھا کہ سیرتؐ کا کام ناتمام نہ رہ جائے اور کون اس کو پورا کرے گا۔ غذا بھی چوبیس گھنٹوں میں پاؤ بھر رہ گئی تھی۔

اب حیدر آباد (دکن) سے واپس ہونا چاہتے تھے، مگر لکھنو صحت کے لیے مضر تھا۔ الہ آباد اس سے کچھ ہی بہتر تھا اور اعظم گڑھ میں علمی صحبتیں نہ تھیں۔ بہر حال یہ تو طے کر لیا تھا کہ جلد حیدر آباد سے واپس ہوں اور مولوی حمید الدین سے مشورہ کرکے کوئی مکمل اسکیم تیار کریں۔

بمبئی میں مولانا کی صحت بہتر رہتی تھی اور مصارف کی طرف سے بھی اب اطمینان ہو گیا تھا، اس لیے کہ حیدر آباد (دکن) سے وظیفہ بھی سہ گنا ہو گیا تھا۔ لیکن وہاں بھی علمی صحبتیں نہ تھیں اور کسی قسم کی علمی اور اسلامی تحریک نہ تھی۔ مولوی حمید الدین کی حیدر آباد (دکن) کی ملازمت کا مسئلہ بھی حل ہو گیا تھا، اس لیے کہ ڈائرکٹر تعلیمات، جو خلاف یا مقابل تھے، انھوں نے مولانا ہی پر فیصلہ چھوڑ دیا تھا اور مولانا تو چاہتے ہی تھے کہ مولوی حمید الدین کی خود کی مرضی ہو تو

چلے جائیں (۸۰) ۔

۲۲ ۔ اکتوبر کو مولانا کو اعظم گڑھ سے اطلاع ملی کہ نیشنل اسکول کی حالت اچھی ہے اور گورنمنٹ نے عمارت کے لیے تین ہزار کی منظوری دی، لیکن شرط یہ تھی کہ تین ہزار انتظامیہ کمیٹی بھی دے ۔ لہذا مولانا نے مشورہ دیا کہ تین ہزار کی رقم دینا چاہیے اور خود مولانا بھی اس مد میں رقم دینے پر تیار تھے ۔ ویسے یہ اسکول اپنی آمدنی ہی سے چل رہا تھا ۔ لیکن مولانا کے سامنے اب یہ سوال تھا کہ مدرستہ الاصلاح سرائے میر کو ترقی دینے پر توجہ دی جائے یا نیشنل اسکول پر ۔ اس لیے کہ اعظم گڑھ والوں میں دونوں کے بیک وقت چلانے کی سکت نہ تھی اور مولانا چاہتے تھے کہ دونوں کی جداگانہ حیثیت قائم ہو اور آپس میں تعلق بھی قائم رہے ۔ مولانا کے ذہن میں کچھ عرصہ سے یہ خیال چکر لگا رہا تھا کہ ان میں ایک کو مرکز بنا کر اسی کو ندوہ کے انداز پر دین و دنیا دونوں کا مرکز بنایا جائے ۔ جہیں خدام دین بھی تیار ہوں اور مذہبی اعلیٰ تعلیم بھی دی جائے اور گروکل کے انداز پر تعلیم ہو ۔ اس بارے میں مولوی حمید الدین کی رائے بھی دریافت کی ۔ یہ سب اس لیے تھا کہ ندوے میں لوگ کام نہیں کرنے دیتے تھے ۔ لہذا اسی لیے ایک دائرہ عمل کی ضرورت تھی اور وہیں قیام کر کے اپنی نگرانی میں تربیت کرنا چاہتے تھے اور وہیں ایک اعلیٰ کتب خانہ بھی قائم کرنا چاہتے تھے ۔ مولوی حمید الدین اگر آمادہ ہوتے تو مولانا انؒ کے ساتھ مل کر کام کرنے کو بخوشی تیار تھے ۔

۲۲ ۔ اکتوبر کو مولانا ڈائرکٹر تعلیمات سے مل کر مولوی حمید الدین کے متعلق اپنا فیصلہ بتلانے والے تھے اور باوجود اس کے کہ ان کے حق میں فیصلہ دینے والے تھے، پھر بھی اس عہدے کی بہ نسبت مولانا ان کے لیے قومی خدمت ہی کو ترجیح دیتے تھے ۔ یہ ضرور ہے کہ معاش کا سہارا بھی ضروری سمجھتے تھے اور وہ قومی خدمت میں اور سرائے میر یا اعظم گڑھ کے قیام میں میسر نہ تھا، لیکن امید تھی کہ اس کا بھی کہیں سے بندوبست ہو جاتا ۔ پرنسپلی اور بیش قرار تنخواہ تو وقتی تھی اور قومی خدمت کا صلہ ابدی تھا اور خود مولوی حمید الدین نے بھی پہلے قومی خدمت ہی کرنے کو ترجیح دی تھی (۸۱) ۔

مولوی ابوالکلام آزاد کو بدگمانی ہوئی کہ مولانا اب بھی ملازمت کے خواہاں ہیں ۔ اس پر مولانا نے لکھا کہ یہ محض بدگمانی ہے، اس لیے کہ اب مرنے کے قریب ہیں اور اب اس کی خواہش نہیں رہی ۔ ہاں پہلے بے شک تھی، لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب " یہ قصے ہیں جب کے کہ

آتش جوان تھا" اور اب تو سوائے سیرت کو مکمل کرنے کے اور کوئی چیز پیش نظر نہ تھی ۔ مگر حالت یہ تھی کہ روز بروز ضعف بڑھتا جاتا تھا اور ہزار کوشش کے باوجود ہفتہ میں بہت سے بہت دو تین دن لکھ سکتے تھے ۔ باقی مرض کی تکلیف کی وجہ سے شب بیداری اور طبیعت کی خرابی میں وقت گزر جاتا تھا جو بہت گراں گزرتا تھا ۔

مولانا عماد الملک کے بلانے سے حیدر آباد (دکن) آئے تھے ۔ مولانا کے بمبئی کے قیام کے زمانے میں منصب میں اضافے کا ذکر کیا تھا، مگر جب وہ حیدر آباد آئے تو باقاعدہ تحریک کی اور وہ منظور ہو کر وظیفے میں اضافہ ہو گیا ۔ مولانا چاہتے تو یہی تھے کہ جلد حیدر آباد سے واپس ہوں، مگر قیام کی جگہ ایسی دل پسند اور فرحت بخش مل گئی تھی کہ لکھنو وغیرہ میں قیام کی ایسی جگہ ملنے کی توقع نہ تھی، اس لیے اس کو چھوڑتے ہوئے جھجک محسوس ہو رہی تھی ۔

حیدر آباد کے لوگ مولوی ابو الکلام آزاد سے الہلال کلکتہ کے ذریعے بڑے قدر داں ہو گئے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ حیدر آباد آئیں، لیکن ریاست کے حدود میں جلسہ کرنے کی پابندی تھی، اس لیے عموماً جلسے رزیڈنسی کے حدود میں ہوتے تھے، جو شہر سے ملی ہوئی تھی اور حیدر آباد کے تمام شائقین وہاں شرکت کرتے تھے ۔ لہذا مولانا چاہتے تھے کہ وہ آئیں اور جلسے وغیرہ ہوں اور مسلمانوں میں بیداری پیدا ہو ۔ جلسے کے انتظامات وغیرہ کے متعلق لوگوں سے دریافت کرنے کے بعد اطلاع دینے کا مولوی ابو الکلام سے وعدہ کیا ۔

اسی زمانے میں وائسرائے ہند حیدر آباد آنے والے تھے اور سیاسی تبدیلیوں کا امکان تھا ۔ لوگ مسٹر علی امام کو وزارتِ عظمیٰ کے لیے چاہتے تھے، لیکن نظام کے مصاحبین، جن کا نظام پر اثر تھا، وہ مخالف تھے اور نظام کے کان برابر بھر رہے تھے ۔

مولانا کا فی الحال کلکتہ جانے کا ارادہ نہ تھا، اس لیے ندوے کا دستور العمل اور آخری جلسے کی طے شدہ تجاویز کی نقل اور دیگر کاغذات بھیجنے والے تھے اور ان کی رائے تھی کہ اب اس پر قانونی الفاظ میں کھل کر لکھا جائے، جب ہی ندوہ کی اصلاح ہو سکے گی ۔ الہلال نے لوگوں میں یہ شعور پیدا کر دیا تھا کہ اسلامی کاموں پر لوگ مداخلت کرنے پر تیار تھے اور اسی اصول پر ندوہ کے لیے الہلال میں صدا بلند ہونے کی ضرورت تھی ۔ اس میں مطالبہ کرنا چاہتے تھا کہ ایک تحقیقاتی کمیشن بنایا جائے اور طریق عمل کی اصلاح ہو اور ندوہ قوم کا سمجھا جائے، ایک آدمی مطلق العنان نہ بن جائے ۔ تحقیقاتی کمیشن پانچ ممبروں پر مشتمل ہو، جن میں مظہر الحق، بیرسٹر پٹنہ اور مولوی

عبد الباری فرنگی محلی ہوں ۔ اگرچہ مولانا عبد الباری مولانا کے خلاف تھے، مگر ان کی دیانت پر مولانا کو اعتماد تھا ۔

مولوی ابو الکلام سے بھی مولانا نے مشورہ کیا تھا کہ اب مولانا کس کام میں ہاتھ ڈالیں ۔ انھوں نے اس کا جواب نہ دیا تو مولانا نے یاد دہانی کرتے ہوئے لکھا کہ مختلف مقاصد پیش نظر ہیں، مگر قطعی انتخاب نہیں کر سکے ہیں ۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ سیرت کے مقاصد کو ایک مستقل صورت دے دی جائے، یعنی ایک اکیڈمی قائم ہو جائے ۔ اس سلسلے کی تمام نادر تصنیفات جمع کی جائیں ۔ لوگوں کو بطور فیلو شپ وظائف دیے جائیں کہ سیرت کا بطور مطالعہ کریں اور خاص اس فن میں ماہر بنیں اور سیرت پر تحریر و تقریر میں مہارت پیدا کریں ۔ رہ گیا خاص اس سلسلے میں مالی اعانت، تو اس کے لیے بکثرت لوگ تیار ہیں ۔

اسی زمانے میں ہندوستان میں خدام کعبہ کی جماعت تیار ہوئی تھی ۔ اس کا تقاضہ تھا کہ مولانا ممبر بن جائیں، لیکن اس کا مقصد بڑا وسیع تھا اور مولانا اپنی کمزوری کی وجہ سے اب اتنے بڑے کام میں حصہ لینے کی ہمت نہ پا رہے تھے ۔

مولانا کا خیال تھا کہ اگر ندوے کا سالانہ جلسہ کہیں ہو جائے تو ندوے کی خرابیاں کھل کر لوگوں کے سامنے آجائیں اور نظامت بدل جائے، اس لیے کہ نظامت کے لیے پہلی شرط یہ تھی کہ جلسہ، عام سالانہ میں اتفاق رائے ہو ۔ لوگ خرابیوں سے اور ناظم کی مطلق العنانی سے واقف تھے، یہ ضرور ہے کہ دخل نہ دیتے تھے، لیکن جب دخل دینے کا موقع آتا تو خاموش بھی نہ رہتے ۔

اس زمانے میں طبیعت کی خرابی کی وجہ سے مولانا کے اکثر سر میں درد رہتا تھا، جو لکھنے پڑھنے میں بڑی رکاوٹ بنتا تھا (۸۲) ۔

سید سلیمان ندوی نے وکیل امرتسر میں ناظم ندوۃ العلماء سے چند سوالات کیے تھے ۔ چوں کہ ان میں بعض باتیں غلط تھیں، اس لیے مولانا نے گرفت کی اور لکھا کہ حقائق ہونا چاہییں اور ہر چیز مدلل ہو ۔ ایک بات مولوی خلیل الرحمن کے خلاف یہ تھی کہ ان کے قیام و طعام کا بار ندوہ پر ہے، جو غلط الزام تھا ۔ اگر ایک روپیہ کرایہ مکان اور کھانے کا بار ندوہ پر ہوتا بھی تو لوگ اس پر زیادہ توجہ نہ دیتے ۔ یہ تھی بھی معمولی بات ۔ ایک الزام یہ بھی تھا کہ وہ مسجد میں پنج وقتہ نماز نہیں پڑھتے ہیں ۔ لیکن یہ بات بھی غلط تھی اور اس کی تردید مولوی عبد السلام ندوی نے کی تھی ۔ بعض سوالات بے شک ٹھیک تھے، لیکن بہت معمولی تھے ۔ اسی زمانے میں لکھنو کے مشہور

وکیل محمد نسیم نے وکیل امرتسر میں کچھ باتیں لکھیں، تو مولانا نے لکھا کہ اس کے متعلق یہ لکھنا چاہیے کہ بے شبہ مولانا شبلی کا یہ خیال تھا کہ دونوں گروہوں کو کارکن کی حیثیت سے الگ ہو جانا چاہیے، لیکن مخالف جماعت کے اصلی لیڈر تو مولوی خلیل الرحمن سہارن پوری ہیں اور ندوہ کے مقامی کارکن جانتے ہیں کہ منشی احتشام علی کی مخالفت پہلے نہ تھی۔ اب مخالفت مولوی خلیل الرحمن کی پانچ سالہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔ چناں چہ تاریخ اور واقعات شہادت میں موجود ہیں۔ اس لیے منشی احتشام علی سے پہلے مولوی خلیل الرحمن کو ندوہ سے الگ ہونا چاہیے۔ حالاں کہ وہی نہیں ہوئے اور دوسرے لوگ مستعفی ہو گئے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اگر دونوں گروہوں کے علاوہ کوئی ناظم ہوتا تو کام ٹھیک چلتا اس لیے کہ دونوں گروہ اس کو مدد دیتے۔

دوسری چیز مولوی نسیم سے دریافت طلب یہ تھی کہ ندوہ کے دستور العمل میں تھا کہ ناظم کا تقرر جلسہ انتظامیہ میں ہوگا اور جلسہ سالانہ کے اتفاق کے بعد عہدے پر مقرر کیا جائے گا اور مولوی خلیل الرحمن کے معاملے میں ایسا نہیں ہوا اور وہ اپنے کو ناظم کہنے اور لکھنے لگے۔

انتخاب نظامت کے لیے یہ ضروری تھا کہ ناظم کے عہدے کے لیے کسی شخص کا نام تجویز ہو کر تمام ارکان سے رائے لی جائے اور ندوہ میں یہ کارروائی کی گئی کہ نئی انتظامیہ بنائی گی اور دوسرے دن جلسہ انتظامیہ ہوا، حالاں کہ پندرہ دن بعد ہونا چاہیے تھا۔

جلسہ انتظامیہ کے ایجنڈے میں فیصلہ طلب امور درج تھے اور پندرہ دن قبل شائع کیا گیا تھا۔ اس میں اس کے متعلق صرف یہ الفاظ تھے کہ ممبروں اور عہدہ داروں کا انتخاب ہوگا، کسی عہدے دار کا نام پیش نہیں کیا گیا تھا۔

اسی ایجنڈے پر لوگوں کی رائیں آئی ہوں گی۔ کیا ایسا غیر معین اور مشتبہ اور مجمل طریقہ انتخاب جائز کہا جا سکتا ہے۔ پھر اس جلسے میں پندرہ سے زائد اشخاص نہ تھے، جنہوں نے ناظم کے متعلق فیصلہ کیا۔

سب سے اہم سوال محمد نسیم صاحب سے یہ کرنا چاہیے کہ معتمدیوں کے توڑنے کی تجویز تو ایجنڈے میں نہ تھی۔ کس بنا پر یہ تجویز پیش ہوئی اور فوراً منظور ہو گئی اور پھر لطف یہ کہ مقامی ارکان کی رائے سے منظور ہوئی اور باہر کے ارکان کو خبر تک نہ ہوئی، لیکن ان سوالات کے معقول اور سنجیدہ پیرائے میں پوچھنے کی ضرورت تھی۔

مولانا ضعف کی وجہ سے اب سیرتؐ کے علاوہ کوئی کام نہیں کر پا رہے تھے، ورنہ ان کا

خیال تھا کہ معلمین ندوہ کی ایک جماعت تیار کی جائے اور بااثر لوگوں سے ممبر بننے کی خط و کتابت کے ذریعے درخواست کی جائے۔ پھر اس مضمون کے خطوط چھپوا کر جس میں ندوہ کے مقاصد کی اہمیت تمہید میں ہو اور پھر موجودہ حالت کو ناقابل اطمینان بتلایا جائے اور جب بااثر لوگ ہم خیال ہو جائیں تو ایک تحقیقاتی کمیشن لکھنو جا کر تحقیقات کرے اور قوم کے سامنے اپنی تحقیقات کو پیش کر دے اور چوں کہ قوم کو احساس پیدا ہو چکا ہے کہ ندوہ قوم کا ہے، اور جو چیز قوم کی ہے اس میں وہ مداخلت کر سکتی ہے اور اس کو اپنے اختیار میں لے سکتی ہے تو خود ہی ندوہ قوم کے ہاتھ میں آجائے گا۔

سید سلیمان ندوی سیرتِ عائشہ رضی اللہ عنہا کے لیے مواد تلاش کر رہے تھے تو مولانا نے لکھا کہ حافظ سیوطی کا رسالہ الاصابہ فی استدراک عائشہ علی الصحابہؓ مستعار مل گیا تھا، لیکن کوئی نقل کرنے والا نہ تھا، جو نقل کر کے سید سلیمان ندوی کو بھیجا جاتا (۸۳)۔

مولانا کا قیام کاچی گوڑہ حیدر آباد میں تھا۔ یہاں مولوی ابو ظفر ندوی کا خط ملا، جس میں انھوں نے حیدر آباد میں اپنی ملازمت کے بارے میں لکھا تھا۔ مولانا نے جواب دیا تھا کے باہر کے لوگوں کو یہاں ملازمت ملنا مشکل ہے۔ چار سال ملازم رہے، مگر کسی عزیز کو ملازمت نہ دلا سکے۔ ان کے لیے جو کچھ ہو جاتا تھا وہ بغیر کسی کوشش کے ہوتا تھا اور ان کی شہرت تھی اور حیدر آباد کے لوگ قدر دان تھے۔ ہاں سیرتؐ میں لینے کو تیار تھے، مگر شرط یہ تھی کہ تصنیفی لیاقت میں ترقی کر لیں (۸۴)۔

نومبر ۱۹۱۳ء

مولوی امین زبیری نے اپنے خط میں علی گڑھ کالج میں شعبہ فارسی میں سید سلیمان ندوی کی تقرری کے بارے میں لکھا تو مولانا نے جواب دیا کہ علی گڑھ کالج میں اس شعبے میں دو پروفیسر تو اس وقت بھی موجود ہیں۔ کیا کوئی اور جگہ نکلی ہے؟ سید سلیمان ندوی اور مولوی عبد السلام ندوی کے متعلق لکھا کہ دونوں اچھے بن گئے اور اگر مخالفین اوقات اور کام میں خلل نہ ڈالتے تو اور بھی لوگوں کے تصنیفی کام میں تیار ہونے کی امید تھی۔ مولانا اب تک طے نہیں کر پائے تھے کہ باقاعدہ کہاں قیام کریں، ورنہ ارباب قلم کی تربیت کا انتظام کرتے۔ فی الحال یہی طے کیا تھا کہ سیرت کے دفتر کو اتنا وسیع کریں کہ دائرۃ التالیف بن جائے۔ ہندوستان میں ہر کام کے لئے انجمنیں ہیں، لیکن

تصنیفی انجمن کوئی بھی نہیں اور یہی سب سے اہم کام ہے، اس لیے کہ ایک لائق مصنف ہزاروں آدمیوں کے دل پر حکمرانی کرتا ہے۔

مولانا نے اپنی نظموں کے متعلق لکھا کہ دو حصے ہونے چاہییں۔ اخلاقیات و سیاسیات، کشاف و صاف کے نام کی نظمیں سیاسیات کے تحت ہونا چاہییں اور دونوں حصے اس طرح چھاپے جائیں کہ مجموعہ بھی ہو اور الگ الگ بھی فروخت کیے جا سکیں۔ اکثر لوگوں پر اخلاقیات کی مانگ ہو اور سیاسیات کو کوئی نہ پوچھے گا۔ ایسی صورت میں مجموعہ رک جانے کا اندیشہ تھا۔ چوں کہ مولانا کی نظمیں الہلال میں مختلف ناموں سے شائع ہوئی تھیں، اس لیے ان کو بالکل یاد نہ تھیں کہ کون سی ان کی ہیں۔ اس لیے مولوی زبیری کو لکھا کہ سب نقل کرا کے بھیج دیں تو دماغ پر زور دے کر یاد کریں۔

مولانا کو ندوہ کے متعلق مایوسی کے خطوط مل رہے تھے۔ اس لیے وہاں کے حالات دائرۃ التالیف کے لیے سازگار نہ تھے۔ ابھی سیرت کا دیباچہ نہیں لکھا تھا، جس میں سبب اور اس کی تاریخ اور امین زبیری کا تذکرہ لکھنے کا ارادہ تھا، لیکن بہر حال دماغ میں تھا۔

سیرت کے لیے معمولی انگریزی داں مرضی کے مطابق نہیں ملا تھا۔ ہاشمی صاحب، جو علی گڑھ کالج سے نکال دیے گئے تھے، ان کے آنے کی امید نہ تھی۔ ان کے آنے پر کام چل جانے کی امید تھی۔ جرمن زبان میں عرب کی تحقیقات کے متعلق اچھی اچھی کتابیں ہاتھ آگئی تھیں، لیکن غیر زبان ہونے کی وجہ سے کام نہ لے سکتے تھے۔

مولانا کی حیدر آباد موجودگی میں وائسرائے آئے۔ بڑی تبدیلیوں کا اندیشہ تھا، لیکن نظام کی تقریر کچھ اس انداز پر ہوئی کہ تبدیلی کا خطرہ بظاہر ٹل گیا۔

مولوی امین زبیری کی ادارت میں "ظل السلطان" بھوپال سے نکلتا تھا۔ اس کے متعلق مولانا نے مشورہ دیا کہ چھپائی اور کاغذ اس کے نام اور انتساب کی مناسبت سے معیاری ہونا چاہیے (۸۵)۔

انھی جرمن کتابوں میں کئی کتابیں ایسی تھیں جن میں یمن وغیرہ کے کتبات کے موجد تھے، جن کا تعلق دو تین ہزار سال قبل اسلام سے تھا۔ یہ ان خطوط کے علاوہ تھے جو اب تک دستیاب ہو چکے تھے۔ پھر بھی مولانا چاہتے تھے علی گڑھ کالج کی لائبریری میں مولوی حمید الدین تحقیق کریں کہ عرب کے متعلق ایسی کتابیں موجود ہیں یا نہیں۔ اس لیے کہ ابتدائی حصے کی تکمیل کے لیے یہ

ضروری چیز تھی۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت حفصہؓ کے مظاہرہ کے متعلق بعض کا خیال تھا کہ وہ سیاسی نوعیت کا تھا اور مفسرین کا کہنا ہے کہ نفقہ کا جھگڑا تھا۔ اس کا بھی سیاست سے تعلق نہ تھا۔ بہر حال کوئی بات ابھی تک تحقیق نہیں ہوئی تھی اور یقین سے نہیں کہی جا سکتی تھی (۸۶)۔

مولانا کو خلاصہ۔ آرا حکمائے یورپ کی ضرورت پڑی تو پروفیسر نواب علی سے طلب کی۔ حیدر آباد کے اسی دوران قیام میں مولانا نے نواب عماد الملک سے خواہش کی۔ قرآن مجید پر ایک کتاب بھی لکھ دیں۔ مگر قرآن مجید کے ترجمے کے بعد اب کبر سنی کی وجہ سے، ہمت نہ پڑ رہی تھی۔ اس لیے کہ ۸۰ سال کے ہو چکے تھے۔ ویسے نصف قران مجید کا ترجمہ ہو چکا تھا۔ مولانا کے پروگرام کے مطابق سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا تیسرا حصہ قرآن مجید پر مستقلاً ایک کتاب تھی۔ اگر جلدی تیار ہو جاتی تو نواب عماد الملک کو دینے کا ارادہ تھا۔ جن چیزوں کو اس حصے میں مولانا کا لکھنے کا ارادہ تھا ان کے متعلق اہل قادیان کا دعویٰ تھا کہ مولوی محمد علی قادیانی نے اپنے ترجمہ اور حواشی میں ان عقدوں کو حل کیا ہے۔ مولانا کا کہنا تھا کہ ارباب فلسفہ کی آخر تحقیق بھی قرآن مجید کے ارشادات بلکہ تصریحات سے آگے نہیں بڑھتی اور قرآن مجید حقائق سے مملو ہے، اس لیے غور سے پڑھنے کی ضرورت ہے۔

مولانا کا ارداہ تھا کہ لکھنو اور پھر الہ آباد جائیں لیکن غیر موجودگی میں بہت سے کام ادھورے رہ جانے کا اندیشہ تھا۔

اسی زمانے میں مولوی عبد الحلیم شرر اور عبد الودود بریلوی اور بعض اور لوگوں نے قوم کو ندوہ کی طرف توجہ دلائی کہ یہ قومی درس گاہ ہے، اس لیے قوم کو اختیار ہونا چاہیے کہ وہ ناظم کا انتخاب کرے۔ یہ نہیں کہ چند لوگ جس کو چاہیں ناظم بنالیں۔ مولانا کی رائے تھی کہ متفقہ صدائے احتجاج کی ضرورت ہے۔ وہ خود تو صحت کی کمزوری کی وجہ سے معتمدی کے لیے اپنے کو موزوں نہیں پاتے تھے، لیکن ان کے نزدیک قوم میں ایسے لوگ موجود تھے جو اس وقت کے ناظم سے ان کے نزدیک بہت بہتر ہے (۸۷)۔

مولوی مسعود علی ندوی نے کہیں مولانا کو لکھ دیا کہ وہ لکھنو سے اور ان لوگوں سے متنفر ہو گئے ہیں، جب ہی لکھنو آنے کا نام نہیں لیتے، تو مولانا نے لکھا کہ وہ لوگ مخلص ہیں اور مخلصین کے بغیر ہی کر کیا کریں گے۔ مولوی مسعود علی کا نظارۃ المعارف القرآنیہ میں ۵۰ ماہانہ پر جانے کا

ارادہ ہوا اور مولانا سے مشورہ کیا تو انہوں نے منع کیا اور لکھا کہ وہ شروع دسمبر تک لکھنو پہنچ جائیں گے، پھر کوئی صورت ان کے لئے نکال لیں گے۔ لیکن لکھنو آنے کے اور مستقل قیام کے لیے سب سے پہلے صحت شرط ہے اور پھر ایک وسیع مکان کا ملنا جو ۳۰ اور ۴۰ کرایہ تک ہو گا۔

مولوی مسعود علی کو ندوے کے متعلق لکھا۔ مولوی عبدالباری ندوی کو ہدایت کرنا چاہتے تھے کہ وہ بھی ندوے کی خرابی پر لکھیں اور دوسرے ارکان کو بھی لکھنا چاہیے۔ سب سے بڑھ کر نواب علی حسن علی خاں لکھ سکتے تھے، اس لیے کہ خوب واقف تھے، مگر افسوس یہ تھا کہ ان کو لکھنا نہیں آتا تھا۔ اب بہت بیمار رہنے لگے تھے اور ہفتے میں بہ مشکل دو تین دن لکھ سکتے تھے (۸۸)۔

سید سلیمان ندوی نے رسالہ استدراک عائشہؓ کی نقل کرانے کے لیے بڑی لجاجت سے لکھا تو مولانا نے لکھا کہ ان کو خود خیال ہے اور کتابت کا بندوبست کرا رہے ہیں۔ اس رسالے کو مولوی شبیر علی صاحب کہیں سے لائے تھے۔ مولانا نے سید سلیمان ندوی کو ہدایت کی کہ حضرت عائشہؓ کے فقہی اور کلامی اجتہادات پر پوری قوت سے لکھنے کی ضرورت ہے، یعنی طرزِ استدلال اور عبارت، سب خوبیوں کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے، کیوں کہ صحاح میں بھی بہت سی روایتیں ان کی شان کے خلاف منقول ہیں۔ خصوصاً وہ تمام روایتیں جو آنحضرتؐ کی معاشرتِ ازواج کے متعلق ہیں، اس لیے اس پر بڑے غور و فکر سے لکھنے کی ضرورت ہے۔ مولانا کا ارادہ تھا کہ سیرت میں اس پر باقاعدہ بحث کر کے ثابت کریں کہ تمام روایتیں منافقین مدینہ کی ہیں، جن کی افک کے واقعہ میں شرکت تھی اور منافقین سے کوئی تعجب کی بات بھی نہ تھی (۸۹)۔

الہلال کلکتہ کی ضمانت وغیرہ طلب ہو جانے اور کچھ انتظامی معاملات کی وجہ سے سید سلیمان ندوی وہاں سے بے دل تھے۔ اس پر مولانا نے لکھا کہ ملاقات ہونے پر ان کے لیے باقاعدہ ایک مضبوط اسکیم بنائیں گے، تاکہ کچھ کام بھی ہو اور معیشت کا سامان بھی۔ اس کا مولانا کو اب بھی افسوس تھا کہ انھوں نے سیرت کا تعلق چھوڑنے میں جلدی کی اور الہلال میں تعلق کے بعد مولانا سے مشورہ کیا۔ دسمبر میں لکھنو پہنچ کر تمام مراحل طے کرنا تھے (۹۰)۔

مولوی اسحق کو مولانا کی گرتی ہوئی صحت اور بار بار کی صحت کی خرابی سے بڑی فکر ہوئی۔ اور ان کو مشورہ دیا کہ باقاعدہ علاج کریں۔ مولانا نے لکھا کہ علاج وغیرہ بے کار ہے، کیوں کہ وہ چاہتے تھے کہ بقول ان کے تیل تمام ہو چکا البتہ تبدیلی، آب و ہوا بے شک مفید ہے۔ لیکن

دشواری یہ تھی کہ جب کسی کے منصب میں اضافہ ہوتا تھا تو نذر گزارانی پڑتی تھی۔چناں چہ نواب عماد الملک نے مولانا کو روک لیا کہ یہ رسم ادا کر کے جائیں۔ مگر نظام امیر شریف گئے ہوئے تھے، اس لیے ابھی باریابی میں دیر تھی۔ لہٰذا مجبوراً ٹھیرے ہوئے تھے۔ مہینہ دو مہینہ رہ کر بمبئی جانے کا ارادہ تھا (۹۱)۔

مولانا کو اعظم گڑھ کی آب و ہوا موافق تھی، پھر اپنا بنگلہ، سکون اور خاموشی، اس لیے وہاں تصنیف کا کام نہایت اطمینان سے ہو سکتا تھا۔ اسٹاف بھی بلا لیتے اور اپنی مرضی کے مطابق بنگلے کو ترتیب دے لیتے۔ لیکن بنگلے میں کنور عبدالکریم کا قیام تھا اور وہ مولانا کے سعادت مند شاگرد تھے، اس لیے مولانا کو ان کو خالی کرنے کے لیے لکھتے ہوئے جھجک ہو رہی تھی۔ اس لیے مولوی اسحق کو لکھا کہ حامد نعمانی کے ذریعے کہلوائیں کہ وہ ایک ماہ میں خالی کر دیں اور اپنے قیام کا بندوبست کہیں اور کر لیں۔ اعظم گڑھ کے قیام میں مولانا کے لیے نیشنل اسکول کے مشغلے سے بھی دلچسپی تھی (۹۲)۔

اب مولانا نے اپنی اسکیم بدل دی تھی اور گرمیوں تک حیدر آباد (دکن) میں ہی جم کر رہنے کا ارادہ تھا۔ سیرت کا پورا اسٹاف بھی بلا رہے تھے۔ اس لیے چاہتے تھے کہ سید سلیمان ندوی حیدر آباد میں رہ کر سیرت کے کام میں مدد دیں، کیوں کہ عبدالسلام ندوی بھوپال جا رہے تھے، لیکن سید سلیمان ندوی کے لیے کام کا معاوضہ ۵۰ تھا جو بہت تھوڑا تھا۔ اسی زمانے میں انگریزی مترجم سو روپیہ ماہانہ مشاہرہ پر رکھ لیا گیا تھا اور دو کاتب بھی مقرر کیے گئے تھے (۹۳)۔

ہاشمی صاحب کے متعلق امین زبیری صاحب نے بعض اطلاعات بہم پہنچائیں تو مولانا نے لکھا کہ اب تو وہ ان کو بلا چکے ہیں اور یہ ان کی سندوں کے حوالے دینے پر فیصلہ کیا گیا تھا۔

مفتی انوار الحق مہتمم تعلیمات بھوپال نے مولانا کو خط لکھا، مگر ان کو نہیں ملا۔ غالباً اس میں ندوہ کی مالی امداد کے متعلق کچھ لکھا گیا تھا۔ لہٰذا مولوی امین زبیری کو مولانا نے لکھا کہ ندوے کی مالی مدد تو ضرور ہونا چاہیے، مگر شرائط کے ساتھ، تاکہ اس امانت کو اپنا مال سمجھ کر بے دردی سے نہ خرچ کیا جائے۔ اس وقت جو انتظام تھا وہ سراسر بددیانتی اور تمام قواعد کی خلاف ورزی پر مبنی تھا۔ اگرچہ اس معاملے میں مولانا خاموش رہے، لیکن قوم کی طرف سے عام مظاہرے کی تحریک کو بہتر سمجھتے تھے۔ چناں چہ، ہمدرد اور دلگداز میں ندوہ کے خلاف مضامین لکھے گئے۔

عورتوں کے متعلق مولانا نے پھر لکھا کہ ایک کتاب میں بہت کم ملے گا۔ سیکڑوں

مقاموں سے ریزے چننے پڑیں گے۔ اس لیے ان کو لکھا کہ مولوی عبدالسلام ندوی کو بلالیں۔ مولانا ان کو تمام حوالہ جات بتاکر بھیجیں گے، تاکہ ان کو کام میں دشواری نہ ہو۔

مولانا اس سے متفکر تھے کہ ابھی تو سیرت کی ابتدا ہوئی ہے اور اس سلسلے میں مالی امانت کی مدت ختم ہونے والی ہے، لیکن ان کی فکر میں اس طرح کمی ہوئی کہ پرنس حاجی حمید اللہ خان نے مولانا کو لکھا کہ سیرت کی مد کے استقلال کے لیے عید الضحیٰ کی تعطیل میں بیگم بھوپال کی خدمت میں عرض کریں گے۔ لہٰذا مولانا نے امین زبیری کو لکھا کہ وہ بھی یاد دہانی کر دیں۔

حیدر آباد دکن میں مولانا کی صحت خاصی بہتر تھی، اس لیے ان کا ارادہ تھا کہ جلد اول تمام کر کے حیدر آباد سے روانہ ہوں۔ یہاں کا کتب خانہ سیرت کے لیے مفید تھا (۹۴)۔

حکیم غلام غوث نے مولانا سے پھر اشعار کی فرمائش کی، تو انھوں نے لکھا کہ اخبارات میں ان کی نظمیں دیکھ کر غلط اندازہ ہوا کہ وہ زندہ ہیں، ورنہ سچ تو یہ ہے کہ اب ان کی حالت مردہ، متحرک جیسی تھی اور جب یہ صورت تھی تو پھر فرمائش کیسے پوری کی جا سکتی تھی۔ ہاں اب صرف ایک کام رہ گیا تھا، وہ تھا سیرت کا کام، وہ بھی چوبیس گھنٹوں میں ایک پاؤ ڈیڑھ گھنٹہ سے زیادہ نہیں کیا جاتا تھا۔ وہ بھی اس وجہ سے پورا کرنا تھا خواہ جان دے کر ہی پورا کرنا پڑے (۹۵)۔

مولانا نے دینے کو تو مولانا ابو ظفر ندوی کو ان کی ملازمت کے بارے میں کورا جواب دے دیا تھا، مگر رہے وہ ان کے لیے فکر میں، چناں چہ مولوی عبدالغنی صاحب وارثی (۹۶)، جو ان کے ہم وطن (بہار) تھے، سے بات کی تو انھوں نے ۳۰ روپے، ۴۰ روپے کی ملازمت کی پیش کش کی تو مولانا نے ان کو لکھا کہ وہ مولانا کے حوالے سے مولانا عبدالغنی صاحب اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ جنرل کو لکھیں تو وہ ضرور کوئی صورتِ حال نکال دیں گے۔ ویسے مولانا نے تعریف کر دی تھی اور ہر وقت تائید کرنے کو تیار تھے، رہ گئی سفارش تو وہ انھوں نے اپنے بیٹے کے لیے کبھی نہیں کی (۹۷)۔

مولانا کو سیرت بہت عزیز تھی، اس لیے کہیں آنے جانے میں وقت ضائع کرنا نہ چاہتے تھے۔ ہر منزل پر پہنچنے کے بعد بھی ہفتوں تک طبیعت نہیں جمتی تھی۔ الہ آباد اور لکھنؤ کی آب و ہوا ایسی تھی کہ مستقل قیام نہ کر سکتے تھے اور حیدر آباد میں طبیعت درست ہو چلی تھی اور اتنا ہی بہت تھا کہ روز کام کرنے لگے تھے، گو زیادہ نہ کر سکتے تھے۔ اس وجہ سے اب پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ پہلی جلد یہیں ختم کر لیں، لہٰذا استاف سید سلیمان ندوی اور انگریزی مترجم کو بلا لیا تھا۔ حیدر آباد

سے جانے میں ایک رکاوٹ یہ بھی تھی کہ ہمدردوں کا کہنا تھا کہ مولانا اپنے سامنے ہی مولوی حمید الدین کا تقرر کرالیں تو ٹھیک ہے، ورنہ پھر رہ جائے گا۔ اس لیے دو تین مہینے تک تو بہرحال رہنا تھا۔

مولوی حمید الدین کے قربانی کے مضمون سے مولانا اب سیرت میں کام لے رہے تھے۔ لیکن وہ آیت توارۃ میں نہیں ملی تھی جس میں حضرت ابراہیمؑ کا حضرت اسحٰقؑ سے استفادہ مولوی اسحٰق نے لکھا تھا۔

مولوی حمید الدین کے سامنے بھی انسپکٹری کا تقرر تھا، اس پر مولانا نے لکھا اس میں دورہ وغیرہ کرنا پڑے گا اور تصنیفی کاموں میں رکاوٹ ہوگی۔ ایک جگہ کے قیام میں زیادہ موقع ہے اور حیدر آباد میں تو کام بہت کم ہے۔

اعظم گڑھ اسکول (نیشنل) کے لیے مولانا نے کارکنوں کو اطلاع دے دی کہ ڈیڑھ ہزار کارکن لوگ انتظام کریں۔ پانچ سو مولانا اپنی جیب سے دینے کو تیار تھے اور راجہ ابو جعفر سے بھی خاصی رقم دلانے کا ارادہ تھا۔ گویا اس طرح تقریباً تین ہزار کی رقم پوری کرنے کا ارادہ تھا جب ہی گورنمنٹ سے تعمیر کے سلسلے میں مالی اعانت ملتی (۹۸)۔

اسی زمانے میں جریر اور فرزدق شاعروں کے مناقضات مع شرح بڑے اہتمام سے لندن میں شائع ہوئی تھی اور اس کی قیمت ۱۳۰ روپے تھی۔ اس کی مولوی حمید الدین کو اطلاع دی (۹۹)۔

مولانا عبد الماجد دریا آبادی بھی مولانا کے لیے انگریزی کتابوں سے ترجمہ کرتے تھے۔ جب مولانا کو ترجمے کی دوسری قسط ملی تو مولانا نے ان کے مشاغل اور ان کی آئندہ اسکیم کے متعلق دریافت کیا۔ مولانا پہلے بھی دریا آبادی صاحب کو سیرتؐ کے اسٹاف میں مستقل طور پر بحیثیت مترجم لینا چاہتے تھے، مگر مولانا دریا بادی مستقل طور پر اس خدمت کے لیے تیار نہ تھے۔ اب پھر مولانا نے لکھا کہ ہاشمی صاحب کو بلایا گیا اور جو ابھی تک نہیں آئے تھے۔ اس کا بھی امکان تھا کہ بالکل نہ آئیں تو ایسی صورت میں کیا چار پانچ مہینے کے لیے مستقل طور پر خدمت کو قبول کرنے کو تیار ہو سکتے ہیں۔ کیوں کہ پہلی جلد میں انگریزی اقتباسات کی جگہیں خالی ہونے کی وجہ سے کام رکا ہوا تھا اور چوں کہ مولانا دریا بادی مترجم کے ساتھ مصنف بھی تھے، اس وجہ سے مولانا ان کو ترجیح دے رہے تھے اور امید کر رہے تھے کہ وہ مرضی کے مطابق کام کر سکیں گے۔ لہٰذا ان کے

ارادے کے بارے میں دریافت کیا۔ اس بات پر ان کو ٹوکا کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق واحد کی ضمیر استعمال نہ کریں، بلکہ جمع کی ضمیر استعمال کیا کریں (۱۰۰)۔ ابھی تک مولانا اپنے قیام کے بارے میں فیصلہ نہیں کر سکے تھے۔ ہاں اعظم گڑھ کے قیام میں سوائے اشعار کے اور سب ہو لتیں تھیں۔

اس زمانے مسلمانوں میں جو سیاسی انتشار تھا اس سے وہ بہت پریشان تھے اور نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ وزیر حسن اور امیر علی کا سیاسی کشمکش میں مقابلہ ان کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا، بلکہ اس مقابلہ کو ہیچ سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ قوم سرسید کے زمانے میں بھی اندھی تھی اور اب بھی اندھی ہے (۱۰۱)۔

اب مولانا دریابادی نے اپنے خیالات سے اور تجویزوں سے مولانا کو اطلاع دے دی تھی اس میں انھوں نے لکھا تھا کہ عام دنیوی عہدہ انہیں پسند نہیں۔ فیلوشپ کے طریقے پر اگر کوئی علمی اعانت ہو تو اس کو قبول کرنے کو تیار تھے۔ ابھی تک ان کی کتاب فلسفۂ جذبات طبع نہیں ہوئی تھی، گو تیار ہو گئی تھی۔ مولانا نے مولانا دریابادی کو لکھا کہ شاید انہیں تجاویز لکھتے وقت انھوں نے اس چیز کو پیش نظر نہیں رکھا کہ قدیم مصنفین اور بانیان فن ابن سینا، طوسی، رازی، ابن رشد وغیرہ نے سرکاری خدمتوں کے ساتھ علمی خدمتیں انجام دی ہیں۔ سرسید کے مہمات مشاغل صدر الصدوری کے زمانے کے ہیں۔ خالص علمی خدمت کے لیے دنیا میں بہت کم موقع ہے، یعنی دائرہ بہت تنگ ہو جاتا ہے۔ اب تک حیدرآباد میں فیلوشپ کا طریقہ نہیں تھا۔ مشرقی جامعہ کا قیام جلد ہی عمل میں آنے والا تھا، بلکہ اسی سال تک یہ طریقہ جاری ہونے کی امید تھی، لیکن اب بھی مولانا کو علم نہ تھا کہ وہ وظیفہ وہیں کے لیے ہو گا یا باہر والوں کے لیے بھی۔ جس وقت مولانا دریابادی کو خط لکھ رہے تھے اسی وقت نواب عماد الملک بلگرامی کا دستی خط آیا۔ مولانا نے جواب لکھتے وقت باہر والوں کے لیے فیلوشپ کے بارے میں بھی دریافت کیا۔

مولوی عبدالحق (بابائے اردو) کے پاس مولانا دریابادی کی کتاب فلسفۂ جذبات انجمن ترقی اردو میں چھپنے کے لیے گئی تھی، لہٰذا مولانا نے چاہا کہ اگر وہ ان کو مل جاتی تو عماد الملک کو دکھلاتے۔

مولانا نے مولانا دریابادی سے مشورہ کیا اور چاہا کہ وہ دیگر احباب سے مشورہ کے بعد جواب لکھیں کہ اب وہ لکھنو واپس آنا چاہتے تھے اور لکھنو میں قیام کا ارادہ تھا۔ لیکن باوجود اس

کے کہ وہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے معاملات میں دخل نہ دیتے، پھر بھی وہاں کے حالات ان کے کانوں میں ضرور پڑتے اور اس سے کوفت ہوتی اور یہاں قیام کے زمانے کو سکون سے گزارنا چاہتے تھے۔ اور اس ۴-۵ ماہ کی مدت میں پہلی جلد مکمل کر لیتے تو ایسی کوئی صورت ممکن تھی کہ وہ لکھنو کے قیام کے زمانے میں سکون سے وقت گزاریں۔ مولانا نے دریابادی صاحب سے پھر خواہش کی کہ صیغہ۔ انگریزی کی افسری اور مہتمی کا کام انجام دیں تو پہلی جلد تیار ہو جائے اور خود ان کو معلوم نہیں تھا کہ یورپ کے بے شمار ذخیرے میں سے کیا کیا چیزیں لینے کے قابل ہیں اور عام مترجم بتا نہیں سکتے (۱۰۲)۔

اسلام کے متعلق اب مولانا نے انگریزی کتاب لے لی تھی۔ لیکن پڑھوا کر سنا تو بڑی مایوسی ہوئی اور نہایت جاہلانہ اور متعصبانہ کتاب معلوم ہوئی۔ ہر جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اہانت آمیز الزامات لگائے گئے تھے۔

مولانا، سید سلیمان ندوی کو تین چار ماہ کے لیے سیرت کے کام میں رکھنا چاہتے تھے، لیکن وہ پروفیسر عبد القادر کی طلب پر ان کو اسسٹنٹ پروفیسر کی جگہ پر دکن کالج پونا بھیجنے کو تیار تھے۔ لیکن مولانا کے خیال میں مولوی عبد السلام ندوی کو فارسی دانی میں سید سلیمان ندوی پر ترجیح تھی لیکن ان دونوں کے پاس کوئی سند نہ تھی، اس لیے تقرری مشکل تھی، اس لیے کہ انگریز تو صرف سند دیکھتے ہیں (۱۰۳)۔

پروفیسر عبد القادر کو مولانا پہلے ہی اطلاع دے چکے تھے کہ سید سلیمان ندوی کسی قدر انگریزی جانتے ہیں، بولنے کے لیے نہیں بلکہ مطالعے کے لیے۔ پھر بھی اگر ان کا تقرر ہو جائے تو دو تین مہینے توقف کریں تاکہ مولانا سیرت کے سلسلے میں اس درمیان کام لیں (۱۰۴)۔

مولانا حمید الدین نے ایک عبارت لکھ کر بھیجی اور علامات ت ۱۱: ۱۸ لکھیں۔ لیکن مولانا نے جب وہ حوالہ تکوین کی اصحاح ۱۱ میں تلاش کیا تو وہ عبارت نہ ملی، لہذا مزید تحقیق چاہی۔ مولوی حمید الدین نے تکوین کے حوالے سے حضرت ابراہیم کا مسکن صفا میں لکھا تھا، لیکن مولانا نے جب حوالہ دیکھا تو اس میں صفا کا کہیں ذکر نہ تھا۔

مولانا نے اس زمانے میں یورپ سے بعض کتابیں منگانے کے لیے خط لکھا، خصوصاً جرمن کی وہ مبسوط کتاب بھی طلب کی جس میں نابتی خط میں کتبات تھے۔

مولانا نے اپنی صحت کی خرابی کی وجہ سے لوگوں کے مشورے سے افیون (۱۰۵) کھائی

شروع کردی اور اس سے ان کو بے انتہا فائدہ ہوا۔ معدہ نہایت درست ہو گیا، اشتہا بھی بڑھ گئی۔ اس بارے میں اطبا سے بھی مشورہ کر لیا تھا اور انھوں نے بالاتفاق مشورہ دیا تھا اور کہا تھا کہ کسی قسم کا ضرر نہ ہو گا۔ مولانا کو توقع تھی کہ انھوں نے جو افیون کی مقدار مقرر کر لی ہے، اس سے زیادہ نہ بڑھے گی، اگرچہ لوگوں کے متعلق یہ تجربے کے خلاف بات ہے۔

مولوی حمید الدین کی صحت بھی آج کل کچھ کمزور تھی تو مولانا نے ان کو مشورہ دیا کہ آب وہوا کی تبدیلی ضروری ہے، لہٰذا چھٹی لے کر کچھ دنوں کے لیے کہیں چلے جائیں (۱۰۶)۔

مولانا نے مولوی عبد الحق (بابائے اردو) سے مولانا دریا بادی کی کتاب سائیکولوجی پر مانگی کہ عماد الملک کو دکھائیں، تو انھوں نے لکھا کہ وہ کتاب واپس بھیج چکے، تاہم وہ چھپ رہی ہے۔ بعد اشاعت عماد الملک کو دکھلانے کے لیے مل جاتی۔ اب مولانا نے جلد ہی لکھنو جانے کا ارادہ کر لیا تھا اور ۳۰ روپے ۳۵ روپے ماہانہ کرائے کے مکان کی فکر میں رہنے کے لیے مولانا دریا بادی کو لکھا (۱۰۷)۔

سید سلیمان ندوی نے اپنے خط میں کوئی بات لکھی تو مولانا کو جلال آگیا اور لکھا کہ انھوں نے اتنی مدت کے بعد بھی مولانا کی عقل، ہمدردی اور تعلق خاطر کو ٹھیک نہیں سمجھا۔ بہر حال اب حیدر آباد سے روانہ ہونے والے تھے اور ان کی (سید سلیمان ندوی کی) حیدر آباد آمد کے منتظر تھے، کیوں کہ لوگوں سے تعارف کرانا چاہتے تھے۔ لیکن چوں کہ اب قیام کا ارادہ نہ تھا اور وہ اب تک نہ پہنچے تھے اور نہ اب آنے کی امید تھی، اس لیے موقع نکل گیا۔ اب دکن کالج پونا کے لیے کوشش ہو رہی تھی، جس کے متعلق لکھنو پہنچ کر تفصیل لکھنے والے تھے۔

ویسے تو مولانا کا ارادہ تھا کہ سیرت کا سلسلہ مستقل قائم کر دیا جائے اور کم از کم اپنی زندگی تک رکھیں، لیکن فی الحال چند ماہ کے لیے سید سلیمان ندوی کی سیرتؒ کے کام میں ضرورت تھی۔ اس سے زیادہ روکنے کا ارادہ نہ تھا، کیوں کہ پونا کا معاملہ اس وقت طے ہو چکا تھا۔

سید سلیمان ندوی کی خواہش تھی کہ پٹنہ سے ایک اچھا سا رسالہ نکالیں، لیکن مولانا نے اس کو محال بتلایا، اس لیے کہ اچھی چھپائی کے بغیر رسالہ نکالنا بے کار تھا (۱۰۸)۔

دسمبر ۱۹۱۳ء

سید سلیمان ندوی جب مولانا کی طلب پر حیدر آباد نہ پہنچ سکے تو مولانا نے ارادہ کر لیا کہ اب حیدر آباد میں زیادہ نہ ٹھہریں اور ۶ دسمبر کو روانہ ہو جائیں۔ راستے میں دو چار روز بھوپال ٹھہریں۔ پر لکھنو یا الہ آباد محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس بھی اسی زمانے میں ہونے والی تھی، لہذا ارادہ کر رہے تھے کہ اس میں شرکت کے بعد کہیں مستقل قیام کریں، پھر سید سلیمان ندوی کو اپنے پاس بلائیں۔

سید سلیمان ندوی کو رسالے کے متعلق مشورہ دیا کہ اگر نکالنا ہی ہے تو ٹائپ میں چھپوائیں اور الہلال پریس کلکتہ ہی اس کے لیے مناسب ہو گا۔

اب ندوے کا سالانہ جلسہ لکھنو میں ہونے والا تھا اور مولانا کے پاس ضابطے کی اطلاع آگئی تھی۔ مولانا کا خیال تھا کہ لکھنو میں جلسہ اس لیے کیا جا رہا ہے کہ نظامت کو پختہ کر دیا جائے اور اس کو اس طریقے سے کرنا مقصود معلوم ہوتا تھا کہ جلسے سے تین چار روز قبل تک اس کا اعلان نہ کریں کہ جلسے میں نظامت کا فیصلہ ہو گا۔ عین وقت پر اعلان کر کے کارروائی کریں گے۔ اس وقت چوں کہ مقامی اشخاص کا مجمع زیادہ ہو گا، اس لیے حسب مراد فیصلہ ہو جائے گا۔

مولانا نے سید سلیمان ندوی کو مشورہ دیا کہ پٹنہ، آرہ، مظفر پور، بہار میں مسلمانوں کے جلسے ہونے چاہئیں، جس میں لوگ کسی حقیقی قابل شخص کا نام نظامت کے لیے پیش کریں۔ مولانا کا ارادہ خود ہونے کا نہ تھا بلکہ وہ چاہتے تھے کہ قومی کام میں قوم کی حقیقی رائے معلوم ہو اور قوم کی عام دل چسپی بڑھے۔ اس سلسلے میں اگر پٹنہ میں تحریک کی جاتی تو ندوے کے قدیم طلبہ ڈاکٹر محمد مسٹر مظہر الحق اور دیگر بیرسٹر ضرور تائید کرتے۔ اس سے بڑا فائدہ یہ ہوتا کہ ندوے کی اہمیت بڑھ جاتی اور لوگ واقف ہو جاتے، ورنہ بے پروائی کا یہ عالم تھا کہ ندوے میں کچھ ہو جاتا، نہ کسی کو خبر ہوتی اور نہ پروا (۱۰۹)۔

مولانا نے مولانا دریا بادی سے چاہا کہ ولہاوسن کے مضمون سے پہلے انسائیکلوپیڈیا سے عرب کے متعلق ایک مضمون تقریباً دس بارہ صفحات کا لکھ دیں، جس میں ذیل کے امور کا خیال ضرور رکھا جائے:

۱۔ عرب کی قدامت

۲۔ عرب میں کون کون سی حکومتیں قائم ہوئیں۔

۳۔ حمیری، سبائی، نابتی خاندانوں کے مختصر حالات اور ان کے کتبے۔

۴۔ عمارات قدیم مثلاً ضمدان، مآرب، حصن، ناعدا

۵۔ تہذیب و تمدن۔

حیدر آباد سے جلد ہی روانہ ہونا چاہتے تھے، لیکن واقعات اور رکاوٹیں اختیار سے باہر تھیں (۱۱۰)۔ مولانا کا ارادہ نیشنل اسکول کو کالج بنانے کا تھا اور اس کا نام محمڈن کالج رکھنے کا تھا، اس لیے اعظم گڑھ میں مسلمانوں کی ایک کانفرنس کرنے کا ارادہ تھا۔ اس پر مولوی اسحق نے لکھا کہ شور و غل ہوگا اور کچھ نہیں، تو مولانا نے جواب دیا کہ شور و غل بے ہودہ چیز ہے، لیکن بغیر اس کے دنیا میں کام نہیں چلتا اور اس سلسلے میں انبیاء اور مصلحین کی نظیریں موجود ہیں۔ علی گڑھ کالج بھی شور و غل ہی سے قائم ہوا تھا اور اب تک اس پر قائم ہے۔ بہرحال اتنا ضرور ہوا کہ انھوں نے مولانا کی کانفرنس والی تجویز کو تسلیم کر لیا۔ لہٰذا اب اس کی ضرورت تھی ایک اچھا سا پراسپیکٹس انگریزی اور اردو میں چھپوا کر برادری کے کل معزز سرکاری ملازمین اور دیہات کے روساء کے پاس بھیجا اور وکلا، منصف اور عہدیداروں کو برادری کی تعلیم پر توجہ دلائی جائے۔ اس گروہ نے اب تک برادری کی تعلیم سے بالکل دلچسپی نہ لی تھی۔ چناں چہ نیشنل اسکول اور مدرسۃ الاصلاح سرائے میران کے فیض سے اب تک محروم تھے۔ لہٰذا مولانا نے مولوی اسحق کو تاکید سے لکھا کہ ذاتی خطوط لکھ کر اصرار اور تقاضے سے ان لوگوں کو جمع کریں اور خصوصاً مندرجہ ذیل حضرات کو تو ضرور مدعو کریں: مولوی عبدالحمید سروری، مولوی عبدالحلیم منصف، میاں جنید (۱۱۱) وغیرہ۔ مولانا کا یہ بھی خیال تھا کہ مولوی اسحق ہی کا ان لوگوں پر اثر پڑ سکتا تھا، ورنہ مولانا کا کہنا تو یہ لوگ ایک کان سے سنتے تھے اور دوسرے کان سے اڑا دیتے تھے۔

کانفرنس کے مقام کو اعظم گڑھ پسند نہیں کر رہے تھے کیوں کہ یہاں عامی مذاق غالب رہتا اور اگر اعظم گڑھ میں یہ کانفرنس ہوتی تو نیشنل اسکول یا بنگلے (۱۱۲) میں ہوتی۔ سرائے میں بھی عامی مذاق غالب رہنے کا اندیشہ تھا۔

مولانا کو علی گڑھ والے بڑے تقاضے سے بلا رہے تھے اور ان کے علی گڑھ کے مستقل قیام پر مصر تھے اور مولانا جانے کا وعدہ بھی کر چکے تھے، مگر مستقل قیام کا ارادہ اعظم گڑھ ہی کا تھا۔

مولانا چاہتے تھے کہ اعظم گڑھ کی کانفرنس میں حکام کو بھی مدعو کیا جائے اور اسکول کے

متعلق یہ خیال تھا کہ اگر اس کے بورڈنگ کو وسعت دی جائے تو گورکھپور اور جون پور کے لڑکے بھی اسکول میں داخلہ لے لیتے۔

مولانا کے ذہن میں دارالمصنفین کے ساتھ ہی یہ اسکیم بھی آئی تھی اور اعظم گڑھ کے قیام میں اس کا مسئلہ اور دارالمصنفین اور محمڈن کالج اعظم گڑھ (مجوزہ و متخیلہ) کی نگرانی کرنا چاہتے تھے یہ دونوں گویا مولانا کی آخری اسکیمیں تھیں اور دونوں کو بعد میں عملی جامہ پہنایا گیا اور اب تک وہ قائم ہیں۔ یعنی دارالمصنفین اعظم گڑھ اور نیشنل اسکول کو ترقی دے کر بجائے محمڈن کالج کے شبلی کالج اعظم گڑھ۔

ان اسکیموں کو پیش کرتے وقت بھی مولانا کی صحت کی خرابی اور معذوری حوصلے پست کر دیتی تھی، اس لیے کہ چوبیس گھنٹوں میں صرف گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کام کر سکتے تھے اور یہ غنیمت وقت سیرت کے کام میں لگا رہے تھے اور کہتے جاتے تھے۔

عمر تھوڑی حسرتیں دل میں بہت (۱۱۳)

مولانا کانفرنس والی اسکیم کے سلسلے میں مولوی حمید الدین سے بھی مشورہ کرنا چاہتے تھے لہٰذا مولوی اسحق کو ہدایت دی کہ ان سے بھی مشورہ کر لیں اور کانفرنس کا اعلان اور پروگرام مل کر لکھیں اور چھپوائیں اور لوگوں کے پاس بھیجیں اور تقسیم کریں (۱۱۴)۔

مولانا کی خواہش تھی کہ ان کے احباب، اعزا اور طلبہ درس گاہ سے نکل کر ملک میں پھیل جائیں۔ اور الگ الگ نظام شمسی (۱۱۵) قائم کریں۔ یہی چیز سید سلیمان ندوی کے لیے چاہتے کہ ان کو دائرے میں محدود رکھنا نہیں چاہتے تھے بلکہ ایک خاص مدت تک کے لیے یعنی ۴ یا ۵ ماہ اپنے پاس رکھ کر سیرت میں مدد لینا چاہتے تھے، تاکہ پہلی جلد تیار ہو جائے۔ پھر ان کے لیے بھی وہ چاہتے تھے کہ کہیں بیٹھ کر علمی کام کریں۔ سیرت کے معاملے میں اب حافظہ و دماغ کے ضعف کی وجہ سے نظر ثانی پر اطمینان نہ ہوا تھا۔

اب حیدر آباد سے ۸۔ دسمبر کو روانہ ہونے کا ارادہ تھا اور دو چار روز بھوپال میں بھی قیام کرنا چاہتے تھے۔

مولانا نے سید سلیمان ندوی کو بعض باتوں پر غور کر کے لکھنے کی تاکید کی، جو سیرت سے متعلق تھیں۔ مثلاً صحیح بخاری میں کعب اشرف یہودی اور ابورافع کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے قتل ہونا لکھا تھا۔ لہٰذا مولانا کا سوال یہی تھا کہ اس کو اخلاق کے موافق کس طرح تسلیم کیا

جائے۔ اس کے راوی، اول حضرت جابر بن عبداللہ تھے۔ کیا وہ اس واقعے میں شریک تھے، یا شرکاء سے سنا تھا۔ آیت تخییر سے کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر عدل بین الازواج باقی نہیں رہا۔ حضرت عائشہؓ کی ترجی من تشاء کے متعلق کہاں تک صحیح ہیں (۱۱۶)۔

مولانا نے مولوی اسحق کو بورڈنگ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے پھر لکھا کہ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ نیشنل اسکول کو ہائی اسکول (میٹرک) بنانا چاہیے یا بورڈنگ قائم کرنا چاہیے۔ اسکول ہر شہر میں سرکاری یا مشن موجود ہیں اور ان کے مقابلے میں کم خرچ پر اعلیٰ اساتذہ مہیا کرنا آسان نہیں اور یہ طے ہو جائے کہ کرنا ہی ہے تو بہت محنت، قوت اور وقت کی ضرورت ہو گی، لیکن تجربہ کار حضرات کا یہ کہنا ہے کہ اسلامی بورڈنگ بنانا ہائی اسکول کرانے سے بہتر ہو گا، اس لیے کہ اس میں اخلاقی اور مذہبی تربیت ہو گی۔ رہ گیا تعلیم کا معاملہ تو طلبہ کو کسی اسکول میں حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر یہ رائے صحیح ہو تو نیشنل اسکول کے قریب ہی بورڈنگ کی بنیاد ڈالنا چاہیے، جس کو رفتہ رفتہ تعمیر کرا لیا جائے۔ بورڈنگ کی وجہ سے باہر کے بچے کم خرچ میں تعلیم حاصل کر سکیں گے اور تربیت گویا بورڈنگ میں مفت حاصل ہو جائے گی۔ مولوی محمد عمر اور مولوی سمیع جلد ہی (سال بھر میں) پنشن لینے والے تھے، لہٰذا یہ لوگ اپنا وقت نکال کر بورڈنگ یا اسکول کے قیام و ترقی میں معاون ثابت ہو سکتے تھے اور لوگ بھی ان لوگوں پر اعتماد کرتے تھے۔

مولانا نے مولوی اسحق کو لکھا کہ وہ خیال رکھیں کہ اگر مولانا نے اعظم گڑھ میں قیام کیا تو وکٹوریہ فٹن کی آنے جانے کے لیے ضرورت ہو گی۔ لہٰذا گھوڑا یا گاڑی جو موقع سے اچھی مل جائے اس کو خرید لیا جائے۔

اب مولانا نے ایک کھانا پکانے والی ماما ملازم رکھ لی تھی، جو کھانا اچھا پکاتی تھی۔ لہٰذا کھانے کے معاملے میں انہیں اطمینان ہو گیا تھا۔ لیکن چوں کہ حیدر آباد سے واپس ہونے والے تھے، لہٰذا ساتھ لانے کا ارادہ نہ تھا۔ یہ ضرور ہے کہ ضرورت پڑنے پر بعد کو بلا لینے کا ارادہ تھا (۱۱۷)۔

اب سید سلیمان ندوی کا دکن کالج پونا میں بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر تقرر ہونا طے ہو گیا تھا۔ اس پر مولانا بے حد مسرور تھے اور یہ پروفیسر عبدالقادر کی کوششوں کی کامیابی سمجھتے تھے۔ اس خوشخبری کا خط مولانا کو پہلے ہی مل گیا تھا، مگر حیدر آباد سے لکھنو کے سفر کی وجہ سے جواب نہ لکھ سکے تھے اور اب لکھنو میں قیام تھا۔

مولانا نے سید سلیمان ندوی کی طبیعت سے پروفیسر عبدالقادر کو واقف کرنے کی خاطر لکھا کہ وہ بہت قانع شخص ہیں اور اس عہدے کو کسی طرح قبول کرنے پر تیار نہ تھے ۔ لہذا مولانا کو بار بار سمجھانا پڑا اور آخر مجبور کر کے ان کو تیار کیا ۔ اصل میں وہ ملازمت سے آزاد رہ کر علمی کام کرنا چاہتے تھے ۔ بہرحال مولانا کے دباؤ اور پروفیسر صاحب کے خیال سے وہ پونا کے لیے روانہ ہو گئے ۔ راستے میں ان کا ارادہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کا بھی تھا ۔

پھر بیمار پڑ جانے کی وجہ سے کانفرنس میں شرکت کے لیے آگرہ نہ جا سکے ۔ بعض کتابیں پروفیسر عبدالقادر نے منگوائیں تو لکھا کہ ان کے پاس نہیں ہیں، لہذا عبداللہ خاں صاحب کتب خانہ، آصفیہ حیدر آباد سے منگوا لیں ۔

مولانا کو جرمن کتاب جس میں ناپتی کیسے تھے، اور فارسٹر کے جغرافیہ کا بڑا انتظار تھا (۱۱۸) ۔

مولانا کا خیال تھا کہ قرآن شریف کے شبہات کا جواب یورپ کے انداز پر پورے ہندوستان میں مولوی حمید الدین پروفیسر میور کالج سے بہتر کوئی نہیں دے سکتا تھا ۔ انھوں نے مولانا عبدالحی فرنگی محلی اور دیگر اکثر اشکالات پر اب تک عربی زبان میں چھ رسالے لکھے تھے، جس پر علمائے مصر نے بھی تحسین کی اور حیرت ظاہر کی ۔ وہ اس وقت کالج میں دو سو روپے ماہوار پا رہے تھے اور مولوی امین زبیری کو بھوپال میں دینی کام کے لیے ضرورت تھی تو مولانا نے لکھا کہ چوں کہ دینی کام ہے اس لیے ممکن ہے کچھ کم تنخواہ پر وہ راضی ہو جائیں ۔ لیکن ان کے لیے ایک انگریزی مترجم کی ضرورت ہوگی، جو عمدہ انگریزی لکھے ۔ لیکن اس کے مہیا کرنے کی ذمے داری مولوی صاحب (امین زبیری) لیں، تب صحیح کام ہو سکتا ہے اور ملک کو جب ہی اطمینان ہو سکتا ہے اس زمانے میں یاقوت مستعصمی کے قرآن مجید کا نسخہ ۳ ہزار میں ہدیہ طے ہو جاتا، اس کے لیے مولانا نے زبیری صاحب کو لکھا کہ خود آ کر ملاحظہ کریں اور طے کریں (۱۱۹) ۔

حواشی:

۱..... یہ آرٹیکل مولانا نے چار نمبروں میں لکھا تھا لیکن اس وقت تک تین ہی لکھے گئے تھے ۔
۲..... مکاتیب اول، صفحہ ۲۲۳-۲۲۴، ۵-جنوری ۱۹۱۳ء
۳..... مکاتیب اول، صفحہ ۱۰۸، ۷-جنوری ۱۹۱۳ء
۴..... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۳۲، ۱۶-جنوری ۱۹۱۳ء
۵..... مسلم گزٹ لکھنو، وحید الدین سلیم پانی پتی کی ادارت میں نکلتا تھا ۔ میر جان اس کے مالک تھے اور

مولانا شبلی اس کے نگراں۔

۶ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۸۰، ۲۰-جنوری ۱۹۱۳ء

۷ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۶۴، ۲۰-جنوری ۱۹۱۳ء

۸ .... لکھنؤ کے مشہور بیرسٹر مذہبی آدمی اور قومی کاموں میں پیش پیش تھے۔

۹ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۸۱ تا ۸۳، ۲۳-جنوری ۱۹۱۳ء

۱۰ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۸۳، ۵-فروری ۱۹۱۳ء

۱۱ .... تقسیم ہند سے پہلے تک اس کے سیکریٹری محمد خلیل صاحب تھے جو ڈاکخانہ میں کسی عہدے پر ملازم تھے اور تقسیم ہند سے پہلے ریٹائر ہو گئے تھے۔ ۱۹۵۲ء میں اپنے اکلوتے صاحبزادے سید محمد جمیل کے پاس کراچی تشریف لے آئے تھے۔ موصوف راقم الحروف کے دادا کے شاگرد تھے اور آمد فنڈ گزٹ میں اپنے استاد کے خاندانی حالات اور شجرہ شائع کیا تھا (ہاشمی)۔

۱۲ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۸۳-۸۴، ۶-فروری ۱۹۱۳ء

۱۳ .... ندوے کے ابتدائی سالانہ جلسوں میں شیعہ علما اور دیگر حضرات شریک ہوتے تھے، کیوں کہ ندوہ مسلمانوں کے تمام فرقوں اور ہر طبقۂ خیال کے علما کو ایک جگہ جمع کرنے اور سب کے مفاد کا خیال کرنے اور اختلافات ختم کرنے کا دعوے دار تھا۔ بعد کو چند جلسوں کے بعد خود شیعہ حضرات نے یہ کہہ کر کہ ہماری الگ جماعت کام کر رہی ہے اور ہمارا الگ دارالعلوم (سلطان المدارس) ہے، اس لیے شرکت نہ کر سکیں گے، علحدگی اختیار کر لی اور یہ سب ہنسی خوشی اور بغیر کسی ناگواری کے ہوا تھا۔ اس کے باوجود اکثر شیعہ حضرات تائید کرتے رہے یا شرکت کرتے رہے، مثلاً خواجہ غلام الثقلین، مسٹر مہدی حسن اور سید حسین بلگرامی وغیرہ۔

۱۴ .... مراد ہے مسلم لیگ۔

۱۵ .... لکھنؤ کی طرف اس طرح بولتے ہیں جیسی روح ویسے فرشتے۔

۱۶ .... محمد علی جناح

۱۷ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۹۱-۱۹۲، ۱۸-مارچ ۱۹۱۳ء

۱۸ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۶۶، ۱۹-مارچ ۱۹۱۳ء

۱۹ .... ندوے سے یہ عمارت سندیلہ کے دیوان جی کے مشہور خاندان کی ایک خاتون نے خریدی اور خاتون منزل نام رکھا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی قرابت کی بنا پر اسی عمارت میں لکھنؤ آکر قیام کرتے ہیں۔ موصوف کے بڑے بھائی ڈپٹی عبدالمجید صاحب مرحوم آخر عمر تک اسی میں قیام پذیر رہے۔ اب یہ ڈپٹی عبدالمجید صاحب کے داماد شیخ محمد قدیر الزماں کی ملکیت ہے۔ اکابر کے قیام اور آمد کی وجہ سے اس کی حیثیت آثارِ قدیمہ جیسی ہے۔

۲۰ .... مکاتیب اول، صفحہ ۱۰۳-۱۰۵، ۲۷-مارچ ۱۹۱۳ء

۲۱.... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۵۸-۱۵۹، ۳۱-مارچ ۱۹۱۳ء

۲۲.... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۳۲-۲۳۳، ۳-اپریل ۱۹۱۳ء

۲۳.... مکاتیب دوم، صفحہ ۸۴-۸۵، ۲۸-اپریل ۱۹۱۳ء

۲۴.... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۹۲-۱۹۳، ۱۸-مئی ۱۹۱۳ء

۲۵.... مکاتیب اول، صفحہ ۳۰۴ تا ۳۰۶، ۲۹-مئی ۱۹۱۳ء

۲۶.... مکاتیب دوم، صفحہ ۸۵-۸۶

۲۷.... مکاتب اول، صفحہ ۲۲۴-۲۲۵، ۶-جون ۱۹۱۳ء

۲۸.... مکاتیب دوم، صفحہ ۸۶، ۹-جون ۱۹۱۳ء

۲۹.... محمد علی کی قسمت میں تو ابھی قوم کی طرف حساب اور بھی باقی تھا جو ان کی موت تک جاری رہا۔

۳۰.... وحید الدین سلیم اب مولانا کے خلاف تھے اور مخالفین کی مولانا کے خلاف ہر تحریر شائع کر رہے تھے

۳۱.... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۵۹-۱۶۰، ۱۰-جون ۱۹۱۳ء

۳۲.... مکاتیب اول، صفحہ ۲۳۶، ۱۹۱۳ء

۳۳.... مکاتیب دوم، صفحہ ۸۷، ۲۲-جون ۱۹۱۳ء

۳۴.... مولوی خلیل الرحمن سہارن پوری

۳۵.... مکاتیب اول، صفحہ ۲۰۵، ۹-جولائی ۱۹۱۳ء

۳۶.... مکاتیب اول، صفحہ ۲۰۶، ۱۲-جولائی ۱۹۱۳ء

۳۶/ الف .... نظارۃ المعارف القرآنیہ، دہلی-قائم کردہ مولانا عبید اللہ سندھی (ابو سلمان شاہجہان پوری)

۳۷.... مکاتیب اول، صفحہ ۳۲۸-۳۲۹، ۱۳-جولائی ۱۹۱۳ء

۳۸.... مکاتیب اول، صفحہ ۸۷-۸۸، ۱۴-جولائی ۱۹۱۳ء

۳۹.... سید نواب علی صاحب کمنڈوی بڑودہ کالج میں پروفیسر تھے۔

۴۰.... مکاتیب اول، صفحہ ۳۱۳-۳۱۴، ۱۶-جولائی ۱۹۱۳ء

۴۱.... مکاتیب اول، صفحہ ۳۲۹-۳۳۰، ۱۶-جولائی ۱۹۱۳ء

۴۲.... مکاتیب اول، صفحہ ۳۱۴-۳۱۵، ۱۸-جولائی ۱۹۱۳ء

۴۳.... مکاتیب اول، صفحہ ۳۰۶-۳۰۷، ۲۱-جولائی ۱۹۱۳ء

۴۴.... مکاتیب دوم، صفحہ ۳۹-۴۰، ۲۱جولائی ۱۹۱۳ء

۴۵.... مکاتیب دوم، صفحہ ۴۰، ۲۱جولائی ۱۹۱۳ء

۴۶.... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۱۸، ۲۲جولائی ۱۹۱۳ء

۴۷.... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۳۱، ۲۷جولائی ۱۹۱۳ء

۴۸ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۸۸، ۲-اگست ۱۹۱۳ء
۴۹ .... مکاتیب اول، صفحہ ۲۰۶-۲۰۷، ۳-اگست ۱۹۱۳ء
۵۰ .... مولوی خلیل الرحمن سہارن پوری (انھیں ناظم مقرر کیا گیا تھا، مگر چوں کہ ناظم کی جگہ پر کوئی مقرر نہیں ہوا تھا لہٰذا وہ اپنے کو ناظم سمجھتے تھے اور کہلاتے تھے)۔
۵۱ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۸۹ تا ۹۲، ۷-اگست ۱۹۱۳ء
۵۲ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۸۹، ۱۳-اگست ۱۹۱۳ء
۵۳ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۱۸-۱۱۹، ۱۴-اگست ۱۹۱۳ء
۵۴ .... مولوی سلیمان ندوی نے اس کا نام رحیم بے لکھا ہے (مکاتیب دوم صفحہ ۹۳ کا حاشیہ) لیکن راقم الحروف نے عطیہ بیگم کی زبان سے رحمن سنا ہے اور فیضی عطیہ کے خاندان کی مناسبت سے لگایا تھا۔
۵۵ .... مولانا کی یہ تصویر پیرس کی نمائش ۱۹۱۳ء میں دوسرے نمبر پر ٹھہری تھی۔
۵۶ .... مکاتیب اول، صفحہ ۲۸۳-۲۸۵، ۲۰-اگست ۱۹۱۳ء
۵۷ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۳۱ تا ۳۳، ۲۰-اگست ۱۹۱۳ء
۵۸ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۹۳، ۲۲-اگست ۱۹۱۳ء
۵۹ .... مکاتیب اول، صفحہ ۳۱۵، ۲۵-اگست ۱۹۱۳ء
۶۰ .... مکاتب دوم، صفحہ ۹۴، ۲۷، اگست ۱۹۱۳ء
۶۱ .... مکاتیب اول، صفحہ ۳۱۶، ۲۹-اگست ۱۹۱۳ء
۶۲ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۹۴-۹۵، ۲۹-اگست ۱۹۱۳ء
۶۳ .... مکاتیب اول، صفحہ ۱۰۹، یکم ستمبر ۱۹۱۳ء
۶۴ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۹۵-۹۶، ۷-ستمبر ۱۹۱۳ء
۶۵ .... مکاتیب اول، صفحہ ۲۲۹، ۸-ستمبر ۱۹۱۳ء
۶۶ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۴۳-۴۴، ۸-ستمبر ۱۹۱۳ء
۶۷ .... یہ مضمون سید سلیمان ندوی نے ابوالکلام کے رنگ میں لکھا تھا۔ مضمون خاصا تیز تھا اس لیے مولانا کو یہ خیال بھی نہیں ہوا کہ سید سلیمان کا لکھا ہوا ہے۔ گورنمنٹ نے اسی مضمون کی وجہ سے الہلال سے دو ہزار کی ضمانت طلب کی تھی۔
۶۸ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۹۶-۹۷، ۱۶-ستمبر ۱۹۱۳ء
۶۹ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۵۰، ۱۹-ستمبر ۱۹۱۳ء
۷۰ .... مکاتیب اول، صفحہ ۳۰۷-۳۰۸، ۲۲-ستمبر ۱۹۱۳ء
۷۱ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۴۴، ۲۶-ستمبر ۱۹۱۳ء
۷۲ .... مکاتیب اول، صفحہ ۲۴۶-۲۴۷، ۱۳-اکتوبر ۱۹۱۳ء

۷۳ .... ستمبر ۱۸۹۶ء

۷۴ .... اصلی حکم نامہ دارالمصنفین میں محفوظ ہے۔

۷۵ .... اکتوبر ۱۹۱۳ء

۷۶ .... مکاتیب اول، صفحہ ۲۸۵، ۱۵-اکتوبر ۱۹۱۳ء

۷۷ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۱۹-۱۲۰، ۱۸-اکتوبر ۱۹۱۳ء

۷۸ .... مکاتیب اول، صفحہ ۲۸۵-۲۸۶، ۲۰-اکتوبر ۱۹۱۳ء

۷۹ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۳۵، ۲۱-اکتوبر ۱۹۱۳ء

۸۰ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۳۵-۳۶، ۱۹۱۳ء

۸۱ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۳۶-۳۷، ۲۲-اکتوبر ۱۹۱۳ء

۸۲ .... مکاتیب اول، صفحہ ۲۸۶-۲۸۸، ۲۷-اکتوبر ۱۹۱۳ء

۸۳ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۹۷ تا ۹۹، ۲۹-اکتوبر ۱۹۱۳ء

۸۴ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۶۶، ۳۰-اکتوبر ۱۹۱۳ء

۸۵ .... مکاتیب اول، صفحہ ۲۴۸-۲۴۹، یکم نومبر ۱۹۱۳ء

۸۶ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۳۷، ۳-نومبر ۱۹۱۳ء

۸۷ .... مکاتیب اول، صفحہ ۳۱۶-۳۱۷، ۳-نومبر ۱۹۱۳ء

۸۸ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۲۰-۱۲۱، ۴-نومبر ۱۹۱۳ء

۸۹ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۹۹-۱۰۰، ۵-نومبر ۱۹۱۳ء

۹۰ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۰۰، ۷-نومبر ۱۹۱۳ء

۹۱ .... مکاتیب اول، صفحہ ۳۲، ۷-نومبر ۱۹۱۳ء

۹۲ .... مکاتیب اول، صفحہ ۳۲-۳۳، ۷-نومبر ۱۹۱۳ء

۹۳ .... مکاتب دوم، صفحہ ۱۰۱، ۸-نومبر ۱۹۱۳ء

۹۴ .... مکاتیب اول، صفحہ ۲۴۹-۲۵۰، ۹-نومبر ۱۹۱۳ء

۹۵ .... مکاتیب اول، صفحہ ۳۲۶-۳۲۷، ۹-نومبر ۱۹۱۳ء

۹۶ .... مولوی محی الدین صاحب اردو کالج کراچی کے پہلے پرنسپل تھے اور سید تقی الدین صاحب انجمن ترقی، اردو پاکستان، کراچی کے پہلے سیکریٹری کے والد مولوی عبدالغنی وارثی صاحب۔

۹۷ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۶۶، ۱۱-نومبر ۱۹۱۳ء

۹۸ .... عرب کے مشہور شاعر۔ دونوں میں معاصرانہ چشمک تھی لیکن جب جریر مرا تو فرزدق نے کہا جریر نہیں مرا بلکہ فرزدق مر گیا۔

۹۹ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۳۷ تا ۳۹، ۱۲-نومبر ۱۹۱۳ء

۱۰۰ .... مولانا عبد الماجد دریابادی کا وہ الحادی دور تھا۔

۱۰۱ .... مکاتیب اول، صفحہ ۲۹۱-۲۹۲، ۱۵-نومبر ۱۹۱۳ء

۱۰۲ .... مکاتیب اول، صفحہ ۲۹۲-۲۹۳، ۱۷-نومبر ۱۹۱۳ء

۱۰۳ .... مکاتب اول، صفحہ ۲۲۹-۲۳۰، ۲۲-نومبر ۱۹۱۳ء

۱۰۴ .... مکاتیب اول، صفحہ ۲۳۰، ۲۲-نومبر ۱۹۱۳ء

۱۰۵ .... مولانا حالی نے نومبر ۱۸۹۰ء میں افیون کھانی شروع کی تھی۔ چناں چہ ڈاکٹر غلام مصطفی خاں لکھتے ہیں:

"نومبر میں نزلہ میں پھر مبتلا ہو گئے اور کسی کے مشورے سے افیون کھانی شروع کی۔ لیکن اس سے اور طرح کی تکلیفیں شروع ہو گئیں۔" (حالی کا ذہنی ارتقا، صفحہ ۱۱۸)

۱۰۶ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۴۹، ۲۲-نومبر ۱۹۱۳ء

۱۰۷ .... مکاتیب اول، صفحہ ۲۹۴، ۲۷-نومبر ۱۹۱۳ء

۱۰۸ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۰۱-۱۰۲، ۲۸-نومبر ۱۹۱۳ء

۱۰۹ .... مکاتیب اول، صفحہ ۱۰۲-۱۰۳، ۳-دسمبر ۱۹۱۳ء

۱۱۰ .... مکاتیب اول، صفحہ ۲۹۴-۲۹۵، ۳-دسمبر ۱۹۱۳ء

۱۱۱ .... مولانا کے چھوٹے بھائی۔

۱۱۲ .... مولانا کا اعظم گڑھ میں موروثی بنگلہ۔ مولانا نے اپنے انتقال سے قبل دیگر ورثا اور اعزا کی رائے سے دار المصنفین کے لیے اس کو وقف کر دیا تھا۔

۱۱۳ .... مولانا کو اب زیادہ زندہ نہ رہنے کا یقین ہو گیا تھا۔

۱۱۴ .... مکاتیب اول، صفحہ ۴۳-۴۴، ۷-دسمبر ۱۹۱۳ء

۱۱۵ .... شمس العلماء کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے۔ یعنی اپنی قابلیت اور شہرت سے علامۂ وقت کہلائیں اور شمس العلماء کا خطاب ملے۔ ویسے مختلف درس گاہوں کے قائم کرنے کی طرف تو اشارہ ہے ہی۔

۱۱۶ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۰۳-۱۰۴، ۷-دسمبر ۱۹۱۳ء

۱۱۷ .... مکاتیب اول، صفحہ ۴۴-۴۵، ۸-دسمبر ۱۹۱۳ء

۱۱۸ .... مکاتیب اول، صفحہ ۲۳۱، ۲۸-دسمبر ۱۹۱۳ء

۱۱۹ .... مکاتیب اول، صفحہ ۲۵۰-۲۵۱، ۳۱-دسمبر ۱۹۱۳ء

۱۹۱۴ء

جنوری

غذا کی قلیل مقدار اور کام کی رفتار میں کوئی فرق نہیں ہوا کہ ۱۹۱۴ء آگیا۔ آٹھ مہینے (۱) سے ایک وقت کی غذا نے کمزوری کو اور بڑھا دیا تھا۔ اس نقاہت کے باوجود معمولات میں فرق نہ آنے دیا اور صبح کے دو گھنٹے لکھنے کا کام جاری رہا۔ اعظم گڑھ میں موروثی بنگلے کو کرایے دار سے خالی کرا لیا اور اس کو آراستہ کرا کے گرمیوں میں وہیں قیام کا ارادہ کیا۔ گرمی کی شدت اور لو کی حدت سے پریشان ہو کر بمبئی کا ارادہ کرتے تھے، مگر اب اتنی سکت تھی نہ ہمت کہ سفر کر سکیں۔ لہٰذا اعظم گڑھ میں قیام کا ارادہ کیا۔ مولوی سمیع کو پنشن لے کر نیشنل اسکول کی خدمت پر توجہ دلائی اور ان کو مولوی اسحٰق (چھوٹے بھائی) کی تعطیل کو نیشنل اسکول کے لیے وقف بنا کر ہمت بندھائی حامد نعمانی (صاحبزادے) کی تلون مزاجی سے مولانا واقف تھے، لیکن پھر بھی ان سے اس ارادے پر کہ اگر مولانا اعظم گڑھ میں قیام کریں تو وہ پیشکاری (ملازمت) چھوڑ کر اسکول کا کام کرنے پر تیار ہوں گے، مسرت کا اظہار کیا ہے۔ مضامین عالمگیر کو ندوۃ العلماء سے طلب کیا۔ جدید نظمیں جو "نالہ، شبلی" کے نام سے آگرہ میں چھپی تھیں، ان کے متعلق استفسار کیا اور اپنی پولیٹکل نظموں کو بڑھاپے کا زور بتلایا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی (۲) کو ایک دستی رقعہ کے ساتھ یورپین تصانیف کے متعلق سیرت کا ایک جز بھیج کر انگریزی ناموں کو انگریزی حروف میں لکھوایا اور جان ڈیون پورٹ کی کتاب میں دیے ہوئے نقشے (مصنفین یورپ کا نقشہ) کے تمام نام انگریزی حروف میں لکھوائے۔ معمولی اور کم حیثیت تصانیف کو قلم زد کرنے کا ارادہ کیا۔

آگرہ (۳) میں کچھ کام تھے مگر بیماری کی وجہ سے نہ جا سکے۔ عربوں کے ان اشعار کی تلاش میں رہے، جن میں حج کعبہ، کعبہ یا مکہ کا ذکر ہو، اس لیے کہ اس زمانے میں سیرتؐ میں انہیں کے متعلق لکھ رہے تھے۔ عبرانی زبان میں مکہ (مکہ کو بکہ بھی کہا جاتا تھا) کا تلفظ بکا ہونے کی تحقیق کی۔ امریکہ میں اسلامی مشن کی تحریک اور خواجہ کمال الدین کی اس میں شرکت سے دلچسپی کا اظہار کیا۔ مغرب کے بعد طلبہ کو بخاری شریف کا پابندی سے درس دینا شروع کیا۔ اس لیے باوجود خواہش

کے الہ آباد کا جانا ملتوی کر دیا۔ فارسٹر (۴) کے جغرافیہ، تاریخی سے عرب قدیم کے متعلق مواد کا فراہم کرانا، الہ آباد لائبریری سے گلدزر کے متعلق دریافت کرانا، اسلام کی ترقی کے وقت روم (سلطنت روم)، فارس اور ہندوستان کی تمدنی اور اخلاقی حالت کی جستجو، مورخوں کی تاریخ عالم کے متعلق اپنی رائے کہ اسلام کے متعلق اس میں عامیانہ معلومات ہیں، کان پور کی مسجد کے واقعہ پر مولانا کی نظموں سے گورنمنٹ کی غلط فہمی دور کرانا، مولانا کا ان نظموں کو ہنگامی جوش کا نتیجہ قرار دینا اور اس جوش میں ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ اپنی شرکت کو تسلیم کرنا۔ سلطان جہاں بیگم (۵) والیہ، ریاست بھوپال کی آمد کی اطلاع پر لکھنو کے اہل شہر اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کی طرف سے شاہانہ استقبال کا ارادہ کیا۔ ندوہ کے انتظامی معاملات کی خرابی کی وجہ سے مولانا نے استعفیٰ دیا تھا۔ ندوہ میں اس وقت مولوی عبداللہ صاحب پرنسپل تھے۔ ان کو منتظمین ندوہ تنگ کر رہے تھے کہ وہ چلے جائیں تو مولوی عبدالکریم صاحب کو پرنسپل بنا دیا جائے، جنھوں نے جہاد پر بڑا سخت مضمون لکھا تھا اور حکومت کو ندوہ کی طرف سے بدظنی پیدا ہو گئی تھی۔ مولانا باوجود اس کے کہ ندوہ کے منتظمین سے اختلاف رکھتے تھے، مگر ندوہ کے خلاف نہ تھے، اس لیے ندوے کی اعانت کا بند ہونا گوارا نہ کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اصلاح ندوہ کے دل سے خواہاں تھے اور یہ چاہتے تھے کہ بھوپال کی سرکار سے یہ ہدایت ہو کہ ندوے کی اصلاح کی جائے اور اس کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی جائے۔ اصلاحی کمیٹی کا ہونا اس وجہ سے بھی ضروری تھا کہ اکثر جگہوں پر جلسوں میں ندوہ سے بے اطمینانی کا اظہار کیا گیا تھا اور سرکاری انسپکٹر کی ندوہ کے خلاف بڑی سخت رپورٹ تھی۔

مولانا چاہتے تھے کہ اصلاحی کمیٹی کے لیے ممبروں کا انتخاب آزادی اور بے لوثی سے ہو اور قواعد انتخاب کے موافق ہو۔ مولانا کا استعفیٰ جس کمیٹی نے منظور کیا تھا اس کمیٹی کو قواعدِ ندوہ کی رو سے استعفیٰ منظور کرنے اور ناظم کا انتخاب کرنے کا حق نہ تھا۔ مولانا نے اسی زمانے میں کوئی لکچر دیا تھا جو تحریری نہ ہونے کی وجہ سے محفوظ نہ رہا، مگر اسی زمانے کی نظمیں ضرور محفوظ رہیں۔ "نوجوانوں سے خطاب" کے عنوان سے جو نظم ہے اس کے دو شعر یہ ہیں:

کیے تھے ہم نے بھی کچھ کام جو کچھ ہم سے بن آئے
یہ قصہ جب کا ہے باقی تھا جب عہد شباب اپنا

اور اب تو سچ یہ ہے جو کچھ امیدیں ہیں وہ تم سے ہیں

جوان ہو تم لب بام آچکا ہے آفتاب اپنا

دوسری نظم سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تکمیل سے متعلق تھی، جس کے چند شعر یہ ہیں:

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہر صورت

کہ ابر فیض سلطان جہاں بیگم زر افشاں ہے

رہی تالیف و تنقید روایت ہائے تاریخی!

تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہے مری جاں ہے

غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل

کہ جس میں اک فقیر بے نوا ہے ایک سلطاں ہے

ان اشعار میں والیہ ریاست بھوپال کی طرف سے سیرت النبی صلعم کی تالیف میں مالی اعانت کا اظہار ہے۔ مولانا نے نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی سے قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ کرایا تھا اور مولانا حمید الدین فراہی کو اعانت کے لیے مقرر کیا تھا کہ وہ قرآن مجید کے اعجازی نکات اور عربی مفہوم کو بلگرامی صاحب کے ذہن نشین کرائیں تاکہ انگریزی میں صحیح مفہوم ادا کیا جا سکے (یہ ترجمہ مکمل نہ ہو سکا)۔ اس ترجمے کو مولانا نے پرنس حمید اللہ خاں (بعد کو یہ ریاست کے نواب ہوئے اور اب مرحوم ہو چکے ہیں) کے ملاحظہ کے لیے بھیجا۔ نالہ۔ شبلی کی زیادہ قیمت سے لوگوں کی شکایت کا مولانا نے اثر قبول کیا۔ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم (۶) کا ایک مضمون ذرا کمزور اور ناتمام تھا۔ اس کو مولانا حمید الدین کے پاس وسیع کرنے اور پرزور بنانے کے لیے بھیجا اور جلد واپسی کے لیے لکھا، کیوں کہ سیرت کے مسودے پر نظر ثانی کر کے مطبع میں بھیجنے کے قابل بنا رہے تھے اور اس جز کی دیر میں واپسی سلسلے کو توڑ دیتی۔ پھر نظر ثالث بھی کی۔ اجزا کو مطبع میں بھیجنے کا ارادہ تھا۔ اسی زمانے میں مولانا کو امیر خسرو کا دیوان غرۃ الکمال ملا، جس میں کچھ اوراق کم تھے اور نثر میں دیباچہ لکھا ہوا تھا جو مکمل تھا۔ اس دیوان کو مولانا نے امیر خسرو کا بہترین دیوان قرار دیا۔ سیرت (۷) کے لیے انگریزی مترجم قابل مل گئے، مگر لکھنو سے باہر جانے میں ان کو معذوری تھی، اسی لیے مولانا باوجود اعزا اور وطن کی یاد کے پہلی جلد ختم کیے بغیر لکھنو سے جانا نہیں چاہتے تھے۔ ندوہ (۸) کے ناظم نے طلبہ کو حکم دیا کہ مولانا سے نہ پڑھیں۔ (مولانا اعزازی

طور پر کوئی نہ کوئی سبق پڑھاتے تھے) ۔ حکم کی خلاف ورزی کی صورت میں نام خارج کرنے کی دھمکی دی گئی ۔ مولانا(۹) نے مولوی عبد الغنی صاحب بہاری، اکاؤنٹنٹ جنرل (حیدر آباد، دکن) سے مولوی عبداللہ صاحب ٹونکی، پرنسپل ندوۃ العلماء کے ممتحن مقرر کرنے کی تعریف کے ساتھ سفارش لکھی اور حیدر آباد سے اپنے وظیفے کے نہ آنے کی اطلاع دی اور لکھا کہ بذریعہ بیمہ بھیج دیں۔ پروفیسر عبد القادر (۱۰) کی سفارش پر سید سلیمان ندوی کا پونا کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے تقرر ہوا تھا ۔ مولانا نے اپنے اور سید سلیمان ندوی دونوں پر ان کا احسان سمجھا اور سید صاحب کو ہدایت لکھی کہ پروفیسر صاحب مذکور کو عربی صرف و نحو اور ضروری مسائل پڑھائیں جس سے عبارت پڑھنا آجائے پھر ادب کی ضروری کتابیں پڑھا دیں ۔ مولانا خلیل الرحمن سہارن پوری، جو اس وقت ناظم ندوۃ العلماء تھے، وہ آگرے گئے اور شاہ سلیمان پھلواروی کو آمادہ کیا کہ ان کی تائید میں لکھنو سے اخبار نکالیں ۔ شاہ صاحب نے ۴ ہزار کا سرمایہ مہیا کرنے کا ذمہ لیا ۔ مولانا نے سید صاحب کو ہدایت کہ کسی اسلامی جلسے میں خطبہ دیں ۔

سرکار عالیہ (۱۱) بھوپال کی لکھنو آمد آمد پر مولانا پبلک جلسے میں والیہ ء بھوپال کی دینی خدمات سراہنا چاہتے تھے، مگر اس کو تاجدار بھوپال نے پسند نہ کیا ۔ اس پر مولانا نے پبلک جلسے کے خیال کو ترک کر دیا ۔ اسی زمانے میں تجویز تھی کہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا انگریزی ترجمہ ہو ۔ ترجمہ وغیرہ کے اخراجات کرنل عبید اللہ خان، صاحبزادہ بھوپال ادا کرنا چاہتے تھے ۔ مولانا نے انگریزی مترجموں کی تلاش کی تو معلوم ہوا کہ اچھی انگریزی لکھنے والے مسلمان تقریباً ناپید ہیں اور غیر مذہب والے اس کام کو اچھی طرح انجام نہ دے سکتے تھے ۔ یہ بھی تجویز تھی کہ قرآن مجید پر حواشی لکھے جائیں ۔

مولانا کا یہ خیال تھا کہ مولانا حمید الدین فراہی اس کام کو بخوبی انجام دے سکیں گے ۔ اس لیے مولانا کا خیال تھا کہ ترجمہ، سیرت اور حواشی قرآن کا اسٹاف یکجا ہو جائے تو دونوں کو مدد ملے ۔ اس زمانے (۱۲) میں سید افتخار عالم صاحب مارہروی مولف "حیات النذیر" نے مولانا شبلی کے حالاتِ زندگی لکھنا چاہے تو ان کو لکھا کہ میرے بعد لکھیے گا، ورنہ مکمل کیوں کر ہوں گے ۔ غالباً افتخار عالم صاحب نے سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ کا مادہ "خاتم رسل" "۱۳۳۱ھ" "تاریخ اختتام جلد اول مطابق ۱۹۱۳ء لکھ کر بھیجا تھا ۔ اس کو مولانا نے پسند کیا اور الہامی قرار دیا اور اس کو کسی مناسب موقع پر لکھنے کا ارادہ کیا ۔ انہی (۱۳) دنوں مولانا کے نفاست پسند دوست مہدی حسن

نے نہایت عمدہ کاغذ کے نفیس لفافے بھیجے تھے ۔ وہ گم ہو گئے تو مولانا کو بڑا افسوس ہوا ۔ نقاد آگرہ میں مہدی حسن نے عناصر اربعہ کے عنوان سے ایک مضمون لکھا، جس میں حالی، آزاد، نذیر احمد، شبلی کے لٹریچر پر ایک ایک شخص کو لکھنے کے لیے منتخب کیا ۔ چناں چہ منشی افتخار عالم نے "حیات النذیر" کو اپنے ہاتھ میں لیا ۔ مولانا کا خیال تھا کہ عناصر اربعہ آپس ہی میں ایک دوسرے کے سوانح نگار بنتے تو خوب ہوتا ۔ مولانا علمی تحقیقات میں مسلمانوں کو یورپ کے مقابلے پر دیکھنا چاہتے تھے چناں چہ سید سلیمان ندوی کے پونہ کالج میں پروفیسر کرانے پر اس لیے خوش تھے کہ سید صاحب کو نہ صرف مالی تقویت ہو گی بلکہ ان کا حوصلہ بلند ہو جائے گا ۔ اسی کے ساتھ ساتھ خواجہ کمال الدین کی لندن میں اسلامی خدمات کو تحسین کی نظر سے دیکھتے تھے اور آئندہ کے لیے پیش خیمہ تصور کرتے تھے، کیوں کہ سمجھ رہے تھے کہ اب مسلمانوں میں دینی شعور اور اسلامی تحقیق اور خدمت کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے اور صحیح تربیت رہی تو آئندہ نسلیں خم ٹھونک کر میدان میں آئیں گی اور نہ صرف ترکی بہ ترکی جواب دیں گی بلکہ یورپ کی تحقیق کی تار و پود بکھیر کر رکھ دیں گی ۔ نواب سلطان جہاں بیگم (۱۴) کو مسلمان خواتین کی تعلیم و تربیت سے بڑی دلچسپی تھی ۔ "ظل السلطان" جو مولوی امین زبیری مرحوم کی ادارت میں نکل رہا تھا اس میں اکثر خواتین کے مضامین ہوتے تھے ۔ مسلمان خواتین کے کارناموں سے چوں کہ بیگم صاحبہ کو بڑی دلچسپی تھی، لہٰذا ان سے متعلق کتابوں کی تلاش رہتی تھی ۔ اس سلسلے میں مولوی زبیری مرحوم مدد دیا کرتے تھے ۔ اگرچہ خود معمولی (۱۵) پڑھے لکھے تھے مگر لکھنے کی مشق، ذاتی محنت اور کتب بینی کی مدد سے اس قابل ہو گئے تھے کہ ریاست بھوپال میں بڑی اہمیت اور شہرت تھی ۔ ان کو جن کتابوں کا علم نہیں ہوتا تھا ان کو احباب سے دریافت کرتے تھے ۔ چناں چہ مولانا شبلی سے بھی مدد لیا کرتے تھے اور مولانا اپنی وسعتِ معلومات کی بنا پر وسعت بھر مدد کرتے تھے ۔ ہمایوں نامہ، تزکِ جہانگیری، بابر نامہ اور مسلمان عورتوں کے حال میں عربی زبان میں ایک بسیط کتاب مصر میں چھپی تھی، ان کے متعلق مولانا نے زبیری صاحب مرحوم کو اطلاع دی ۔

ان دنوں بھوپال (۱۶) میں ترجمہ و تالیف کے محکمے کے قیام کا انتظام ہو رہا تھا ۔ اس کے لیے مولوی مسعود علی کا نام مولانا نے تجویز کیا اور ان کی انگریزی کی تعریف لکھی، مگر ساتھ ہی ساتھ مولانا نے خیال ظاہر کیا کہ اگر ایسا محکمہ ریاست سے باہر بھوپال کی سرکار کی سرپرستی میں قائم ہوتا تو زیادہ مفید ہوتا ۔ سیرتؐ کے سلسلے میں مولانا کو بھوپال سے اعانت ہو رہی تھی ۔ اس اعانت کو

مولانا مستقل کرانا چاہتے تھے، کیوں کہ مولانا کے پیش نظر سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سیرت الصحابہؓ، سیرت ازواج پیغمبر علیہ السلام وغیرہ بھی تھیں۔

انہی دنوں مولانا کو ایک کتبہ ملا، جس پر خط حمیری میں چند سطریں تھیں اور اس کے ساتھ انگریزی ترجمہ بھی تھا، جن کا مطلب تھا کہ ہمارے بادشاہ، ہم کو ہود کی شریعت کی تعلیم دیتے ہیں۔ مولانا اس زمانے میں کمرہ نمبر ۴۸ امین آباد پارک میں مقیم تھے اور دلی جانے کا ارادہ تھا۔ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم چھپوانے کا ارادہ تھا۔ لیتھو میں برسوں لگ جانے کے خیال سے ٹائپ میں چھپوانے کا انتظام کر رہے تھے۔ ندوہ والے مولانا سے طلبہ کے پڑھنے میں رکاوٹ ڈال رہے تھے اور مدرسوں کو بھی ملنے نہ دیتے تھے۔ اس زمانے (۱۷) میں مولانا کو امیر علی کی "اسپرٹ آف اسلام" کے ماخذوں کی سیرتؐ کے سلسلے میں تلاش رہی۔

فروری ۱۹۱۴ء

مولانا شبلی کا قیام آخر جنوری ۱۹۱۴ء میں کمرہ نمبر ۴۸ امین آباد پارک میں تھا اور دلی جانے کا ارادہ کر رہے تھے۔ ندوہ والے مولانا شبلی کے خلاف ہو چکے تھے اور اس مخالفت میں مولانا کو دکھ پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ طلبا مولانا سے بہت مانوس تھے اور مولانا کی ندوہ سے علحدگی کے بعد بھی ان سے پڑھنے (۱۸) ندوہ سے امین آباد (مولانا کے قیام کی جگہ) آتے تھے۔ ان کو ندوہ والوں نے روک دیا اور مدرسوں کو بھی مولانا سے ملنے کو منع کر دیا۔ مولانا کے لیے یہ رکاوٹ کسی حادثے سے کم نہ تھی۔ انھیں الجھنوں میں جنوری ۱۹۱۴ء گزر گیا اور فروری ۱۹۱۴ء نئی مصروفیتیں لے کر آگیا۔ کان پور کی مسجد کا واقعہ ہو چکا تھا۔ اس پر مولانا نے جو آنسو بہائے تھے۔ انھوں نے حکومت کے ایوان میں کھلبلی مچادی تھی اور مولانا پر حکومت کی غضب ناک نظریں پڑ رہی تھیں کہ حکیم اجمل خاں دہلی سے تشریف لائے اور مولانا کو لے کر مسٹر برن چیف سیکریٹری یوپی گورنمنٹ سے ملے۔ مسٹر برن کا رویہ مولانا سے لطف و کرم کا نہ تھا، بلکہ مولانا کی نظموں پر تشویش اور گھبراہٹ کا تھا۔ حکیم اجمل خاں نے اپنے تعلقات کی بنا پر کوشش کی کہ صفائی ہو جائے مگر ان کو زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ مولانا کی طرف سے حکومت کو جو بدگمانی تھی اسی سے فروری ۱۹۱۴ء کی ابتدا ہوتی ہے۔ چناں چہ کان پور کی مسجد کے حادثہ پر مولانا کی گرما گرم اور پرجوش نظموں (از کلیات، صفحہ ۸۰ تا ۸۷، طبع سوم ۱۹۴۰ء، دارالمصنفین اعظم گڑھ یوپی "کشتگان معرکہ۔

کان پور"، "علمائے زندانی"، "آپ ظالم نہیں زنہار پہ ہیں ہم مظلوم"، "کان پور میونسپلٹی کا خطاب"، "مسجد مچھلی بازار کان پور سے"، "شرائط صلح"، "خون کے چند قطرے"، "دنیا میں مسلمانوں کی تعداد کیوں نہیں بڑھتی"، "تقسیم عمل"، "پابہ زنجیران کان پور"، "نوحانہ"، "تفریق و تجزی"، "وحدت و کثرت"، "مسجد کان پور کا وفد شمشیر برطانیہ") سے گورنمنٹ کو مولانا کی طرف سے بدگمانی کو دور کرنے کے لیے مولانا مرحوم نے مولانا عبدالماجد دریابادی کو یکم فروری ۱۹۱۴ء (۱۹) کو ایک دستی رقعے کے ذریعے بلا بھیجا۔ مولانا نے مولانا عبدالماجد صاحب کو ہدایت کی کہ گورنمنٹ کو مولانا کی طرف سے ایک مفصل چٹھی لکھ دیں، جس میں یہ یقین دلایا جائے کہ مولانا شبلی انگریزی گورنمنٹ کے کبھی بدخواہ نہیں رہے اور مشرق و مغرب میں یگانگت بڑھانے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے اور ایک دوسرے کے متعلق جو غلط فہمیاں عرصہ دراز سے چلی آرہی تھیں وہ دور ہوں اور اس بات کی گواہ مولانا کی تصانیف ہیں۔ کان پور کے متعلق نظمیں ہنگامی جوش کا نتیجہ تھیں، جس میں سارے ہندوستان کے مسلمان شریک تھے۔ لیکن جو کچھ مولانا مرحوم نے کہا تھا اس سے برأت ظاہر کرنے کی کوشش نہیں کی، اس کا اقرار کیا اور اس اقرار پر قائم رہے (۲۰)۔

انھیں دنوں پروفیسر شیخ عبدالقادر کی کوشش سے سید سلیمان ندوی کا پونا کالج میں پروفیسر کی حیثیت سے تقرر ہو گیا تھا۔ مولانا شبلی پروفیسر مذکور سے بے حد خوش تھے اور سید صاحب کو ہدایت کر چکے تھے کہ پروفیسر کو عربی پڑھائیں۔ اپنی اس خواہش کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ پروفیسر صاحب کو عربی آجائے تو بڑی مسرت ہو۔ سید صاحب نے فردوسی کے مصرعہ "ہنر برآبد بدار توشہ بزی" کا مطلب پوچھا۔ اس کا مطلب مولانا نے لکھا کہ دعائیہ کلمات ہیں جو سلاطین کے سامنے عرض مدعا سے پہلے ادا کرتے تھے۔ شاہنامہ میں ہر موقعے پر یہی مصرعہ آتا ہے۔ الفاظ مفردہ کے معنی لغت میں دیکھنے کی ہدایت کی۔ مشعت کلہ کے متعلق لکھا کہ عنصری کا نہیں بلکہ منوچہری دامغانی کا لقب ہے۔ دولت مند ہونے کی وجہ سے یہ لقب ہو گیا تھا۔ اسی زمانے میں ندوے کا قصہ پیش تھا۔ مولانا کے خلاف طوفان اٹھا ہوا تھا۔ مولانا کے ہمدردوں کی طرف سے وکیل امرتسر میں کارروائیاں چھپا کرتی تھیں۔ اس کی اشاعت محدود ہونے کی وجہ سے اثر پذیر نہ ہوتی تھیں، اس لیے روزنامہ پیسہ اخبار لاہور اور دیگر اردو اخبارات اور انگریزی اخبارات، خصوصاً انڈین ٹیلی گراف اور لیڈر میں ان کارروائیوں کو چھپوانے کی ہدایت کی۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو خلوص اور نیک نیتی سے دونوں پارٹیوں کے اختلافات کو دور کرنا چاہتے تھے۔ انھوں

نے ارادہ کیا کہ اصلاحی کمیٹی قائم کی جائے ۔ اس کمیٹی کے قیام کے لیے نواب علی حسن خاں اور حکیم عبدالولی نے معززار کان کو خطوط لکھے اور بعض نے اس میں شرکت کے لیے آمادگی ظاہر کی ۔

گورنمنٹ کے ایجوکیشن انسپکٹر نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی ردی حالت کے متعلق حکومت میں پہلے ہی رپورٹ کر دی تھی ۔ مولانا کے استعفے کے بعد مولوی خلیل الرحمن سہارن پوری، جنھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے کلی اختیارات حاصل کر لیے تھے، وہ پٹیالہ سے کرنل عبدالمجید خاں کو لائے اور ان کے ذریعے انگریز افسروں سے ملے، تاکہ رپورٹ کی بنا پر حکومت کی مالی امداد بند نہ ہو جائے ۔ ساتھ ہی ساتھ ندوے کی عمارت پر بھی توجہ دی ۔ ندوے کی قدیم عمارت (۲۱) کی فروخت کا روپیہ موجود تھا، وہی نئی عمارت میں کام آرہا تھا ۔ سید صاحب نے فاسٹر کو غیر معتبر بتلایا تو مولانا نے وضاحت کی کہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں اس سے تو صرف کتبات لیے ہیں ۔ اسی درمیان رعد کے پریس (کان پور) میں سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چھپنے کا انتظام ہو گیا، چناں چہ مولانا نے کاپیاں چھپوانا شروع کر دیں ۔ انھیں دنوں سید صاحب کو مشورہ دیا کہ رسالے کے ایڈیٹر کی حیثیت سے سید صاحب کا نام چھپنا چاہیے ۔ سید صاحب کو یہ بھی مشورہ دیا کہ پبلک سے بھی تعلقات پیدا کریں ۔ چناں چہ انجمن اسلام سے رابطہ پیدا کریں ۔ مولانا اپنے شاگردوں کو نامور دیکھنا چاہتے تھے، جب ہی سید صاحب کو مشورے دیتے تھے اور پروفیسر عبدالقادر کے تعلقات کا انگریزی حلقہ تک محدود ہونا ان کے پیش نظر تھا ۔ مگر سید صاحب کے لیے وہ وسیع میدان دیکھ رہے تھے اور اس بات کی نشاندہی اور رہنمائی بڑی دور اندیشی کی بنا پر تھی ۔ سید صاحب سے مولانا کو بڑی امیدیں وابستہ تھیں کہ وہ قوم کا کام اور مولانا کا نام کرنے والے ثابت ہوں گے ۔ انھیں دنوں الہلال کو کوئی مضمون بھیجا تھا ۔ اس کی واپسی چاہتے تھے لیکن واپسی لاحاصل معلوم ہوئی ۔ اوقاف اسلامی کے متعلق تحریک شروع کر دی اور اس تحریک سے متعلق ایک کاپی سید صاحب کو بھی بھیجی ۔ اپریل ۱۹۱۴ء میں بمبئی جانے کے ارادے کا اظہار کیا (۲۲) ۔ مولانا نے ابن ہشام کے متعلق تحقیق سے لکھا کہ ابن ہشام جو واہی الحدیث ہے وہ ابن ہشام کلبی ہے اور صاحب سیرت عبدالمالک بن ہشام ثقہ راوی ہیں ۔ مولانا نے ۱۲۔ فروری ۱۹۱۴ء کو علی گڑھ جانے کے ارادے کا اظہار کیا (۲۳) اور ۱۶۔ فروری ۱۹۱۴ء کو ۲۴۔ فروری ۱۹۱۴ء سے پہلے علی گڑھ پہنچنے کا خیال ظاہر کیا ۔ اوقاف اسلامی کی تحریک شروع ہوئی اور گورنمنٹ نے یادداشت شائع کی اور فروری ۱۹۱۴ء میں کانفرنس بٹھانے کا اعلان کیا ۔ مولانا نے بھی اپنی جان لڑا دینے کا تہیہ کیا ۔

یہ وہ زمانہ ہے کہ مولانا دار المصنفین کا خاکہ اپنے مخالفین کے سامنے پیش کر چکے تھے اور وقتی طور پر سیرت کے دفتر اور اس کے کام کو دار المصنفین میں بدل دینا چاہتے تھے اور یہ عزم کر چکے تھے کہ دار المصنفین قائم کر کے رہیں گے اور اس کی عمارت کو بھی پورا کر کے رہیں گے اور اس وقت یہ بھی پیشن گوئی کر دی "شاید وہی میرا مدفن ہو (۲۴)" ۱۷۔ اور ۱۸۔ فروری ۱۹۱۴ء کی درمیانی شب میں مولانا کا صندوقچہ چوری ہو گیا، جس میں مولانا کے بہت ضروری کاغذات اور ۲۰۰ روپے کے نوٹ تھے۔ اسی زمانے میں سید صاحب نے سفارش کی تھی کہ مولوی افتخار عالم صاحب، مؤلف "حیات النذیر"، کو اجازت ہو کہ حیاتِ شبلی لکھیں۔ اس پر مولانا نے سید صاحب کو جواب دیا کہ "دنیا کے تمام کاموں سے فارغ ہو نا تو تمہیں لکھنا۔" اس زمانے میں مولانا صندوقچے کی چوری اور پولیس کی تحقیقات کی وجہ سے سخت پریشان رہے (۲۵)، لیکن اس کے باوجود علمی اور ادبی کام جاری رہے۔ ایک استفسار کے جواب میں ہمایوں کو اپنے بھائی کی آنکھیں نکلوانے کے واقعے کی گلبدن بیگم کے حوالہ سے تصدیق کی اور یہ بھی لکھا کہ گلبدن بیگم ہمایوں کی طرف دار اور گرویدہ تھی۔ مولانا بجائے علی گڑھ جانے کے الہ آباد چلے گئے۔ مولوی عبد السلام (مددگار سیرت) سے مولانا سیرت کے متعلق کچھ لکھوانا چاہتے تھے، اس لیے چند عنوانات لکھے کہ اس پر مولوی عبد السلام قلم اٹھائیں۔

۱۔ زبان کی تہذیب۔ غیر قابل اظہار چیزوں کو دوسری طرح سے ادا کرنا، مثلاً لامستم النساء اذا جاع احد منکم من الغائط۔ ۲۔ احکام توراۃ کے خلاف احکام، ۳۔ تاریخی ترتیبِ قرآن۔ سورتوں کی تعیین تو آسان ہے، اتقان میں بھی مذکور ہے، لیکن صحاح ستہ سے مستنبط کرنا چاہیے پھر مہما امکن، آیتوں کی ترتیب، ۴۔ مدنی و مکی سورتوں کی خصوصیاتِ امتیازی۔ ان دنوں مقدمہ۔ سرقہ کی مولانا کو بڑی فکر رہی۔ ایک شخص شبہ میں پکڑا گیا لیکن ثبوت نہیں ملا۔ مولانا کا یہ خیال تھا کہ جب ثبوت نہیں ملتا تو اس کو چھوڑ دیا جائے۔ دار المصنفین کے خاکے پر انگریزی میں مضمون لکھا ہوا رکھا تھا۔ اس کو جیفہ کی جلد سے بذریعہ ڈاک رجسٹرڈ منگوایا شیخ عبد اللہ وکیل علی گڑھ نے خط کے ذریعے اوقاف کی ممبری قبول کی (۲۶)۔ مولانا کی غذا آٹھ مہینے سے صرف ایک وقت رہ گئی تھی اور پھر مختصر سے مختصر۔ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم جلد اول تقریباً تیار ہو گئی، کاپی لکھوائی شروع کر دی۔ انھیں دنوں مولانا نے دار المصنفین کی خاطر لوگوں کے پاس جانے کا ارادہ کیا۔ مولانا نے دار المصنفین کو اپنا آخیر کام اور زمرہ مصنفین کی دائمی

خدمت قرار دیا(۲۷)۔ چوں کہ مولانا شبلی مولانا عبد الماجد دریا بادی کو کام میں لگائے رکھنا چاہتے تھے، اس لیے ان سے ان کی مصروفیات کے متعلق دریافت کیا اور چند انگریزی کتابوں کے متعلق بھی دریافت کیا، کیوں کہ سیرت کے سلسلے میں ضرورت تھی۔ ہنٹ، ویلسٹڈ اور جغرافیہ فاسٹر کی بھی ضرورت تھی۔ مولانا نے دریا بادی صاحب سے "دار المصنفین" کے عنوان کے تحت دار المصنفین کے خاکے کا انگریزی ترجمہ کروایا تھا، اس کو طلب کیا۔ سرقہ کے متعلق فکر تھی کہ داخل دفتر ہو گئی یا اب بھی زیر تحقیقات ہے۔ چوں کہ اس زمانے میں سیرت کو خوش نویس لکھ رہے تھے، اس لیے مولانا دریا بادی کے ذریعے مولوی مسعود علی ندوی سے دریافت کیا کہ جب لکھنو میں کمرہ بند ہے تو خوش نویس کیا کرتے ہیں اور کمرے کی حفاظت کا کیا بندوبست ہے، جب کہ ڈنکے کی چوٹ چوریاں ہوتی ہوں۔ مولوی ابو الکلام کی الہ آباد آمد کی اطلاع دی اور یہ بھی لکھا کہ وہ یہ کہہ کر الہ آباد سے روانہ ہوئے ہیں کہ "ندوہ دیکھنے جاتا ہوں" (۲۸)۔

مولوی عبد السلام اور مولوی مسعود علی ندوی کو امین آباد لکھنو کے پتے پر الہ آباد سے خطوط بھیجے، مگر وہ نہیں پہنچے، جس کا مولانا کو افسوس ہوا۔ وہ مولوی عبد السلام سے سیرت کے متعلق قرآنی مضامین لکھوانا چاہتے تھے۔ مولوی عبد السلام مضامین قرآنی کے عنوانات کا تعین چاہتے تھے۔ مولانا اس بات پر ناراض ہوئے اور لکھا کہ اگر خود کوئی کتاب قرآن مجید پر لکھتے تو کیوں کر لکھتے، مولانا ہی کے کاموں میں لتنے بھولے بن گئے۔

۱۹۱۴ء کا یہ چھوٹا سا مہینہ مولانا کی بڑھی ہوئی اور الجھنوں کی نذر ہو گیا۔ (۲۹)

مارچ ۱۹۱۴ء

۳۔ مارچ ۱۹۱۴ء کو مولانا الہ آباد میں تھے اور دار المصنفین کے قیام کے لیے جو پروگرام بنا رہے تھے وہ بالکل طے کر لیا تھا اور یہاں تک تیار تھے کہ اگر کہیں سے بندوبست نہ ہوا تو ابتدائی عمارت کا خرچ، جس کا تخمینہ پانچ ہزار روپیہ تھا، اس کو اپنی جیب سے ادا کریں اور چھوٹے چھوٹے بنگلے احباب سے بنوائیں۔ ابھی جگہ کا تعین نہیں کر سکے تھے، اس لیے مختلف احباب سے مشورہ کر رہے تھے کہ دار المصنفین کا قیام کہاں عمل میں لایا جائے۔ ابتدا میں تو مولانا نے یہی چاہا تھا کہ ندوۃ العلماء کے منتہی طلبہ کو ہی تصنیف و تالیف کی تربیت دی جائے اور اس قابل بنایا جائے کہ وہ مصنف بن سکیں، مگر ندوہ میں مولانا کی مخالفت نے اس خیال میں تذبذب پیدا کر دیا۔ لیکن

ابھی پورے طور پر مایوس نہیں ہوئے تھے اور وہ امیدیں جو ندوہ سے وابستہ کی تھیں ان کو بروے کار لانے کی ایک بار پھر کوشش کرنا چاہتے تھے اور اپنے اس خواب کی تعبیر کے خواب دیکھ رہے تھے ۔ باوجود اس کے کہ شدید مخالفت ہو چکی تھی اور اب بھی جاری تھی، اپنے خواب کو مولانا ندوہ کے پہلے جلسے منعقدہ ۱۸۹۴ء میں بیان کر چکے تھے، جو مضامین اربعہ (مطبوعہ) میں موجود ہے ۔ لہذا مولانا نے ندوہ کے تمام ارکان سے پوچھنے کا ارادہ کیا کہ دارالمصنفین کا قیام کیوں کر ممکن ہے ۔ یہ بھی جانتے تھے کہ کورا جواب مل جائے گا اس لیے پہلے ہی اس کا اظہار بھی کر دیا کہ اگر منظور نہ کیا تو پھر مولانا پر کوئی ذمہ داری عائد نہ ہوگی ۔

مولانا کے ذہن میں اس زمانے میں دارالمصنفین کے متعلق بڑی اچھی تجویزیں تھیں اور وہ ان کو عملی جامہ پہنانا چاہتے تھے، مگر ندوہ کی مخالفت ان کو ہمتی پڑ رہی تھی اور حوصلے پست کیے دیتی تھی ۔ ندوہ کو ندوے والے ایک خاص ڈھرے پر چلانا چاہتے تھے، جس سے مولانا کو اتفاق نہ تھا (۳۰) ۔

سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سلسلے میں بعض انگریزی کتابوں کے ترجمے کرانے کی ضرورت پڑا کرتی تھی اور مولانا عبدالماجد دریا بادی اس کام کو انجام دیا کرتے تھے ۔ جن کتابوں کے ترجمے کی ضرورت ہوتی تھی صرف انھیں کا ترجمہ کراتے تھے ۔ چناں چہ مولانا دریا بادی کو لکھا کہ کارلائل کو ہاتھ نہ لگائیں، اس لیے کہ اس کتاب کا ترجمہ عربی میں موجود ہے اور گبن کی ضرورت اس لیے محسوس نہ کی کہ سرسید مرحوم کے کتب خانے میں اس کا ترجمہ (قلمی) موجود تھا ۔ کچھ اور کتابیں تھیں جن پر مولانا نے نشان لگا دیے تھے کہ اگر وہ ترجمے کے قابل ہوں تو ان کا ترجمہ کر دیا جائے ۔ الہ آباد کا قیام مولانا کی صحت کے لیے سنبھالا تھا، جو ان کو پھر کبھی نصیب نہ ہوا ۔ دو وقت کھانا کھانے لگے تھے اور بہت صحیح ہو گئے تھے، اس لیے الہ آباد کے قیام میں توسیع کر دی ۔ اسی زمانے میں ارادہ کیا کہ اپنی نگرانی میں ایک خالص علمی رسالہ المعارف کے نام سے نکالا جائے اور ذمہ دار اڈیٹر مولوی عبدالسلام ندوی تجویز ہوئے ۔ مگر انھیں دنوں مولوی عبدالسلام کو الہلال کے اسٹاف میں جگہ مل گئی اور وہ کلکتہ کے لیے پر تولنے لگے ۔ مولانا کو کسی اور شخص کی تلاش ہوئی جو جوہر قابل ہو اور اس کو تربیت دے کر اس قابل بنا دیا جائے کہ قابل قبول ہو جائے، جس میں وہ مرضی کے مطابق کام چلا سکے ۔ تاریخی کتابوں کے ترجمے کرا چکے تھے اور اب چاہتے تھے کہ فلسفہ، مذہب پر کتابوں کا ترجمہ کرایا جائے ۔ مولوی عبدالسلام کے الہلال میں جانے کے ارادے سے

مولانا المعارف کے لیے متفکر ہوئے، کیوں کہ مولوی مسعود علی ندوی اس بار کو تنہا نہ اٹھا سکتے تھے اور چوں کہ مولانا اپنے تمام شاگردوں کی ترقی کے خواہاں تھے اس لیے روکنا بھی نہ چاہتے تھے (۳۱) ۔ چناں چہ سیرت کے کام کے سلسلے میں اکرام اللہ خاں کو لینا چاہا، چھبیس روپے معاوضے کی پیش کش کی ۔ مولوی عبد السلام سے بھی دریافت کیا کہ اگر ان کی نظر میں کوئی تصنیفی استعداد رکھنے والا ہو تو اطلاع دیں، تاکہ اس کو تصنیفی کام کی مزید تربیت دے کر تیار کیا جائے ۔

مولانا کے مولوی ابو الکلام سے تعلقات اچھے تھے، اس کے باوجود مولانا الہلال میں اپنے مضمون نگار شاگردوں کو خصوصاً اور دیگر مضمون نگاروں کا نام نہ چھپنا عموماً پسند نہ کرتے تھے ۔ چناں چہ عبد السلام ندوی کو واضح طور پر ہدایت کی کہ وہ شرط کر لیں کہ وہ (عبد السلام) جو کچھ لکھیں گے اپنے نام سے لکھیں گے، ورنہ زندگی پر پردہ پڑ جائے گا اور آئندہ ترقیوں کے لیے مضر ہونا یقینی ہے ۔ اس طرح ان کا (عبد السلام کا) ایک مقام ہو گا اور الہلال میں جذب نہ ہو سکیں گے ۔

سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پہلی جلد نقل ہو رہی تھی کہ مولانا اسی درمیان میں الہ آباد چلے گئے تھے ۔ لہذا وہاں یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ کاتب کا حرج ہو رہا ہو گا ۔ لہذا مولوی عبد السلام کو ہدایت کی کہ کاتب کا پتا قاری عبد الولی کے ذریعہ معلوم کریں اور مسودہ صاف کرنے یا نقل کرنے کے لیے اجزا دے دیں، جو دفتی میں چھوڑ گئے تھے اور اس پر لکھا ہوا تھا" برائے کاپی" ان کو مستعدی سے کام کرنے کی بھی ہدایت کی، اس لیے دیر ہونے کی صورت میں ان کو (مولانا کو) بڑا ملال ہوتا ۔ (۳۲)

سیرت النبیؐ کے سلسلے میں مولانا کو بعض مضامین کی ضرورت پڑی تو مولانا دریا بادی کو عنوانات تحریر کر کے لکھا کہ ان پر مع اقتباسات وقتاً فوقتاً لکھیں تاکہ مولانا سیرت میں ان اقتباسات کو بعینہٖ درج کر سکیں ۔ عنوانات یہ تھے: وجودِ باری کے دلائل، مذہب کی تائید و تردید، نکاح، طلاق، وراثت کے اصول (عقلی و تمدنی حیثیت سے)، نیز ان چیزوں کی تاریخ، اثبات روح یا تردید (۳۳) ۔

مولانا شروانی نے مولانا کو دار المصنفین والی تجویز کے جواب میں حبیب گنج میں اس قیام کی تجویز کی تو مولانا نے اعظم گڑھ کو پیش کیا اور اپنے باغ اور دو بنگلوں کے وقف کا ارادہ ظاہر کیا ۔ مولانا باوجود کمزور اور پائے لنگ کے نچلا بیٹھنا نہ چاہتے تھے، زندگی کی تھوڑی مدت اور مختصر مہلت کو مصروفیت ہی میں ختم کر دینا چاہتے تھے، لہذا اوقافِ اسلامی کے لیے دورہ کرنے کا ارادہ تھا

اور اسی سلسلے میں حبیب گنج (ضلع علی گڑھ) جانے کا بھی ارادہ کیا۔ کچھ قبل ان کے کاغذات چوری ہو گئے تھے۔ اس چوری کو انھوں نے سازش کا نتیجہ قرار دیا۔ سیرت النبی کا مسودہ چوں کہ دوسری جگہ رکھا تھا، اس لیے وہ محفوظ رہا۔ مولانا کی مخالفت میں ندوہ کے منتظمین نے قاعدہ بنا دیا کہ طلبہ ندوہ سے باہر کسی سے نہ پڑھیں اور خیال یہ تھا کہ مولانا سے طلبہ پڑھنے جاتے ہیں۔ وہ اس قاعدے کے تحت مولانا سے نہ پڑھ سکیں گے۔ اس طرح ان کے اثرات طلبہ پر کم سے کم تر ہو جائیں گے۔ ان دنوں سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چھپنے کا مرحلہ در پیش تھا۔ انھوں نے الہلال کلکتہ میں نمونے کے طور پر چار صفحات چھپوائے۔ چھپائی تو بہت عمدہ ہوئی مگر ٹائپ کو کسی نے بھی پسند نہ کیا۔ عرب کے قدیم خطوط (حمیری اور نابتی)، جو دو ہزار سال پرانے تھے اور کھنڈروں میں ملے تھے، ان کو سیرت میں شامل کرنے کا ارادہ تھا۔ (۳۴)

مولانا کی ایک آنکھ کی بینائی تو جاتی رہی تھی، لہٰذا اب وہ آنکھ بالکل پختہ ہو گئی تھی۔ مگر آپریشن نہ کرا سکے، اس لیے ارادہ کیا کہ اگر آئندہ سال زندہ رہے (گویا آئندہ سال زندہ رہنے کی امید نہ تھی) تو آپریشن ہو گا۔

مولانا گرمی کی شدت سے بہت پریشان ہوتے تھے، اس لیے ارادہ کیا کہ مئی میں بمبئی چلے جائیں۔ اگرچہ ۱۹۱۳ء میں اپریل ہی میں چلے گئے تھے۔ کاغذات اور نوٹوں کی چوری کے سلسلے میں نہ پتا چلا اور نہ پولیس نے پتا لگایا۔ دار العلوم میں بدنظمی برقرار رہی۔ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا حصہ مکمل نہ ہو سکا، اس کے باوجود چاہتے تھے کہ جو کچھ ہو گیا اسی کو جلد مطبع بھیج دیتے (۳۵)۔ اسی زمانے میں سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے انگریزی ترجمہ کی تجویز زیر غور تھی اور اس کا بندوبست بھوپال میں ہو رہا تھا، مگر آخری طور پر کوئی بات طے نہیں ہو سکی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ آخری طور پر کوئی بات طے ہو جائے۔ یعنی بھوپال کی سرپرستی میں انگریزی ترجمہ ہو سکے گا یا نہیں، ورنہ پھر دوسری طرف نگاہ دوڑائی جائے، کیوں کہ نواب ڈھاکہ بھی سعادت کی خاطر شرکت چاہتے تھے اور انگریزی ترجمے کو بخوشی قبول کر لیتے اور حیدر آباد (دکن) سے نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی نے بھی اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔

۱۲۔ مارچ ۱۹۱۴ء کو سیرت کا اردو حصہ مطبع بھیجنے والے تھے اور الٰہ آباد سے لکھنو جانے کا ارادہ کر رہے تھے (۳۶)۔ مولانا کو احباب اور شاگردوں سے علمی، ادبی اور تحقیقاتی کام لینے میں ان کی تربیت پیش نظر رہتی تھی۔ چناں چہ مولانا دریابادی نے جب کچھ اجزا لکھ کر بھیجے تو ان کو لکھا کہ

دو ڈھائی گھنٹے روزانہ (۳۷) سے زیادہ کام نہ کریں اور کتابوں کا دیکھنا اور مہیا کرنا بھی ان گھنٹوں میں رکھیں۔ اتنا باقاعدہ وقت اس کام کے لیے مناسب سمجھتے تھے۔ اس سلسلے میں مولانا شبلی کا سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط پڑھنے کے قابل ہے جس میں سید صاحب کی ہمت افزائی بھی کی ہے اور نکتہ چینی بھی۔ چناں چہ لکھتے ہیں:

"دونوں پرچوں میں تمہارا مضمون بہت اچھا نکلا (۳۸)۔ اب تم کو تصنیفی سلیقہ آچلا، البتہ عبارت کی ابھی تک کمزوری باقی ہے، وہ بھی جاتی رہے گی" (۳۹)۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کو اپنے شاگردوں کی تربیت کا کتنا خیال تھا۔ ایک اور شاگرد مولوی عبدالسلام ندوی مرحوم کو اس طرح لکھتے ہیں:

"اور جو مصرعہ تم نے نقل کیا اس کو تو میں اپنے حق میں ازالہ، حیثیت عرفی سمجھتا ہوں۔ آئندہ احتیاط رکھو کہ ایسے مبتذل اور عامیانہ فقرے درج نہ ہونے پائیں" (۴۰)۔

مولانا دریابادی نے مولانا شبلی مرحوم کے الکلام پر اور اس کے ضمن میں مسلمانوں کے مذہب پر رسالہ الناظر لکھنو کے مارچ، اپریل، جون، اگست، اکتوبر ۱۹۱۰ء کے شماروں میں "ایک طالبِ علم کے" نام سے کڑی تنقید کی تھی (مولانا دریابادی کا وہ الحادی دور تھا)۔ مولانا شبلی مرحوم کو مولانا دریابادی کے متعلق اس وقت شبہ تک نہ ہوا تھا، بلکہ مولانا کا خیال بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم (۴۱) کی طرف گیا تھا۔ چناں چہ مسٹر مہدی حسن کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"الناظر کا مضمون ------ کا ہے، جو کالج کے بی۔ اے اور میرے شاگرد ہیں، ان کی مدت سے مجھ پر عنایت ہے، تاہم شاگردی کا اتنا پاس ہے کہ جب کچھ لکھتے ہیں تو نام بدل دیتے ہیں۔ پہلے نقاد تھے اب "طالبِ علم" بن گئے (۴۲)۔

مولانا دریابادی کے متعلق شبہ نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے (۴۳) میں بھی جب وہ مولانا شبلی کے پاس جاتے تو اسی ادب و تہذیب کو ملحوظ رکھتے جس کی چھوٹوں سے امید کی جاتی تھی۔ لیکن جب راز فاش ہوا اور مولانا شبلی کو معلوم ہوا تب بھی مولانا نے ناگواری کا اظہار بالکل نہ کیا۔ بہرحال ۱۴۔ مارچ ۱۹۱۴ء تک مولانا شبلی کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ "ایک طالبِ علم" کون تھا،

اس لیے مولانا دریابادی سے سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق خواہش کی کہ مذہب یا الحاد پر ویسی تحقیقات کی ضرورت نہیں جیسا کہ انھوں نے الکلام کے لیے کی تھی۔ ایک دو مستند کتابیں کافی ہیں۔ البتہ نکاح، وراثت، تعزیرات، تعدّد ازدواج کی تاریخ اور ان کے جدید اصول کے متعلق مواد اکٹھا کرنا ضروری تھا۔

مولانا کو انساب سمعانی کی ضرورت پڑی، اس لیے مولانا ناصر حسین کے بھائی مولوی ذاکر حسین کے یہاں سے منگوانے کو لکھا جو مستعار لے گئے تھے۔ مولوی عبدالسلام ندوی نے احکام کی تاریخ کا ذخیرہ جمع کیا تھا۔ وہ نواب علی حسن خاں کے یہاں رکھا تھا۔ اس کو اور اخلاق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذخیرہ دونوں رجسٹری سے الہ آباد طلب کیے (۴۴)۔ انہیں دنوں مولوی عبدالباری ندوی نے سنا کہ مولانا کشمیر جانے والے ہیں۔ مولانا نے ان خبروں کی تردید کی اور لکھا کہ کشمیر کے سفر کے قابل کہاں۔ از ضعف بہرجا کہ نشستیم وطن شد (۴۵)۔

اپریل ۱۹۱۴ء

مولانا نے ندوہ کے پہلے جلسے ۱۸۹۴ء سے شرکت شروع کی تھی اور دارالعلوم کے قیام کی تجویز پیش کرنے میں پیش پیش تھے۔ مگر مولانا کا مجوزہ دارالعلوم قدیم و جدید علوم کی درس گاہ تھی اور اس کے لیے نصاب کی تبدیلی کی ضرورت تھی۔ مولانا کی مدلل تقریروں سے متاثر ہو کر جلسے میں نصاب کی تبدیلی بھی منظور ہو گئی تھی، مگر اس کا نفاذ عملی طور پر نہ ہو سکا۔ مولانا نے اس کے لیے اپنی معتمدی کے زمانے میں بڑی کوشش کی، بلکہ سختی کی، مگر ان کی ایک نہ سنی گئی۔ اس کی کئی وجہیں تھیں: (۱) اساتذہ جدید علوم سے ناواقف تھے۔ جب خود ناواقف تھے تو طلبہ کو کیا پڑھاتے، (۲) مولانا انگریزی کو داخل نصاب کرنا چاہتے تھے اور ندوہ والے انگریزی کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتے تھے، (۳) ندوہ والے مولانا کو علی گڑھ کالج کا نمائندہ سمجھتے تھے، اس لیے مولانا سے ان کو نیچریت کی بو آتی تھی، (۴) مولانا (۴۶) میں فرائض کے اوقات کی پابندی نہ رہی تھی، یعنی اگر لوگ بیٹھے ہیں، علمی گفتگو چل رہی ہے یا شعر و شاعری ہو رہی ہے اور نماز کا وقت ہو گیا تو وہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اس کا سبب جو کچھ بھی ہو، خواہ مولانا کو بواسیر کی وجہ سے طہارت وغیرہ میں دشواری ہوتی ہو اور اس کی وجہ سے پابندی نہ کر سکتے ہوں، جیسے کہ سر سید سلسل البول کی وجہ سے نماز باجماعت سے معذور ہو گئے تھے۔ ان اسباب کی وجہ سے نصاب کی

تبدیلی اور اصلاحات میں ان کو کامیابی نہیں ہو رہی تھی، پھر بھی ان کے آگے کسی کا چراغ نہ جلتا تھا اس لیے کہ مولانا اپنی مدلل تقریر و تحریر سے غیروں کو اپنا ہمنوا بنالیا کرتے تھے۔ اس لیے سازش کر کے مولانا کے خلاف سیاسی چالبازی سے کام لیا گیا اور پروپیگنڈا کر کے بدامنی پھیلائی جاتی رہی اور دار العلوم کے معاملات میں بے جا دخل اندازی اور آئین کی خلاف ورزی کی جاتی رہی۔ جب مولانا نے اصلاح کی کوئی صورت نہ دیکھی تو استعفیٰ (۴۷) دے دیا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، مولانا کانٹا تھے، نکل گئے۔ اب من مانی کرنے کا موقع ملا، مگر من مانی کرنے میں بھی دشواری تھی، اس لیے کہ مولانا کا طلبہ اور اساتذہ پر بڑا اثر تھا۔ اس لیے طلبہ اور اساتذہ پر پابندیاں عائد کی گئیں، یہاں تک کہ مولانا اور مولانا کے متعلقین کے خطوط کو سنسر کیا گیا۔ اتفاق کی بات کہ مولوی عبد السلام ندوی نے مولوی مسعود علی ندوی کو ایک خط لکھ مارا، جو درج ذیل ہے:

بصیغہ راز: نقل خط مولوی عبد السلام بنام مولوی مسعود علی ندوی، متعلم درجہ تکمیل دار العلوم

"محبی تسلیم! اب خاموشی کا وقت نہیں۔ بھیارہ (۴۸) ردولی (۴۹) بہنل وغیرہ میں جہاں جہاں آپ کا اثر ہو یا کسی ذریعے سے اثر پہنچ سکے اظہار افسوس اور موجودہ انتظام پر بے اطمینانی کے جلسے کرائیے۔ طغیانی، تمرد، سرکشی شور و غل کا وقت اب آیا ہے۔ امتحان سے فارغ ہو کر تمام بڑے بڑے طلبہ کو شور و غل، اسٹرائک اخباروں میں مضامین لکھنا چاہیے۔ انجمن المعین کے رجسٹر میں قدیم طلبہ کے جو نام درج ہیں ان کے نام خط جاری ہونا چاہیے۔ وہ اپنے اپنے شہروں میں اس قسم کے جلسے کریں اور ندوہ میں اظہار افسوس کے تار دیں۔ پہلے باورچی خانے کا دروازہ ہلایا تھا اب گورنمنٹ کا دروازہ ہلانا ہوگا۔ اتنا شور و غل کیجیے کہ گورنمنٹ کے کانوں تک پہنچ جائے۔ اس خط کی خبر کسی کو نہ ہو، یہ مولانا کا حکم ہے۔ جن طلبہ کو اپنا ہم آہنگ بنائیے ان پر یہ ظاہر کیجیے کہ خود آپ کی تحریک ہے۔"

دستخط عبد السلام، ۲۵۔ جولائی ۱۹۱۳ء، بمبئی۔ (۵۰)

اس دستاویزی ثبوت کا ہاتھ آنا تھا کہ ندوہ والے اچھل پڑے اور مولانا کے خلاف حربے کے طور پر اس کو استعمال کیا اور اس کو اخبارات میں بھی شائع کرا دیا۔ اس خط کی بنا پر مولوی عبد السلام ندوی کو ندوہ سے علیحدہ کر دیا گیا۔ جلسہ انتظامیہ منعقدہ ۷۔ دسمبر ۱۹۱۳ء، گولہ گنج لکھنو کی قرارداد اس طرح ہے:

"ناظم نے مولوی عبدالسلام ندوی کی درخواست رخصت کی پیش کی اور یہ طے ہوا کہ چوں کہ مولوی عبدالسلام نے اکثر مضامین اخباروں میں خلافِ ندوۃ العلماء شائع کیے کہ جن سے پبلک کو ایک قسم کی بدگمانی ندوۃ العلماء کے خلاف پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے اور ایسی بدگمانی پیدا ہو جانے سے ندوہ کو بہت بڑا ضرر پہنچ جانے کا خطرہ ہے، لہذا ایک خط ان کا جو مولوی مسعود علی کے نام، جو اخبارات میں بھی شائع ہو چکا ہے، وہ کافی ثبوت اس کا ہے کہ اگر مولوی عبدالسلام صاحب مدرس کی حیثیت سے ندوہ میں رکھے گئے تو اندرونی دشواریاں بڑھ جائیں گی اور ندوہ کو سخت نقصان پہنچے گا۔ لہذا باتفاق رائے یہ طے ہوا کہ مولوی صاحب کو واپس آنے کی اجازت دینا بالکل خلافِ مصلحت ہے۔ ان کو اطلاع دے دی جائے کہ آپ اپنے عہدے مدرسی سے برخواست کیے گئے۔" (۵۱)

دستخط عبدالحی

ان حالات کے تحت مولانا کے خلاف کیا کچھ طوفان نہ اٹھا ہوگا۔ الہلال بھی خم ٹھونک کر میدان میں آگیا۔ مولوی عبدالسلام ندوی اس کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں آگئے تھے۔ اس میں اسٹرائک کے جواز میں کئی نمبروں میں مضمون لکھا۔ اس مضمون کے جواب میں الہلال ہی میں دیوبند کے مولوی شبیر احمد (مدنی) نے ایک مضمون لکھا۔ غرض کہ ایک دوسرے کے خلاف مضامین کا تانتا بندھ گیا۔ آخر چند صلح پسند حضرات کی کوشش سے اصلاحی کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے سیکرٹری نواب حسن علی خان تھے اس کا جلسہ حکیم اجمل خاں کی کوشش سے دہلی میں ہوا۔

مولانا اپریل ۱۹۱۴ء میں الہ آباد سے دہلی آگئے تھے اور اصلاحی (۵۲) جلسے کے سلسلے میں موجود تھے۔ جلسے کے مصارف کا تخمینہ ایک ہزار تھا۔ کوئی صاحب فیاض القوانین کا ترجمہ اجرت دے کر کرانا چاہتے تھے۔ مولانا کو کاتب کی فکر تھی۔ چناں چہ تقی صاحب، جو مقبرہ گولہ گنج لکھنؤ میں رہتے تھے، ان سے نقل کرانے کا خیال ہوا۔ دہلی سے مولوی مسعود علی کو جلسے کے متعلق اطلاع دی اور لکھا، عبدالسلام کے اور میرے خطوط غلط یا صحیح پڑھے گئے پھر کیوں کر ممکن ہے کہ وہ درج کارروائی نہ ہوں اور اس سے یہ لوگ سازش کا کام نہ لیں۔ ان لوگوں نے اپنی تمام خرابیوں اور اسٹرائک (۵۳) کے سارے زور کو صرف سازش اور میری شرکت کے ادعا سے ٹھنڈا کر دینا چاہا

ہے اور البشیر (۵۴) وغیرہ بھی اثر ملک میں پھیلادیں گے (۵۵)۔ انھیں دنوں مولوی مسعود علی نے دار العلوم ندوۃ العلماء کے مقابلے پر ایک مدرسہ کھول لیا تھا اور ان طلبہ کو داخل کیا تھا جو دار العلوم سے خارج کر دیے گئے تھے یا اسٹرائک کی وجہ سے جن کا حرج ہو رہا تھا۔ مولانا کو فکر ہوئی کہ ایسا مدرسہ کب تک چل سکے گا۔ مخالفین دار العلوم کے لیے دیوبند سے طلبہ بلوائیں گے اور شہر سے وظیفے کے لالچ میں طلبہ مل جائیں گے۔ اس مدرسے کی ماہانہ مالی اعانت کے لیے مولانا آمادہ ہوئے۔ مولوی عبد السلام کے متعلق ان کی رائے دریافت کی کہ وہ الہلال میں کلکتہ جانا چاہتے ہیں یا لکھنو میں رہنا چاہتے ہیں۔ اگر لکھنو رہتے تو ان سے تدریس ادب کا بھی کام لیا جاتا اور اگر وہ کلکتہ ہی کا ارادہ کر چکے تھے تو پھر کسی ایسے شخص کی تجویز جو سیرت کے کام کے ساتھ ساتھ درس کے بھی کام آئے اور اس کام کے لیے ماسٹر دین محمد زیادہ موزوں نظر آئے اور لکھنو میں ان سے زیادہ لائق اور ارزاں کوئی اور نہ تھا (۵۶)۔ مولوی عبد السلام کو مولوی مسعود علی کے ذریعہ ہدایت کی کہ مولانا کی ذاتی کتابوں کی فہرست بنائیں اور قرآن مجید کو ایک طرف سے پڑھیں اور بلاغت، مسائل، عقائد و کلام، مسائل حکمیہ و تمدن، اخلاق سے متعلق جو آیتیں ہوں ان کو علیحدہ کاغذ پر ہر ایک عنوان کے تحت لکھ لیں اور قرآن مجید کے اصطلاحی الفاظ مثلاً صلواۃ، زکواۃ، منافق، مومن، رکوع، سجود کو بھی اکٹھا کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ زبان میں قرآن مجید نے کتنے اصطلاحی الفاظ کا اضافہ کیا۔ مولوی اکرام اللہ خاں (۵۷) نے مولانا کی کتابوں کے سلسلے میں ایک یادداشت مرتب کی تھی، جس میں مولانا کی کتابیں مستعار لینے والوں کے نام تھے۔ اس کی مدد سے مولانا اپنی کتابوں کی واپسی چاہتے تھے۔ انگریزی کتابوں میں مسٹر بنٹ کی ایک کتاب تھی، اس کو مولانا دریابادی (۵۸) کے ذریعے اپنے پاس منگوائی (۵۹)۔

مولانا اسٹرائک کے مخالف تھے، مگر مخالفت کے باوجود اسٹرائک ہوئی اور اس کی ذمہ داری مولانا پر ڈالی گئی۔ انھیں دنوں مجلس انتظامیہ ندوۃ العلماء کا ارادہ تھا کہ اپنی رپورٹ شائع کرے۔ اس میں بڑے بڑے لوگ تھے، ان کے مقابلے میں بچوں کی کیا وقعت تھی۔ اس پر مولانا کو تردد ہوا۔ مولانا کے خلاف چھ سال سے ارکان میں برہمی پیدا کرنے کی سازش اور کوشش ہو رہی تھی۔ انھوں نے اس سازش اور کوشش کے متعلق اظہار خیال کیا کہ حقیقت میں تو یہ اسٹرائک تھی، حالاں کہ طلبہ کی اسٹرائک کو اتنی اہمیت دی گئی۔ مولانا کو غریب طلبہ کی فکر لگی ہوئی تھی کہ کیوں کر بسر کرتے ہوں گے اور کب تک بسر کریں گے اور جس مکان میں مدرسہ ہو گا یا وہ لوگ

مقیم ہوں گے، ندوہ والے اس کو کیوں نہ خالی کرائیں گے (۶۰) ۔ مولانا دہلی میں اپنی صحت کے خیال سے بھی مقیم تھے ۔ دہلی کا جلسہ، عام لکھنو کی اصلاحی کمیٹی کی ایک شاخ تھا ۔ اسی وجہ سے صرف سیکرٹری کے نام سے تار بھیجا گیا ۔ حکیم اجمل خاں اس جلسے کے روح رواں تھے، مگر ان کی بے حد مصروفیت پر رشک کیا اور ان کے ایک دن کے کام کو ایک مہینے کے کام پر بھاری بتلایا ۔ جلسے کی مخالفت زوروں پر تھی اور اخبارات کو بھی ہمنوا بنایا جارہا تھا ۔ یہ بھی خیال کیا جارہا تھا کہ لکھنو سے ایک مخالف پارٹی آئے گی اور رخنے ڈالے گی ۔ اس لیے نواب علی حسن کو مع پارٹی کے آنے کی ضرورت تھی تاکہ تصفیے کی راہ آسان ہو (۶۱) ۔ اسی زمانے میں مولوی عبدالسلام کے مضامین اسٹرائک کی موافقت اور ندوہ کے جدید انتظام (خصوصاً جدید ناظم مولوی خلیل الرحمن سہارن پوری) کی مخالفت میں نکل رہے تھے ۔ مولانا نے ان کو منع کیا، ممکن ہے سختی سے روکا ہو، اس پر وہ ناراض ہوگئے ۔ چناں چہ مولانا نے معذرت کرتے ہوئے لکھا کہ البشیر وغیرہ کا اثر نہیں پڑ سکتا اور مولوی عبدالسلام کے متعلق ہمدرد نے ایک حرف بھی نہیں لکھا ۔ بہر حال مولانا کی اس روک ٹوک سے غرض یہ تھی کہ مولوی عبدالسلام اپنے اصل کام میں لگے رہیں اور اعتراضات کے جوابات دینے میں وقت ضائع نہ کریں ۔ مولانا خود بھی کسی اعتراض کا جواب دینا پسند نہ کرتے تھے اور احباب اور شاگردوں کو بھی روکتے تھے اور فرماتے تھے کہ جواب دینے میں جو وقت لگایا جاتا ہے اسی وقت میں ایک مضمون لکھا جا سکتا ہے ۔ مولوی عبدالسلام نے کہیں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ مولانا اپنے ہوا خواہوں کی مبالغہ آمیز سفارش کرتے ہیں (۶۲) ۔ مولانا جواب میں لکھتے ہیں کہ عبدالسلام سے بڑھ کر ہوا خواہ کون ہو گا، جنھوں نے باوجود منع کرنے کے سلسلہ، مضامین نہ چھوڑا ۔ مولوی ابوالکلام، مولوی عبدالسلام کو الہلال کے لیے زور دے کر طلب کر رہے تھے ۔ مولانا نے لکھا کہ الہلال میں جاؤ مگر ناراض ہو کر نہیں، اس لیے کہ "تم میری (۶۳) وجہ سے یا میں تمہاری وجہ سے بدنام ہو چکے، پھر اخیر میں ناچاقی ۔ یہ کس قدر افسوس کی بات ہے" (۶۴) ۔

دہلی کی مقامی کمیٹی ۲۹ ۔ اپریل ۱۹۱۴ء کو جلسے کے انتظام میں مصروف تھی ۔ باہر سے لوگوں کی آمد تھی ۔ بڑے جلسے (جس کے انتظامات ہو رہے تھے) سے قبل مختلف جلسے معاملات طے کرنے کے لیے ہوئے، مگر مولانا ان جلسوں میں شرکت نہ کر سکے، لیکن ان میں جو امور طے ہوئے ان سے مولانا مطمئن تھے ۔ ساتھ ساتھ یہ بھی اندیشہ تھا کہ ان طے شدہ امور پر مخالفین قائم بھی رہتے ہیں یا نہیں ۔ ۱۰ ۔ مئی کو ہونے والے جلسے کے متعلق خصوصیت سے بحث ہوئی ۔ بہر حال دو

ایک دن میں آخری نتائج کی توقع تھی اور یہ بھی طے تھا کہ کوئی کام اصلاحی کمیٹی کے بغیر طے نہ ہوگا۔ مولانا گرمی بے حد محسوس کر رہے تھے، اس لیے جلد بمبئی جانا چاہتے تھے (۶۵)۔ مگر مئی ۱۹۱۴ء سے قبل نہ جا سکے۔

مئی ۱۹۱۴ء

مولانا شبلی کا قیام اپریل ۱۹۱۴ء سے دہلی میں تھا۔ صحت کی بحالی کے لیے آئے تھے مگر حکیم اجمل خاں کی کوشش سے دار العلوم ندوۃ العلماء سے متعلق اصلاحی کمیٹی کے جلسے ہونے لگے، اس لیے مولانا ٹھہر گئے۔ ایک طرف مولوی خلیل الرحمن سہارن پوری جدید ناظم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو اور موصوف کے ساتھی ہیں، دوسری طرف مولانا شبلی اور ان کے ہمنوا حکیم صاحب کی کوشش ہے کہ دونوں جماعتوں میں اتحاد و اتفاق ہو جائے اور دینی اور قومی مدرسے کو نقصان نہ پہنچے اور کوئی ایسی صورت ہو کہ طلبہ کی شکایات بھی دور ہو جائیں، اس لیے کہ اسٹرائک بے وجہ تو نہیں کی گئی۔ سید سلیمان ندوی نے مولانا کو کچھ شرطیں لکھ کر بھیجی تھیں کہ ان کے تحت اصلاحی کمیٹی لکھنو میں گفتگو ہو رہی تھی۔ اس کو بھی مخالف پارٹی نامنظور کر رہی تھی۔ اس لیے مولانا نے سید صاحب کو ہدایت کی کہ کمیشن غیر معلوم الاسماء والی شرط ہی کو تسلیم کر لیا جائے، کیوں کہ بغیر اس کے چارہ نہیں یا کوئی اور بات ذہن میں آئے تو مولانا کو لکھی جائے۔ یہ بھی ہدایت کی کہ مولوی مسعود علی (۶۶) سے بھی مشورہ کر لیا جائے کہ ان کی کیا رائے ہے۔ مولانا نے سید صاحب کو یہ بھی مشورہ دیا کہ نواب علی حسن یا حکیم عبد الولی مخالف پارٹی سے بحیثیت سیکرٹری اصلاحی کمیٹی ملنا چاہیے۔ ممکن ہے کوئی بات طے ہو جائے۔ علی گڑھ والوں نے بھی موقع سے فائدہ اٹھایا اور مولانا کی مخالفت پر کمر باندھی۔ مولانا کی مخالفت (۶۷) کی وجہ سے وہ ندوہ کے بھی خلاف تھے البشیر وغیرہ نے ندوہ کی حمایت کے پردہ میں اصلاح کی مخالفت شروع کر دی اور مولانا سے بدلہ لینے کے لیے بہتان اور افترا سے کام لینا شروع کیا۔ پیسہ اخبار لاہور وغیرہ نواب اسحاق خاں کے زیر اثر تھا۔ ہمدرد دہلی ایک ہمدرد تھا اس پر اندرونی دباؤ ڈالا گیا۔ غرض کہ مخالفت کے بڑے بڑے سامان تھے، مگر حکیم اجمل خاں کی ایسی زبردست شخصیت تھی کہ دہلی میں جلسہ قرار پایا، پھر بھی کوشش یہی تھی کہ جلسہ ناکام ہو جائے (۶۸)۔

آخر اصلاحی کمیٹی (۶۹) کی مجلس شوری منعقد ہوئی۔ اس میں مسٹر محمد علی (مولانا محمد علی)

نے بڑی اچھی تجویز پیش کی کہ یہ کمیٹی پچھلے واقعات کی تنقید نہ کرے بلکہ اس چیز کو پیش نظر رکھا جائے کہ اب ایسے قاعدے بنائے جائیں اور عام لوگوں کی مداخلت کو ان قاعدوں کے تحت اتنا مضبوط کیا جائے کہ کوئی بھی من مانی نہ کر سکے۔ چناں چہ ۲۴۔ مئی ۱۹۱۴ء کو ایک جلسہ بلانا طے ہوا، جس میں تمام ارکان جمع ہو کر خاکہ اس طرح مرتب کریں کہ بار بار اجتماع کی ضرورت نہ پیش آئے دہلی کو جلسے کے لیے موزوں سمجھا گیا اور مولانا سے کہا گیا کہ وہ نواب علی حسن خاں (اصلاحی کمیٹی کے سیکرٹری) کو لکھیں کہ تمام ارکان کو اطلاع دے دیں اور جلسے کی اہمیت کو ظاہر کریں اور یہ بھی لکھیں کہ ان لوگوں کو بار بار سفر کی تکلیف نہیں دی جائے گی، لیکن اس مرتبہ آنا ضروری ہے چناں چہ مولانا نے نواب علی حسن خاں کو لکھا اور مندرجہ ذیل ارکان کے نام بھی لکھے: مسٹر محمد علی، پیرزادہ مولوی محمد حسین، مولوی عبداللہ صاحب فتح پوری، مولوی ثناء اللہ صاحب امرتسری، مولوی غلام الثقلین، نواب علی حسن خاں، حکیم عبدالولی اور مولوی نظام الدین صاحب۔ مولانا نے ساتھ ساتھ یہ بھی ہدایت کی کہ جلد خطوط لکھے جائیں تاکہ لوگ ۲۴۔ مئی ۱۹۱۴ء کے جلسے میں شریک ہو سکیں اور نواب علی حسن خاں پر زور دیا کہ وہ ضرور آئیں۔ مولانا کو اس کارروائی اور جلسے کی شرکت کے لیے روک لیا گیا تھا، ورنہ وہ گرمی سے بے حد پریشان تھے اور جلد بمبئی جانا چاہتے تھے۔

مولانا نے نواب علی حسن خاں صاحب کو ہدایت کی کہ ان کی مقامی کمیٹی نقائص کی تحقیقات کر کے اس کو شائع کر دے اور مرزا سمیع اللہ بیگ کی تعلیمی رپورٹ بھی قابل اشاعت قرار دی تاکہ اس رپورٹ کی روشنی میں خرابیاں دور کی جائیں اور قاعدوں میں ایسی تبدیلی کی جائے کہ پورے طور پر اس کی اصلاح ہو جائے۔ مولانا کو ان دنوں کچھ اور بھی ضروری کام تھے مگر وہ پیارے صاحب سے متعلق تھے۔ لہٰذا نواب صاحب کو الگ لکھ کر بھیجے تاکہ ان پر عمل درآمد کر دیا جائے (۷۰)۔

حکیم اجمل خاں صاحب مجلس شوریٰ کے بعد شملہ چلے گئے۔ طریقۂ کارروائی کا ۲۴۔ مئی کے جلسے میں تعین ہونے کا امکان تھا۔ یہ بھی طے ہونا تھا کہ دونوں کمیٹیوں میں کام کس طرح تقسیم ہو۔ مسٹر محمد علی (مولانا محمد علی) کی اس تجویز سے خوش ہوئے کہ پچھلے واقعات کی تنقید سے پرہیز کیا جائے، لیکن مولانا کی رائے میں موجودہ حالات سے بے خبری بھی مناسب نہیں۔ مولانا کا یہ خیال تھا کہ لکھنو کے ارکان کو صرف اصلاح کی ضرورت پر متوجہ کرنا ضروری

ہے اور جب نیک نیتی اور بے غرضی سے کام ہو گا تو اثر لازمی ہے۔ اڈیٹر مسلم گزٹ کو اپنانے کی ضرورت پر بھی زور دیا۔ مولانا کو اس پر تعجب ہوا کہ مسٹر محمد علی سے بھی مخالف پارٹی ناراض ہو گئی، حالاں کہ ڈاکٹر ناظر حسن وغیرہ نے بھی وہی کہا جو مسٹر محمد علی نے کہا تھا۔ نواب اسحاق خاں نے نظامت کے متعلق جلسہ، عام میں تسلیم کیا کہ ناقص اور بے ضابطہ تھی۔ مولانا کے خیال میں موجودہ تمام ارکان بے قاعدہ ہیں۔ اس لیے دوبارہ انتخاب اور نظامت کے بارے میں قطعی فیصلے کی ضرورت ہے۔ مخالفین کا ارادہ تھا کہ جلسہ، عام لکھنو میں ہو اور نظامت باقاعدہ بنائی جائے۔ اس کے متعلق مولانا نواب علی حسن خاں سے زبانی مشورہ کر کے کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتے تھے۔

مولانا کی رائے تھی کہ حکیم عبدالولی اور مولوی نظام الدین دہلی آئیں اور دہلی کی روداد نواب علی حسن خاں صاحب یا مولوی نظام الدین حسن صاحب کی طرف سے قلم بند کر کے بیگم صاحبہ بھوپال کے پاس بھیجی جائے اور یہ بھی اطلاع دی جائے کہ پہلا اجلاس ۲۴۔ مئی کو دہلی میں ہو گا اور ارکان فلاں فلاں ہیں۔ اور یہ بھی کہ اگر منتظمین نے اصلاحیں منظور کیں اور ان پر عمل کیا تو بعد کو اطلاع دی جائے۔ مولانا دہلی میں مخالفین کی اور دیگر حضرات کی کارروائیوں سے بھوپال کی سرکار کو اس لیے باخبر رکھنا چاہتے تھے کہ بیگم صاحبہ ندوہ کی امداد کیا کرتی تھیں اور ندوہ کی خرابی سے بددل ہو کر امداد بند کر دی تھی اور سیرت کے کام کے سلسلے میں بھی مولانا کو وہاں سے وظیفہ ملتا تھا۔ مولانا کے خلاف ندوہ والوں نے اتنا پروپیگنڈا کیا تھا اور اتنا مطعون کیا تھا کہ بیگم صاحبہ کا مولانا سے مشکوک ہونا اور سیرت کے سلسلے میں امداد بند کرنے کا امکان ہو سکتا تھا۔ اس طرح مولانا کے سیرت کے سلسلے میں سب کیے پر پانی پھر جاتا۔ سیرت کے سلسلے میں بھی غلط فہمی پھیلائی گئی، جس کا ذکر دوسرے مہینوں کی روداد میں آئے گا(۱)۔

جون ۱۹۱۴ء

مولانا گرمی کی شدت اور لو کی حدت سے اتنا تنگ تھے کہ جلد بمبئی پہنچنا چاہتے تھے مگر دہلی میں ندوۃ العلماء کے سلسلے میں اصلاحی جلسوں کی وجہ سے اور صحت کی بحالی کے خیال سے قیام کرنا پڑا۔ اصلاحی جلسوں کا نتیجہ نہ نکلتے دیکھ کر مولانا بمبئی چلے آئے (۲) اور اکبر بلڈنگ، بھائی کلہ میں قیام کیا۔ ندوہ والوں کی مخالفت جاری رہی۔

مولانا (۳) بھی آئینی کارروائیوں کے ذریعے اصلاح کے حامی تھے اور مقابلے پر ڈٹے

ہوئے تھے۔ مگر اس کو فوری اور معمولی خیال نہ کرتے تھے بلکہ ان کا خیال تھا کہ اگر اسٹرائک نہ ہوتی تب بھی اصلاحی اسکیم کی ضرورت تھی اور ندوے کی اصلاح، مسودہ دار العلوم، رپورٹ سہ مالہ، دار العلوم ندوہ کی ابتدائی رپورٹیں قیام سے چند سال تک مضامین اربعہ کی روشنی میں کرنا چاہتے تھے، جن میں صاف صاف دو مقصد نظر آتے تھے۔ ایک یہ کہ ہر فن کے اہل کمال پیدا کیے جائیں، جو درجہ تکمیل کے ذریعہ ممکن تھا۔ دوسرے جدید ضرورتوں سے باخبر علما کا پیدا کرنا، جس کے لیے انگریزی دانی اور جدید علوم کی تعلیم ضروری تھی۔ اگر ان دو مقاصد کی تکمیل نہیں ہوتی تھی تو پھر مولانا کے نزدیک ندوہ کی کیا ضرورت تھی اس لیے کہ صرف قدیم تعلیم کے لیے مدارس کافی تھے۔ ایک مقصد اور بھی تھا یعنی علماء کے آپس کے اختلافات کو دور کرنا اور مشترک مقاصد پر تمام فرقوں کو متحد اور متفق کرنا، مثلاً اشاعتِ اسلام وغیرہ۔ مولانا چاہتے تھے کہ مطبوعاتِ مذکورہ سیکریٹری اصلاحی کمیٹی (نواب علی حسن خاں) پڑھیں اور ان کے مطابق اصلاحی عمل کریں۔

اصلاحی اسکیم کا دوسرا مرحلہ مولانا کے خیال میں دستور العمل کی درستی تھی، یعنی ممبروں کا صحیح طریقہ انتخاب اور سب کمیٹی کا تقرر، جیسا کہ علی گڑھ کالج میں سنڈیکیٹ تھی۔ مولانا کا خیال تھا کہ یادداشت اور دستور العمل کی ایک ایک کاپی اہل الرائے حضرات کو بھیجی جائے اور ان سے درخواست کی جائے کہ وہ اصلاحی اسکیم کے متعلق اپنی اپنی رائے لکھیں۔ مولانا اصلاح کے سلسلے میں خود بھی مطبوعاتِ مذکورہ بالا کو ندوہ سے حاصل کرنا چاہتے تھے تاکہ اپنی رائے کا اظہار اس کی روشنی میں کریں۔ سیرت کے کام میں انتشار واقع ہونے کی وجہ سے مولانا استبدادی (بعض اساتذہ کا ندوہ سے نکالا جانا) اور سازشی کارروائیوں (مولانا، ان کے ساتھیوں اور اصلاحی اسکیم کے خلاف) کے متعلق کچھ سننا نہیں چاہتے تھے کیوں کہ بمبئی میں وہ بالکل سکون کی حالت میں تھے اور ذرا سا انتشار بھی سیرت میں خلل ڈال سکتا تھا۔

اب مخالفین نے یہ مشہور کرنا شروع کر دیا کہ مولانا نے جو نصاب مدرسۃ العلوم ندوۃ العلماء کے لیے مرتب کیا تھا وہ ملحدانہ تھا۔ یہ بڑی دلچسپ اور عجیب بات تھی، اس لیے کہ اگر نصاب ملحدانہ تھا تو نصاب کی کمیٹی نے کیسے آنکھیں بند کر کے پاس کر دیا تھا۔ اس نے اپنے فرض سے کیوں منہ موڑا۔ دوسرے یہ کہ مولانا کو استعفیٰ دیے ہوئے عرصہ (۴۷) ہو گیا تھا۔ استعفیٰ دینے کے بعد سے اب تک (جون ۱۹۱۴ء) ملحدانہ نصاب کے جاری رکھنے کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔ لیکن پروپیگنڈہ اور وہ بھی غلط پروپیگنڈہ کے وقت دیانت اور صداقت کا کون خیال

رکھتا۔ مولانا نے اس کا رد یہ سوچا کہ ندوہ سے مطبوعہ نصاب منگا کر زمیندار لاہور اور وکیل امرتسر کو بھیج دیا جائے اور عربی کتابوں کے نام شائع کر دے جائیں اور مخالفین سے پوچھا جائے کہ اس میں کون سی کتاب ملحدانہ ہے۔ مولانا مسعود علی ندوی کے متعلق بھی جاننا چاہتے تھے کہ وہ ان دنوں کہاں رہتے تھے۔ مولانا اپنے مسودات غالباً سیرت النبیؐ کے، ڈاک کے ذریعے لکھنو سے بمبئی طلب کر رہے تھے (۷۵)۔ ندوہ والوں کی یہ بھی کوششیں تھیں کہ کسی طرح مولانا کا وظیفہ بھوپال سے بند ہو جائے، اس لیے مولانا اور مولانا کی تصنیف سیرت النبیؐ کے متعلق بے سر و پا باتیں لکھتے اور کہتے رہیں۔ چناں چہ ایک مولوی صاحب (۷۶) نے جوش میں آکر سیرت کے (۷۷) مطبوعہ مقدمے پر ایک رسالے کی شکل میں اعتراضات شائع کیے اور دربار بھوپال میں بھیج دیے۔ مولوی محمد امین زبیری صاحب کی رائے تھی کہ ان اعتراضات کے جواب دیے جائیں، اس لیے کہ بیگم صاحبہ بھوپال بھی یہ محسوس کر رہی تھیں کہ مولانا کی یہ تصنیف اگر جمہور علماء کے خلاف ہوئی تو بھوپال کے دربار کی بھی بدنامی ہوگی کہ ایسے کی سرپرستی کی جس نے دین کو نقصان پہنچایا۔ گویا دین کو نقصان پہنچانے میں بیگم صاحبہ کا ہاتھ ہوا۔ مولانا ان اعتراضات کا جواب تو دے چکے تھے لیکن ان کو اپنے نام سے چھپوانے کے حق میں نہ تھے، کیوں کہ وہ ان الجھنوں سے دور ہی رہنا چاہتے تھے۔ لیکن کسی دوسرے کے نام سے چھپوانے میں حرج بھی نہیں سمجھتے تھے اور اس کو بھی رسالے کی شکل میں چھپوانے کے حق میں تھے یا الہلال میں بھجوانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ مولوی محمد امین زبیری ان کو بھوپال بلا رہے تھے۔ لیکن مولانا بارش سے قبل بمبئی سے جانے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے، پھر بھی اس پر تیار تھے کہ بہت ضرورت ہو تو ایک دو دن کے لیے بھوپال چلے جائیں (۷۸)۔

مولانا نے یہ بھی چاہا کہ ہندوستان کے مشہور عالم مولانا محمود حسنؒ (شیخ الہند) سیرت کے مسودے کو دیکھ کر اپنی رائے دیں۔ لیکن مولانا محمود حسن کے لتنے کان بھرے گئے کہ ان کو اتنی ہمت نہ ہوئی کہ وہ مسودے کو پڑھ کر اپنی رائے دے سکیں۔ مولانا عبید اللہ سندھی تیار ہو گئے تھے کہ وہ مسودے کو پڑھیں اور اپنی رائے دیں۔ لیکن مولانا شبلی کو بھی مولانا محمود حسن پر اعتماد تھا اور وہ جانتے تھے کہ مولانا موصوف کی رائے دیانت و صداقت پر مبنی ہو گی۔ لیکن مولانا محمود حسن کے تیار نہ ہونے پر مولانا نے مولانا سندھی کو ہی غنیمت جانا۔ وہ دربار بھوپال کی دار و گیر سے پریشان ہو گئے تھے اور ارادہ کر رہے تھے کہ بھوپال کی اعانت سے مستغنی ہو جائیں۔

انھیں دنوں علم الاخلاق پر سید کرامت حسین نے کتاب لکھی تھی۔ مولانا عبد الماجد دریا

بادی نے چاہا کہ مولانا شبلی کے مقدمے کے ساتھ وہ شائع ہو، مگر مولوی ابوالکلام ریویو کے لیے مولانا شبلی سے اس کو مانگ کر لے گئے۔ مولانا شبلی اصل (۷۹) میں یہ سمجھتے تھے کہ ریویو کے لیے کتاب آئی ہے، اس لیے مولوی ابوالکلام کو ریویو کے لیے دینے میں عذر نہ کیا، حالاں کہ وہ اس لیے آئی تھی کہ اس کے نئے ایڈیشن کے لیے مولانا مقدمہ لکھیں۔ مولانا دریابادی چاہتے تھے کہ مولانا شبلی اور مولانا حالی مقدمہ لکھیں یا پھر بغیر مقدمے کے شائع ہو۔ اسی زمانے میں مولانا دریابادی نے ایک کتاب (غالباً فلسفہ، جذبات) مولوی سید حسن بلگرامی کو بھیجی تھی اور خیال تھا کہ بلگرامی صاحب نے وہ پڑھی ہوگی اور فیلوشپ کے لیے میدان ہموار ہوگا۔ اس کے متعلق مولانا نے لکھا کہ مولوی صاحب موصوف نے مشاہیر مصنفین کے دو ہی ایک صفحے پڑھے ہوں گے (مصروفیت اور حیدرآباد کی سیاسی چپقلش کی بنا پر کس کو اتنی فرصت ہوتی تھی)۔ دوسری چیز یہ بھی تھی کہ مولانا دریابادی کا شہرت کی طرف ابھی پہلا قدم تھا اور نظام کے دربار میں اس وقت رسائی مشکل تھی جب تک عام شہرت نہ ہو اور اسی وقت لوگ سفارش بھی کرتے، ورنہ تامل کرتے تھے۔ مولانا نے تسلی کی خاطر اپنی مثال دی کہ خود ان کے لیے مولوی سید حسین بلگرامی صاحب نے سفارش کی تو نظام نے خوشی کا اظہار کیا کہ ایک قابل شخص کی سفارش کی گئی اور مولانا کی تمام تصانیف کو اپنے پاس رکھنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ فلسفے کے باب میں اپنی سفارش کو بے وقعت سمجھتے تھے لیکن مولوی عبدالحق کی تعریف پر کام بننے کا امکان ضرور تھا۔ مولانا دریابادی نے مذہب پر کچھ لکھ کر بھیجا تھا۔ اس کی رسید دیتے ہوئے لکھا کہ نولدیکی کے قرآن مجید کے مضمون کا ترجمہ باقی ہے، اس کو پورا کرنا چاہیے۔ کچھ اور عنوانات بھی مولانا نے لکھے تھے ان کو پورا کرنے کی یاد دہانی بھی کی مولویوں کا آخری تیر کفر کا فتویٰ ابھی مولانا کے خلاف باقی تھا، وہ بھی پورا ہو کر رہا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح نگار کے خلاف مخالفین نے کفر کے سرٹیفکیٹ بھوپال بھیجے۔ ندوہ کے سفیر، جن کا کام ندوہ کو خاص و عام میں متعارف کرانا تھا، مولانا کے کفر کی تشہیر میں لگ گئے۔ علی گڑھ (۸۰) کی وہ پارٹی جو مولانا کی شروع سے مخالف تھی اس کو بھی موقع ملا اور وہ بھی خم ٹھونک کر اکھاڑے میں اتر آئی۔ ادھر ایک مولانا جو جسمانی طور پر کمزور، ایک پیر سے معذور اور ہاتھ سیرت کے کام میں مصروف، کتنا دل دکھا ہوگا۔ ایسے میں کیا کچھ مخالفین کے خلاف کہنے کا خیال نہ آیا ہوگا، مگر لکھا تو صرف اتنا "زمانہ گو حقیقت شناس نہیں ہے تاہم سچ نقاب میں نہیں رہے گا" (۸۱)۔

مولانا کو اب فکر تھی کہ درجہ تکمیل (ندوہ کے طلبہ) کے آخری امتحان کے بعد بعض

قابل طلبہ کو اپنے ساتھ رکھ کر کسی ایک فن میں ماہر کر دیں اور جن میں تصنیف کا مادہ ہو ان کو تصنیف کے لیے تیار کریں۔ اس طرح مصنفین کی ایک جماعت تیار کریں۔ گویا دارالمصنفین دارالعلوم کے لیے انتظام اور کوشش کا آغاز کر رہے تھے۔ غیر مستطیع طلبہ کے مصارف کا بندوبست بھی پیش نظر تھا، اس لیے ایسے طلبہ کی (اگر ہوں اور پسند کریں) ایک فہرست چاہتے تھے تاکہ اسی مناسبت سے انتظام کریں (۸۲)۔

نولدیکی کے قرآن مجید کے متعلق مضمون مولانا دریابادی نے نامکمل چھوڑ دیا تھا۔ مولانا اس کو پورا کرنا چاہتے تھے۔ قرآن مجید کی تاریخی ترتیب پر ایک کتاب بھی، اس کا یا اس کے اقتباسات کا ترجمہ بھی مولانا دریابادی کرنا چاہتے تھے۔ مولانا کا بمبئی میں بھائی کلہ میں قیام کا اس وقت تک ارادہ تھا جب تک ایک جلد (سیرت النبیؐ) مکمل ہو کر نہ نکل جائے۔ گذشتہ مہینوں میں ندوہ کی مخالفت کی وجہ سے جو فضول وقت ضائع ہوا تھا اس پر متاسف تھے۔ چوں کہ سیرت کو مکمل کرنے کی جلدی تھی اس لیے مترجم کو ساتھ رکھنا چاہتے تھے، تاکہ زیادہ وقت ضائع نہ ہو۔ لیکن کوئی مترجم نہ مل رہا تھا، جو بمبئی میں قیام کرتا۔ اگر ملتا تھا تو مترجم کی حیثیت سے معیار پر پورا نہ اترتا تھا۔ ندوہ سے مولانا کو بڑی امیدیں وابستہ تھیں اور وہاں کی خرابی سے بے چین ہو جاتے تھے۔ جدید ناظم نے ندوہ کو جو بنانا چاہا اور مولانا کے خلاف ان کے ہمنوا نے جو طوفان اٹھایا اس سے مولانا ندوہ کے متعلق ناامید سے تھے۔ لیکن مولانا کو اس مخالفت میں بھی ندوہ کے لیے بہتری نظر آئی کہ مخالفین ندوہ کے کاموں میں سرگرم ہو گئے۔ لہٰذا امید ہو چلی کہ عمارت جو نامکمل پڑی تھی اس کے بننے کا شاید بندوبست ہو جائے۔ نصابِ تعلیم اگرچہ مولانا کی مرضی کے مطابق رائج نہ ہو سکا مگر مولانا نے یہ سوچ کر صبر کر لیا کہ زمانہ خود ہی درست کرے گا۔ وہ ندوہ میں دیوبند کے طرز کی تعلیم نہیں چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ندوہ سے ایسے علماء نکلیں جو حالاتِ حاضرہ سے کماحقہ واقف ہوں اور جدید علوم و فنون سے ناواقف نہ ہوں۔ لہٰذا فارغ التحصیل طلبہ مسائل حاضرہ کو دین کی روشنی میں دیکھ کر فیصلہ کر سکیں گے اور ان کا فیصلہ وقیع ہو گا، کیوں کہ دین کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کو دنیا کی تعلیم بھی ملی ہو گی۔ اس لیے مولانا نے اظہار خیال کیا کہ ندوہ دیوبند نہیں بن سکتا اور خود دیوبند کب تک دیوبند رہ سکتا ہے (۸۳)۔ حالات ایسے ہو رہے تھے کہ دیوبند بھی بدلتا جا رہا تھا اور وہاں انگریزی پڑھے لکھے طبقے سے دلچسپی پیدا ہونے لگی تھی۔ مولانا کا اشارہ بھی اسی طرف معلوم ہوتا ہے۔

مولانا نے ان دنوں پھر تاریخی نظموں کا سلسلہ شروع کر دیا تھا اور الہلال ان نظموں کی زینت تھا۔ مولانا دہلی سے ندوہ کے سلسلے میں بک بک جھک جھک سے جان چھڑا کر بمبئی آئے تھے اور یہاں ان کو بڑا سکون تھا اور خاموشی سے اپنا کام کر رہے تھے۔ (۸۴)

مولوی عبدالشکور صاحب فاروقی مدیر النجم نے سیرت پر جو اعتراضات کیے تھے وہ اور کفر کے فتوے بھی دربار بھوپال میں بھیج چکے تھے۔ اس پر دربار بھوپال سے سرکاری مراسلہ مولانا کو ملا مولانا نے اس کا جواب لکھا اور یہ چاہا کہ مستند عالم تجویز کیا جائے کہ مولانا لکھا ہوا مسودہ بھیج دیا کریں اور وہ تصدیق کرے تب مستند سمجھا جائے۔ مگر اس میں ایک دقت تھی کہ بمبئی میں کاتب نہیں مل رہا تھا اور لکھنؤ سے کوئی آنے کو تیار نہ تھا۔ مولانا نے اپنی شرافت کا ایک اور ثبوت دیا کہ دیباچے کو اعتراضات کی زد سے باہر کر دیا۔ اگرچہ اعتراضات میں مولانا کی جو عبارت نقل کی گئی تھی اس کے الفاظ تک بدل دیے گئے تھے اور بعض اعتراضات غلط تعبیر پر مبنی تھے۔ ان سب کے باوجود مولانا اب خود یہ چاہنے لگے تھے کہ کوئی عالم نظر ثانی کرے تاکہ ملک کے لوگ اعتماد کر سکیں ایسے موقع پر مولانا نے مولانا محمود حسن دیوبندی کی تعریف فرمائی اور اظہار اعتماد کیا کہ وہ چاہے مولانا کے متعلق اچھی رائے نہ رکھتے ہوں مگر اپنی رائے دیانت کے خلاف نہ دیں گے اور مولانا محمود حسن کو سیرت پر نظر ثانی کرنے کے لیے آمادہ کرنا ہو تو مولانا عبید اللہ سندھی کو ذریعہ بنانا چاہیے۔ مولانا نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ بمبئی سے اس وقت تک نہ جائیں گے جب تک کتاب کی تکمیل نہ ہو جائے، کیوں کہ دوسری جگہوں پر ملنے والے وقت ضائع کریں گے۔ انہیں دنوں مولوی حمید الدین فراہی کا دارالعلوم (شرقی یونیورسٹی) حیدرآباد (دکن) کے پرنسپل کی حیثیت سے تقرر ہو گیا تھا۔ مولانا اس سے بہت مسرور ہوئے اور امید ظاہر کی کہ مولوی صاحب سے یونیورسٹی کو بہت فائدہ پہنچے گا (۸۵)۔

مولانا بمبئی کے خوشگوار موسم سے خوش تھے اور جم کر کام کر رہے تھے۔ کفر کے فتوے جب بھوپال بھیجے گئے تو پھر دلی، جو ہندوستان کا صدر مقام تھا، وہ اس سعادت سے کیوں محروم رہتا، جبکہ ایک فتویٰ (۸۶) ساز بھی دلی کے تھے اور عجب اتفاق ہے کہ یہ مولوی صاحب مولانا شبلی کی دینداری سے خوب واقف تھے اور برسوں ساتھ کام کیا تھا۔ لیکن یہ کھٹک (۸۷) ان کے سے نہیں جاتی تھی کہ مولانا شبلی علی گڑھ کالج میں پروفیسر تھے اور سرسید کے ہمنوا تھے۔ دلی میں اصلاح ندوہ کے سلسلے میں جو جلسہ ہوا تھا اس میں چار فتوے الگ الگ تقسیم کیے گئے تھے اور

تقسیم سے پہلے ہی اطلاع دے دی گئی تھی کہ جلسہ موقوف کیا جائے ورنہ کفر کے فتوے تقسیم کیے جائیں گے۔ جلسے کے علاوہ وہ فتوے سفرائے ندوہ کے ذریعے مختلف شہروں میں تقسیم کیے گئے اور دیواروں پر لگائے گئے۔ چناں چہ رائے بریلی (اودھ) کی دیوار سے ایک صاحب نے اکھاڑ کر مولانا کو بھیجا۔ بھوپال میں یہ کوشش جاری رہی کہ سیرت کی اعانت (۸۸) بند ہو جائے۔ مولانا دریابادی نے مولانا کو بقیہ ترجمہ نولدیکی بھیج دیا، جس کی مولانا کو بڑی (۸۹) ضرورت تھی۔ مولانا (۹۰) کو سید سلیمان ندوی کے متعلق معلوم ہوا کہ (۹۱) وہ پونہ پہنچ گئے۔ اسی زمانے میں مولانا کو بہت سی باتیں تحقیق ہوئیں، یعنی خیبر کے متعلق قطعی طور پر ثابت ہوا کہ یہودیوں نے مدینہ پر چڑھائی کا ارادہ اور تیاریاں کر لی تھیں اور امدادی قبائل خیبر میں پہنچ چکے تھے۔ کتاب (سیرتؐ) کی ترتیب بھی مولانا نے اب آخری طور پر طے کر لی تھی۔

مولانا ندوہ سے مایوس ہو گئے تھے کہ وہاں کے فارغ التحصیل طلبہ نہ ان کو ملیں گے اور نہ وہ ان کو کسی فن میں ماہر بنا سکیں گے۔ اس لیے مولانا آزاد (ابوالکلام) سے مشورہ کیا اور طے ہوا کہ اصل فرض قابل اشخاص کا تیار کرنا ہے۔ لہذا کیوں نہ چند قابل طلبہ کو پاس رکھ کر ان کو کسی فن میں تیار کیا جائے اور ان میں صحیح مذاق پیدا کیا جائے۔ اس اسکیم کو عملی جامہ پہنچانے کے لیے مولانا ایک وظیفہ فنڈ قائم کرنا چاہتے تھے اور اس میں ماہانہ چندہ اپنے اعزہ، احباب اور شاگردوں سے لینا چاہتے تھے اور اس فنڈ سے ضرورت مند طلبہ کی کفالت کرنا چاہتے تھے۔ اس اسکیم کو باقاعدہ صورت دینے کے لیے سید صاحب کو لکھا اور یہ بھی لکھا کہ اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے آپس میں کام تقسیم کر لیا جائے۔ مولوی حمید الدین فراہی کے ذمہ بھی کام لگانا چاہتے تھے۔ حمید الدین فراہی الہ آباد جا رہے تھے، اس کی اطلاع بھی مولانا کو تھی۔ بات اصل یہ ہے کہ مولانا اپنے اعزا، احباب اور شاگردوں سے باخبر رہتے تھے کہ وہ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ اگر ان کو براہِ راست اطلاع نہیں ہوتی تو دوسروں سے دریافت کرتے تھے۔

انہی دنوں مولوی سید علی زینبی اور مولوی شبلی متکلم پر ندوہ والوں کا عتاب تھا اور ان کو ندوہ سے نکالنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں (۹۲)۔ مولوی شبلی متکلم مولانا کے خاص شاگرد تھے اور ندوہ میں استاد تھے لیکن مولانا شبلی نے اپنی معتمدی کے زمانے میں ان کے ساتھ خصوصی رعایت نہ کی تھی اور قاعدے کی پابندی کا خیال رکھا تھا۔ اس کا ثبوت حکیم مولوی عبدالحی مولف "گل رعنا" اور مولانا کی خط و کتابت ہے۔

"جناب مولانا! کاغذات سب پہنچے، اضافہ شدہ تنخواہ کی یادداشت دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی، یہ آپ نے بہت اچھا کیا، ایسے موقع پر جب کہ جدید اسٹاف مقرر ہوا اور تنخواہیں لوگوں کی خاطر خواہ رکھی گئیں۔ ان مدرسوں کے آنسو نہ پوچھنا اچھا نہیں تھا، بہرحال یہ اچھا ہوا، مگر اس میں اتنی کسر ہے کہ مولوی شبلی صاحب کی تنخواہ میں اضافہ آپ نے نہیں کیا۔ ان کی تنخواہ ان کے کام کے اعتبار سے کم ہے۔ وہ بہت مخلص آدمی ہیں، ان کی تنخواہ میں بھی پانچ روپے کا اضافہ کرنا مناسب ہے۔ اگر فرمایئے تو یادداشت میں واپس بھیجوں اور آپ خود اضافہ فرمائیں------ کہاں سے ہو، اس کو بجٹ بنانے والے طے کر دیں گے۔ عبدالحی"

اسی خط پر مولانا نے جواب لکھا، وہ یہ ہے:

"مکرمی مولوی شبلی (متکلم) کا مجھ سے بڑھ کر کوئی قدردان نہیں ہے لیکن ان کا اضافہ ابھی ہو چکا ہے اور مولوی سید علی وغیرہ کا مطلق نہیں ہوا۔ اس لیے ان لوگوں کو شکایت ہوگی۔ تاہم اگر آپ کی رائے ہو تو میں کر دوں، لیکن اور لوگ ہم وطنی پر محمول کریں گے۔ شبلی (۹۳)

اب مولانا کو جلدی تھی کہ "قرآن کی تاریخی ترتیب" کا ترجمہ ہو کر جلد آجائے۔ ادھر مولانا دریابادی سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ وہ کون سی کتاب ہے جس کا ترجمہ مولانا چاہ رہے ہیں۔ چناں چہ مولانا نے مولانا دریابادی کو توجہ دلائی کہ مولانا کی کتب انگریزی کی فہرست انھوں نے ہی تو تیار کی تھی۔ ایک کتاب تھی جس کا اردو نام "قرآن کی تاریخی ترتیب" لکھا تھا، اس کے ترجمے یا اقتباس کی ضرورت تھی۔ کتابیں الگ صندوق میں تھیں، لکھنو میں رکھی ہوئی تھیں اور غالباً نواب علی حسن خاں کے یہاں تھیں۔ لہٰذا نواب صاحب کی مدد سے اس کو صندوق سے نکلوانا اور ترجمہ کروانا چاہا۔ اسی زمانے میں کرنل عبید اللہ خاں سیرت النبیؐ کا انگریزی ترجمہ کرنا چاہ رہے تھے۔ اس سلسلے میں مختلف لوگوں سے خط و کتابت کر رہے تھے۔ آخر سیرتؐ کے انگریزی ترجمے کا ذمہ مسٹر محمد علی نے لیا (۹۴)۔

مولانا کو فکر بڑھتی جا رہی تھی کہ چند طلبہ ملیں تو ان کو کسی فن میں ماہر کیا جائے اور ان کو تصنیفی کام کا سلیقہ آئے۔ مولوی مسعود علی ندوی سے مشورہ کیا تھا، انھوں نے لکھا کہ درجہ

تکمیل میں کوئی اس قابل نہیں۔ مولانا کا محسن کے متعلق خیال تھا، مگر مولوی مسعود علی ندوی نے ان کو بھی اسی میں شمار کیا۔ اب مولانا کا خیال تھا کہ خلیل (۹۵) ہی مولانا کے پاس چلے آئیں۔ مولوی عبدالسلام کو الہلال میں بلایا جارہا تھا اور ان کا ارادہ جون ہی میں جانے کا تھا۔ مولانا نے سوچا کہ اگر مولوی عبدالسلام الہلال میں نہ جائیں تو کوئی بندوبست کیا جائے۔ شبلی متکلم ندوہ سے الگ ہونے والے تھے۔ مگر ان میں تصنیف یا تقریر کا مادہ نہ تھا ورنہ مولانا اپنے یہاں بلالیتے۔ پھر بھی ان کے لیے مولانا کے نزدیک بہت ٹھکانے تھے۔ مولوی عبدالرحمن نگرامی کو مولانا نے قابل تربیت سمجھا اور سید صاحب کو مطلع کیا، لیکن مولانا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مولوی سید علی زینبی کے لیے کہاں جگہ نکالیں۔ مجبور آپ نے تعلق کے ارکان ندوہ کو لکھا کہ ان کو ندوہ کی علیحدگی سے بچا لیں (۹۶)۔

اسی زمانے میں مولانا کا ارادہ تھا کہ سید صاحب کا رسالہ، جو قبل اسلام عرب سے متعلق تھا، اس کو سیرتؐ میں سید صاحب کے نام سے شائع کر دیں، کیوں کہ اس عنوان پر مولانا نے اجمالاً لکھا تھا مگر پھر طوالت اور ضخامت کی وجہ سے سیرتؐ میں شامل نہ ہو سکا اور "ارض القرآن" کے نام سے الگ شائع ہوا۔ ان دنوں مولوی مسعود علی جیسے منتظم کے پاس کوئی کام نہ تھا، اس پر مولانا نے ان کو توجہ دلائی کہ اصلاح ندوہ سے بڑھ کر کیا کام ہو سکتا ہے اور نواب علی حسن خاں کو اس کام میں مدد دینے کی ضرورت تھی۔ اسی کام کو اگر پھیلایا جاتا تو بہت پھیل سکتا تھا۔ اصلاحی مسودہ دہلی سے آچکا تھا۔ لکھنو میں جلسہ کر کے ترمیم و اضافہ کرنا، اس کو شائع کرنا، پھر تمام ملک سے آرا طلب کرنا، اصلاحی کمیٹی کے ممبروں کے دائرے کو وسیع کرنا، مختصر انگریزی رپورٹیں تیار کرانا، یہ سب کام ہی کام تھے اور ان کے بغیر ندوہ کے درست ہونے کا خیال خیال خام تھا۔ معین الدین خورد نے مولانا کو حسرت آمیز خط لکھا تھا۔ یہ بھی ندوہ کی حالت سے پریشان تھے، مگر ابھی اس قابل نہ ہوئے تھے کہ مولانا کے ساتھ علمی کام کر سکتے۔ سید صاحب کی رائے محسن کے متعلق اچھی تھی کہ وہ قابل تربیت تھے۔ اس لیے مولانا نے مسعود علی ندوی کو لکھا تھا، مگر ان کی رائے نہیں ہوئی۔

خلیل (۹۷) کو مولانا وظیفہ دے کر بلانا چاہتے تھے مگر ان کے رہنے کا انتظام نہ تھا، اس لیے مولانا چاہتے تھے کہ خلیل صاحب بمبئی کے سیٹھ سلیمان عبدالواحد سے قیام کا وقتی بندوبست کر لیں۔ جب کئی طلبہ ہو جائیں تو ایک کمرہ لے لیا جائے (۹۸)۔

مولانا دریا بادی نے مولانا کو لکھا کہ "قرآن کی تاریخی ترتیب" نہایت ہی ادنیٰ درجے کی

کتاب ہے اور اس کے ساتھ ہی کچھ اقتباسات بھی دیے۔ اس پر مولانا نے فوراً جواب لکھا کہ اس کا ترجمہ ہرگز نہ کیا جائے۔ ایسی کم رتبہ چیزوں کا ترجمہ مقصود نہیں (۹۹)۔

مولانا اب عدیم الفرصت ہو گئے تھے اور ضعف کی وجہ سے روزمرہ کے ضروری مشاغل کے علاوہ کوئی کام نہ کر سکتے تھے۔ اس کے باوجود مولانا نے سید نظیر الحسن رضوی کی کتاب "المیزان"، جو "موازنہ، انیس و دبیر" کے جواب میں تھی، اسی روز (۲۹۔ جون ۱۹۱۴ء) پہنچی تھی، بڑی دلچسپی سے پڑھی اور اس کے پڑھنے میں خاصہ وقت صرف کیا۔ پھر جس طرح سے اس کتاب کی تعریف کی ہے وہ مولانا کی عالی حوصلگی اور مخالف کی جائز تعریف کی بین دلیل ہے۔ لکھتے ہیں:

"آپ (۱۰۰) نے نہایت متانت اور سنجیدگی سے جواب لکھا ہے جو اس زمانے میں نہایت غنیمت ہے۔ آج مجھ کو موازنہ کی قدر ہوئی، کیوں کہ اس بہانے اردو میں ایک اچھی کتاب کا اضافہ ہوا اور ایک باکمال (مرزا دبیر مرحوم) کے جوہر اچھی طرح کھلے۔ آپ کی عنایت کا مشکور اور طرز تحریر کا مداح ہوں" (۱۰۱)۔

مولانا نے مسودے کی نقل کے لیے لکھنو سے خوش نویس کو بلایا۔ ایک بمبئی میں پہلے سے موجود تھے۔ مولانا محمود حسن (شیخ الہند) اور مولوی عبید اللہ سندھی کو سیرتؐ پر نظرثانی کے لیے مولانا نے خط لکھنے کا ارادہ کیا۔ سید صاحب سیرۃ عائشہؓ کے لیے عرصے سے مواد جمع کر رہے تھے حضرت عائشہؓ نے صحابہ کی روایتوں پر جو تنقیدات کی تھیں ان کو علامہ سیوطی نے یکجا کر دیا تھا۔ سید صاحب کو اس کتاب کی تلاش تھی تاکہ سیرت عائشہؓ مکمل کر لی جائے۔ چناں چہ مولانا نے حیدر آباد (دکن) سے مستعار منگوا دی تاکہ کتاب جلد مکمل ہو جائے۔ بقیہ ازواج مطہراتؓ کو مولانا نے سیرت النبی میں لے لیا تھا، مگر زیادہ پھیلا کر نہیں اور اس حصے کو اپنی نگرانی میں مولوی عبدالسلام سے تیار کرایا تھا۔ مگر ابھی تک اس پر نظرثانی نہیں کی تھی۔ چوں کہ ازواج مطہراتؓ کے زیادہ حالات نہ تھے اس لیے الگ الگ رسالوں کی ضرورت محسوس نہ کی بلکہ ان سب کو ملا کر ایک رسالہ کرنے کا ارادہ کر لیا، تاکہ ایک کتاب ہو جائے۔

مولوی عبدالسلام سو روپے پر الہلال کلکتہ میں جولائی سے جانے والے اور سب ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرنے والے تھے، اس لیے مولانا کو امید نہ تھی کہ سیرت اور الہلال دونوں کے کام بیک وقت کر سکیں۔ چناں چہ مولانا کو فکر ہوئی کہ سیرت کے کام میں کوئی اور مدد دینے والا مل

جائے۔ بیگم صاحبہ جنجیرہ اس زمانے میں بمبئی میں مقیم تھیں اور مولانا سے ملتی رہتی تھیں اور ملاقات میں اکثر بیگم بھوپال کی تعریف کرتی تھیں (۱۰۲)۔

مولانا کے نام بھوپال سے سید صاحب کی کتاب سیرت عائشہؓ کے متعلق تقاضہ آیا کہ جلد تیار کریں۔ معقول معاوضہ کی پیشکش بھی کی گئی۔ سید صاحب کو استدراکات علی الصحابہ از سیوطی کا انتظار تھا۔ وہ مولانا منگوا کر بھیج ہی چکے تھے، اس لیے چاہتے تھے کہ جلد تیار ہو جائے۔ مگر سیرت عائشہؓ کے متعلق اپنی معلومات کی بنا پر سید صاحب کو لکھا۔ مسودہ دیکھنا چاہتے تھے تاکہ اس میں اگر ضرورت ہو تو اضافہ کر دیں۔ سید صاحب کو لکھا کہ کتاب مذکورہ مولوی شیر علی کو حیدر آباد دکن واپس بھیج دیں۔ بیگم بھوپال یہ بھی چاہتی تھیں کہ دیگر ازواج مطہراتؓ کی سوانح بھی لکھی جائیں، مگر چوں کہ موصوف کو عجلت تھی اس لیے مولانا کسی اور انتظام کی فکر میں تھے۔ ماسٹر دین محمد ندوہ سے الگ ہو کر بمبئی پہنچنے والے تھے۔ مولانا کو فکر تھی کہ ان کو کسی کام میں لگا دیا جائے۔ اسی زمانے میں عبید جابلی کا دیوان لندن میں چھپا تو مولانا نے اس کو خریدا۔ "معجم الادبا" کے چھپنے کی بھی مولانا کو اطلاع ملی، جس میں جاحظ کا حال بھی درج تھا۔ اسی کی ایک کتاب "دلائل النبوت" بھی تھی، جس کے سو نسخے کسی زمانے میں موجود تھے، مگر اب سب نایاب تھے۔ مولانا کو ان کی سیرت کے سلسلے میں تلاش تھی (۱۰۳)۔

بیگم بھوپال کی خواہش کے مطابق مولانا چاہتے تھے کہ ازواج مطہراتؓ کے حالات پر ایک کتاب تیار کی جائے، مگر سوال یہ تھا کہ کون تیار کرے۔ مولوی عبدالسلام سیرت کے سلسلے میں مولانا کی زیر نگرانی کچھ حالات لکھ چکے تھے، جس میں تحقیق کے ساتھ تفصیل کی ضرورت تھی۔ اس لیے مولانا چاہتے تھے کہ اگر ابو الکلام آزاد اجازت دیں تو مولوی عبدالسلام مولانا کے پاس چھ ماہ قیام کریں اور کتاب مکمل کر لیں۔ مولوی عبدالسلام کی سیرتؐ کے کام سے علیحدگی کی وجہ سے مولانا کو سیرتؐ کے دفتر کے لیے ایک شخص کی بڑی ضرورت تھی۔ چاہتے تھے کہ طلبہ میں سے اگر کوئی اس قابل ہو تو اس کو لے لیں یا پھر خلیل صاحب تکمیل کے لیے آئیں تو ان کو ہی سیرت کا کچھ کام دیں تاکہ ان کو تصنیف کا طریقہ معلوم ہو اور مولانا کو بھی کچھ مدد ملے۔ انہیں حالات میں مولانا نے جون ۱۹۱۴ء کو ختم کیا (۱۰۴)۔

جولائی ۱۹۱۴ء

مولانا شبلی نے جولائی ۱۹۱۴ء میں جن مصروفیتوں میں وقت گزارا اس میں ہمارے لیے بہت بڑا سبق ہے کہ جن لوگوں کے دل میں کام کی لگن ہوتی ہے وہ زندگی کے آخری لمحوں تک مصروف رہتے ہیں اور ان کی یہی مصروفیت اور خاموش خدمت ان کی شہرت کا سبب ہوتی ہے۔ وہ تو رخصت ہو جاتے ہیں، لیکن ان کے کام اور شہرت ہمیشہ زندہ اور تابندہ رہتی ہے۔ مولانا شبلی ایسے ہی لوگوں میں تھے۔

مولانا شبلی کا قیام ابھی بمبئی میں تھا اور "سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم" لکھنے میں مصروف تھے۔ سید سلیمان ندوی سے حضرت عائشہؓ اور دیگر ازواج مطہراتؓ پر ایک مستقل کتاب کی فرمائش کی اور ارادہ کیا کہ اس کو سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں شامل کر دیں۔ لیکن یہ جز سید صاحب کے نام ہی سے رکھنے کا ارادہ تھا اور اس کتاب کی اشاعت اور اس کا نفع بھی سید صاحب سے متعلق رکھنے کا خیال تھا، لیکن مولانا اتنا ضرور چاہتے تھے کہ صاف شدہ مسودہ ایک نظر مولانا کو ضرور دکھلا لیا جائے۔ مولانا اس کے لیے بھی تیار تھے کہ اگر ازواجؓ کا حال الگ سلسلے میں ہو تو مولانا اس حصے کو سیرت سے الگ کر دیں۔ سیرتِ عائشہؓ اور دیگر ازواج مطہراتؓ کی سیرت کا کام مولوی عبد السلام ندوی سے نہ لینا چاہتے تھے، کیوں کہ ان پر زیادہ بار پڑ جاتا۔ پھر ان کا طرز تحریر (۱۰۵) سیدھا سادا تھا، اس میں ادب کی چاشنی نہ تھی، جس سے پڑھنے والے کو دل چسپی ہوتی۔ مولوی حمید الدین فراہی حیدر آباد دکن پہنچ چکے تھے اور مولوی شیر علی صاحب (۱۰۶) کے تقرر کا بھی ریاست میں امکان پیدا ہو گیا تھا (۱۰۷)۔ ندوہ کے ہنگاموں اور مولانا کی مخالفت کا زور ابھی باقی تھا اور مولانا کا اس سے متاثر ہونا قدرتی بات تھی۔ مولانا چوں کہ ندوہ کو دل سے چاہتے تھے، اس لیے اس کی ردی حالت اور منتظمین کی ندوہ کے آئین سے روگردانی اور من مانی ان سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ لہٰذا سوچتے سوچتے مولانا اس نتیجے پر پہنچے کہ ندوہ کو جیسا ندوہ مولانا بنانا چاہتے تھے، مولویوں (یہاں پر مراد منتظمین ندوہ سے ہے، جو نصاب میں تبدیلی پر کسی طرح تیار نہ تھے، باوجود اس کے کہ نصاب کی تبدیلی سالانہ جلسے میں منظور کر لی گئی تھی) کی مخالفت اس کو بننے نہ دے گی اور ندوہ سے مراد ندوے کے در و دیوار نہیں بلکہ وہ حضرات تھے جو مذہبی علوم و فنون میں ماہر ہوں اور مغربی علوم سے بھی آشنا ہوں تاکہ دین کی برتری کا لوہا مغربی طرز پر بھی منوا لیں

اور مغربی تعلیم کے دل دادہ حضرات پر بھی اپنا سکہ جمائیں۔ یہی مشورہ مولانا کے احباب نے بھی دیا۔ چناں چہ مولانا نے طے کیا کہ کچھ لوگوں کو ساتھ رکھیں اور تصنیف و تالیف میں ان کی تربیت کریں اور ندوہ کے مثالی انسان یعنی سید سلیمان جیسے اشخاص بنائیں، جو نہ مغربی علوم و فنون سے مرعوب ہوں اور نہ اپنے علوم و فنوں سے شرمندہ۔ اس سلسلے میں مولوی ابو الکلام آزاد نے دو آدمیوں کو کلکتہ سے بھیجنے کا ارادہ کیا تھا۔ لہٰذا مولانا کو یہ بھی فکر تھی کہ ایسے اشخاص کے لیے انگریزی کا بھی انتظام کیا جائے۔ چوں کہ مولوی مسعود علی نے بڑے بڑے علماء کے مقابلے اور زبردست مخالفت کے باوجود طلبائے ندوہ کی مدد کی تھی اور اسٹرائک میں جان ڈال دی تھی اور اسی وجہ سے ہندوستان و پاکستان کے مسلمانوں میں ندوہ کے معاملات سے دل چسپی پیدا کرا دی تھی، اس لیے ان کا عزم و حوصلہ، انتظامی صلاحیت اور مستقل مزاجی مولانا کے نزدیک مسرت کا باعث ہوئی۔

مولانا اس بات کو بھی سمجھ گئے تھے کہ منتظمین ندوہ کی اگر مخالفت کی جائے تو مخالفین کچھ نہ کچھ اصلاح کی کوشش کرتے ہیں اور بڑے بڑے لوگوں کو ندوہ کی طرف توجہ دلاتے ہیں اور سالانہ جلسے میں عوام کو بھی اکٹھا کر کے اکثریت کے بل بوتے پر اپنی تجاویز پاس کرا لیتے ہیں جو مناسب نہیں ہوتیں، اور اگر مخالفت نہ ہو یا اس کا اندیشہ نہ ہو تو پھر کمزوری چلی جاتی ہے اور جمود طاری رہتا ہے۔

نواب علی حسن خاں کے خط نہ آنے سے مولانا ان دنوں فکر مند رہے، کیوں کہ ان کو چند ضروری خطوط لکھے تھے۔ بعض ضروری مسودات کا انتظار بھی تھا، وہ بھی اب تک وصول نہیں ہوئے تھے۔ پیارے صاحب کو بار بار لکھ رہے تھے، مگر وہ جواب نہ لکھ سکے تو مسعود علی کو لکھا کہ وہ یاد دہانی کر دیں (۱۰۸)۔

سید سلیمان ندوی کو سیرتِ عائشہؓ کے سلسلے میں مسندِ عائشہؓ کی ضرورت تھی۔ مولانا کے پاس تھی، لہٰذا مولانا نے سید صاحب کو اسے دینے کا وعدہ کیا اور سید صاحب کے استفسار کے جواب میں لکھا کہ طبقات ابن سعد میں زیادہ مواد نہ ملے گا۔ بخاری، مسلم اور ابو داؤد میں خاصا مواد مل جائے گا اور یہ کتابیں بمبئی کی کسی انجمن سے مل جائیں گی یا پروفیسر شیخ عبد القادر اپنے وسیع تعلقات کی بنا پر حاصل کر دیں گے۔

سید سلیمان کے ایک اور استفسار کے جواب میں لکھتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ کے مجتہدات

کے متعلق ان کے نوٹ پڑھ کر بتایا جاسکتا ہے کہ اسی عنوان کے تحت مزید کیا اضافہ کیا جاسکتا ہے مولانا نے فن درایت کا حضرت عائشہؓ کو موجد قرار دیا اور سید صاحب کو مشورہ دیا کہ اس عنوان پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے۔ علم فقہ اور اعتقاد میں بھی حضرت عائشہؓ کی خدمات کو مولانا نے بہت سراہا اور سید صاحب کو توجہ دلائی کہ اس مجوزہ کتاب (سیرتِ عائشہؓ) کا خاکہ بنا کر مولانا کو بھیجیں تاکہ اس پر مولانا صحیح مشورہ دے سکیں۔ چوں کہ سیرت عائشہؓ سے قبل اسلم جیراجپوری (۱۰۹) نے سوانح عائشہؓ لکھی تھی لہذا اس کو پڑھنے کا بھی مشورہ دیا تھا تاکہ زیر تحریر کتاب اس سے ہٹ کر اور معلومات کے لحاظ سے بہتر ہو۔

مولوی حمید الدین فراہی کے خط کا ذکر سید سلیمان کے خط مورخہ ۳۔ جولائی ۱۹۱۴ء میں کرتے ہوئے مولانا نے لکھا کہ مولوی شیر علی صاحب کے پروفیسر کی حیثیت سے تقرری کا حیدر آباد (دکن) میں یقین دلایا گیا ہے (۱۱۰)۔

مولانا چاہتے تھے کہ ندوہ کے طلبہ ملک کے مختلف مقامات میں پھیل جائیں تو مقاصد ندوہ کے لیے مفید ہو۔ تین یا چار مہینے کے لیے مولانا، سید سلیمان کی ضرورت محسوس کر رہے تھے اور سید صاحب کے لیے مختلف کوششوں میں مصروف تھے۔ ندوہ کے انتظامی جلسے میں سالانہ جلسے کی تاریخوں کا یقین ہونے والا تھا۔ اس لیے مولوی معین الدین ندوی کو لکھا کہ تار پر اس کی اطلاع دیں۔ مولوی مسعود علی، مولانا پر زور دے رہے تھے کہ وہ ندوہ کے جلسے میں شرکت کے لیے آئیں اور مولانا کا خود بھی خیال تھا کہ لکھنو آئیں، مگر اس بات کا اندیشہ تھا کہ مزاج کے خلاف باتوں سے سکون میں فرق آئے گا اور اب مولانا میں برداشت کی طاقت نہیں رہی تھی۔ پھر اب تو اپنے کو "سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم" کے لیے وقف کر دیا تھا، اس لیے دنیوی جھگڑوں میں پڑنے سے اور بھی پرہیز کر رہے تھے (۱۱۱)۔

ایران کا خاتم الخطاطین احمد تبریزی نام کا ایک شخص تھا۔ آغا خاں اول کے بھائی نے اس کو ایران سے بلوا کر حمائل شریف لکھوائی تھی۔ اول سے آخر تک مطلا تھی یعنی ہر سطر پر طلائی ٹکڑے تھے اور تقطیع نہایت موزوں تھی۔ یہ حمائل مولانا نے دو جولائی کو دو سو پچاس روپیہ نذرانہ دے کر لے لی۔ اگرچہ کل ۳۲ برس کی لکھی ہوئی تھی۔ لیکن اس کی اہمیت کی وجہ سے مولانا نے گراں قیمت دے کر لینا پسند کیا (۱۱۲)۔

سید سلیمان کو متوجہ کیا کہ ترمذی میں اکثر مسائل میں حضرتِ عائشہؓ کے اجتہادی مسائل کی

تصریح ہے، لہٰذا ان کو الگ یکجا جمع کر لینا چاہیے۔ مولانا کے پاس سید سلیمان کی لکھی ہوئی ایک فہرست تھی جس میں حضرت عائشہ کی معلومات تھیں۔ مولانا نے توجہ دلائی کہ ان پر جو اعتراضات ہیں ان کے تفصیلی جوابات پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ مولانا نے خواہش کی کہ سید سلیمان کا جمع کیا ہوا مواد اگر اجمالاً ہی پیش نظر ہو تو کچھ اضافہ کے لیے مشورہ دے سکیں۔ شمائل شریف دو سو پچاس پر ہدیہ لینے کی سید سلیمان کو بھی اطلاع دی۔ (۱۱۳)

اگرچہ مولانا کی کوشش اب دنیوی جھگڑوں سے خاصا دور رہنے کی تھی پھر بھی کبھی کبھی ندوہ سے دل چسپی کا اظہار کرتے تھے۔ چناں چہ کچھ ترمیمات نواب علی حسن خاں صاحب کو لکھ کر بھیجیں تھیں۔ ان کے متعلق ان سے دریافت کیا کہ اس پر کیا کیا گیا۔ ندوہ کے سلسلے میں اصلاحی کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ندوہ والوں نے اپنے قواعد اخبارات میں شائع کر دیے۔ مولانا اس وقت کی کمیٹی اور ارکان کو باضابطہ خیال کرتے تھے اور اس کو باضابطگی کی وجہ سے قائم رکھنے کے حق میں تھے۔ ہاں ایک بے ضابطگی ضرور ہو گئی تھی اور مولانا اس ہی کے مخالف تھے اور وہ بے ضابطگی یہ تھی کہ ارکان کی پینتیس ممبروں کے بجائے ۵۱ تعداد کر دی گئی اور ۱۵ ممبر فوری طور پر منتخب کر لیے گئے۔ چوں کہ وہ ایک خاص پارٹی کے تھے اس لیے اس پارٹی کی اکثریت قائم ہو گئی۔ لہٰذا ممبروں کی جگہ خالی ہونے پر جدید قاعدے کے موافق ان کی جگہ نئے ممبر اکثریت کے بل بوتے پر منتخب ہونے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کارروائیاں یک طرفہ ہونے لگیں اور قواعد کی رو سے اس اکثریت کا کوئی علاج نہ تھا۔ پیرزادہ صاحب کے دستور العمل میں کسی حد تک اس کا علاج تھا مگر نواب علی حسن صاحب کی طرف سے اس پر کوئی کارروائی نہ کی گئی۔ مولانا نے مشورہ دیا کہ نواب صاحب اپنا دستور العمل بعد غور و مشورہ کے شائع کر دیں اور اخبارات کو بھی توجہ دلانے کی ضرورت پر زور دیا۔ ندوہ نے چوں کہ دستور العمل کا ایک جز شائع کیا تھا اس لیے اس کو پورے چھپنے کے انتظار میں مولانا نے اپنی رائے دینے سے پرہیز کیا، مگر اتنا خیال ضرور ظاہر کیا کہ قومی قوت پر جدید دستور العمل سے ضرب لگتی ہے۔ اس لیے کہ چند ارکان کے ہاتھ میں اختیارات دے دیے گئے ہیں اصل چیز کلی امور، ممبران کا تقرر، ناظم کا تقرر ہیں جو قوم کے ہاتھ میں ہونا چاہیے اور بھی اختیارات قوم سے چھین لیے گئے ہیں۔ نواب صاحب کو مشورہ دیا کہ مولانا ابو الکلام آزاد کو بھی اس بارے میں لکھیں (۱۱۴)۔ اسی زمانے میں سید نظیر الحسن نے مولانا کو اطلاع دی کہ وہ حضرت امام حسن کے حالات لکھ رہے ہیں۔ اس پر مولانا نے جواب دیا کہ مواد کے ملنے کی امید کم ہے، یہ ضرور ہے کہ

اس کام میں اجر ضرور ہے۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ حضرت علیؓ کی سوانح لکھی جائے، اس لیے کہ حضرت علیؓ پر کوئی جامع تصنیف نہیں۔ دوسرے یہ کہ جنگی کارناموں کے علاوہ حضرت علیؓ کے علمی کارنامے بہت ہیں۔ مولانا نے یہ بھی لکھا کہ اکثر اہل سنت حضرت کے فضائل سے واقف نہیں اور یہ بھی خیال پھیلا ہوا ہے کہ حضرت علیؓ کے سیاسی اصول کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ لہٰذا اس خیال کو دور کرنا چاہیے اور اگر عربی سے موصوف واقف ہوں تو مولانا اس تصنیف میں مدد دینے کو تیار ہیں۔ مولانا نے ایک بڑی دل چسپ بات لکھی کہ حضرت عمرؓ کے بارے میں "میں سنی اور حضرت علیؓ کے بارے میں شیعہ ہوں" مراد یہ تھی کہ عقائد میں وہ کسی کی فضیلت و بزرگی کو کم سمجھنے کو تیار نہ تھے (١١٥)۔ مشرق گورکھپور میں ایک صاحب نے مولانا کے خلاف اعتراضات کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس کے جواب میں سید سلیمان نے مضمون لکھا تھا۔ اس کو مولانا نے پسند کیا، مگر ایک غلطی کی طرف اشارہ کیا کہ اس کو درست کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ کہ مولانا نے ایک موقع پر (٦٠٠) چندہ دیا تھا اور وہ غلطی سے (٦٠٠٠) چھپ گیا تھا۔ اگر یہ غلطی باقی رہ جاتی تو پورا مضمون مبالغہ آمیز ہو جاتا۔ لہٰذا اس کی اصلاح کا مشورہ دیا اور اس خیال کا بھی اظہار کیا کہ ممکن ہے کہ یہ خود مشرق کا تصرف ہو (١١٦)۔

مولانا چاہتے تھے کہ دونوں دستور العمل کو سامنے رکھ کر مقابلہ کیا جائے اور نقص کے وجوہ بتلائے جائیں۔ اصلاحی کمیٹی سے زیادہ امید نہیں تھی کیوں کہ وہ اتنا بھی نہ کر سکی کہ اپنا مسودہ شائع کرتی۔ نواب علی حسن خاں صاحب ممبروں کو تار پر تار دیتے رہے مگر جواب نہ ملا۔ ١٧۔ جولائی کو مخالف پارٹی کا جلسہ ہونے کی اطلاع سید سلیمان کو دی اور لکھا کہ جو کچھ طے ہو گا شائع کیا جائے گا۔ مخالف پارٹی نے اپنے مسودہ میں پبلک کی مداخلت کا حق بھی ختم کر دیا۔ مثلاً انتظامت کے انتخابات میں جلسہ عام کی کوئی اہمیت نہ رہی۔ ممبروں میں بھی ٢٥ آدمیوں سے کورم پورا کرا لیا جانا طے ہو گیا۔ سب سے اہم یہ بات تھی، جس پر اصلاحی کمیٹی کی نگاہ نہ پڑی، کہ جو پارٹی جولائی میں منتخب ہوئی وہ بے قاعدہ تھی، کیوں کہ ان ممبروں نے منتخب کی جن کی میعادِ ممبری دو ماہ قبل ختم ہو چکی تھی، وہ ویسے کی ویسے قائم رہی اور وہی لوگ جدید ممبروں کا انتخاب کرنے والے رہے۔ نتیجہ یہ کہ ارکان کی نوعیت ہمیشہ وہی باقی رہی۔ مخالفین میں ضابطے اور قاعدے کی پابندی نہیں، اور اپنی طرف قانون اور قاعدے کو نہ کوئی پڑھنے والا اور نہ قانونی حیثیت سے اعتراض کرنے والا، سب لفاظی میں بڑھے ہوئے اصل ضابطے سے واسطہ نہیں۔ ابو الکلام نے تار سے اطلاع دی کہ سید

سلیمان ہی لکھ کر بھیج دیں ان کی طبیعت لکھنے میں نہیں لگتی۔ لہٰذا سید سلیمان کو اطلاع دی کہ وہی آرٹیکل لکھ کر وکیل امرتسر میں چھپنے کو بھیج دیں، جس میں صرف یہ لکھنے کی ضرورت ہے کہ اصلاح کے لیے جو ذرائع ممکن تھے وہ بھی مسودہ، دستور العمل سے ناممکن ہوگئے، کیوں کہ کام کرنے والی کمیٹی باوجود بے قاعدگی کے باقی رہی۔ جلسہ، عام کا کوئی حق نہیں رہا اور ناظم دار العلوم ندوۃ العلما کے اختیارات لامحدود کر دیے گئے۔ ایک دل چسپ بات کی طرف مولانا نے توجہ دلائی کہ مخالفین کے دستور العمل میں ہے کہ ناظم ندوۃ العلماء مشاہیر علما سے ہو۔ اس زمانے میں چوں کہ مولوی خلیل الرحمن سہارن پوری ناظم ندوۃ العلما تھے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ مولوی صاحب موصوف مشاہیر علماء میں سے ہیں تو یہ تصور خود ان کا اپنا ہے یا واقعی وہ مشاہیر علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ مولانا نے ماسٹر دین محمد کے بمبئی پہنچنے کی اطلاع بھی سید سلیمان کو دی۔ ندوے کے دستور العمل اور وہاں کی اندرونی خرابیوں پر پوری توجہ کے باوجود مولانا سیرتؐ کے کام میں مصروف تھے۔ اسی بنا پر شروانی صاحب کو لکھا کہ سیرت کو مکمل کرنے کے لیے خاموشی اور سکوت درکار تھا اور وہ بمبئی میں حاصل تھا، اس لیے کہ دن بھر لوگوں کی آمد و رفت بالکل نہ تھی۔ یہ بھی ارادہ تھا کہ جلد اول مکمل کر کے بمبئی سے واپس ہوں۔ چوں کہ ہمہ تن سیرتؐ میں مصروف تھے، اس لیے تاریخی اور تحقیقی راز افشا ہو رہے تھے اور مشکلات حل ہوتی جارہی تھیں۔ مولانا چاہتے تھے کہ جب شروانی صاحب سے ملاقات ہو تو سیرتؐ کا تیار مسودہ دکھلائیں۔ ان دنوں مولانا نے خوش نویس کو بمبئی بلوا لیا تھا، لیکن کسی رکاوٹ کی وجہ سے مسودہ مطبع میں نہ جاسکا۔ غالباً یہ رکاوٹ بھوپال سرکار کی تھی، جس میں وہ چاہتی تھی کہ مسودے کو کوئی مستند عالم دیکھ لے کیوں کہ ان کو یہ سمجھایا گیا تھا کہ مولانا کی تحریر کردہ سیرتؐ میں بہت سی غلطیاں ہیں اور اس سلسلے میں جو مالی امداد دی جارہی ہے اس سب کے ضائع ہونے اور الٹے بھوپال سرکار کی بدنامی کا اندیشہ ہے کہ ایسے کی سرپرستی کیوں کی گئی جو بدنامی کا سبب بنا۔ ریاست پر مختلف طرف سے دباؤ ڈلوایا جارہا تھا کہ سیرت چھپنے نہ پائے، اس لیے کہ اگر چھپ گئی تو مولانا کی قدر و منزلت اور بڑھ جائے گی۔ حب علیؓ نہیں بلکہ بغض معاویہؓ کی کتنی اچھی مثال تھی۔ مولوی مسعود علی ندوی اس زمانے میں بے کار تھے۔ مولانا بھی ان کی بے شغلی سے متفکر تھے۔ لہٰذا مولانا نے مولوی مسعود علی کے پچھلے خط کا حوالہ دے کر دریافت کیا کہ وہ جو کام شروع کرنے والے تھے وہ کیا تھا۔ قاری عبدالولی صاحب ان دنوں پریس کی مشین خریدنے بمبئی گئے تھے، مولانا کو خیال ہوا کہ اگر ایک ماہ نامہ

جاری ہو جائے تو بہتر ہے، اس لیے کہ علمی معیار پست ہو رہا تھا اور انگریزی تعلیم بھی معمولی ہوتی جارہی تھی ۔ دارالعلوم ندوہ کے اختلافات کو اصلاح کی خاطر اونچے ہاتھوں میں جانے کو لاحاصل سمجھتے تھے، کیوں کہ نہ لوگوں کو دل چسپی تھی نہ فرصت ۔ اب مولانا کی کوشش یہ تھی کہ دارالمصنفین کے قیام کا بندوبست ہو جاتا تو بہتر تھا ۔ اس کے لیے راجہ صاحب محمود آباد کے توسط سے امام باڑہ شاہ نجف لکھنو کے قریب زمین لینے کا ارادہ کر رہے تھے اور اس کا منتظم مولوی مسعود علی ندوی کو بنانا چاہتے تھے ۔ زمین کے ملنے پر مولانا کا ارادہ تھا کہ شروع میں ایک مختصر پھوس کا بنگلہ اور چھپر کے کمرے بنوا لیے جائیں بعد کو تو حسبِ ضرورت توسیع ہوتی رہے گی ۔ اس جگہ کے قیام میں صحت بھی بہتر رہنے کا امکان تھا ۔ اس زمانے میں دو کاتبِ سیرتؐ کے مسودہ کی نقل میں مصروف تھے (۱۱۷) ۔ مولانا نے ۱۸ ۔ جولائی ۱۹۱۴ء کو ابن تیمیہ کی منہاج السنۃ پڑھی تو اس میں جوہر خمسہ کی صراحت مل گئی ۔ مولانا کو اگرچہ معلوم تھی مگر بھول گئے تھے ۔ لہٰذا سید سلیمان کے قبل کے ایک استفسار کا جواب دیا اور لکھا کہ شیخ عبدالقادر (پروفیسر) کو بھی بتا دیا جائے (۱۱۸) ۔ مولانا کا شروع سے یہ خیال تھا کہ کام کرنے والے ایک ہی دو آدمی ہوتے ہیں اور باقی لوگ برائے نام ہوتے ہیں ۔ یہی چیز وہ ندوے کے سلسلے میں سمجھتے تھے، چناں چہ مولوی مسعود علی ندوی صاحب کو مشورہ دیتے ہیں کہ اصلاح ندوہ کے سلسلے میں جس قدر رائیں آگئیں تھیں نواب علی حسن خاں کو چاہیے تھا کہ ارکان لکھنو سے مل کر ان کی رائیں لکھوا لیتے، اگر وہ نہ لکھتے تو خود راویوں کا خلاصہ لکھتے اور اس کے مطابق دستور العمل کو درست کر کے اخباروں میں بھیج دیتے اور وہ اصولی امور چھپوا دیے جاتے جو ندوہ کے دستور العمل کے خلاف تھے ۔ اگرچہ یہ نہ ہو سکا، پھر بھی نواب صاحب سے کہہ کر دونوں دستور العملوں میں جو اہم اصولی اختلاف ہوں ان کو اخبارات میں شائع کر دیں اور ارکان کا متفق علیہ دستور العمل خود شائع کر دیں اور اگر دلی جانے کی ضرورت پیش آئے تو فوراً چلے جائیں، کیوں کہ رمضان شریف میں زیادہ کام ہونے کی امید نہیں ۔ اس زمانے میں عبدالباری (ندوی) کے لیے بھی ایک خط بھیجا تھا اس کی رسید مانگی (۱۱۹) ۔

اسی زمانے میں سید سلیمان ندوی حیاتِ مالکؒ لکھ رہے تھے ۔ اس کے متعلق مولانا نے لکھا کہ امام مالکؒ کے اجتہادیات پر کیا کیا لکھا گیا ۔ اجتہادیات پر موطا کی شرح زرقانی بڑی مفید ہے بمبئی میں ملتی ہے، لیکن گراں خاصی ہے ۔ اس زمانے میں مولانا کو حمید الدین فراہی نے اطلاع دی کہ سید علی زینبی امروہی مدرس ادب، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو کا تقرر عثمانیہ کالج حیدر آباد

(دکن) میں ہو گیا اور مولوی شیر علی کا تقرر تو گویا ہو ہی چکا تھا۔ ایک دو جگہ اور خالی تھیں، ان کے لیے مولانا نے سید سلیمان سے دریافت کیا کہ کس کے لیے تحریک کی جائے۔ دبی زبان سید سلیمان سے بھی دریافت کیا کہ کہیں ان کا ارادہ تو نہیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی لکھا کہ وہاں کے مصارف بہت ہیں، فائدہ کم اور علمی مذاق ختم ہونے کا اندیشہ تھا (۱۲۰)۔

مولوی مسعود علی ندوی چاہتے تھے کہ دارالمصنفین ندوہ میں قائم ہو۔ مولانا بہت پہلے سے یہی چاہتے تھے مگر ندوہ کے اربابِ اقتدار مولانا کو اپنے اقتدار کے لیے خطرہ سمجھتے تھے۔ لہٰذا مولانا کے لیے رکاوٹیں پیدا کرتے رہتے تھے۔ ندوہ میں دارالمصنفین کے قیام کی خواہش کا اظہار مولوی مسعود علی سے کرتے ہوئے لکھا کہ اگرچہ ندوہ والوں کا اس میں فائدہ ہے، مگر قائم نہ کرنے دیں گے۔ چوں کہ قاری عبدالولی بمبئی جاکر پریس کی مشین کے لیے بات پکی کر آئے تھے، بلکہ پیشگی رقم بھی دے آئے تھے اس لیے مولانا کا خیال تھا کہ علمی رسالے کا اجرا ہو سکتا ہے اور امید تھی کہ وقت پر اس کا نکلنا آسان رہے گا (۱۲۱)۔

مولانا کے پاس جہاں آرا بیگم کی تصنیف مونس الارواح (قلمی) اور عالمگیر کا فرمان تھا ان کو لوہے کے صندوق میں رکھ کر منشی محمد علی کے پاس رکھوا دیا تھا۔ مولوی مسعود علی سے خواہش کی کہ وہ ان کو اپنی نگرانی میں نواب علی حسن خاں کے پاس کسی محفوظ جگہ رکھوا دیں اور آئندہ پھر لکھا جائے گا کہ کہاں بھیجی جائیں (۱۲۲)۔

اب مولانا کو سیرت النبی کی فکر تھی اور وہ چاہتے تھے کہ کوئی عالم اس کو دیکھ لے تاکہ اس کے خلاف جو پروپیگنڈا ہو رہا تھا اس کی قلعی کھل جائے۔ لیکن پروپیگنڈا اتنا منظم تھا کہ کسی عالم کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ وہ دیکھنے ہی کی حامی بھرے۔ پھر بھی مولانا نے سیرت کا مسودہ مولانا عبید اللہ سندھی ناظم نظارۃ المعارف القرآنیہ دہلی کو بھیج دیا کہ وہ دیوبند لے کر جائیں اور شیخ الہند محمود حسن کو دکھلائیں۔ مگر دیوبند کے علماء کو بھوپال سے پہلے ہی اطلاع مل چکی تھی لہٰذا انھوں نے شیخ الہند محمود حسن کو مسودہ دیکھنے سے باز رکھا۔ مولانا کو بڑا اعتماد تھا کہ اگر شیخ الہند مسودے کو دیکھتے تو وہ غیر جانب داری اور دیانت داری سے رائے دیتے، اور غیر جانب دار دیانت دار کی رائے ہی مفید ہو سکتی تھی۔ ایک چیز اور بھی تھی کہ شیخ الہند اپنی ایک الگ رائے رکھتے تھے اور دوسروں کی رائے سے کم متاثر ہوتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اکثر علماء نے مولانا عبید اللہ سندھی کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا، مگر شیخ الہند نہ صرف فتوے بازی سے الگ رہے بلکہ مولانا مرحوم نے مولانا سندھی سے

تعلقات بھی قائم رکھے ۔ لیکن مولانا کی کوشش بہرحال بے کار گئی اور کسی عالم کی رائے نہ حاصل کی جاسکی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا شبلی اور سیرت النبیؐ کے خلاف علماء کا پروپگنڈا کام کر گیا ۔ لہٰذا انہیں فکر ہوئی کہ جب شیخ الہند نے مسودہ دیکھنے کی ہمت نہ کی تو کوئی دوسرا عالم کہاں سے ہمت کرے گا اور اگر ہمت کی بھی تو علماء کے زمرے سے خارج ہونا پڑے گا اور ایسی صورت میں بھوپال سے وظیفہ بند ہو جائے گا تو کیوں نہ اس وظیفے سے خود ہی دست بردار ہو جائیں اور خود ہی کش مکش سے نجات پاجائیں اور مسودے کو مطبع بھیج دیں تاکہ چھپ جائے اور چوں کہ اپنے طور پر چھپواتے اس لیے بھوپال سرکار کی بدنامی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا ۔ رہ گیا مولانا کی بدنامی تو جو بدنامی ہونا تھی وہ ہو چکی تھی، یعنی کفر کا فتویٰ مل چکا تھا ۔ بلکہ اس کا زیادہ امکان تھا کہ سیرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چھپنے کی نیک نامی سے بدنامی ہلکی ہو جائے، اگرچہ قدر تو اس کے پڑھے جانے کے بعد ہی ہوتی ۔ مولانا نے منشی محمد امین زبیری کے ذریعے بھوپال سرکار سے چاہا کہ یا تو سرے سے رقم بند کر دی جائے یا وہ رقم دارالمصنفین کے نام سے کر دی جائے، یا جیسی مرضی ہو ۔ لیکن اتنا ضرور تھا کہ مولانا بجائے دل شکستہ ہونے کے کام کرنے پر اور زیادہ مستعد ہو گئے تھے اور مصارف کو خود ہی برداشت کرنے کی ٹھان لی تھی ۔ اس کے علاوہ یہ بھی تھا کہ مولانا کی علمی کاموں میں محنت اور سیرت النبیؐ لکھنے کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی کہ اگر کسی مسلم ریاست میں وظیفے کی تحریک کی جاتی تو مالی امداد مل سکتی تھی ۔ ۔ بہرحال مولانا کشمکش سے جلد نکلنا چاہتے تھے، اس لیے بھوپال کے فیصلے کے جلد منتظر تھے تاکہ آمدنی کی کمی کے لحاظ سے خرچ میں کمی شروع کر دیتے (۱۲۳) ۔

امام مالکؒ کی فقہ کے سلسلے میں سید سلیمان کو ہدایت کی کہ "بدایۃ المجتہد از ابن رشد" اور "احکام القرآن از ابو بکر عربی" منگوا کر پڑھیں ۔ ان کتابوں سے بڑی مدد ملنے کی امید تھی اور یہ بھی مشورہ دیا کہ امام ابن تیمیہؒ کو سوانح عمری لکھنے کی ضرورت ہے ۔ مولانا اس زمانے میں ابن تیمیہ سے بہت متاثر تھے اور امام رازیؒ اور امام غزالیؒ سے بڑھ کر سمجھتے تھے ۔ ان کی تصنیفات میں نئی نئی چیزیں پاتے تھے، چناں چہ ان کی تصنیفات کو بار بار پڑھنے پر زور دیا اور ابن تیمیہ کی یہ رائے بھی لکھی کہ اگر یہود و نصاریٰ تثلیث چھوڑ کر اپنے اصل مذہب پر قائم ہو جائیں اور اعمال حسنہ بجالائیں تو اسلام ان کو اجازت دیتا ہے، مگر نتیجہ ذرا ہلکا نکالا ہے ۔ اس دعوے پر قرآن مجید سے استدلال کیا ہے (۱۲۴) ۔

مولانا کا خیال تھا کہ اگر شیخ الہند مولانا محمود حسن مولانا کی لکھی ہوئی سیرت کو دیکھتے تو تعریف کرتے، اس لیے کہ انھوں نے بڑی تحقیق و تدقیق سے لکھی تھی۔ مگر اس کا افسوس رہا کہ مخالفین نے ان کو دیکھنے پر آمادہ نہ ہونے دیا، بہر حال مولانا عبید اللہ سندھی کا مسودہ دیکھ لینا ہی غنیمت معلوم ہوا اور بھوپال سرکار کو ان کی رائے بھیجنے کا ارادہ تھا (۱۲۵)۔

بھوپال سرکار کے مزید اطمینان کے لیے مولانا نے مولوی عبید اللہ ٹونکی کا نام تجویز کیا کہ اگر سرکار کو ان پر اعتماد ہو تو ان کی رائے بھی معلوم کر لی جائے یا جیسا سرکار بھوپال کی مصلحت ہو یا ان جھگڑوں کو جوں کا توں رہنے دیا جائے۔

ان ہی دنوں "الندوہ" پھر نکلا جس کی کتابت و طباعت مولانا کو پسند آئی۔ چوں کہ مولوی مسعود علی ندوی بڑے منتظم تھے، اس لیے موصوف سے مولانا نے دریافت کیا کہ اگر وہ اتنی اچھی کتابت اور طباعت کا انتظام کر سکتے ہوں تو ایک رسالے کا انتظام کرا دیا جائے اور کوئی وجہ نہیں کہ عمدہ انتظام کے بعد رسالہ "الندوہ" کا مقابلہ نہ کر سکے جو اس وقت اکرام اللہ خان کی ادارت میں نکل رہا تھا (۱۲۶)۔

مولانا کی زندگی کی مہلت کم سے کم ہوتی جارہی تھی، مگر مصروفیت میں کمی واقع نہیں ہوئی تھی بلکہ کچھ بڑھ ہی گئی تھی۔ یہ تھی ایک مصروف انسان کی زندگی۔

اگست ۱۹۱۴ء

مولانا بمبئی میں سیرت کے کام میں لگے ہوئے تھے کہ مولوی اسحاق (۱۲۷) کے سانحۂ ارتحال کی ناگہانی خبر ملی۔ اس خبر کے معلوم ہوتے ہی الہ آباد پہنچے۔ ایک تو مولانا کی حساس طبیعت، دوسرے مسلسل بیماری، تیسرے گھر کے انتظامی معاملات مولوی اسحاق کی ذمہ داری کی وجہ سے ان کا ان بکھیڑوں سے آزاد رہ کر سیرت کے کاموں میں مصروف رہنا۔ مولوی اسحاق دنیا سے کیا گئے کہ ان کا سہارا اٹھ گیا۔ مصیبتوں کا پہاڑ تھا جو ان پر ٹوٹا۔ اس صدمے سے بے حد نڈھال ہو گئے اور شدت غم میں سید سلیمان ندوی کو اس سانحہ کی اطلاع ان الفاظ میں دی:

"میرا سب کچھ جاتا رہا۔ انا للہ" (۱۲۸)

مولانا نے دار التصنیف کا انتظام کر لیا تھا۔ شوال سے کلاس شروع کرنے کا ارادہ تھا، مگر مولوی اسحاق کے انتقال نے حوصلہ پست کر دیا۔ اب وہ اپنے میں عرصے تک کام کرنے کی ہمت نہ

پاتے تھے۔ گویا مولوی اسحاق کی موت نے ان کو زندہ در گور کر دیا تھا (۱۲۹)۔

وہ اسی غم میں مبتلا تھے کہ مولوی اسحاق کی بیوہ نے شوہر کے انتقال کے بعد ہی ان کے اور مولوی جنید (۱۳۰) کے خلاف جائیداد وغیرہ کے معاملے میں عدالتی چارہ جوئی کر دی۔ اگرچہ مقدمہ بازی اور عدالتی کارروائی ان کی طبیعت کے خلاف تھی، مگر انہوں نے ان جھگڑوں کے نپٹانے کے لیے الہ آباد میں مجبوراً قیام کیا (۱۳۱)۔

مولوی اسحاق کو کھو کر اور انہیں رو کر مولانا نے اعظم گڑھ کے قیام کا ارادہ کیا، کیوں کہ گھر کی دیکھ بھال کی ذمہ داری بھی ان کے سر پر آپڑی تھی، اس لیے کہ مولوی اسحاق کی زندگی میں انہوں نے مولانا کو ان جھگڑوں سے آزاد کر رکھا تھا۔ آخر وہ اعظم گڑھ چلے آئے، مگر علمی کاموں کے رسیا کا جی لگنا مشکل تھا، لہذا مولوی مسعود علی کو اطلاع دی کہ ساری دنیا لٹا کر سیرت کے کاموں سے غافل نہ ہوئے اور ان کو لکھا کہ اپنی کتابوں کے دو صندوق اور یورپ کی مطبوعات، جو پیارے صاحب سیکنڈ ماسٹر دارالعلوم ندوۃ العلماء کی نگرانی میں نواب علی حسن کے پاس رکھوا دی گئی تھیں، ان کو بھی اپنے ہمراہ لیتے آئیں۔ سیرت کے دفتر کے لیے کرسیاں اور میز بھی طلب کیں۔ وہ بھی اس صورت میں کہ اگر دونوں کی قیمت سے ان کا کرایہ کم ہو (۱۳۲)۔

مولانا نے اگست میں سوائے اپنے بھائی مولوی اسحاق کی وفات پر مرثیہ لکھنے کے اور کوئی قابل ذکر علمی و ادبی کام نہیں کیا۔ کرتے بھی کیسے، جب عزیز بھائی کی موت مولانا جیسے حساس آدمی کے لیے دعوت مرگ ثابت ہوئی ہو تو خاص ان دنوں میں حواس کا بحال رکھنا اور معمولات کا قائم رہنا حیرت انگیز و تعجب خیز تھا۔ یہ مرثیہ چوں کہ عقیدت سے ہٹ کر صرف محبت سے تعلق رکھتا ہے، اس لیے بڑا پر اثر ہے اور دوسروں پر بغیر اثر کیے نہیں رہتا۔ حساس دل خون کے آنسو رویا تو ذہن و دل نے بھی اس کا ساتھ دیا اور اس نے ہر شکستہ دل کو تڑپا دیا اور غیر متعلق دل کو بھی رلا دیا۔ وہ غم اور اس کا اثر اب بھی اس میں موجود ہے اور اردو شاعری جب تک زندہ ہے وہ بھی تازہ رہے گا۔

مولانا کی شاعری کے لیے کوئی خاص واقعہ محرک ہوتا تھا، جس سے متاثر ہو کر وہ گل بوٹے کھلاتے تھے، خود روتے تھے اور دوسروں کو رلاتے تھے۔ کان پور کی مسجد کے واقعے نے مولانا سے وہ مرثیہ کہلوایا جو اردو ادب کی جان ہے اور مولوی اسحاق کی موت پر بھی اردو میں ایسا پردرد مرثیہ لکھا جس سے وہ عربی مرثیہ گو شعرا کے ہمنوا اور ہم پلہ معلوم ہونے لگے۔ سید سلیمان ندوی

ان کی شاعری کے متعلق لکھتے ہیں:

"مولانا کی طبیعت بہت ہی حساس تھی اس لیے وہ فوری واقعات سے بہت جلد متاثر ہوتے تھے اور یہی تاثیر ان کی شاعری کی روح تھی" (۱۳۳)۔

خود مولانا ایک خط میں اپنی نظموں کے متعلق اس طرح لکھتے ہیں:

"میں نظم پر باوجود ہزاروں شعر کہنے کے بالکل قادر نہیں، یعنی بغیر کسی خاص فوری تاثر کے ایک حرف نہیں لکھ سکتا۔ بارہا احباب نے فرمائشیں کیں اور کئی کئی دن طبیعت پر زور ڈالا، لیکن کچھ نہ کہہ سکا" (۱۳۴)۔

مولانا کے لیے یہ چیز صرف نظموں پر ہی نہیں بلکہ پوری شاعری پر منطبق ہوتی ہے۔ مرثیے میں تو درد و غم کا تاثر ہی خاص چیز ہے اور جب دل کی کیفیت کی ترجمان زبان ہو تو درد و غم کا اثر کئی گنا زیادہ ہو جاتا ہے۔ اسی چیز کو مولانا حالی نے اپنے ایک شعر میں بیان کیا ہے:

ٹوٹے ہوئے دل سے اگر ہو گئی سازش تری
عرش اعظم کو ہلا دیتی ہے اک جنبش تری

مولانا کے مرثیہ سے جب لوگوں کے دل تڑپ گئے تو عرش اعظم کا ہل جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ درد و غم کا نقشہ کس خوبی سے کھینچا ہے:

وہ برادر کہ مرا یوسف کنعانی تھا — وہ کہ مجموعہ ہر خوبیِ انسانی تھا
وہ کہ گھر بھر کے لیے رحمتِ یزدانی تھا — قوتِ دل و دستِ شبلی نعمانی تھا
جوش اسی کا تھا جو میرے سر پر شور میں تھا
بل اسی کا یہ مرے خامہ پر زور میں تھا

ہم سے ناکاروں کی اک قوت عامل تھا وہی — مایہ عزت اجداد کا حامل تھا وہی
مسند والد مرحوم کے قابل تھا وہی — یوں تو سب اور بھی اعضا ہیں مگر دل تھا وہی
اب وہ مجموعہ اخلاق کہاں سے لاؤں
ہائے افسوس میں اسحاق کہاں سے لاؤں

جب گیا والد مرحوم نے دنیا سے سفر — گھر کا گھر تھا ہدف ناوکِ صد گونہ خطر
بن گیا آپ اکیلا وہ ہر آفت میں سپر — تیر جو آئے، گیا آپ وہ ان کی زد پر
خود گرفتار رہا تاکہ میں آزاد رہوں

اس نے غم اس لیے کھائے تھے کہ میں شاد رہوں
اس کا صدقہ تھا کہ ہر طرح سے تھا میں بے غم　　گھر کے جھگڑوں سے نہ کچھ فکر نہ کچھ رنج و الم
امن و راحت کے جو سامان تھے ہر طرح بہم　　میں تھا اور مشغلۂ نامہ و قرطاس و قلم
اس کے صدقے سے تھی میری سخن آرائی بھی
اس کا ممنون تھا مرا گوشۂ تنہائی بھی

تازہ تھا دل پہ مرے مہدیٔ مرحوم کا داغ　　کہ مرا قوت بازو تھا، مرا چشم و چراغ
اس کو جنت میں جو خالق نے دیا کنج فراغ　　میں یہ کہتا تھا کہ اب بھی تر و تازہ ہے یہ باغ
یعنی وہ آئینۂ خوبیٔ اخلاق تو ہے
اٹھ گیا مہدیٔ مرحوم تو اسحاق تو ہے

آج افسوس کہ وہ نیر تاباں بھی گیا　　میری جمعیتِ خاطر کا وہ ساماں بھی گیا
اب وہ شیرازۂ اوراق پریشاں بھی گیا　　عتبۂ والدِ مرحوم کا درباں بھی گیا
گلۂ خوبیٔ تقدیر رہا جاتا ہے
نوجواں جاتے ہیں اور پیر رہا جاتا ہے

تجھ کو اے خاکِ لحد آج اجل نے سونپی　　وہ امانت جو مرے والدِ مرحوم کی تھی
بسکہ فطرت میں ودیعت تھی نفاست طلبی　　ناز پروردۂ نعمت تھا بہ ایں سادہ دلی
دیکھنا اڑ کے غبار آئے نہ دامن پہ کہیں
گرد پڑ جائے نہ اس عارض روشن پہ کہیں

اسکے اخلاق کھٹک جاتے ہیں دل میں ہر بار　　وہ شکر ریز تبسم، وہ متانت، وہ وقار
وہ وفا کیشیٔ احباب، وہ مردانہ شعار　　وہ دل آویزیٔ خو، وہ نگۂ الفتِ یار
صحبتِ رنج بھی اک لطف سے کٹ جاتی تھی
اس کے ابرو پہ شکن آکے پلٹ جاتی تھی

حق نے کی تھی کرم و لطف سے اس کی تخمیر　　خوبیٔ خلق و تواضع میں نہ تھا اس کا نظیر
بات جو کہتا تھا ہوتی تھی وہ پتھر کی لکیر　　اس کی اک ذات تھی مجموعۂ اوصافِ کثیر
بسکہ خوش طبع تھا وہ صاحبِ تدبیر بھی تھا
سچ تو یہ ہے کہ وہ نوخیز بھی تھا پیر بھی تھا

اس کو شہرت طلبی سے کبھی کچھ کام نہ تھا وہ گرفتار کمندِ ہوس خام نہ تھا
اس کی ہر بات میں اک لطف تھا ابرام نہ تھا وہ کبھی مدعی رہبری عام نہ تھا
اس کو مطلوب کبھی گرمیِ بازار نہ تھی
اس کی جو بات تھی کردار تھی گفتار نہ تھی

اس کو معلوم جو تھا وسعتِ تعلیم کا راز اپنے دیکھے تھے جو منزل کے نشیب اور فراز
اس نے یہ کام نئی طرح کیا تھا آغاز مگر افسوس کہ تھا راہ میں رخش تگ و تاز
کوششوں کے جو نتیجے تھے اسے مل نہ سکے
ہائے وہ پھول کہ پھولے تھے مگر کھل نہ سکے

آہ بھائی ترے مرنے کے تھے یہ بھی کوئی دن وہ تیرا اوج شباب اور وہ بچے کمسن
مسندِ حلقہء احباب ہے سونی تجھ بن تو ہی تھا اب خلفِ صدر نشینان مسن
دن آئے جب کہ تجھے رہبر جمہور کہوں
چرخ اب مجھ سے یہ کہتا ہے کہ مغفور کہوں

یہ بھی اے جان برادر کوئی جانے کا ہے طور اپنے بچوں کی نہ کچھ فکر نہ تدبیر نہ غور
ابھی آنے بھی نہ پایا تھا ترے اوج کا دور کیا ہوا تجھ کو کہ تو ہو گیا، کچھ اور سے اور
چھوڑ کر بچوں کو بے صبر و سکون جاتا ہے
کوئی جاتا ہے جو دنیا سے تو یوں جاتا ہے

آہ اے مرگ کسی شے کی نہیں تجھ کو تمیز تیری نظروں میں برابر ہے گہر اور پشیز
میں نے مانا ترے نزدیک نہ تھا وہ کوئی چیز رحم کرنا تھا کہ چھوڑے ہیں کئی اس نے عزیز
لاڈلے ہیں کہ کسی اور کے بس کے بھی نہیں
اس کے بچے ابھی سات، آٹھ برس کے بھی نہیں

اے خدا شبلی، دل خستہ بایں موے سفید لے کے آیا ہے ترے درگہ عالی میں امید
مرنے والوں کو نجاتِ ابدی کی ہو نوید خوش و خرم رہے چھوٹا یہ مرا بھائی جنید
کیا لکھوں قصہء غم تاب رقم بھی تو نہیں
اب مرے خامہء پرزور میں دم بھی تو نہیں

ستمبر ۱۹۱۴ء

مولانا کا قیام اب اعظم گڑھ میں تھا۔ بقول ان کے آخر ساری دنیا لٹا کے گھر میں آیا۔ اسی زمانے میں مولوی مسعود علی نے دار العلوم سے متعلق مقدمہ شروع کر دیا تھا۔ مولانا نے مشورہ دیا کہ کہاں مقدمے کے جھگڑے میں پھنسے، اس کے نتائج اچھے نہ ہوں گے اور ان سے بہتر کاموں کی امید تھی۔ اب بھی مولانا کے خلاف ندوہ والوں کی کارروائیاں جاری تھیں۔ مولانا نے طے کر لیا تھا کہ اعظم گڑھ میں تکمیل کا درجہ کھول لیں۔ لہٰذا مولوی مسعود علی سے انہوں نے طلبہ کے متعلق دریافت کیا اور یہ بھی چاہا کہ جن طلبہ کا ارادہ ہو وہ مولانا سے براہِ راست خط و کتابت کریں۔ مولانا کو یہاں بڑا آرام تھا۔ علمی کام شروع کر دیے تھے اور اس بات کا افسوس تھا کہ یہیں رہ کر کیوں نہ کام کیا، بے کار ادھر ادھر کیوں جھگڑوں میں بسر کی۔ تفریح کے لحاظ سے باغ، رہنے کے لیے بنگلہ، مرضی کے مطابق کام کرنے والے، تعلیمی انجمن کی اور نیشنل اسکول کی دیکھ بھال، نہ بک بک، نہ جھک جھک، نہ لڑائی، نہ جھگڑا۔ دار المصنفین کا کام بھی جلد شروع کرنے کا ارادہ تھا (۱۳۷)۔

سید صاحب نے مولانا کے خط نہ آنے کی شکایت لکھی تو جواب میں لکھا کہ مولوی اسحاق کی وفات نے حواس باختہ کر دیا اس وجہ سے ممکن ہے کہ جواب نہ لکھ سکے ہوں۔ دار المصنفین کے لیے باغ اور بنگلہ وقف کر دینے کا ارادہ تھا اور چوں کہ یہ جائیداد مشترکہ تھی اس لیے اعزا کو بھی اس بات پر راضی کر رہے تھے کہ وہ بھی وقف کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ اس کی اراضی پندرہ بیگھہ خام تھی اور اسی زمین پر نیشنل اسکول (موجودہ شبلی کالج) کو منتقل کرنے کا بھی ارادہ تھا۔ درجہ تکمیل کے شائقین کو اطلاع دینے کی ہدایت کی اور دریافت کیا کہ اگر اعظم گڑھ آئیں تو قیام کے لیے مع ضروریات کے علحدہ کمرہ موجود ہے (۱۳۸)۔

پیارے صاحب سیکنڈ ماسٹر دار العلوم ندوہ مولانا سے تعلق رکھتے تھے۔ موصوف کو ندوہ سے الگ کر دیا گیا، لہٰذا مولانا ان کی موقوفی کی وجہ معلوم کرنے کی فکر میں تھے۔ مولوی مسعود علی مولانا سے ایک سرٹیفکیٹ چاہتے تھے۔ مولانا سمجھتے تھے کہ اگر سرٹیفکیٹ دیا تو وہ مخالفین کے پروپیگنڈے کے لیے ایک اور ہتھیار بن جائے گا اور پورے ملک میں اس کے ذریعے شہرت دی جائے گی کہ مقدمہ مولانا ہی لڑا رہے ہیں۔ مولانا نے قاضی تلمذ حسین ہیڈ ماسٹر دار العلوم ندوۃ

العلماء کو ایک خط میں پیارے صاحب کی تعریف کی تھی۔ قاضی صاحب بھی چوں کہ ندوہ والوں کے آلہ کار بن گئے اس لیے مولانا کے خط کے جواب میں ایک پمفلٹ چھاپ کر تمام ممبروں کے نام بھیج دیا اور پمفلٹ میں مولانا کا پورا خط شائع کیا، اس پر مولانا نے مولوی مسعود علی کی رائے طلب کی۔ مولانا نے معین الدین خورد کے متعلق دریافت کیا کہ اگر وہ نصابی تعلیم پوری نہ کریں تو ان کو اپنے یہاں بلالیں اور علم کلام، خطابت اور تقریر میں تکمیل کرادیں۔ تکمیل کے صیغے کے لیے مولانا حمید الدین فراہی نے تیس روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کیا اور مولانا نے بھی اتنا ہی دینا منظور کیا (۱۳۹)۔

ان تمام مصروفیتوں کے باوجود مولانا کا غم ہلکا نہیں ہوا تھا اور وہ صدمے کی وجہ سے اپنے کو زندہ درگور سمجھتے تھے (۱۴۰)۔ مولانا دارالمصنفین وغیرہ کے سلسلے میں مولوی مسعود علی کا اعظم گڑھ میں شدت سے انتظار کر رہے تھے۔ لیکن ان کے نہ پہنچ سکنے کی وجہ سے خیال کر رہے تھے کہ شاید وہ لکھنو یا اطراف لکھنو میں پبلک کام کرنا پسند کرتے ہوں گے، اس لیے مولانا نے زور نہ دیا۔ بہرحال پر امید رہے اور اعظم گڑھ میں ان کے مستقل قیام کے خواہاں رہے۔ ابھی وقف کے کام کی تکمیل باقاعدہ نہیں ہوئی تھی، اس لیے پوری اسکیم شروع نہیں کی تھی (۱۴۱)۔ مولانا کو بخار آنے لگا تھا، اسی حالت میں مسعود علی کو لکھا کہ اگر طبیعت ٹھیک رہی تو دارالمصنفین اور اعظم گڑھ میں عام تعلیم کی اشاعت ان دونوں کاموں کو وسیع پیمانے پر جاری کرنے کا ارادہ۔ اس حالت میں بھی بنگلہ کو درست کرا رہے تھے اور کتب خانہ کو وسعت دے رہے تھے۔ مسعود علی پر ہی چھوڑ دیا تھا کہ جو کام وہ چاہیں اپنے ذمے لے لیں۔ مولانا کے والد نے اپنے پوتے مظفر (مولانا کے سوتیلے بھتیجے) کو ایک مکان دیا تھا، وہ کرایہ پر اٹھتا تھا۔ مولانا نے اس کا کرایہ اپنے ذمے لیا اور اس مکان کو دارالتصنیف اور دارالتکمیل کے لیے رکھا۔ یہ چھاؤنی والا مکان تھا جو نیشنل اسکول اور بنگلہ سے قریب تھا۔ مولانا فکرمند تھے کہ اگر مسعود علی آئیں تو ایڈوانس دیا جائے اور اگر ایڈوانس دیا جائے تو کہاں سے؟ مفت کام لینا نہیں چاہتے تھے۔ یہ ضرور تھا کہ مصارف کم ہوتے، پھر بھی جو کچھ بھی ہوتے وہ کہاں سے دیے جاتے۔ مولانا کے پاس اس وقت بھوپال کا ماہانہ وظیفہ اور حیدرآباد کا وظیفہ تھا۔ دارالمصنفین کے لیے اس وقت تک آمدنی نہ تھی۔ بنگلہ اور باغ کی توسیع کے مصارف مولانا خود کر رہے تھے۔ اس لیے بہت مصارف ہو رہے تھے۔ تکمیل کے وظیفے کے لیے حمید الدین فراہی کے ۳۰ روپے ماہانہ اور اسی قدر ایک صاحب کی ماہانہ رقم اور تھی بس۔ ان حالات میں مولانا

کام شروع کرنا چاہتے تھے (۱۴۲) ۔ مولانا ۲۰۔ ستمبر کو بخار کی وجہ سے زیادہ پریشان تھے اور مسعود علی کے بے حد منتظر ۔ اس پریشانی میں انہوں نے لکھا کہ میں ہر چیز کا مقابلہ کر سکتا ہوں لیکن بیماری سے بد ہمت ہو جاتا ہوں (۱۴۳) ۔

مولوی حمید الدین فراہی چاہتے تھے کہ مولانا مدرسہ ، سرائے میر کی نظامت سنبھال لیں، مگر مولانا نے اپنی کمزوری اور مولوی اسحاق کے انتقال کی وجہ سے دل شکستگی کی وجہ سے انکار کیا اور کسی دوسرے شخص کے متعلق سوچنے کا مشورہ دیا، البتہ مدد کرنے پر تیار ہوئے ۔ باغ اور بنگلے کے وقف نامے لکھے جانے اور دستخط کرانے کی اطلاع اور علمی کاموں کے شروع کرنے کی اطلاع دی ۔ اپنی صحت کی خرابی سے بے اطمینانی کا اظہار کیا، لیکن اس کے باوجود ندوہ کی خراب حالت سے متفکر تھے، کیوں کہ ندوہ میں کل ۳۲۰ طالب علم رہ گئے تھے ۔ حالاں کہ اسٹرائیک کے وقت ۸۰ طلبہ تھے اور وہ سب کے سب واپس آگئے تھے ۔ اب ان کی تعداد کیوں کم ہو گئی (۱۴۴) مولانا مسعود علی کے بے حد منتظر تھے، حتی کہ ان کو لکھا کہ تم دور ہی سے باتیں کرتے ہو، اتنا نہیں ہو سکتا کہ تعزیت یا عیادت کو آؤ ۔ اس سے مولانا کی دل شکستگی اور اپنی صحت کی طرف سے مایوسی صاف ظاہر ہوتی ہے (۱۴۵) ۔

اکتوبر ۱۹۱۴ء

مولانا کا قیام اعظم گڑھ میں تھا اور دار المصنفین کے قیام کی فکر میں تھے اور اس کے لیے کتابیں جمع کر رہے تھے ۔ مولانا عبد السلام نے کسی کتاب کو منگوایا تھا تو مولانا نے لکھا کہ سات الماری کتابیں مختلف جگہوں سے آئیں مگر سب غلط ملط ہو گئیں، اس لیے کسی کتاب کا تلاش کرنا بہت دشوار ہے ۔ ویسے کتابوں کی ترتیب کا کام ہو رہا تھا، لیکن کوئی باقاعدہ کرنے والا نہ تھا ۔ مولانا نے مولوی عبد السلام کے ندوہ کی اسٹرائیک کی تائیدی مضامین کی گرفت کی اور لکھا کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ مولانا کے پاس تھے اور مولانا کے ایما پر مضامین لکھ رہے تھے ۔ مولانا نے اس کا بھی اظہار کیا کہ (مولوی عبد السلام کا وہ خط جو انہوں نے مولوی مسعود علی کے نام لکھا تھا اور اسٹرائیک پر ابھارا تھا اور مولانا کی تائید بھی بتلائی تھی ۔ اس خط کو ندوہ والے لے اڑے تھے اور مولانا کے خلاف پروپیگنڈا کرنے میں استعمال کیا تھا) ۔ مولوی عبد السلام سے اس خط کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے وقتی جوش کا نتیجہ بتلایا ۔ گویا اصلی خیالات نہ تھے اور اس وقت جو

اسٹرائیک کی موافقت میں مضامین الہلال میں لکھ رہے تھے وہ اس معذرت کو باطل کر رہے تھے. گویا وہ خط بالکل ٹھیک تھا۔ مولوی شبیر حسن، جنھوں نے مولوی عبد السلام کے مضمون کا جواب دیا تھا، انہوں نے صاف اظہار کیا کہ مولانا شبلی کی مضامین میں شمولیت ہے یا ایما پر لکھے جارہے ہیں۔ مولانا نے خیال کیا تھا کہ تردید کردی جائے مگر مولوی عبد السلام کی ناگواری کے خیال سے نہ کی۔ یہ ضد کی بات تھی اور مولانا کو ان کی ضد ناگوار تھی۔ علی گڑھ کی ایک پارٹی، باوجود سرسید اور محسن الملک کی تائید کے، ندوے کو علی گڑھ کے خلاف سمجھتی تھی اور ندوے کے خلاف محاذ قائم کر رکھا تھا۔ مولانا کی کاٹ کے لیے ندوے والوں نے انھیں سے اتحاد کیا اور آفتاب احمد خاں کو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے نمائندے کی حیثیت سے ندوے کے معائنے کے لیے بلایا تھا۔ قاضی تلمذ حسین، جو مولانا کے خلاف ہو ہی چکے تھے، وہ آفتاب احمد خاں کے رہنما ہوئے۔ مولوی نظام الدین حسن بڑے بااصول اور غیر جانب دار تھے اور ایمان داری اور دیانت داری سے ہر کام کرتے تھے۔ ان کی خصوصیات کی وجہ سے لوگ ان پر اعتماد کرتے تھے، لہٰذا ان کو بھی اسی کمیشن میں شامل کیا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مولوی نظام الدین حسن کی رپورٹ جو ندوہ کی خرابی کے متعلق بھی تھی ندوے والوں نے شائع نہ کی اور لوگوں سے چھپا رکھی۔ مولانا نے مولوی عبد السلام کو مشورہ دیا کہ اگر ابو الکلام اجازت دیں تو مضمون میں اپنا نام دینا چاہیے، گمنام لکھنا ٹھیک نہیں (۱۳۶)۔

مولانا کو سید صاحب کا بڑا انتظار تھا اور سید صاحب نے اعظم گڑھ پہنچنے کی اطلاع بھی دے دی تھی، مگر اتفاقاً بیمار ہو جانے کی وجہ سے نہ پہنچ سکے۔ اسی دوران مولوی مسعود علی اعظم گڑھ گئے، مگر زیادہ ٹھہر نہ سکے۔ مولوی مسعود علی نے اعظم گڑھ کو علمی کوششوں (دار المصنفین و تکمیل وغیرہ) کے لیے پسند کیا۔ کتابیں بھی وقتی ضرورت کے لیے مہیا ہو گئی تھیں۔ وقف نامہ زیر تحریر تھا۔ بنگلے کے بغل میں مختصر سا دار الضیوف بن گیا تھا، لہٰذا سید صاحب کو آنے کی دوبارہ دعوت دی اور لکھا کہ کچھ دن ٹھہرے کے خیال سے آئیں۔ دار الضیوف کی وجہ سے قیام میں آرام ملے گا۔ مولوی مسعود علی کے دوبارہ آنے کی بھی امید تھی۔ علی محسن جو تکمیل کے لیے آنے والے تھے ان کا امتحان کے بعد آنے کا ارادہ تھا۔ ندوہ کے معائنہ کے لیے آفتاب احمد خاں کے ماتحت ملازم آنے والے تھے۔ یہ گویا دلی کے اصلاحی جلسے کی تحریک کا جواب تھا (۱۳۷)۔

مولانا کو مولوی مسعود علی کے مجبوراً جلد واپس جانے سے افسوس تھا، اس لیے

دار المصنفین اور ندوے کے لیے آئندہ کارروائی کے متعلق بہت سی باتیں طے کرنا تھیں۔ نواب علی حسن خان، جو اصلاحی کمیٹی کے سیکریٹری تھے، ان کو مولانا نے دستور العمل کے متعلق مشورے دیے تھے اور جواب کے منتظر تھے۔ ان کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا تو بڑے فکر مند ہوئے۔ مولانا کو بھی مولوی نظام الدین حسن کی صحیح اور صاف صاف رپورٹ کی اطلاع مل گئی تھی، اور یہ بھی اطلاع ملی تھی کہ کمیشن ان کی رپورٹ کو چھپوانا نہیں بلکہ چھپانا چاہتا تھا۔ سید صاحب کی بیماری کی اطلاع مولوی مسعود علی ندوی کو بھی دی۔ اسی زمانے میں ابو الحسنات عبد الشکور بہاری ندوی، جو اس وقت طالب علم تھے، انہوں نے مولانا کو ایک قصیدہ بھیجا تھا۔ اس میں غلطیاں اور کمزوریاں تھیں، مگر ان کی طبیعت کی قابلیت کی وجہ سے ان خامیوں کے جلد دور ہونے کا امکان تھا مولوی عبد الشکور نے مسعود علی کے ذریعے اعظم گڑھ جانے کا ارادہ کیا تھا۔ مولانا نے بقرعید کے بعد بلایا۔ چوں کہ مولانا ندوے سے مایوس ہو چکے تھے، اس لیے اب ان کی پوری توجہ دار المصنفین، درجہ تکمیل اور مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے ابتدائی درجے کی طرف تھی اور ان کو امید تھی کہ یہ جامعہ اسلامیہ کے لیے گویا مصالحہ تیار ہو رہا تھا۔ سرائے میر والے چاہتے تھے کہ مولوی مسعود علی کو ناظم یا نائب ناظم بنا دیں۔ مولوی شفیع ندوی بانی مدرسہ، جو عملی ناظم تھے، ان کی خواہش تھی کہ وہ اپنے کو قصبات کا دورہ کرنے اور مالی حالت کو درست کرنے میں وقف کر دیں، کیوں کہ نظم ونسق کے لیے اپنے کو اہل نہیں سمجھتے تھے۔ کلکٹر کے ہاں وقف نامے کے لیے اسٹامپ وغیرہ کی درخواست دی گئی اور حکم بھی آگیا اس لیے وقف نامے کی تکمیل میں زیادہ کسر نہ تھی۔ سوائے اس کے پھریا (مولوی حمید الدین کا وطن) مستورات کے لیے جانا تھا، کیوں کہ وہ حصے دار تھیں۔ اس کے لیے مولانا نے بقرعید کی صبح کو جانا طے کیا تھا۔ سرائے میر کے مدرسے کو گورنمنٹ سے امداد ملنے والی تھی، چناں چہ انسپکٹر مدارس آئے اور دو ماہ بعد معائنے کے لیے آنے کا وعدہ کر گئے۔ مولوی عبد الودود ندوی ان دنوں بیکار تھے اور کار سے لگنے کے لیے مولانا سے ملنے آئے تھے۔ مولانا چاروں طرف نگرانی میں مصروف تھے۔ چناں چہ اس زمانے میں نیشنل اسکول کی تعمیر کا (۱۴۸) کام بھی شروع ہو گیا تھا اور نئے کمروں کی بنیادیں پڑ رہی تھیں۔ مولانا چاہتے تھے کہ مسعود علی بھی اب اپنے متعلق کوئی قطعی فیصلہ کر لیں۔

مسعود علی چاہتے تھے کہ مولانا آزاد اور سید صاحب دستور العمل وغیرہ کے متعلق کچھ لکھیں تو اصلاحی کمیٹی کام کرے۔ مولانا نے یہ تجویز پسند کی اور لکھا کہ کون اتنی دردِ سری مول لیتا

ہے اور کس کو اتنی فرصت ہے کہ دستور العملوں کو پڑھے اور قانونی ترمیم و تنسیخ کرے ۔ دلی کے اصلاحی جلسوں میں بھی یہی دیکھنے میں آیا تھا کہ لوگ دستور العمل سے ناواقف تھے ۔ بالکل اسی طرح لوگ کچھ نہ کریں گے ۔ لہٰذا کرنے کا کام یہ کہ نواب صاحب (علی حسن خان ۔ سیکریٹری اصلاحی کمیٹی) خود اساسی اور اصولی باتوں کو لے کر پورے طور پر قانون میں تیار ہو جائیں ۔ اس کے بعد ممبروں کو دونوں دستور العمل کے ساتھ سیکریٹری اپنی یادداشت دکھلا کر اور بھیج کر رائیں لیں تو لوگ رائیں دے دیں گے ۔ کسی ممبر کا خود اتنی محنت کر کے رائے لکھنا ممکن نہیں معلوم ہوتا ۔ علی گڑھ میں بھی اسی طرح کام ہوتا تھا ۔ کام ایک ہی کرتا تھا اور بقیہ تو صرف ساتھ دیا کرتے تھے ۔ مولانا کا خیال تھا کہ نواب صاحب خود ہی کریں ، اس لیے کہ آفتاب احمد خاں ، مولانا عبدالحق حقانی (تفسیر حقانی والے) بھی تنہا ہی کام کر رہے تھے ۔ اخبارات بھی خود سے نہ لکھیں گے ۔ زمیندار اخبار نے لکھنا چاہا مگر ناواقفیت کی وجہ سے معمولی سا لکھ کر رہ گیا ۔ نواب صاحب اگر چاہتے تو مولانا ہی ان کے لیے یہ کام کر دینے کو تیار تھے ۔ چوں کہ دستور العمل کوئی نہ پڑھتا تھا ، لہٰذا دستور العمل میں شامل تین چیزوں کو نمایاں کرنے کی ضرورت تھی ۔ ۱۔ مسودہ ندوہ کی رو سے موجودہ ارکان ہی جدید ارکان کا انتخاب کریں گے ، اور یہی چیز مخالفین اور مخالفت کو باقی رکھنے والی تھی ۔ ۲۔ دستور العمل قدیم میں ناظم ندوۃ العلماء کا تقرر جلسہ عام سالانہ پر موقوف تھا ، بعد کو یہ عام انتخاب کا حق ختم کر دیا گیا ۔ اس طرح اختیارات کو مخصوص کر دیا گیا اور برسراقتدار پارٹی کب کسی اور کو چاہنے لگی ۔ اس طرح کسی اصلاح کی امید کیسے ہو سکتی تھی ۔ ۳۔ جلسہ عام سالانہ کا کورم پچیس اشخاص کا رکھا گیا ۔ مولانا کا اس پر بھی اعتراض تھا کہ ہندوستان کی ۷ کروڑ مسلم آبادی میں سے کل پچیس آدمی کافی سمجھے گئے ۔ اسی قسم کی اصولی باتوں کی بے اصولی کو مولانا نمایاں کر کے اصلاح کے حق میں تھے (۱۴۹) ۔

مولانا کی بیماری کا سلسلہ چل رہا تھا ۔ چناں چہ ۱۳۔ اکتوبر کو دو ہفتے ہو گئے تھے ، اب تک سیرتؐ کے چھپنے کی نوبت نہ آئی تھی ۔ سیرتؐ پر یہ بھی الزام تھا کہ بخاری اور مسلم کی ضعیف روایتوں کو لیا گیا ہے ۔ جس سے مولانا نے انکار کیا اور اس کا اظہار کیا کہ کتاب کے جھمیلے میں پڑنا دردسر بن گیا اور مصنف پر استاد باؤ شاید ہی کہیں ڈالا گیا ہو ۔ کچھ تو اس سے دل شکستہ ہوئے اور کچھ مولوی اسحق کی موت نے دل بٹھا دیا ۔ لہٰذا اعظم گڑھ میں قیام کیا اور یہاں چوں کہ ہمدرد و معین تھے اس لیے مدد ملنے کی خاصی امید تھی ۔ دارالمصنفین کا باقاعدہ انتظام ہوتے ہی مولوی امین

زبیری کو ضرور ایک مرتبہ آنے کی دعوت دی۔ سیرت کا کام جاری رہنے کی بھی اطلاع دی۔ گو تاخیر طبع کی وجہ سے طبیعت کے اچھی طرح نہ لگنے کا بھی اظہار کیا۔ مولانا شبلی کے خلاف بھوپال سرکار کو ندوہ کی طرف سے عرض داشت بھیجی گئی تھی۔ اس میں ظاہر کیا گیا تھا کہ ساری خرابیاں مولانا شبلی کے زمانے کی تھیں۔ مولانا نے اس کی گرفت کی اور لکھا کہ اگر یہ صحیح مان لیا جائے تو بھی اصلاح تو ناظم یا نائب ناظم کے ہاتھ میں تھی اور مولانا ناظم یا نائب ناظم نہ تھے، معتمد تھے اور معتمد کو قانوناً اصلاح کا اختیار نہ تھا پھر بھی مولانا مجالس انتظامیہ میں خرابیوں کی طرف برابر توجہ دلاتے رہے۔ مگر کسی نے نہ سنا، صرف مولانا کی مخالفت ہی میں مصروف رہے، آخر مجبور ہو گئے اور استعفیٰ دے دیا(۱۵۰)۔

مولانا نے درجہ تکمیل میں داخل ہونے والے طلبہ کے لیے ایک نقشہ تیار کیا تھا جس کی خانہ پری مولوی مسعود علی سے کرانا چاہتے تھے، کیوں کہ مولوی مسعود علی انتظامی معاملات میں دخل رکھتے تھے اور تکمیل کے درجے کے لیے طلبہ کا انتخاب ان کے ذمے تھا۔ اس نقشے کے مطابق مندرجہ ذیل باتیں دریافت کی گئی تھیں: ۱۔ نام اور پتہ یعنی سکونت وغیرہ، ۲۔ مستطیع ہیں یا غیر مستطیع؟ ۳۔ کس فن کی تکمیل چاہتے ہیں؟ ساتھ ساتھ یہ بھی وضاحت کی گئی تھی کہ صرف تفسیر اور ادب کی تکمیل کا وقتی طور پر انتظام کیا جاسکتا ہے، ۴۔ کتنی مدت قیام کریں گے؟ ۵۔ مقصدِ زندگی کیا ہے؟ ۶۔ وضع و لباس و فرائض میں علماء کی وضع کے پابند رہ سکتے ہیں یا نہیں؟ اگرچہ یہ کوئی اہم چیز نہ تھی مگر خاص طور پر علماء کے لیے شیروانی اور بوٹ کا استعمال بھی مولانا نے پسند کیا تھا اور ڈاڑھی کا ترشوانا تو قطعاً ناگوار تھا۔ مولانا چاہتے تھے کہ تعلیم ہی نہیں بلکہ تربیت بھی ہو اور صورت و سیرت دونوں نمایاں ہوں۔ قاضی ابو یوسف کے زمانے سے علماء کا ایک خاص لباس رہا ہے اور طلبہ کا لباس بھی علماء سے ملتا جلتا تھا۔ لہذا لباس بھی خاص طرز کا ہو جس میں دوسرے لوگوں سے ممتاز نظر آئیں۔ سرائے میر کے مدرسے کے مدرس اگرچہ ناقابل تھے۔ ان کے موقوف کرنے میں منتظم صاحب پس و پیش کر رہے تھے۔ مولوی شبلی متکلم ان دنوں بے کار تھے۔ اس لیے مولانا نے ان کو درجہ تکمیل والوں کے ساتھ بلانا چاہا اور ان کے لیے تجویز کیا کہ جب تک کوئی دوسرا انتظام نہ ہو موصوف کو تکمیل میں رکھیں اور اگر وہ دفتر تصنیف سیرت میں کوئی کام کر سکیں تو اس میں منتقل کر دیے جانے کا خیال تھا(۱۵۱)۔

مولوی مسعود علی کا جواب نہ پہنچنے سے مولانا متفکر تھے۔ اعظم گڑھ سے اپنے وطن بندول

جانا چاہتے تھے، مگر خطوط کے انتظار میں نہ گئے۔ مولوی عبدالباری ندوی نے اعظم گڑھ پہنچنے کی اطلاع دی۔ ندوے کے معائنے کے لیے علی گڑھ کا مشن آنے والا تھا۔ اس کے متعلق مولانا معلوم کرنا چاہتے تھے۔ اس مشن کے متعلق مولانا کی رائے تھی کہ وہ نہ قوم کا منتخب کردہ تھا اور نہ اصلاحی کمیٹی نے اس کو تسلیم کیا تھا۔ اس لیے نواب علی حسن خاں صاحب، جو سیکریٹری اصلاح کمیٹی تھے اور مولوی نظام الدین حسن جو اصلاحی کمیٹی کے ممبر تھے، ان دونوں کو اس مشن میں شمولیت نہ کرنا چاہیے تھی۔ درجہ تکمیل میں داخلہ لینے والے لڑکوں کے متعلق دریافت کیا کہ کون کون تیار ہے بعض لڑکوں نے مولانا کو داخلے کے سلسلے میں براہِ راست خطوط بھی لکھے تھے۔ مولانا کے وقف شدہ بنگلے سے ملا ہوا سرکاری بورڈنگ تھا، جو اب بھی ہے۔ اس کو مولانا خریدنا چاہتے تھے تاکہ دارالمصنفین شاہراہ تک آجائے، مگر افسوس مولانا کی موت نے اس کی نوبت نہ آنے دی (۱۵۲)۔

مولوی مسعود علی ندوی نے مولانا کو کوئی مشورہ دیا تھا۔ اس مشورے کو مدنظر رکھتے ہوئے مولانا نے ابوالکلام آزاد اور حکیم اجمل خاں کو خطوط لکھے اور مسعود علی کو جواب دیا کہ نواب علی حسن خاں، سیکریٹری اصلاح کمیٹی، کو لکھنا چاہیے کہ مولانا کو اصلاحی کمیٹی کی منظوری کے بغیر کمیشن کا تقرر اور اس کا معائنہ منظور نہ تھا اور یہ ضابطے کی بات بھی تھی، ورنہ پھر اصلاحی کمیٹی کیوں قائم ہوتی اور ایک ہی فریق کا انتظامی معاملات میں دخل رہتا اور خرابیاں جوں کی توں باقی رہتیں۔ مولانا نے مولوی نظام الدین حسن کے متعلق لکھا کہ وہ ضابطے کے پابند ہیں وہ ذاتی طور پر شریک ہوں گے، لیکن اصلاحی کمیٹی کی طرف سے شریک نہ ہوں گے۔ اس طرف مولوی صاحب کو توجہ دلانے کی بھی ضرورت ہے۔

مولوی عبدالباری ندوی نے مولانا کے پاس جانے کو لکھا تھا، مولانا موصوف کے انتظار میں تھے، حتیٰ کہ بندول جو تین چار کوس پر واقع ہے وہاں بھی نہ جاسکے۔ اگر بندول گئے بھی تو عبدالباری صاحب کی اعظم گڑھ آمد سے قبل ہی واپس آنے کا خیال تھا۔ مولوی اسحاق کی موت سے افسردگی بدستور قائم تھی (۱۵۳)۔

اب مولانا کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی جارہی تھی۔ بظاہر کوئی بیماری نہ تھی لیکن موت کی آمد آمد نے مضمحل اور افسردہ کر رکھا تھا، دو دن اچھے رہتے تو چار دن بیمار رہتے۔ روح جسم کو چھوڑنے کے لیے تیار ہو رہی تھی، اس لیے جسم کا نظام گڑبڑ ہو گیا تھا۔ اب مولانا کو بالکل یقین ہو گیا تھا کہ زندہ نہ رہیں گے، اس لیے بڑے افسوس کے ساتھ اس کا اظہار کیا کہ سیرتؐ

پوری نہ ہو سکی، اور اس کا بھی افسوس تھا کہ ان کے نزدیک کوئی پورا نہ کر سکتا تھا۔ اگرچہ مولانا جوہر شناس تھے اور مولانا کو معلوم تھا کہ کون سیرتؐ پوری کر سکتا تھا، مگر ان لوگوں کو اپنے مشاغل سے فرصت نہ تھی۔ دوسرے یہ کہ وہاں حسرت آمیز جملوں کے جواب میں وعدے کے متمنی تھے کہ کوئی وعدہ کرلے، اور آکر قیام کرلے۔ مولانا کی نظر انتخاب تین حضرات پر پڑی؛ سید صاحب، مولوی حمید الدین فراہی، ابوالکلام آزاد۔ مگر یہ تینوں حضرات بے حد مصروف تھے۔ وقف نامہ فیس اسٹامپ کی ضرورت تھی جس کے لیے ضلع کے کلکٹر کو درخواست دے دی گئی تھی۔ مولوی حمید الدین کو متولیوں میں رکھا تھا اور دارالمصنفین کے قائم ہونے کی صورت میں اس کی ذمہ داری مولوی حمید الدین کے سر رکھنا چاہتے تھے۔ اس میں بھی مولانا کی سوجھ بوجھ کا بڑا دخل تھا۔ ایک تو مولانا کے یہ عزیز تھے اور اعزا کی مخالفت سے باآسانی نپٹ سکتے تھے، دوسرے عربی اور انگریزی دونوں میں قابل تھے، تیسرے اعزا کے علاوہ وہ ہم وطنوں میں بھی مقبول تھے۔ مولوی اسحاق کے انتقال کے بعد ہی مرحوم کی بیوہ نے مقدمہ دائر کر دیا تھا۔ اس کا معاملہ بھی دس ہزار پر طے ہو گیا۔ دستاویز لکھ دی گئی۔ رجسٹری جلد ہونے والی تھی۔ سید سلیمان ندوی ۱۶۔ اکتوبر ۱۹۱۴ء کو مولانا کو دیکھنے اور ملنے کے لیے پہنچنے والے تھے اور دوسرے تیسرے دن تکمیل کے لیے چند طلبہ پہنچنے والے تھے، مگر بیماری نے افسردگی اتنی بڑھا دی تھی کہ مایوسی تھی اور اندیشہ تھا کہ اس کے خود کے نہ ہونے سے سارے منصوبے خاک میں مل جائیں گے۔ دارالمصنفین کے لیے مولانا کو ان کے ماموں کا کتب خانہ مل گیا تھا۔ مگر قلمی کتابیں سب برباد ہو گئیں اور کچھ مطبوعہ بھی سو کتابیں جلد بندھوانے کے قابل تھیں، جن کی مولانا کو فکر تھی (۱۵۴)۔

مولوی مسعود علی ندوی نے اطلاع دی کہ تکمیل کے طلبہ کا خیال ہے کہ بقرہ عید کے بعد آئیں تو مولانا نے اس تجویز کی تائید کی۔ مولانا نے ارادہ کیا کہ بقرہ عید اپنے وطن بندول میں کریں طلبہ کے متعلق پھر لکھا کہ درجہ تکمیل کے لیے انہیں کا انتخاب کیا جائے جو صرف و نحو پر اچھی طرح قادر ہوں اور عربی کی پیچیدہ عبارت بالکل صحیح پڑھنے پر قادر ہوں۔ کتب خانہ دارالعلوم ندوہ کی کچھ کتابیں مولانا کے ذمے تھیں۔ مولانا کسی معتبر آدمی کی تلاش میں تھے کہ اس کے بدست کتابیں واپس کر دیں۔ مولانا کے ذمے جو کتابیں تھیں ان میں فتح الباری کی ایک جلد بھی تھی۔ نواب علی حسن خان کو مولانا نے اصلاحی کمیٹی سے متعلق خط لکھا، مگر جواب نہ آیا، جس سے فکر مند تھے۔ خط نہ پہنچنے کا احتمال تھا۔ مولوی فضل الرحمان صاحب کتابیں دینا چاہتے تھے۔ لہٰذا مولانا

پوری نہ ہو سکی، اور اس کا بھی افسوس تھا کہ ان کے نزدیک کوئی پورا نہ کر سکتا تھا۔ اگرچہ مولانا جوہر شناس تھے اور مولانا کو معلوم تھا کہ کون سیرت پوری کر سکتا تھا، مگر ان لوگوں کو اپنے مشاغل سے فرصت نہ تھی۔ دوسرے یہ کہ وہاں حسرت آمیز جملوں کے جواب میں وعدے کے متمنی تھے کہ کوئی وعدہ کر لے، اور آکر قیام کر لے۔ مولانا کی نظر انتخاب تین حضرات پر پڑی: سید صاحب، مولوی حمید الدین فراہی، ابو الکلام آزاد۔ مگر یہ تینوں حضرات بے حد معروف تھے۔ وقف نامہ فیس اسٹامپ کی ضرورت تھی جس کے لیے ضلع کے کلکٹر کو درخواست دے دی گئی تھی۔ مولوی حمید الدین کو متولیوں میں رکھا تھا اور دار المصنفین کے قائم ہونے کی صورت میں اس کی ذمہ داری مولوی حمید الدین کے سر رکھنا چاہتے تھے۔ اس میں بھی مولانا کی سوجھ بوجھ کا بڑا دخل تھا۔ ایک تو مولانا کے یہ عزیز تھے اور اعزا کی مخالفت سے باآسانی نپٹ سکتے تھے، دوسرے عربی اور انگریزی دونوں میں قابل تھے، تیسرے اعزا کے علاوہ وہ ہم وطنوں میں بھی مقبول تھے۔ مولوی اسحاق کے انتقال کے بعد ہی مرحوم کی بیوہ نے مقدمہ دائر کر دیا تھا۔ اس کا معاملہ بھی دس ہزار پر طے ہو گیا۔ دستاویز لکھ دی گئی۔ رجسٹری جلد ہونے والی تھی۔ سید سلیمان ندوی ۱۶۔ اکتوبر ۱۹۱۴ء کو مولانا کو دیکھنے اور ملنے کے لیے پہنچنے والے تھے اور دوسرے تیسرے دن تکمیل کے لیے چند طلبہ پہنچنے والے تھے، مگر بیماری نے افسردگی اتنی بڑھا دی تھی کہ مایوسی تھی اور اندیشہ تھا کہ اس کے خود کے نہ ہونے سے سارے منصوبے خاک میں مل جائیں گے۔ دار المصنفین کے لیے مولانا کو ان کے ماموں کا کتب خانہ مل گیا تھا۔ مگر قلمی کتابیں سب برباد ہو گئیں اور کچھ مطبوعہ بھی سو کتابیں جلد بندھوانے کے قابل تھیں، جن کی مولانا کو فکر تھی (۱۵۴)۔

مولوی مسعود علی ندوی نے اطلاع دی کہ تکمیل کے طلبہ کا خیال ہے کہ بقرہ عید کے بعد آئیں تو مولانا نے اس تجویز کی تائید کی۔ مولانا نے ارادہ کیا کہ بقرہ عید اپنے وطن بندول میں کریں طلبہ کے متعلق پھر لکھا کہ درجہ تکمیل کے لیے انہیں کا انتخاب کیا جائے جو صرف و نحو پر اچھی طرح قادر ہوں اور عربی کی پیچیدہ عبارت بالکل صحیح پڑھنے پر قادر ہوں۔ کتب خانہ دار العلوم ندوہ کی کچھ کتابیں مولانا کے ذمے تھیں۔ مولانا کسی معتبر آدمی کی تلاش میں تھے کہ اس کے بدست کتابیں واپس کر دیں۔ مولانا کے ذمے جو کتابیں تھیں ان میں فتح الباری کی ایک جلد بھی تھی۔ نواب علی حسن خان کو مولانا نے اصلاحی کمیٹی سے متعلق خط لکھا، مگر جواب نہ آیا، جس سے فکر مند تھے۔ خط نہ پہنچنے کا احتمال تھا۔ مولوی فضل الرحمان صاحب کتابیں دینا چاہتے تھے۔ لہذا مولانا

نے عام فہرست طلب کی۔ ممکن ہے قیمتاً دینے پر تیار ہوں۔ قاری عبدالولی نے چند ماہ قبل اپنا پریس کھولا تھا۔ مولانا نے مولوی (اسحاق) کا مرثیہ انھیں کے مطبع میں دیا تھا، مگر ابھی تک چھپا نہ تھا۔ مولوی مسعود علی کو تاکید کی کہ جلد چھپوا دیں (۱۵۵)۔

سید صاحب نے مولانا کو اپنی آمد کی اطلاع دی تھی، مگر طبیعت کی خرابی کی وجہ سے نکل نہ سکے۔ مولانا چوں کہ سفر آخرت کی تیاری کر رہے تھے لہٰذا بہت سی باتیں کرنا تھیں۔ اسکیمیں بتانا تھیں۔ سید صاحب نہیں پہنچے تو مولانا نے لکھا کہ اگر آنا ہے تو آجائیں اور اگر ارادہ نہیں تو ایک مایوسی میں دو راحتیں ہیں انتظار نہیں رہتا (۱۵۶)۔

مولانا چاہتے تھے کہ سب لوگ اکٹھا ہوں تو کچھ طے ہوتا اور مل جل کر کوئی ٹھوس کام کیا جاتا۔ مگر اس کی نوبت ہی نہیں آرہی تھی اور وقت موعود قریب آتا جارہا تھا، جس کا مولانا کو شدید احساس تھا۔ دنیا طلبی سے مولانا بے تعلق ہو چکے تھے، مگر عزیزوں کی بے تعلقی اور دنیا میں ترقی نہ کرنے کا احساس مولانا کو گراں گزرتا تھا۔ سید صاحب پونا کالج کی اسسٹنٹ پروفیسری سے مطمئن نہ تھے اور مولانا کا ایما پاتے ہی آنے پر تیار تھے لیکن مولانا بعض مصلحتوں کی بنا پر انہیں روک رہے تھے۔ ایک سبب یہ ہو سکتا ہے کہ ابھی قطعی طور پر کام متعین نہیں ہوا تھا اور نہ اخراجات کے لیے باقاعدہ سبیل نکلی تھی۔

مرا گر تو بگذاری اے نفس طامع — بسے بادشاہی کنم در گدائی (۱۵۷)

نومبر ۱۹۱۴ء

مولوی مسعود علی ندوی کو مولانا درجہ تکمیل کے متعلق مفصل اسکیم لکھ چکے تھے۔ اب وہ طلبہ کے بے حد منتظر تھے اور چاہتے تھے کہ اس اسکیم کا عملی طور پر نفاذ ہو جائے اور اگر کچھ دشواریاں ہوں تو ان کا تدارک کیا جائے۔ شبلی منکلم کے لیے مولانا اکتوبر ہی میں اجازت دے چکے تھے۔ مولوی مسعود علی کے متعلق خود ان ہی پر فیصلہ چھوڑا تھا کہ وہ اپنے متعلق کیا طے کرتے ہیں۔ ویسے مولانا کی رائے تھی کہ لکھنو سے پورے طور پر قطع تعلق مناسب نہیں ورنہ مولانا کا خیال تھا کہ سرائے میر کے مدرسۃ الاصلاح کا نظام مولوی مسعود علی کو دے دیا جاتا۔ اگر لکھنو کے انتظامات کا مولوی صاحب کوئی بندوبست کر سکتے تو پھر ان کے لیے سرائے میر نہایت مناسب جگہ تھی اور پھر مولانا وقتاً فوقتاً وہاں جاتے اور ضروری مشورہ دیتے اور نگرانی کرتے تاکہ

مولوی صاحب موصوف دل برداشتہ و دل شکستہ نہ ہوتے۔ اس درمیان میں دارالعلوم ندوۃ العلما. کا علی گڑھ کے حضرات نے معائنہ کر لیا تھا اور چوں کہ ندوہ کے ناظم کی ایما سے وہ لوگ آئے تھے اس لیے ان لوگوں کی رپورٹ ندوہ والوں کی موافقت میں تھی۔ مگر مولوی نظام الدین کی رپورٹ حقائق پر مبنی تھی اور انہوں نے نقائص کی طرف نہ صرف اشارہ کیا تھا بلکہ گرفت کی تھی۔ مولانا کو یہ خبریں ملتی رہتی تھیں، چناں چہ ان کو معتبر ذریعے سے معلوم ہوا کہ مولوی نظام الدین کی رپورٹ جو ندوے والوں کے خلاف پڑتی تھی اس کو ندوہ والے بھوپال سرکار کی خدمت میں بھیجنا نہ چاہتے تھے (۱۵۸)۔

نواب علی حسن خاں صاحب نے مولانا کو اطلاع دی کہ دستور العمل چھپوا لیا گیا۔ چوں کہ یہ دستور العمل مولانا کو بھیجا نہ گیا تھا، اس لیے ان کو تردد رہا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ صرف دستور العمل ہی چھپا ہو اس میں تمہید وغیرہ کچھ نہ ہو۔ بغیر تمہید اور صحیح عبارت کے مقصد پورا نہ ہونے کا احتمال تھا۔ مولانا یہ بھی چاہتے تھے کہ دستور العمل خاصی تعداد میں چھاپا جائے اور تمام اہل الرائے کو بھیج کر ان سے رائیں طلب کی جائیں۔ اس طرح اہل الرائے کو موافق اور ہم نوا بنانے کے بعد سالانہ جلسے کا بندوبست کیا جائے، تاکہ اہل الرائے حضرات اپنی صحیح رائے دیں اور کسی صحیح نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کریں۔ مولانا نے اپنے متعلق وضاحت کی کہ وہ تو دارالمصنفین اور دارالتکمیل کے کاموں میں مصروف ہو گئے تھے۔ اس کے لیے وسیع قطع لے لیا تھا اور ساری کوشش، قوت اور توجہ اس پر صرف کر رہے تھے۔ اس کام میں چوں کہ کوئی مخالفت نہ تھی اس لیے یکسوئی حاصل تھی۔ عملی کام شروع کر کے دو تین مہینے کے بعد اس کو ایسا بنا دینے کا ارادہ تھا کہ لوگ دیکھ کر مطمئن ہوں اور نواب صاحب کو بھی بلانے اور اس کو دکھلانے کا ارادہ تھا۔ دارالمصنفین کے لیے اس وقت تک سات الماری کتابیں جمع ہو گئی تھیں۔ نواب صاحب سے بھی دریافت کیا کہ اگر کچھ بچی کچھی (۱۵۹) زائد کتابیں موجود ہوں تو دارالمصنفین کو عنایت کریں۔

مولانا کو جتنی شدت سے دارالتکمیل کے طلبہ کا انتظار تھا، طلبہ کے پہنچنے میں اتنی ہی دیر ہو رہی تھی۔ مولانا اپنے وطن بندول گئے، مگر عین بقرہ عید کے روز واپس آگئے، کیوں کہ طلبہ کے پہنچنے کا کسی روز بھی امکان تھا۔ مولانا نے دو مکان طلبہ کے قیام کے لیے خالی کرا رکھے تھے۔ ان کا کرایہ بلاوجہ چڑھ رہا تھا اور مولانا کو برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔ شبلی متعلم عرصے سے بے کار تھے اور ذرا سے ایما پر جلد جانا چاہتے تھے یا ان کو عین وقت پر ایسا ضروری کام نکل آیا کہ پندرہ نومبر سے

پہلے وہ پہنچ ہی نہ سکتے۔ مولانا اس بات سے بہت ناراض تھے اور اس چیز سے بھی تنگ تھے کہ لوگ دریافت کرتے تھے کہ انتظامات تو سارے ہیں، مگر جن کے لیے (طلبہ) ہیں وہ کب آئیں گے (۱۶۰) (۱۶۱)۔

اس سے مولانا کی جھلاہٹ میں اور اضافہ ہوتا تھا۔ گنجائش چوں کہ خاصی تھی اس لیے مستطیع طلبہ کی تعداد مولانا نے مقرر نہیں فرمائی اور یہ چاہا کہ جتنے بھی آجائیں۔ اور غیر مستطیع کی تعداد محدود رکھی۔ کیوں کہ زیادہ وظائف کا بندوبست نہیں ہو سکا تھا۔ گو آئندہ امید تھی۔ علی محسن کے لیے بھی مولانا نے دریافت کیا کہ وہ کیا کر رہے تھے۔ در پردہ ان کی طرف بھی اشارہ تھا کہ وہ بھی آجائیں۔ مولوی مسعود علی کا خیال تھا کہ وہ پہلے ۶ ماہ سرائے میر میں رہ کر کام کی نوعیت، اپنی رغبت اور صلاحیت کا اندازہ لگائیں پھر کوئی قطعی فیصلہ کریں۔ مولانا نے اس تجویز کو پسند کیا اور سرائے میری میں رہنے کو ترجیح دی اور ساتھ ساتھ یہ بھی لکھا کہ اختیارات جس قدر وہ چاہیں مل سکتے تھے۔ اس طرح ہر بات کا تجربہ ہو جاتا۔ مولانا تیس سال کے غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اصلی ترقی کا مانع گراں زندگی ہے۔ اگر کم سے کم اپنے اوپر خرچ کیا جاتا اور بالکل سادہ زندگی اختیار کی جاتی تو بہت سی خرابیاں اس سے دور ہو سکتی تھیں۔ ہندو کی حالت مسلمان سے بہتر ہونے کا اصل سبب یہی تھا کیوں کہ ان کا بڑے سے بڑا آدمی بھی اپنی خورد و نوش اور پوشش پر بہت کم خرچ کرتا تھا اور کم سے کم میں گزارا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ مولانا کا صرف یہ خیال ہی نہ تھا بلکہ سادہ زندگی بسر کرنا انھوں نے شروع بھی کر دیا تھا۔ چناں چہ اپنے مصارف برابر گھٹاتے چلے جا رہے تھے۔ نومبر شروع ہو گیا تھا مگر جاڑوں کے لیے کوئی انتظام نہ کیا تھا۔ پرانی اچکن میں پورا سال گزارا دینے کا ارادہ تھا۔ مولانا اس سے بھی واقف تھے کہ بدحیثیت لوگوں کی وقعت نہیں کرتے۔ لیکن یہ ان لوگوں کے لیے تھا جن کو چند روز کا تجربہ ہو، مولانا تو خاصی مدت کے تجربے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے۔ برسوں لوگوں کے ساتھ رہ کر ایک حیثیت قائم ہو جاتی ہے اور جب ایک حیثیت قائم ہو جائے تو پھر ظاہری باتیں اس پر اثر انداز نہیں ہوتیں اور مولانا تو قدیم و جدید گروہ میں اپنا مقام پیدا کر چکے تھے۔ اسی تجربے سے دار التکمیل والوں کو فائدہ اٹھانے کا موقع فراہم کرنا چاہتے تھے تاکہ وہ لوگ بہت کم خرچ میں زندگی بسر کریں اور تمام ظاہری باتوں سے بے پروا ہو کر گراں قدر علمی خدمت انجام دے سکیں (۱۶۲)۔

مولانا اب اپنی زندگی سے بالکل مایوس تھے اس لیے چاہتے تھے کہ مولانا ابوالکلام آزاد

آجاتے تو سیرت نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اسکیم کا کچھ انتظام ہو جاتا، ورنہ سب کیے دھرے پر پانی پھرنے کا اندیشہ تھا اور سید سلیمان ندوی کے بھی منتظر تھے کیوں کہ ان کو طریقہ کار بتانا تھا مولانا کی یہ مایوسی حق بجانب تھی اس لیے کہ ۴۔ نومبر سے خونیں اسہال شروع ہو چکے تھے، جنھوں نے بے حد کمزور کر دیا تھا (۱۶۳) ۔ اس سلسلے میں مولانا شیروانی لکھتے ہیں: "اسہال خونیں بہانہ، موت بنے ۔ پندرہ روز علالت کا سلسلہ رہا ۔ ۱۹۔ نومبر (۱۶۴) کو میرے مکرم دوست اور علامہ مرحوم کے عزیز شاگرد مولوی سید سلیمان صاحب نے مجھ کو لکھا: "آپ کا حبیب صمیم (مولانا شبلی) اس وقت موت و حیات کی کشمکش میں ہے ۔ قبض سے آنتوں میں زخم ہے ۔ دس روز سے غذا نہیں ۔ حالت مایوس کن ہے (۱۶۵)" ۔ بہر حال مولانا ۱۸۔ نومبر ۱۹۱۴ء کو اپنی منزل پر پہنچ گئے ۔ اپنے علمی کاموں سے تھک ہی چکے تھے، آرام کی ضرورت تھی ۔ لہٰذا ابدی نیند سو گئے اور لیٹے بھی دار المصنفین میں تاکہ ان کی تربت اسکیموں کو عملی جامہ پہنانے پر ہمیشہ اکساتی رہے اور توجہ دلاتی رہے ۔ رہے نام اللہ کا ۔

نوٹ: ابو الکلام آزاد کے نام کلکتہ تار گیا تھا ۔ آزاد شملہ گئے ہوئے تھے ۔ مولوی عبد السلام ندوی نے اس تار کو لفافے میں رکھ کر آزاد کو شملہ بھیج دیا ۔ اس بات پر مولوی عبد السلام مرحوم کو ان کے ساتھی اکثر چھیڑتے تھے کہ انھوں نے تار کو خط بنا دیا ۔

مولوی عبد الحکیم صاحب بندولی مولانا کے عزیزوں میں تھے ۔ ان کے انتقال کے وقت تقریباً بیس سال کے تھے ۔ وہ سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مسودات کو صاف کیا کرتے تھے اور قیام ان کا اعظم گڑھ کے رئیس سلطان صاحب (۱۶۶) کے یہاں تھا، جن کا مکان شبلی منزل سے فاصلے پر ہے ۔ موصوف کا بیان ہے کہ مولانا مرحوم نے ان کو ۱۵۔ نومبر ۱۹۱۴ء کو فجر سے اندازاً تین گھنٹے قبل نوکر کے ذریعے بلوایا ۔ کڑاکے کی سردی میں اٹھ کر گئے تو فرمایا کہ حالت بہت خراب ہو چکی ہے اور زندگی کی کوئی امید نہیں ۔ دو کام کرنا ہیں ایک یہ کہ گز ڈیڑھ گز موٹا کپڑا لے آئیں اور دوسرا کام یہ ہے کہ تار کی عبارت لکھیں اور ایک ہی عبارت کے تین تار دیں ۔ ایک ابو الکلام آزاد کو، دوسرا مولوی حمید الدین فراہی کو، تیسرا سید سلیمان ندوی کو ۔ چناں چہ انھوں نے تار کی عبارت لکھی اور صبح ہوتے ہی تینوں تار بھیج دیے اور جب کپڑا لائے تو اپنے سامنے اس میں سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مسودہ بندھوایا اور ایک صندوق میں رکھوا کر اپنے سامنے قفل ڈالوایا اور چابی مولوی عبد الحکیم بندولی کو دی اور کہا یہ چابی سوائے تین اشخاص یعنی مولانا ابو الکلام آزاد

مولوی حمید الدین فراہی اور سید سلیمان ندوی کے کسی کو نہ دیں۔ اگر بیگم بھوپال بھی طلب کریں تو بھی نہیں (۱۶۷)۔ مولانا کو اندیشہ تھا کہ کہیں مسودہ نااہلوں کے ہاتھوں میں نہ پڑ جائے۔ ممکن ہے ذکر شبلی کے لکھے جانے کا ایک پس منظر یہ بھی ہو۔

وہ زمانہ گیا وہ دن گئے وہ رات گئی　　　پڑھیے اب فاتحہ، خیر کہ ہر بات گئی
قصہ کوتاہ بزرگوں کی کرامات گئی　　　شوکت قوم گئی شان کمالات گئی

دولتِ علم بچی بھی تھی جو کچھ لے دے کر
چل دیے شبلی و حالی سوے جنت لے کر

(۱۶۸)

مولانا کا علی گڑھ کالج میں جنوری ۱۸۸۳ء میں تقرر ہوا اور یکم فروری ۱۸۸۳ء سے باقاعدہ پڑھانا شروع کیا (۱۶۹)۔ شروع میں مولانا شہر میں رہے، بعد کو سرسید کے بنگلے کے احاطے میں چھوٹے سے بنگلے میں منتقل ہو گئے۔ بعد کو یہ چھوٹا سا بنگلہ مولانا شبلی کی بنگلے کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ یہاں مولانا کو سرسید کے کتب خانے کی کمیاب کتابوں کے مطالعے کا موقع ملا۔ نئے جذبات اور خیالات، قدیم و جدید کی آمیزش نے مولانا کے خیالات میں وسعت پیدا کر دی۔ ایسے تو مولانا نے جدید طرز پر لکھی ہوئی تاریخ کی کتاب سنین اسلام از ڈاکٹر لائٹنر (Dr. G. W. Laitner) پڑھی تھی، مگر تاریخی معلومات سے دلچسپی کے دو سبب ہوئے۔ ایک تو سرسید سے کلامی مسائل پر تبادلہ، خیال نے اس عہد کی تاریخ تک پہنچایا، جس زمانے میں کہ علم کلام پیدا ہوا تھا یعنی خلفائے عباسیہ کا عہد، دوسرے سرسید کا کتب خانہ بھی اس ذوق کو ابھارنے میں معاون ثابت ہوا کہ جس میں عربی تاریخ و جغرافیہ کی نادر کتابیں موجود تھیں۔ چناں چہ اڈیٹر زمانہ کان پور کے جواب میں خود مولانا ایک خط میں لکھتے ہیں:

"تصانیف کا شوق ابتداً مجھ کو ان تاریخی تصنیفات کے دیکھنے سے ہوا تھا جو یورپ میں چھپی ہیں اور ایک موقع پر بہت سی یکجا ملی تھیں جن کو میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا" (۱۷۰)۔

اور یہ اکٹھی کتابیں سرسید کے کتب خانے میں ملی تھیں۔ چناں چہ مولوی سمیع کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"سید صاحب کے پاس تاریخ و جغرافیہ، عربی کی چند ایسی کتابیں ہیں،

جن کو حقیقت میں کیا بڑے بڑے لوگ نہیں جانتے ہوں گے، مگر یہ سب کتابیں جرمنی میں طبع ہوئی ہیں، مصر کے لوگوں کو بھی نصیب نہیں ہوئیں۔ گبن صاحب کی تاریخ جس کا ترجمہ سید صاحب نے چھ سو روپیہ کے صرف سے کرایا ہے، میرے مطالعے میں ہے" (۱۷۱)۔

ان کتابوں کے مطالعے سے مولانا کو یورپ کے طرز پر تاریخی واقعات کی ترتیب اور نتائج کے استنباط سے آگاہی ہوئی۔ مولانا نے ہمیں مسٹر پامر کی حیات ہارون الرشید پڑھی۔ علمی طور پر مولانا یورپ کی علمی تحقیقات سے کتابوں کے ذریعے واقف ہوئے اور عملی طور پر پروفیسر آرنلڈ نے جدید تحقیق کے انداز اور اصول سے واقف کرایا۔ چناں چہ مولانا حبیب الرحمن شروانی لکھتے ہیں:

"پروفیسر آرنلڈ نے علامہ شبلی کو جدید اصول سے آگاہ کیا۔ یہ بتایا کہ جدید علمی مجلس کے کیا ساز و سامان ہیں، قدیم علوم پر کیا کیا اعتراض اور حملے ہیں۔ علامہ شبلی کی حذاقت اور قوتِ دماغی یہ تھی کہ وہ جدید اصول کے طمطراق سے مرعوب نہیں ہوئے، بلکہ ان پر اطمینان سے غور کیا۔ جو اصول عمدہ تھے ان کو اخذ کیا (نہ صرف اخذ کیا بلکہ ان کو اپنی زندگی کا رہبر بنایا)، نمائشی چیزوں کو رد کر دیا" (۱۷۲)۔

حالات اور خیالات کی تبدیلی نے مولانا کی تصنیف و تالیف کا دوسرا دور ۱۸۸۳ء سے ۱۸۹۸ء تک قائم کیا۔ گویا علی گڑھ کا قیام مولانا کا تصانیف اور شاعری کے لحاظ سے دورِ دوم ہے۔

مولانا تاریخ کے مطالعے سے اس قابل ہو گئے تھے کہ تاریخ پر بھی قلم اٹھائیں، لیکن قومی ہمدردی جو ان کو علی گڑھ میں پیدا ہو گئی تھی اس کا تقاضا تھا کہ وہ تاریخ اسلام کو ہاتھ لگائیں۔ مگر یہ کام بہت وسیع تھا اس لیے تاریخ بنی العباس لکھنا شروع کی اور خلیفہ معتصم باللہ کے حالات لکھے تھے کہ اس کو بھی مختصر کر کے ہر خاندان کے ایک ہیرو پر لکھنا پسند کیا اور اس میں بھی المامون کو پہلی منزل قرار دیا۔ المامون کی تمہید میں اس طرح لکھتے ہیں:

"ایک مدت سے میرا ارادہ تھا کہ اسلامی حکومتوں کی ایک نہایت مفصل اور بسیط تاریخ لکھوں، لیکن مشکل یہ تھی کہ نہ میں تمام خاندانوں کا استقصاء کر سکتا تھا نہ کسی خاص سلسلے کے انتخاب کی مجھ کو کوئی وجہ مرجح ملتی

تھی۔ آخر میں، میں نے یہ فیصلہ کیا کہ رائل ہیروز آف اسلام یعنی (نامور فرماں روایان اسلام) کا ایک سلسلہ لکھوں جس کا طریقہ یہ ہو کہ اسلام میں آج تک خلافت و سلطنت کے جتنے سلسلے قائم ہوئے ان میں سے صرف وہ نامور انتخاب کر لیے جائیں جو اپنے طبقے میں عظمت و حکومت کے اعتبار سے اپنا ہمعصر نہ رکھتے تھے اور ان کے حالات اس ترتیب و جامعیت سے لکھے جائیں کہ تاریخ کے ساتھ بھی موجود ہو۔ جن خاندانوں کو میں نے اس غرض کے لیے انتخاب کیا ہے ان کے نام یہ ہیں:

خاندان یا سلسلہ: ہیرو یعنی وہ نامور جو اپنے خاندان یا سلسلے میں سب سے ممتاز ہو۔

۱۔	خلفائے راشدین	: حضرت عمر رضی اللہ عنہ، خلیفۂ دوم۔
۲۔	بنو امیہ	: ولید بن عبد الملک۔
۳۔	عباسیہ	: مامون الرشید۔
۴۔	بنو امیہ اندلس	: عبد الرحمن ناصر۔
۵۔	ہمدان	: سیف الدولہ۔
۶۔	خلفائے سلجوقیہ (۱۷۳)	: ملک شاہ۔
۷۔	نوریہ	: نور الدین محمود زنگی۔
۸۔	ایوبیہ	: سلطان صلاح الدین، فاتح بیت المقدس۔
۹۔	موحدین اندلس	: یعقوب بن یوسف۔
۱۰۔	ترکان روم	: سلیمان اعظم۔

ان خاندانوں کے سوا اور بھی بہت سے اسلامی خاندان ہیں جو تاج و تخت کے مالک ہوئے مگر میں نے ان کو دانستہ چھوڑ دیا ہے (۱۷۴)۔

اسی میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

"یہ حصہ جو میں قوم کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ مامون الرشید عباسی کی تاریخ ہے اور اسی مناسبت سے اس کا نام المامون ہے۔ اس بات کا مجھ کو افسوس ہے کہ چند مجبوریوں کی وجہ سے اس سلسلے میں ترتیب کی پابندی نہ کر سکا (۱۷۵) اور خلفائے راشدین اور بنو امیہ کو چھوڑ کر پہلے اس خاندان کو لیا جو

ترتیباً تیسرے نمبر پر تھا۔ آئندہ بھی شاید میں ترتیب کی پابندی نہ کر سکوں،
لیکن یہ قطعی ارادہ ہے کہ اگر زمانے نے مساعدت اور عمر نے وفا کی تو اس
سلسلے کے کل حصے جس طرح ہو سکے گا پورے کروں گا" (۱۷۶)۔

تمہید کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نے تاریخ کی کتابیں پڑھ کر نقشہ تو ایسا ہی جمایا تھا مگر کلامی مسائل سے دل چسپی اور مواد کی فراہمی نے اس میں رنگ دورِ عباسیہ کا بھرا اور المامون کا مرقع تیار کیا اور آئندہ بھی ترتیب قائم نہ رکھ سکنے کی مجبوری میں مولانا کی اس زمانے کی دل چسپی، مواد کی فراہمی اور سرسید کی حکمائے اسلام سے دل چسپی اور مولانا کا سرسید کی دل چسپی کا احترام، سرسید کے خیال کے مطابق دونوں فرقوں میں اختلافات کے پیدا ہونے کا اندیشہ اور کالج کو نقصان پہنچنے کا احتمال، یہ سب ساری باتیں مانع رہیں۔ دوسرے دور میں مولانا کی المامون پہلی کتاب ہے اس میں انھوں نے یورپ کے سوانحی اصول برتنے کی کوشش کی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ پورا عمل نہ کر سکے پھر بھی انھوں نے سچائی اور صداقت، بشری خط و خال فطرت انسانی کی جھلک، ہیرو کے محاسن و معائب اور سوانح عمری کا مقصد پیش کیا ہے۔ لیکن ان کے لیے مشکل یہ تھی کہ انھوں نے ہیرو کا انتخاب کیا تھا اور ہیرو بشری کمزوریوں سے خالی نہ تھا۔ اس کی بشری کمزوریوں کا اظہار اس کو ناموری سے گرا سکتا تھا اور اظہار نہ کرنا سچائی اور صداقت سے، اس لیے مولانا نے واقعات کو چھپانے کی کوشش نہیں کی جس سے سچائی اور صداقت باقی رہی، لیکن اندازِ بیان ایسا اختیار کیا کہ حادثات پر اچٹی ہوئی نظر پڑے اور حادثے کا تاثر بھی قائم ہو۔ اس کے لیے ان کو اس موقع پر سوانح نگار سے مورخ بن جانا پڑا ہے اور سیاسی ماحول کو پیش کر کے ہیرو کی سفاکی نے نگاہیں ہٹا دی ہیں۔ امین الرشید کا قتل، طاہر سے زیادتی اور امام رضا سے مامون الرشید کا سلوک، یہ باتیں اس انداز میں پیش کی گئی ہیں کہ قاری پر پورا اثر کرتی ہیں اور مامون الرشید کے بشری خط و خال، فطرتِ انسانی اور معائب کو ظاہر کرتی ہیں۔ لیکن ان موقعوں پر سیاسی ماحول کی عکاسی ایسے رنگ میں کی گئی ہے کہ سوانحی رنگ مدہم پڑ جاتا ہے اور تاریخی رنگ ابھر آتا ہے اور قاری کی نگاہ سے اس وقت مامون الرشید کی سیرت کی خامی کو مصنف اپنی قادر الکلامی سے چھپا گیا۔

اسی طرح مامون الرشید کی رندانہ محفلوں میں مصنف قاری کو لے کر اس طرح سے داخل ہوتا ہے کہ وہاں کی رندی اور سرمستی کو دیکھ کر وہ مدہوش ہو جاتا ہے اور وہ کیفیات اس کو دیر تک تنقید سے باز رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

"حالی کو اشخاص عزیز تھے مگر شبلی کو ہیروز۔ یعنی ابطال اور نامور ان سے ادھر شاذ نظر بھی اٹھا کر نہ دیکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شبلی عموماً مورخ خیال کیے جاتے ہیں اور حالی سوانح نگار، حالاں کہ شبلی نے بھی سوانح عمریاں ہی لکھیں ہیں، مسلسل تاریخ کی کوئی مربوط کتاب نہیں لکھی، مگر پھر بھی وہ مورخ ہی کھے جاتے ہیں۔ سبب اس کا یہی ہے کہ ان کا مزاج، انتخاب، موضوع اور طریق کار سوانح نگاروں سے زیادہ تاریخ نگاروں سے ملتا جلتا ہے" (۱۷۷)۔

عبداللطیف اعظمی کا خیال ہے کہ شبلی کے پیش نظر کارلائل کا غالباً مشہور فقرہ "تاریخ عالم صرف اس کے بڑے بڑے اشخاص کی تاریخ کا نام ہے" (۱۷۸) تھا۔ چناں چہ انھوں نے سب سے پہلے مشاہیر اسلام پر قلم اٹھایا۔ اس سلسلے میں پہلی کتاب المامون شائع ہوئی (۱۷۹)۔ ممکن ہے اعظمی صاحب کا خیال صحیح ہو، لیکن مولانا کی طبیعت سے یہ بعید معلوم ہوتا ہے کہ وہ کارلائل کے اس فقرے سے اس طرف متوجہ ہوئے ہوں۔ بات اصل یہ ہے کہ مولانا نومسلم راجپوت کے خاندان سے تھے، اس لیے بچپن سے دین کی باتیں کانوں میں پڑی ہوئی تھیں اور دینی تعلیم بھی ملی تھی۔ حساس طبیعت تھی، پھر کچھ ہی قبل مسلمانوں کے ہاتھوں سے سلطنت اور حکومت گئی تھی۔ مولانا نے زمانہ طالب علمی میں ہی لکھنو، لاہور، سہارن پور اور رام پور وغیرہ میں گھوم پھر کر مسلمانوں کے احساس کمتری کو دیکھ لیا تھا۔ کچھ نہ کچھ ردعمل ان کی طبیعت پر تھا ہی، اس پر سونے پر سہاگا یہ ہوا کہ سرسید نے قوم کا درد ان کے دل میں پیدا کر دیا اور ان کے کتب خانے نے تاریخ پر کتابیں مہیا کر دیں۔ اس طرح انھوں نے جو سوانح عمری لکھی اس میں تاریخ کو سمونے سے پہلے مطلب یہ تھا کہ وہ بتلا سکیں کہ وہ لوگ کتنے اچھے تھے اور ان اچھوں میں یہ شخص زیادہ اچھا تھا۔ اس طرح انھوں نے نئی نسلوں کو اپنے اجداد کے کارناموں سے واقف کرانے اور اگلوں سا حوصلہ پیدا کرنے اور محنت کا شائق اور لائق بنانے کے لیے بڑا کام کیا جائے۔ ان کی خامیوں کو بھی بتلایا جائے تاکہ قوموں کے لیے ضرر رساں چیزوں سے بچایا جائے اور محتاط رہا جائے۔ ہمعصروں کی سوانح عمری کے معیار پر گرے ہوئے ناموروں کی سوانح عمری کو پرکھنا مناسب نہیں۔ لیکن مواد کی فراہمی میں دیدہ ریزی، وسعتِ معلومات، کتب خانوں سے واقفیت، تلاش و تحقیق میں مارے مارے پھرنا، روایت کو درایت کی روشنی میں دیکھنا اور اس کو سلیقے اور طریقے سے پیش کرنے میں جو پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے اس قسم کی سوانح عمری کا مرتبہ بہت بلند ہو جاتا ہے

مولوی مجیب اللہ ندوی مولانا کی سوانح نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے اس طرح خوبی کو اجاگر کرتے ہیں ۔ عموماً مسلمان مورخین اور سوانح نگار بھی تاریخوں اور تذکروں میں سیاسی واقعات اور ذاتی حالات لکھتے وقت اس وقت کے تمدنی حالات اور اسباب و علل پر بہت کم بحث کرتے ہیں اور اگر کرتے ہیں تو سیاسی واقعات ذاتی حالات میں اور ان میں کوئی ربط و تعلق نہیں محسوس ہوتا اور پھر عموماً ان کی نظر میں اس حقیقت سے بھی بعض وقت ہٹ جاتی ہیں کہ بعض واقعات کے علل و اسباب کا ذکر کیے بغیر ان کے بیان کرنے میں کیا کیا نقصانات اور شبہات ہوتے ہیں۔

علامہ شبلی نے جتنی سوانح عمریاں لکھی ہیں وہ ان عیوب سے خالی ہیں ۔ انھوں نے ذاتی حالات و واقعات بیان کرتے ہوئے ان کے پس منظر اور پیش منظر دونوں کو سامنے رکھا ہے ۔ وہ ماضی پر سیاسی، تمدنی اور معاشرتی حیثیت سے بھی بحث کرتے ہیں اور واقعات کے علل و اسباب کا کھوج بھی لگاتے ہیں، ان کی غلطیوں کی پردہ داری بھی کرتے ہیں اور بعض چھپی ہوئی حقیقتوں کی پردہ کشائی (۱۸۰) بھی ۔ حقیقت میں یہی خوبی ان کی لکھی ہوئی ہر سوانح عمری میں ہے اور خصوصاً المامون میں، لیکن سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور الفاروق کو سوانح عمری کہنا غلط ہے ۔ اس لیے مندرجہ بالا اقتباس کا اطلاق اس پر کرنا مناسب نہیں ۔ سیرت اور سوانح میں فرق ہے ۔ سوانح میں واقعات اور حالات کی کڑی غائب بھی ہو سکتی ہے اور اس خلا کو مصنف خوش اسلوبی سے نظر انداز بھی کر سکتا ہے ۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس عمدگی سے پیش کرنے کی وجہ سے خلا محسوس نہ ہو ۔ لیکن سیرت میں جزوی واقعات اور خلوت و جلوت کے حالات اور ایک ایک لمحے کی مصروفیات اور مہد تا لحد کی معمولی سے معمولی اور بڑی سی بڑی چیز کا معلوم ہونا ضروری ہے اور اس جزوی واقعے کے متعلق بھی مختلف راویوں کا بیان اور اس کی درایت کی کسوٹی پر پرکھ ہی سیرت تیار کر سکتی ہے اور ان بنیادوں پر سوائے سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور خلفائے راشدین کی سیرت کے اور کوئی نہیں ہو سکتی، حتیٰ کہ کسی اور پیغمبر کے جزوی حالات بھی تاریخ میں موجود نہیں ہیں ۔ سیرت کے سلسلے میں تاریخ سے بڑھ کر قرآن مجید، احادیث، مغازی، کتب رجال اور شمائل پر بکثرت کتابیں ہیں جو سیرت لکھنے میں معاون ہیں ۔ گویا سوانح عمری تاریخ کی مدد سے لکھی جا سکتی ہے اور سیرت، قرآن مجید، احادیث، مغازی، اسماء الرجال، شمائل اور تاریخ کی مدد سے اور یہی چیز سیرت کو سوانح سے ممتاز کرتی ہے ۔ مولانا نے سیرت کے لیے بیاگرافی (۱۸۱)

ہی کا لفظ استعمال کیا ہے، جو سوانح کی انگریزی ہے۔ مگر چوں کہ سیرت کا تصور اور اس کا اور سوانح کا فرق بھی انگریزوں یا یوروپینوں کے ذہن میں نہ تھا اور نہ اب تک ہے اور خود ہمارے ادب میں بھی ان دونوں میں فرق نہیں کیا گیا ہے۔ حالاں کہ یہ بہت ضروری چیز ہے۔ اس لیے سوانح اور سیرت میں جب فرق کیا جاسکتا ہے اور یقیناً ہے تو اس کے لیے دوسری زبانوں میں بھی الگ لفظ مقرر کرنے کی ضرورت ہے اور یہ ہمارا فرض ہے کہ توجہ دلائیں اور غیروں کو سوانح اور سیرت کا فرق سکھائیں۔

اس دور میں مولانا نے دوسری کتاب سیرۃ النعمان لکھی۔ یہ بھی سلسلہ، ناموران اسلام کی ایک کڑی ہے۔ مولانا حنفی ہونے کی وجہ سے تقلید کے جوش میں اعظم گڑھ میں غیر مقلدین کے خلاف کئی معرکے سر کر چکے تھے۔ اگرچہ علی گڑھ کی فضا نے ان کے مزاج کو معتدل بنا دیا تھا مگر عقیدت اور خلوص کا تقاضا تھا کہ ان کی سوانح لکھ کر اور علمی اور فقہی کارناموں پر روشنی ڈال کر ان کی سیادت کو تسلیم کرایا جائے۔ اس خدمت کو مولانا نے بڑی حد تک پورا کیا اور مناظرانہ جوش اور مدافعانہ روش سے پرہیز کرکے صحیح علمی اور فقہی خدمات کو پیش کیا ہے۔ بیاگرافی کے لیے جن اصولوں کی ضرورت ہے ان کا اعلان کیا اور اس کو بڑی حد تک برتنے کی کوشش کی ہے۔ سب سے پہلا اصول جو انھوں نے پیش نظر رکھا ہے وہ یہ ہے کہ عقیدت کو سوانح پر اثر انداز نہیں ہونے دیا ہے۔ مثلاً ان روایات کی پرزور تردید کی ہے جس سے امام صاحب کی شخصیت مافوق الفطرت معلوم ہو، یعنی امام صاحب نے چالیس سال تک عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھی۔ اس لیے یہ کہنا بالکل بجا ہوگا کہ ان کی (شبلی کی) کھینچی ہوئی تصویر انسان کی ہے۔ لیکن اشرف المخلوقات سے یہ ممکن ہے کہ چالیس سال تک عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھی جائے اور مسلمانوں کی تاریخ میں ایسے واقعات ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مولانا شبلی اس کوچے سے نابلد تھے اس لیے انھوں نے بحث سے اور اعتراض سے بچنے کے لیے سرے سے انکار کر دیا ہے۔ سوانح کا اصول یہ بھی ہے کہ محاسن کے ساتھ ہیرو کی کمزوریوں کو بھی پیش کیا جائے۔ چوں کہ مولانا کا اب سوانحی شعور خاصا جاگ گیا تھا، اس لیے اس کتاب میں ان چیزوں کو بھی پیش کیا ہے اور عقیدت پر اصول کو ترجیح دی ہے۔ چناں چہ امام صاحب کی کمزوری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "امام صاحب کے مناظرات میں کہیں کہیں ہم اس ادعا اور جوش مقابلہ کا اثر پاتے ہیں جو بظاہر ان کی کسر نفسی اور تواضع کے خلاف ہے۔ لیکن یہ انسانی جذبات ہیں جن سے کوئی شخص بری نہیں ہوسکتا" (۱۸۲)۔

یہاں پر مدافعت کی ہے مگر امام صاحبؒ کی نہیں بلکہ انسانی کمزوریوں اور بشری نقصوں کی، جس سے ان کا اصول اپنی جگہ پر قائم ہے۔ایک اور موقع پر ان کے فقہی اجتہادات کے متعلق لکھتے ہیں: "ہم یہ عام دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ان کے سب مسائل یقینی اور صحیح ہیں" (۱۸۳)۔

بہر حال یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے بڑی عمدگی اور پختگی سے لکھی گئی ہے اور ان کی "متنوں کا تماشاگاہ ہے"۔

مولانا کے اس دور کی تیسری کتاب "سفر نامہ ، روم و مصر و شام" ہے۔یہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ پہلے پہل پاک و ہند کے کسی مسلمان نے غیر ملک کا علمی سفر کیا اور خصوصاً ایک عالم اور کالج کے پروفیسر نے اخوتِ اسلامی کے جذبے سے مجبور ہو کر اور ترکوں کی محبت میں چور ہو کر سفر کی ٹھانی اور باوجود زبان کی اجنبیت کے سفر کیا، وہاں کے کتب خانوں کو کھنگال ڈالا، مختلف شعبوں کی ترقی کو گہری نظر سے دیکھ کر سفرنامے میں اس کی خوبیوں کو سراہا اور خامیوں پر گرفت کی۔مولانا کا ایک غلام ملک سے تعلق تھا۔وہاں پہنچ کر ان کو آزاد ملک میں سانسیں لینے سے بڑی فرحت ہوئی اور وہاں کی آزاد فضا میں انھوں نے ایک ایک چیز کو پیار کی نظروں اور محبت و عقیدت کی نگاہوں سے دیکھا۔بہادر ترکوں کی فوجوں کو دیکھ کر جھوم اٹھے اور شاعرانہ رگ پھڑک اٹھی۔اسی کیفیت میں قصیدہ کہا جس سے ان کے احساسات اور جذبات کا اندازہ ہوتا ہے۔ترکوں کو یورپ کا مردِ بیمار کہا جاتا تھا اور اس کو شہرت دینے میں انگریزوں کا خاص ہاتھ تھا۔مولانا کا باوجود انگریزوں کے محکوم ملک سے تعلق تھا، مگر انھوں نے اپنے سفرنامے میں انگریزوں کے پروپیگنڈے کی پول کھول کر رکھ دی اور ترکوں کے داغہائے بدنامی کو دھو دیا، دشمنوں کی سازشوں اور ترکوں کے خلاف پیہم کوششوں کو بے نقاب کر دیا۔اس سفرنامے میں معلومات کی ایک دنیا فراہم کر دی ہے۔سفر کا ارادہ، تیاری سمندری سفر کے جسمانی اور دماغی فوائد، سوئز میں اردو بولنے والے سے ملاقات، شمالی قوم کے لڑکوں کی متبذل حرکتیں دیکھ کر قومی احساس کا پیدا ہونا اور بے چینی، تمام اسلامی ممالک میں دولت اور تجارت غیر مسلموں کے ہاتھ میں، جس جس جگہ گئے وہاں کی تاریخ بیان کر دی، قسطنطنیہ کے لباس اور وضع قطع، جامع حمیدیہ اور شاہی ایوانات، عدالتوں کا نظام، ترقیِ تعلیم، جدید و قدیم درسگاہوں کی حالت، تعلیم پر مہارت، بورڈنگ ہاؤس، طلبہ کا لباس ان سب کا مطالعہ اور مشاہدہ کیا اور سفرنامہ پیش کیا۔مصر میں انھوں نے ایک کالج دیکھا جس میں قدیم اور جدید دونوں قسم کی تعلیم دی جاتی تھی۔یہ گویا مولانا

کے خوابوں کی تعبیر تھی اور ان کے تخیل کی مثال۔ اسی کو پیش نظر رکھ کر انھوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے تعلیمی اسکیم اپنے ذہن میں مرتب کی اور ندوہ کے پہلے اجلاس ۱۸۹۴ء میں اسی کو بنیاد بنا کر دارالعلوم کا خاکہ پیش کیا۔ مولانا نے عقیدت و محبت کی نگاہ سے مسلم ممالک کو دیکھنے کے باوجود وہاں کی خامیوں سے نگاہیں نہیں پھیر لیں تھیں اور انصاف کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ چناں چہ لکھتے ہیں:

"معمولی کھانا خود ازہر سے ملتا ہے، لیکن چوں کہ صرف روٹیاں ملتی ہیں اس لیے سالن کا اہتمام ان کو خود کرنا پڑتا ہے۔ بہت سے طلبہ جن کو چار چار یا پانچ پانچ روٹیاں ملتی ہیں نان بائی کو دو تین روٹیاں دے کر اس کے بدلے سالن لے لیتے ہیں اور اس طرح ان کے جیب خرچ پر بار نہیں پڑتا ہے روٹیوں کی تقسیم کا طریقہ یہ ہے کہ وقتِ معین پر طلبہ کا ایک گروہ بازار میں دو رویہ صف باندھے کر کھڑا ہو جاتا ہے اور روٹیاں تقسیم ہوتی ہیں۔ ایک گروہ کے بعد دوسرا گروہ آتا ہے اور یہ سلسلہ کئی گھنٹہ قائم رہتا ہے۔ طالبِ علموں کے ہاتھ میں کوئی تولیہ یا رومال نہیں ہوتا، جس طرح بھیک (کے طور پر) جو کچھ ملتا ہے ہاتھ پھیلا کر لے لیتے ہیں۔ ان طالبِ علموں کا بھی یہی حال ہے (۱۸۴)۔

آگے چل کر لکھتے ہیں:

"مجھ کو اپنے تمام سفر میں جس قدر جامعہ ازہر کے حالات سے مسلمانوں کی بدبختی کا یقین ہوا کسی چیز سے نہیں ہوا۔ ایک ایسا دارالعلوم، جس میں دنیا کے ہر حصہ کے مسلمان جمع ہوں، جس کا سالانہ خرچ دو تین لاکھ سے کم نہ ہو، جس کے طالبِ علموں کی تعداد بارہ ہزار سے متجاوز ہو، اس کی تعلیم و تربیت سے کیا کچھ امید نہیں ہو سکتی تھی، لیکن افسوس ہے کہ وہ بجائے فائدہ پہنچانے کے لاکھوں مسلمانوں کو برباد کر چکا ہے اور کرتا جاتا ہے۔ تربیت و معاشرت کا جو طریقہ ہے اور جس کا میں ذکر کر چکا ہوں اس سے حوصلہ مندی، بلند نظری، جوش، ہمت، غرض تمام شریفانہ اوصاف کا استیصال ہو جاتا ہے۔ میں نے یہاں ایسے طلبہ دیکھے ہیں جن کے عزیز اور نہایت قریبی عزیز خود

اسی شہر میں بڑے بڑے عہدوں پر ہیں اور ان کی تمام ضروریات کے متکفل بھی ہیں، تاہم چوں کہ یہ طلبہ ازہر میں رہتے ہیں، اس لیے ان کو عام بازار میں ہاتھ پھیلا کر روٹیاں لینے میں ذرا شرم نہیں آتی ۔ طالب علموں کی ذہانت اور پست حوصلگی کا یہ حال ہے کہ بازار میں پیسے کی ترکاری خریدتے میں کنجڑے کو قسم دلاتے جاتے ہیں کہ میں " براس سیدنا الحسین "یعنی تجھ کو امام حسینؓ کے سر کی قسم واجبی قیمت بتانا ۔ کیا اس قسم کے تربیت یافتہ لوگوں سے یہ امید ہو سکتی ہے کہ وہ اسلام کی عظمت و شان بڑھائیں گے؟ ہمارے ملک میں اس قسم کے جو مدرسے ہیں ازہر ان میں سے بھی گیا گزرا ہے" (۱۸۵) ۔

تعلیمی حالت کی تفصیل لکھنے کے بعد شیخ ازہر کے متعلق لکھتے ہیں:

" میں نے طلبہ سے دریافت کیا کہ شیخ ازہر، جو استاد الکل خیال کیے جاتے ہیں، ان کی کوئی تصنیف بھی ہے ۔ انھوں نے بڑے فخر سے کہا کہ ہاں صبان پر بڑے معرکے کے حاشیے لکھتے ہیں" (۱۸۶) ۔

ان نکتہ چینیوں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نے جو خامی پائی ہے اس کا نہ صرف کھل کر اعتراف کیا ہے بلکہ اس پر تنقید بھی کی ہے ۔ اس سفرنامے کی خوبی یہ ہے کہ مسلم ممالک کے سفر میں اب بھی رہنمائی کرتا ہے، باوجود یہ کہ سفر کی سہولتیں ہو گئی ہیں اور وہاں کے حالات بدل گئے ہیں ۔

مولانا نے اپنے علی گڑھ کالج کے قیام میں سیرت (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایک کتاب " بدء الاسلام " کے نام سے لکھی تھی جس کے اردو ترجمے کا ذکر آچکا ہے ۔ اس کا فارسی ترجمہ مولوی حمید الدین فراہی نے کیا تھا اور یہ علی گڑھ کالج میں بی ۔ اے کے عربی نصاب میں شامل رہی ۔ اس کے سال تصنیف کی تحقیق نہ ہو سکی ۔ کتاب کے سرورق پر بھی طباعت کا سال نہیں ہے اور نہ فارسی ترجمے کی طباعت کا سال درج ہے (۱۸۷) ۔

مولوی حمید الدین فراہی کا فارسی ترجمہ یہ ہے:

نحمدہ و نصلی من بندہ الٰہی حمید فراہی این خامہ کہ برادر معظم مولانا شبلی نعمانی در شرح سیرت نبوی از دفتر سیر انتخاب زدہ ترتیب دادہ انداز تازی بفارسی در آوردم و ندادان الشروع فی المقصود " (۱۸۸) ۔

مولانا نے "الفاروق"، علی گڑھ کالج میں ہی تقریباً مکمل کر لی تھی لیکن، علی گڑھ چھوڑنے کے بعد اس کو آخری شکل دی اور طبع کرائی۔ یہ مولانا کو اپنی تصانیف میں سب سے زیادہ پسند بھی تھی اور اس میں چوں کہ مولانا کا سوانحی شعور سیرت میں تبدیل ہوا ہے اس لیے، روایت کی درایت کی کسوٹی پر پرکھ اور تحقیق کا معیار بہت اونچا ہو گیا ہے۔ اس کا عربی ترجمہ کرانے کی بھی تجویز تھی مگر عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا۔ اس کا انگریزی ترجمہ مولانا ظفر علی خاں نے کیا اور فارسی ترجمہ افغانستان میں ہوا۔ اس کے ترجموں کے متعلق شیخ عطاء اللہ صاحب لکھتے ہیں:

"الفاروق کے مطالعے سے خیال پیدا ہوا کہ اس کا انگریزی ترجمہ ہونا چاہیے، اختتام تعلیم پر خاموشی سے اپنے طور پر کام کر دیا گیا، لیکن ایک ابتدائی مقام پر پہنچ کر ایسا اٹکا کہ پھر بڑھنے نہ پایا اور رفتہ رفتہ فکر معاش اور دیگر مصروفیتوں نے ایسا گرفتار کیا کہ اس طرف توجہ نہ دے سکا۔ تاآں کہ ۱۹۴۸ء میں قیام پاکستان کے بعد شیخ محمد اشرف، ناشر کتب اسلامیہ، نے مولانا شبلی کے شاگرد رشید فدائے ملت مولوی ظفر علی خاں مرحوم و مغفور، ایڈیٹر زمیندار، کے قلم سے الفاروق کا انگریزی ترجمہ شائع کر دیا" (۱۸۹)۔

اسی مضمون میں آگے چل کے لکھتے ہیں:

"مولانا شبلی، الفاروق کو اپنی غزل مرصع سمجھتے تھے اور اس پر انھیں متعدد اعتبارات سے بجا طور پر ناز تھا۔ مکاتیب سے معلوم ہوتا ہے وہ اس کا عربی ترجمہ کرنا یا کرانا چاہتے تھے" (۱۹۰)۔

اسی مضمون میں پھر لکھتے ہیں:

"الفاروق کا فارسی ترجمہ جس کا خیال کبھی مولانا کو پیدا نہیں ہوا تھا البتہ شائع ہو چکا ہے۔ اس کی محرک کوئی افغان شہزادی تھیں اور ترجمہ کرنے والے میرے ہم وطن مولوی نجف علی خاں مرحوم تھے۔ یہ بزرگ مدتوں افغانستان میں رہے۔ امان اللہ خاں کے اتالیق بھی رہے" (۱۹۱)۔

فارسی ترجمے کے دیباچے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ الفاروق کے ترجمے کی ابتدا امیر حبیب اللہ خاں کی اہلیہ (جو محمد نادر شاہ افغانستان کی ہمشیرہ ہوئیں) نے کی تھی، مگر وہ تکمیل سے پہلے انتقال کر گئیں۔ چناں چہ سردار محمد یوسف خاں مرحوم نے مولانا نجف علی جلال پوری کو

تکمیل کے لیے متعین کیا۔ انھیں نے تکمیل کی۔ محمد نادر شاہ کے حکم سے اس کی طباعت ہوئی۔ سنہ طباعت ۱۳۵۱ھ۔ حصہ دوم کے آخر میں ابو سعید محمد عبدالرشید کاتب کا قطعہ، تاریخ طباعت ہے۔ جس کا مقطع ہے:

از پئے تاریخ طبعش خواں تو از عبدالرشید	وجہ احسن طبع الفاروق شد با آب وتاب

۱۳۵۱ھ

ترجمے کی تکمیل کا سنہ درج نہیں البتہ مولانا نجف علی خاں نے دیباچے کے آخر میں اپنے نام کے نیچے دو سنہ لکھے ہیں: ۱۳۱۱ھ ش، ۱۳۵۱ھ ق۔ غالباً پہلا سنہ ترجمے کی ابتدا کا ہے۔

حصہ دوم کے آخر میں بھی مولانا نجف علی نے اپنے نام کے نیچے دو سنیں لکھے ہیں۔ "یوم جمعتہ المبارک ۲۰۔ قوس ۱۳۰۹ھ ش، مطابق ۲۰۔ رجب المرجب ۱۳۴۹ھ ق"۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ترجمہ ۱۳۴۹ھ میں مکمل ہوا اور ۱۳۵۱ھ میں طبع ہوا۔

حصہ اول کی ترتیب یہ ہے:

۱۔ دیباچہ ۱۔۳
۲۔ فہرست ۴۔۱۶
۳۔ حصہ اول ۱۔۲۷۶

حصہ دوم کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ حصہ دوم ۱۔۴۰۰
۲۔ غلط نامہ ۱۔۴
۳۔ تقریظ الف۔ج
۴۔ قطعہ۔ د (۱۹۲)

مولانا کے الفاروق کا نمونہ یہ ہے:

"عام طور پر مشہور ہے کہ ظلم و ستم سے سلطنت برباد ہو جاتی ہے۔ یہ اس لحاظ سے صحیح ہے کہ ظلم کو بقا نہیں۔ چناں چہ سکندر اور چنگیز کی سلطنتیں بھی دیرپا نہ ہوئیں، لیکن فوری فتوحات کے لیے اس طرح کی سفاکیاں کارگر ثابت ہوئیں ہیں۔ ان کی وجہ ملک کا ملک مرعوب ہو جاتا ہے اور چوں کہ رعایا کا بڑا گروہ ہلاک ہو جاتا ہے، اس لیے بغاوت و فساد کا اندیشہ باقی نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ چنگیز، بخت نصر، تیمور، نادر، جتنے بڑے بڑے فاتح گزرے ہیں، سب کے سب سفاک تھے۔

لیکن حضرت عمرؓ کی فتوحات میں کبھی سرمو قانون، انصاف سے تجاوز نہیں ہو سکتا تھا۔ آدمیوں کا قتل عام ایک طرف، درختوں تک کے کاٹنے کی

اجازت نہ تھی۔ بچوں اور بوڑھوں سے باس تعرض نہیں کیا جاسکتا تھا، بجز عین معرکہ۔ کارزار کے کوئی شخص قتل نہیں کیا جاسکتا تھا، دشمن سے کسی موقعے پر بدعہدی یا فریب دہی نہیں کی جاسکتی تھی، افسروں کو تاکیدی احکام جاتے تھے "فان قاتلوکم فلا تعذروا ولا لمعلوا ولا تقتلوا ولید" یعنی دشمن تم سے لڑائی کریں تو ان سے فریب نہ کرو، کسی کی ناک کان نہ کاٹو، کسی بچے کو قتل نہ کرو"۔

الفاروق کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ اس کو اس انداز پر لکھا گیا ہے کہ اصلاحات وغیرہ موجودہ دور کی اصلاحات معلوم ہوتی ہیں۔ اگرچہ اس زمانے کے لحاظ سے وہ اصلاحات تھیں لیکن وہ بنیاد تھی اور مولانا نے اس کو تعمیری شکل میں دکھلایا ہے۔ اس لیے اس پر یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ اس انداز پر اصلاحات نہ تھیں مثلاً ڈاک خانے کا نظام جس انداز میں پیش کیا گیا ہے ایسا تو نہ تھا۔ یہ اس لحاظ سے صحیح ہے کہ بے شک اس انداز پر ڈاک خانہ کا نظام نہ تھا، مگر اس وقت کے نظام کی بالکل ابتدا کا جو تصور اس وقت کیا جاسکتا ہے وہ وہی ہے جو مولانا شبلی نے پیش کیا۔ پھر پرچہ نویسی گویا اس زمانے کے سراغرسانی کی بالکل ابتدائی شکل تھی۔ اس طریقہ سے اگر عہد فاروقی کا جائزہ لیا جائے تو اس زمانے کے اکثر محکموں کی ابتدائی شکل ہم کو عہد فاروقی میں ملے گی۔

۱۸۹۲ء میں کتب خانہ اسکندریہ پر مولانا نے بڑی تحقیق سے ایک مضمون لکھا جس میں یورپ کے پروپیگنڈے کی دھجیاں اڑادیں۔ جس کے ذریعے یہ ثابت کیا جاتا رہا تھا کہ مسلمان اتنے جاہل تھے کہ جب انھوں نے مصر کو اور خصوصاً اسکندریہ کو فتح کیا تو وہاں کا عظیم کتب خانہ جلا دیا۔ مولانا نے اپنے مضمون میں یہ ثابت کیا کہ یہ کتب خانہ خود عیسائیوں نے جلا ڈالا تھا کہ مسلمانوں کو ان کی کتابیں ہاتھ نہ لگیں۔ اس مضمون کا اثر یہ ہوا کہ بہت سے عیسائیوں نے بھی فاضلانہ مضامین لکھ کر مسلمانوں کے سر سے الزام کی تردید کردی۔

۱۸۹۳ء سے ۱۸۹۸ء تک مولانا نے کئی محققانہ تاریخی مضامین لکھے، کیوں کہ وہ اس زمانے میں تاریخ کے کوچے میں تھے اور یہ مضامین ملک کے مشہور رسالوں میں شائع ہوئے۔ یہ مضامین مسلمانوں کی تاریخ سے متعلق تھے۔ ان کو یکجا کر کے رسائل شبلی کے نام سے شائع کیا گیا۔ مولانا نے اپنے قلم سے اس پر یکم فروری ۱۸۹۸ء کو مقدمہ لکھا جس کا اقتباس سید سلیمان ندوی نے (حیاتِ شبلی، صفحہ ۲۲۸) دیا ہے۔ اس زمانے میں مولانا کے اکثر مضامین "انسٹی ٹیوٹ گزٹ،

علی گڑھ" میں شائع ہوئے جن کے عنوانات حسبِ ذیل ہیں:

حکمائے اسلام (۱۹۳) (انسٹی ٹیوٹ گزٹ، مورخہ ۱۴۔ اپریل ۱۸۸۳ء) وہ غلطی زیادہ خطرناک ہے جو انسان کو اپنی نسبت آپ ہو (۱۹۴) (یہ مضمون ۱۷۔ جولائی ۱۸۸۳ء کو لکھا گیا اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ، مورخہ ۲۱۔ جولائی ۱۸۸۳ء کو شائع ہوا)۔ تقریر مولوی شبلی (۱۹۵) (محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے پہلے اجلاس منعقدہ ۲۷۔ دسمبر ۱۸۸۶ء) رپورٹ متعلق کتب خانہ ریاستِ عالیہ، مصطفےٰ آباد (رام پور) محررہ ۱۴۔ اکتوبر ۱۸۸۸ء (۱۹۶)، اسپیچ مولوی شبلی صاحب (۱۹۷) (محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا چوتھا سالانہ اجلاس ۲۷ تا ۳۰ دسمبر ۱۸۸۹ء) مولوی خدا بخش خاں عظیم آبادی کا کتب خانہ (۱۹۸) (علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، مورخہ ۲۴۔ فروری ۱۸۹۱ء)۔

مولانا کے اس دور کی شاعری بھی ایک نئے موڑ پر آگئی تھی اور اس دور میں ان پر قومی رنگ غالب آگیا تھا۔ شروع میں تو وہ پرانے ڈھرے پر چلتے رہے اور اردو غزلیں اسی انداز پر کہتے رہے، مگر وہاں جو مرثیے، قصیدے و مثنوی انھوں نے لکھیں اس میں وہ بدل گئے ہیں۔

سرسالار جنگ کا مرثیہ اس لیے لکھا کہ ان سے قوم کو بڑا فائدہ پہنچا تھا اور علی گڑھ کالج کے مربی تھے۔ چناں چہ مطلع ہی اس غم کا اظہار ہے:

آہ ایں چہ غم بود کہ جہانے است نوحہ گر
آہ ایں چہ ماتم است کہ خوں شد دل و جگر

مولانا نے مثنوی "صبح امید" میں قوم کی پوری تاریخ کو مدِ نظر رکھا ہے اور قوم کی بدحالی کا پہلے ہی شعر میں استفہامیہ انداز میں ذکر کرکے اس کے شاندار ماضی کو یاد دلادیا ہے۔ چناں چہ کہتے ہیں:

کیا یاد نہیں ہمیں وہ ایام — جب قوم تھی مبتلائے آلام
وہ قوم کہ جان تھی جہاں کی — جو تاج کی تھی فرق آسماں کی
تھے جس پہ نثار فتح و اقبال — کسریٰ کو جو کر چکی تھی پامال
گل کر دیے تھے چراغ جس نے — قیصر کو دیے تھے داغ جس نے
وہ نیزہء خوں فشاں کہ چل کر — ٹھہرا تھا فرانس کے جگر پر
روما کے دھویں اڑا دیے تھے — اٹلی کو کنویں جھکا دیے تھے

اس کے بعد قوم کی پستی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اسلام کی جان پر بنی ہے دم توڑ رہا ہے جاں کنی ہے
ہر چند یہ ہو چکی تھی حالت ہم تھے وہی مست خواب راحت
غفلت نے ڈبو دیا تھا ہم کو تقلید نے کھو دیا تھا ہم کو
مٹنے پہ جو تھا نشاں ہمارا خواب اور ہوا گراں ہمارا
غفلت کے یہ چل رہے تھے جھونکے گو صبح ہوئی پہ ہم نہ چونکے
کس نیند میں سو گئی تھیں آنکھیں بیکار سی ہو گئی تھیں آنکھیں

قوم کی حالت خراب ہو رہی تھی کہ ایک مصلح اٹھا اور اس نے قوم کو خواب غفلت سے جگا دیا۔ شبلی اس کو بڑے اچھے انداز میں پیش کرتے ہیں:

ماتم تھا ابھی کہ آئی ناگاہ اک سمت سے اک صدائے جانکاہ
اس شان سے تھی وہ آہ دلگیر پہلو میں اثر بغل میں تاثیر
دل ہاتھ سے لینے میں بلا تھی جادو تھی؟ فسوں تھی؟ جانے کیا تھی
ڈوبی ہمہ تن جو تھی اثر میں نشتر سی اتر گئی جگر میں

اس مصلح کو بڑی خوبی سے پہنچواتے ہیں:

دیکھا تو وہاں بجاہ و تمکیں آیا نظر اک پیر دیریں
صورت سے عیاں جلال شاہی چہرے پہ فروغ صبح گاہی
پیری سے کمر میں اک ذرا خم توقیر کی صورت مجسم

مصلح (سرسید) نے قوم کو غفلت سے جگانے کی کوشش کی، وہ انداز بھی دیکھنے والا ہے:

اٹھتے ہوئے جوش دل سے پیہم عبرت کا دکھا رہا تھا عالم
افسانہ غم سنا کے ٹھہرا سوتوں کو جگا جگا کے ٹھہرا
جادو کی بھری ہوئی وہ تقریر ہونٹوں سے ٹپک رہی تھی تاثیر

قوم کی حالت بدل گئی۔ نقاش اس کا نقشہ، دل پر اس طرح نقش کرتا ہے:

وہ دوڑ چلے جو بگل تھے آندھی ہوئے جو فسردہ دل تھے
جو تھا وہ عجیب جوش میں تھا مخمور بھی اب تو ہوش میں تھا

جب قوم کو اس قابل کر دیا کہ وہ اپنے برے بھلے کی تمیز کر سکے تو پھر سرسید نے قوم سے چندے کی اپیل کی کہ مسلمانوں کے لیے ایک کالج کھولیں جہاں قدیم و جدید تعلیم دی جائے۔ چندہ

وصول کرنے کی منظر کشی کسی خوبی سے کرتے ہیں:

وہ کشتۂ قوم وہ ندائی ــــ اٹھا لیے کاسۂ گدائی
ایک ایک سے عرض حال کرتا در در پھرا وہ سوال کرتا

بعض لوگوں نے پھر بھی پروانہ کی اور الٹا طنز و تعریض کیا تو اس کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے:

کیا کیا نہ مصیبتیں اٹھائیں ہر طرح کی ذلتیں اٹھائیں
ناکام رہا صدائیں دے کر دشنام سنی دعائیں دے کر

لیکن خلوص اور نیک نیتی سے کہیں مخالفت جیت سکتی ہے۔ اس لیے خلوص نے اپنا اثر دکھایا اور لوگ متاثر ہونے لگے۔ چناں چہ کہتے ہیں:

باطل کو جو حق نے کر دیا پست اب نیست نے پائی صورت ہست
آہوں نے دکھائی اس کی تاثیر کام آئے وہ نالہائے شبگیر
پر درد جو اس کی داستاں تھی لبریز اثر جو وہ فغاں تھی
ٹھنڈے ہوئے تھے جو گرم خو بھی دل تھام کے رہ گئے عدو بھی

لوگوں نے مالی اعانت کی، آخر کار علی گڑھ کالج قائم ہو گیا۔ اس کے قیام کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

قائم ہوا یادگار ایامؑ وہ مدرسۃ العلوم اسلام

کالج کی دن دونی رات چوگنی ترقی کا ذکر اور ہر طرف سے طلبہ کی آمد کا بیان بھی دل چسپی سے خالی نہیں۔ چناں چہ کہتے ہیں:

پہلے سے بہ آب و تاب ہے آج کل شمع تھا آفتاب ہے آج
اس چشمۂ فیض سے ہے سیراب بنگال سے تا حدودِ پنجاب
دانش طلبان قوم اکثر ہیں جمع ہر اک جگہ سے آکر
کس نخل کے یاں ثمر نہیں ہیں کس کان کے یاں گہر نہیں ہیں
اس باغ میں کوئی آکے دیکھے اسلام کے ہونہار پودے

لیکن شاعر کو بعض لوگوں کی بے حسی پر اب بھی افسوس ہے۔ چناں چہ اس کا کہنا ہے کہ اگر سرسید سے کسی وجہ سے وہ رنجیدہ ہیں تو خود ہی کچھ کر کے دکھائیں۔ اس لیے کہ دم تو بھرتے

ہیں اسلام سے محبت کا اور دعویٰ ہے مسلمانوں کی ہمدردی کا لیکن کوئی عملی کام کر کے نہ دکھایا۔
سرسید جو ان کے نزدیک گمراہ ہیں انھوں نے تو قوم کے لیے کالج کھول کر دکھادیا۔

سید سے اگر ہے بغض للہ وہ خادم قوم اگر ہے گمراہ
کچھ آپ ہی انتظام کرتے اسلام کو نیک نام کرتے
باتیں نہ فقط بنا کے رہتے جو منہ سے کہا دکھا کے رہتے
اسلام کی دوستی تو یہ تھی الفت کی دلیل تھی، تو یہ تھی

ڈاکٹر گیان چند جین اس مثنوی کے بارے میں اس طرح لکھتے ہیں:

"شبلی نے اس غیر شاعرانہ موضوع میں کیا کیا گل بوٹے کھلائے ہیں۔
یہ ملت کے عروج و زوال پر ایک مقالہ ہے جو والہانہ انداز میں سپرد قلم کیا گیا ہے"(۱۹۹)۔

اس دور میں مولانا نے اردو کے تین قصیدے لکھے ایک ترکیب بند تھا جس کو انھوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں پڑھا۔ یہ بھی قومی درد سے بھرپور ہے۔ اس میں بھی مسلمانوں کے تاریخی واقعات بیان کر کے عبرت دلائی ہے اور ان کو ترقی کی طرف بلایا ہے۔ چناں چہ لکھتے ہیں:

بجا ہے آج گر اس بزم میں یہ زیب و ساماں ہیں
یہ ان کی بزم ہے جو یادگار نسل عدناں ہیں
خلیل اللہ سے مہمان نوازی جن کو پہنچی ہے
ہزاروں کوس سے آ آ کے وہ اس گھر میں مہماں ہیں
فقط اک جذبہ قومی انھیں واں کھینچ لایا ہے
جہاں زور حکومت ہے نہ حاجب ہیں نہ درباں ہیں
ہماری خدمتوں کا وہ اٹھانے آئے ہیں احساں
کہ اسلامی جماعت پر ہزاروں جن کے احساں ہیں

جن لوگوں نے اس اجلاس میں شرکت کی تھی وہ قومی جذبات سے سرشار تھے اس لیے مولانا نے بڑے عمدہ پیرائے میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

نہ ہو گا ایک بھی دل، درد قومی سے جو خالی ہو
بظاہر گرچہ سب مسرور ہیں، خرم ہیں، شاداں ہیں
انھیں احساس ہے آئین و ملت کی تباہی کا
یہ واقف ہیں کہ بیڑے قوم کے اب غرق طوفاں ہیں
انھیں معلوم ہے جس تاک میں ہے گردش گردوں
انھیں محسوس ہے جس گھات میں ایام دوراں ہیں
خبر ہے ان کو جس آزار میں چھوٹا بڑا ہے اب
یہ واقف ہیں کہ پہلے قوم کیا تھی اور کیا ہے اب

اس کے بعد قوم کی حالت کو بڑے درد سے بیان کرتے ہیں۔ چناں چہ کہتے ہیں:

علاج اپنا ہم اب تک تو سمجھتے تھے کہ آساں ہے
مگر وہ درد نکلا، جس کو ہم سمجھے تھے کہ درماں ہے
دوا ہر بار جب اپنا اثر الٹا ہی دکھلائے
تو بس سمجھو کہ اب بیمار کوئی دم کا مہماں ہے
جو سچ پوچھو تو ہے اسلامیوں کی اب یہی حالت
مرض دونا بڑھا دیتی ہے خود وہ شے جو درماں ہے

اس کے بعد لیڈروں کی بے پروائی کو بیان کرکے پھر ہمت دلاتے ہیں کہ اب بھی وقت نہیں گیا ہے، لہٰذا کچھ کرلینا چاہیے تاکہ قوم کو ترقی ہو، لہٰذا کہتے ہیں:

ہماری سب سے بڑھ کر بد نصیبی جو ہے وہ یہ ہے
کہ بے پرواہ ہیں وہ بھی قوم کے جو آج ہیں لیڈر
فقط باتیں نہ ہوں کچھ کام بھی بن آئے ہاتھوں سے
کہیں جو کچھ وہ منہ سے کر دکھائیں اس سے کچھ بڑھ کر
نہیں گر یہ تو بس اک گرمی، صحبت کے ساماں ہیں
یہ قومی مرثیے، یہ وعظ ، یہ اسپیچ، یہ لکچر
طلب اور سعی سے کچھ کام بن آئے تو بن آئے
فصاحت اور بلاغت کا بس اب چلتا نہیں منتر

تمھیں جو کام ہیں در پیش گو مشکل ہیں
مگر کرنے پہ آ جاؤ تو آساں سے ہیں آساں تر

اور بالکل آخر میں تو صاف صاف کہہ دیتے ہیں کہ اب بھی وقت ہے کہ سنبھل جاؤ ورنہ پھر مزید پستی میں گر جانے کا اندیشہ ہے۔

سنبھلنا اب بھی گر چاہو تو ہے وقت اور ضرورت بھی
وگرنہ پھر نہیں رہنے کی جو کچھ ہے یہ حالت بھی

اسی دور کا ایک اور قصیدہ ہے جس میں مسلمانوں کے اجتماع کی پہلے تعریف کی ہے پھر اپنے عزم و حوصلہ سے قوم کو ترقی دینے کا خیال ظاہر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

بزم احباب ہے پرجوش ہے جلسا کیسا — جم گیا پھر طرب و عیش کا نقشا کیسا
صفحہ عیش کی سطریں ہیں برابر دیکھو — حسن و خوبی سے یہ مجمع ہے صف آرا کیسا
نوجواں جمع ہیں یا جوش کی تصویریں ہیں — میں نے اس بزم کا کھینچا ہے سراپا کیسا
اپنے ہی ہاتھ میں ہے عقدہ کشائی اپنی — کیا زمانہ کا گلہ چرخ کا شکوا کیسا
دیکھنا آپ کھڑے ہوں گے ہم اپنے بل پر — غیر سے چارہ نوازی کا تقاضا کیسا

قومی جوش میں مولانا پرامید ہو کر حریفوں کو چیلنج دیتے ہوئے کہتے ہیں:

تم بھی سن لوگے حریفوں کبھی انشاء اللہ — قافلہ قوم کا منزل پہ وہ پہنچا کیسا

اس کے بعد مسلمانوں کے اسلاف کے تاریخی کارناموں کو گناتے ہیں، تاکہ لوگوں میں پھر ترقی کا خیال پیدا ہو اور نئے سرے سے عزم کریں۔

ہاں کمربستہ ہو اے قوم ترقی کے لیے — آج کے کام میں اندیشہ فردا کیسا
نوجوانو! یہ زمانے کو دکھا دینا ہے — اپنی قوت کو کیا، قوم نے یکجا کیسا
قوم کے تازہ نہالان چمن ہو تم لوگ — دیکھیں پھل لاتا ہے یہ نخل تمنا کیسا

اے حریفو! تمھیں خالق کی قسم سچ کہنا
شبلی خستہ نے لکھا یہ قصیدہ کیسا؟

مولانا کو سرسید کے قومی تھیٹر میں خوب گل کھلانے کا موقع ملا اور انھوں نے "تماشائے عبرت" کے نام سے ایک مسدس پیش کی۔ مسدس کیا ہے قوم کی زبوں حالی کا رونا ہے، مگر رونے کے ساتھ اسلاف کے کارناموں کو بھی بیان کیا ہے اور قوم کو غیرت دلائی ہے کہ اب بھی ہوش میں

آجائے اور ترقی کی راہ اختیار کرے، کیوں کہ اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے:

آج کی رات یہ کیوں جمع ہیں احباب بہم بھیڑ کیا ہے، نظر آتا ہے یہ کیسا عالم
نوجوانان ہنر پرور و ارباب ہمم جوق کے جوق چلے آتے ہیں کیسے ہم
کچھ سمجھ میں نہیں آتا جو یہ سب سمجھے ہیں
شاید اس بزم کو یہ بزم طرب سمجھے ہیں

آگے چل کے قوم کے سامنے سے پھر غفلت کا پردہ اٹھاتے ہوئے قوم کی زبوں حالی کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں:

ہائے افسوس کہ ہو قوم تو یوں خستہ و زار مرض الموت میں جس طرح سے کوئی بیمار
نہ معالج ہو کوئی پاس نہ سر پر غمخوار نظر آتے ہوں دم نزع کے سارے آثار
واں تو یہ حال کہ مرنے میں بھی کچھ دیر نہیں
آپ ادھر سیر تماشے سے ابھی اسیر نہیں

نوحہ، غم ہے یہاں نغمہ، عشرت کیسا ہے یہ عبرت کا سماں، جوش مسرت کیسا
ہے جنوں خیز یہ ہنگامہ، عبرت کیسا قوم کا حال ہے غفلت کی بدولت کیسا
ہے عجب سیر اگر دیدہ، بینا دیکھے
دیکھنا ہو جسے عبرت کا تماشا دیکھے

ہائے کیا سین ہے یہ بھی کہ گروہِ شرفا صاحب افسر و اورنگ تھے جن کے آبا
قوم کے عقدہ، مشکل کے جو ہیں عقدہ کشا ایکٹر بن کے وہ اسٹیج پہ ہیں جلوہ نما
قوم کے خواب پریشاں کی یہ تعبیریں ہیں
ایکٹر یہ نہیں عبرت کی یہ تصویریں ہیں

بانی، مدرسہ وہ سید والا گوہر وہ منیجنگ کمیٹی کے معزز ممبر
شبلی غمزدہ وہ شاعر اعجاز اثر اور یہ نو بادہ، اقبال کے سب برگ و ثمر
نہ تکلف کے کچھ انداز نہ کچھ جاہ کی شان
بزم میں آئے ہیں اس حال سے اللہ کی شان

اس کے بعد مسلمانوں کی تاریخ کی ورق گردانی کرتے ہوئے ان کے اسلاف کی عظمت و شان دکھلائی ہے اور قوم کو عبرت دلائی ہے کہ وہ کیسے تھے اور تم کیا ہوگئے ہو۔ اگر احساس پیدا ہو

جائے اور عمل کیا جائے تو کچھ مشکل نہیں کہ قوم پھر اسی بام ترقی پر پہنچ جائے، جس پر اگلے لوگوں نے پہنچ کر اقوام میں عزت پائی تھی۔

اس دور میں مولانا کی اردو غزلیں ملتی ہیں مگر یہ اعظم گڑھ کی ادبی فضا اور مشاعروں کی یادگار ہیں، جو غزل برائے غزل کے لیے لکھی گئی ہیں۔ پھر بھی بعض اشعار بڑے کامیاب ہیں۔ غزلیں پرانے طرز پر کہی ہیں۔ ایک غزل کا مطلع ہے:

تیر قاتل کا یہ احساں رہ گیا　　جائے دل سینہ میں پیکاں رہ گیا

محبوب کے حسن کے آگے آفتاب کی کیا حقیقت ہے، اس کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے:

حسن چمکا یار کا، اب آفتاب　　اک چراغ زیر داماں رہ گیا

معمولی شکل وصورت والے محبوب کے حسن کے آگے بزم میں کب ٹھہر سکتے تھے۔ ان کا جو حشر ہوا اس کو مولانا اس طرح بیان کرتے ہیں:

بزم میں ہر سادہ رو تیرے حضور　　صورتِ آئینہ حیراں رہ گیا

مولانا کی ایک اور غزل کا شعر ہے جس میں محبوب کے کوچے سے نکہتِ زلف یا غبارِ رہ دوست کے بڑی بے چینی سے منتظر ہیں:

نکہتِ زلف، غبار رہ دوست　　آخر اس کوچے سے کیا لائی ہے

شبِ فرقت میں تنہائی جان لیوا ہوتی ہے، پھر جب اپنا مونس و غم خوار یعنی غم زدہ دل بھی پاس نہ ہو تو وہ تنہائی والی رات بھی کیسی ہوگی کہ بیان سے بھی باہر ہے:

شبِ فرقت میں دل غمزدہ بھی پاس نہ تھا　　وہ بھی کیا رات تھی کیا عالم تنہائی تھا

کسی اور کی مجال نہ تھی کہ محبوب کے رخ کی طرف انگلیاں اٹھائے، مگر مژگان کی انگلیاں اس کے رخ کی طرف ایک بار نہیں بارہا اٹھیں:

انگلیاں اٹھتی تھیں مژگاں کی اسی رخ پیہم　　جس طرف اس بزم میں وہ کافر ترسائی تھا

شاعر غم کو دل سے نکالنے کے لیے تیار ہو سکتا ہے، مگر وہ یہ جانتا ہے کہ اگر غم کو نکال دیا تو پھر دل کی قدر و قیمت ہی ختم ہو جائے گی۔ اس کی وقعت اسی غم کی وجہ سے تو ہے۔

اور پھر کس کو پسند آئے گا ویرانہ ، دل　　غم سے مانا بھی کہ اس گھر کو میں خالی کر لوں

کسی شاعر کا ایک شعر بالکل اسی مفہوم میں ہے:

دل گیا رونق حیات گئی　　غم گیا ساری کائنات گئی

مولانا محبوب کی باغ میں آہستہ آمد کا بڑا دل چسپ سماں باندھ دیتے ہیں اور چپکے کے لفظ نے تو شعر میں جان ڈال دی ہے۔

چپکے وہ آتے ہیں گلگشت کو اے بادِ صبا   سبزہ بھی باغ میں بیدار نہ ہونے پائے

اگرچہ ان غزلوں میں کوئی انوکھی چیز نہیں پیش کی ہے، مگر فارسی ترکیبیں کلام کی زینت بن گئی ہیں۔ مولانا نے علی گڑھ کے قیام میں کالج میں معزز مہمانوں کی آمد پر ان کے خیر مقدم میں فارسی اشعار بھی اسی دور میں کہے ہیں جن کا ذکر متعلقہ سال میں کر دیا گیا ہے۔ لیکن نواب اقبال الدولہ وقار الامرا بہادر مدار المہام حیدر آباد (دکن) کی علی گڑھ میں آمد پر مولانا نے ان کے خیر مقدم میں جو قصیدہ پڑھا تھا اس کا ذکر عمداً (۲۰۰) نہیں کیا گیا تھا۔ اس میں بھی مسلمانوں کے ادبار، علی گڑھ تحریک اور کالج کی خصوصیات اور اس سے امیدیں وابستہ ہونے کا بڑا موثر بیان ہے۔ پہلا شعر ہے:

درجہاں چوں سخن از شوکت واز شان گذرد   نام دستور دکن برسر عنواں گذرد

نواب وقار الامرا کا ذکر بڑی خوبی سے کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

صدر جم مرتبہ، نواب وقار الامرا   آنکہ گردوں بدرش بندہ، فرماں گذرد

اس قصیدے میں کل چھتیس اشعار ہیں اور سب پڑھنے کے قابل ہیں۔ سید سلیمان ندوی اس قصیدے کے لکھے جانے کی تحریک کے بارے میں لکھتے ہیں (۲۰۱): "۱۸۸۵ء میں نواب سر وقار الامرا بہادر علی گڑھ پہنچے تو سرسید کی فرمائش پر شبلی نے ایک قصیدہ چھتیس شعر کا کہہ کر سنایا" (۲۰۲)۔

"اقبال الدولہ وقار الامراء کے متعلق عرض ہے کہ ۶۔ جمادی الاول ۱۳۱۱ھ م ۱۶۔ نومبر ۱۸۹۳ء کو منصرم مدار المہام ہوئے۔ ۲۔ ربیع الاول ۱۳۱۲ھ م ۵۔ ستمبر ۱۸۹۴ء کو مستقل ہوئے اور ۱۰۔ جمادی الاول ۱۳۱۹ھ م ۲۵۔ اگست ۱۹۰۱ء کو خدمت سے علیحدہ ہوئے۔ اس طرح ان کا ۱۸۹۵ء میں علی گڑھ جانا ممکن ہے۔ ۱۸۸۵ء میں لائق علی خاں مدار المہام تھے" (۲۰۳)۔

مولانا شبلی کے قصائد کے متعلق ڈاکٹر محمود الٰہی لکھتے ہیں:

"وہ قصیدے سے قومی بیداری اور حب الوطنی کی پیغام بری کا کام لینا چاہتے تھے۔ وہ اسلاف کے جوش انگیز واقعات سے حال کی مردہ دلی کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ مداحی کو وہ بڑے کام کی چیز سمجھتے تھے، بشرطیکہ اس میں صداقت و

راستی ہو اور اس سے جذبات میں تحریک پیدا ہوا۔......... وہ مدح کرتے ہیں مگر قصیدے کی روش سے ہٹ کر۔ ان کی مدح نہ کسی مخصوص عروضی ترکیب کی پابند ہے اور نہ روایتی اجزائے ترکیبی کی حامل۔ وہ مسلمانوں کے شاندار کارناموں کو دہرا کر اپنے عہد کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ شبلی کی مداحی کے پیچھے ایک متحرک نظام حیات کی حکمرانی ہے۔ وہ مدح نہیں نعرہ، رجز ہے۔ شبلی کا یہ نعرہ، رجز کبھی کبھی قصیدے کی عروضی ترکیب میں بھی مل جاتا ہے۔ تشبیب و گریز کی پابندی کے ساتھ وہ قوم کو حفظ خودی اور عرفان نفس کا درس دیتے ہیں اور اس طرح یہ ثابت کرتے ہیں کہ اگر جذبے میں شدت اور تجربے میں گہرائی ہو تو پامال راستے پر بھی چلنا برا نہیں معلوم ہوتا" (۲۰۴)۔

مولانا شبلی کے قصیدے میں طربیہ تشبیب ملتی ہے اور وہ اسلاف کے کارناموں کو بتا کر اخلاف کو ابھارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی یہی کوشش قصیدہ نگاری کو جدید شاعری کا ترجمان بنا دیتی ہے۔ چناں چہ ان کے اس قصیدے میں بھی یہی طریق کار ملتا ہے:

بزم احباب ہے پر جوش ہے جلسہ کیسا   جم گیا پھر طرب و عیش کا نقشہ کیسا

شبلی مدح کے قریب آتے آتے ناصح بن جاتے ہیں اور ناصح بھی خشک نہیں بلکہ شاعرانہ شگفتگی کا عصا لیے ہوئے اور اس طرح سید محمود کو نصیحت کرتے ہیں:

باپ کی طرح سے تو قوم کا بن پشت پناہ   جانشینی کے لیے کون ہے تجھ سے افضل
قوم کی چارہ نوازی بھی ہے تجھ پر لازم   تجھ کو خالق نے بنایا ہے جو مسعود ازل

مولانا کو شبہ ہوا کہ قصیدے کی رعایت سے لوگ ان پر غیر معمولی تعریف کرنے کا الزام نہ دھریں۔ اس کی تردید بڑی خوبی سے کر دی ہے:

مدح مقصود نہیں جوش محبت ہے یہ   میں نہیں وہ کہ لکھوں مدحتِ اربابِ دول
مجھ کو خود حسن طبیعت پہ ہے اپنے وہ ناز   کہ لکھوں مدح تو اپنا ہی لکھوں علم و عمل

گویا وہ سچی تعریف اور حقیقت کا اعتراف کرتے تھے اور بے جا تعریف اور مبالغے سے پرہیز کرتے تھے۔

مولانا کی تصنیف اور شاعری کا تیسرا دور علی گڑھ کالج چھوڑنے کے بعد سے لکھنؤ میں قیام سے پہلے تک ہے، یعنی ۱۸۹۸ء سے ۱۹۰۴ء تک۔ اگرچہ حقیقت میں یہ دور ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۴ء تک

ہے اس لیے کہ یہ مدت انھوں نے حیدر آباد (دکن) میں گزاری اور وہاں کے اثرات ان کے ذہن نے قبول کیے، لیکن چوں کہ ان کا دوسرا دور ۱۸۹۸ء تک ہے اس لیے ۱۸۹۸ء سے ۱۹۰۱ء کی درمیانی مدت بھی تیسرے دور میں شامل کر لی گئی ہے۔

مولانا عبد السلام ندوی مرحوم (۲۰۵) اور ڈاکٹر آفتاب صدیقی (۲۰۶) نے تین ہی دور قائم کیے ہیں، مگر ان کے حالات اور ذہن پر اثرات کے لحاظ سے چار ادوار ہونا چاہییں، اس لیے کہ ان کا پہلا دور علی گڑھ جانے سے قبل کا ہے جب وہ قومی درد سے آشنا نہ تھے اور مذہب کے معاملے میں بڑے سخت تھے اور فرقہ ورانہ کشمکش اور گروہ بندی کی جکڑ بندیوں میں پھنسے ہوئے تھے اور خیالات اور احساسات کا ان کی تصانیف پر اثر ہے اور شاعری میں اس زمانے کی بے فکری اور مشاعروں میں ان کی شرکت اور بے کاری کے مشغلے کا خاص اثر ہے۔

علی گڑھ آئے تو قومی درد پیدا ہو گیا۔ لہٰذا اس دور کی شاعری اور تصانیف قومی درد میں ڈوبی ہوئی، قومی وقار کو بلند کرنے والی، اسلاف کے کارناموں کو اجاگر کرنے والی اور اخلاف کو انھیں کے نقش قدم پر چلنے کی تلقین کرواتی ہے۔

چوں کہ حیدر آباد (دکن) میں مولانا کا ایک خاص ماحول اور خاص مدت تک قیام رہا اس لیے اس کا اثر مولانا پر پڑنا لازمی تھا اور اس وقت سے ایک درمیانی دور یعنی دور سوم بھی ہے۔ مولانا نے علی گڑھ سے ہٹنے کے بعد اعظم گڑھ میں قیام کیا اور اس زمانے میں خاصے بیمار رہے، جس کی وجہ سے مولانا حالی کو ان کے متعلق بڑی فکر رہی کہ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں، لیکن اس حالت میں بھی الفاروق کی تکمیل میں لگے رہے۔ اسی زمانے میں مولانا کے والد کا انتقال ہو گیا اور مولانا پر ان کے چھوڑے ہوئے قرض کا بار پڑا، جس سے وہ گھبرا گئے اور پریشان ہو کر حیدر آباد (دکن) چلے گئے۔ اعظم گڑھ کے قیام کے زمانے میں مولانا نے قصیدہ، کشمیر مکمل کیا اور اس میں اپنے علاج کا ذکر بڑی خوبی سے کیا ہے۔ یہ قصیدہ فارسی میں ہے، جس میں کہتے ہیں:

مصطفیٰ خان کہ اسسٹنٹ سول سرجن ہست از رہ لطف بہ اعظم گڑھ آمد ناخواست داشت چوں سابقۂ معرفتے با اسحٰق کہ اخ اصغر من ہست و بہر ما یہ سزاست (۲۰۷)۔ اس کے بعد ہی اپنے منجھلے بھائی مولوی اسحٰق کی اس طرح تعریف کرتے ہیں:

آنکہ از دولت او بازو من ہست قوی　　　آنکہ از نسبت او نازش من ہست و بجاست

ڈاکٹر مصطفیٰ صاحب کی تشخیص کو بڑی خوبی سے اس شعر میں بیان کرتے ہیں:

رو بھمی کرد، بفرمود کہ از غایت ضعف　　کار خودی تنگ شد دل کہ رئیس الاعضاست

اس کے بعد علاج وغیرہ کی تفصیل ہے۔ اس میں مولانا نے واقعات کو حقیقت اور سادگی سے بیان کیا ہے۔

اپنے والد کے انتقال پر مولانا نے فارسی میں مرثیہ کہا جو اپنے اثر و کیف کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔ اگر مولانا کی بے چینی اور بے قراری دیکھنا ہو تو ان کے یہ اشعار پڑھے جائیں۔ کہتے ہیں:

ہاں اے پدر نہ گویمت ایں در زد آں مکن　　زنہار عزم رہبردی آن جہاں مکن
دعوائے صبر گہ بہ غلط ہم نہ کردہ ام　　ہاں اے پدر! بہ صبر مرا امتحاں مکن
دستان سرا بزم طرب بودہ ام بدہر　　مارا بنوحہ زمزمہ سنج فغاں مکن
کوہ غم فراق توانم کہ بر کشم　　بازوں منے شکستہ وزار ایں گماں مکن

ایسے موقع پر مولانا کو اپنے منجھلے بھائی مہدی مرحوم بھی یاد آگئے۔ چناں چہ کہتے ہیں:

مہدی اگر گذشت سرتن بازماندہ ایم　　باب پاش دہمری رفتگان مکن

اس کے بعد اپنے یتیم بھتیجے کو، جس کو دادا پال رہے تھے، دیکھ کر مولانا کا اس کی بے کسی پر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ چناں چہ کہتے ہیں:

پسند ایں کہ بیکس و بے خان وتماں شود　　ہاں آن قدر بمان کہ مظفر جواں شود

آخری بند میں ایسی تصور کشی کی ہے کہ غم کی کیفیت بے چین کر دیتی ہے:

آہ آں زمان کہ نقش را مزار کرد　　وآثار مرگ بررخ ونبض آشکار کرد
عم بزرگوار کہ آسیہ سرد وید　　مالش بدمہ گریہ، بی اختیار کرد
شبلی رسید ونالہ زدو بسمل افتاد　　اسحاق آمد وشرہ را اشکبار کرد
مستور خانہ آمدواز سینہ برکشید　　آں تیر آہ کزدل گردوں می گزار کرد
حالی بہم رسید کہ طفل وجوان و پیر　　از ہوش رفت و جامہ، خود تار تار کرد
آہ از جفائے مرگ کہ با حالتے چنیں　　رحمی نکرد و شیوہ، جور اختیار کرد
المختصر جو جاں بہ جہاں آفریں سپرد　　چادر کنار رحمت پروردگار کرد

چوں ہر کسے بہ در گہش امید وار ہست
آمرزش فدای کہ آمرزگار ہست

مولانا حیدر آباد پہنچے تو وہاں امیر مینائی اور داغ کی وجہ سے شعراء کے جمگھٹے تھے۔ گویا لکھنوی اور دہلوی شاعری اٹھ کر حیدر آباد چلی گئی تھی۔ چناں چہ مولانا بھی باوجود اپنی مالی پریشانیوں اور قرض کی فکروں کے، اسی ماحول میں گھل مل گئے اور فکر سخن میں دونوں استاد شعراء کے ہم نوا رہے۔ یہ ایک حساس شاعر پر شاعرانہ ماحول کا اثر تھا۔ اس کے متعلق ڈاکٹر آفتاب صدیقی لکھتے ہیں:

"جب شدتِ احساس کا یہ عالم ہو تو کیسے ممکن تھا کہ مولانا کی زبان و قلم سے نکلے ہوئے الفاظ ان اثرات سے خالی ہوتے، جن کا اس زمانے اور اس ماحول میں پیدا ہو جانا لازمی تھا۔"

شبلی نے جس سیاسی، دینی اور معاشرتی خلفشار میں جنم لیا، اس کا ذکر فضول ہے۔ بس اتنا جان لینا کافی ہے کہ انھوں نے اپنے دور کے ہر نقش کو قبول کیا اور اس سے متاثر ہوئے (۲۰۸)۔

مولانا نے حیدر آباد کے مشاعروں میں حصہ لیا اور داغ سے تو بڑے تعلقات تھے اور ان کی شاعری کے مداح تھے۔ چناں چہ ان تاثرات کو خاصا قبول کیا ہوگا۔ مگر افسوس ہے کہ اس زمانے کی ان کی شاعری میں سوائے ایک اردو غزل کے اور کچھ نہیں ملتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا نے یہاں جو کچھ شاعری کی وہ اپنے ساتھ لیتے گئے تھے (۲۰۹)۔ جن لوگوں نے ان کی غزلوں کو نقل کر لیا تھا وہ رودِ موسیٰ کی نذر ہو گیا۔ مولانا جو شاعری ساتھ لائے تھے وہ ندوے میں چوری کی وجہ سے ضائع ہو گئی۔۔ بہر حال حیدر آباد میں مختلف الجھنوں، جن میں وہاں کی درباری سازشیں شامل ہیں، مولانا کی ایک غزل حیدر آباد کے تبرک کے طور پر محفوظ رہ گئی ہے، جو اس طرح ہے:

اثر کے پیچھے دل حزیں نے سراغ چھوڑا نہیں کہیں کا
گئے ہیں نالے جو سوے گردوں تو اشک نے رخ کیا زمیں کا

نالوں کا آسمان کی طرف جانا اور اشکوں کا زمین پر گرنا صفتِ تضاد کی اعلیٰ مثال کہی جا سکتی ہے۔ یہ شعر تو بڑا شوخ ہے، گویا بمبئی کی پر کیف شاعری کی تمہید ہے:

وہی لڑکپن کی شوخیاں ہیں وہ اگلی سی ہی شرارتیں ہیں
سیانے ہوں گے تو ہاں بھی ہو گی ابھی تو سن ہے نہیں نہیں کا

مولانا کو یہ احساس تھا کہ اردو شاعری میں بھی علی حزیں کا تتبع کرتے ہیں، اس چیز کو تسلیم

کیا ہے۔ ایک اور خوبی بھی ہے کہ مطلع میں دل حزیں کہا ہے اور مقطع میں علی حزیں کا ذکر ہے:

پہ نظم آئیں ، یہ طرز بندش سخنوری کیا فسوں گری ہے
کہ ریختہ میں بھی تیرے شبلی مزہ ہے طرز علی حزیں کا

چوں کہ مولانا مالی پریشانیوں میں گھرے ہوئے تھے، قرض کی ادائیگی کی فکر تھی، ذہن پر افسردگی چھائی ہوئی تھی، وہی ان کے قلم سے بھی ٹپکی پڑتی تھی۔ چناں چہ یہاں جتنی کتابیں لکھیں وہ خشک ہیں یا پھر مرثیے سے متعلق۔ یہاں مولانا نے الکلام، علم کلام، الغزالی، سوانح مولانا روم اور موازنہ انیس و دبیر لکھیں۔

الکلام اور علم کلام تو خشک ہونا چاہیے، مگر الغزالی بھی یہاں کے ماحول، مولانا پر پریشانی کے اثرات اور ان دونوں کی کتابوں کی پلیٹ میں دوسری سوانح عمریوں کے مقابلے میں خشک ہے اور موازنہ انیس و دبیر میں مولانا کا شاعرانہ ذوق اگر آڑے نہ آتا تو اس کی حزنیہ شاعری نہ صرف حزن و ملال کو بڑھاتی بلکہ خشک بھی ہوتی، مگر مولانا کے اعلیٰ ذوق نے اس کو بڑی حد تک شگفتہ اور شاداب بنا دیا ہے۔ اشعار کے انتخاب سے اس میں جان پڑ گئی ہے اور انیس و دبیر کے موازنے اور تقابل سے ایک ادبی رنگ میں آگئی ہے اور ادبی موازنوں کے لیے راہ ہموار کر گئی ہے۔ انیسیوں اور دبیریوں کو تو موقع ہاتھ آگیا اور انھوں نے ایک دوسرے کے خلاف خوب خوب گل فشانیاں کیں۔ چناں چہ جب نظیر حسین رضوی نے دبیر کی حمایت میں المیزان لکھی اور مولانا کو بھیجی تو مولانا نے ان کے خط کے جواب میں اپنی کتاب کی بھی تعریف کی اور بڑی خوبی سے کی اور لکھا کہ آج مجھ کو موازنہ کی قدر ہوئی کہ اس کی وجہ سے ایک اچھی کتاب لکھی جا سکی۔ مولانا نے جس اصول پر موازنہ لکھی اس کی دیباچے میں پہلے ہی وضاحت کر دی ہے۔ اب اس اصول کو جو تسلیم کرے وہ مولانا کے ڈھنگ پر تنقید نہیں کر سکتا اور جو اصول کو تسلیم نہ کرے وہ اصول پر بے شک تنقید کر سکتا ہے، مگر کتاب پر نہیں۔ بہر حال ایک چوک مولانا سے پھر بھی ہو گئی ہے کہ انھوں نے اس کا موازنہ نام رکھا ہے اور موازنہ میں دونوں کی کچھ نہ کچھ خوبیوں کو بیان کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، جو اس میں نہیں ہے۔ اس میں میر انیس کو بڑھایا گیا ہے اور معترضین کے خیال کے مطابق مرزا دبیر کو گرایا گیا ہے۔ مگر اس چیز کی پہلے ہی (دیباچے میں) وضاحت کر دی گئی ہے، لہٰذا یہ اعتراض کمزور پڑ جاتا ہے (۲۱۰)۔

مولانا نے الکلام اور علم کلام بڑی تلاش و تحقیق سے لکھا ہے اور اکثر مسلمان فرقوں کے

اقوال کے حوالے دیے ہیں۔ وہی حوالے ان کے لیے سم قاتل بن گئے ہیں، بلکہ یوں کہا جائے کہ کفر کی دلیل بنا لیے گئے ہیں۔ مخالفین نے حوالے کی عبارت کو مولانا سے منسوب کر کے پیش کیا اور علمائے کرام نے اور مفتی صاحبان نے بغیر کتابوں کو پڑھے اور دیکھے اور تحقیق کیے کفر کے فتوی کی سند دے دی اور بعض فتوے تو مولانا کے مرحوم ہونے کے بعد اور سیرت نگار (۲۱۱) کی حیثیت سے رحمت کی آغوش میں جگہ پانے کے بعد بھی جاری ہوتے رہے اور زبان حال سے یہی کہتے رہے کہ اللہ تعالیٰ نے بے شک جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائی ہوگی، مگر ہم میں تو ان کا کفر نقش ہو کر رہ گیا ہے، کیوں کہ علماء کے ہم پر دستخط ہیں اور مفتیوں کی مہریں ثبت ہیں۔

الکلام اور علم کلام ہی کے زیر اثر مولانا نے الغزالی لکھی۔ ویسے الفاروق شروع کرنے سے قبل سر سید نے اس کی فرمائش کی تھی، مگر ان کی فرمائش ان کے انتقال کے بعد پوری ہو سکی۔ اس میں مولانا نے ثابت کیا ہے کہ الغزالی نے فلسفے کو مسلمان بنا دیا اور علم کلام میں جان ڈال دی۔ علم کلام اگرچہ خلافتِ عباسیہ میں پیدا ہو چکا تھا مگر غزالی نے اس کو اپنی ذہانت و فراست سے ایک مستقل فن بنا دیا اور ایسا مضبوط کر دیا کہ فلسفے کے ملحدانہ فکر پر ضرب کاری ثابت ہوا۔

سوانح مولانا روم میں مولانا نے ان کی سوانح کے ساتھ ساتھ شاعری کی خوبیوں کو وجدانی انداز پر لکھا ہے۔ مگر چوں کہ مولانا کا تصوف کا خانہ خالی تھا، اس لیے جو کیفیت تصوف کی شاعری میں تھی اس کو صحیح طور پر نہیں پیش کر سکے ہیں۔ لیکن اس کو لکھنے کا سبب مولانا کا علم کلام سے لگاؤ ہے اور سوانح مولانا روم کو علم کلام کی ایک کڑی سمجھ رکھا ہے۔ چناں چہ خود فرماتے ہیں:

"مولانا روم کو دنیا جس حیثیت سے جانتی ہے وہ فقہ و تصوف ہے اور اس لحاظ سے متکلمین کے سلسلے میں داخل کرنا اور اس حیثیت سے ان کی سوانح عمری لکھنا لوگوں کو موجبِ تعجب ہو گا، لیکن ہمارے نزدیک اصل علم کلام بھی ہے کہ اسلام کے عقائد کی اس طرح تشریح کی جائے اور اس کے حقائق و معارف اس طرح بتائے جائیں کہ خود بخود دل نشین ہو جائیں۔ مولانا نے جس خوبی سے اس فرض کو ادا کیا ہے مشکل سے اس کی نظیر مل سکتی ہے، اس لیے ان کو زمرہ متکلمین سے خارج کرنا سخت ناانصافی ہے۔"

پروفیسر محمد ظفر خان سوانح مولانا روم کے بارے میں لکھتے ہیں

"مثنوی سے دل چسپی رکھنے والے حضرات اگر "سوانح مولانا روم"

کے اس حصے کو پڑھنے کی زحمت گوارا فرمادیں تو بہت سے راز سربستہ ان پر منکشف ہوں گے اور اس مادی دور میں ذاتِ باری، صفاتِ باری، نبوت، معجزہ، وحدت وجود، ایسے بہت سے مسائل کے سمجھنے میں انھیں دقت نہ ہوگی ان اوراق کے مطالعے سے یہ بات واضح ولائح ہوجاتی ہے کہ مولانا نے بحرِ ذخار مثنوی کی غواصی کرکے بے شمار درِ آبدار کو سفینۂ تحریر میں اس خوبصورتی سے پیش کیا ہے کہ جنھیں دیکھ کر چشم دیدہ ور کو نور اور قلب مضطر کو سکون و سرور میسر ہوتا ہے۔ چشم بصیرت روشن اور آئینۂ دل متجلی ہوتا ہے۔ یہ وہ دربہائے شاہوار ہیں جن کی چمک دمک رہتی ہے دنیا تک خاصان ادب کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کرتی رہے گی اور دل حق شناس مولانا روم کے ساتھ ساتھ شبلی مرحوم کی بارگاہ میں بھی ستائش و سپاس کے گلہائے بوقلموں نثار کرنے میں فخر محسوس کرے گا۔"

مولانا کی تصنیف اور شاعری کا چوتھا دور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۴ء تک ہے۔ اس دور میں مولانا نے بکثرت مقالات لکھے ہیں جو الندوہ، وکیل، امرتسر اور مسلم گزٹ، لکھنو میں شائع ہوئے ہیں۔ شاعری کے لحاظ سے مولانا کا یہ زریں دور ہے۔ اسی میں انھوں نے شعرالعجم کے پانچ حصے لکھے۔ پانچواں حصہ ان کے انتقال کے بعد شائع ہوا۔ شعرالعجم جس زمانے میں لکھ رہے تھے اس زمانے میں فارسی شاعری اپنے شباب پر تھی۔ لطف یہ کہ بمبئی کی آمد و رفت بھی اسی دور میں شروع ہوئی اور وہاں کے بے باک حسن نے شراب و شباب کی شاعری میں ایک نئی کیفیت پیدا کردی۔ گویا حافظ کی روح پاک و ہند میں جلوہ گر ہوکر یہاں کی شاعری کو اس بلندی پر لے گئی کہ اس کے بعد یہ عروج اس کو حاصل نہ ہوا۔ غزلوں میں مولانا حافظ شیرازی سے بہت متاثر تھے، چناں چہ ان کی بعض غزلوں پر حافظ کا گمان ہوتا ہے۔ حافظ کا ایک شعر ہے:

عاشق و رند و نظر بازم و می گویم فاش　　تابدانی بہ چندیں ہنر آراستہ ام

اور شبلی کہتے ہیں:

رندی و سیہ کاری مستی و نظر بازی　　زیں گونہ اگر خواہی بسیار ہنر دارم

مولانا کے شعر میں سادگی اور روانی حافظ سے بڑھ جاتی ہے اور اسی وجہ سے کیف کو دوبالا کردیتی ہے۔

مرزا احسان احمد بیگ مولانا کی غزل کے متعلق لکھتے ہیں:

"مولانا کی شاعرانہ طلسم کاریوں کا اصلی تماشاگاہ غزل ہی ہے، جہاں وہ

محض رندِ بے باک کی صورت میں نظر آتے ہیں۔"

مولانا کو حافظ شیرازی سے خاص عقیدت تھی (۲۱۲)۔ چناں چہ کہتے ہیں:

گر خداوندی ہوس داری درا قلیم سخن   بندگی حافظ شیراز می بایست کرد

جوش بیان، جدتِ ادا، رندی و سرمستی مولانا کے کلام میں اسی عقیدت مندی کی بناء پر پیدا ہوئی۔

دو دل بودن دریں رہ سخت تر عیبے ست سالک را
خجل ہستم زکفر خود کہ دارد بوے ایماں ہم (۲۱۳)

مولانا حالی اس شعر کو پڑھ کر وجد کرنے لگتے ہیں۔ چناں چہ لکھتے ہیں:

"شاید لوگ تعجب کریں کہ اس شعر میں وجد کرنے کی کون سی بات ہے، مگر اس شعر سے ہر شخص لطف نہیں اٹھا سکتا" (۲۱۴)۔

مولانا کی غزلوں میں بلا کا تغزل ہے۔ چناں چہ کہتے ہیں:

روے وچنیں روے شایانِ نہفتن نیست   بگذار کہ ایں پردہ از روے تو بردرام (۲۱۵)

من فداے بت شوخے کہ بہ ہنگامِ وصال   بمن آموخت خود آئین ہم آغوشی را (۲۱۶)

یہ غزل تو اپنی کیف و مستی کے لحاظ سے حافظ سے بھی بڑھ جاتی ہے۔ چناں چہ مطلع میں بمبئی پر ہر متاع کو نثار کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ جس نے ان پر سرور کی یہ کیفیت پیدا کر دی ہے کہتے ہیں:

نثار بمبئی کن ہر متاع کہنہ و نورا   طرازِ مسندِ جمشید و فرتاج خسرورا

دلربا کی شوخیوں اور بے پروائی کو دیکھ کر دل والے بھی دل تھام کر رہ جاتے ہیں تو شاعر تو حساس ہوتا ہے، وہ کیسے نہ تڑپ جاتا۔

بہ ہر سو از ہجوم دلبرانِ شوخ بے پروا   گذشتن از سرِرہ مشکل افتادست رہرورا

اس کیف و مستی کو پرجوش بنانے میں زردشتی حسن کو بڑا دخل تھا۔ لہٰذا اس کا اظہار بڑی خوبی سے کرتے ہیں:

فغاں از گرمی ہنگامہ، خوبان زردشتی   بہم آمیختہ از زلف و عارض، ظلمت و ضورا

اور حافظ کے مصرعے پر کس خوبی سے گرہ لگائی ہے، حافظ کا مصرع تھا:

"بدہ ساقی می باقی کہ در جنت نخواہی یافت"

مولانا کی لگائی ہوئی گرہ کی خوبی کا واقعی اندازہ بمبئی کی چوپاٹی اور اپالو بندر کی سیر کرنے

والے ہی لگا سکتے ہیں۔ مولانا کہتے ہیں:

کنار آب چوپانی و گلگشت اپالورا

مقطع تو غزل کی جان ہے:

بیا شبلی بہ یاد پنجہ گیرائی مژگانش دگر رہ پارہ سازم این قبای زہد صد تورا

(۲۱۷)

ایک اور شعر ہے:

ہاں! بیا، تا کنم از بوسہ نشان برلب تو شاہ حسنی و ترا نقش و نگیں می باید (۲۱۸)

مولانا کی فارسی شاعری کے متعلق رضیہ بیگم لکھتی ہیں:

"فارسی زبان و شعر سے انھیں جو جذباتی لگاؤ تھا، ان کا انھوں نے جتنا گہرا مطالعہ کیا تھا اور جیسی طبع موزوں رکھتے تھے، اس کے ہوتے ہوئے جب کہ اسی زمانے میں وہ شعرالعجم لکھ بھی رہے تھے تو کبھی کبھار کے کچھ حسین لمحوں اور خلوت شوق کے تاثرات کو خوبصورت شعر کا روپ دے دینا شبلی کے لیے مشکل بھی کیا تھا۔ چناں چہ "دستہ گل" کی تقریباً سب ہی غزلیں بمبئی کی انھیں خوش محفلوں اور مست نگاہیوں کی، میں کہوں گی کہ پردہ در نہیں بلکہ پردہ دار ہیں" (۲۱۹)۔

غرض کہ مولانا جب تک شعرالعجم کے کوچے میں رہے فارسی غزلوں میں بھی اپنے جوہر دکھاتے رہے۔ شعرالعجم کی بہار ختم ہوئی تھی تو مولانا کی فارسی شاعری نے بھی خزاں کا منہ دیکھا۔ اس کے بعد مولانا نے کبھی اتفاقیہ ہی فارسی میں اشعار کہے ورنہ اب وہ اردو شاعری کی طرف متوجہ ہو چکے تھے اور ابھی اس میں جوہر دکھانا باقی تھا۔ چوں کہ زندگی کی مہلت کم سے کم ہوتی جارہی تھی اس لیے اردو شاعری میں کوئی خاص پابندی نظر نہیں آتی ہے یعنی ایک ہی وقت میں سیاسی شاعری، اخلاقی شاعری اور مذہبی شاعری (تاریخ اسلام کا کوئی مشہور واقعہ) پر فکر سخن کرتے ہیں۔ حساس طبیعت کے لیے کچھ واقعات و حادثات بھی ایسے پیہم ہوئے کہ مولانا کو جذبات پر قابو رکھنا مشکل ہو گیا۔ جنگ طرابلس اور بلقان، کان پور کی مسجد کا واقعہ، مسلم لیگ کی بے عملی اور مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے واقعات نے تمام دنیا کے مسلمانوں اور خصوصاً ہندوستان کے مسلمانوں کو بے چینی اور بے کیفی میں مبتلا کر دیا تھا۔ مولانا ان حالات کو دیکھ کر تڑپ جاتے تھے اور اپنی بے قراری کو شاعری میں موزوں کر کے پیش کرتے تھے۔ رئیس احمد جعفری مولانا کی شاعری کے متعلق اس طرح لکھتے ہیں:

"مولانا کی شاعری " پیشہ ور " شعرا کی طرح غزلیات، قصائد، و اسوخت، اور اس قسم کی دوسری صنعتوں کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ مولانا، ملک و قوم پر جب کوئی بپتا پڑتی دیکھتے تھے، تو مجبور ہو کر اپنا درد دل نالہ موزوں کی صورت میں ظاہر کرتے تھے۔ "(۲۲۰)

مولانا نے الہلال کلکتہ میں کشاف اور وصاف کے نام سے شاعری کی ہے اور یہ وہ شاعری ہے جو سیاست سے تعلق رکھتی ہے اور جس میں حکومت کی طرف سے گرفت کا امکان تھا یا کوئی ایسی بات بیان کی ہے یا کسی ایسے شخص کے متعلق کہا ہے کہ جس کے متعلق مولانا اپنے نام سے لکھنا نہ چاہتے تھے۔

چناں چہ مولانا نے کشاف کے نام سے ایک طنزیہ مضمون (۲۲۱) پہلی مرتبہ ۱۱۔ اگست ۱۹۱۲ء کو الہلال کلکتہ میں شائع کرایا۔ اس میں آغا خان اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی پر طنزیہ اعتراضات ہیں۔

" مراسلات " کے عنوان کے تحت الہلال نے اڈیٹوریل نوٹ "نظرے خوش گزرے" اثر خامہ حضرت (کشاف) کے تحت مندرجہ ذیل عبارت کے ساتھ شائع کیا ہے:

" حضرت (کشاف) سے ہمارے پرانے وعدے تھے۔ رسالے کی اشاعت کے ساتھ ہی ہم نے یاد دہانیاں شروع کر دیں۔ لیکن بجائے اپنے مخصوص طرز علمی کے آج پہلی مرتبہ اس بزم میں آئے بھی، تو قلم و کاغذ لے کر نہیں، بلکہ ظرافت کے چند کھلونے اچھالتے ہوئے۔ خیر اس کو بھی غنیمت سمجھتے ہیں، مگر آئندہ ہمیں معاف رکھیں۔ اگر اس طرح کے لطائف و فکاہات کی اشاعت سے معذوری ظاہر کریں۔ ان کو اپنے اصلی پایہ، علمی کو ملحوظ رکھ کر سلسلہ، سخن شروع کرنا چاہیے۔ "

یہ مضمون ظرافت کے انداز میں اس طرح شروع ہوتا ہے۔ اڈیٹر سے خطاب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" یہ مانا کہ آپ سے قلمی امداد کا وعدہ کر لینے کا جرم غلطی سے کر چکا ہوں، مگر اس کے لیے یہ تو ضرور نہیں کہ آپ طرابلس کو چھوڑ کر مجھی پر اپنے جہادی وار شروع کر دیں۔ اور ہاں آپ تو ابھی شمالی افریقہ میں عرب بدوؤں کے خیموں کی چوبیں گنا رہے تھے، کبھی خمس کے معرکے میں نظر آتے تھے اور کبھی سنوسی کے علم جہاد پر لکھی ہوئی آیتوں کو نوٹ کرنے میں دنیا و مافیہا سے

غافل تھے۔ معرکہ، جہاد و دفاع کی مشغولیتوں سے آپ کو فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ یہ یکایک آپ کفرستان ہند میں کہاں سے آگئے؟ اور پھر کراچی یا بمبئی کے بندر پر بھی نہیں عین وسط ہند یعنی علی گڑھ میں، اور وہاں بھی اسٹریچی ہال کی سیڑھیوں کے سامنے! خیر اب نزول اجلال فرمایا ہے تو کبھی کبھی مجھے بھی اپنے ساتھ لے لیا کیجیے۔ اور نہیں تو جب کبھی آپ قلم کان میں رکھ کر آستین چڑھائیے گا تو میں بھی اپنے لطائف و ظرائف کے کشکول سے ترکش اور نیام کا کام لینے کے لیے مستعد ہو جاؤں گا۔" (صفحہ ۶)

الہلال میں نقاد اور شغاف کے نام سے بھی نظمیں ملتی ہیں، جن کا اسلوب نگارش مولانا شبلی ہی کا معلوم ہوتا ہے۔ چناں چہ سید سلیمان ندوی یونیورسٹی ڈپوٹیشن از نقاد، مطبوعہ الہلال، کلکتہ، مورخہ ۵۔ مارچ ۱۹۱۳ء، صفحہ ۱۵۶ کو کلیاتِ شبلی (اردو)، صفحہ ۹۷۔ ۹۸ میں شائع کیا ہے۔ بہر حال مولانا کی اخلاقی نظمیں تو ان کے اصل نام سے اور ان کے طنزیات اور مطائبات، فکاہات کے عنوان کے تحت کبھی کشاف، وصاف، نقاد اور شغاف کے نام سے چھپتے رہے۔

الہلال کلکتہ نے ۲۰۔ نومبر ۱۹۱۲ء کی اشاعت میں صفحہ ۱۲ پر شہر آشوب اسلام، یا تعزیتِ عید، عید الضحیٰ کے موقع پر مولانا کی مشہور نظم شائع کی جس کا مقطع یہ ہے:

جو ہجرت کر کے بھی جائیں، تو شبلی اب کہاں جائیں
کہیں اب کیا کہ دامن گیری ہندوستاں کب تک

یہ مقطع کلیاتِ شبلی (اردو) میں اس طرح شائع ہوا ہے:

جو ہجرت کر کے بھی جائیں، تو شبلی اب کہاں جائیں
کہ اب امن و امانِ شام و نجد و قیرواں کب تک

الہلال کلکتہ میں ۲۶۔ مارچ ۱۹۱۳ء کو فکاہات (۲) کے تحت "ترکوں کو صلاح ترک یورپ از شغاف صفحہ ۲۰۰ پر یہ نظم شائع ہوئی۔ یہ کلیاتِ شبلی میں نہیں ہے۔

نہیں کچھ امتیازِ دوست دشمن اس زمانے میں
کرم فرما جنھیں کہتے تھے، وہ نکلے ستم آرا
وہ آغا خاں، جنھیں ہندوستاں کے سادہ دل مسلم
کہا کرتے تھے کل تک " ناخدا ہست کشتی مارا "
ہیں لکھتے آج ایک مضمون ٹائمس آف بمبئی میں
جسے پڑھ کر ہر اک مسلم کا دل ہوتا ہے صد پارا

وہ لکھتے ہیں کہ "بہتر ہے کہ یورپ چھوڑ دے ٹرکی"
اٹھا لے جائے ارض ایشیا کو اپنا پشتارا
یہ کیسی رائے ہے؟ کیوں ہے؟ نہ پوچھو اس معمے کو
یہ ہیں اسرار پنہاں ان کے افشا کا نہیں یارا
مگر کہنا یہ ہے، سنتے ہی یہ مضمون شور افزا
بڑھا جوش و خروش ایسا کہ ہر اک شخص ہنکارا
جہاں دیکھا، جسے دیکھا، مخالف ہی نظر آیا
نہیں دو چار، ہم آہنگ تھا ہندوستاں سارا
بھری اک سانس ٹھنڈی اور پڑھا یہ شعر حافظ کا
سنا جب حضرتِ شفاف نے یہ ماجرا سارا
"من از آں حسن روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم
کہ عشق از پردہ عصمت بروں آرد زلیخا را
کھلا عقدہ نہ آغا خاں کی اس شوری طرازی کا
بہت ہم عقل دوڑایا کیے، ہر چند سرمارا
نظر آیا بالآخر ایک سیاح جہاں دیدہ
کہ حل کرد او زتیر و فراست این معمارا
کہا اس نے "صلاح ترک یورپ" پر تعجب کیوں
مگر شاید نمی دانی تو قوم و ملک آغا را
یہ ایرانی ہیں، جو ہیں عاشقان خانہ برانداز
ہے ان کا قول یہ باوصف فقد شاہی دارا
اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا
بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را
بہت چھینٹے دیے بار و مزاجوں نے انھیں، لیکن
کسی صورت نہ مقیاس الحرارت کا دبا پارا
یہ بڑھتا جوش جب دیکھا، تو حامی بن کے ترکوں کے
بڑھا کر ہاتھ چندے کا، مسلمانوں کو تھپکارا

یہ پالیسی، یہ ترکیبیں ہیں پالیسس کے جوہر
کبھی تعریف فرما دی، کبھی برعکس لکھ مارا

بلقان کی لڑائی میں ڈاکٹر انصاری کا وفد گیا تھا۔ جب واپس آیا تو مولانا نے ایک نظم خیر مقدم میں کہی، جو بڑی پر درد اور پر اثر ہے۔ مطلع یہ ہے:

مسلمانوں کے تم نے طالع واژوں بھی دیکھے ہیں
نئے سب انقلابِ گردش گردوں بھی دیکھے ہیں

گلیڈاسٹون اس زمانہ میں برطانیہ کا وزیر اعظم تھا۔ یہ بڑا متعصب تھا اور ترکوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے پر تلا ہوا تھا۔ اس کے متعلق کہتے ہیں:

مسلمانوں کا قتل عام اور ترکوں کی بربادی
نتائج ہائے امید گلیڈسٹون بھی دیکھے ہیں

لیکن شاعر مایوس نہیں ہے بلکہ پر امید ہے اور امید بندھاتا ہے۔ چناں چہ کہتا ہے:

سہارا ہے اگر امید کا اب بھی کوئی باقی
تو تم نے وہ رموزِ قوت مکنوں بھی دیکھے ہیں
عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر اچھل آئے
کہ ہم نے انقلابِ چرخ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں

کان پور کی مسجد کے واقعے کے موقع پر مولانا بمبئی میں تھے، مگر سن کر تڑپ گئے اور قلم سے خون کے آنسو بہائے ہیں۔ چناں چہ لکھتے ہیں:

پنہائی جارہی ہیں عالمانِ دیں کو زنجیریں
یہ زیور سید سجاد عالی کی وراثت ہے
یہی دس بیس اگر ہیں کشتگان خنجر اندازی
تو مجھ کو سستی بازوئے قاتل کی شکایت ہے
عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں
کہ یہ بچے ہیں ان کو جلد سو جانے کی عادت ہے
شہیدان وفا کی خاک سے آتی ہیں آوازیں
کہ شبلی بمبئی میں رہ کے محروم سعادت ہے

کان پور کے سلسلے میں سب سے موثر نظم ایک پر اثر مرثیہ ہے جس میں شہیدوں کی تفصیل ہے۔ اس کو پڑھ کر پتھر دل بھی تڑپ جاتے ہیں۔

کل مجھ کو چند لاشۂ بیجاں نظر پڑے
دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفل خورد سال ہیں جو چپ ہیں خود مگر
بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
آئے تھے اس لیے کہ بنائیں خدا کا گھر
نیند آ گئی ہے منتظر نفخ صور ہیں
کچھ نوجواں ہیں بے خبر نشۂ شباب
ظاہر میں گرچہ صاحب عقل و شعور ہیں
اٹھتا ہوا شباب یہ کہتا ہے بے دریغ
مجرم کوئی نہیں ہے مگر ہم ضرور ہیں

سینے پہ ہم نے روک لیے برچھیوں کے وار — از بسکہ مست بادۂ ناز و غرور ہیں
کچھ پیر کہنہ سال ہیں دلدادۂ فنا — جو خاک و خون میں بھی ہمہ تن غرق نور ہیں
پوچھا جو میں نے کون ہو تم ؟ آئی یہ صدا
ہم کشتگان معرکۂ کان پور ہیں

مولانا مسلم لیگ کو نوابوں اور جاگیرداروں کی جماعت سمجھتے تھے اور آزادی کی راہ میں رکاوٹ خیال کرتے تھے۔ اور انگریزوں کی طرف سے آزادی کی راہ میں ڈالا ہوا روڑا خیال کرنا بیجا بھی نہ تھا۔ اس لیے کہ اس کی اب تک کی تاریخ میں جی حضوری کے سوا کچھ نہ تھا۔ لہٰذا مولانا نے اس کو ہدفِ ملامت بنایا اور کئی نظمیں لکھیں۔ نمونے کے طور پر ایک نظم پیش کی جاتی ہے:

مسلم لیگ

جنابِ لیگ سے میں نے کہا کہ اے حضرت — کبھی تو جا کے ہمارا بھی ماجرا کہیے
کلیم، طور پہ کرتے تھے عرض قوم کا حال — تو آپ شملہ پہ کچھ حال قوم کا کہیے
معاملاتِ حکومت میں دیجیے کچھ دخل — یہ کیا کہ قصۂ پادینۂ وفا کہیے
خدا نخواستہ ترکِ وفا نہیں مقصود — ہر ایک بات باندازِ آشنا کہیے
عدالتوں کی پریشانیاں بیاں کیجیے — فسانۂ ستم و جورِ ناروا کہیے
دراز دستی پولیس کا کیجیے اظہار — مقدمات کے حالاتِ فتنہ زا کہیے
گزر رہی ہے یہ جو کچھ کہ کاشتکاروں پر — یہ داستان الم ناک و غم فزا کہیے
شیوعِ علم میں قیدیں جو بڑھتی جاتی ہیں — یہ کون شیوۂ دانش ہے، اس کو کیا کہیے ؟
سنائیے انھیں کچھ بحر قہر و جبر کا حال — پھر اس کے بعد ستمہائے ناخدا کہیے
برادران وطن کہہ رہے ہیں کیا کیا کچھ — کبھی تو آپ بھی افسانۂ جفا کہیے
کبھی تو رد و قدح کی بھی کیجیے جرأت — جو بات بات پہ ہر بار مرحبا کہیے
نہ ہو سکے تو اشاروں میں کیجیے اظہار — وگرنہ لطف تو یہ ہے کہ برملا کہیے

جنابِ لیگ نے سب کچھ یہ سن کے فرمایا
مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہیے (۲۲۲)

سیاسی نظموں کے ساتھ ساتھ مولانا اخلاقی اور تاریخ اسلام کے کسی واقعے کو بھی نظم کر رہے تھے۔ چناں چہ "اظہار و قبولِ حق" کے عنوان سے حضرت عمر فاروقؓ کا ایک واقعہ نظم کیا

ہے، جو نمونہ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے:

وارث عدل پیمبر عمرؓ ابن الخطاب
بیچ تھی جن کے لیے منزلتِ تاج و سریر

مجمع، عام میں لوگوں سے انھوں نے یہ کہا
مہر باندھو نہ زیادہ کہ ہے یہ بھی تبذیر

جس قدر تم کو ہو مقدور وہیں تک باندھو
حکم یہ عام ہے سب کو، امرا ہوں کہ فقیر

ایک بڑھیا نے وہیں ٹوک کے فوراً یہ کہا
تجھ کو کیا حق یہ ہے جو تو کرتا ہے ایسی تقریر

صاف قرآن میں قنطار کا لفظ آیا ہے
تجھ کو کیا حق ہے کہ اس لفظ کی کردے تغییر

لاکھ تک بھی ہو تو کہہ سکتے ہیں اس کو قنطار
تھا یہ ایک وزن کہ اس وزن کی یہ ہے تعبیر

سر نگوں ہو کے کہا حضرت فاروقؓ نے آہ
میں نہ تھا اس سے جو واقف، تو یہ میری تقصیر

(۲۲۴)

جہانگیر کا انصاف مشہور ہے، لیکن مولانا نے "عدل جہانگیری" کے نام سے ایک نظم لکھ کر اس کے انصاف کو عالمی شہرت اور حیاتِ جاوید عطا کر دی۔ لکھتے ہیں:

"عدل جہانگیری"

قصر شاہی میں کہ ممکن نہیں غیروں کا گزر
ایک دن "نور جہاں" بام پہ تھی جلوہ فگن

کوئی شامت زدہ رہ گیر ادھر آنکلا
گرچہ تھی قصر میں ہر چار طرف سے قدغن

غیرت حسن سے بیگم نے طپنچہ مارا
خاک پر ڈھیر تھا اک کشتہ، بے گور و کفن

ساتھ ہی شاہ جہانگیر کو پہنچی جو خبر
غیظ میں آگئی ابروے عدالت پہ شکن

حکم بھیجا کہ کنیزان شبستان شہی
جا کے پوچھو آئیں کہ بیچ یا کہ غلط ہے یہ سخن

نخوت حسن سے بیگم نے بصد ناز کہا
مجھ سے ناموس حیا نے یہ کہا تھا کہ "بزن"

اس کی گستاخ نگاہی نے کیا اس کو ہلاک
کشور حسن میں جاری ہے یہی شرع کہن

مفتی، دین سے جہانگیر نے فتویٰ پوچھا
کہ شریعت میں کسی کو نہیں کچھ جائے سخن

مفتی، دیں نے بے خوف و خطر صاف کہا
شرع کہتی ہے کہ قاتل کی اڑا دو گردن

لوگ دربار میں اس حکم سے تھرا اٹھے
پر جہانگیر کے ابرو پہ نہ بل تھا، نہ شکن

ترکنوں کو یہ دیا حکم کہ اندر جا کر
پہلے بیگم کو کریں بستہ، زنجیر و رسن

پھر اسی طرح اسے کھینچ کے باہر لائیں — اور جلاد کو دیں حکم کہ ہاں تیغ بزن
یہ وہی نور جہاں ہے کہ حقیقت میں یہی — تھی جہانگیر کے پردہ میں شہنشاہِ زمن
اس کی پیشانیِ نازک پہ جو پڑتی تھی گرہ — جا کے بن جاتی تھی اوراقِ حکومت پہ شکن
اب نہ وہ نور جہاں ہے، نہ وہ اندازِ غرور — نہ وہ غمزے ہیں، نہ وہ عربدہ، صبر شکن
اب وہی پاؤں ہر اک گام پہ تھراتے ہیں — جن کی رفتار سے پامال تھے مرغانِ چمن
ایک مجرم ہے کہ جس کا کوئی حامی نہ شفیع — ایک بے کس ہے کہ جسکا نہ کوئی گھر، نہ وطن

خدمتِ شاہ میں بیگم نے یہ بھیجا پیغام — "خوں بہا بھی تو شریعت میں ہے اک امرِ حسن"
مفتیِ شرع سے پھر شاہ نے فتویٰ پوچھا — بولے جائز ہے، رضامند ہوں گر بچہ و زن
وارثوں کو جو دیے لاکھ درم بیگم نے — سب نے دربار میں کی عرض کی اے شاہِ زمن
ہم کو مقتول کا لینا نہیں منظور قصاص — قتل کا حکم جو رک جائے تو ہے مستحسن
ہو چکا جب کہ شہنشاہ کو پورا یہ یقیں — کہ نہیں اس میں کوئی شائبہ، حیلہ و فن
اٹھ کے دربار سے آہستہ چلا سوے حرم — تھی جہاں نور جہاں معتکفِ بیتِ حزن

دفعتہ پاؤں پہ بیگم کے گرا اور یہ کہا (۲۲۴)

"تو اگر کشتہ شدی، آہ چہ می کردم من ؟"

مولانا کی اردو شاعری کا ذکر مکمل نہ ہوگا اگر خون کے چند قطرے دنیا میں مسلمانوں کی تعداد کیوں نہیں بڑھتی، پا بہ زنجیران کان پور کو نہ پیش کیا جائے۔ ان اشعار سے مولانا کی شاعرانہ صلاحیت اور واقعات کو صداقت سے پیش کرنے کا جوہر کھلتا ہے۔

"خون کے چند قطرے"

اگرچہ آنکھ میں نم بھی نہیں ہے اب باقی — اگرچہ صدمۂ بلقان سے جگر شق ہے
بچا رکھے ہیں، مگر میں نے چند قطرۂ خوں — کہ کان پور کے بھی زخموں کا کچھ حق ہے

(۲۲۵)

"دنیا میں مسلمانوں کی تعداد کیوں نہیں بڑھتی"

کیا پوچھتے ہو یہ کہ رسول عرب کی قوم — کیوں گھٹ رہی آج عدد میں ظہور میں
سن لو وہ گنجہائے گراں مایہ دفن ہیں — کچھ بیلقاں کی خاک میں کچھ کان پور میں

(۲۲۶)

"پا بہ زنجیران کان پور"

ہم قدم آپ کا ہونا تو بہت ہے دشوار | ان کا کیا ذکر جو اس درد میں شامل ہی نہیں
پاؤں کٹنے کا مجھے آج ہوا ہے صدمہ | یعنی افسوس میں زنجیر کے قابل ہی نہیں

(۲۲۷)

بہرحال یہ تھی مولانا کی اردو شاعری جس نے پاک و ہند میں روزمرہ کے حادثات اور تاریخی واقعات کو نظم کرنے اور شاعری میں اپنانے کے لیے راہ ہموار کی اور لوگوں کو توجہ دلائی۔ رئیس احمد جعفری نے بالکل سچ کہا ہے:

"حقیقت یہ ہے کہ آزاد و حالی نے جس "طرح نو" کی بنیاد ڈالی تھی، مولانا نے اسے مکمل کر کے بتلا دیا کہ قلم فرسائی اس طرح کی جاتی ہے" (۲۲۸)

اور فارسی شاعری کے متعلق محی الدین احمد کا یہ کہنا نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ:

"شعر و سخن مولانا کا کوئی خاص مشغلہ نہیں تھا لیکن اس پر بھی انھوں نے اس فن کے لیے جو معیار مقرر کیا ہے اس کے وہ خود بھی پابند تھے اور ان کا ہر شعر اسی معیار پر پورا اترتا تھا۔ وہ معیار کیا ہے، ان ہی کی زبان سے سنیے:

شعر گر دامن دل می نکشد بانگ خراست | نغمہ گر نیست دل آشوب لغوغا ماند

آپ ان کا پورا کلیات پڑھ جائیے، کوئی شعر اس معیار سے گرا ہوا نہ پائیں گے۔ پھر جس شاعر کا کلام اس قدر بلند ہو تو اس کا یہ کہنا:

روشنم شد بہ نوا سنجی شبلی کا مروز | ہند را نیز قمی ہست و صفاہانی ہست

کوئی شاعرانہ تعلّی نہیں حقیقت اور بالکل حقیقت ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ مولانا کی فارسی شاعری کا ظہور اسے وقت ہوا جب کہ ہندوستان میں فارسی کی شمع ٹمٹا رہی تھی۔ ان کے اس بلند پایہ کلام کو کون سمجھ سکتا، کون لطف اٹھا سکتا اور کون داد دے سکتا تھا، اس لیے کبھی حسرت سے کہتے ہیں:

شبلیا کیست کزو داد سخن می خواہی | گو نظیری نبود شیخ حزیں می باید (۲۲۹)

مولانا ابو الکلام آزاد نے مولانا کی فارسی شاعری کے متعلق یہ الفاظ لکھے:

"ہندوستان میں فارسی شاعری غالب پر نہیں ان پر (شبلی پر) ختم ہوئی" (۲۳۰)۔

مولانا کے اس شاعرانہ کمال اور فارسی دانی کے پیش نظر یہ اشعار کچھ بے جا نہیں، جن میں ان کو فارسی شعرا کی صف میں کھڑا کر کے ان کا فارسی شاعری میں درجہ متعین کیا گیا ہے:

چو غالب رہا شد زبند ملال خدیو سخن شد عزیز از کمال
سخن یافت چون از عزیز انصرام ملک گشت شبلی بملک کلام (۲۳۱)

اگر مولانا صرف شاعر ہوتے اور شاعری کی طرف پوری توجہ کرتے تو شاید ایسا شاعر کئی صدیوں تک پاک و ہند میں پیدا نہ ہوتا۔ معمولی تغیر کے ساتھ ان کے لیے موزوں ہے:

نیا ہے لیجیے جب ذکر اس کا عجب وسعت ہے داستان شبلی میں

حواشی:

۱۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۱۰۹-۱۱۰، ۲-جنوری ۱۹۱۴ء
۲۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۲۹۵، ۶-جنوری ۱۹۱۴ء
۳۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۵۰، حمید الدین کے نام، ۷-جنوری ۱۹۱۴ء
۴۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۹۶-۲۹۵
۵۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۵۳-۲۵۱، ۱۰-جنوری ۱۹۱۴ء
۶۔۔۔ مکاتیب دوم، صفحہ ۵۰، ۵۱، حمید الدین کے نام، ۱۰-جنوری ۱۹۱۴ء
۷۔۔۔ شروانی کے نام، صفحہ ۲۰۷، مکاتیب اول، ۲-جنوری ۱۹۱۴ء
۸۔۔۔ زبیری کے نام، صفحہ ۵۲-۲۵۳ مکاتیب اول، ۱۲-جنوری ۱۹۱۴ء
۹۔۔۔ مکاتیب اول، صفحہ ۳۲۶، ۵-جنوری ۱۹۱۴ء
۱۰۔۔۔ سید سلیمان کے نام مکاتیب دوم، صفحہ ۵-۱۰۴، ۱۷-فروری ۱۹۱۴ء
۱۱۔۔۔ زبیری کے نام، صفحہ ۲۵۴، مکاتیب اول، ۲۵-جنوری ۱۹۱۴ء
۱۲۔۔۔ افتخار عالم کے نام، صفحہ ۳۳۰، ۲۵-جنوری ۱۹۱۴ء
۱۳۔۔۔ مہدی حسن کے نام، صفحہ ۲۳۴، مکاتیب دوم، ۲۵-جنوری ۱۹۱۴ء
۱۴۔۔۔ زبیری کے نام، صفحہ ۲۵۵، ۳۰-جنوری ۱۹۱۴ء
۱۵۔۔۔ خود نوشت سوانح عمری از مولانا امین زبیری، سہ ماہی "اردو" کراچی، صفحہ ۳۳ تا ۹۸
۱۶۔۔۔ حمید الدین کے نام، صفحہ ۵۲ تا ۵۴، ۳۰-جنوری ۱۹۱۴ء
۱۷۔۔۔ عبد الماجد دریابادی کے نام، صفحہ ۲۹۶، مکاتیب اول، ۳۱-جنوری ۱۹۱۴ء
۱۸۔۔۔ ندوہ کا مدرسہ پہلے ماموں بھانجے کی قبر کے قریب ایک عمارت میں تھا۔ یہ عمارت اب خاتون منزل

کے نام سے مشہور ہے۔ یہ عمارت فقیر محمد ہتھے میں واقع ہے اور محلہ گولہ گنج کہلاتا ہے۔
۱۹ ـــ مکاتیب اول، صفحہ ۲۹۶، یکم۔ فروری ۱۹۱۳ء
۲۰ ـــ مکاتیب اول، صفحہ ۲۹۷، ۲۔ فروری ۱۹۱۳ء
۲۱ ـــ ندوۃ العلماء کی قدیم عمارت اب خاتون منزل کے نام سے مشہور ہے۔ مولانا عبد الماجد دریابادی لکھنو میں اسی عمارت میں قیام کرتے ہیں۔
۲۲ ـــ سید صاحب کے نام، صفحہ ۱۰۵ تا ۱۰۷، مکاتیب دوم، ۵۔ فروری ۱۹۱۳ء
۲۳ ـــ شروانی کے نام، مکاتیب اول، صفحہ ۲۰۸، ۱۲۔ فروری ۱۹۱۳ء
۲۴ ـــ مکاتیب اول، صفحہ ۲۰۸، ۱۶۔ فروری ۱۹۱۳ء
۲۵ ـــ مکاتیب دوم، صفحہ ۱۰۷، ۱۸۔ فروری ۱۹۱۳ء
۲۶ ـــ عبد السلام کے نام، صفحہ ۱۵۰-۱۵۱، مکاتیب دوم، ۲۶۔ فروری ۱۹۱۳ء
۲۷ ـــ ریاض حسین خاں کے نام، صفحہ ۱۹۳، مکاتیب دوم، ۲۶۔ فروری ۱۹۱۳ء
۲۸ ـــ عبد الماجد کے نام، مکاتیب اول، صفحہ ۹۸-۲۹۷، ۲۸۔ فروری ۱۹۱۳ء
۲۹ ـــ مکاتیب دوم، صفحہ ۱۲۱، ۲۸۔ فروری ۱۹۱۳ء ۳۰ ـــ مکاتیب اول، صفحہ ۲۰۹، ۳۔ مارچ ۱۹۱۳ء
۳۱ ـــ مکاتیب اول، صفحہ ۹۹-۲۹۸، ۳۔ مارچ ۱۹۱۳ء ۳۲ ـــ ایضاً
۳۳ ـــ مکاتیب اول، صفحہ ۲۹۹، ۵۔ مارچ ۱۹۱۳ء ۳۴ ـــ مکاتیب اول، صفحہ ۱۰-۲۰۹، ۹۔ مارچ ۱۹۱۳ء
۳۵ ـــ مکاتیب دوم، صفحہ ۱۶۱، ۹۔ مارچ ۱۹۱۳ء ۳۶ ـــ مکاتیب اول، صفحہ ۲۵۶، ۱۲۔ مارچ ۱۹۱۳ء
۳۷ ـــ مکاتیب اول، صفحہ ۳۰۰-۲۹۹، ۱۳۔ مارچ ۱۹۱۳ء
۳۸ ـــ الندوہ، ج ۵، نمبر ۱۱-۱۲، ۱۹۱۰ء، مضامین ایمان بالغیب و مکررات القرآن۔
۳۹ ـــ مکاتیب دوم، صفحہ ۷۳، ۱۳۔ فروری ۱۹۰۹ء ۴۰ ـــ مکاتیب دوم، صفحہ ۱۳۹، ۲۶۔ مارچ ۱۹۱۰ء
۴۱ ـــ سید صاحب نے خط میں نام شائع نہیں کیا (مولانا دریابادی نے مجھ سے نجی گفتگو میں بابائے اردو کا نام بتلایا اور انداز تحریر سے بھی انھیں کی طرف اشارہ ہے۔ ہاشمی)
۴۲ ـــ مکاتیب دوم، صفحہ ۲۶-۲۲۵، ۱۱۔ مارچ ۱۹۱۳ء
۴۳ ـــ مولانا دریابادی نے مجھ سے خود بیان کیا۔ (ہاشمی)
۴۴ ـــ مکاتیب دوم، صفحہ ۵۳-۱۵۲، ۱۶۔ مارچ ۱۹۱۳ء
۴۵ ـــ مکاتیب دوم، صفحہ ۱۶۱، ۱۹۔ مارچ ۱۹۱۳ء
۴۶ ـــ مولانا دریابادی کا بیان نجی گفتگو میں۔ (ہاشمی)
۴۷ ـــ جلسہ انتظامیہ منعقدہ ۱۹۔ جولائی ۱۹۱۳ء کو مولانا شبلی کا استعفا پیش ہو کر منظور ہوا۔
۴۸ ـــ مولوی مسعود علی کا وطن۔
۴۹ ـــ شاہ معین الدین ندوی، مدیر ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ کا وطن۔
۵۰ ـــ یہ خط بمبئی سے ۲۵۔ جولائی ۱۹۱۳ء کو لکھا گیا ہے (اصل خط کی نقل دفتر ندوۃ العلماء واقع گوئن روڈ لکھنو کے خصوصی رجسٹر میں موجود ہے)۔
۵۱ ـــ خصوصی رجسٹر مملوک دفتر ندوۃ العلماء واقع گوئن روڈ لکھنو۔

۵۲ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۸۰،۱۷-۸-اپریل ۱۹۱۳ء

۵۳ .... مولانا کے استعفےٰ کی وجہ سے طلبہ ناظم ندوہ سے ناراض تھے۔ بعض اور باتیں بھی ناظم کی وجہ سے انتشار کا سبب بنیں اور طلبہ نے اسٹرائک کردی۔

۵۴ .... البشیر مولوی بشیر احمد صاحب کی ادارت میں اٹاوہ سے نکلتا تھا اور مولانا کے خلاف لکھا کرتا تھا۔

۵۵ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۲-۱۲۱، اپریل ۱۹۱۳ء

۵۶ .... ایضاً

۵۷ .... مولوی اکرام اللہ ندوی جولائی ۱۹۱۳ء سے الندوہ کے ایڈیٹر ہوئے تھے۔

۵۸ .... مولانا دریابادی اپریل ۱۹۱۳ء سے پہلے بی-اے پاس کر چکے تھے۔

۵۹ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۳-۱۲۲، اپریل ۱۹۱۳ء ۶۰ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۴-۱۲۳، اپریل ۱۹۱۳ء

۶۱ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۷۳-۱۷۲، ۱۷-اپریل ۱۹۱۳ء ۶۲ .... غالباً ہمدرد دہلی کی طرف اشارہ ہے۔

۶۳ .... مولوی عبد السلام کے اس خط کی طرف اشارہ ہے جس کی نقل اوپر دی گئی ہے۔ جس کو انتظامیہ کمیٹی ندوۃ العلماء نے مولانا اور ان کے ساتھیوں کے خلاف استعمال کیا۔

۶۴ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۵۴-۱۵۳، ۲۰-اپریل ۱۹۱۳ء

۶۵ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۷۳، ۲۹-اپریل ۱۹۱۳ء

۶۶ .... مولوی مسعود علی نے اس اسٹرائک میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا اور طلبہ کے خورد و نوش اور رہائش کا اس عمدگی سے انتظام کیا تھا کہ وہ مشکلات سے بچے رہے اور اسٹرائک ۳ ماہ تک جاری رکھ سکے۔ مولانا کی دور رس نگاہ نے مولوی مسعود علی کی اس غیر معمولی انتظامی صلاحیت کا اندازہ اسی اسٹرائک سے لگایا تھا۔

۶۷ .... تذکرۃ المشاہیر (مولانا شبلی مرحوم)، مرتبہ محمد مہدی، ۷-دسمبر ۱۹۲۵ء- بشیر پاشا سیریز میں اس طرح ہے- اراکین ندوہ کے علاوہ کچھ اور اصحاب بھی موقع کے منتظر تھے- یہ علی گڑھ کی مخصوص جماعت تھی جو ندوہ کی ترقی کو باوجود سرسید علیہ الرحمۃ، سید محمود مرحوم، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک مرحوم کی تائید کے رقیبانہ نظروں سے دیکھتی تھی- ایک غضب یہ ہو گیا کہ اس زمانہ۔ انتظار و ہیجان میں سیاسیات اور یونی ورسٹی کے بعض مسائل کے متعلق مولانا نے جو نظم و نثر میں اپنے خیالات ظاہر کیے تھے اور بعض نظموں میں دکھتی رگوں کو چھیڑ دیا تھا، جس نے اس جماعت کو تلملا دیا، اس لیے یہ بھی اس موقع پر جماعت ندوہ یا مخالف منتظمین کی تائید کے پردے میں مولانا کے خلاف حرکت میں آئی۔

۶۸ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۸-۷۰، ۱۰ مئی ۱۹۱۳ء ۶۹ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۷۵-۱۷۴

۷۰ .... ایضاً ۷۱ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۷۶-۱۷۵، ۱۹-مئی ۱۹۱۳ء

۷۲ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۷۶، ۷-جون ۱۹۱۳ء، بمبئی سے

۷۳ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۷۹-۱۷۸، بمبئی سے

۷۴ .... مولانا شبلی کا ۹-جولائی ۱۹۱۳ء کو استعفا منظور ہوا۔

۷۵ .... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۷۶، ۷-جون ۱۹۱۳ء

۷۶ .... مولوی عبد الشکور صاحب فاروقی کاکوروی مرحوم۔

۷۷ ــــ مکاتیب اول، برحاشیہ صفحہ ۲۵۶

۷۸ ــــ مکاتیب اول، صفحہ ۷-۲۵۶،۵-۸-جون ۱۹۱۳ء

۷۹ ــــ مکاتیب اول، صفحہ ۳۰۲، ۲۰-جون ۱۹۱۳ء

۸۰ ــــ ارکین ندوہ کے علاوہ کچھ اور اصحاب بھی موقع کے منتظر تھے- یہ علی گڑھ کی ایک مخصوص جماعت تھی جو ندوہ کی ترقی کو باوجود سرسید علیہ الرحمتہ، سید محمود مرحوم، نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک مرحوم کی تائید کے رقیبانہ نظروں سے دیکھتی تھی- ایک غضب یہ ہوگیا کہ اس زمانہ، انتشار و ہیجان میں سیاسیات اور یونی ورسٹی کے بعض مسائل کے متعلق مولانا نے جو نظم و نثر میں اپنے خیالات ظاہر کیے تھے اور بعض نظموں میں دکھتی رگوں کو چھیڑ دیا تھا، جس نے اس جماعت کو تلملا دیا، اس لیے یہ بھی اس موقع پر حملت ندوہ یا مخالفت منتظمین کی تائید کے پردے میں مولانا کے خلاف حرکت میں آئی (مولانا شبلی نعمانی مرحوم، بشیر پاشاہ و سیریز، اٹاوہ، ۱۹۲۵ء)

۸۱ ــــ مکاتیب اول، مولانا دریابادی کے نام، صفحہ ۳۰۱، ۱۱-جون ۱۹۱۳ء

۸۲ ــــ مکاتیب دوم، صفحہ ۱۲۳، ۱۵-جون ۱۹۱۳ء

۸۳ ــــ مکاتیب اول، صفحہ ۳۰۱-۳۰۲، ۱۹-جون ۱۹۱۳ء

۸۴ ــــ مکاتیب اول، صفحہ ۳۰۲، ۱۹-جون ۱۹۱۳ء

۸۵ ــــ مکاتیب اول، صفحہ ۲۵۷-۵۸، ۱۸-جون ۱۹۱۳ء

۸۶ ــــ مولوی عبدالحق مفسر تفسیر حقانی-

۸۷ ــــ مولوی عبدالحق نے تفسیر حقانی سرسید کے جواب میں لکھی تھی-

۸۸ ــــ مکاتیب اول، صفحہ ۲۱۰-۱۱، ۲۵-جون ۱۹۱۳ء

۸۹ ــــ مکاتیب اول، صفحہ ۳۰۲، ۲۰-جون ۱۹۱۳ء

۹۰ ــــ مکاتیب دوم، صفحہ ۱۰۸-۹، ۲۱-جون ۱۹۱۳ء

۹۱ ــــ پونا کالج میں پروفیسری کی حیثیت سے-

۹۲ ــــ مکاتیب دوم، صفحہ ۱۰۸-۹، ۲۱-جون ۱۹۱۳ء

۹۳ ــــ غیر مطبوعہ خط مملوکہ مولوی ابوالحسن علی ندوی مدظلہ و محمد میاں سلمہ-

۹۴ ــــ مکاتیب اول، صفحہ ۳۰۳، ۲۲-جون ۱۹۱۳ء

۹۵ ــــ شیخ خلیل عرب ندوی مدرس مدرسہ عالیہ کلکتہ-

۹۶ ــــ مکاتیب دوم، صفحہ ۱۱۰، ۲۳-جون ۱۹۱۳ء ۹۷ ــــ شیخ خلیل عرب-

۹۸ ــــ مکاتیب دوم، صفحہ ۱۲۵، ۲۳-جون ۱۹۱۳ء ۹۹ ــــ مکاتیب اول، صفحہ ۳۰۳، ۲۸-جون ۱۹۱۳ء

۱۰۰ ــــ مکاتیب اول، صفحہ ۳۲۷، ۲۹-جون ۱۹۱۳ء ۱۰۱ ــــ ایضاً

۱۰۲ ــــ مکاتیب اول، صفحہ ۲۵۸-۵۹، ۳۰-جون ۱۹۱۳ء

۱۰۳ ــــ مکاتیب دوم، صفحہ ۱۱۰-۱۱، ۳۰-جون ۱۹۱۳ء

۱۰۴ ــــ مکاتیب دوم، صفحہ ۱۲۹، ۳۰-جون ۱۹۱۳ء

۱۰۵ ــــ دارالعلوم حیدر آباد (دکن) کے پرنسپل-

۱۰۶ ..... بعد کو مولوی شیر علی صاحب حیدر آباد دکن میں ملازم ہو گئے تھے۔

۱۰۷ ..... مکاتیب شبلی، حصہ دوم، صفحہ ۱۱۱، بمبئی سے ۲۰- جولائی ۱۹۱۳ء

۱۰۸ ..... مکاتیب شبلی، حصہ دوم، صفحہ ۳۰-۱۲۹، ۲- جولائی ۱۹۱۳ء

۱۰۹ ..... جے راج پور، مولانا کے آبائی وطن "بندول" سے شمال مغرب میں دو یا تین میل پر واقع ہے۔

۱۱۰ ..... مکاتیب شبلی، حصہ دوم، صفحہ ۱۲-۱۱۱، ۳- جولائی ۱۹۱۳ء

۱۱۱ ..... مولوی معین الدین ندوی کے نام، صفحہ ۱۶۲، جلد ۲، ۴- جولائی ۱۹۱۳ء

۱۱۲ ..... مکاتیب شروانی کے نام، ۱۹- جولائی ۱۹۱۳ء- صفحہ ۲۱۱، مکاتیب حصہ اول

۱۱۳ ..... سید سلیمان کے نام مکاتیب دوم، صفحہ ۱۱۲- ۱۶- جولائی ۱۹۱۳ء

۱۱۴ ..... نواب علی حسن کے نام مکاتیب دوم- صفحہ ۷۷-۱۷۶، ۶- جولائی

۱۱۵ ..... مکاتیب شبلی، اول، صفحہ ۲۲۸، ۱۲- جولائی ۱۹۱۳ء

۱۱۶ ..... سید صاحب کے نام، صفحہ ۱۱۳، جلد دوم، ۱۵- جولائی ۱۹۱۳ء، بمبئی سے

۱۱۷ ..... سید سلیمان کے نام، مکاتیب دوم، صفحہ ۱۴-۱۱۳، ۱۶- جولائی ۱۹۱۳ء

۱۱۸ ..... مکاتیب دوم، صفحہ ۲۹-۱۲۸، ۱۸- جون ۱۹۱۳ء، بمبئی سے

۱۱۹ ..... سید صاحب کے نام، صفحہ ۱۵-۱۱۴، جلد ۲، ۱۸- جولائی ۱۹۱۳ء، بمبئی سے

۱۲۰ ..... مولوی مسعود علی کے نام، صفحہ ۲۸-۱۲۷، ۲۳- جولائی ۱۹۱۳ء

۱۲۱ ..... مولوی مسعود علی کے نام، صفحہ ۱۲۷، جلد دوم، ۲۷- جولائی ۱۹۱۳ء، بمبئی سے

۱۲۲ ..... مولوی مسعود علی کے نام، صفحہ ۱۲۹، جلد دوم، ۲۷- جولائی ۱۹۱۳ء

۱۲۳ ..... مکاتیب اول، صفحہ ۶۰-۲۵۹، ۲۸- جولائی ۱۹۱۳ء

۱۲۴ ..... سید صاحب کے نام مکاتیب، جلد ۲، صفحہ ۱۶-۱۱۵، ۱۸- جولائی ۱۹۱۳ء

۱۲۵ ..... زبیری کے نام مکاتیب، ۲۶۱، جلد ۲، صفحہ ۲۹- جولائی ۱۹۱۳ء

۱۲۶ ..... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۲۶، ۲۹- جولائی ۱۹۱۳ء

۱۲۷ ..... مولانا کے حقیقی منجھلے بھائی جو الہ آباد میں ہائی کورٹ کے کامیاب وکیل تھے۔

۱۲۸ ..... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۱۹، ۱۰- اگست ۱۹۱۳ء

۱۲۹ ..... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۶۲، ۱۴- اگست ۱۹۱۳ء

۱۳۰ ..... مولانا کے چھوٹے بھائی۔

۱۳۱ ..... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۳۰، ۱۸- اگست ۱۹۱۳ء

۱۳۲ ..... مکاتیب دوم، صفحہ ۳۱-۱۳۰، ۲۹- اگست ۱۹۱۳ء

۱۳۳ ..... دیباچہ کلیات شبلی، اردو، ۱۹۳۰ء، طبع سوم، معارف پریس، اعظم گڑھ۔

۱۳۴ ..... مکاتیب اول، صفحہ ۳۰۸، ۲۲- ستمبر ۱۹۱۳ء

۱۳۵ ..... مولانا کے منجھلے بھائی۔

۱۳۶ ..... مولانا حالی نے بھی اپنے بڑے بھائی کا مرثیہ ۱۸۸۵ء - ۱۸۸۶ء میں لکھا تھا - اس مرثیے میں اور مولانا شبلی کے مرثیے میں وہی فرق ہے جو ان کی طبیعتوں میں ہے - مولانا حالی غم کی وجہ سے چپ چپ سے نظر آتے تھے اور پوچھنے پر آہیں بھرتے ہیں - مولانا شبلی غم سے بے تاب ہو جاتے ہیں اور تڑپ اٹھتے ہیں اور جب اظہار غم کرتے ہیں تو لوگ تڑپ جاتے ہیں - مولانا حالی حساس ہیں، لیکن برداشت کی قوت بھی رکھتے

ہیں - صدمے سے نڈھال ہیں - ان کا صدمہ اور پریشانی چہرے سے ظاہر ہوتی ہے - "صورت ببیں حالت مپرس" اور دریافت کرنے پر آہ بھرتے ہیں اور پھوٹ پڑتے ہیں، گویا زخم کو کریدنے پر تکلیف کا اظہار کرتے ہیں - لیکن انداز دھیما ہے، فرماتے ہیں:

کل سوگ میں بھائی کے اسے دیکھ کے چپ چاپ
حالی سے کہا ہم نے کہ اے بحر معانی

خاموش کبھی ہم نے تجھے یوں نہیں دیکھا
کیا ہو گئی وہ تیری طبیعت کی روانی

ہنستا ہے، نہ روتا ہے، نہ بذلہ ہے، نہ نوحہ
کچھ کہہ تو سہی دل میں یہ کیا تو نے ہے ٹھانی

اک آہ بھری سن کے یہ حالی نے کہ جس سے
دل ہل گئے اور سب کے لہو ہو گئے پانی

حالی ہی کو معلوم ہے حالی کی حقیقت
مشکل ہے کسک دل کی عزیزوں کو دکھانی

آئے ہیں سدا بھائیوں سے بھائی بچھوڑتے
موت ایک کے آگے ہے ضرور ایک کو آنی

آخر میں کہتے ہیں:

جیتا بھی رہا بھائی گر اس بھائی کے پیچھے
لذت نہیں جینے سے نصیب اس کو اٹھانی

دل مردہ ہو حالی کی طرح جس کا عزیزو
کیا ڈھونڈتے ہو اس کی طبیعت میں روانی

برخلاف اس کے مولانا شبلی کے غم دل اور زخم جگر چھیڑنے کی ضرورت نہیں ہوتی اور وہ خود ہی پھوٹ پڑتے ہیں - خود تڑپتے ہیں اور دوسروں کو تڑپا دیتے ہیں اور مولوی اسحق کا غم ان کا غم نہیں رہتا، بلکہ آفاقی ہو جاتا ہے - رشید احمد صدیقی نے مولانا محمد علی کے متعلق لکھا ہے: "ولادت تو مادر زاد ہوتی ہے لیکن محمد علی کی موت خانہ زاد تھی -" (گنجہائے گراں مایہ، صفحہ ۱، یونیورسٹی بک ڈپو، اردو بازار، راولپنڈی) یہی چیز مولوی اسحق کی موت کے لیے کچھ تغیر کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ مولوی اسحق کی موت مولانا شبلی کے مرثیے کی وجہ سے خانہ زاد ہو گئی -

ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان مولانا حالی کے مرثیے کے متعلق لکھتے ہیں:

"اس قطعے میں کل بیس شعر ہیں، لیکن وہ اپنی سلامت اور روانی کے علاوہ قلبی واردات کے لحاظ سے بھی بہت عمدہ یادگار قرار پائیں گے" (حالی کا ذہنی ارتقاء، صفحہ ۹۴) - اور مولانا شبلی کے مرثیے کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی تڑپ اور اثر کے لحاظ سے ہمیشہ تر و تازہ رہے گا -

۱۳۷ ... مولوی مسعود علی کے نام، صفحہ ۱۳۸، جلد - ۲، ۴ - ستمبر ۱۹۱۳ء
۱۳۸ ... سید صاحب کے نام، صفحہ ۱۱۶ - جلد ۲، ۵ - ستمبر ۱۹۱۳ء
۱۳۹ ... مولوی مسعود علی کے نام، صفحہ ۱۳۱ - جلد ۲، ۲ - ستمبر ۱۹۱۳ء
۱۴۰ ... افتخار عالم کے نام، صفحہ ۳۳۰ - جلد اول، ۸ - ستمبر ۱۹۱۳ء
۱۴۱ ... مسعود علی کے نام، صفحہ ۱۳۸-۳۹، ۱۱ - ستمبر ۱۹۱۳ء
۱۴۲ ... مسعود علی کے نام، صفحہ ۱۳۹-۴۰، جلد ۲، ۱۸ - ستمبر ۱۹۱۳ء
۱۴۳ ... مسعود علی کے نام، صفحہ ۱۴۰ - جلد ۲، ۲۰ - ستمبر ۱۹۱۳ء
۱۴۴ ... مولوی حمید الدین فراہی کے نام، صفحہ ۵۳، جلد ۲، اعظم گڑھ -
۱۴۵ ... مسعود علی کے نام، صفحہ ۱۴۰، جلد ۲ -
۱۴۶ ... مولوی عبد السلام کے نام، صفحہ ۱۵۴-۵۵، ۵ - اکتوبر ۱۹۱۳ء، اعظم گڑھ سے -

۱۴۷ ... سید صاحب کے نام صفحہ ۱۱۶-۱۱۷، جلد ۲، ۱۰-اکتوبر ۱۹۱۲، اعظم گڑھ سے۔
۱۴۸ ... مسعود علی کے نام، صفحہ ۳۶-۱۳۵، اکتوبر (جلد ۲) ۱۹۱۳، اعظم گڑھ۔
۱۴۹ ... مسعود علی کے نام، صفحہ ۳۷-۱۳۶، اکتوبر ۱۹۱۳ء
۱۵۰ ... امین زبیری کے نام، صفحہ ۶۲-۲۶۱، جلد ۲، ۱۳-اکتوبر ۱۹۱۳ء
۱۵۱ ... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۳۲، ۱۵-اکتوبر ۱۹۱۳ء
۱۵۲ ... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۳۳، ۱۵-اکتوبر ۱۹۱۳ء
۱۵۳ ... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۳۳-۱۳۴، ۱۶-اکتوبر ۱۹۱۳ء
۱۵۴ ... مولانا عبدالباری کے نام، صفحہ ۱۹۱- مکاتیب دوم
۱۵۵ ... حمید الدین کے نام، مکاتیب دوم، صفحہ ۵۴-۵۵، ۱۶-اکتوبر ۱۹۱۳ء
۱۵۶ ... مکاتیب دوم، صفحہ ۱۳۴، ۲۱-اکتوبر ۱۹۱۳ء
۱۵۷ ... سید صاحب کے نام مکاتیب دوم، صفحہ ۱۱۷، ۱۶-اکتوبر ۱۹۱۳ء
۱۵۸ ... مولوی مسعود علی کے نام، مکاتیب دوم، صفحہ ۱۳۱-۱۴۰، یکم نومبر ۱۹۱۳ء
۱۵۹ ... نواب علی حسن خاں کے نام، مکاتیب دوم، صفحہ ۸۰-۷۹، ۲-نومبر ۱۹۱۳ء
۱۶۰ ... نواب علی حسن خاں صاحب بہت کچھ کتابیں ندوہ کو دے چکے تھے جو دارالعلوم کے کتب خانہ میں اب بھی موجود ہیں۔
۱۶۱ ... مولوی مسعود علی کے نام، مکاتیب دوم، صفحہ ۳۲-۱۴۱
۱۶۲ ... ایضاً
۱۶۳ ... مکاتیب دوم، ابوالکلام آزاد کے نام تار، صفحہ ۲۸۹، ۱۵-نومبر ۱۹۱۳ء
۱۶۴ ... یہ تاریخ غلط ہے۔ مولانا کا ۱۸-نومبر کو انتقال ہو چکا تھا (حیاتِ شبلی، صفحہ ۷۲۳) - ۱۷-نومبر صحیح معلوم ہوتی ہے کیوں کہ سید صاحب ۱۵-نومبر ۱۹۱۳ء کو پہنچے تھے (حیاتِ شبلی، صفحہ ۷۲۲) لہٰذا ۱۵-نومبر کے بعد اور ۱۸-نومبر سے قبل خط لکھا ہوگا۔
۱۶۵ ... مقالاتِ شروانی، صفحہ ۱۷۵، شروانی پرنٹنگ پریس، علی گڑھ۔
۱۶۶ ... شبلی کالج کے موجودہ پرنسپل شوکت سلطان صاحب (حامد نعمانی مرحوم کے داماد) انھیں کے صاحبزادے اور مرزا احسان احمد بیگ وکیل اعظم گڑھ کے بھتیجے ہیں۔ مرزا احسان احمد بیگ نے مولانا کی فارسی شاعری پر "معارف" میں مقالہ لکھا تھا۔ محبوب الرحمن کلیم بھی اسی خاندان کے ایک فرد تھے، یعنی مرزا احسان احمد بیگ کے بچا تھے۔ محبوب الرحمن کلیم نے بھی مولانا کی فارسی شاعری پر "معارف" میں ایک مقالہ لکھا جو نامکمل رہا۔
۱۶۷ ... راقم الحروف سے عبدالحکیم کی گفتگو میں، ۱۹۶۰ء میں۔
۱۶۸ ... کسوف الشمسین یعنی غم شبلی و ماتم حالی، نظامی پریس، بدایوں، صفحہ ۸۵
۱۶۹ ... حیاتِ شبلی، صفحہ ۱۲۲
۱۷۰ ... مکاتیب دوم، صفحہ ۳۵، ۲۳-جنوری ۱۹۱۱ء
۱۷۱ ... مکاتیب اول، صفحہ ۵۶-۵۷، ۱۹-دسمبر ۱۸۸۳ء

۱۷۲۔۔۔ مقالاتِ شیروانی، صفحہ ۱۶۹، شیروانی پرنٹنگ پریس، علی گڑھ
۱۷۳۔۔۔ سلجوقیہ۔
۱۷۴۔۔۔ البصیر(شبلی نمبر)، صفحہ ۱۳۲، اسلامیہ کالج، چنیوٹ
۱۷۵۔۔۔ اطمینان بخش مواد نہ مل سکا تھا۔
۱۷۶۔۔۔ البصیر، صفحہ ۱۳۳
۱۷۷۔۔۔ "سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ" از سید عبداللہ، صفحہ ۱۳۲-۱۳۳، مکتبہ کار، لاہور، صفحہ ۸۰-۸۱
۱۷۸۔۔۔ History to be Comected Story of Great Men
۱۷۹۔۔۔ مولانا شبلی کا مرثیہ اردو ادب میں، شبلی اکادمی، قرول باغ، دہلی
۱۸۰۔۔۔ ماہنامہ "ادب" علی گڑھ، شبلی نمبر، صفحہ ۵۵
۱۸۱۔۔۔ سیرت النبیؐ، صفحہ ۵، طبع پنجم، حصہ اول
۱۸۲۔۔۔ سیرۃ النعمان، جلد اول، صفحہ ۹۴
۱۸۳۔۔۔ سیرہ النعمان، جلد دوم، صفحہ ۲۶۶
۱۸۴۔۔۔ سفرنامہ، روم و مصر و شام، صفحہ ۲۰۲
۱۸۵۔۔۔ سفرنامہ، صفحہ ۲۰۲-۲۰۳
۱۸۶۔۔۔ سفرنامہ، صفحہ ۲۰۴
۱۸۷۔۔۔ اس مقام پر بدء الاسلام سے جو نمونہ تحریر عربی دیا گیا تھا، اس کی نقل در نقل میں چوں کہ ہر جملے و ہر سطر میں غلطیاں موجود تھیں اور تصحیح کے لیے رسالہ موجود نہ تھا، اس لئے اقتباس حذف کر دیا گیا (ا۔ س۔ ش)
۱۸۸۔۔۔ مطبع مفید عام، آگرہ
۱۸۹۔۔۔ البصیر، شبلی نمبر، صفحہ ۷۶
۱۹۰۔۔۔ البصیر، شبلی نمبر، صفحہ ۷۷
۱۹۱۔۔۔ البصیر، شبلی نمبر، صفحہ ۷۷
۱۹۲۔۔۔ اصل ترجمہ مولانا پیر مہدی اسحق جان صاحب نقشبندی کے پاس ہے، جس سے یہ عبارت لی گئی ہے۔
۱۹۳۔۔۔ باقیاتِ شبلی صفحہ ۱۹ تا ۲۳، از مشتاق حسین، آزاد کتاب گھر، کلاں محل، دلی۔
۱۹۴۔۔۔ باقیاتِ شبلی، صفحہ ۲۴ تا ۲۸
۱۹۵۔۔۔ باقیاتِ شبلی، صفحہ ۲۹ تا ۳۴
۱۹۶۔۔۔ باقیاتِ شبلی، صفحہ ۳۵ تا ۴۱
۱۹۷۔۔۔ باقیاتِ شبلی، صفحہ ۴۳ تا ۴۵
۱۹۸۔۔۔ باقیاتِ شبلی، صفحہ ۴۶ تا ۵۴
۱۹۹۔۔۔ ماہنامہ ادب، شبلی نمبر، صفحہ ۱۳۵
۲۰۰۔۔۔ اس وقت تحقیق نہیں ہو سکی تھی۔
۲۰۱۔۔۔ حیاتِ شبلی، صفحہ ۱۵۵
۲۰۲۔۔۔ ادب علی گڑھ اکتوبر ۱۹۶۰، یہ تحریر تمکین کاظمی نے "شبلی حیدر آباد میں" کے عنوان سے لکھی۔ صفحہ ۲ پر سید سلیمان ندوی کی تحریر یہ ہے "۱۸۹۵ء میں نواب اقبال الدولہ وقار الامرا بہادر مدار المہام حیدر آباد (دکن) کی علی گڑھ میں تشریف آوری کے موقع پر سرسید کی تحریک پر ایک قصیدہ لکھا اور پڑھا۔"
۲۰۳۔۔۔ راقم الحروف کے نام، مورخہ ۳۰-مارچ ۱۹۶۵ء۔
۲۰۴۔۔۔ ماہنامہ ادب، شبلی نمبر، صفحہ ۱۳۹
۲۰۵۔۔۔ ماہنامہ ادب، علی گڑھ، صفحہ ۴۲-۱۳۱
۲۰۶۔۔۔ شبلی ایک دبستان، صفحہ ۱۹۰- مکتبہ عارفین، نیو مارکیٹ، عظیم پور، ڈھاکہ

۲۰۷..... دیوان شبلی، مطبع نامی، کان پور، صفحہ ۳۵ ۲۰۸..... شبلی ایک دبستان، صفحہ ۱۸۵
۲۰۹..... نصیر الدین ہاشمی کا مکتوب راقم الحروف کے نام۔ ۲۱۰..... سوانح مولانا روم، صفحہ ۷
۲۱۱..... البصیر، شبلی نمبر، صفحہ ۷۴، اسلامیہ کالج، چنیوٹ
۲۱۲..... مولانا شبلی کی فارسی شاعری، بحوالہ۔ علی گڑھ میگزین ۱۹۲۲ء، صفحہ ۳۱
۲۱۳..... کلیاتِ فارسی شبلی، صفحہ ۸۷
۲۱۴..... مولانا شبلی کی فارسی شاعری، علی گڑھ میگزین ۱۹۲۲ء، صفحہ ۳۲
۲۱۵..... کلیاتِ فارسی، صفحہ ۸۴ ۲۱۶..... کلیاتِ فارسی، صفحہ ۶۸
۲۱۷..... کلیاتِ فارسی، صفحہ ۶۷-۶۸ ۲۱۸..... کلیاتِ فارسی، صفحہ ۱۰۹
۲۱۹..... شبلی کی شعر فہمی اور شعر گوئی از رضیہ بیگم، صفحہ ۷۳، "صبا" شبلی نمبر ۱۹۵۸ء، حیدر آباد (دکن)
۲۲۰..... "خضر راہ" لکھنو، شبلی نمبر، مارچ ۱۹۳۰ء۔ صفحہ ۱۰۳
۲۲۱..... فرنگی محل لکھنو کے مفتی قائم صاحب کا کہنا ہے کہ یہ مضمون مولانا شبلی کا نہیں ہو سکتا بلکہ یہ مولوی عبد الرزاق ملیح آبادی کا ہو گا، لیکن اب تک یہ ثابت نہیں ہو سکا ہے کہ مولانا کے علاوہ بھی کوئی کشاف کے نام سے لکھتا تھا۔ کشاف کے نام سے صرف یہی ایک مضمون ہے، باقی شاعری ہے۔
استدراک بر حاشیہ ۲۲۱: مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی تقریباً ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔ حضرت کشاف کا یہ مضمون ۱۱۔اگست ۱۹۱۲ء کو چھپا تھا۔ اس وقت تو ملیح آبادی لکھنو آکر ندوہ میں داخل بھی نہ ہوئے تھے۔ ان کی علمی قابلیت اور مضمون نگاری کی صلاحیت بہت بعد کی بات ہے۔ مضمون پر ایڈیٹر (مولانا ابو الکلام آزاد) کے تعارفی نوٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت کشاف کا پایہ علمی اور شاعرانہ حیثیت مسلم تھی اور الہلال کے اجرا سے بہت پہلے قلمی معاونت کا وعدہ فرما چکے تھے۔ ملیح آبادی تو اس وقت کسی پرائمری درجے کے طالبِ علم ہوں گے۔ شعر گوئی کے ذوق سے تو وہ ۵۹ برس کی عمر (ف جون ۱۹۵۹ء) میں بھی محض ناآشنا تھے۔ مولانا آزاد سے ملیح آبادی کی ملاقات ۱۹۲۰ء کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد بلاشبہ مولانا آزاد کی نگرانی میں پیغام (۱۹۲۱ء) الجامعہ (۲۴-۱۹۲۳ء) اور الہلال (۱۹۲۷ء) سے ان کا تعلق رہا تھا۔ بنابریں مفتی قائم فرنگی محلی کی روایت میں کوئی واقعاتی صداقت موجود نہیں ہو سکتی۔ اس بارے میں ہرگز شبہ نہ کرنا چاہیے کہ حضرت کشاف علامہ شبلی مرحوم کے سوا کوئی اور صاحب ہیں (ابو سلمان شاہ جہان پوری)۔
۲۲۲..... کلیاتِ شبلی، صفحہ ۶۶ ۲۲۳..... کلیاتِ شبلی، صفحہ ۴۳
۲۲۴..... کلیاتِ شبلی، صفحہ ۴۷-۴۸ ۲۲۵..... کلیاتِ شبلی، صفحہ ۸۴
۲۲۶..... ایضاً ۲۲۷..... کلیاتِ شبلی، صفحہ ۸۵
۲۲۸..... خضر راہ (شبلی نمبر)، لکھنو ۱۹۳۰ء، صفحہ ۱۰۳، خضر راہ مشین پریس، نیا گاؤں، لکھنو۔
۲۲۹..... صبا (شبلی نمبر)، حیدر آباد (دکن)، ۱۹۸۵ء۔
۲۳۰..... کاروانِ خیال، صفحہ ۹۳
۲۳۱..... اقبالیات کا تنقیدی جائزہ از قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی، صفحہ ۹۴

مجلسِ یادگارِ ہاشمی

زیرِ سرپرستی

حضرت مخدومی نقشبندِ وقت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب

دامت فیوضہم

یہ مجلس ڈاکٹر سید نبی احمد ہاشمی مرحوم کے آثارِ علمیہ کے تحفظ اور تالیف و اشاعت کے لیے قائم کی گئی ہے۔

اس کے علاوہ

دیگر بزرگانِ دین، رہنمایانِ شریعت، ہادیانِ طریقت، سالکانِ وقت اور اکابرِ علم و ادب کے تبرکاتِ علمی اور رشحاتِ فکر کی تالیف و اشاعت بھی مجلس کے قیام کے مقاصد میں شامل ہے۔

ناظم مجلس

(پروفیسر) سیّد زبیر احمد ہاشمی

کراچی